ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ
Checked 1969
ہماری دعوت
لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ
اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے
لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، در اصل یہ
اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی
اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔
جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی
زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اس کا
عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔
فاطر السماوات والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرة
توفنی مسلما والحقنی بالصالحین
ادارۂ الفرقان
مسئول
محمد منظور نعمانی
مرتب
عتیق الرحمن سنبھلی

کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات

کلمۂ طیبہ کی حقیقت :- ... از افادات مولانا نعمانی
اس میں اسلام کے کلمۂ دعوت لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے موثر انداز میں کی گئی ہے کہ سطر سطر سے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہو۔ اور دماغ کے ساتھ دل بھی متاثر ہوتا ہے .. .. .. قیمت -/۶/-

برکات رمضان :- ... از افادات مولانا نعمانی
اس رسالہ کی خصوصیت ہو کہ روزہ داروں رمضان اور تراویح وغیرہ کے فضائل کی احادیث کی تشریح حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے طرز پر اس میں اس طرح کی گئی ہو کہ دل اور دماغ دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ اور عمل کا شوق پیدا ہوتا ہے قیمت -/۱۲/

انیس نسواں
از محترمہ بیگم سید اصغر حسین
مسلمان خواتین خاصکر تعلیمیافتہ [illegible] دوں میں دین کی طرف سے بے فکری اور آخرت کی فکر سے جو غفلت تیزی سے بڑھ رہی ہو اس کے علاج اور انسداد کیلئے ہماری ایک محترم بہن نے یہ رسالہ لکھا ہو۔ شروع میں مولانا نعمانی کے قلم سے پیش لفظ ہے۔ ... ... قیمت -/۱۰/-

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ :- (از مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم)
حضرت شاہ صاحبؒ کے مقام کی معرفت اور ان کی کتابوں کے سمجھنے کے لیے یہ مقالہ کلید کی حیثیت رکھتا ہو ... ... قیمت -/-/۱

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت :- مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے یہ مولانا مرحوم کی قابل دید سوانح حیات ہو جسمیں انکی دینی دعوت کی تاریخ اور اس کے بنیادی اصولوں کو بھی تفصیل سے لکھا گیا ہو۔ قیمت -/۸/۲

معرکۃ القلم اکابر دیوبند کی طرف سے مولوی احمد رضا خانصاحب بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا جواب -/-/۱

اسلام کیا ہے؟

(تالیف مولانا نعمانی)
(نیا اڈیشن کافی ترمیم و اضافہ کیا گیا ہے)

اس کتاب کے دیکھنے والوں کا عام احساس یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اسکو کوئی خاص مقبولیت و تاثیر عطا فرمائی ہو۔ پچھلے چند سالوں میں تقریباً تیس ہزار اردو میں اور کئی ہزار گجراتی میں شائع ہو چکی ہے۔

حال ہی میں ہندی اڈیشن بھی تیار ہو گیا ہے

اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کے لیے ہی نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ اور عمل انشاء اللہ کافی ہو۔

زبان نہایت آسان ہونے کے ساتھ نہایت شیریں اور پرتاثیر ہے، کتابت طباعت اعلیٰ اور معیاری قسم اول۔ کاغذ ۲۸ پونڈ چکنا مجلد۔ قیمت ڈھائی روپے (-/۸/۲)، قسم دوم کاغذ ۲۲ پونڈ چکنا غیر مجلد۔ قیمت پونے دو روپے -/۱۲/۱۔ ہندی اڈیشن کاغذ اعلیٰ مجلد۔ قیمت تین روپے ..... -/-/۳

نماز کی حقیقت :- از افادات مولانا نعمانی۔ ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہو کہ نماز کے مقام اور اس کی روح و حقیقت سے واقف ہونے کے لیے اور اپنی نماز میں روحانیت اور نورانیت پیدا کرنے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں "کلمۂ طیبہ کی حقیقت" کی طرح یہ بھی عقل و جذبات اور دل و دماغ کو یکساں متاثر کرتا ہو قیمت -/۱۲/

آپ حج کیسے کریں؟ (از مولانا نعمانی و مولانا علی میاں ندوی)
حج و زیارت کے متعلق اردو زبان میں بیشمار چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن یہ کتاب (جو مولانا نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی گویا مشترک تالیف ہو)، اپنی اس خصوصیت میں اب بھی بے نظیر ہو کہ اس کے مطالعہ سے حج کا صحیح اور مسنون طریقہ بھی تفصیل کے ساتھ معلوم ہو جاتا ہو اور دل میں عشق و محبت اور ذوق و شوق کی وہ کیفیات بھی پیدا ہو جاتی ہو جو در اصل حج کی روح اور جان ہیں۔ کاغذ عمدہ مجلد۔ قیمت ...... -/-/۲

آسان حج :- از افادات مولانا نعمانی۔ یہ آسان زبان میں "حج کیسے کریں" کا خلاصہ ہو۔ ایسے کم تعلیم والے حضرات جو صرف آسان اور معمولی اردو ہی پڑھ سکتے ہیں وہ اسکے مطالعہ سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ طباعت معیاری قیمت صرف -/۸/

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ :- مرتبہ مولانا نعمانی۔ مولانا مرحوم اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن جو شخص ان کو اور ان کی دینی دعوت کی حقیقت اور اس کی گہرائیوں کو سمجھنا چاہیے اس کو ان ملفوظات کا مطالعہ بار بار کرنا چاہیے۔ ... ... قیمت -/۸/۱

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ ..... قیمت -/۶/

شاہ اسمٰعیل شہید اور معاندین کے الزامات
علمی حیثیت سے بھی قابل دید ہے ..... قیمت -/۸/۱

(فی کاپی آٹھ آنے ۸/)

جلد ۲۶ | محرم الحرام ۱۳۷۸ھ مطابق اگست ۱۹۵۸ء | شمارہ ۱

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی، پی ارسال کیا جائے گا۔

چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۲۴ تاریخ تک پہونچ جانی چاہیئے۔

پاکستان کے خریدار:- اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں۔ اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت:- رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ کو روانہ کردیا جاتا ہے اگر ۲۰ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔

خط و کتابت کا پتہ:- دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

افتتاح جلد بست و ششم ۲۶

بسم اللہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات

شکر اس خدائے لایزال کا جس کی چشم کرم کے ادنیٰ التفات نے اپنے اس نام لیوا کی ایک چوتھائی صدی کی عمر اس طرح طے کرادی جس کا دین کی غربت کے اس دور میں ایک سال کے لئے بھی اطمینان نہیں کیا جاسکتا۔ اور اُسے توفیق بخشی کہ اپنے مقصد کی خدمت کا عزم لے کر چھبیسویں سال میں قدم رکھے ــــــ

دعا ہے کہ اس مہربان آقا کا گوشۂ چشم اسی طرح ملتفت رہے ــــــ اور الفرقان اپنی دانست میں تفریقِ حق و باطل کی جو حقیر کاوش کر رہا ہے اُسے قوت بخشے۔ اور اگر اس کاوش میں اس سے کوئی غلطی ہو تو اس کی اصلاح فرمادے ــــــ وما توفیقی الا باللہ

سال گزشتہ اسی صفحہ میں اس ارادہ کا اظہار کیا گیا تھا کہ الفرقان کے چھبیسویں سال کی ابتدا، ایک خاص نمبر سے ہوگی۔ مگر ابھی اللہ کو منظور نہیں تھا چنانچہ اسکی تیاریوں کے لئے کما حقہٗ وقت نہیں مل سکا۔ بہرحال ایک خاص نمبر کا ارادہ اپنی جگہ پر ہے اور انشاء اللہ وہ اس سال کے کسی حصہ میں حاضر خدمت ہوگا۔

ادارۂ الفرقان

نگاہِ اوّلیں

زمانے کے اثرات بھی کیا ہوتے ہیں کہ دو اور دو، چار کی طرح کھلی ہوئی صداقتیں بھی اچھے اچھے سمجھدار لوگوں کے لئے ناقابل فہم بلکہ قابل اعتراض ہوجاتی ہیں! کسقدر واضح اور حقیقت پسندانہ بات ہے کہ جب تک سوسائٹی میں اخلاقی احساس، ذمہ داری کا پاس اور فرائض کا شعور قوی نہو، اجتماعی خوشحالی کے بڑے سے بڑے انقلاب انگیز منصوبے، عظیم سے عظیم ترقیاتی اسکیمیں اور بہتر سے بہتر قانونی تدبیریں اپنے خاطر خواہ نتائج تک نہیں پہنچا سکتیں، جو کچھ کام ہوگا وہ اصل کے مقابلہ میں بہت تھوڑا ہوگا، اور اس سے بہت زیادہ مصارف میں ہوگا جتنے مصارف میں ایک زندہ اخلاقی احساس اور فرائض کے قوی تر شعور کے ساتھ ہوسکتا تھا ———— اس بات کو دوسرے انداز میں یوں کہہ لیجیے کہ انسان کے اجتماعی مسائل کی کلید یہ ہے کہ اسے صحیح معنیٰ میں انسان بنایا جائے۔ اسکی اخلاقی حس اس حد تک بیدار کی جائے کہ وہ اپنے ابناء جنس کے حقوق پہچانے اور اپنے حقوق میں حد سے تجاوز نہ کرے۔ اس میں فرائض کا ایسا شعور پیدا کیا جائے کہ کوئی بڑے سے بڑا لالچ اور اونچے سے اونچا ذاتی فائدہ اُسے فرض سے انحراف اور اجتماعی مفاد سے روگردانی پر آمادہ نہ کرسکے۔ کتنی صاف اور سیدھی اور دو اور دو، چار کی طرح کھلی ہوئی بات ہے۔ مگر ذرا حیرت نہ کیجیے کہ بعض اچھے اچھے ارباب فہم کے نزدیک یہ رجعت پسندی اور عوامی مسائل سے روگردانی ہے۔ اسلئے کہ اس میں زور ہے اخلاق اور انسانیت پر، درانحالیکہ آج انسان کو ضرورت ہے روٹی اور کپڑے کی، مکان کی، اور سستی دوا اور تعلیم کی!

جنتا کا غم کھانے والے بزرگو! یہ کون کہتا ہے کہ تم زرعی اور صنعتی منصوبے نہ بناؤ، ترقیاتی

اسکیمیں نہ چلاؤ۔ دولت کی منصفانہ تقسیم کے لیے مفید قوانین بروئے کار نہ لاؤ۔ اسپتالوں اور تعلیم گاہوں کا جال نہ پھیلاؤ؟ ——— یہ سب کچھ کرو، اور ضرور کرو، مگر کہنے والوں کا کہنا یہ ہے کہ اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی سمجھو کہ یہ سارے کام صرف چند مخلص اور دردمند لوگوں کے کاغذ پر نقشہ بنا دینے سے نہیں ہو جائیں گے، بلکہ ان کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے لاکھوں اور کروروں آدمیوں کی ضرورت ہوگی۔ پھر ان کے نتائج کو عام آدمیوں تک پہنچانے میں بھی لاکھوں افراد ہمیشہ واسطے کی حیثیت سے درکار رہیں گے۔ لہٰذا ناگزیر ہو کہ جس سوسائٹی سے یہ افراد مہیا ہوتے ہیں اس میں کیرکٹر کی بلندی اتنی عام ہو کہ وہ بیک وقت لاکھوں فرض شناس اور باضمیر کارکن فراہم کر سکے۔ بلکہ ان منصوبوں اور اسکیموں کے نتائج کی صحیح تقسیم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ سوسائٹی میں کم از کم بنیادی اخلاقی اور انسانی احساسات اس قدر عام ہوں کہ لوگ اپنے حقوق اور اپنی ضروریات کی طرح دوسروں کے حقوق اور دوسروں کی ضروریات کو سمجھیں اور (الا ماشاء اللہ) کوئی شخص اپنے قرار واقعی حصہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لیے دوسروں کے حقوق کو پامال اور ان کی ضروریات کو نظر انداز نہ کرے۔

ان دونوں باتوں کی ضرورت سمجھنے کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک نہایت قریب کی مثال لے لیجئے۔ آج کل ہمارے صوبے میں غذائی اجناس کی گرانی اور کمیابی کا مسئلہ وقتی طور پر حل کرنے کے لیے غلہ کی سرکاری دوکانوں کا سسٹم جاری کیا گیا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس اسکیم سے جتنی سہولت اور جتنا فائدہ عوام کو پہنچنا چاہیئے تھا وہ نہیں پہنچ رہا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اولاً تو بہت سے سرکاری اہلکار جن کے ہاتھوں میں ان دوکانوں کے پرمٹ اور لائسنس کا اجراء ہوتا ہو۔ وہ فرض شناس نہیں ہوتے کہ پبلک مفاد کے پیش نظر اپنے اندازہ کی حد تک اچھے سے اچھے آدمی منتخب کریں۔ بلکہ اقربا نوازی اور رشوت خوری کا سلسلہ چلتا ہو۔ پھر سرکاری اہلکاروں کا کام ختم ہو کر دوکانداروں کا کام شروع ہوتا ہے تو ان کا بس چلتا ہو تو بلیک کرتے ہیں یا اچھا مال بچا کر ناجائز منفعت خوری کے لیے رکھتے ہیں اور گھٹیا مال ملا کر سرکاری نظم کے ماتحت فروخت کرتے ہیں۔ اس کے بعد خریدار جنتا کا نمبر آتا ہو تو روزمرہ کی بات ہو کہ بہت سے لوگ عجیب عجیب ہتھکنڈوں سے کئی کئی حصے مارلے جاتے ہیں اور بہت سے مستحق اور ضرورتمند محروم رہجاتے ہیں یا کم از کم پریشان ہوتے ہیں۔ یہ آخر کس چیز کا نتیجہ ہو سوائے اس کے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں اس اسکیم کا نفاذ ہے

وہ فرض شناس اور بے غرض نہیں ہیں، اور عوام جن کی سہولت اور راحت کے لیے یہ اسکیم چلائی گئی ہے ان میں باہمی حقوق شناسی اور انسانیت کے بنیادی تقاضوں کا احساس (یا وقت کی زبان میں کہہ لیجئے کہ اجتماعی شعور) نہیں ہے۔

جب معمولی منافع اور محض ضروریات کے معاملہ میں ہماری سوسائٹی کا حال یہ ہو تو ذرا قیاس کیجئے ان بڑے بڑے منصوبوں اور ترقیاتی اسکیموں کے بارے میں جہاں قدم قدم پر لاکھوں کے وارے نیارے ہو سکتے ہیں جہاں پشتوں کے لیے انتظامات کیے جا سکتے ہیں، جہاں رشوت خوری اور اقربا نوازی کے تحت کھپیں کی کھپیں کھپائی جا سکتی ہیں۔ جہاں ان منصوبوں اور اسکیموں کے نتائج کو عوام تک پہنچانے والے بڑے اور چھوٹے کارکن مستقل طور سے ناجائز روپیہ کما سکتے ہیں اور پھر جہاں پبلک کے افراد ان نتائج کو حاصل کرنے میں دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈال کر وسیع تر منافع کی امید رکھ سکتے ہیں۔

ہمیں حیرت ہو کہ پھر وقت کے دانش مندوں اور عوام کے غمخواروں کو یہ بات کیوں کر بے وقت کی راگنی نظر آتی ہے کہ ہمارے ملک کا بنیادی مسئلہ لوگوں میں اخلاقی اور انسانی حس اور احساس فرض کو بیدار کرنا ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ واقعات اور نتائج کی منطق میں بڑی طاقت ہو۔ لیکن اگر یہ منطق بھی عوامی مسائل میں سر کھپانے والوں کو اس بنیادی مسئلہ کی طرف متوجہ نہیں کرتی، اور وہ مصر ہیں کہ وہ اس شاہ کلید (Master Key) سے بے نیاز رہ کر ہی عوام کے مسائل اور مصائب کا حل نکالیں گے تو اسے ملک کے عوام کی بدقسمتی کے سوا کیا کہیئے؟

صفحہ ۴ کا حاشیہ ؎۱ حسن اتفاق کہیئے کہ ریاستی کونسل کے موجودہ اجلاس میں ۱۱ اگست کو ریاستی وزیر غذا نے اور ۱۲ اگست کو متعدد ممبران کونسل نے اس بات کی بہت کھلے الفاظ میں شکایت کی ہو کہ غلہ کی دوکانوں کا الاٹمنٹ نامناسب آدمیوں کو ہوا ہو۔ اور اس کی وجہ سے کافی بدعنوانیاں ہو رہی ہیں۔ ملاحظہ ہو قومی آواز لکھنؤ ۱۲ اور ۱۳ اگست ۵۸ء۔

قرآنی دعوت

(مسلسل)

سماحت و سخاوت :-

جن اخلاقی نیکیوں پر قرآن مجید میں خاص طور سے زور دیا گیا ہے اُن میں سے ایک سماحت و سخاوت بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بندہ کو جو دولت و قوت اور جو نعمت اس دنیا میں دی ہے وہ اس سے صرف خود ہی فائدہ نہ اٹھائے بلکہ اللہ کے دوسرے بندوں پر بھی اس کو خرچ کرے اور اُس سے اُن کو فائدہ پہنچائے ـــــ اس کا دائرہ ظاہر ہے کہ بہت وسیع ہے اور بندگان خدا کی خدمت و اعانت کی تمام صورتیں اس عنوان کے تحت آجاتی ہیں ـــــ دوسرے ضرورت مندوں پر اپنی دولت خرچ کرنا، اپنے علم و فن اور اپنی قابلیت سے انکی کوئی خدمت کرنا، خود تکلیف اُٹھا کے ان کے کام کر دینا اور جس مدد کے وہ محتاج ہوں اپنے وسائل سے ان کی وہ مدد کر دینا یہ سب شکلیں سماحت و سخاوت ہی کی شاخیں ہیں اور قرآن مجید نے اسکو بنیادی نیکی قرار دے کر مختلف عنوانوں سے اسکی ترغیب دی ہے ـــــ سورہ بقرہ کے پہلے ہی رکوع میں (جس کو قرآن مجید کا تمہیدی حصہ کہنا صحیح ہے) قرآنی ہدایت سے فائدہ اُٹھا کر فلاح یاب ہونے والے گروہ کے جو بنیادی اوصاف ذکر کئے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ البقرۃ ع۱　　اور ہم نے ان کو جو کچھ دیا ہے وہ اُس میں سے (ہماری راہ میں دوسرے بندوں پر بھی) خرچ کرتے ہیں۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ مال و دولت کے علاوہ جو خداداد قوت و طاقت، قابلیت اور محنت وغیرہ

اللہ کے بندوں کی نفع رسانی کے لئے خرچ کی جائے وہ سب بھی اس میں داخل ہے۔ پھر اسی سورہ بقرہ کے آخری حصہ میں ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ ۝ (بقرہ۔ ع ۳۴)

اے ایمان والو ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے اُس میں سے (ہماری راہ میں دوسروں پر بھی) خرچ کرو، قبل اس کے کہ (قیامت کا) وہ دن آجائے جس میں نہ کوئی خرید فروخت ہوگی، نہ کسی یاری یاری نہ کسی کی سفارش کام آئے گی۔

اور تین رکوع کے بعد اسی سورہ بقرہ میں راہ خدا میں اپنی دولت وطاقت وغیرہ خرچ کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے اُس کی نافعیت اور اُس کے اجر وثواب کے بارے میں فرمایا گیا ہے

وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنْفُسِكُمْ ۚ وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ۝ (بقرہ ع ۳۷)

اور جو اچھی چیز تم (اللہ کے بندوں پر) خرچ کروگے اُس کا نفع اور ثواب تم ہی کو پہنچے گا اور تمہارا خرچ کرنا لوجہ اللہ ہی ہونا چاہیے۔ اور جو اچھی چیز بھی تم راہ خدا میں صرف کروگے تم کو اُس کا پورا پورا صلہ ملے گا اور تمہاری کوئی حق تلفی نہ ہوگی۔

ایک دو آیتوں کے بعد پھر ارشاد ہوا ہے

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (بقرہ ع ۳۸)

جو بندے خرچ کرتے ہیں (اللہ کی راہ میں دوسروں پر) اپنا سرمایہ رات میں اور دن میں خفیہ اور علانیہ پس ان کے واسطے ان کے رب کے ہاں (جنت میں) ان کا اجر ہے (جو اُس کریم رب کی شان کے لائق ہے) اور (ان کا حال یہ ہوگا کہ) نہ انھیں کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

راہ خدا میں اللہ کے دوسرے بندوں پر اپنی چیزیں صرف کرنے کی ترغیب کے سلسلہ میں ایک بات قرآن مجید نے یہ بھی کہی ہے کہ اس راہ میں خرچ کرنے والا جتنا خرچ کرے گا اللہ کی

طرف سے اس کا سیکڑوں گنا اُس کو دیا جائے گا، اس لئے اس راہ میں خرچ کرنا گویا ایک انتہائی نفع بخش تجارت اور ایک ایسی کھیتی ہو جس سے ایک ایک دانہ کے عوض سیکڑوں ہزاروں دانے کاشتکار کو حاصل ہوتے ہیں۔ اسی سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ	جو لوگ راہ خدا میں اپنا مال خرچ کرتے
فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ	ہیں، اُن (کے اس مال) کی مثال اُس
اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِىْ كُلِّ	دانہ کی سی ہو جس سے سات بالیں اُگیں
سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ	اُن میں سے ہر بال میں سو دانے ہوں
يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ	اور اللہ جس کے لئے چاہے (اس سے
وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ (بقرہ - ع ۳۵)	اور زیادہ بھی) بڑھاتا ہو اور اللہ بڑی

وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

راہ خدا میں خرچ کرنے کی ترغیب کے لئے ایک نہایت مؤثر انداز قرآن مجید میں یہ بھی استعمال کیا گیا ہے کہ اس مد میں خرچ کرنے کو اللہ تعالیٰ کو قرض دینے سے تعبیر کیا گیا ہے ــــ سورۂ مزمل میں ارشاد ہوا ہے۔

وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۝	اور اللہ کو اچھا قرض دو (یعنی چیز
(مزمل - ع ۲)	بھی اچھی ہو اور نیت بھی اچھی ہو)

اور اس سے بھی زیادہ دلکش انداز میں سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے

مَنْ ذَا الَّذِىْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا	کون وہ بندہ ہے جو اللہ کو اچھا قرض
حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا	دے، پھر اللہ (اُسکے بدلہ میں) اُس کو
كَثِيْرَةً ؕ (بقرہ ع ۳۲)	بہت گنا بڑھا کر دے۔

اسی طرح سورۂ حدید میں فرمایا گیا ہے

مَنْ ذَا الَّذِىْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا	کون ایسا بندہ ہے جو اللہ کو قرض حسن
حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ	دے، پھر اللہ اُس کو اُس کے واسطے
كَرِيْمٌ ۝ (حدید - ع ۲)	بڑھائے اور اسکے واسطے کریمانہ اجر ہے۔

اور سورۂ تغابن میں ارشاد ہوا ہے۔

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا	اگر تم اللہ کو قرض حسن دو گے تو اللہ
يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَ	اُس کو تمہارے لئے خوب بڑھائے گا،
اللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ (تغابن ع ۲)	اور تمھیں بخش دیگا، اور اللہ بڑا قدر دان

اور صاحب حلم ہے۔

اس نیکی کی ترغیب کے لئے یہ "قرض حسن" دینے کی تعبیر ظاہر ہے کہ محض بندہ نوازی ہے ورنہ اللہ تعالیٰ "غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ" ہے۔ اس کی پاک ذات قرضہ لینے دینے سے اور اس قسم کے ہر معاملہ اور کاروبار سے وراء الوراء ہے۔

اس سلسلہ میں قرآن پاک کی ایک ہدایت اور تعلیم یہ بھی ہے کہ اللہ کی راہ میں اُس کے بندوں پر اچھی اور مرغوب و محبوب چیز خرچ کی جائے ایسا نہ ہو کہ جب کوئی چیز اپنے لئے ناقابلِ استعمال ناکارہ اور بے قیمت ہو جائے تو اُس کو اُٹھا کر اللہ کی راہ میں دیدیا جائے۔ سورۂ بقرہ کے اواخر میں جہاں راہ خدا میں خرچ کرنے کی بار بار ترغیب دی گئی ہے وہیں یہ ہدایت بھی فرمائی گئی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ	اے ایمان والو تم اپنی کمائی میں سے اور
طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا	زمین سے ہماری نکالی ہوئی پیداوار میں سے
لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا	اچھی عمدہ چیزیں (ہماری راہ میں) خرچ
الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ	کرو، اور ایسا نہ ہو کہ بالقصد
بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ	اور سوچ سمجھ کے ردی اور خراب چیزیں
(بقرہ ع ۳۷)	اُس میں سے (اس راہ میں) خرچ کرو

اور حال یہ ہے کہ (اگر تمھیں کوئی ایسی ردی چیز دے تو) نہیں ہو تم اس کو لینے والے الا یہ کہ تم اس میں چشم پوشی سے کام لو۔

اور سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوا ہے

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا	ہرگز تم نیکی کو نہیں پاسکتے جب تک تم

مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۵ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۵ (آل عمران۔ ع ۱۰)

(راہ خدا میں) اُس میں سے خرچ نہ کرو جو تم کو محبوب اور عزیز ہے اور تم جو چیز بھی (اچھی یا بُری) خرچ کروگے تو یقین رکھو کہ اللہ کو اُس کا خوب علم ہے۔

اس سلسلہ میں ایک خاص ہدایت یہ بھی دی گئی ہے کہ اللہ کی راہ میں اسکے بندوں پر جو کچھ خرچ کیا جائے اور ان کی جو بھی خدمت اور مدد کی جائے اسکی غایت اور اُس کا مقصد بس رضائے الٰہی ہونا چاہیئے۔

سورۂ بقرہ کے ۳۷ ویں رکوع کی وہ آیت اوپر نقل ہو چکی ہے جس میں فرمایا گیا ہے

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ۔

اور نہیں خرچ کرتے ہو تم (اے اہل ایمان) مگر صرف رضائے الٰہی کی طلب میں۔

مطلب یہ ہو کہ مومنین کی شان یہی ہے کہ اس طرح کے کام وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا طلبی کے داعیہ ہی سے کریں اُسکے سوا اُنکی کوئی غرض نہ ہو۔۔۔ اور سورۂ لیل میں فرمایا گیا ہو کہ اللہ کا جو پرہیزگار بندہ اپنا مال (اُسکے دوسرے بندوں پر) صرف اُسکی رضا کیلئے خرچ کرتا ہو اور رضائے الٰہی کے سوا اس سے اسکا کوئی مقصد نہیں ہو تو اس کو اللہ تعالیٰ کی رضا بھی حاصل ہو جائیگی اور دوزخ کے عذاب سے وہ بالکل محفوظ رہے گا۔ ارشاد ہے:۔

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۵ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۵ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰى ۵ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۵ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۵ (اللیل)

اور اس آتش دوزخ سے وہ پرہیزگار بندہ دور رکھا جائے گا جو اپنا مال اللہ کے لئے (اس کے دوسرے بندوں کو) اس لئے دیتا ہے کہ اس عمل کے ذریعہ اُسکو پاکیزگی حاصل ہو اور یہ بات نہیں ہے کہ اُس پر کسی کا احسان ہو جس کا بدلہ دیا جائے بلکہ اپنے بزرگ و برتر پروردگار کی رضا طلبی ہی کے لئے دیتا ہو۔۔۔ اور بلاشبہ اس کا پروردگار اس سے راضی ہو جائے گا۔

اس سلسلہ میں ایک اہم ہدایت قرآن مجید میں یہ بھی دی گئی ہے کہ اللہ کے لئے جس بندہ کو کچھ دیا جائے یا اسکی کوئی خدمت اور مدد کی جائے تو اُس پر اُس کا احسان ہرگز نہ جتایا جائے۔۔۔ اگر ایسا کیا گیا تو

اس سے وہ نیکی بالکل اکارت ہو جائے گی۔ سورۂ بقرہ ہی میں ارشاد ہوا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ (بقرہ ع ۳۶)

اے ایمان والو اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور اذیت دیکر رائیگاں نہ کرو۔

یعنی اگر کسی نے کسی بندۂ خدا کو کچھ دیا اور اسکی کوئی خدمت اور مدد کی اور پھر کبھی اُس پر احسان دھرا، یا طعنہ کے طور پر تذکرہ کر کے اس بیچارہ کا دل دکھایا تو گویا اپنی کی ہوئی نیکی کو بالکل ملیا میٹ کر دیا۔

ایثار :-

سماحت اور سخاوت ہی کی ایک اعلیٰ شکل یہ ہے کہ آدمی خود ضرورت مند ہوتے ہوئے اپنی چیز دوسروں پر صرف کرے اور دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھے، خود بھوکا رہے اور دوسروں کو کھلائے، خود تکلیف اُٹھائے اور دوسروں کو آرام پہنچائے ــــ قرآن مجید میں انصار مدینہ کی تعریف میں فرمایا گیا ہے

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر ع ۱)

اور وہ مقدم رکھتے ہیں (ضرورت مند مہاجرین کو) خود اپنے پر اگرچہ خود ان کو تکلیف اور تنگی ہو۔

اور ایک دوسری آیت میں اللہ کے نیک اور مقبول جنتی بندوں کی تعریف میں فرمایا گیا ہے

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا (الدہر ع ۱)

اور اللہ کے یہ بندے کھانے کی چاہت اور رغبت کے باوجود کھلا دیتے ہیں وہ کھانا کسی مسکین یا یتیم یا کسی بیچارے قیدی کو

اس وصف پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کی یہ تعریف و تحسین بلاشبہ دوسرے بندوں کو اس کی بڑی مؤثر دعوت و ترغیب ہے کہ وہ اپنے میں یہ خُلق پیدا کر کے اللہ کے مقبول بندے بنیں۔

بُخل :-

سماحت اور سخاوت کی ضد یعنی اس نیکی کے مقابلہ کی بُرائی کا نام بخل ہے اس لئے قرآن مجید نے جس طرح سماحت و سخاوت کی ترغیب و تعلیم دی ہے اسی طرح بخل کی ممانعت

اور اس کی سخت ترین مذمت فرمائی ہے ــــــ ایک دو آیتیں اس سلسلہ کی بھی یہیں پڑھ لی جائیں۔

سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۝ (آل عمران ع ۱۸)

اور جو لوگ بخل کرتے ہیں اُس میں جو اللہ نے انکو اپنے فضل و کرم سے دیا ہے (یعنی جو لوگ اللہ کی بخشی ہوئی دولت وقوت وغیرہ دوسرے بندوں پر خرچ نہیں کرتے وہ) یہ خیال نہ کریں کہ یہ (طرز عمل) اُن کے لئے کچھ اچھا اور نفع مند ہے (ہرگز ایسا نہیں ہے) بلکہ یہ اُن کے لئے نہایت بُرا ہے، جو دولت از راہ بخل وہ بچا بچا کر رکھ رہے ہیں یقیناً وہ (قیامت کے دن) ان کے گلے کا طوق بنے گی

یہی بات سورۂ توبہ میں اور زیادہ واضح اور مؤثر الفاظ میں اس طرح فرمائی گئی ہے

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۝ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝ (التوبہ ع ۵)

اور جو لوگ اپنی دولت، سونا چاندی (وغیرہ) کو بطور ذخیرہ کے جمع کرتے اور جوڑتے رہتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، پس اے پیغمبر آپ اُن (پرستارِ دولت) کو دوزخ کے دردناک عذاب کی "خوشخبری" سُنا دیجئے (یہ دردناک عذاب اُنھیں اُس دن ہوگا) جس دن کہ انکی جمع کردہ دولت کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اُس سے ان کے ماتھے، ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائینگی (اور اُن سے کہا جائے گا) یہ ہے (تمھاری وہ دولت) جس کو تم نے اپنے لئے جوڑا اور ذخیرہ کیا تھا پس مزہ چکھو تم اپنی اس دولت اندوزی کا۔

بخل و کنجوسی کی مذمت اور بد انجامی کے بیان میں اگر قرآن مجید میں صرف یہی ایک آیت ہوتی تو

مسلمانانِ ہند کا مسئلہ

(از مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی، استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

شاید دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں کسی نہ کسی تعداد میں مسلمان آباد نہ ہوں، کرۂ ارض کا ایک بڑا حصہ تو اسلامی ممالک ہی کے نام سے موسوم ہے۔ کیونکہ ان ممالک میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور اقتدار و حکومت پورے طور پر ان کے ہاتھ میں ہے، لیکن بہت سے ممالک ایسے بھی ہیں جہاں اقتدار غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے۔ اول الذکر ممالک کے متعلق تو شریعت اسلامیہ کے احکام بالکل واضح ہیں، وہاں ہر مسلمان حکومت کی مشینری کا ایک پرزہ ہے۔ اور پوری مشینری کی اصلاح بقدر استطاعت اس کا فریضہ ہے۔ اقتدار کو فاسقوں فاجروں خصوصاً گمراہوں کے ہاتھ میں جانے سے محفوظ رکھنا اور اگر ان کی بدنصیبی سے ایسے لوگ اقتدار پر قابض ہو گئے ہوں تو اسے صحیح طریقوں سے، ان کے پنجے سے چھڑا کر سواد اعظم کے دیندار مخلص لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچا دینا مسلمانوں پر فرض ہے۔ مسئلہ اتنا واضح ہے کہ جو شخص قرآن و حدیث سے ذرا بھی تعلق رکھتا ہو وہ آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ یہاں اس پر تفصیلی بحث بھی مقصود نہیں ہے۔ اس لیے بات یہیں پر ختم کر کے اصل موضوع پر آتا ہوں۔

یہاں گفتگو ان ممالک کے متعلق کرنا ہے جہاں اقتدار کی باگ غیر مسلموں کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ بھی دو طرح کے ہیں۔ (الف) جہاں اقتدار کلیتہً غیر مسلموں کے قبضہ میں ہے اور حالات کے لحاظ سے اس کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی کہ اس میں مسلمانوں کو کوئی معتدبہ حصہ ملے گا۔ جیسے یوگوسلاویہ، انگلستان، فرانس وغیرہ۔

(ب) جہاں اقتدار میں مسلمانوں کا بھی کچھ حصہ ہے۔ اگرچہ وہ فیصلہ کن طاقت کی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس کی مثال خود ہندوستان ہے۔

دونوں قسموں پر علیحدہ علیحدہ تفصیلی بحث بہت طوالت کا سبب ہوگی۔ اس لیے میں اس

مضمون کا موضوع صرف قسم ثانی کو بناتا ہوں، یعنی وہ ممالک جہاں اقتدار میں مسلمان بھی ایک حد تک شریک ہیں مگر غیر مسلموں سے مغلوب ہیں۔ اور فیصلہ کن طاقت کی حیثیت نہیں رکھتے ہیں اس کی بہترین مثال خود ہندوستان ہے۔ جس کے حالات کا ہمیں اچھی طرح علم ہے۔ اسی مثال کو موضوع سخن بنا کر اصولی حیثیت سے بحث کرنا مفید ہوگا، اس قسم کے دوسرے ممالک کے احکام اسی پر قیاس کرنے سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ بحث چونکہ محض اصولی ہوگی اس لیے اس کے وسیع دائرے میں اس قسم کے سب ممالک آجائیں گے۔ صرف مخصوص حالات کا لحاظ معمولی سا فرق پیدا کرے گا جو آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ اتنی سی بات کے لیے اس فائدے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو ہند کے مخصوص تذکرے سے حاصل ہوگا جس کے حالات کا ہمیں خوب علم ہے اور یہ علم ہمیں مسائل کی توضیح میں بہت امداد دیتا ہے۔

ہند میں مسلمانوں کی شرکت اقتدار نے مسئلہ کو مشکل بنا دیا ہے۔ یہاں وہ اس میں حصہ دار ہیں بھی اور نہیں بھی ہیں۔ مخلوط انتخاب نے اس چیز کو بھی بالکل صاف کر دیا ہے کہ ان کی یہ شرکت بھی بحیثیت ہندوستانی ہے نہ کہ بحیثیت مسلمان۔ مشکل یہ آپڑی ہے کہ نہ تو ان کے حالات پر اسلامی ممالک کے شرعی احکام منطبق ہوتے ہیں نہ ان ممالک کے احکام صادق آتے ہیں جہاں کلیتہً اقتدار غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن اس اشکال نے ایک دوسری مشکل کو حل کر دیا۔ یعنی مسئلہ کا سلبی پہلو بالکل صاف ہو گیا۔ ہندوستان کو نہ اسلامی ممالک میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ نہ غیر اسلامی ممالک کی قسم الف میں۔ نہ ان دونوں ممالک کے احکام شرعیہ اس پر منطبق ہوتے ہیں۔ بلکہ اس کے لیے کوئی تیسری راہ تلاش کرنا پڑے گی۔ سخت مغالطہ میں ہیں وہ لوگ جو اسلامی ممالک کے احکام یہاں چسپاں کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ بھی جو صرف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں یہاں کے مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں۔ گویا اسے غیر اسلامی ممالک کی قسم الف میں داخل سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں راستے بالکل سامنے تھے۔ دو گروہوں نے اسے اختیار کر لیا۔ لیکن تیسرا حل دقیق اور باریک تھا۔ اسے معلوم کرنے سے یہ حضرات قاصر رہے۔

حل کی دقت کے علاوہ ایک شے اور بھی حجاب بن کر سامنے آگئی اور صحیح راستہ کو مخفی کر رہی ہے۔ اسلام کے اجتماعی احکام سے ناواقفیت بلکہ اس پہلو سے کلیتہً غفلت بھی بہت بڑی رکاوٹ ہے جو اس قسم کے مسائل میں صحیح نتائج تک پہونچنے میں مانع ہوتی ہے۔ شریعت مقدسہ نے جس طرح ہماری انفرادی زندگی کے لیے احکام دیئے ہیں اسی طرح ہماری اجتماعی زندگی کی بھی رہنمائی فرمائی ہے۔ بسا اوقات زندگی کے

ان دونوں پہلوؤں میں تعارض واقع ہوتا ہے اور قدرتاً دونوں کے احکام بھی متعارض ہو جاتے۔ الّا ماشاء اللہ کو چھوڑ کر ہمارے رہنما اس حقیقت سے نابلد ہیں۔ یہاں تک کہ بہت سے وہ لوگ جو اجتماعی خدمات میں لگے ہوئے ہیں اور اجتماعیات میں مہارت کے دعویدار ہیں وہ بھی دونوں قسم کے احکام کے فرق سے ناآشنا ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انفرادی احکام اجتماعی زندگی پر منطبق کیے جاتے ہیں۔ جو چادر صرف ایک فرد کے قامت کے لحاظ سے تیار کی گئی ہو کروڑوں افراد پر پھیلائی جائے تو نتیجہ ظاہر ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر جگہ انفرادی و اجتماعی احکام میں تعارض ہوتا ہے، لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے اور جس شخص نے قرآن و حدیث کا مطالعہ ذرا غور سے کیا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ ایسی صورت میں شریعت نے اجتماعی مصلحتوں کو انفرادی مصلحتوں پر عموماً ترجیح دی ہے۔ یہاں سے ہمیں مسئلہ پر غور و فکر کا راستہ ملتا ہے۔ ہمیں اسلام ہی کی رہنمائی میں منزل تک پہونچنا ہے۔ مگر اس کے انفرادی احکام پر قیاس کر کے چار کروڑ افراد کے اجتماعی مسائل کا حل تلاش کرنا بہت سخت غلطی ہوگی، صحیح طرز فکر یہ ہے کہ مسئلہ پر اجتماعی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے۔ اور وہ نقطۂ نظر اسلامی ہو، ہماری دائمی و ابدی شریعت مقدسہ بہت آسانی کے ساتھ ہمیں منزل مقصود تک پہونچا دے گی۔

مسلمانوں کی پوزیشن

بات اس وقت تک صاف نہیں ہو سکتی جب تک ہم ہند میں مسلمانوں کی صحیح پوزیشن نہ سمجھ لیں، آئندہ سطروں میں اس کا مختصر تذکرہ ملاحظہ فرمائیے۔ انگریزی دور میں اگرچہ تعداد کے لحاظ سے مسلمان اقلیت ہی میں تھے مگر اکثریت کے ساتھ مساویانہ حیثیت رکھتے تھے۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔

(۱) اقتدار سے محرومی کے لحاظ سے اقلیت و اکثریت دونوں میں یکسانیت تھی، حکومت ایک تیسری طاقت کے ہاتھ میں تھی جو دونوں کے لیے اجنبی تھی۔

(۲) نظام حکومت جمہوری نہیں تھا، بلکہ باوجودیکہ آخری دور میں حکومت میں جمہوریت کا رنگ پیدا ہو گیا تھا آخری فیصلہ انگریزوں ہی کے اختیار میں تھا جو ہندوستان کی رائے عامہ کا پابند نہ تھا۔

ان دو باتوں نے مسلمانوں کو اس بات کا عادی بنا دیا کہ وہ اکثریت کے ساتھ مساویانہ حیثیت سے رہے اور اسے اپنی عددی کمزوری کا کوئی معتدبہ احساس کبھی نہیں ہوا جس میدان میں وہ اکثریت کا مقابلہ کرتا تھا اس میں اپنی ذہنی برتری و قابلیت کو ثابت کر کے دکھا دیتا تھا، بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ جہاں

مسلمان اقلیت میں تھا وہاں ذہنی و علمی لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ اور بہتر تھا۔ یو، پی، بہار، مدراس کے مسلمان بحیثیت مجموعی دماغی و فکری اعتبار سے پنجاب، سرحد، بلوچستان، سندھ اور بنگال کے مسلمانوں سے بحیثیت مجموعی بدرجہا بلند تھے۔ جس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ ان مقامات کے مسلمان اپنی فکری، و ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے اکثریت کے برابر ہی نہیں بلکہ اس سے کچھ برتر ہیں کہ باوجود تعداد اور وسائل کی قلت کے بسا اوقات ان سے بازی لے جاتے تھے اور مساوات تو بہرحال باقی رہتی تھی۔

۱۹۴۷ء کے بعد

افسوس ہو کہ ہماری داستان آزادی کی سرخی لاکھوں انسانوں کے خون سے تحریر کی گئی ہو۔ اس کے صفحہ اول کی سیاہی لاکھوں یتیموں، ہزاروں بیواؤں اور کروڑوں سوگواروں کی آہوں سے تیار کی گئی ہو۔ آسماں راحق بود گر خوں ببارد بر زمیں، سیاسی حیثیت کا بدلنا اور اس ہولناک طریقہ سے بدلنا ایسی چیز نہیں ہو جو کسی قوم پر اثر انداز نہ ہو، خصوصاً ایسی حالت میں کہ یہ انقلاب یکایک ہو گیا اور یہ قیامت خیز واقعات بالکل اچانک پیش آئے۔ یہ صحیح ہو کہ بعض مبصروں کو واقعات کا کسی درجہ میں اندازہ تھا، مگر وہ شاذ و نادر تھے۔ بحیثیت مجموعی مسلمان قوم پر یہ مصائب کا پہاڑ اچانک ہی ٹوٹا۔

ان اسباب نے مسلمانوں پر بہت ہی مایوس کن اور ہمت شکن اثر ڈالا۔ واقعات کے پیش نظر وہ اکثریت کی طرف سے مایوس ہو گئے تو ان پر کوئی الزام نہیں عائد کیا جا سکتا۔ انھوں نے اگر اس وقت پاکستان کو پناہ گاہ سمجھ کر ترک وطن کا اقدام کیا تو کوئی جرم نہیں کیا، ان کے اس رویہ کی ذمہ داری درحقیقت اکثریت پر عائد ہوتی ہو، اگر یہی تقسیم باہمی تعاون اور امن و امان کے ساتھ ہوئی ہوتی تو مسلمانوں کے جتنے افراد نے پاکستان کی راہ لی ہو شاید ان میں سے ۲ فیصدی بھی اپنا وطن نہ چھوڑتے۔ ان کی ہمت بلند رہتی، اور ان کے عزائم قوی رہتے۔ اکثریت کے ساتھ ان کا شائستہ اور دوستانہ مقابلہ جاری رہتا جو مجموعی حیثیت سے پورے ملک کے لیے مفید ہوتا، ایسے مقابلوں سے صلاحیتوں کے چھپے ہوئے خزانے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اور ملک کی عام ترقی کی رفتار بہت تیز کر دیتے ہیں۔

لیکن "ہوتا" کی بحث ہی فضول ہو۔ اب تو "کیا ہوا" کو بھی چھوڑ کر "کیا ہو رہا ہو" کو دیکھنا چاہیے اور اس کی روشنی میں دیکھنا چاہیے کہ ہمارے لیے شریعت اسلامیہ کیا راہ عمل مقرر کرتی ہو؟ البتہ مندرجہ بالا

پس منظر کو سامنے رکھنا حالات کے سمجھنے میں معاون ہوگا۔

اس وقت مسلمانوں کی پوزیشن کو مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) نظام حکومت جمہوری ہونے کی وجہ سے سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کو اکثریت کے ساتھ مساویانہ حیثیت نہیں حاصل رہی۔

(۲) نظم حکومت میں ان کا دخل دستوری اعتبار سے تو خاصا ہے مگر عملی حیثیت سے برائے نام ہے اور جو ہے بھی اسے اکثریت جب وقت چاہے غیر مؤثر بنا سکتی ہے۔

(۳) اس ملک کی بدنصیبی یہ ہے کہ اس کی اکثریت میں نہ وہ وسعت قلب ہے جو ہونا چاہیے اور جو صرف اقلیتوں ہی کے لیے نہیں بلکہ خود اکثریت کے لیے بھی مفید، بلکہ ملک کی عام ترقی کے لیے ضروری ہے۔ اور نہ وہ خودداری و خوداعتمادی ہے جو اتنی بڑی اکثریت رکھنے والی قوم کے لیے لازم اور اس کے وقار کے مناسب ہے۔

(۴) حکومت اور عوام کی دوئی ختم ہو چکی ہے۔ اب حکومت کی طاقت کا اصل سرچشمہ فوج اور پولیس نہیں ہے، بلکہ عوام الناس ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ تخت حکومت پر اکثریت قابض ہے۔

(۵) اکثریت اور حکومت کی اس وحدت سے جو ماحول تیار ہوا ہے وہ سراسر اسلامی روح کے منافی ہے۔ تعلیم گاہیں ہوں یا بازار، دفاتر ہوں یا تفریح گاہیں، دوکانیں ہوں یا کارخانے ہر جگہ اکثریت کے مذہب کا رنگ نمایاں ہے۔ اور اس رنگ کے اترنے کا بظاہر حال کوئی امکان نہیں نظر آتا۔

(۶) مسلمانوں کو اس حد تک مذہبی آزادی حاصل ہے جہاں تک وہ ملک کے کسی دوسرے فرقہ خصوصاً اکثریت کے جذبات سے متصادم نہ ہو۔ اور یہ بھی انفرادی زندگی تک محدود ہے۔ اجتماعی زندگی کا اکثر و اغلب بلکہ قریباً کل حصہ اس سے محروم ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ کوئی حکومت جو اقلیت کی ہم مذہب نہ ہو اس کی اجتماعی زندگی کو کلیتہً آزاد نہیں رکھ سکتی۔

ہمارا اصل مسئلہ

حالات کی یہ چھوٹی سی تصویر ہے جسے دیکھنے سے ہمیں معلوم ہوجاتا ہے کہ مشکلات کے تنوع کے باوجود درحقیقت مسلمانوں کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے ہمارے سامنے کوئی مشکل نہیں ہے۔ جو کشمکش ہے وہ بحیثیت مسلمان ہے۔ اگر خدانخواستہ اپنی اس حیثیت کو ہم نظر انداز کر دیں تو ہمارا کوئی مخصوص مسئلہ نہیں باقی رہ جاتا۔ اصل شے یہ ہے کہ ہم ان

حالات اور اس ماحول میں اپنے دین کا تحفظ کس طرح کریں؟ اور شریعت کے مطابق زندگی گزارنا چاہیں تو کیسے گزاریں؟

لیکن اس سوال کے سامنے آتے ہی بہت سے مسائل ہمارے سامنے آجاتے ہیں جو اس مسئلہ سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً تعلیم کے بارے میں ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہیے؟ معاشی مسائل کو کس طرح حل کرنا چاہیے؟ سیاسی طرز عمل کیا ہونا چاہیے؟ یہ تین مثالیں میں نے قصداً اس لیے منتخب کی ہیں کہ یہ اہم ترین مسائل ہیں جو اس وقت ہمیں درپیش ہیں۔ ان کا بہت گہرا اثر ہمارے دینی مسئلہ پر پڑتا ہے۔ اور انھیں اس کے ساتھ بہت قوی اور ناقابل شکست ربط حاصل ہے اس لیے اس وقت ہم انھیں کو موضوع بحث بناتے ہیں۔

ہجرت کا مسئلہ یہ بات پیش نظر رکھنا چاہیے کہ مسلمانان ہند کے لیے ترک وطن اور ہجرت کا مسئلہ بالکل خارج از بحث ہے۔ انفرادی حیثیت دوسری ہے، ورنہ اجتماعی حیثیت سے کروڑوں افراد کا ترک وطن نہ تو ممکن ہے اور نہ شرعاً کسی درجہ میں واجب، ہماری الجھی ہوئی ڈور کا سرا یہ ہے کہ ہم ہند میں رہنے کا عزم بالجزم کرلیں۔ یہ میں احتیاطاً عرض کر رہا ہوں، ورنہ مجھے یقین ہے کہ بحیثیت مجموعی مسلمان یہ عزم عرصہ سے کر چکے ہیں۔

عزم ثبات و بقا مشکلوں کے حل کی جانب پہلا قدم یہ ہے کہ ہم اسلام پر ثابت قدم رہنے اور بحیثیت مسلمان زندہ اور باقی رہنے کا عزم بالجزم کرلیں۔ ہم فیصلہ کرلیں کہ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں ہمیں اسلام پر ثابت قدم رہنا ہے۔ اور بحیثیت امت مسلمہ اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کے زندہ اور باقی رہنا ہے۔ جب تک ہمارے اندر یہ عزم نہ ہوگا ہمارا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ اس کی پختگی حالات کو بدل سکتی ہے، لیکن اس کی بنیاد حالات پر نہ ہونا چاہیے۔ نہ ان کی تبدیلی کا اس پر کوئی اثر ہونا چاہیے۔ اسے ہمارے ایمان کے ساتھ مربوط ہونا چاہیے۔ اور اس کی بنا قادر مطلق جل شانہ کے بھروسہ پر قائم اور اس کے احکام کے ماتحت ہونی چاہیے۔ حالات مایوس کن ہوں، مگر ہم پُر امید رہیں، حالات پر امید ہوں مگر ہم خیالی تمناؤں اور امیدوں کے جال میں نہ پھنسیں۔ اس عزم ایمانی کو اپنے طریق کار کی روح بنانا چاہیے۔

اولین مقصد اس عزم کا فطری تقاضہ یہ ہے کہ ہمارا اولیں مقصود زندگی اپنے دین کی حفاظت

ہو۔ دوسرے معاشی یا سیاسی مقاصد اس مرکز و محور کے گرد گردش کریں اور اسی کے تابع اور خادم ہوں۔
عرض کر چکا ہوں کہ ہمارا مخصوص مسئلہ درحقیقت صرف دینی نوعیت کا ہے۔ اگر اس سے قطع نظر کریں تو ہمارا کوئی مخصوص مسئلہ ہی نہیں رہ جاتا۔

اسوۂ یوسفی ازلی و ابدی ہدایت نامہ یعنی قرآن مجید اسوۂ یوسفی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی شکل میں ہماری رہنمائی فرما رہا ہے۔ ہمارے حالات بہت کچھ ان کے حالات سے مشابہت رکھتے ہیں اور بالکل بجا ہوگا، اگر ہم قیاس کی امداد سے ان آیات سے اپنے لیے احکام معلوم کریں۔

دعوت و تعلیم قرآن مجید کا بیان ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام قید و بند کے مصائب میں بھی مبتلا رہے اور تختِ حکومت پر بھی متمکن ہوئے، مگر دونوں حالات میں جو چیز کبھی اُن کی نظر مبارک سے اوجھل نہیں ہوئی وہ دین اسلام کی دعوت اور اس کی تعلیم تھی۔ اسی نمونہ پر عمل کرکے ہم بھی اپنی کشتی کو طوفانِ ضلالت سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ ہمارا مزاج داعیانہ ہونا چاہیے اور دعوتِ دین کو ہماری زندگی کا جزو نہیں بلکہ پوری زندگی بن جانا چاہیے۔

ابتدائی دینی تعلیم کی اشاعت ہمارا اہم ترین فریضہ اور ہماری بقاءِ دینی کے لیے انتہائی ضروری جزو ہے۔ کثرت سے مکاتب و مدارس کا قائم کرنا لازم و واجب ہے، لیکن اتنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ پوری کوشش اس بات کی بھی ہونا چاہیے کہ ہمارا گھر دینیات کا ابتدائی مدرسہ بن جائے اور بچہ ضروری عقائد و اعمال سے گھر ہی میں واقف ہو جائے۔

اختصار مطلوب ہے اس لیے اس کی مزید تفصیل کو نظر انداز کرکے تعلیم کے بارے میں دو ضروری باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) دینی تعلیم کے لیے اس وقت ابتدائی مکاتب کی سخت حاجت ہے۔ ان کی تعداد میں جس قدر بھی اضافہ کیا جائے کم ہے۔ لیکن عربی مدارس قائم کرنے کا شوق اب میرے خیال میں مرض کی حد تک پہونچ چکا ہے۔ پورے ہندوستان میں عربی کے دو چار چوٹی کے مدارس بہت کافی ہیں، قریہ بقریہ ان کا قیام ضرورت سے زائد ہونے کے علاوہ غیر مفید بلکہ مفید عربی مدارس کے لیے مضر ہے۔ یہ بے ثمر پودے باثمر درختوں کی غذا چوس کر پھلوں کی تعداد کم کر دیتے ہیں اور ان کی شادابی کو نقصان پہونچاتے ہیں۔

(۲) دنیاوی تعلیم کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے۔ بزرگوں کے ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ موجودہ حالات

ہیں مسلمانوں کے دینی تحفظ کے لیے لازم ہو کہ ان کے بچے اسکول اور کالج کی صورت نہ دیکھیں۔ ان کے لیے صرف دو راستے ہیں۔ پہلا یہ ہو کہ ابتدائی دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کوئی دستکاری سیکھ لیں۔ یا سرمایہ ہو تو کوئی تجارت شروع کر دیں۔ عالی ہمتوں کے لیے راستہ اعلیٰ دینی تعلیم ہو۔ معاش کے بارے میں دونوں کے لیے ایک ہی طریقہ ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ حضرات جدید تعلیم کے جن مضر اور ایمان سوز اثرات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ انھیں سامنے رکھنے کے بعد ہر دینی حس رکھنے والا شخص ان اداروں کو دیکھ کر الاماں والحذر کہے گا۔ ان اثرات ونتائج کو دائمی اور کلّی تو نہیں کہا جا سکتا ہو۔ لیکن ان کی کثرت کا انکار نا ممکن ہو۔ بیشک طلبہ کی عملی زندگی پر تو ان مدارس کے یہ مضر اثرات تقریباً کلّی ہیں، لیکن ایمان تک ان کی رسائی شاید اکثری بھی نہیں کہی جا سکتی، ہاں کثرت کا انکار نہیں ہو سکتا۔

مسئلہ پر ذرا اجتماعی نقطۂ نظر سے غور فرمائیے کہ اگر مسلم قوم بحیثیت مجموعی نئے علوم وفنون سے بالکل بے بہرہ رہے تو نتیجہ کیا ہوگا۔ فرض کیجئے کہ ہندی مسلمانوں میں نہ کوئی ریاضی داں اور انجینیر ہو، نہ کوئی ڈاکٹر، نہ کوئی سائنٹسٹ، موجودہ معاشی مسائل اور نظریات کے سمجھنے والے بھی مفقود ہوں، یورپ کی کسی علمی زبان کا جاننے والا نایاب ہو۔ موجودہ نظم ونسق حکومت اور سیاسی تنظیمات سے وہ بالکل بے بہرہ ہوں تو انجام کیا ہوگا؟ پچھلے تجربات کی روشنی میں ہم اسے بہت آسانی کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں۔ مشرق کی بے راہ روی کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہو کہ وہ یورپ کی صنعتی اور سائنسی ترقی سے مرعوب ہو۔ اخلاقیات میں یورپ وامریکا ہمارے سامنے طفل مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن صرف ان کی سائنسی اور صنعتی ترقی نے ہمارے نوجوانوں کے عمل ہی کو نہیں بلکہ اعتقاد وایمان کو بھی متاثر کیا ہے۔ ایک بدیہی بات ہو جس کا انکار نا ممکن ہے۔

اب ایک طرف مسلم قوم کی وہ حالت رکھئے جس کا نقشہ اوپر کھینچا گیا ہو، دوسری طرف اکثریت کی علمی ترقیاں رکھیئے۔ نتیجہ خود بخود سامنے آجائے گا۔ جو قوم سات سمندر پار رہنے والی قوموں سے اس درجہ متاثر ہو سکتی ہے کہ صرف بدعملی ہی نہیں بلکہ الحاد اور دین سے بغاوت پر آمادہ ہو جائے۔ کیا وہ اس قوم سے متاثر نہ ہوگی۔ جو پورے ماحول پر چھائی ہوئی ہو۔ اور اس کے ساتھ ہمہ وقتی ربط وتعلق رکھتی ہو؟ اگر مسلمانان ہند نے جدید علوم وفنون خصوصاً سائنس میں اجتماعی

اعتبار سے ابھی خاصی ترقی نہ کی تو کچھ عرصہ میں ان کی کیفیت بالکل اچھوتوں کی ایسی ہوجائے گی اور سرزمین ہند پرانے اچھوتوں کو پستی سے نکال کر ان کا قائم مقام ان نئے اچھوتوں کو بنا دے گی۔ یورپ سے تاثر کا نتیجہ تو انفرادی گمراہیوں کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ کیونکہ یہاں کا ماحول مغربی نہ تھا، لیکن اکثریت سے تاثر اجتماعی گمراہی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اس لیے کہ ماحول کی تاثیر یورپ کی تاثیر سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔

موجودہ تعلیم دلانے سے جس خطرے کا تذکرہ ابتدا بحث میں کیا گیا ہے وہ اپنی جگہ صحیح ہے۔ مگر تعلیم سے محرومی کی صورت میں جس خطرے کا ہم نے اظہار کیا ہے وہ عقلاً و شرعاً ہر طرح پہلے خطرے سے کہیں زیادہ اہم اور قابل احتراز ہے۔ پہلا خطرہ انفرادی ہے اور یہ اجتماعی۔ اس کا اثر کچھ افراد پر پڑے گا اور اس کا پوری قوم پر، پہلے سے حفاظت ممکن ہے۔ دوسرے سے حفاظت بہت مشکل بلکہ قریب بہ محال ہے۔ پہلے کے ساتھ کچھ فوائد بھی ہیں لیکن دوسرے میں فائدہ کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔ بلکہ اس بے تعلقی کی وجہ سے جو معاشی، سیاسی اور معاشرتی شکلیں درپیش ہوں گی ان کا تذکرہ میں نے نہیں کیا ہے۔

یہاں تو معاملہ اقلیت کا ہے، تجربہ تو بتاتا ہے کہ اگر اکثریت علمی و ذہنی اعتبار سے پست اور ضروریات زمانہ سے ناواقف ہو تو وہ عملاً اقلیت کی محکوم ہو جاتی ہے۔ بنگال اور سندھ کے حالات پر غور کر لیجئے، غیر منقسم بنگال میں مسلمان اکثریت میں تھے مگر علمی و ذہنی اعتبار سے ہندوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، نتیجہ سب کا دیکھا ہوا ہے کہ اقلیت مکمل طریقہ سے حکمران تھی۔ اور اکثریت بے دست و پا۔ سندھ میں بھی یہی کیفیت تھی کہ مسلمان غالب اکثریت رکھنے کے باوجود اقلیت سے اس درجہ مغلوب تھے کہ دونوں میں حاکم و محکوم کا تعلق کہا جا سکتا تھا۔ اقلیت حاکم اور اکثریت مغلوب تھی۔

ان حالات کے پیش نظر ہر صاحب نظر کا فیصلہ یہی ہوگا کہ مسلمانوں کو جدید علوم و فنون حاصل کرنا لازم ہے۔ خصوصاً اسلیے کہ ان میں سے بعض علوم کی تحصیل تو شرعاً واجب علی الکفایہ ہے۔ علوم معالجہ کی تحصیل کے وجوب علی الکفایہ کا ذکر تو صراحتہً مل جائے گا۔ بعض کے لیے قیاس یا استنباط کی حاجت ہوگی۔ اس تعلیم سے جن نقصانات کا اندیشہ ہے۔ ان کا تدارک کرنا بھی واجب ہے۔ اولاد کو دین سے واقف بنانا اور ان کی اچھی تربیت کرنا ان سے بچنے کے لیے صحیح تدبیر ہے۔ خلاصہ یہ کہ بد دینی کے خلاف طلبہ میں قوت مقاومت پیدا کر دینا صحیح طریق کار ہے۔ انھیں گوشہ نشین بنا کر اجتماعی ہلاکت کا خطرہ مول لینا نہ عقلاً روا ہے

نہ شرعاً۔

اچھی طرح تو یاد نہیں مگر غالباً مارچ ۶۵ء کے معارف میں میں نے مسلمانوں کی جدید تعلیم کا ایک خاکہ پیش کیا تھا، اس کا خلاصہ بھی یہاں ذکر کروں تو بہت طوالت ہو گی۔ لیکن اتنی بات کا اعادہ ضروری ہے کہ موجودہ حالات میں خصوصیت کے ساتھ یہ لازم ہے کہ ہماری نئی نسلوں کی تعلیم ایک منصوبہ کے ماتحت ہو، اور اس شعبۂ زندگی سے انفرادیت کو ختم کر کے اس کی بنیاد اجتماعی اصول و ضروریات پر رکھی جائے۔

تعلیم جدید کی طرف توجہ کے متعلق جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ اثبات مدعیٰ کے لیے بالکل کافی ہے۔ لیکن مزید تسکین اس سے ہوتی ہے کہ اس طرف قرآن مجید کا اشارہ بھی مل جاتا ہے۔ اسوۂ یوسفی (علیہ السلام) یہاں بھی رہنمائی کر رہا ہے۔ ممدوح الشان ملک کے غیر مسلم حکمراں سے فرماتے ہیں۔

قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ۔ (یوسف)	مجھے مملکت کے خزائن پر حاکم بنا دیجیے بیشک میں حفاظت کرنے والا، اور صاحب علم ہوں۔

یہ "علیم" کے لفظ سے جس علم کا دعویٰ فرمایا گیا ہے۔ اسے علم بالآخرہ نہیں کہہ سکتے۔ مطالبہ کی نوعیت صاف بتا رہی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام مالیات و معاشیات میں اپنی اعلیٰ بصیرت و قابلیت کا اظہار فرما رہے ہیں۔ یہ علم "دین کے لیے" تو ہو سکتا ہے، مگر خود "علم دین" تو نہیں کہا جا سکتا۔ یہی علم ان کے لیے "تمکین فی الارض" کا ظاہری ذریعہ بنا۔ کیا اس سے یہ اشارہ نہیں نکلتا کہ کسی غیر اسلامی ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں "تمکین فی الارض حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اکثریت کے دل پر اپنی علمی و ذہنی فوقیت کا سکہ بٹھا دیا جائے۔ یہ طریقہ نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ ایسی صحیح تدبیر ہے جس پر ایک جلیل القدر نبی نے عمل فرمایا اور کامیابی حاصل فرمائی۔

(باقی)

احیاء دین کا جذبہ رکھنے والوں کیلئے ایک لمحۂ فکریہ

چند دقیق اصولی اشارات

از صوفی نذیر احمد صاحب کاشمیری

حیاتِ انسانی، اخلاقی و روحانی و طبعی قوتوں کا اس درجہ جامع امتزاج ہے کہ جس کی نظیر سلسلۂ تخلیق میں کہیں نہیں ملتی۔ گزشتہ سالوں میں (غالباً ۵۵ء یا ۵۶ء میں) حیدرآباد میں ہونے والی ایک سائنس کانفرنس میں مسٹر ہکسلے نے اس حقیقت کا مفصل اقرار کیا تھا۔ اسکے علاوہ بھی تمام وہ دہریے سائنٹسٹ جو بضد ہیں کہ وہ حیات انسانی کے سارے وظائف و اعمال کی تشریح میکنیائی، نباتی یا حیوانی انداز پر کرسکتے ہیں، کسی نہ کسی موقع پر مجبور ہوگئے ہیں کہ وہ انسان کے اشرف و اکرم مخلوقات ہونے کا اقرار کریں۔ لیکن اپنی دہریت کے تعصب میں وہ اس اجمالی اعترافِ حق کی تشریح مزید کی طرف نہیں جاتے۔ ان کے نظریوں کی تفصیلی تنقید کو نظر انداز کرتے ہوئے اتنی بات کا اعلان کرنا سلسلۂ تخلیق کی ایک صداقت عظیم ہے کہ انسان کا یہ احساس کہ وہ سب سے پہلے انسان ہے اور بعد میں کچھ اور، انکی تمام میکنیائی و نباتی و حیوانی تشریح کے کلی بطلان پر مشتمل ہے۔ اور یہ احساس، حیات انسانی کا سب سے اصولی و مرکزی و ابتدائی احساس ہے۔ اُس کا باقی تمام احساس و شعور صرف اسی انسانی احساس انانیت پر مبنی ہے۔ انسان، کائنات اور اس کے اندر کی تمام اشیاء کی جو جو بھی قدر و قیمت معین کرتا ہے اس کا تعلق اساسی طور پر صرف اسی انسانی احساس اَنا کے مقام سے وابستہ ہے۔ اگر یہ مقام معین نہیں تو اس کا ہر محاکمہ باطل ہے

(۲) آنا کا تجزیہ صدر کی چند واضح سطور کے بعد یہ بات ایک بداہتِ ثانیہ کے طور پر کہی جاسکتی ہے کہ سلسلۂ حیات کی سب کڑیوں کے مقابل حیات انسانی نام ہے انسان کے

اخلاقی و روحانی شعور و کردار کا۔ اس شعور و کردار کے علاوہ باقی محرکات و وظائف و اعمال میں انسان کہیں بلاشک حیوان سے، کہیں نباتات سے اور کہیں مشین سے مشابہت رکھتا ہے۔ مگر یہ زعم علی الاطلاق باطل ہے کہ ان مشابہتوں سے اس کا نوعی موقف معین کیا جا سکتا ہے یا ان کے ذریعے اس کی نوعی تاریخ کی تشریح کی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ تمام انواع مخلوقات کی تاریخ صرف ان کے نوعی امتیازات سے متعین ہو سکتی ہے۔ تمام انواع کی مابہ الاشتراک باتوں سے کسی بھی نوع کی حقیقت یا تاریخ متعین نہیں کی جا سکتی۔ ان مابہ الاشتراک باتوں پر بنیادی زور دینے اور نوعی خصوصیتوں کو نظر انداز کرنے سے انسان کو بتدریج ہلاکت کی وادی میں پہنچایا جا سکتا ہے اس طریق سے اسکی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ گزشتہ دو سو برس سے دہریت انسان کو اسی وادی الہالکین کی طرف لے جا رہی ہے۔ کمیونزم اسی دعوت الی الہلاکت کی سب سے خطرناک صورت ہے۔

(۴) کمیونزم کا خلاصہ

(الف) حیاتِ حیوانی کی طرح حیات انسانی کا نوعی نصب العین بھی صرف روٹی اور صنفی تسکین کا سوال ہے۔ لہٰذا مذہب و اخلاق و روحانیت کے نام پر انسانی نصب العین کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے یا کہا جا رہا ہے، وہ یا تو مفاد پرست طبقات کی بے ایمانی ہے یا انسانی اوہام پرستی ہے، جسے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی ضرورت ہے۔

(ب) اس نصب العین کے حصول کا سب سے صحیح، سب سے جامع اور ساتھ ہی سب سے آسان طریقہ حیوانی تنازع للبقا کے انداز پر طبقاتی نفرت کو تیز سے تیز کرتے ہوئے طبقاتی جنگ کی صورت پیدا کرنا ہے۔ یہی طبقاتی نفرت پر مبنی طبقاتی جنگ اس نصب العین کے حصول کا سب سے صحیح ذریعہ ہے۔ لہٰذا اس مقام پر بھی (یعنی ذرائع میں) بھی اخلاقی و غیر اخلاقی، روحانی و غیر روحانی اور بالآخر جائز و ناجائز کا سوال پیدا کرنا قدیم مفاد پرست طبقات کی بے ایمانی و دغابازی ہے یا اوہام پرستی ہے جسے بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دینے کی ضرورت ہے۔

(ج) نصب العین اور اسکے حصول کے ذرائع کے علاوہ انسان کے تمام تہذیبی و ثقافتی مظاہر کی تشریح بھی بخوبی اسی مادی نصب العین کی روشنی میں ٹھیک حیوانی جبلت کے

ماتحت کی جا سکتی ہے۔ یہاں بھی تاریخ انسانی کے لئے کسی مخصوص اخلاقی و روحانی بنیاد کو تسلیم کرنا محض فریب کاری، دھوکہ دہی یا اوہام پرستی ہے۔ جو مفاد پرست طبقات کی شرارت ہے۔

ان سطور میں نہ صرف کمیونزم بلکہ موجودہ لادین مغربی تمدن کی پوری پوری تلخیص آگئی ہے۔ چونکہ کمیونزم موجودہ مغربی مادیت کی نہایت درجہ منطقیانہ شکل ہے، جو مادی تصور تخلیق کو اپنے منطقیانہ نتائج کے آخری حدود تک پوری دلیری سے لے جانا چاہتا ہے، لہٰذا میں نے اسی کو اس پیراگراف کا ضمنی عنوان بنایا ہے۔ کمیونزم ہر جبر و ظلم سے اس تصور کو عالمگیر کرنے کی نہایت واضح شکل ہے اور لادین مغربی جمہوریت اسکی نہایت اُلجھی ہوئی شکل ہے۔

(۴) احیائے دین کا نقطۂ آغاز

(الف) اس لادین مادیت کے مقابل دین کے احیار کی عالمگیر شکل ہرگز کسی صورت یہ نہیں ہوسکتی کہ مذہب کے معاشرتی و معاشی و سیاسی پہلوؤں کو اصولی اہمیت دیکر انھیں کو ایک عام تنظیم کی بنیاد بنایا جائے۔ موجودہ حالات میں یہ صورت محض خلط بحث، تضیع اوقات اور بالآخر ناکامی پر منتج ہوگی۔ اس لادین مادیت کے مقابل احیائے دین کی صحیح صورت اور تحریک صرف یہ ہوسکتی ہے کہ دین کے اساسی ایمان کو اور اسی کے ذریعہ بنیادی اخلاقِ مذہبی کو غایت الغایات درجے تک بیدار کرتے ہوئے نوع انسانی کو اس باطل تعبیرِ تاریخ کے مقابل کھڑا کیا جائے۔

یہ طب کس درجہ مضر ہوگی کہ دنیا میں تو طاعون کا مرض عالمگیر ہو رہا ہو اور خاندانی طبیبوں کا ایک گروہ کھڑا ہو جائے اور کالرے کے یا تپ دق کے انجکشن مخلوقات کو دینا شروع کردے اور جب کوئی معقول انسان اُنھیں اس پر ٹوکے تو اپنے عمل کے جواز میں یہ سند پیش کردیں کہ کبھی تمھارے ہمارے مشترک آبا کی کتابِ طب میں یہ نسخے بھی تو لکھے ہیں۔

(ب) بلا شبہ اگر کل تاریخ انسانی میں کوئی ایسا موڑ آجائے کہ حیات انسانی کے تمام مقاصد کے ساتھ ان کے مظاہر کی بھی باطنی تشریحات شروع کردی جائیں اور اس کائنات کے اندر بحیثیت خلیفۃ اللہ کے نوع انسانی کے جو فرائض ہیں انھیں نظر انداز کیا جانے لگے

تو اس باطنیت کی فضا کو درست کرنے کے لئے انسان کے جو معاشی و معاشرتی و سیاسی حقوق و فرائض ہیں، ان پر اصولاً متوجہ ہونا اور دوسروں کو متوجہ کرنا نہایت صحیح صورتِ اصلاح ہوگی۔ لیکن آج جب کہ کائنات کے ساتھ خود تاریخ انسانی کی ساری اخلاقی و روحانی معنویت کا کلی انکار کیا جا رہا ہے، ایسے لوگ کہ جو معاشرے کی سیاسی و معاشی تنظیم ہی کو اصلِ دین اور مرکز دین بتائیں، نہایت درجہ غلط کار، مضر اور گمراہ کن ہو سکتے ہیں۔ اس کے مقابل صحیح طریق کار صرف یہ ہے کہ تعلق باللہ کو اُجاگر سے اُجاگر کرتے ہوئے ایمان مجمل کو ایمان مفصل اور ایمان بالغیب کو شہودی ایمان جیسی پختہ صورت دی جائے۔

(۵) اصولی و فروعی مسائل میں فرق کی ضرورت

(الف) تمام انبیاء کی تعلیم اصولاً متحد رہی ہے۔ مگر معاشرتی و معاشی و سیاسی مسائل میں اُن میں غیر معمولی اختلاف رہا ہے۔ حقیقت میں انسانیت کے دین واحد کو ادیان مختلفہ بنانے کا سبب ہی اصولی مسائل اور فروعی مسائل میں عدم امتیاز اور اس عدم امتیاز کے باعث فروع کو اصل قرار دیکر انھیں مرکزی اہمیت دینا رہا ہے۔

(ب) اب یہ اُصولی مسائل کیا ہیں کہ جن کے اتحاد کی بناء پر تمام انبیاء کو دین واحد کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ معاشی مسائل ہرگز نہیں، یہ معاشرتی مسائل بھی نہیں نہ یہ سیاسی مسائل و قوانین ہیں۔ اس لئے کہ ان میں سے اکثر انبیاء کی تعلیم میں بہت بڑا فرق ہے۔ لہذا یہ مسائل تو صرف ذات و صفات باری پر، مقصودیتِ آخرت پر اور تمام مسلم الثبوت اخلاقی قدروں پر مشتمل ہیں۔ لہذا جسے دین کی اصلِ ثابت کو مضبوط کرنا ہو، اُسے اصولاً انھیں اساسوں کی تقویت و تربیت کرنا ہوتی ہے، جس کے بعد شاخ و برگ کا عمل بھی خود سے خود درست اور بار آور ہوتا جاتا ہے۔

(ج) یہ کس درجہ غیر فطری اور غیر اصولی طریق کار ہے کہ توحیدِ ذات و صفات باری میں سے ایک صفت "رب" کو یا ایک صفت حاکمیت کو لے لیا جائے اور اسے بھی ایک طرف نظریہ ربوبیت یا نظریۂ توحید کہہ کر محسوس البداہت حق کے بجائے منطقیانہ نظریے کے مقام پر لا چھوڑا جائے، دوسری طرف اسکے تقاضوں کو پوری امکانی تفصیل کی حدود تک منضبط

کرلیا جائے اور اس پر دین کی کلی تشریح کا لیبل لگا کر اُسے سوسائٹی کے سامنے رکھ دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ کُل دین ہے تو پھر اس کا کسی پہلو سے بھی انکار کرنے والے کیا ہوں گے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اہل کتاب کے حکم میں ہو سکتے ہیں۔ اس سے زائد ہونے کا کوئی بھی منطقیانہ امکان نہیں۔

(د) ایسی سب تشریحات کا ایک بنیادی نقص یہ بھی ہے کہ وہ ماضی کے فقیہانہ اختلافات میں کوئی کمی کرنے کے بجائے بیسیوں قسم کے نئے اختلافات پیدا کر رہی ہیں۔ ادھر یقین کی ساری اساس کو نظر انداز کرتی ہوئی ان کی اہمیت کو گھٹا رہی ہیں۔ لہذا اس لحاظ سے بھی یہ تشریحات ہر قسم کی اصولی افادیت سے خالی ہیں — ان کا ایک جزوی سا فائدہ یہ ضرور ہے کہ جو لوگ کچھ نہ کچھ دینی احساس رکھتے ہیں مگر موجودہ طوفان انگیز لامذہب حرکت کے مقابل ان کے اکھڑ جانے کا خطرہ ہے، ان کے لئے ایک عارضی حفاظت گاہ پیدا ہو جاتی ہے۔ کچھ نہ کچھ ذہنی تربیت بھی ان تشریحات سے ممکن ہے لیکن وہ موجودہ دور کے دینی و ایمانی انحطاط کا علاج ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتیں۔ اس کا علاج کامل روحانی تربیت کے ذریعے تمام مبادیات دین کو اس درجہ یقینی کر دینے سے ہی ہو سکتا ہے کہ جس کے مقابل یہ کفر ایک سراب محسوس ہونے لگے۔ اور یہ عمل ذہن و دماغ کا نہیں بلکہ قلب و روح کا ہے۔ اس کے لئے ضرورت قلبی و روحانی تربیت کی ہے نہ کہ ذہنی تسکین کی۔

اسلام کی جدید تعبیر و تشریح، اپنی انتہا میں

(از جناب ڈاکٹر احمد حسین کمال بھوپالی ـ مغربی پاکستان)

اس صدی کے اوائل میں دین سے متعلق جن فکری گمراہیوں کا آغاز ہوا، اُن میں سب سے بڑی گمراہی، عقلیت پرستی کا وہ رجحان تھا، جو انیسویں صدی کے یورپ سے زور و شور کے ساتھ اُٹھا، اور بعض مسلمان اہل قلم اُس سے شدید طور پر متاثر ہوئے ـ ان صاحبان تحریر نے کوشش کی کہ اسلام اور اُس کے معتقدات دینی کو کسی نہ کسی طرح عقلیت اور نام نہاد سائنس کے تابع کر دیا جائے ـ ہر چند کہ بعد میں عقلیت پرستی کا یہ طوفان اپنا اثر کھونے لگا۔ تاہم اس کی وجہ سے اسلام کی جدید تعبیر و تشریح کا ایک نیا اور گمراہ کن سلسلہ ضرور شروع ہو گیا جو کسی نہ کسی صورت میں اب تک جاری ہے اور دنیا کی ہر نئی بات، نئی تجویز اور نئے نظریہ پر اسلام کو چسپاں کرنے کی جسارت عام ہو گئی ـ چنانچہ سیاست و معیشت کا ہر وہ تصور اور تحریک، جو اس عہد میں پیدا ہوئی اسلام کو اس کے مطابق بنانے کی سعی و کوشش ضرور کی گئی اور بعض نکتہ رس دماغوں نے اسلام کے دعوت و ہدایت و رضائے الٰہی کے نصب العین تک کو ایک نظام حکومت سیاست یا نظریہ معیشت و عمرانیت بنا ڈالنے کی جدوجہد شروع کر دی، ابتداءً جب اس بارے میں انھیں ٹوکا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ تو محض وقت کی زبان میں اسلام کی تشریح و توضیح ہے حالانکہ اس قسم کی تشریح و توضیح سے، جن معنوی تحریفات کا اندیشہ تھا، اور جن کے مفاسد اب ظہور میں آنے لگے ہیں، انھیں ان جدید نقطہ ہائے نظر کے حاملین نے باوجود نشاندہی کے یکسر نظر انداز کیے رکھا ـ

نیتوں کا خلوص اور ارادوں کی معصومیت کسی غلط چیز کو صحیح نہیں بنا دیتی ـ یہ نیا ذہن جن غلط تصورات کے ساتھ اُبھرا ہے، اپنی دیانت و صداقت کے باوجود مسلمانوں کے لئے

ایک شدید فتنہ و آزمائش بن گیا ہے۔ ایک طرف اس ذہن کے یہ دعوے ہیں کہ وہ اسلام کا تنہا صحیح ترجمان ہے اور اُسکی تمام ترجد وجہد اقامت دین کی ہے اور زندگی کے ہر شعبہ اور ہر گوشہ میں اسلام کا نفوذ چاہتا ہے اور پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کی تعمیر کتاب اللہ پر کرنا اُس کا مقصود ہے، لیکن دوسری طرف جس گروہ بندانہ عصبیت کے ساتھ یہ ذہن اپنی اجتماعی تنظیم شروع کرتا ہے، وہ نہ صرف انسانیت کی ہی تقسیم کر ڈالتی ہے بلکہ مسلمانوں کو بھی دو متقابل گروہوں میں بانٹ دیتی ہے اور پھر یہ تقسیم رفتہ رفتہ مسلمانوں کے درمیان بھی حق و باطل کی تقسیم بن جاتی ہے۔ ساتھ ہی نیک و بد کی آویزش کو جس طرح یہ تعبیر کرتا ہے اُس سے دینی خلوص کے بجائے ذاتی اور گروہی عصبیت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور بسا اوقات شخصی اغراض، اسلامی مقاصد کے ساتھ اس طرح خلط ملط کر دیے جاتے ہیں کہ ان کے درمیان نہ صرف تمیز کرنا ہی مشکل ہو جاتی ہے، بلکہ انجام کار شخصی اغراض کی کامیابی پر ہی اسلامی مقاصد کی کامیابی منحصر کر دی جاتی ہے۔ پھر یہ کہ یہ ذہن اپنی پیش کردہ فکر کی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لئے، ماضی و حال کے تمام افکار کی بے رحمانہ تنقید کرتا ہے اور دوسروں کی آراء کے جانچنے کے لئے ایک ایسا محدود اور تنگ سانچہ بنا لیتا ہے جس کے اندر کسی دوسرے کی رائے کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی جب کہ اپنی آراء کی تبدیلیوں کے لئے اسی سانچے میں اتنی وسعتیں پیدا کر لی جاتی ہیں کہ ہر قسم کے تضادات بھی بیک وقت اُس میں سمو دیے جا سکیں۔ اس طرز عمل کے جواز کے لئے، حکمت عملی کا نام لیا جاتا ہے اور خدا اور رسول کی بخشی ہوئی بعض ایسی رخصتوں کو جو محض اضطراری اور انفرادی حالات کے لئے دی گئی تھیں، اختیاری اور اجتماعی صورتوں کے لئے دلیل بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔

کتاب و سنت، کے معیار کے علاوہ حکمت عملی کا یہ معیار جس کے لئے ضوابط و اصول کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی، اور جو تمام تر شخصی و ذاتی فکر و رجحان کا تابع ہے اور جس کے ذریعہ دین و دنیا کی ہر چیز کو اسلام و حق کے نام سے رد و قبول کیا جا سکتا ہے، اس دور کی ایسی عظیم غلط فکری ہے جس کی اندیشناکیاں دور دور تک سرایت کئے ہوئے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آج کی حکمت عملی کے تقاضے، کل کی حکمت عملی کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتے ہیں، حکمت عملی صد فی صد

ایک شخصی اور ذاتی چیز ہے اور ہر قسم کے طرز عمل کے لئے، اگر ایک شخص کی عقل زرخیز ہو، تو اسے دلیل جواز بنایا جا سکتا ہے۔

ہمیشہ ہی چھوٹی چھوٹی باتیں بڑے بڑے فتنوں کا سبب بنی ہیں، کتاب و سنت کے پہلو بہ پہلو جب کبھی کوئی دوسری بات کہی گئی وہ ابتدا میں بظاہر کتنی ہی غیر اہم اور حقیر معلوم ہوئی ہو آخر کار کتاب و سنت سے علیحدہ اپنی مستقل حیثیت اختیار کئے بغیر نہیں رہی اور بسا اوقات اس نے کتاب و سنت کو ہی اپنا تابع بنایا۔ اس خطرناک حقیقت کی طرف جب ایسے قائدین و مفکرین کی توجہ منعطف کرانے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ اور اُن کے متبعین بجائے ان باتوں کے متوقع خطرات محسوس کرنے، سمجھنے اور رجوع کر لینے کے، اپنے دوسرے ناقابل اعتراض اقوال و افکار کو سامنے لاکر جواب اور صفائی کی ایسی مہم شروع کر دیتے ہیں جس میں تدلیس، اخفاء اور مغالطوں کی آمیزش کے علاوہ ٹوکنے والوں پر انشاء پردازانہ گالیوں کی پیہم بوچھار ہوتی ہے تاکہ اصل حقیقت عوام کی نظروں سے مستور رہ جائے اور چونکہ ہر زمانے میں بعض وقتی اور ہنگامی مسائل کا زور ہوتا ہے۔ عوام و خواص کی بیشتر توجہ ان مسائل میں ہی اُلجھی رہتی ہے، اس لئے یہ حضرات بھی ان ہی مسائل پر اپنے زورِ فکر و بیان کی عمارت تعمیر کرتے ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اُن کی یہ خدمت اُنھیں ہر فکری و عملی لغزش سے غیر مسئول کر دے گی۔ حالانکہ اسکے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان ہی ہنگامی مسائل کے ہجوم و یورش میں خطاؤں اور لغزشوں کے امکانات بہت زیادہ اور قوی تر ہیں اور ایسے ہی حالات میں کتاب و سنت بہ طریق سلف کو مضبوطی سے پکڑے رہنا ضلالت و گمراہی سے بچے رہنے کا واحد ذریعہ ہے۔

اواخر خلافت راشدہ میں، جس گروہ نے، قرآن سے ماخوذ نعرہ "الحکم للہ" پر عامۃ المسلمین کے خلاف خروج کیا تھا، اُس نے اپنی فہم و فراست کے مطابق، غالباً نیک نیتی کے ساتھ ہی اس خروج اور نعرہ کو وقتی مسائل کا وقتی حل سمجھا تھا، لیکن اُس دور کی سب سے زیادہ مستند اور محترم ہستی نے اُن کے اس نعرہ کو مسترد کر دیا، حالانکہ آپ کو اُن کی حمایت بھی حاصل ہو سکتی تھی۔

"قرآن مخلوق" ہے کا نظریہ جو بظاہر محض ایک علمی اور بے ضرر نظریہ نظر آتا ہے اور جسے ایک ایسے گروہ نے پیش کیا تھا جو بزعم خود، وقت کی زبان اور علمی سطح کے مطابق قرآن اور

اسلام کی بہترین خدمات انجام دے رہا تھا اور دورِ حاضر کے متجددین تک کو جن کے افکار و استدلال سے گہری دلچسپی ہے اگر اُس کے خلاف اُس زمانہ کا سب سے بڑا گوشہ نشین زاہد متقشف لب کشائی نہ کرتا اور انھیں نہ ٹوکتا تو آج دین کے جو صحیح خد وخال ہمارے سامنے موجود ہیں خدا جانے تاویلات کے گورکھ دھندوں میں وہ اب تک کیا کیا بن چکے ہوتے۔ علیٰ ہذا القیاس ابتدائے اسلام سے سرسید احمد خاں مرحوم کے دورِ نیچریت اور مرزا غلام احمد صاحب کے دورِ تنبیت تک ایسے اصحابِ فہم و دانش کی ایک طویل فہرست تیار ہو سکتی ہے جن کی نیک نیتی اور جذبۂ خدمات ملی مسلّم، لیکن اُن کے فکری لغزشوں کے ایک معمولی اقدام کی حوصلہ افزائی نے امت مسلمہ کے مستقبل پر نہایت اندوہناک اثر ڈالا۔ وہ گروہ مقدسین و زاہدان متقشف جنکی مخالفت کو اول اول ہمیشہ ریاکارانہ مذہبیت سے تعبیر کیا گیا۔ باآخر مستقبل کے مؤرخ نے اُن کے ہی "فرسودہ" فتووں پر مہر تصدیق ثبت کی۔

بے لگام آزادئ افکار کے اس دور میں، آزادانہ انشا پردازی ہی شہرت و عظمت کا واحد ذریعہ ہے، چنانچہ انشاء پردازوں کا ایک گروہ جدید اسلام کو بھی اپنی قلموں کی جولانگاہ بنائے ہوئے ہے، حتیٰ کہ آج کے جدید افسانوی ادیب نے بھی اُسے اپنی قلم کاریوں کا تختۂ مشق بنا رکھا ہے۔ حالانکہ جو لوگ ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ دینی حقائق کے اظہار کے لئے شعر و افسانہ کا قلم ناموزوں ہی نہیں بلکہ گمراہ کن بھی ہو اور اسی لئے وحی الٰہی نے انبیاء و رسل کے شاعر و داستاں گو ہونے سے بار بار او ربشدت انکار کیا ہے۔

آج کے مسلمانوں میں، اسلام سے بغاوت کا جو ذہن جگہ جگہ پھیلا ہوا ہے غور کیجئے تو اس کا آغاز عقلیت پرستی کے رجحان سے ہی ہوا ہے۔ یہ رجحان ابتداء میں نہایت معصوم و بے ضرر نظر آتا ہے۔ اس کا پہلا مقصد اسلام اور جدید دور کے نظریات و تقاضوں میں موافقت پیدا کرنا تھا، موافقت پیدا کرنے کی یہ کوششیں کبھی جدید معلومات کو دین پر منطبق کرنے اور کبھی دین کو جدید معلومات پر منطبق کرنے میں صرف ہوتی رہیں اور رفتہ رفتہ وقت کے افکار سے اذہان مرعوب ہوتے رہے، دین کے اصولوں میں جدت کا رنگ بھر بغیر دین کی خدمت کا تصور دقیانوسی نظر آنے لگا۔ چنانچہ شارحین اسلام نے اپنی ہمہ دانی سے

زعم میں اسلام کو جدید نظریات و افکار کا ملغوبہ بنا ڈالا۔ ایک ایسا دین جو خالص ایمان و عمل کا دستور العمل تھا، جس پر وقت و ماحول کی کسی حدبندی کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا اور جس کی قوت فعالیہ انسانی زندگی کے حال کو آخرت کے مستقبل سے وابستہ کر دینے والی تھی، وہ ان نئے اسلام کے خیر خواہوں کی بدولت کبھی محض ایک نظام سیاسی کی صورت میں نظر آتا ہے کبھی ایک نظام عسکری کی شکل میں، کبھی نظام معاشی کے رنگ میں تو کبھی نظام اقتصادی کے لباس میں اور بعضوں نے اسے محض ایک نظام حکمرانی کا خاکہ بنا کر پیش کر رکھا ہے اور اب ایک اور نیا ذہن اس دعوے کے ساتھ نمودار ہو رہا ہے کہ اسلام بھی موجودہ دور کے ملکی، عدالتی اور بین الاقوامی قسم کے قوانین رکھنے والا مجموعۂ دستور و آئین ہے، جسے ہم آج کی قانونی موشگافیوں کی جگہ قائم کر سکتے ہیں۔

الغرض مسلمانوں کی تاریخ میں ایک ایسا گروہ برابر پیدا ہوتا رہا ہے، جس نے اسلام کی خدمت اسی میں سمجھی ہے کہ وقت کے علمی، سیاسی اور عمرانی نظریات کو جوں کا توں قائم رکھتے ہوئے اور اُن میں سے کسی ایک یا سب کو معمولی ترمیم کے ساتھ اپنا کر اسلام کی شکل دیدی جائے اور افسوس ہے کہ وقت کا ایک بڑا قابل قدر گروہ جو اس ذہن سے لڑتا ہوا اُٹھا تھا اس میں چونکہ خود جدت کا مادہ تھا، اس لئے تھوڑی دور چلنے کے بعد اب وہ خود بھی اسی راہ پر چل نکلا ہے۔ یہ لوگ اب اسلام کو جمہوریت کی تکمیل، مملکت کی تعمیر، سیاست کی تنظیم اور امارت و سیادت کی تشکیل کا ذریعہ بنا دینا چاہتے ہیں، اگرچہ وہ اس بارے میں نیک نیت ہیں کہ یہ سب کچھ وہ احیاء اسلام کے لئے ہی کر رہے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ انھیں یہ کون سمجھائے کہ اسلام کے لئے اسلام کو ہی فکری طور پر مسخ کر ڈالنا اور ایک اصول کی بقاء و استحکام کے لئے اسی سے پیدا ہونے والے دوسرے اصول و ضوابط میں تبدیلیاں کر ڈالنا اسلام اور اُس کے اصول کی خدمت نہیں ہے۔

دین میں حکمت عملی کا مقام

(از ــــــ عتیق الرحمٰن سنبھلی)

(۲)

مولانا نے "الائمۃ من قریش" کا ترجمہ "امام قریش میں سے ہوں" کر کے اس کو ایک ہدایت ظاہر فرمایا ہے۔ اور پھر اسی بنیاد پر اس سے استدلال کیا ہے۔ مگر ہم کو اس سے اختلاف ہے۔ اس لیے کہ اس مضمون کی اسی ایک انداز کی جتنی احادیث مختلف طُرُق سے مروی ہیں، اُن سب پر نظر کرنے سے اور اس باب سے تعلق رکھنے والی دیگر مرویات کو بھی سامنے رکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ارشاد گرامی کی نوعیت "ہدایت" کی نہیں، بلکہ کچھ اور ہے۔

جہاں تک اس خاص انداز میں اس مضمون کے مختلف طرق کا تعلق ہو اُن سب کو نقل کرنا تو بے ضرورت طوالت ہے۔ البتہ ہم اتنے سب طرق کے الفاظ یہاں جمع کیے دیتے ہیں جو مجموعی طور پر باقی سب طرق کے الفاظ کو بھی جامع ہو جائیں۔

۱۔ "الائمۃ من قریش ما عملوا ثلاثا"

(مسند ابی داؤد الطیالسی (عن ابی برزۃؓ) جزو رابع صفحہ ۱۲۵)

۲۔ "الائمۃ من قریش، اذا حکموا عدلوا و اذا عاھدوا وفوا و ان استرحموا رحموا فمن لم یفعل ذلک منھم فعلیہ لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین لا یقبل منھم صرف ولا عدل"

(ایضاً الجزو التاسع صفحہ ۲۸۴ عن انسؓ)

۳۔ "الوُلاۃ من قریش ما اطاعوا اللہ و استقاموا علیٰ امرہ"

(کنز العمال جزو ثالث صـ۱۲۶ عن عمرؓ)

۴۔ "الامراءُ من قریش ابرارھا امراءُ ابرارھا و فجّارھا امراءُ فجّارھا"

(تاریخ الخلفاء بحوالہ مسند بزار عن علیؓ)

یہ سب روایات اپنے پہلے ٹکڑے کے اعتبار سے ایک ہی مضمون اور ایک ہی انداز کی ہیں، فرق اگر کچھ ہے تو الائمۃ، الامراء اور الولاۃ کے لفظ کا ہے۔

اب ذرا وہ احادیث دیکھئے جن کا نفس مضمون تو یہی ہو مگر انداز کچھ بدلا ہوا ہے۔ یہ احادیث دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جن میں خطاب خود قریش سے ہو۔ اور ایک وہ جن کا خطاب عام ہے۔ پہلے قسم دوم کی روایات لیجئے۔

۱۔ "انّ ھذا الامر فی قریش لا یعادیھم احدٌ الّا کبّہ اللہ علیٰ وجھہٖ ما اقاموا الدین"

(صحیح بخاری۔ کتاب الاحکام۔ باب الامراء من قریش۔ عن معاویہؓ)

۲۔ "اِنّ ھذا الامر فی قریش ما اطاعوا اللہ واستقاموا علیٰ امرہٖ"

(کنز العمال جزو ثالث صـ۱۲۵ .... عن ابی بکرؓ)

۳۔ "لا یزال ھذا الامر فی قریش ما بقی منھم اثنان"

(بخاری۔ باب الامراء من قریش۔ عن ابن عمرؓ)

۴۔ "قریش ولاۃ ھذا الامر فبرّ النّاس تبعٌ لبرھم وفاجرھم تبعٌ لفاجرھم"

(مسند احمد ج ۱ صـ۵ عن ابی بکرؓ)

اب قسم اول کی روایات پر نظر کیجئے۔

عن عبد اللہ بن مسعودٍ قال بینا نحن عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی قریبٍ من

حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہو کہ ایک دن خالص قریش کے کوئی اسّی آدمیوں کے درمیان رسول اللہ

ثمانين رجلاً من قريش ليس فيهم الا قرشی ...... فتشهد ثم قال يا معشر قريش فانكم اهل هذا الامر مالم تعصوا الله فاذا عصيتموه بعث اليكم من يلحاكم كما يلحیٰ هذا القضيب، لقضيب فی يده (الحديث)	صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے دیکھے اور باتیں ہوتی رہیں حتیٰ کہ وہ ختم ہوئیں تو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور ارشاد فرمایا کہ اے گروہ قریش! اس امر قیادت کے تم ہی متولی ہو جب تک کہ تم اللہ کی نافرمانی نہ کرو۔ پس جب تم نافرمانی کرنے لگو گے تو وہ تمھاری طرف ایسے لوگوں کو بھیجے گا جو تم کو اس طرح ادھیڑ

(مسند احمد ج اول ص۴۵۸)

ڈالیں گے جیسے یہ شاخ اُدھیڑی جاتی ہے، جو میرے ہاتھ میں ہے۔"

یہی مضمون حضرت ابومسعود انصاریؓ سے ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔" لا يزال هذا الامر فيكم وانتم ولاته " الحديث (امامت کا منصب برابر تمھیں میں رہے گا۔ اور تم ہی اس پر فائز رہو گے۔.... الخ) (فتح الباری باب الامراء من قریش)

یہ دونوں روایتیں مرفوع ہیں، اسی مضمون کی ایک روایت مرسلاً یہ بھی ہے۔

قال لقريش انتم اولی الناس بهذا الامر ما كنتم على الحق الا ان تعدلوا عنه فتلحون كما تلحی هذه الجريدة	حضور نے قریش سے فرمایا۔ اس امر (قیادت اور امامت) کے معاملے میں سب میں اولیٰ ہو، جب تک کہ تم حق پر قائم رہو۔ مگر یہ کہ تم حق سے منحرف ہو جاؤ تو اس طرح چھیل کر رکھ دیے جاؤ گے جیسے یہ سبز شاخ۔

(اخرجہ الشافعی والبیہقی مرسلاً عن عطاء بن یسار کما قال ابن الحجر فی فتح الباری)

اب اس باب کی تینوں قسم کی مرویات کو سامنے رکھ کر غور فرمائیے کہ پہلی قسم میں " الائمہ

من قریش" وغیرہ کے جو الفاظ آتے ہیں ان کی واقعی نوعیت کیا بیٹھتی ہے؟ ـــ اس سلسلہ میں غور و فکر کا صحیح راستہ یہ رہے گا کہ اولاً تیسری قسم کی مرویات پر (یعنی جن کو ہم نے سب سے آخر میں درج کیا ہے اُن پر) غور کر کے دیکھئے کہ یہاں حضور کا منشاء کلام کیا ہے؟ آیا ان ارشادات سے آپ قریش کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہم نے اسلامی حکومت کی سربراہی کے لیے تم کو نامزد کر دیا ہے۔ اور اس نوزائیدہ مملکت کی فرمانروائی کا پٹہ اس وقت تک کے لیے تمھارے نام لکھ دیا ہے جب تک تم ایسا ایسا نہیں کروگے؟ یا آپ کا مقصد قریش سے کہنا یہ ہے کہ عرب میں قیادت وسیادت اور مرکزیت کا جو مقام تمھیں ایک مدت سے حاصل ہے، میں دیکھ رہا ہوں کہ اب بھی جبکہ یہاں ایک نیا انقلاب آچکا ہے اور جاہلی نظام کی جگہ اسلامی نظام کا جھنڈا سربلند ہو چکا ہے یہ مقام تمھارے ہی پاس رہے گا، اور مرکز قیادت میں فی الحال کسی تبدیلی کے آثار نہیں ہیں۔ پس اگر تم چاہتے ہو کہ اس نئے نظام میں بھی یہ سلسلہ دائم رہے تو اس کی واحد سبیل یہ ہے کہ تم نے اطاعتِ حق کا جو عہد باندھا ہے اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہو، جب تک تم اس عہد پر قائم رہوگے اپنے پرانے مقام پر بھی برقرار رہوگے، ورنہ یاد رکھو کہ اسی عرب کی سرزمین پر جس میں صدیوں سے تمھاری سرداری کے ڈنکے بج رہے ہیں، اس طرح تمھاری قبائے سیادت نوچ کر پھینک دی جائے گی جس طرح ہاتھ کی ایک ذرا سی حرکت ہری بھری شاخ سے اس کی چھال جدا کر کے رکھ دیتی ہے؟ ظاہر ہے کہ پہلی بات نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ اس کا مطلب قریش کو ایک ایسے گھمنڈ میں مبتلا کر دینا ہے جس کی ہلاکتوں کا کوئی ٹھکانا نہیں، اور یہ بات اللہ کے نبی سے اور اس کے حکیمانہ مزاج سے جس قدر بعید ہو سکتی ہے وہ پوشیدہ نہیں! ـــ پس یہاں حضور کا منشاء کلام دراصل دوسرا ہی ہو سکتا ہے۔ وہی نبی کے مزاج سے بھی میل کھاتا ہے، اور جس وقت قریش سے یہ باتیں کہی جا رہی ہیں، اس وقت عرب میں قریش کا مقام کیا تھا؟ اس کو سامنے رکھا جائے تو اس سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محل پہلی بات کا تھا ہی نہیں!۔

"اس وقت عرب میں قریش کا مقام کیا تھا؟" اس سوال سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ حضور کا یہ خطاب جس زمانہ کا ہے (یعنی جب کہ عرب میں جاہلیت پسپا ہو چکی تھی اور قریش نے بھی امن رسالت تھام لیا تھا) اس زمانہ میں قریش کی حیثیت عربوں کی نظر میں عام قبیلوں کی سی ہو گئی

تھی یا اس نئے انقلاب کے بعد بھی عرب قریش کو اپنا سردار اور اپنی امامت کا سزاوار سمجھتے تھے؟۔
اس دور کے تاریخ کے کسی طالب علم سے بھی یہ بات پوشیدہ نہیں ہو کہ قریش کی حیثیت میں قطعاً کوئی فرق نہیں آیا تھا، اور آتا بھی کیسے، جبکہ اسلام اور جاہلیت کی کشمکش کی تاریخ بتاتی ہو کہ عام طور پر قبائل عرب اس وقت مطیع ہوئے جبکہ قریش نے ہتھیار ڈال دیے۔ اور پھر اس طرح مطیع ہوئے کہ "یدخلون فی دین اللہ افواجا" کا نقشہ کھنچ گیا۔ ورنہ اس سے پہلے تو وہ یا تو قریش کے جھنڈے کے نیچے اسلام سے نبرد آزما تھے، یا یہ سوچ کر بیٹھے ہوئے تھے کہ جب قریش اس نئے دین کو مان لیں گے تو ہم بھی مان لیں گے۔ بلکہ ایک قریشی کی نبوت کو مان لینے کے بعد عربوں کی نظر میں، قدرتی طور پر قریش کے فضائل میں ایک عظیم تر فضیلت کا مزید اضافہ ہوجانا ضروری تھا کہ اس قبیلہ کو اللہ نے اپنی آخری رسالت کے لیے منتخب فرمایا۔ اور یہ لوگ ہمارے نبی برحق کے قبیلے سے ہیں۔ چنانچہ یہ قدرتی بات ظہور پذیر ہوئی بھی۔ اور اس کی واضح مثال حضرت زید بن ثابت انصاری رضؓ کے وہ الفاظ ہیں جو انھوں نے اس وقت کہے جب سقیفۂ بنی ساعدہ میں یہ بحث ہو رہی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ پر امیر قریشی کو ہونا چاہیے یا غیر قریشی (انصاری) کو۔ مہاجرین کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ قریشی کو ہونا چاہیے۔ حضرت زیدؓ نے انصاری ہونے کے باوجود اس کی تائید کرتے ہوئے فرمایا۔ اور محبت و اخلاص کی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل یہ فقرے ثبت کر دیے۔

"اِنَّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ	جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
وسلم کان من المہاجرین۔ وَ	مہاجرین میں سے تھے بس اب ہمارا امام
اِن الامام یکون من المہاجرین	بھی مہاجرین ہی میں سے ہوگا اور ہم
ونحن انصارہ کما کنا انصار	اُسکے انصار ہوں گے جس طرح جناب رسول
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"	اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انصار تھے۔

(کنز العمال جزو ثالث ص ۱۳۱۔)

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خطاب کے وقت بھی قریش کی پوزیشن وہی تھی جو اس سے پہلے تھی، یعنی اس نئی اسلامی مملکت کی غالب اکثریت انھیں کو اپنا سردار مانتی تھی[۵]

---

۵ اس کی تائید خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے بھی ہوتی ہو اور وہ یہ ہو "کان ھذا الامر

بلکہ ان کی یہ پوزیشن پہلے سے بھی کچھ بڑھ گئی تھی، تو لامحالہ شورائی بنیادوں پر امام تو انھیں کو ہونا تھا. الّا یہ کہ حضور ان کے بارے میں ممانعت فرمادیتے۔ لہٰذا یہاں نامزدگی کا اور امامت کے لیے ان کا استحقاق بتانے کا تو کوئی محل ہی نہیں تھا۔ یہاں اگر حضور کا منشا ہوسکتا تھا تو یہی ہوسکتا تھا کہ انھیں تنبیہ کی جائے کہ اسلامی نظام کی سربراہی کے معاملہ میں خدا کا قانون یہ ہو کہ جو لوگ اس کے کم سے کم مقاصد سے بھی انحراف کریں گے وہ خواہ کیسے ہی پشتینی معزز ہوں اس مقام سے بے دخل کر کے خس و خاشاک کی طرح پھینک دیے جائیں گے۔ یا اقامت دین پر کاربند رہنے کی اس طور پر ترغیب دی جائے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمھاری سرداری چھینی نہ جائے تو اس کی واحد صورت یہ ہو کہ اللہ کی اطاعت پر قائم رہو۔ کیونکہ اس معاملہ میں اللہ کے یہاں اعتبار اسی چیز کا ہو۔ وہاں کوئی نسلی وراثت اس معاملہ میں نہیں چلتی۔

نتیجۂ بحث اس ساری بحث سے معلوم ہوگیا کہ حضور کا یہ فرمانا کہ "انکم اھل ھذا الامر" یا "اولی الناس بھذا الامر" یا "انتم ولاتہ" اس مفہوم میں نہیں تھا کہ اسلامی حکومت کا منصب امامت انھیں تفویض کیا جارہا ہے، یا تم ہی اس کے مستحق ہو۔ بلکہ اس مفہوم میں تھا کہ مجھے صاف نظر آرہا ہو کہ یہ مقام بظاہر تمھارے ہی پاس رہنا ہو۔ لہٰذا اگر تم چاہتے ہو کہ ...... تو ...... الخ ــــ یا ــــ لیکن اس بھول میں مت پڑ جانا کہ ..... بلکہ .... الخ

اب اس حقیقت کے پیش نظر، جو قریش کی پوزیشن کے بارے میں تاریخ سے اور خود حدیث (حدیث ذی مخمرؓ) سے ثابت ہوتی ہو صاف ظاہر ہے کہ دوسری قسم کی احادیث (انّ ھذا الامر فی قریش لا یعادیھم احدٌ وغیرہ) میں جو "انّ ھذا الامر فی قریش" ــ "لایزال ھذا الامر فی قریش" ــ اور "قریش وُلاۃ ھذا الامر" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، اُن کا صحیح مفہوم بھی یہی ہوسکتا ہو کہ یہ مقام جو قریش کو زمانۂ جاہلیت سے حاصل ہو، اسلام میں بھی اس

فی حمیر فنزعہ اللہ منھم وصیّرہٗ فی قریش وسیعود الیھم" عرب کی امامت پہلے قبیلۂ حمیر کے پاس تھی۔ مگر اللہ نے ان سے چھین لی اور قریش کے سپرد کردی۔ اور ایک زمانہ آئے گا کہ پھر حمیر ہی کے پاس واپس چلی جائے گی"۔ (مسند احمد ج ۴۔ عن ذی مخمر)

وقت تک اسی طرح برقرار رہے گا اور کوئی ان سے نہیں چھین سکے گا، جب تک وہ دین کو قائم رکھیں گے ("ما اقاموا الدین" ــــ جیسا کہ حدیث کے الفاظ ہیں) یا جب تک وہ اللہ کے احکام پر کاربند رہیں گے (ما اطاعوا اللہ واستقاموا ــــ جیسا کہ حدیث ۲ کے الفاظ ہیں) حتیٰ کہ اگر ان میں (اپنی باقی خصوصیات کے ساتھ) دو آدمی بھی ایسے رہے، تب بھی اللہ تعالیٰ ان کے اس مقام کی حفاظت فرمائے گا (ما بقی منھم اثنان ــــ جیسا کہ حدیث ۳ کے الفاظ ہیں) ــــ یہ ہوگا متذکرۂ بالا حقیقت کے پیش نظر ان الفاظ کا صحیح مفہوم! نہ یہ کہ اسلامی حکومت کی سربراہی کا منصب فلاں وقت تک کے لیے قریش کے سپرد کیا جاتا ہے۔

دو اور شہادتیں

یہ مفہوم صرف ایک خارجی حقیقت کے پیش نظر ہی متعین نہیں ہوتا۔ بلکہ ان احادیث میں سے دو حدیثوں کے الفاظ میں خود اس امر کی شہادت موجود ہے۔ اور وہ ہے حدیث ۳ میں "لا یزال" کا لفظ جس کا خود اپنا مقتضیٰ یہی ہے۔ جیسا کہ عربیت سے مس رکھنے والا ہر انسان جانتا ہے ــــ اور حدیث ۴ "قریش ولاۃ ھذا الامر فبر الناس تبع لبرھم و فاجرھم تبع لفاجرھم") میں اس کا دوسرا ٹکڑا (جو زیر خط کر دیا گیا ہے) یہ ٹکڑا اس بات کی بین دلیل ہے کہ "قریش ولاۃ ھذا الامر" کے الفاظ سے بظاہر جو یہ سمجھنے کی گنجائش نکلتی ہے کہ حضور قریش کو خلافت اسلامی کیلئے نامزد فرما رہے ہیں، حقیقتاً یہ صحیح نہیں ہے۔ اسلئے کہ پھر تو ضروری ہو جاتا ہے کہ اگلا ٹکڑا جو اس پہ متفرع ہے۔ اُس کا مفہوم کھینچ تان کر کسی طرح یہ بنایا جائے کہ "پس نیک لوگوں کو چاہیے کہ قریش کے نیکوکاروں کی پیروی کریں اور بدکاروں کو چاہیے کہ قریش کے فاجروں کی پیروی کریں"۔ لیکن یہ بات نہ ایک نبی کی زبان پر آسکتی ہے اور نہ ان الفاظ میں اسکی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے! ان الفاظ کا سیاق تو متعین طور پر خبر ہی کا ہے ــــ وہ حال کی ہو یا مستقبل کی! ــــ پس ان کا مطلب تو ان دو میں سے ایک ہی ہو سکتا ہے۔

۱۔ "نیک لوگ قریش کے نیکوں کے پیرو ہیں اور بدکار ان کے بدکاروں کی پیروی کرتے ہیں"۔

۲۔ "پس جو لوگ نیک ہوں گے وہ قریش میں سے نیکوں کے تابع رہیں گے اور جو لوگ خود بدکار ہوں گے وہ ان کے بدکاروں کی پیروی کریں گے"۔ اور اس مطلب کے ساتھ اس ٹکڑے کا کوئی جوڑ حدیث کے پہلے ٹکڑے سے نہیں بیٹھتا۔ اس کا تو کوئی جوڑ پہلے ٹکڑے کے ساتھ جبھی بیٹھ سکتا ہے جبکہ اسکو "نامزدگی"

کے مفہوم میں نہ لیا جائے، بلکہ اس مفہوم میں لیا جائے کہ یہ ایک امر واقع کا بیان اور اسکے قدرتی نتیجہ کی طرف اشارہ ہو۔ یہی صورت ہو جسمیں حدیث کے دونوں ٹکڑے باہم مربوط ہو جاتے ہیں اور پھر متعین ہو جاتا ہو کہ حضور کا منشاء مبارک "قریش ولاۃ ھذا الامر" کے ارشاد سے خلافت کیلئے قریش کو نامزد کرنا نہیں ہو بلکہ قریش کے اقتدار و مرجعیت کی ہمہ گیری کو ظاہر کرنا ہو کہ برے اور بھلے دونوں قسم کے لوگوں کی قیادت کی باگ ڈور انھیں کے ہاتھ میں ہو) یا ان کی موجودہ پوزیشن کو دیکھتے ہوئے مستقبل کے بارے میں اپنا یہ اندازہ ظاہر کرنا ہو کہ لوگوں کی نظر میں سرداری کا مقام قریش ہی کو حاصل رہے گا۔ تاکہ لوگ ان سے معاملہ کرنے میں اس امر واقع کو پیش نظر رکھیں اور کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھیں جس کے نتائج قریش کی اس حیثیت کی بنا پر برے نکلیں۔

قسم دوم کی حدیثوں کا مطلب بھی متعین ہو گیا اور اس سے واضح ہو گیا کہ ان احادیث کی نوعیت "نامزدگی" کی نہیں، بلکہ ان میں سے پہلی تین میں تو یہ بیان کیا گیا ہو کہ قریش کی سرداری جو مدتوں سے چلی آرہی ہو اسلام میں کب تک قائم رہے گی؟ اور آخری حدیث میں مجرد اس امر واقع پر تنبیہ کی گئی ہو کہ عرب میں قریش ہی کو سرداری حاصل ہے۔ یا اس امر واقع کے پیش نظر اپنا یہ اندازہ ظاہر کیا گیا ہو کہ آئندہ بھی لوگوں کی نظر میں سرداری کا مقام قریش ہی کو حاصل رہے گا —— اب آئیے قسم اول کی روایات پر غور کریں، جن کو ہم نے سب سے پہلے نقل کیا ہے!

سوال، جس کی وجہ سے ان روایات کو زیر بحث لایا گیا ہے، یہ ہے کہ کیا ان روایات کے الفاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء صحابہ کو یہ "ہدایت" دینا تھا کہ امامت کے لیے وہ قریش ہی کا انتخاب کریں، کسی اور کا نہ کریں؟ یا حضور کا منشاء یہ نہیں تھا؟ اس سوال کو ایک بار پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ اور پھر زیر بحث احادیث پر غور کیجیے[1]۔

---

[1] بہتر ہو گا کہ ناظرین اس موقع پر ذرا پیچھے پلٹ کر ان احادیث پر ایک بار پھر نظر ڈال لیں۔

اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہو کہ جن روایات پر ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں اُن کا، اور جو اس وقت زیر بحث ہیں؛ اُن کا، زیر بحث جزو (جزو اول) کی حد تک، اصل مضمون جب ایک ہی ہو. فرق صرف طرزِ ادا کا ہو، اور اُن ارشادات کی نوعیت کافی بحث و تمحیص کے بعد متعین ہو چکی، تو پھر اِن ارشادات کی نوعیت میں مزید بحث کی کیا حاجت ہو. جب دونوں کا مضمون ایک ہو تو دونوں کی نوعیت بھی ایک!

لیکن اگر کوئی حاجت ہی ہو تو اوپر کی گفتگو میں جن حقائق تک ہماری رسائی ہوئی تھی ان میں ایک حقیقت ہمارے سامنے یہ بھی آئی تھی کہ قریش کو عرب میں ایسی حیثیت حاصل تھی کہ جدید اسلامی نظام میں شورائیت کی بنیاد پر بھی امامت اور خلافت کا منصب قدرتی طور پر انھیں کو ملنا تھا، اور اگر قصہ زورِ بازو اور استبداد کا چل جاتا جب بھی بظاہر قریش کے سامنے کسی کی پیش نہیں جا سکتی تھی. اس حقیقت کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ زیر بحث الفاظ ("الائمۃ من قریش" وغیرہ) میں بہ ظاہرِ الفاظ جس طرح "ہدایت" کا مفہوم نکلتا ہو (یعنی "امام قریش میں سے ہوں") اسی طرح ان الفاظ کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہو کہ "امام قریش میں سے ہوتے رہیں گے"؛ یعنی ایک طرح کی پیشین گوئی. پس اب یہ طے کرنے کی ضرورت ہو کہ فی الواقع ان ارشادات کی نوعیت کیا ہے؟ — ہمارا خیال ہو کہ اس مشکل کا حل ڈھونڈھنے کے لیے ہمیں کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہو. اس سلسلہ کی جو چار روایات ہم نے شروع میں درج کی ہیں، ان میں سے دو کے اگلے الفاظ تو بہت واضح طور پر، اور دو کے ذرا خفی طور پر، خود ہی اس مسئلہ کو حل کر رہے ہیں. جن دو روایتوں کے الفاظ کا یہ پہلو خفی ہو، اُن پر گفتگو چونکہ عام ناظرین کے لیے کچھ زیادہ سود مند نہیں ہو سکتی. اس لیے ان سے متعلق تو ہم صرف بطور حاشیہ کے چند اشارات اہلِ علم کے لیے کریں گے[۵] اور باقی اصل گفتگو ان دو روایات تک محدود رہے گی جن کا یہ پہلو بہت واضح اور آسانی کے ساتھ قابلِ فہم ہے۔

---

[۵] یہ دو روایتیں یہ ہیں۔

۱۔ الائمۃ من قریش ما عملوا ثبلاث ـــــــ اور

۲۔ الولاۃ من قریش ما اطاعوا اللہ واستقاموا علیٰ امرہ۔

ان میں ما عملوا ثبلاث اور ما اطاعوا اللہ واستقاموا علیٰ امرہ والا ٹکڑا اس طور پر

یہ دو روایتیں یہ ہیں۔

۱۔ الائمۃ من قریش اذا حکموا عدلوا واذا عاھدوا وفوا واذا استرحموا رحموا فمن لم یفعل ذالک منھم فعلیہ لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین۔ (الحدیث)

۲۔ الامراء من قریش، ابرارھا امراءُ ابرارھا وفجارھا امراءُ فجارھا۔

ان میں سے پہلی میں اس بات کا واضح قرینہ کہ "الائمۃ من قریش" کی نوعیت ہدایت کی نہیں، بلکہ ایک پیشگی خبر کی ہے۔ ایک تو وہی ہے جسکی طرف حاشیہ میں پہلی دو روایتوں کے سلسلہ میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی اذا حکموا عدلوا الخ کی شرط۔ اور دوسرا یہ ہے کہ اگر یہ ہدایت ہوتی، اور اس کا مطلب یہ ہوتا کہ" ائمہ اس وقت تک قریش ہی میں سے منتخب کیے جائیں، جب تک کہ وہ عدل گستری، ایفائے عہد اور عفو ورحم کے خوگر رہیں۔" تو آگے ان امور ثلثہ سے انحراف کی صورت میں بجائے اس کے کہ "علیہ لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس" کی وعید سنائی جاتی ایسے الفاظ ہونے چاہیے تھے جن کا مطلب یہ ہوتا کہ (اگر ان میں یہ تین باتیں نہ رہیں) "تو ان کو امامت نہ دی جائے"۔ یا۔ "پھر یہ لوگ امامت کے مستحق نہیں ہیں۔" یہ بات کہ فمن لم یفعل ذالک منھم فعلیہ لعنۃ اللہ والملائکۃ (یعنی جو ان میں سے

قابل غور ہے کہ یہ قید جمیع قریش کے لیے ہو، یا صرف ائمہ و ولاۃ کے لیے، دونوں صورتوں میں "ہدایت" کے عنوان کے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ اگر یہ جمیع قریش کے لیے مانی جائے تو اس مصلحت کا تقاضہ پورا نہیں ہوتا جو اس ہدایت کا محرک ہوئی ہے: اس مصلحت اور اس حکمت عملی کا تقاضہ (جس کے ماتحت یہ "ہدایت" دی جارہی ہے) تو یہ ہے کہ جب تک نظم اجتماعی کا استحکام قریش سے وابستہ رہے، خلافت انھیں کے ہاتھ میں رہنی چاہیے۔ خواہ ان کا حال کچھ بھی ہو۔ لیکن اگر اسلامی خلافت کے اہم مقاصد کو محفوظ رکھنے کے لیے کوئی قید ناگزیر ہی ہو تو وہ صرف ائمہ کی حد تک کافی ہے۔ جمیع قریش کے لیے اس کی کوئی حاجت نہیں ـــــ اور اگر اس قید کا تعلق صرف ائمہ و ولاۃ سے مانا جائے، تو اشکال یہ ہے کہ یہ ایک مہمل بات بن جاتی ہے۔ ہدایت یہ دی جارہی ہے کہ خلفا قریش میں سے منتخب کیے جائیں۔ اس کے ساتھ اس قسم کی بات تو بامعنیٰ تھی کہ ان میں فلاں فلاں اوصاف پائے جانے چاہئیں مگر یہ شرط کہ خلافت کے بعد ان کا عمل ایسا اور ایسا ہو، تو "خلافت کا بعد کس نے دیکھا ہے؟ کون ضمانت لے سکتا ہے کہ خلافت پانے کے بعد خلیفہ کیا کرے گا؟

اس کے برعکس اگر "الائمۃ من قریش" اور "الولاۃ من قریش" کو پیشینگوئی مانئے تو یہ قید دونوں صورتوں میں بامعنیٰ رہتی۔ اگر حدیث کا مطلب یہ لیجئے کہ مجموعی طور پر قریش کا طرز عمل جب تک ایسا اور ایسا رہے گا خلافت انھیں میں رہے گی تو اس میں بھی کوئی اشکال نہیں۔ اور اگر یہ لیجئے کہ جب تک قریش کا قبیلہ فلاں فلاں اوصاف کے حامل خلفا فراہم کرتا رہے گا اس وقت تک خلافت قریش ہی میں رہے گی۔ اور جب اس کے خلاف ہونے لگے گا تو خلافت چھن جائے گی۔ تو اس صورت میں بھی بات بالکل ٹھیک ہے۔ ۱۲

ایسا نہیں کرے گا اس پر اللہ کی، اللہ کے فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہوگی یہ تو کچھ پیشین گوئی کے سیاق ہی سے مناسبت رکھتی ہو یا اللہ کا کوئی وعدہ بیان کیا جارہا ہو تب یہ وعید برمحل ہوتی، ہدایت کے ساتھ تو دراصل اس کا کوئی محل ہی نہیں۔

دوسری روایت میں اس سے بھی زیادہ واضح قرینہ موجود ہے اور وہ یہ ہے جس کی تقریر "قریش ولاۃ هذا الامر فبرالناس تبع لبرهم وفاجرهم تبع لفاجرهم" والی روایت کے ذیل میں گزر چکی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر "الامراء من قریش" کا مطلب یہ ہو کہ "امراء قریش میں سے ہوں" تو اگلے الفاظ (ابرارها امراء ابرارها الخ) کا مطلب بھی لازمی طور پر یہی لینا پڑے گا کہ "قریش کے نیکوکار ان کے نیکوکاروں کے امراء ہوں اور ان کے بدکار ان کے بدکاروں کے امراء" جو بداہۃً غلط اور اس قدر غلط ہے کہ اس کی نسبت آنحضرت کی طرف نہیں کی جا سکتی۔ پس اگر اس غلطی سے بچنا ہے تو اس کی صورت یہی ہے کہ "الامراء من قریش" کو ہدایت نہ سمجھا جائے، بلکہ اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ "امراء قریش میں سے ہوتے رہیں گے" پھر اس کی مناسبت سے اگلے ٹکڑے کا مطلب یہ نکلے گا کہ "قریش میں جب تک نیکوکاری رہے گی اُن کے امراء بھی نیک اور صالح افراد ہوں گے اور جب وہ بدکاری کی راہ پر پڑ جائیں گے تو ان کی قیادت بھی بدکاروں کے ہاتھ میں آجائے گی"۔ اور یہ مطلب ہر لحاظ سے بالکل درست اور عین صواب ہے۔

بہرحال نتیجہ یہ نکلا کہ حضور کے ارشاد الائمۃ من قریش یا الامراء من قریش کی نوعیت ہدایت کی نہیں ہے (کہ "ائمہ یا امراء قریش میں سے ہوں") بلکہ یہ ایک طرح کی پیشین گوئی ہے کہ جب تک قریش اپنے مخصوص قائدانہ اوصاف کے ساتھ فلاں فلاں صفات سے بھی متصف رہیں گے، عرب کی قیادت جو زمانۂ جاہلیت سے ان کے ہاتھ میں چلی آرہی ہے، اسلامی دور میں بھی وہ اسی طرح برقرار رہے گی۔

خوش قسمتی سے ہماری اس بات کی تائید اور صریح تائید خود مولانا مودودی کی بعض سابقہ تحریروں سے بھی ہوتی ہے۔ حال ہی میں ماہنامہ چراغ راہ کا "اسلامی قانون نمبر" شائع ہوا ہے۔ اس میں ایک مغربی مستشرق کا مضمون ترجمان القرآن کے پرانے فائلوں سے نقل کیا گیا ہے جس پر مولانا کے قلم سے کچھ حواشی بھی ہیں جن میں مولانا نے اس مستشرق کی بعض غلط فہمیوں کو دور کرنے یا اس کی غلط بیانیوں پر ناظرین کو متنبہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ کے اپنے ایک حاشیہ میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:-

"فاضل مصنف نے یہاں بلا تحقیق اُن لوگوں کا قول نقل کر دیا ہے جو خلافت و امامت کے لیے قرشیت کو شرط قرار دیتے ہیں۔ قرآن کی کسی آیت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ خلیفہ کا قریش سے ہونا ضروری ہے۔ اور یہ کہ غیر قریش خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ جس شخص نے اسلام کی فطرت کو کچھ بھی سمجھا ہو وہ اس حقیقت کے ادراک سے عاجز نہیں رہ سکتا کہ کسی منصب کو اہلیت کے بجائے نسل و نسب کے ساتھ مخصوص کرنا اس دین کی بنیاد ہی کے خلاف ہے۔ رہیں وہ احادیث جن میں ارشاد ہوا ہے کہ "ائمہ قریش سے ہوں گے" یا اس کے ہم معنیٰ دوسرے الفاظ) تو دراصل ان میں حکم اور قانون نہیں بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ پیش گوئی کی گئی ہے کہ جب تک قریش اس منصب کے اہل رہیں گے خلفاء اور ائمہ انھیں میں سے ہوں گے۔"[۱]

(چراغ راہ اسلامی قانون نمبر ص۱۸۱)

"سقیفہ بنی ساعدہ" اور حدیث امامت قریش

نفس حدیث پر گفتگو تمام ہو چکی، اور ہم سمجھتے ہیں کہ اب اس مسئلہ میں کسی اشتباہ کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک بحث یہ رہ جاتی ہے کہ "سقیفۂ بنی ساعدہ" میں اس حدیث (الائمة من قريش) کا مطلب کیا سمجھا گیا تھا؟ کیونکہ مولانا نے اس واقعہ کو بھی اپنی تائید میں پیش کیا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جہاں تک ہم نے تتبع کیا سقیفۂ بنی ساعدہ کے واقعہ کی روداد میں ہمیں "الائمة من قريش" کے الفاظ کہیں نہیں ملے۔ اور اس تلاش و جستجو کے سلسلہ میں ہمیں یہ دیکھ کر بالکل اطمینان ہو گیا کہ شارح بخاری حافظ ابن حجر بھی اسی نتیجہ پر پہونچے ہوئے

---

[۱] اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ مولانا نے اپنی کتاب "رسائل و مسائل" کے جس مضمون کا حوالہ دیا ہے۔ اس میں بھی موصوف نے ان احادیث کا یہی مطلب بیان فرمایا ہے۔ البتہ وہاں "ہدایت" کا مفہوم مولانا نے ایک دوسری حدیث سے لیا ہے۔ لیکن وہاں مولانا نے اس ہدایت کو کسی "استثناء" پر محمول نہیں فرمایا ہے۔ اور محل نزاع صرف یہی ہے۔ اس لیے اس مضمون پر ہمیں کلام کرنے کی ضرورت نہیں۔

چنانچہ بعض لوگوں کے اس قول کو نقل کر کے کہ "انصار کا کہنا منا امیر ومنکم امیر" اسوقت تک رہا جب تک حدیث "الائمۃ من قریش" نہیں پیش ہوئی۔ مگر جب یہ حدیث ان کے سامنے آگئی تو وہ اس سے دست بردار ہوگئے" وہ کہتے ہیں لم یقع فی ھذہ القصۃ الا بمعناہ[1] (یہ حدیث اس قصہ میں ان لفظوں کے ساتھ کسی روایت میں نہیں آئی ہاں بعض روایات میں اس کے ہم معنی الفاظ آئے ہیں) پھر یہ بھی جان لیجئے کہ جن دوسرے الفاظ کے ساتھ یہ حدیث اس واقعہ کی روایت میں آئی ہے وہ یہ ہیں — "قریش ولاۃ ھذا الامر فبر الناس تبع لبرھم وفاجرھم تبع لفاجرھم"

—— اور اس روایت کو صرف امام احمدؒ نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے۔ باقی اس قصہ کو اور جس قابل ذکر مصنف نے بھی نقل کیا ہے اُس میں سرے سے اس قسم کی کسی حدیث کے پیش کئے جانے کا ذکر ہی نہیں ملتا[2]۔ البتہ اس مضمون کا (جو مسند احمد والی روایت کا مضمون ہے) حضرت ابوبکرؓ کا خود اپنا ایک فقرہ ملتا ہے کہ

لن یُعرف (یا۔ لن تعرفَ العربُ)	اہل عرب قریش کے سوا کسی کی سرداری سے
ھذا الامر الا لھذا الحی من قریش	آشنا ہی نہیں ہیں۔

ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام۔ قصہ سقیفہ جلد سوم۔ تاریخ طبری جلد سوم۔ البدایۃ والنھایۃ۔ نیز صحیح بخاری

—— بلکہ صحیح بخاری کی روایت اور ان دوسری مذکورہ کتابوں میں سے بھی تقریباً سب ہی کی روایات نہ صرف اس حدیث کے ذکر سے ساکت ہیں بلکہ اُن سے تو واقعہ کی جو نوعیت معلوم ہوتی ہے، وہ اس نوعیت سے بالکل متضاد ہے جو مسند احمد والی روایت سے معلوم ہوتی ہے بایں معنی کہ مسند احمد والی روایت ظاہر کرتی ہے کہ اس قضیہ کو نپٹانے کیلئے حدیث پیش کی گئی اور حدیث کو سن کر انصار، مہاجرین کے موقف سے متفق ہوگئے۔ اور یہ سب روایات (حدیث کے ذکر سے خاموشی کے ساتھ ساتھ یہ بھی) ظاہر کرتی ہیں کہ انصار، مہاجرین کے موقف سے متفق نہیں ہوئے تھے بلکہ حضرت عمرؓ کی ایمانی فراست اور الہامی جرأت سے صورت حال ایسی بن گئی کہ انصار کو اپنا موقف چھوڑنا پڑ گیا۔ بخاری کی روایت میں اس نوعیت کے لحاظ سے چونکہ زیادہ وضاحت بلکہ صراحت موجود ہے۔ اس لئے ہم اس تضاد کو سامنے لانے کے لئے مسند احمد کی روایت کے مقابلہ میں صرف بخاری ہی کی روایت کو درج کرتے ہیں۔ پہلے مسند احمد کی پوری روایت دیکھ لی جائے۔

سُعید بن عبدالرحمٰن، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت کے کچھ حالات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں

(۱) فتح الباری شرح حدیث عائشہؓ فی مناقب ابوبکرؓ (۲) کنز العمال میں سقیفہ کے حوالہ سے بعض دوسرے الفاظ ہیں مگر وہ ہمیں اصل ماخذوں کے یہاں نہیں ملے۔

فانطلق ابوبکرؓ وعمرؓ یتقاودان
حتی اتوھم فتکلم ابوبکر ولم یترک
شیئا انزل فی الانصار ولا ذکرہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من
شأنھم الا وذکرہ قال الا وقد علمتم
ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
قال لو سلک الناس وادیا وسلکت
الانصار وادیا لسلکت وادی
الانصار ولقد علمت یا سعد ان
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
قال وانت قاعد قریش ولاۃ ھذا
الامر فبر الناس تبع لبرھم و
فاجرھم تبع لفاجرھم - قال فقال
لہ سعد صدقت نحن الوزراء وانتم
الامراء (مسند احمد، ج اول)

حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے
ہوئے جلدی جلدی سقیفے کی طرف چلے اور
وہاں پہنچ کر حضرت ابوبکرؓ نے تقریر فرمائی۔
اس تقریر میں انھوں نے انصار کے فضائل و
مناقب میں سے کوئی چیز نہ چھوڑی جو قرآن و
حدیث میں وارد ہوئی ہو مگر یہ کہ اس کو بیان
کیا۔ انھوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ سب لوگ ایک وادی میں
چلیں اور انصار ان سے الگ دوسری وادی
میں چلیں تو میں انصار کے ساتھ چلوں گا،
لیکن اے سعد! تم تو جانتے ہو (تمھاری
موجودگی ہی میں) رسول اللہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "سیادت" کا منصب قریش
ہی کو حاصل ہے۔ بھلے لوگ اُن کے بھلوں کے
پیرو ہیں اور بُرے لوگ اُن کے بُروں کے"
— راوی کہتے ہیں کہ یہ سُن کر حضرت سعدؓ بن عبادہ نے فرمایا، آپ سچ فرماتے ہیں (لہذا
ہمیں یہ منظور ہے کہ) امیر آپ ہوں اور وزیر ہم۔

امام بخاری نے اس قصہ سے تعلق رکھنے والی روایات کو حسب عادت مختلف ابواب میں درج کیا ہے مگر ان سب میں مفصل روایت وہ ہے جو کتاب الحدود میں "باب رجم الحبلی من الزنی" کے ذیل میں آتی ہے۔ اس روایت میں اس واقعہ کے راوی خود حضرت عمرؓ ہیں، اور معلوم ہے کہ اول سے آخر تک اس معرکہ کو سر کرنے کا سہرا انھیں کے سر ہے اور وہی اس قصہ کے روح رواں ہیں بخاری کی یہ پوری روایت نہایت طویل روایتوں میں سے ہے اور کوئی ڈیڑھ صفحے میں آئی ہے اس لئے اس کو بتمامہ لینا تو بہت طول کا باعث ہوگا۔ ہم یہاں اس کا ضروری خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

"حضرت عمرؓ بن خطاب کے آخری حج کا واقعہ ہو کہ آپ کے علم میں یہ بات آئی کہ ایک صاحب یہ کہتے ہیں (غالبًا انصاری تھے) کہ عمرؓ کی وفات کے بعد میں فلاں شخص سے خلافت کی بیعت کروں گا اس لئے کہ ابوبکرؓ کی بیعت بھی تو اسی طرح سے آناً فاناً (بلا کسی خاص اجتماعی مشاورت کے) ہوئی تھی اور پھر بعد میں مکمل ہوئی تھی۔ حضرت عمرؓ یہ سُن کر سخت غضبناک ہوئے اور چاہا کہ لوگوں کو یہیں اس معاملہ میں تنبیہ کردیں، مگر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے مشورہ سے مؤخر کردیا اور مدینہ پہنچکر جمعہ کے خطبہ میں دوسری ضروری باتوں (مسئلۂ رجم وغیرہ) کے ساتھ ارشاد فرمایا۔" انه بلغني ان قائلاً منكم يقول والله لومات عمرؓ بايعت فلاناً فلا يغترنّ امرؤ ان يقول انما كانت بيعة ابي بكرؓ فلتةً وتمّت۔ الَا وانّها قد كانت كذلك ولكن الله وقى شرها وليس منكم من تقطع الاعناق اليه مثل ابي بكرؓ" (ترجمہ) :۔ مجھے معلوم ہوا کہ تم میں سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ عمرؓ کے بعد ہم فلاں شخص سے بیعت کرلیں گے اور اسکے لئے وہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا حوالہ دیتے ہیں ۔۔۔ تو خبردار اس بات سے کوئی دھوکے میں نہ پڑے کہ ابوبکرؓ کی بیعت اسی طرح ایک شخص نے کرڈالی تھی اور بعد میں اس پر اتفاق ہوگیا۔ بیشک حضرت ابوبکرؓ کی بیعت اسی طرح ہوئی تھی لیکن اللہ کا فضل ہے کہ اُس نے اس طریق کار کے شر سے ہم لوگوں کو بچا دیا ۔۔۔ اور اس کی وجہ تھی ابوبکرؓ کی غیر معمولی شخصیت اور انکی عظمت و مقبولیت۔ پس یہ بھی تو سوچنے کی بات ہے کہ اب تم میں ایسا کوئی بھی نہیں ہے جس کے لئے ابوبکرؓ کی طرح گردنیں جُھک جائیں۔ اس کے بعد (کچھ مزید تنبیہی الفاظ فرماکر) حضرت عمرؓ نے بیعت ابوبکرؓ کا واقعہ تفصیل سے بیان فرمایا کہ وہ کیا موقع اور کیا صورت حال تھی اور اس سے کس طرح نپٹا گیا) اس سلسلہ میں فرمایا کہ (انصار کا نقطۂ نظر سُننے کے بعد) حضرت ابوبکرؓ نے (اُن کے فضل و مرتبت کی توثیق کرتے ہوئے) فرمایا

ماذكرتم فيكم من خير فانتم له اهل ولن يعرف هذا الامرُ الا لهذا الحي من قريش۔	تم نے اپنے جن فضائل کا تذکرہ کیا وہ بالکل مسلّم ہیں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ عرب میں سیادت کا مقام قریش کے سوا کسی اور کیلئے

جانا اور مانا ہی نہیں جاتا۔

اور اس کے بعد میرا (یعنی حضرت عمرؓ کا) اور ابو عبیدہؓ کا ہاتھ پکڑ کے فرمایا کہ ان میں سے ایک کو پسند کرلو اور بیعت کرلو۔ لیکن اس پر بھی انصار راضی نہیں ہوئے اور ان کے ایک نمائندے نے کھڑے ہو کر کہا کہ نہیں! یہ نہیں ہوسکتا البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک امیر تم میں سے ہو اور ایک تم میں سے (منا امیر ومنکم امیر) اور اس پر شور و ہنگامہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ مجھے ڈر ہوا کہ یہ اختلاف کوئی شدید صورت نہ اختیار کرلے چنانچہ میں نے فوراً ابو بکرؓ سے کہا کہ بس ہاتھ لائیے۔ چنانچہ انھوں نے ہاتھ بڑھادیا اور پھر میں نے اور دوسرے مہاجرین نے اور پھر انصار نے بیعت کی۔"

ایک تو صحیح بخاری کی روایت اور پھر قصہ کے روح رواں کی زبان سے، ان دونوں باتوں کی قوت کو ملحوظ رکھ کر غور فرمائیے کہ اس روایت میں نہ صرف یہ کہ حدیث مرفوع پیش کیے جانے اور اس پر تصفیہ ہوجانے کا ذکر نہیں بلکہ صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ انصار آخر دم تک اپنے موقف پر قائم رہے اور سخت ہنگامی حالت میں بس حضرت عمرؓ کی پہل سے بیعت ہوگئی۔ گویا یہ روایت اس بات کی بالکل نفی کرتی ہے جو مسند احمد والی روایت سے ظاہر ہوتی ہے (یعنی یہ کہ انصار کسی حدیث کے پیش کیے جانے پر امامت قریش پر راضی ہوگئے تھے) پس اب بخاری والی روایت کی قوت کو ملحوظ رکھتے ہوئے دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں کہ یا تو بخاری کی روایت کو ترجیح دے کر مسند احمد والی روایت کو ترک کردیا جائے یا پھر دونوں میں تطبیق کی کوشش کی جائے لیکن یہ ظاہر ہے کہ تطبیق کی اگر کوئی صورت ہوسکتی ہے تو وہ صرف حدیث پیش کیے جانے کی حد تک ہوسکتی ہے (اگرچہ ہمیں یہ بھی مشکل نظر آتی ہے) رہی یہ بات کہ اس حدیث کو ہدایت سمجھ کر انصار نے قریش کی امامت کو منظور کرلیا، اسکی تطبیق بخاری والی روایت کے ساتھ کسی طرح نہیں ہوسکتی، کیونکہ بخاری کی روایت اسکے بالکل برعکس ہے۔ پس اس جزء میں تو تطبیق کے بجائے ترجیح ہی کے اصول سے کام لینا پڑے گا اور ترجیح ظاہر ہے کہ بخاری کی روایت کو ہوگی ——— الحاصل سقیفہ کا واقعہ اس دعوے کی قطعاً تائید نہیں کرتا کہ "الائمۃ من قریش" یا اس مضمون کی دوسری احادیث کی نوعیت ہدایت کی ہے، بلکہ اگر یہ مان لیا جائے کہ اس طرح کی کوئی حدیث سقیفہ کے واقعہ میں پیش کی گئی

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

جادۂ حبیب

(از، مولانا محمد اشرف خاں صاحب ایم اے اسلامیہ کالج پشاور)

۴

بقیہ ۱۴ر اگست ۱۹۵۸ء

آج صبح سے گرمی محسوس ہو رہی ہے۔ مشورے کے مطابق جہاز کے ساتھیوں کے لیے صبح ۱۰ بجے سے گیارہ بجے تک تعلیم کا نظم کیا گیا ہے۔ کچھ اردو جاننے والے پاکستانی و ہندوستانی حضرات تھے، اور کچھ عرب حضرات مسقط، بحرین، کویت وغیرہ کے تھے، بحمد اللہ تعلیم ہوئی تاثر خاص کر عرب حضرات میں اچھا تھا، یہ عرب غریب طبقے کے کم لکھے پڑھے ہیں۔ لیکن اسلام کی عظمت اور احادیث نبوی کی محبت کی چنگاری ہنوز قلوب میں موجود ہے، کاش نور ایمان کے روشن کرنے اور یقین کے بڑھانے کے لیے نبوی طریقہ کے مطابق مسلمانوں میں عمومی طور پر جان کھپانے کا رواج ہو جاتا۔ ابھی وقت ہے، کہ اس سرمایہ کو ضائع ہونے سے بچا لیا جائے۔

جہاز گیارہ بجے کے قریب بحرین پہنچا، ساحل سے کوئی ایک آدھ میل کے فاصلے پر لنگر ڈال دیا گیا۔ یہ بحرین وہ نہیں، جس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مال غنیمت آیا تھا، وہ ساحل عرب پر ہے، اور اُسے آج کل "الحسا" کہتے ہیں۔ 'تیل' کی دریافت نے اسے مغرب کے استحصال اور حرص و آز کی جولانگاہ بنا دیا ہے۔ الخبر کی بندرگاہ آج کل مشہور ہے۔ پہلے زمانے میں 'الخط' کی بندرگاہ مشہور تھی۔ جس کی نسبت سے عربی ادب میں 'رماح الخط' کا لفظ کثرت سے آتا ہے۔

بہرحال یہ علٰحدہ جزیرہ خلیج فارس میں ہے۔ تیل کے چشموں کی بنا پر مشہور ہے۔ یہاں برطانوی اور امریکی تیل کی کمپنیاں ہیں۔ سمندر سے موتی بھی نکالے جاتے ہیں۔ یہاں کی (Pearl Fisheries) مشہور ہیں۔ یونانی مورخ پلائنی (Pliny) کا خیال ہے کہ فنیقی (PHONECIAN) شروع میں اسی جزیرے کے بسنے والے تھے۔ اس نے یہ قیاس اسی بنا پر کیا ہے کہ اسے اس جزیرہ میں فنیقی طرز کے مقابر وغیرہ ملے تھے۔ فنیقی

وہی قوم ہے جس نے یونان کی ترقی سے بھی پیشتر اپنی صنعت کاریوں کی دھوم مچا دی تھی۔
یہ ساحل بحیرہ روم پر فلسطین وغیرہ کے قریب آباد تھے۔ اور بقول ہٹی 'بحیرہ روم' رومن جھیل (Roman Lake) بننے سے صدیوں پہلے فنیقی جھیل بن چکا تھا۔ اور اسی قوم کے ملاحوں نے واسکوڈے گاما سے تین ہزار سال پیشتر افریقہ کے گرد کیپ ٹاؤن ہوتے ہوئے چکر لگایا تھا۔ (یہ بھی ہٹی کا قول ہے)

یورپ کی عادت ہے، کہ ان تمام مفاخر کو جو غیر یورپین اقوام سے متعلق ہوں، نظر انداز کر دیتا ہے، یا اس قدر ہلکا اور مدھم کر کے بتاتا اور اپنے کارناموں کو اس طرح بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے، کہ اسکے تمدن و تسلط کی ظاہری روشنی میں سننے والا ہر چیز کو اسی کا کمال سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے،

کراچی سے سقط تک سمندر کی تلاطم خیزیاں دیکھ کر بار بار قرون ماضیہ کے ان بہادر ملاحوں پر آفرین کہنے کو جی چاہتا ہے۔ جو بادبانی کشتیوں میں ہزارہا سال پیشتر اللہ تعالےٰ کے رحم و کرم پر موجوں کے خطرناک تھپیڑوں کا مقابلہ کرتے تھے، اسی سمندر کو لے لیجئے، عرب ملاحوں کا ہندوستان کی بندرگاہوں میں آنا جانا تین ہزار ق،م تک قیاس کیا گیا ہے۔ ۱۵۰۰ ق،م میں ہند و عرب کی آمد و رفت تاریخی شہادتوں کی بنا پر ظن غالب کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔
بائبل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں ملکہ سبا کے جن تحائف کا ذکر کیا ہے، ان میں سے کئی یقیناً صرف ہندوستان کی پیداوار ہیں۔ بعد کے زمانے میں سکندر مقدونی کا سمندر کے راستے واپس ہونا، ایک تاریخی واقعہ ہے، تعجب ہے کہ بعض یونانی مورخین نے اس سکندر کے بیڑے کے رہنما (Illiterate) "اُمّی" قوم کے افراد بتائے ہیں۔ کیا وہ عرب تھے؟ اس کے عہد میں بلوچستان کے علاقے میں Arabies اور Arabae کے مقامات ملتے ہیں۔ کیا یہ عربوں کی نوآبادیاں تھیں؟ سیلون میں ہون ٹسانگ چینی ۱۲۰ء میں عرب تاجروں کو پاتا ہے، مالابار کے ساحل پر موپلے اور بعض دوسری قومیں عرب ملاحوں کی اولاد ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ شروع زمانے میں ساحل کے ساتھ ساتھ عرب ملاح سندھ کے ساحل تک پہنچے ہوں گے۔ اور ابتداً اتفاقیہ مون سون نے عرب

کشتیوں کو ساحل ہند تک پہنچا دیا ہوگا۔ مسالوں اور عطریات کی تلاش تو انھیں قدرتاً تھی۔ مسالوں کی سرزمین اس طرح ہاتھ آگئی۔ تو 'مون سون' کے تغیر کو انھوں نے عطیہ آلہی سمجھ کر اپنی کشتیوں کے ہند سے آمد و رفت کے ایسے اوقات مقرر کر لیے جن کے ذریعے سے ہوائیں آسانی سے انھیں ایک طرف سے دوسری طرف پہنچا دیتی تھیں۔ اور ساحل عرب پر واپسی کے بعد یہ درآمدی اشیاء کو خشکی کے راستے شام و مصر تک پہنچاتے تھے۔ اور یہ سلسلہ اسلام کی ابتدا تک اسی طرح جاری تھا۔ 'رحلۃ الشتاء والصیف' اور 'امام المبین' کے اجمال کی تفصیل کے لیے عربوں کی تجارت قبل الاسلام کا حال معلوم کرنا ضروری ہے۔

جاہلی شاعر اعشی نے ابن یمین کے جہازوں اور عمرو بن کلثوم نے 'خدوج مالکیہ' کا تذکرہ کیا ہے۔ حضرت سید الملت علامہ سید سلیمان ندوی کی عربوں کی جہازرانی، ارض القرآن وغیرہ میں اس کا کافی تذکرہ مل سکتا ہے۔

۹۳ھ سے پیشتر سیلون میں انہی تاجروں کے ذریعے اسلام پہنچ چکا تھا۔ جن کے حاجیوں پر مکران کے لٹیروں کا حملہ سندھ پر حملہ کا سبب بنا۔ اسلام کے بعد تو بحر ہند و بحیرہ عرب کیا، عالم کے سمندر عرب سفینوں کی جولانگاہ تھے، "ابو زید سرافی"، ابو دلف، ابن بطوطہ سے لیکر سد البحر تک پورا عالم انھیں کے جہازوں سے آباد تھا۔ ع

سمندر بازیگاہ تھا جن کے سفینوں کا

فن لینڈ، جزائر برطانیہ افریقہ کا مغربی ساحل، اٹلانٹک کے جزیروں سے لیکر بحر ہند کے سمندر اور بحر الکاہل کے جزیرے جاپان، فلپائن تک انکی تاجرانہ اور داعیانہ سرگرمیوں سے آباد تھے، انڈونیشیا کا پورا ملک فلپائن کے بعض جزائر انھیں مسلمان تاجروں اور ملاحوں کی برکت سے آج اسلام کی آغوش میں ہیں؛ اور حقیقت تو یہ ہے کہ امریکہ کی دریافت کا سہرا یورپ کی عیسائی اقوام میں سے کولمبس کے سر اگر ہو تو ہو سکتا ہے۔ لیکن حقیقی دریافت اسکی بھی ان عرب بہادروں کی رہین منت ہے جن کے کارناموں کو آج اتنا دھندلا کر کے بتلایا جا رہا ہے۔ گویا وہ کچھ تھے ہی نہیں، بات سے بات پیدا ہوتی ہے، مقصد صرف اتنا ہے کہ سمندروں کو جنھوں نے ایک معمولی دریا کی طرح اپنی داعیانہ سرگرمیوں' اور

تاجرانہ تگ و دو کا میدان بنا رکھا تھا۔ وہ مسلمان اور عرب ملاح آج کہاں ہیں؟

ع

صد حیف از قبیلہ مجنوں کسے نماند

۵ اگست ۱۹۵۷ء مطابق ۸ محرم الحرام ۱۳۷۷ھ

ناشتہ سے فراغت کے بعد جماعت کے رفقاء کی تعلیم آپس میں ۹ سے ۱۱ بجے تک ہوئی، اسکے بعد کھانے کے نظم میں لگا ہی چاہتے تھے کہ بوشہر کی بندرگاہ آگئی، یہ ایرانی ساحل پر ہے، جہاز کوئی چھ گھنٹے ٹھہرا، سامان کافی اترا، کچھ ایرانی مسافر معہ مستورات کے سوار ہوئے، بحمداللہ تعالیٰ مستورات پورے پردے میں تھیں۔ برقع پوش اور چہرے پر نقاب، ایران میں گویا اب بھی پردہ بالکل مفقود نہیں ہوا۔

محرم کی آٹھ تاریخ ہے، زائرین کربلا کے ارادے سے بھی جا رہے ہیں۔ شیعیت خالص مذہبی فرقہ نہیں، بلکہ ایرانی سیاسی دماغ و افکار کی پیداوار ہے، جس کی ذہنی و فکری جڑیں ساسانی اور کیانی خاندانوں سے گزر کر ہخامنشی خاندان تک چلی گئی ہیں۔ اسلام کے لئے یہ تمام تصورات عجمی اور بیگانہ ہیں۔ وہ نئے خاندانی نظام نہیں بنانے آیا تھا، وہ تو ایک الٰہی دینی دعوت تھی۔ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔

اپنی دعوتی سرگرمیاں بحمداللہ تعالیٰ رفقاء کی ہمت سے کچھ نہ کچھ جاری ہیں۔ میں تو بس شمار ہی کے لئے ان باہمت دوستوں کا رفیق ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اخلاص سے حصہ نصیب فرمائے۔ خدمت بھی کرتے ہیں اور تعلیم و دیگر مشاغل میں بھی سرگرم ہیں۔ مجھ سا بیکار ان کے سہارے کچھ کما لے تو اللہ کی رحمت سے بعید نہیں، عصر میں عمومی تعلیم ہوئی، جماعت بحمداللہ تعالیٰ عرب مسافروں کی برکت سے کافی بارونق ہو جاتی ہے، نماز اکثر پڑھتے ہیں، کاش ارکان کی تعدیل اور خشوع کا اہتمام ہوتا، عربی بولتے ہیں، کمال ہے، مسلمان جہاں بھی ملتا ہے، ایک دوسرے سے اجنبیت محسوس نہیں کرتا، بلکہ انس ہی پاتا ہے۔ کویت کے ایک حبشی النسل نوجوان سے کافی دیر تک بات چیت ہوئی۔ دینی جذبات اور مسلمانوں کی محبت کی بناء پر مجھے تو اس سے انسیت معلوم ہونے لگی۔ (باقی)

تعارف و تبصرہ

اعیان الحجاج
یعنی تاریخ اسلام کے بلند پایہ حجاج

تالیف حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی، ۲۳۲ صفحات، بڑا سائز کاغذ اور کتابت طباعت اعلیٰ۔ قیمت مجلد ۸/۴ غیر مجلد ۸/۳ روپے
پتہ - مکتبۂ اعظمی، مئو ناتھ بھنجن۔ یو۔پی۔ (کتب خانہ الفرقان سے بھی مل سکتی ہے)

حج، اسلام کا جذب و شوق اور غایت تعلق مع اللہ کو ظاہر کرنیوالا رکن ہے۔ اور یہی سفر حج کی اصلی سوغات ہے۔ مگر فی زمانہ حج کی اصل روح کی طرف بہت کم لوگوں کو توجہ ہوتی ہے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ العالی نے تاریخ اسلام کے تقریباً دو سو بلند پایہ حجاج کا یہ تذکرہ مرتب فرما کر لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ذیل میں قرن اوّل اور بعد کی صدیوں کے بزرگان دین کے علاوہ شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض دیگر انبیاء علیہم السلام کے حج کا بھی تذکرہ ہے اور آخر میں بعض خلفاء اور شاہانِ اسلام کا۔

یہ تذکرہ ان شخصیتوں کے صرف واقعات حج تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کے شوقِ حج اور خاص خاص مؤثر واقعاتِ حج کے علاوہ عموماً ان کی زندگی کے دوسرے مؤثر پہلوؤں (مثلاً علم و عمل اور زہد و تقویٰ وغیرہ) کو بھی مختصراً بیان کیا گیا ہے۔

زبان بہت صاف و سادہ اور انداز بیان دل نشین ہے۔ امید ہے لوگ .... اس علمی و اصلاحی کاوش کی کما حقہ قدر کریں گے۔

کلمات اکابر

تالیف مولانا محمد اسحاق صاحب بنارسی، صفحات ۱۲۶، کتابت و طباعت دیدہ زیب، کاغذ بہتر، قیمت مجلد ۸/۱۔ ملنے کا پتہ: (۱) مولانا محمد اسحاق - کچی باغ بنارس۔ (۲) مولانا محمد اسحاق - الکریم منزل، فلیٹ نمبر ۱۵ - پلٹن روڈ - بمبئی ۱

یہ کتاب صلحاء امت کے پُر حکمت اور جامع مختصر ارشادات پر مشتمل ہے۔ شروع میں تبرکاً کچھ آیات و احادیث بھی مع ترجمہ درج ہیں، ان ارشادات کا مطالعہ یقیناً مفید اور باعث سعادت ہوگا جن اکابر کے کلمات اس میں درج کئے گئے ہیں ان کا مختصر تعارف بھی دیا گیا ہے۔

یہ کلمات غالباً سب کے سب ہی اصل کا ترجمہ ہیں، ترجمہ کی زبان عموماً اچھی اور صاف ہے تاہم ایک سرسری نظر میں چند مقامات نظر ثانی کے محتاج نظر آئے ـــــ ص۳۴ پر دوسری سطر میں ہے۔ "عقل کا اندازہ معلوم ہوجاتا ہے" اس میں معلوم کا لفظ زائد ہے۔ "اندازہ معلوم ہونا" نہیں بولا جاتا ـــــ ص۳۸ پر آخری سطر میں ہے "کسی ناکردہ گناہ پر تہمت و بہتان لگانا" اس میں اگر "ناکردہ گناہ" سے "بے گناہ" مراد لیا گیا ہے تو غلط ہے۔ اور اگر یہ لفظ اسی معنی میں بولا گیا ہے جس میں بولا جاتا ہے تو پھر عبارت یوں ہونی چاہیئے

"کسی پر ناکردہ گناہ کی تہمت و بہتان لگانا"

حضرت عمرؓ کے تعارف میں لکھا گیا ہے "خدائے اسلام نے ان کی وجہ سے دین کی تائید کی ہے" اول تو "خدائے اسلام" کی تعبیر محل نظر ہے، دوسرے "ان کی وجہ سے دین کی تائید" کے بجائے "ان کے ذریعہ سے دین کی تائید" ہونا چاہیے۔ بلکہ "تائید" کے بجائے بھی یہاں کوئی دوسرا لفظ ہونا چاہیئے۔ مثلاً (دین کو) "قوت بخشی" اس لئے کہ یہاں تائید کا جو مفہوم ہے وہ اُردو میں تائید کے لفظ سے ادا نہیں ہوتا۔

یہ چند باتیں تو زبان و بیان کے قبیل سے تھیں۔ اس کے علاوہ حضرت علیؓ کے تعارف میں ایک دوسری قسم کی چیز قابل توجہ ہے۔ "انا مدینۃ العلم وعلیٌّ بابها" کے بارے میں محققین کا فیصلہ ہے کہ یہ حدیث موضوع، ورنہ کم از کم منکر تو ہے ہی۔ پھر بھی فاضل مؤلف نے حضرت علیؓ کے مناقب میں اسے پیش کردیا ہے۔

عجیب بات ہے کہ زبان و بیان کی مذکورہ نوع کی فروگزاشتوں کے ساتھ ساتھ مؤلف موصوف کے قلم میں ایک اچھا ادبی رنگ بھی ہے جو تعارفی حصہ میں خاص طور پر نمایاں ہے جس کی وجہ سے تعارفی پیرے روکھے پھیکے اور بے جان نہیں بلکہ بڑے جاندار نظر آتے ہیں

دنیا و آخرت | از حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح۔ کتابت، طباعت اور کاغذ بہتر، سائز خورد کتابی، صفحات ۲۲۴، مجلد قیمت -/۶/۵

ناشر:- مکتبہ اشرف المعارف پھلپک۔ ملتان۔ مغربی پاکستان۔

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کے مواعظ مشہور زمانہ ہیں۔ انھیں میں سے چودہ وعظ لیکر منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب (صاحب سیرت اشرف) نے اس کتاب کی صورت میں شائع کئے ہیں، یکجائی کے علاوہ موصوف نے اتنا کام اور کیا ہے کہ ہر وعظ میں مختلف مضامین کی مناسبت سے ذیلی عنوانات بھی قائم کر دیے ہیں، اس طور پر یہ مواعظ جواب تک پرانے ڈھنگ سے شائع ہوتے رہے ہیں، عصری مذاق کے مطابق نشر و اشاعت کے نئے رنگ ڈھنگ سے سامنے لائے گئے ہیں۔ اندر عنوانات کا اضافہ ہے۔ شروع میں ان سب عنوانات کی مفصل فہرست ہے، سائز اور ضخامت خوشنما اور متناسب ہے۔ اور پھر اوپر سے ایک دیدہ زیب گرد پوش ــــــ گویا شراب تو پرانی ہے مگر "شیشۂ نو" میں۔

حضرت حکیم الامت کے علوم و معارف کی بیشک یہ ایک اچھی خدمت ہے۔ اور اُمید ہے کہ اس کی وجہ سے ان کی افادیت کا دائرہ وسیع تر ہوگا۔

اچھی باتیں (حصہ ششم) از جناب حکیم شرافت حسین صاحب رحیم آبادی۔ کتابت طباعت روشن، کاغذ عمدہ، صفحات ۱۲۰۔ قیمت ۱۲ر۔ پتہ:- مکتبہ دین و دانش مکارم نگر۔ لکھنؤ۔

حکیم صاحب موصوف مسلمان بچوں کے لئے "اچھی باتیں" کے نام سے ایک دینی نصاب تیار فرما رہے ہیں، پانچ حصے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ اور اب یہ اسی سلسلہ کا چھٹا حصہ ہمارے سامنے ہے، یہ پورا حصہ روزہ کے لئے مخصوص ہے اور حق یہ ہے کہ روزہ کے سلسلہ کی تمام ہی ضروری باتیں حکیم صاحب موصوف نے اس قدر سلاست کے ساتھ اور دل نشین پیرائے میں بیان فرما دی ہیں کہ جس عمر کے بچوں کے ہاتھ میں یہ کتاب جاتی ہے۔ اُن کے لئے اس سے بہتر زبان اور اس سے بہتر انداز مشکل ہی سے ہو سکتا ہے۔ بلکہ ہمارا خیال ہے کہ یہ کتاب دینی تعلیم بالغان کے سلسلہ میں بھی پوری طرح کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔

ہم نے شروع کے دس بارہ صفحے تو مسلسل پڑھے ہیں اور باقی حصہ پر ایک سرسری نظر ڈال کر یہ رائے قائم کی ہے۔ شروع کے انھیں دس بارہ صفحات میں ہمیں دو مقامات ایسے بھی نظر آئے جن کے بارے میں مصنف کو بنظر احتیاط نظر ثانی کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۱) ـــــ" اور یہ تو عوام اور کم سمجھ آدمیوں کا روزہ ہے" (ص۶)

ہمارے خیال میں یہ فقرہ بے ضرورت بھی ہے اور غلط فہمی کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ اگر ضرورت ہی ہو تو اس قسم کی تعبیر زیادہ مناسب رہے گی "اور یہ تو کم نظر اور لا پروا آدمیوں کا روزہ ہے"

(۲) روزہ کی فرضیت مکہ میں کیوں نہیں ہوئی۔ مدینے جا کر کیوں ہوئی ؟

یہ سوال اول تو کچھ معنی نہیں رکھتا، دوسرے اس کی جو توجیہ حکیم صاحب نے فرمائی ہے وہ دل کو نہیں لگتی، بلکہ اگر کوئی شخص چاہے تو ہجرت کے دور میں جن دنوں روزہ فرض ہوا ہے اُس کے مقابلہ میں مکی دور کو فرض فرضیت کے لئے زیادہ موزوں ثابت کر سکتا ہے۔

(ع - س)

حکمتِ عملی کا مقام

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۰)

تھی تو اس سے اتنا نتیجہ نکلتا ہے کہ صحابۂ کرامؓ نے اس کا یہ مطلب نہیں سمجھا اور سمجھا جا بھی نہیں سکتا تھا اس لئے کہ مسند احمد والی روایت میں حدیث کے جو الفاظ ہیں ان پر ہم ہر پہلو سے روشنی ڈال کر پہلے بتا چکے ہیں کہ ان الفاظ کو "ہدایت" کے معنی پر محمول کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ بلکہ اس کا مطلب صرف وہی ہوتا ہے جو حضرت ابوبکرؓ کے فقرے (لن یُعرَف ھذا الامر الخ) کا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(باقی)

HYDERABAD (DECCAN)
الفرقان لکھنؤ
ماہنامہ
ہماری دعوت
لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ
اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے
لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، وہ فیصلہ ہے
اس بات کا عہد کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی
اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت و شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے
جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی
زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اس کا
عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں
فاطر السموات والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرۃ
توفنی مسلما والحقنی بالصالحین
"ادارہ الفرقان"
مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی
مسئول
محمد منظور نعمانی

کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات

برکات رمضان

از افادات مولانا نعمانی

اسلام کے اہم رکن "صوم رمضان" اور ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال و وظائف۔ تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات۔ اور ان کی روحانی تاثرات کا نہایت مؤثر اور شوق انگیز بیان اور حکیم اُمت حضرت شاہ ولی اللہؒ کے طرز پر اس سلسلہ کی احادیث کی ایسی تشریح جس سے دل بھی متاثر ہو اور دماغ بھی مطمئن۔ قیمت ۔/۱۲/۰

نماز کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اس کی روح و حقیقت سے واقف ہونے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں "کلمہ طیبہ کی حقیقت" کی طرح یہ بھی عقل، جذبات اور دل و دماغ کو یکساں متاثر کرتا ہے۔

قیمت .... ۔/۱۲/۰

کلمۂ طیبہ کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

اس میں اسلام کے کلمۂ دعوت "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ سننے سے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے اور دماغ کے ساتھ دل بھی متاثر ہوتا ہے۔

قیمت ۔ ۔ ۔ ۔/۶/۰

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

قیمت ۔/۶/۰

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین کے الزامات

قیمت ۔/۸/۱

معرکۃ القلم

اکابر دیوبند کی طرف سے مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا آخری تحقیقی جواب۔ .... قیمت ۔/۰/۱

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

تالیف مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے قابل قدر فاضلانہ اور مبسوط مقدمہ ۲/۸/۰

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی۔ قیمت ۔/۸/۱

امام ولی اللہ دہلویؒ

از مولانا عبید اللہ سندھیؒ ...... قیمت ۔/۶/۰

انیس نسواں

از محترمہ بیگم سید اصغر حسین صاحب

مسلمان خواتین خاص کر تعلیم یافتہ بہنوں میں دین کی طرف سے جو بے فکری اور آخرت کی طرف سے جو غفلت تیزی سے بڑھ رہی ہے اس کے علاج اور انسداد کے لیے ایک محترم بہن نے یہ رسالہ لکھا ہے۔ شروع میں مولانا نعمانی کے قلم سے پیش لفظ ہے۔ .... قیمت ۔/۸/۰

جلد (۲۶) بابتہ ماہ صفر ۱۳۷۸ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۵۸ء شمارہ (۲)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب یہ ہو کہ آپ کی مُدت خریداری ختم ہوگئی ہو، براہ کرام آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی، پی ارسال کیا جائے گا۔

چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۲۴ تاریخ تک پہونچ جانی چاہیے۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں، اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت:۔ رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ کو روانہ کر دیا جاتا ہو۔ اگر ۲۵ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:۔ دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

(از محمد منظور نعمانی)

[الفرقان کی گزشتہ سے پیوستہ اشاعت (بابتہ ماہ جولائی) کے ان ہی صفحات میں ملک کے بہت زیادہ بگڑے ہوئے دیانت و اخلاق کے مسئلہ کی اہمیت ظاہر کر کے ملک کے معماروں اور خیر خواہوں کو اسکی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ پھر گزشتہ اشاعت (بابت اگست) میں اسکی وضاحت میں کچھ اور لکھا گیا۔ اس پر اردو کے وقیع اور سنجیدہ روزنامہ "قومی آواز لکھنؤ" نے "الفرقان" کے اصل مقصد و مدعا سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے دو تین اداریوں میں اس پر کچھ بحث کی' اور پھر "الفرقان" کے اصل مضمون کو بھی اپنے خاص کالموں میں بجنسہ شائع کر دیا اور اس طرح وہ بات خواص و عوام کے اس بہت بڑے حلقہ میں بھی پہنچ گئی جس تک الفرقان کی رسائی نہیں ہے ——— آج پھر اس مسئلہ پر کچھ اور عرض کیا جا رہا ہو ——— ملک کے وقیع اور با مقصد اخبارات سے استدعا ہے کہ اگر یہ موضوع ان کے نزدیک بھی اہم اور قابل توجہ ہو تو اس کو اپنی بحث کا موضوع بنائیں۔]

دیانت و اخلاق کا مسئلہ :-

ہمارے ملک میں اللہ نے جن لوگوں کو سوچنے والی عقل، سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھیں دی ہیں وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہو سکتے کہ دیانت و اخلاق کا مسئلہ ہمارے ملک میں بہت زیادہ بگڑا ہوا ہے اور یہ کہ یہ بگاڑ بجائے خود ایک بڑی برائی اور مہلک بیماری ہونے کے علاوہ ملک کی تعمیر و ترقی کی راہ میں بھی بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

لیکن "ملک کے بڑے" کبھی کبھی اپنے بیانوں میں اور پریس کانفرنسوں میں اس مسئلہ کا ذکر جس انداز میں کرتے ہیں اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بگاڑ جس انتہائی خطرناک حد تک پہنچا ہوا ہے اور اس سے ملک کو جتنا عظیم نقصان پہنچ رہا ہے اس کا ان کو صحیح علم و اندازہ نہیں ہے ——— اور اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں، کیونکہ انکا ذریعہ علم عام طور سے محکموں کی رپورٹیں ہوتی ہیں جن کا حال، خاص کر اس باب میں معلوم ہے ——— بہرحال ہمارے نزدیک یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ کو ملک کے ان بڑوں کی بھی خاص فکر و توجہ ابھی تک حاصل نہیں ہو سکی ہے جن کا ملک کے ساتھ خلوص اور جنکی نیک نیتی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

یہ ناچیز قریباً ۲۰ سال سے چونکہ سیاست کے میدان سے الگ رہ کر زندگی گزار رہا ہے اسلئے سیاسی جماعتوں کی اصطلاح کے مطابق تو وہ "عوامی آدمی" نہیں ہے لیکن اس لحاظ سے وہ بہت سے عوامی لیڈروں سے بڑا عوامی ہے کہ اپنی زندگی کی ایک خاص نوعیت کی وجہ سے عوام سے تعلق و رابطہ اور ان کے احوال و مسائل اور ان کے دکھ درد سے واقف ہونے کا جتنا موقع اس عاجز کو ملتا ہے غالباً ان لوگوں میں سے بہت کم کو اتنا ملتا ہوگا، جن کو آج کل عوامی لیڈر یا عوامی آدمی کہا جاتا ہے۔

اولاً تو میں نے ایک ایسے کام کو کچھ اپنا رکھا ہے جس کی وجہ سے مجھے عوام سے اور ان کو مجھ سے ملنے اور قریب رہنے کا بہت زیادہ موقع رہتا ہے۔ علاوہ اس کے میں کثیر الاسفار ہوں اور مدت سے میرا معمول ہے کہ اگر تھرڈ کلاس میں آرام سے سفر کرنے کا موقع ملے تو میں اسی میں سفر کرتا ہوں اور اگر وہاں تنگی اور تکلیف ہو تو سکنڈ کلاس میں اور اگر وہاں بھی ضروری درجہ کا آرام نہ مل سکے تو پھر (جیب میں پیسے ہونے کی صورت میں) فرسٹ کلاس میں بھی سفر کر لیتا ہوں ——— میرا تجربہ یہ ہے کہ عوام کے مختلف طبقوں کے حالات و خیالات اور ان کی برائی بھلائی کے مطالعہ کا جتنا بے تکلف اور بے پردہ موقع تھرڈ کلاس کے سفر میں ملتا ہے (بشرطیکہ آدمی کو اس مطالعہ سے دلچسپی ہو اور وہ اس کا اہل بھی ہو) اتنا شاید ہی کہیں اور مل سکتا ہو ——— اسی طرح ذرا اونچے کلاس کے لوگوں کے حالات و خیالات معلوم کرنے کا موقع بھی سکنڈ کلاس میں خوب ملتا ہے۔ اور اگر آدمی چاہے

تو عوامی مسائل پر غور و فکر کے لئے اس ذریعہ سے بڑا مواد حاصل کر سکتا ہے۔ میں کبھی کبھی سوچا کرتا ہوں کہ ہمارے وزراء اور بڑے لیڈر اگر گاہ بگاہ ملک کے ایک عام شہری کی طرح خاموشی سے تھرڈ کلاس اور سکنڈ کلاس میں سفر کر لیا کریں تو ملک اور عوام کی صحیح حالت سے وہ ذاتی طور پر اور براہ راست اتنے واقف ہو سکتے ہیں جتنے واقف ہونے کی ان کو واقعی ضرورت ہے ـــــ اس وقت صورت یہ ہے کہ ان بڑوں کی بعض باتوں سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہ اس دنیا سے بالکل الگ رہ کر یہاں کے مسائل کو سوچتے ہیں۔

خیر! یہ بات تو جملہ معترضہ کے طور پر زبان قلم پر آ گئی، ورنہ میں عرض یہ کرنا چاہتا تھا کہ چونکہ میں کثیر الاسفار ہوں اور ذہن فطری طور پر اس طرح کے مطالعہ اور غور و فکر کا عادی ہے، اسی لئے میں اپنے سفروں سے یہ فائدہ بھی اٹھاتا ہوں۔

آج کی صحبت میں، میں اس سلسلہ کے اپنے کچھ ذاتی تجربات و معلومات اور ان کی بنا پر لگائے ہوئے اپنے کچھ اندازے پیش کرتا ہوں جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دیانت و اخلاق کا بگاڑ کس حد تک پہونچ چکا ہے، اور ملک کو یہ کتنی مہلک اور خطرناک بیماری لگی ہوئی ہے۔

یوں تو ملک کا کوئی طبقہ بھی ایسا نہیں ہے جو بد دیانتی اور ناجائز ذریعوں سے دولت حاصل کرنے کی بری عادت میں مبتلا نہ ہو، لیکن اس میں سب سے بڑھا ہوا نمبر سرکاری ملازمین کا ہے۔ ـــــ مختلف قابل اعتماد ذریعوں سے میرے جو معلومات ہیں انکی بنا پر میرا اندازہ ہے کہ اس وقت صورت یہ ہے کہ جن محکموں میں بھی سرکاری ملازمین کو رشوت اور خیانت و بد دیانتی کے مواقع حاصل ہیں (اور زیادہ تر محکمے وہی ہیں) ان میں قریباً نوے فیصدی ضرور اس گندگی میں مبتلا ہیں۔

میرا ذاتی تجربہ تو صرف ریلوے کے محکمہ کا اور وہ بھی صرف ٹی ٹی صاحبان کا ہے، میں نے ابھی اوپر جیسا کہ عرض کیا ہے میں زیادہ تر سفر تھرڈ کلاس میں کرتا ہوں، لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہاں جگہ کی تنگی جب میرے لیے باعث تکلیف ہونے لگتی ہے تو میں حسب موقع اوپر کے درجے میں منتقل ہو جاتا ہوں، میرا نوے فیصدی سے کچھ زیادہ ہی کا یہ تجربہ ہے کہ جب میں ٹی ٹی آئی صاحب

کو تلاش کرکے ٹکٹ کی تبدیلی کے لئے کہتا ہوں تو وہ حساب لگا کے فرما دیتے ہیں کہ "اتنے پیسے ہوئے آپ مجھے یہ پیسے اور اپنا ٹکٹ دیدیجئے، اور منتقل ہو جائیے، میں ٹکٹ بنا کر اگلے اسٹیشن پر آپ کو خود پہونچا دونگا" ـــــ پھر سفر طے ہوتا رہتا ہے اور میں ان کا انتظار کرتا رہتا ہوں، دو چار اسٹیشن گزرنے کے بعد میں پھر انھیں تلاش کرتا ہوں اور ٹکٹ کے لیے تقاضا کرتا ہوں تو وہ بڑے "اخلاق" سے فرما دیتے ہیں کہ "ابھی تک میں بنا نہیں سکا ہوں، آپ اطمینان سے اپنی جگہ آرام فرمائیں میں بنا کر خود ہی آپ کے پاس پہونچا دونگا" یہاں تک کہ وہ اسٹیشن آجاتا ہے جہاں مجھے اترنا ہے، تو وہ بابو صاحب میرے پاس تشریف لاتے ہیں اور مجھے میرا صرف تھرڈ کلاس کا ٹکٹ واپس کرنا چاہتے ہیں اور جب میں ان سے کہتا ہوں کہ پیسوں کی رسید! تو وہ فرماتے ہیں کہ سفر آپ کا آرام سے پورا ہو گیا اب آپ رسید لے کر کیا کریں گے ـــ اس کے بعد میں ان سے کہتا ہوں کہ یہ مجرمانہ حرکت ہے اور چوری ہے اور آپ مجھے بھی اس میں شریک کرنا چاہتے ہیں گویا مجھے بھی چور اور بد دیانت سمجھتے ہیں، اور میں آگے کارروائی کرنے کی دھمکی دیتا ہوں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ حواس باختہ ہو کر میرے پیسے واپس کرنا چاہتے ہیں اور میری خوشامد کرنے لگتے ہیں، پھر میں جب ان سے کہتا ہوں کہ بھائی! میں اوپر کے کلاس میں سفر کر چکا اور زائد کرایہ میرے ذمہ واجب ہو چکا اور اس کو ادا نہ کرنا بد دیانتی اور چوری ہے اس لیے آپ کو مجھ سے پیسے لے کے رسید کاٹنی ہی ہو گی تاکہ ریلوے کے جو پیسے میرے ذمہ واجب ہو چکے ہیں وہ ریلوے کے خزانے میں پہونچ جائیں، تو وہ مجبور ہو کر رسید بناتے ہیں ـــــ

میں عرض کر چکا ہوں کہ میرا قریباً نوے فیصدی یہی تجربہ ہے۔ میں نے ایسے موقعوں پر اس پر بھی غور کیا کہ ان لوگوں کو سزا دلوانے کے لیے بات کو آگے چلایا جائے، لیکن اس پر میری طبیعت اولاً تو اس لئے آمادہ نہیں ہوئی کہ جب افسروں کے سامنے ان کا معاملہ جائے گا ان کی دیانت اور پاکدامنی کا بھی کچھ اندازہ ہے اور دوسری بڑی وجہ میرے آمادہ نہ ہونے کی یہ ہو کہ دفاتر اور عدالتوں میں اس طرح کے کاموں میں وقت اتنا برباد ہوتا ہے کہ جس کو اپنا وقت ذرا بھی عزیز ہو وہ سخت مجبوری اور اضطرار کے بغیر اس طرح کی کسی کارروائی میں حصہ لینے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا۔

بڑی رکاوٹ ہے، اس لئے خالص ملکی نقطۂ نگاہ سے بھی اس مسئلہ کی اہمیت کسی دوسرے ملکی مسئلہ سے کم نہیں ہے۔

ملک کے سچے خیر خواہوں کا فرض ہے کہ وہ اس مسئلہ کی واقعی نوعیت اور اہمیت کو سمجھیں اور اس کا مداوا سوچیں۔ ہم نے جہانتک غور کیا ہے ہماری رائے یہ ہو کہ اس بگاڑ کا سدھار اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ پورے خلوص اور عزم کے ساتھ اس کو ایک مستقل مہم بنا کر کام نہ کیا جائے۔

بات کافی طویل ہوگئی اسلئے اس کام کے طریقہ اور راستہ سے متعلق جو کچھ ہم کو عرض کرنا ہو وہ انشاء اللہ اب آئندہ صحبت ہی میں عرض کیا جا سکے گا۔

اسلام میں عبادت کا تصور

(از۔ ڈاکٹر محمد آصف صاحب قدوائی۔ ایم اے پی ایچ ڈی)

تمام مذاہب میں عقائد کے بعد سب سے زیادہ اہمیت عبادات کو دی گئی ہے۔ درحقیقت یہ دونوں ایک دوسرے کے ایسے لازم وملزوم ہیں کہ پہلے کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ترتیب کے اعتبار سے ایک کو دوسرے پر تقدم حاصل ہے۔ عقیدہ عبادت کا محرک، اس کا سبب اور اس کی علت ہے۔ اور عبادت اس کی غذا، اس کا ثبوت اور اس کا جسد ہے۔ اسی لیے یہ برابر دیکھنے میں آتا رہتا ہے کہ جتنی کمی یا کمزوری کسی شخص کی عبادت میں ہوتی ہے وہ دلیل ہوتی ہے اس کے عقیدہ میں اسی قدر کمی یا کمزوری کی خواہ اس کی فطرت کی خود فریبی اسے تسلیم کرنے سے کتنا ہی گریز کیوں نہ کرے، عقیدہ درخت ہے اور عبادت اس کا پھل ـــــ اور درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔

اسلام کی خصوصیت اس بارہ میں یہ ہے کہ دین کے مختلف شعبوں کی طرح اس نے عبادت کے مفہوم اور اس کے طریقوں کے متعلق بھی ایک ایسا جامع، واضح اور منضبط ہدایت نامہ پیش کیا جو ہر اعتبار سے بے نظیر ہے۔ چنانچہ اگر دنیا کے کل مذہبوں کے بانیوں اور داعیوں کے تعلیم و عمل کا مطالعہ اس پہلو سے کیا جائے کہ عبادت کے معنی پر کوئی تشفی بخش روشنی پڑ سکے۔ اور اس کے بہترین طریقوں کا علم حاصل ہو سکے تو حضور سرور کائنات ﷺ کی ذات ہی ایک ایسی نظر آئے گی جو واضح حقیقت کی طرف رہنمائی کر سکے۔

اسلامی عبادات کا اولین طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ تنہا خدا کی اور تنہا خدا کے لیے ہوتی ہے اس میں کسی دوسرے کو کسی بھی نوعیت سے شریک نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس میں نہ تو پیغمبروں کا

بڑی رکاوٹ ہے، اس لئے خالص ملکی نقطہ نگاہ سے بھی اس مسٔلہ کی اہمیت کسی دوسرے ملکی مسٔلہ سے کم نہیں ہے۔

ملک کے سچے خیرخواہوں کا فرض ہے کہ وہ اس مسٔلہ کی واقعی نوعیت اور اہمیت کو سمجھیں اور اس کا مداوا سوچیں۔ ہم نے جہاں تک غور کیا ہے ہماری رائے یہ ہو کہ اس بگاڑ کا سدھار اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ پورے خلوص اور عزم کے ساتھ اس کو ایک مستقل مہم بنا کر کام نہ کیا جائے۔

بات کافی طویل ہوگئی اسلئے اس کام کے طریقہ اور راستہ سے متعلق جو کچھ ہم کو عرض کرنا ہو وہ انشاءاللہ اب آئندہ صحبت ہی میں عرض کیا جاسکے گا۔

اسلام میں عبادت کا تصور

(از- ڈاکٹر محمد آصف صاحب قدوائی. ایم اے پی ایچ ڈی)

تمام مذاہب میں عقائد کے بعد سب سے زیادہ اہمیت عبادات کو دی گئی ہے۔ درحقیقت یہ دونوں ایک دوسرے کے ایسے لازم و ملزوم ہیں کہ پہلے کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ترتیب کے اعتبار سے ایک کو دوسرے پر تقدم حاصل ہے۔ عقیدہ عبادت کا محرک، اس کا سبب اور اس کی علت ہے۔ اور عبادت اس کی غذا، اس کا ثبوت اور اس کا جسد ہے۔ اسی لیے یہ برابر دیکھنے میں آتا رہتا ہے کہ جتنی کمی یا کمزوری کسی شخص کی عبادت میں ہوتی ہے وہ دلیل ہوتی ہے اس کے عقیدہ میں اسی قدر کمی یا کمزوری کی خواہ اس کی فطرت کی خود فریبی اسے تسلیم کرنے سے کتنا ہی گریز کیوں نہ کرے، عقیدہ درخت ہے اور عبادت اس کا پھل ـــــ اور درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔

اسلام کی خصوصیت اس بارہ میں یہ ہے کہ دین کے مختلف شعبوں کی طرح اس نے عبادت کے مفہوم اور اس کے طریقوں کے متعلق بھی ایک ایسا جامع، واضح اور منضبط ہدایت نامہ پیش کیا جو ہر اعتبار سے بے نظیر ہے۔ چنانچہ اگر دنیا کے کل مذہبوں کے بانیوں اور داعیوں کے تعلیم و عمل کا مطالعہ اس پہلو سے کیا جائے کہ عبادت کے معنی پر کوئی تشفی بخش روشنی پڑ سکے۔ اور اس کے بہترین طریقوں کا علم حاصل ہو سکے تو حضور سرور کائنات ؐ کی ذات ہی ایک ایسی نظر آئے گی جو واضح حقیقت کی طرف رہنمائی کر سکے۔

اسلامی عبادات کا اوّلین طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ تنہا خدا کی اور تنہا خدا کے لیے ہوتی ہے اس میں کسی دوسرے کو کسی بھی نوعیت سے شریک نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس میں نہ تو پیغمبروں کا

کوئی حصہ ہو، نہ ان کے گھر والوں کا اور نہ فرشتوں کا اور نہ ولیوں اور شہیدوں کا، اسلام کا یہ اٹل فیصلہ ہو کہ خدا کے علاوہ نہ تو زمین پر اور نہ آسمانوں میں کوئی شے یا ہستی ایسی ہو جو پرستش کے لائق ہو، جس کے سامنے انسان اپنی گردن جھکائے اور جس کی بارگاہ میں اپنی روح اور اپنے ضمیر کی انتہائی گہرائیوں سے کمال کی بندگی اور عبودیت کا نذرانہ پیش کرے۔

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (القرآن: انعام)	بلاشبہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اسی ایک اللہ کے لیے ہو جو کل جہانوں کا پروردگار ہو۔
اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا۔ (القرآن: مریم)	زمین و آسمان میں جو کوئی بھی ہو وہ ضرور ایک دن اسی مہربان خدا کے سامنے غلام بن کر آنے والا ہو۔

عبادت کی اصل غایت بندہ کا خالق کے سامنے بندگی و بے چارگی کا اظہار، اس رحمٰن و رحیم کی یاد، اس کے بے نہایت احسانوں کا شکریہ، اس کی حمد و ثنا اور اس کی بڑائی اور یکتائی کا اقرار ہے ـــــــ اور یہ اس وجہ سے نہیں کہ اس میں خالق مطلق کا کوئی فائدہ ہو، یا اس سے اس کی عظمت و کبریائی میں اضافہ ہوتا ہے، (ایک حدیث شریف میں ہے کہ "اگر کل جہان کے لوگ اعلیٰ درجہ کے پرہیزگار اور عبادت گزار ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کی شان اور اس کی بڑائی میں ذرّہ برابر زیادتی نہ ہوگی، اور اگر سب کے سب بدترین درجہ کے نافرمان اور فاسق و فاجر ہو جائیں تو اس کی عظمت اور بزرگی میں ذرّہ برابر کمی نہ ہوگی۔) بلکہ اس وجہ سے کہ اس میں بندہ ہی کا خاص الخاص فائدہ اور اس کی تخلیق کی تکمیل ہے، کیونکہ دل و دماغ اور نفس و روح میں صفائی و پاکیزگی پیدا کرنے اور بندہ کو خدا سے قریب کرنے اور اس کی خاص رضا و رحمت کا مستحق بنانے کا عبادت کے سوا کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے۔

چنانچہ عبادت کی حیثیت اصلاً اور اولاً روحانی اور ملکوتی ہے۔ لیکن آج کل چونکہ مزاجوں پر مادیت کا غلبہ ہو اور ظاہر و محسوس نفع کے علاوہ ہر چیز کا انکار فہم و دانش کی بلوغت

کی پہچان سمجھا جانے لگا ہو۔ اس لیے بعض حضرات اس سلسلہ کے فرائض و رسوم کی بھی تشریح دنیاوی فوائد کے زاویہ سے کرنے لگے ہیں۔ گویا کہ یہ چیزیں قدر کرنے اور اپنانے کے لائق دراصل اس وجہ سے ہیں کہ ان میں دنیوی ترقی کے کیسے کیسے راز پنہاں ہیں، مثلاً یہ کہ نماز کی اصل حکمت یہ ہو کہ اس سے ملت کو وقت کی پابندی اور امام کی اطاعت کی تعلیم ملتی ہو، یا روزہ قوت ارادی کو بڑھانے اور نظم و ضبط پیدا کرنے کا ذریعہ ہو، یا حج فرض اس مصلحت سے کیا گیا ہو کہ کل دنیا کے مسلمانوں کو ایک جگہ جمع ہو کر وقت کے مسائل پر غور کرنے کا موقع مل جایا کرے۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہو یہ اور اس قبیل کی تمام دوسری باتیں نتیجہ ہیں مادی نقطۂ نظر سے مرعوبیت اور مادی ترقی کی پرستش کا۔ جو لوگ اس طرز سے سوچتے ہیں انھوں نے مغرب کی تقلید میں مادیت کو اپنے دل و دماغ پر اس درجہ حاوی کر لیا ہو کہ اس عالم محسوسات کے علاوہ کسی دوسرے عالم پر ان کا ایمان یا تو رہ ہی نہیں گیا ہو یا اس قدر کمزور ہو گیا ہو کہ اس کی حیثیت بس ایک رسمی عقیدہ کی ہو گئی ہو۔ وہ خود اپنے ہی طلسم کے اسیر، اپنے ہی فریب نظر کے مارے ہوئے ہیں۔ انھوں نے مذہب و اخلاق کو بھی فلسفۂ افادیت کے ہاتھوں رہن کر دیا ہو۔

یہاں ہمارا مطلب یہ نہیں ہو کہ عبادت سے کوئی فائدہ ایسا نہیں حاصل ہوتا جس کا تعلق اس دنیا سے ہو۔ لیکن ان فائدوں ہی کو عبادت کا اصل مقصد قرار دے لینا ایسا ہی ہو جیسے کہ کوئی شخص آم کا درخت لگائے اور نظر اس کے پھلوں پر رکھنے کے بجائے یہ کہے کہ جب یہ درخت بڑا ہوگا تو اس کا سایہ کتنا گھنا ہوگا، اس کے پتوں سے کیسی اچھی کھاد تیار ہوگی، اور اس کی لکڑی کن کن مفید کاموں میں آئے گی۔

عبادت کے صحیح طریقوں کے متعلق انسان وحی الٰہی کا محتاج ہو۔ وہ اپنے عقل و حواس سے بطور خود اس کا تعین نہیں کر سکتا کہ وہ کون سے رسوم و اعمال ہیں جو تقرب الی اللہ اور تزکیۂ روح کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کی قوت فکر بس ایک حد تک ساتھ دے سکتی ہو، اور تزکیۂ روح و قرب خداوندی کے معاملات اس حد سے آگے کی چیز ہیں۔ ان معاملات میں تو صحیح رہنمائی بس وہی کر سکتا ہو جو اول و آخر بھی ہو اور ظاہر و باطن بھی۔

اسلام سے پہلے یہ خیال عام تھا کہ خدا کو خوش کرنے کے لیے بندہ کو چاہیے کہ وہ دنیا سے

روٹھ جائے، علائق ترک کر دے، اور کسی غار یا جنگل میں جا کے بیٹھ جائے، دینداری کا کمال اس میں سمجھا جاتا تھا کہ انسان اپنے اوپر زیادہ سے زیادہ تکلیف ڈالے، روح کی نشو ونما کا بس یہی ایک مجرب نسخہ تھا، یعنی جسم کو آزار دینا، اسی لیے لوگ اپنے جسم کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے تھے، کوئی کھانے پینے کی مرغوب چیزیں اپنے اوپر حرام کر لیتا تھا، کوئی اپنا ہاتھ خشک کر لیتا تھا، کوئی منوں لوہا اپنے اوپر لاد لیتا تھا، کوئی لیٹنے اور سونے سے قطعاً پرہیز کرتا تھا، کوئی ننگے بدن صحراؤں میں مارا مارا پھرتا تھا، کوئی وحشی درندوں کے غار، خشک کنوئیں یا قبرستان کو اپنا مسکن بنا لیتا تھا۔ کسی نے مجرّد رہنے کی قسم کھا رکھی تھی، زاہدان مرتاض اپنے بیوی بچوں سے دغا کر کے اور اُن کو دوسروں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر ویرانوں میں حق کی روشنی تلاش کیا کرتے تھے، اسلام نے ان غلو آمیز تصوّرات کی اصلاح کی۔ اس نے بتایا کہ جسم روح کا دشمن نہیں ہے۔ اور یہی نہیں، بلکہ ان دونوں کا وجود باہم ہی زندگی کی قدرتی اساس ہے، دین کا کام سختی نہیں، آسانی پیدا کرنا ہے۔ وہ بندہ کے لیے اسی حد تک ہے جو اس کی استطاعت کے اندر ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (القرآن، بقرہ)	خدا کسی کو اس کی گنجائش سے زیادہ کا مکلّف نہیں کرتا۔
يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (القرآن، بقرہ)	خدا تمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے سختی نہیں۔
وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (القرآن، حج)	اور تمھارے لیے دین میں خدا نے تنگی نہیں کی۔

انسان پر اگر اس کی روح کے حقوق ہیں تو اس کے جسم کے بھی حقوق ہیں۔

اسلام اس سے انکار نہیں کرتا ہے کہ مادّیات کی کثافتوں سے بَری اور پاک ہونے اور روح کو ملاء اعلیٰ کے فیضان کے قابل بنانے کے لیے کچھ ترکِ لذّات اور مشقّتِ نفس ضروری ہے، اسلامی عبادات میں سے روزے کی فرضیت اسی اصول پر مبنی ہے، لیکن جیسا کہ ان جملوں سے ظاہر ہوتا ہے، روزہ مرغوباتِ شہوانیہ سے تعلق کم کرنے کی ایک قسم کی دوا ہے، اور دوا کو ظاہر ہے کہ دوا ہی کی مقدار میں ہونا چاہیے۔ نہ اتنی کم کہ اس کا اثر ہی ظاہر نہ ہو سکے، اور نہ اتنی زیادہ کہ زندگی بھر دوا پینے کے سوا کوئی اور کام ہی نہ رہے۔ چنانچہ

اسلام نے سال کے بارہ مہینوں میں ایک مہینہ روزے کے لیے مقرر کیا، اور اس مہینہ کے بھی دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے صرف چودہ یا پندرہ گھنٹے، مسلمانوں سے کہا گیا کہ جس طرح تم سے پہلی والی اُمتوں کے لیے روزہ فرض کیا گیا تھا اسی طرح تمہارے لیے بھی فرض کیا گیا، ہمیشہ کے لیے یا کسی بڑی لمبی یا غیر معینہ مدت کے لیے نہیں بلکہ چند مقررہ دنوں کے لیے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ۔ — اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا جیسا کہ تم سے پہلی امتوں پر بھی فرض کیا گیا تھا، چند گنے ہوئے دن۔

(القرآن: بقرہ)

اور اسی کے فوراً بعد اُن رخصتوں اور آسانیوں کا بھی اعلان کیا گیا جو بعض معذوری کی حالتوں میں انسان کے لیے ضروری ہیں، مثلاً یہ اگر سفر یا بیماری کی مجبوری ہو تو ان دنوں کے بجائے دوسرے دنوں میں روزہ رکھ کر گنتی پوری کرلو۔

فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ۔ (بقرہ) — لیکن جو تم میں بیمار ہو یا سفر پر ہو، تو (اس کے لیے) دوسرے چند دنوں کی گنتی۔

اور جن کو کسی سچی مجبوری کے باعث روزہ رکھنا قطعاً دشوار ہو اُن کو کفّارہ کی اجازت ہو۔

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ۔ (بقرہ) — اور جو بمشکل ہی روزہ رکھ سکتا ہو وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے۔

لیکن ساتھ میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ قضا اور کفّارہ کی اجازت کے باوجود اگر کوئی دینی ذوق و شوق کے ماتحت روزہ رکھے تو یہ نہ رکھنے اور شرعی رخصت سے فائدہ اُٹھانے سے بہتر ہے۔

فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ۚ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ۔ (بقرہ) — تو جو کوئی شوق سے کوئی مزید نیکی کرے تو یہ بہتر ہے اس کے لیے اور (رخصت و اجازت کی صورتوں میں بھی، ہمت کر کے) روزہ رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانو۔

یہی حیثیت اعتکاف کی ہو جو روزوں کے زمانے کی ایک مزید عبادت ہو، یہ ایک امر مسلّمہ ہو کہ ذوقِ خدا طلبی کو اُبھارنے اور حاسۂ دینی کو ترقی دینے کے لیے یہ بہت مفید ہو کہ انسان وقتاً فوقتاً دنیوی تعلقات سے ایک حد تک اجتناب و بے نیازی اختیار کرے، اور اپنی توجہ عالمِ ناسوت کے بجائے عالمِ ملکوت پر رکھے تاکہ دُنیا کے جھمیلوں سے یکسو ہو کر وہ تھوڑی دیر کے لیے ملاءِ اعلیٰ کی پاک مخلوقات میں داخل ہو جائے، اور جس طرح ان کی زندگی کا مشغلہ محض طاعت و عبادتِ الٰہی ہو، اسی طرح وہ بھی اتنی دیر تک اپنی زندگی کا شغل حتی الامکان یہی بنالے، اس کے لیے اسلام نے رمضان کے آخری دس دنوں میں معتکف ہو جانے کا طریقہ مسلمانوں کو بتایا، مگر چونکہ کل مسلمانوں کے اس پر پابند ہو جانے میں بہت دشواریاں تھیں اور یہ قرینِ مصلحت بھی نہ تھا اس لیے اسے فرض نہیں کیا گیا بلکہ مستحسن قرار دیا گیا، وغیرہ وغیرہ۔

عبادات میں اسلام نے جو اعتدال کی تعلیم دی ہو اس کو اس واقعہ سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہو۔

"آنحضرت صلعم کے ایک صحابی تھے جن کا نام عثمان بن مظعون تھا۔ ان کی نسبت آپ کو معلوم ہوا کہ وہ دن رات عبادت میں مشغول رہتے ہیں، دن کو روزہ رکھتے ہیں اور رات کو سوتے نہیں ہیں، بیوی سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھتے ہیں، آپ نے ان کو بلوا کر دریافت کیا کہ "کیوں عثمان! تم ہمارے طریقہ سے ہٹ گئے؟"۔ انھوں نے جواب دیا "خدا کی قسم ہٹا نہیں ہوں، میں آپ ہی کے طریقہ کا طلب گار ہوں"۔ ارشاد ہوا "میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، عثمان! خدا سے ڈرو کہ تم پر تمھارے اہل و عیال کا بھی حق ہو، تمھارے مہمانوں کا بھی حق ہو، اور تمھاری جان کا بھی حق ہو، تو روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو، اور نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی"۔

اسی طرح اسلام نے یہ حقیقت بھی آشکار کی ہو کہ بندہ کے خالق سے تعلق کے دو رُخ ہیں۔ ایک براہ راست خالق کی طرف ہو اور دوسرا اس کی مخلوقات کی طرف، گویا کہ ایک کی نوعیت روحانی ہو اور دوسرے کی معاشرتی، چنانچہ قرآن نے 'عبادت' کا لفظ بھی دو علیحدہ علیحدہ معنوں میں استعمال کیا ہو۔ ایک معنی اصطلاحی ہیں جو تمام مذاہب میں مشترک ہیں یعنی وہ مخصوص اعمال جن کا تعلق

عبد و معبود کے سوا کسی تیسرے سے نہیں ہوتا اور جو محض اپنی عاجزی و درماندگی کے اقرار و اظہار اور خدا کی قدرت و عظمت کے سامنے اپنی گردن اطاعت خم کرنے کی خاطر بندہ بجا لاتا ہو، دوسرے معنی اس سے بہت زیادہ وسیع ہیں اور ان میں دُنیا کا ہر نیک اور اچھا کام شامل ہو۔ مثلاً یہ آیت کریمہ لیجئے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (اور میں نے جنوں کو انسانوں کو پیدا اسی لیے کیا ہو کہ وہ میری عبادت کریں)

یہاں 'عبادت' کا مفہوم عباداتِ اربعہ یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج تک محدود نہیں ہو بلکہ زندگی کی ساری نیکیاں اپنے دامن میں لیے ہوئے ہو، یہاں خلقت انسانی کا بحیثیت مجموعی مقصد ہی عبادت بتایا گیا ہو، اس طرح ہمارا سارا وجود اپنے تمام تنوع اور رنگارنگی کے ساتھ ایک واحد ذمے داری بن جاتا ہو جسے نہ روحانیت اور نہ مادیت کے الگ الگ خانوں ـــ یا خدا اور قیصر کی الگ الگ سلطنتوں ـــ میں بانٹا جا سکتا ہو، اور نہ جس کا کوئی جائز مطالبہ خدا کے عالم گیر نظامِ تخلیق سے باہر یا اس کا حریف ٹھیرایا جا سکتا ہو، یا، دوسرے الفاظ میں اسی مادی دنیا میں رہتے ہوئے ہمارا ہر فعل ایک عبادت بنایا جا سکتا ہو، بشرطیکہ ہم اپنے زاویۂ نظر کی تصحیح کرلیں اور اپنے تمام کاموں کا مقصد خدا کی رضاجوئی اور اس کے احکام کی بجا آوری بنالیں' جو شخص تمام مخلوق سے کنارہ کش ہو کر ہمیشہ کے لیے کسی غار یا جنگل میں بیٹھ جاتا ہو، وہ درحقیقت ابنائے جنس کے حقوق سے ـــ جو اسلام کی نظر میں خدا ہی کے حقوق ہیں ـــ قاصر رہتا ہو اور اس طرح اس کی عبادت ناقص اور ناکمل رہتی ہو، اسلام کا تصورِ عبدیت یہ ہو کہ انسان زندگی کی ساری ذمہ داریوں اور دنیا کے علائق میں سے ہر ایک کے متعلق جو اس کا فرض ہو اسے بخوبی ادا کرتے ہوئے خدا کی بندگی کا حق پورا کرے۔

ایک دفعہ کسی غزوہ میں ایک صحابی کا گزر ایسے مقام سے ہوا جس میں موقع سے ایک غار تھا، قریب ہی پانی کا چشمہ بھی تھا اور آس پاس کچھ جنگلی بوٹیاں لگی ہوئی تھیں، ان کو اپنی عزلت نشینی کے لیے یہ جگہ بہت پسند آئی، خدمتِ نبویؐ میں آکر عرض کیا کہ "مجھے گوشہ گیری کے لیے ایک بہت عمدہ جگہ ہاتھ آگئی ہو، سوچتا ہوں کہ وہیں جاکر ترکِ دُنیا کرلوں"۔ رسول اللہؐ نے جواب دیا کہ "میں یہودیت یا عیسائیت لے کر دُنیا میں نہیں آیا ہوں، میں آسان اور سہل اور روشن

"حنیفیت" (طرز ابراہیمی) لے کر آیا ہوں۔" (مسند امام احمدؒ، جلد ۵، ص ۲۶۶)

ایک صحابی حضرت سعد نے ایک بار دربار نبوی میں یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنی ساری دولت راہِ خدا میں صرف کر دیں، آپ نے ان کو سمجھایا کہ "اے سعد! تم جو کچھ بھی اس نیت سے خرچ کرو کہ اس کی غایت خدا کی رضا جوئی ہو۔ اس کا ثواب ملے گا حتیٰ کہ تم اس نیت سے جو لقمہ بھی اپنی بیوی کے منھ میں دو اس کا بھی ثواب ہو۔" اسی طرح ایک دفعہ آپ نے حضرت ابن مسعودؓ کو نصیحت فرمائی کہ "مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا نفقہ پورا کرے تو وہ بھی صدقہ ہو۔" ایک اور موقع پر آپ نے یہاں تک فرمایا کہ "جو شخص اپنی نفسانی خواہش جائز طور پر پوری کرتا ہو وہ بھی ثواب کا کام کرتا ہو۔" اس پر بعض صحابہ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! وہ تو اپنی نفسانی غرض کے لیے یہ کرتا ہو۔" آپ نے ارشاد فرمایا۔ "اگر وہ ناجائز طریقہ سے اپنی ہوس پوری کرتا تو کیا گناہ نہ ہوتا؟ پھر جائز طور پر پوری کرنے میں ثواب کیوں نہ ہو؟[۵]" (ـــــ بخاری، باب کل معروف صدقہ)

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہو کہ معاشرت کے وہ کام بھی جو عموماً دُنیا کے کام سمجھے جاتے ہیں، اگر ان کو اس طرح کیا جائے کہ ان کا محرک خدا کی اطاعت شعاری ہو تو وہ دنیا کے کام نہیں دین کے کام یعنی عبادات ہیں۔ کیونکہ عبادات اور غیر عبادات میں اصل فرق کاموں کا نہیں، نیت اور ارادہ کا ہو، اس کے برخلاف اگر اچھے سے اچھے کام نام و نمود یا کسی اور مادّی غرض کے ماتحت کیے جائیں تو ان میں کوئی خوبی نہیں رہتی، اور اللہ کے یہاں ان کا کوئی اجر نہیں ہے۔

اسلامی عبادات کی چند دوسری خصوصیات یہ ہیں کہ مسلمانوں کو عبادت کے وقت کسی باہر کی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی، نہ مورتوں اور مجسموں کی، نہ چاند اور سورج کی، نہ ناقوس اور گجر کی، نہ شمع اور فانوس کی، اور نہ آگ اور پانی کی، نہ کسی خاص طرز کا لباس پہننے کی حاجت ہے،

---

[۵] اس حدیث سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس معاملہ میں حسن نیت کے بغیر بھی ثواب ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہو کہ جو شخص اس معاملہ میں جائز و ناجائز کی تمیز کرتا ہو۔ اور جائز راستہ اختیار کر کے ناجائز سے بچنے کا قصد کرتا ہو وہ درحقیقت اس طور سے رضائے الٰہی کا طلبگار ہوتا ہو۔ اور یہی بنیاد ہو جس پر اس کو ثواب ملتا ہے۔ ع

نہ خوشبو جلانے کی ضرورت، اور نہ ساز و نغمہ کی قید، اسی طرح کسی مخصوص جگہ یا عمارت کی بھی محتاجی نہیں ہو، ساری دنیا مسلمان کی مسجد ہو، جب اس کا خدا یہاں، وہاں اور ہر جگہ موجود ہو تو اس کی عبادت بھی یہاں، وہاں اور ہر جگہ ہو سکتی ہو، ہوائی جہاز پر بھی سجدۂ نیاز اسی طرح ادا کیا جا سکتا ہو جس طرح اپنے گھر یا جامع مسجد میں۔

اسلام میں عبادت کے لیے کسی درمیانی وساطت کی بھی ضرورت نہیں ہو، خدا اور بندہ کے درمیان تعلق ایسا ہو کہ بندہ کو اس بارہ میں کسی مذہبی عہدہ دار کا رہین منت ہونے کی قطعی حاجت نہیں ہو۔ ہر مسلمان آپ اپنا "مذہبی عہدہ دار" ہو۔ وساطت کا عقیدہ درحقیقت عہد جاہلیت کی ایک یادگار ہو۔ جب خدا کی صفات کا صحیح علم نہ ہونے کے سبب سے لوگوں نے اپنے بادشاہوں کے عادات و اطوار پر قیاس کر لیا تھا کہ کسی مقرب خاص کا وسیلہ اختیار کیے بغیر اس تک رسائی مشکل ہو۔ اسلام نے آکر اس تخیل پر ضرب لگائی اور بتایا کہ یہ سب بے بنیاد تصورات ہیں۔ اس "وساطت" کے لیے کسی کے پاس کوئی دلیل و برہان اور کوئی فرمان الٰہی نہیں۔ یہ سب کم نظری کے گھڑے ہوئے بت ہیں، جن کے رشتے سے ذات الٰہی پاک ہو اور جن کی ضرورت سے وہ بے نیاز ہو۔ وہ اپنی ذات وصفات اور اپنی مرضیات و منہیات کا علم تو براہ راست بے شک مخصوص انسانوں ہی کو دیتا ہو اور پھر اس کو وقف عام کرا دیتا ہو، لیکن انسان کی سننے اور اس کا نذرانۂ عبودیت قبول کرنے کے لیے اس نے کوئی بھی درمیانی واسطہ نہیں رکھا ہو، وہ خود انسان کی رگ جان سے بھی قریب ہو اور اس قرب کے بعد ہر واسطہ بے معنیٰ۔

مسلمانانِ ہند کا مسئلہ

(از مولانا محمد اسحٰق صاحب سندیلوی استاذ ندوۃ العلماء لکھنؤ)

(۲)

مسئلہ معیشت معاش کے ذرائع متعدد ہیں، تجارت، زراعت، صنعت اور ملازمت وغیرہ وغیرہ، لیکن ہمارا موضوع یہاں یہ مشورہ دینا نہیں ہے کہ ان ذرائع کو کامیاب بنانے کے فنی طریقے کیا ہیں، اور نہ ہمیں یہ بتانا ہے کہ ان میں سے کون سے ذرائع زیادہ مفید اور نفع بخش ہیں کیونکہ یہ بات تجربات سے ثابت ہونے والی ہے اور وہ ہو چکی ہے، ہمارا موضوع دراصل دو چیزیں ہیں ایک یہ کہ جو سا بھی ذریعۂ معاش ہم اختیار کریں اس میں دینی نقطۂ نظر سے ہمیں کن باتوں کا لحاظ ضروری ہے؟ دوسری یہ کہ ہندستان کے موجودہ حالات میں کسب معیشت کے ان راستوں میں سے کسی راستے کو دین ہم پر بند تو نہیں کرتا، اور ان کاموں کے موجودہ وسائل اور مواقع کے سلسلہ میں کچھ ایسی پابندیاں تو عاید نہیں کرتا جن کے بعد ہم ان میدانوں کو اپنے لیے بہت تنگ پائیں، اور ہمارا اور اس ملک کے دوسرے باشندوں کا کوئی مقابلہ ہی نہ رہ جائے؟

پہلے مسئلہ میں جو بات یاد رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ کسب معیشت کا جو راستہ اور جو ذریعہ بھی اختیار کریں اُس میں ہمیں سچائی، خوش معاملگی اور ایفائے عہد کا پابند ہونا چاہیے، تجارت ہو تب، کارخانہ داری ہو تب اور ملازمت ہو تب! یہ چیز کامیابی کے گُروں میں سے بھی ایک اہم گُر ہے، اور دینی نقطۂ نظر سے بھی (جو ہمارا اصل موضوع ہے) اس کی اتنی اہمیت ہے کہ اسکی خلاف ورزی کے ساتھ جائز ذرائع سے پیدا کی ہوئی معیشت بھی ناجائز بن جاتی ہے۔

دوسرے مسئلے کے بارے میں کہنا یہ ہے کہ معاش کے جو ذرائع اوپر مثالاً گنائے گئے ہیں،

مخصوص حالات اور وسائل و مواقع کی حیثیت سے قطع نظر، اُن کے فی نفسہ جواز میں تو کسی کو بھی کلام نہیں ہو سکتا، لیکن ہم ہندستان کے موجودہ حالات میں بھی مطمئن ہیں کہ شرعاً یہ سب راستے اپنی بہت بڑی گنجائشوں کے ساتھ مسلمانوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں، اور انھیں اپنے معاشی حالات درست کرنے کے لیے ان سب راستوں پر پوری جسمانی اور دماغی اہلیت صرف کرنی چاہیے، اور بعض شعبوں میں جو رکاوٹیں ناگفتہ بہ حالات نے کھڑی کر دی ہیں انھیں تحمل اور حکمت کے ساتھ مسمار کرنے کی برابر کوشش کرنی چاہیے، ہم میں سے بعض لوگوں کا نقطۂ نظر یہ بھی ہو کہ ان ذرائع میں سے بعض کا تو بہت بڑا دائرہ موجودہ صورت حال میں شرعاً ہمارے لیے ممنوع الدخول ہو، اور اس کی اجازت صرف اضطراری حالتوں میں ہو سکتی ہو، یہ دائرہ ملازمت کے باب میں سرکاری ملازمتوں کا دائرہ ہو، جو ظاہر ہو کہ ملازمت کے باب میں سب سے بڑا اور سب سے اہم دائرہ ہو، علاوہ ازیں کسب معیشت کے دوسرے میدانوں کو یہ حضرات مسلمانوں پر اس طرح تنگ کرتے ہیں کہ زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت وغیرہ کے سلسلہ میں موجودہ نظام حکومت کے تحت جو وسائل اور سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں، اُن کے طریق فراہمی میں شرعی نقطۂ نظر سے بعض قباحتیں نظر آنے کی وجہ سے یہ لوگ ان وسائل اور سہولتوں سے انتفاع ہی کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ ان سہولتوں اور وسائل کی مثالیں، جیسے تقاوی اور کوآپریٹیو سوسائٹیوں کا سسٹم۔

ہماری رائے میں یہ نقطۂ نظر علی العموم غلط ہو اور اس غلطی کی بنیاد ایک تو یہی ہو کہ ان مسائل کو ایک قوم کے مسائل سمجھ کر نہیں سوچا جاتا، بلکہ فرد کے مسئلہ کی طرح سوچا جاتا ہو، اور دوسرے بعض اصولوں کا اطلاق خواہ مخواہ وسیع کر دیا گیا ہو۔

سرکاری ملازمتوں کو یہ کہہ کر علی الاطلاق حرام کیا جا رہا ہو کہ یہ نظام باطل سے تعاون ہو۔ میرا مقصد ہرگز یہ نہیں ہو کہ ہندستان کے موجودہ نظام حکومت میں ہر قسم کی سرکاری ملازمت مسلمان کے لیے جائز ہو، مقصد صرف اتنا ہو کہ محض غیر مسلموں کا غلبہ یا نظام سلطنت کا غیر اسلامی ہونا، ملازمتوں کے عدم جواز کا سبب نہیں بن سکتا، اس کے بعد خود ملازمت کی نوعیت کا مسئلہ باقی رہ جاتا ہو، جن ملازمتوں میں اپنے موضوع لہٗ کے اعتبار سے بلاواسطہ یا بواسطۂ قریب کسی حرام یا مکروہ تحریمی کا ارتکاب لازم آتا ہو ان کے جواز کا فتویٰ کون دے سکتا ہو؟ ایسی ملازمت تو

کسی مسلمان حکومت میں بھی جائز نہیں، لیکن ہماری شریعت کا مزاج یہ بھی نہیں ہو کہ "خونِ پروانہ کے خوف سے" گُل کو باغ میں جانے سے" رد کا جائے۔ جس ملازمت کے اصل فرائض میں کسی حرام یا مکروہ تحریمی کا ارتکاب داخل نہ ہو، اس کے جواز میں اس لیے کلام کرنا کہ اس خدمت کا فائدہ واسطہ در واسطہ ہو کر، ایک رُخ سے بہر حال نظام باطل کو پہونچتا ہو۔ مزاجِ شریعت سے ناواقفیت اور قلتِ تفقہ کی دلیل ہو۔

اس کے علاوہ اجتماعی نقطۂ نظر سے غور کیجیے تو سرکاری ملازمت کا معاملہ اور بھی اہم ہے۔ ذرا ایک ایسے وقت کا تصور کیجیے کہ سرکاری دفاتر اور اعلیٰ عہدوں پر کوئی ایک مسلمان بھی نظر نہ آتا ہو، اس صورتِ حال کا کیا اثر پڑے گا مسلمانوں کے دل و دماغ پر؟ کس مپرسی اور زبوں حالی کا کتنا شدید احساس ہوگا جو ان کے اجتماعی وجود کو ہلا کر رکھ دے گا! اور علاوہ اس تباہ کن احساس کے، کتنے عملی نقصانات ہوں گے؟ — پھر ذرا یہ بھی سوچیے کہ سرکاری امور سے واقفیت اور نظم و نسق کے تجربہ کا کیسا زبردست خلا اس قوم میں پیدا ہوگا کہ کچھ دن کے بعد سو پچاس ایسے آدمی ملنے مشکل ہوں گے جو سرکاری سطح کی ذمہ داریاں سنبھال سکیں، کوئی ٹھکانا ہو ان اجتماعی نقصانات کا؟ — ایسی صورت میں سرکاری ملازمتوں سے بالکلیہ کنارہ کشی کا مشورہ وہی شخص دے سکتا ہو جو چار کروڑ کی قوم کے مسائل کو دس بیس آدمیوں کا مسئلہ سمجھتا ہو، اور ان ملازمتوں کا دروازہ کوئی ایسی شریعت ہی کسی قوم پر بند کر سکتی ہو جس میں اجتماعی مصالح کی کوئی رعایت اور قومی مسائل کی نزاکتوں کا کوئی لحاظ نہ ہو۔

مسئلہ کا یہی اجتماعی پہلو دوسرے ذرائع معیشت کے باب میں بھی فیصلہ کن ہو۔ مسلمان ٹیکس دینے اور دوسرے محاصل ادا کرنے میں تو برابر کے شریک اور اس پر مجبور رہوں، اور ان آمدنیوں سے جب حکومت کسی اجتماعی اسکیم کے تحت عام باشندگانِ ملک کے لیے کچھ سہولتوں اور ترقیاتی وسائل کا انتظام کرے تو ان سے نفع اٹھانے سے وہ اجتناب کریں، آخر اس کا حشر کیا ہوگا؟ اور قومی سطح پر اس کے نتائج کیا نکلیں گے؟ حکومت جو قرضے دیتی ہو۔ یا دوسرے وسائل فراہم کرتی ہو وہ کوئی اپنی جیب سے تو نہیں کرتی۔ وہ روپیہ ہمارا آپ ہی کا ہوتا ہو۔ پھر اگر حکومت اس سے انتفاع کے لیے کچھ ایسی شرطیں رکھتی ہو جنھیں اسلامی نظام حکومت میں

پسند نہیں کیا جاتا، تو حکومت کا یہ طریق کار ہمارے لیے تنگی کا موجب کیونکر ہو سکتا ہو۔ اور اسکی وجہ سے ہم اپنے جائز حق سے کیوں محروم ہو سکتے ہیں؟۔

بہر حال میرے خیال میں ملک کے موجودہ نظام حکومت میں بھی مسلمانوں کے لیے یہ تمام ذرائع معاش شرعاً اپنی بڑی گنجائشوں کے ساتھ کھلے ہوئے ہیں۔ اور وہ محنت و مشقت، صداقت و دیانت، حسن تدبیر اور باہمی امداد سے کام لے کر آج کی ساری دقتوں کے باوجود اپنے معاشی مسئلہ کو بھی بقدر ضرورت حل کر سکتے ہیں۔

مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمانوں کا معاشی مسئلہ ملک کے عام معاشی مسئلے سے الگ نہیں ہو، یہ نہیں ہو سکتا کہ ملک کی جو عام اقتصادی حالت ہو وہی رہے اور مسلمانوں کی یا کسی بھی مخصوص گروہ کی حالت من حیث الکل بہتر ہو جائے، ملک کی دولت اور پیداوار میں اضافہ نہ ہو اور مسلمانوں کے یہاں فارغ البالی کا دور دورہ ہو جائے۔ معاش کا مسئلہ پورے ملک کا ایک مسئلہ ہو، اس لیے ضروری ہو کہ ملک میں تعمیر و ترقی کی جو مفید اسکیمیں چل رہی ہوں اُن کو کامیاب بنانے کی بھی پوری کوشش کی جائے۔ اور اس سلسلہ کے منصوبوں کی تکمیل میں حسب استطاعت پورا پورا حصہ لیا جائے، البتہ اگر کسی خاص چیز میں شرکت کے ناجائز ہونے کا شبہ ہو تو اس کو علماء کے سامنے پیش کر کے اس کا حکم معلوم کرنا چاہیے — ملک کی تعمیر و ترقی کے منصوبوں میں شرکت صرف اپنے ہی لیے ضروری نہیں، بلکہ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہو کہ یہ عام انسانی ہمدردی کا تقاضا ہے جو ہمارے دین کی تعلیمات کا ایک اہم جزو ہو۔ اس خصوص میں سورۂ یوسف پر پھر نظر ڈالیے تو وہاں ہمیں حضرت یوسف علیہ السلام کا عملی اسوہ بھی اس تقاضہ کی طرف رہنمائی کرتا نظر آئے گا، مصر شدید غذائی بحران کا شکار ہونے جا رہا تھا۔ آپ نے شاہ مصر کو اس معاملے میں مفید مشورے دیے، اور جب ان مشوروں کی وجہ سے شاہ نے آپ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا تو آپ نے اس مسئلہ میں اپنی مستقل خدمات پیش کیں، اور پھر یہی گراں بہا خدمات آپ کے لیے مکمل اقتدار کا ذریعہ بن گئیں۔ تو گویا ملک کی تعمیر و ترقی کے منصوبوں میں اشتراک و تعاون ہمارے اپنے معاشی مسئلے کا بھی تقاضہ ہو۔ انسان دوستی کا بھی تقاضہ ہو۔ اور اگر اس معاملہ میں ہم کوئی ممتاز خدمت انجام دے سکیں

تو یہ باعزت سیاسی ترقی کا بھی زینہ ہے۔

اس اسوۂ یوسفی سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہو کہ ایک غیر اسلامی اقتدار کے تحت، باہر رہتے ہوئے (صرف رضاکارانہ طور پر) ہی نہیں، بلکہ اس نظام اقتدار میں باقاعدہ شریک ہو کر بھی وہ تمام خدمات انجام دی جا سکتی ہیں جو پبلک کی جائز خدمات سے تعلق رکھتی ہیں۔ خواہ یہ شرکت اعزازی طور پر ہو یا ملازمت کے طور پر ۔ البتہ ہماری نیت درست ہونی چاہیے۔ اور ہمارے سامنے جائز اور اسلامی مقاصد ہونے چاہئیں، نہ کہ باطل کی چاکری اور اس کی تقویت کا قصد۔ اس معاملہ میں بھی یوسف علیہ السلام ہمارے لیے بہترین اسوہ ہیں۔

ملکی سیاسیات مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ بھی موجود ہو جو ان کے لیے سیاست کے موجودہ کاروبار سے کلی علیحدگی اور کنارہ کشی ضروری سمجھتا ہو اور انھیں مشورہ دیتا ہو کہ ملک کے اس وقت کے نظام سیاست سے وہ بس بایں طور تعلق رکھیں کہ اس پر تنقید کریں اور اور اہلِ ملک پر اُس کی اصولی اور فروعی غلطیاں واضح کریں، بے شک ہمیں اختیار ہو تو ہم اس نظام کے اندر بہتر سے بہتر بنیادی تبدیلیاں کریں۔ اور یہ بھی ہمارا فرض ہو کہ ہم اگر اس کو بدل ڈالنے کی قوت نہیں رکھتے تو تحریر و تقریر کی جو کچھ آزادی ہمیں میسر ہو، اس سے کام لیتے ہوئے ہمارے اہلِ علم و فہم موجودہ نظامِ سیاست پر تعمیری تنقید کریں اور ہندوستانی عوام کے ذہن و فکر کو ایک ایسے نظام کے لیے آمادہ کریں جس میں ہم سب کی بھلائی اور نوعِ انسانی کی حقیقی فلاح ہو لیکن اس میں یہ غلو کہ چار کروڑ افراد کی قوم کو سیاسیات سے عملاً یکسر کنارہ کش ہو جانے کا مشورہ دیا جائے، یہ کسی طرح بھی قابلِ تائید بات نہیں ہو۔ نہ عقلاً نہ شرعاً۔

آخر جب ہمیں اس ملک میں رہنا ہو۔ اور موجودہ نظامِ سیاست کی ساخت یہ ہو کہ ہماری زندگی کے مشکل سے چند گوشے ایسے نکل سکتے ہیں جو اس نظام کے اثرات سے آزاد رہ سکیں، اور وہ اثرات غلط اور مضر قسم کے بھی ہو سکتے ہیں۔ دینی نقصان کے حامل بھی اور مادی نقصان کے حامل بھی! پس ایسی صورت میں یہ کون سی عقل مندی ہو۔ اور کون سا معقول دین ہمیں یہ حکم دے سکتا ہو کہ ہم اپنی دینی اور دنیوی زندگی کو کلیتہً دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر سب کے سب بس تنقید اور دعوت الی نظام الخیر میں لگے رہیں۔ اور جب تک نظام میں بنیادی تبدیلیاں نہ

ہوجائیں اس وقت تک ہم اپنے حق میں اس نظام کی مضرتوں کو اس درجہ میں کم کرنے کی بھی کوشش نہ کریں جس درجہ میں، بحالت موجودہ ہم کر سکتے ہیں ـــ میرا یہ مقصد نہیں ہو کہ آج ملکی سیاست میں حصہ لینے والے بیشتر مسلمان جس انداز پر حصہ لیتے ہیں وہ سب بھی صحیح ہو۔ اس میں تو بڑی اصلاح کی گنجائش اور ضرورت ہو۔ آج جو مسلمان اس میدان میں حصہ لیتے نظر آتے ہیں اُن کے سامنے عموماً کوئی دینی اور ملّی مقصد نہیں ہوتا، ذاتی اغراض اور دیگر محرکات ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اُن کا اندازِ عمل بھی مختلف ہوتا ہے، میرا مقصد صرف یہ ہو کہ موجودہ حالات میں اگر اچھے انداز میں اور اچھے مقاصد کے ساتھ مسلمانوں کا ایک طبقہ ملکی سیاسیات میں حصہ لیتا رہے تو یہ نہ صرف صحیح بلکہ ضروری ہو۔

جن لوگوں کے نقطۂ نظر سے یہاں بحث کی جارہی ہو وہ موجودہ نظامِ سیاست میں حصہ لینے کو اس بنیاد پر منع کرتے ہیں کہ یہ نظام "حاکمیتِ جمہور" کے تصور پر مبنی ہے۔ پس اس میں حصہ لینا "حاکمیت الٰہ" کے عقیدے کے منافی ہو، جو اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے"۔ لیکن یہ محض مغالطہ اور زبردستی کی قیاس آرائی ہو۔ ہم "حاکمیت الٰہ" کا عقیدہ جس انداز پر رکھتے ہیں، "حاکمیت جمہور" کا کوئی بھی قائل اپنے اس خیال میں وہ انداز نہیں رکھتا۔ ہم اپنے اس عقیدے کی بنا پر اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں میں "حرمت" کا اور اس کی جائز کی ہوئی چیزوں میں "حلت" کا جو اعتقادی (اور قلب کی گہرائیوں میں پیدا ہونے والا) تصوّر رکھتے ہیں۔ "حاکمیتِ جمہور" کا قائل قانون ساز جمہوری اداروں کے صادر کیے ہوئے جواز اور عدم جواز کے "فتووں" کے بارے میں اس تصور سے قطعاً ناآشنا ہو۔ ہم اللہ کے امر و نہی کی اگر تعمیل کرتے ہیں تو صرف اس بنیاد پر کہ اس ذاتِ عالی کو حق ہے کہ جو چاہے حکم دے اور ہمارا کام ہو کہ بے چون وچرا اطاعت کریں، نیز یہ کہ اس کے حکم میں اس کی ذات کا سا تقدس ہو، اور ہماری سعادت ہو کہ اس کے ہر حکم پر سر جھکا دیں، وہ خطا و نسیان سے پاک ہو اور اس کے احکام میں بھی کوئی شائبہ نقص نہیں ہوسکتا۔ یہ تصورات ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر ہم اوامر و منہیات الٰہی کی تعمیل کرتے ہیں۔ لیکن نظام جمہوریت کو سب سے بہتر نظام سمجھنے والا اور اس کے ماتحت کوئی رضامندی کے ساتھ زندگی بسر کرنے والا بھی عوام

قانون ساز اداروں کے احکام کی تعمیل میں ان تصورات سے قطعاً نا آشنا ہوتا ہے اور یہی نہیں، بلکہ وہ ان احکام کو چیلنج بھی کرتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں آئے دن ترمیمات ہوتی ہیں، حتیٰ کہ دستور، جس کے "تقدس" کا بعض رسوم سے وہم ہوسکتا ہے وہ بھی ترمیم و تنسیخ کی زد میں آتا ہے — الغرض "حاکمیت جمہور" کے سیاسی تصور کا مثبت پہلو محض لفظی اشتراک سے "حاکمیت الٰہ" کے دینی عقیدے کے قطعاً منافی نہیں ہوتا، رہا اس کا منفی پہلو، تو حقیقت میں وہ تو صرف انفرادی حاکمیت یا طبقاتی حاکمیت کی نفی سے تعلق رکھتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس پہلو کو "حاکمیت الٰہ" کی نفی تک دراز کر دیتا ہے، تو پھر اس پہلو سے "حاکمیت جمہور" کا تصور بیشک "حاکمیت الٰہ" سے ٹکراتا ہے، مگر یہ ایک شخص کا اپنا فعل ہے، خود حاکمیت جمہور کے سیاسی تصور میں یہ چیز لازماً مضمر نہیں ہے، اور اس بنا پر اس میں کوئی اشکال نہیں کہ ہم حاکمیت الٰہ کا عقیدہ بھی رکھیں اور ہمارے ملک کا سیاسی نظام جب حاکمیت جمہور کے تصور پر چل رہا ہو، اور ہم اس کو حاکمیت الٰہ پر مبنی نظام سے بدلنے کی فوری طاقت نہ رکھتے ہوں تو جب تک یہ پوزیشن رہتی ہے ہم اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے اسی نظام کے ماتحت سیاست میں حصہ لیں[1]۔ اور اس میں جو مواقع ہمیں ملک کی جائز خدمت کے ملیں، اُن سے بھی وطن دوستی اور خلقِ خدا کی خیر خواہی کے ماتحت فائدہ اُٹھائیں۔

لیکن یہ واضح رہے کہ مسلمانوں کے سیاست میں حصہ لینے سے یہ صحیح اور ضروری مقاصد اسی وقت پورے ہوسکتے ہیں، جب ان میں کوئی ایسی مضبوط ملّی تنظیم اور ان بنیادوں پر ان کی رہنمائی کرنے والی قیادت پیدا ہوجائے جو اس وقت مفقود ہے — مسئلہ کا یہ پہلو ذرا اور تفصیل کا محتاج ہے، مگر اس مضمون میں اس کا موقع نہیں، اس وقت اس اشارہ ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

عام اصول اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا تعلق زیادہ تر زندگی کے چند مخصوص اور اہم ترین شعبوں کے ساتھ ہے، آئندہ سطروں میں چند ایسے عام اصولوں

---

[1] اس کی یہی صورت نہیں کہ مسلمان نمائندے اسمبلی اور پارلیمنٹ میں جائیں، بلکہ غیر مسلم نمائندوں میں سے کوشش کرکے اچھوں کو منتخب کرانا بھی اسی میں داخل ہے۔

کی طرف توجہ دلاتا ہوں جن کے متعلق میری قطعی رائے یہ ہے کہ ہندی مسلمانوں کو ان پر عمل کرنا لازم ہے۔ اگر وہ انھیں نظر انداز کریں گے تو سخت نقصان اٹھائیں گے جو بعض صورتوں میں ناقابل تلافی ہو گا۔

(۱) صبر و ضبط۔ عرض کر چکا ہوں کہ اس ملک کی اکثریت میں وسعت قلب مفقود ہے۔ صرف گنے چنے افراد ایسے نکل سکتے ہیں جن میں یہ عنصر ضرورت کی حد تک موجود ہو، لیکن مجموعی حیثیت سے اس کا فقدان آفتاب سے زیادہ روشن ہے، ہو سکتا ہے کہ آئندہ اکثریت کی یہ کمزوری دور ہو جائے لیکن ہمیں اس بارے میں زیادہ پر امید نہ ہونا چاہیے۔ اور صرف چند لیڈروں کے بیانات سے حد سے زائد امیدوں کی پرورش نہ کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنا رویہ اپنے دین کے مطابق رکھنا چاہیے جو ایسے حالات میں صبر و ضبط کی تعلیم دیتا ہے۔ مشتعل ہونا اور اشتعال کی حالت میں کوئی اقدام کرنا مضر ہی نہیں مہلک بھی ہو سکتا ہے۔ کیسی ہی اشتعال انگیزی ہو، ہمیں صبر کے حدود سے گزرنا نہ چاہیے۔ یہ یاد رکھیے کہ صبر کے معنی بزدلی کے نہیں ہیں۔ حکومت یا اکثریت کی ہر جائز و ناجائز بات کو قبول کر لینا اول درجہ کی بزدلی ہے۔ اس سے بچنا لازم ہے، لیکن نتائج سے بے پروا ہو کر کوئی عملی قدم اٹھانا بھی حماقت میں داخل ہے، صبر و سکون کے ساتھ حق بات پر ثابت قدم رہنا اور مناسب تدبیر کرنا ہی صحیح طریق کار ہے۔ اکابر اور قوم کے لیڈروں کی حکمت عملی کا اظہار اسی صورت سے ہو سکتا ہے کہ وہ خود بھی حق پر ثابت قدم رہیں اور عوام مسلمین کو بھی اس پر ثابت قدم رکھیں لیکن باوجود اس کے عوام کو حتی الامکان کسی آزمائش میں نہ ڈالیں۔ اور ان کے حق میں ان گنجائشوں سے پورا فائدہ اٹھائیں جو اسلام نے عوام کے لیے رکھی ہیں۔

۲۔ حزم و احتیاط۔ ہمارا کوئی قدم محض جذبات کی بنا پر نہ اٹھنا چاہیے، اکثریت میں جن لوگوں کی قیادت صرف تعصب و نفرت انگیزی کی مرہون منت ہے وہ ایسے موقع کی تاک میں رہتے ہیں، کوشش کرتے ہیں کہ مسلمان مشتعل ہو کر کوئی ایسا قدم اٹھائیں کہ ہمیں عوام الناس کو ان کے خلاف مشتعل کرنے کا موقع مل جائے، اس طرح فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا کر ایک طرف مسلمانوں کو اس میں جلایا جائے اور دوسری طرف اپنی لیڈری کی ہانڈی پکائی جائے۔ قرآن مجید اسوۂ موسوی (علیہ السلام) کی شکل میں ان اصول کی طرف رہنمائی فرما رہا ہے۔

(۳) **شرعی اجتماعی نقطۂ نظر** ۔ مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کو چند افراد یا چند شہروں اور قصبوں کو سامنے رکھ کر نہ دیکھنا چاہیے، بلکہ پوری قوم کو پیش نظر رکھ کر ان پر نظر کرنا چاہیے۔ ہر قدم سے پہلے غور کر لینا چاہیے کہ اس کا اثر ہماری پوری قوم پر کیا ہوگا؟ اور شریعت ایسی صورت میں کیا کہتی ہے، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انفرادی خودکشی کی طرح اجتماعی خودکشی بھی ناجائز ہے۔

(۴) **اجتماعی فیصلہ** ۔ اجتماعی امور کے متعلق فرد واحد کو کسی فیصلہ کا ہرگز اختیار نہیں ہے۔ جو مسئلہ پوری قوم سے وابستہ ہو اور جس اقدام کا اثر سب مسلمانوں پر پڑتا ہو اس کے متعلق کسی فیصلہ کا حق پوری قوم کے سرکردہ لیڈروں کو پہونچتا ہے نہ کہ چند افراد کو، یہ طریقہ بالکل غلط اور خلاف شریعت ہے کہ ایسے معاملہ میں کوئی ایک لیڈر یا اخبار نویس اٹھا اور کسی تحریک کا فیصلہ کر دیا۔ آیۂ کریمہ۔

وَلَوْ رَدُّوْهُ إِلَى الرَّسُوْلِ وَإِلٰى أُولِى الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ	اور اگر وہ ان باتوں میں رسول اور اپنے جماعت کے صاحبان اقتدار کی طرف رجوع کرتے تو ذی فہم حضرات اسے اچھی طرح سمجھ لیتے۔

ان دونو اصول کو بتا رہی ہے۔

(۵) **ذہنی تفوق و حسن تدبیر** ۔ تاریخ بتاتی ہے اور آج بھی دنیا کے بعض واقعات شہادت دے رہے ہیں کہ بسا اوقات اقلیت باوجود قلت تعداد اکثریت پر سیاسی اعتبار سے حاوی ہو جاتی ہے اور مملکت کے سیاہ و سفید پر اسے قابو حاصل ہو جاتا ہے، امریکا میں یہود کی تعداد چھ فیصدی سے زائد نہیں ہے، مگر ہر مبصر سمجھ سکتا ہے کہ اس کی مقدرانہ سیاست کی باگ ڈور یہود ہی کے ہاتھ میں ہے۔

اسی طرح امریکہ کی ایک ریاست میں کچھ عرب مسلمان آباد ہیں جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے مگر اپنی اعلیٰ درجہ کی ذہنی قابلیت اور حسن تدبیر و تدبر کی وجہ سے اس ریاست کی سیاست پر حاوی ہیں اور وہاں کی حکومت ان کی رضاجوئی کو ضروری سمجھتی ہے مسلمانان ہند اگر مایوسی کو چھوڑ کر حزم و ہمت سے کام لیں، اور اعلیٰ درجہ کی علمی و ذہنی قابلیت پیدا

کرکے اپنے حسنِ تدبر کا سکہ اکثریت کے دل پر بٹھا دیں۔ اس کے ساتھ اپنے اسلامی کردار و اخلاق کا اظہار کریں تو باوجود اقلیت میں ہونے کے انشاء اللہ کچھ ہی عرصہ کے بعد وہ ملک کی سیاست و قیادت پر حاوی ہو جائیں گے اور اکثریت ان کی قدر و عظمت کرنے پر مجبور ہوگی۔ ایک طرف ان کی اعلیٰ قابلیت اکثریت سے خراجِ تحسین وصول کرے گی تو دوسری طرف ان کی سچائی، دیانتداری، فرض شناسی، للّٰہیت، عوام کی بہی خواہی، وسیع القلبی، دوسرے اسلامی اخلاق ان سے ہدیۂ عقیدت حاصل کریں گے۔

مخالفانہ عوامی تحریکوں سے احتراز

میں عرض کر چکا ہوں کہ جمہوری نظمِ حکومت نے حکومت اور عوام کی دوئی کو دور کر دیا ہے اور قدرتاً اکثریت ہی کا نام حکومت ہو گیا ہے۔ ان حالات میں جو عوامی تحریک کسی اقلیت کی طرف سے حکومت کے خلاف اٹھائی جائے گی وہ حکومت تک محدود نہیں رہ سکتی بلکہ اکثریت خود اس کا رخ اپنی طرف پھیر لے گی۔ یہ چیز مسلمان کی پوزیشن کو بہت نازک اور خطرناک بنا دیتی ہے۔ اس لیے میری قطعی رائے یہ ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمانانِ ہند اگر کسی وجہ سے حکومت سے شاکی ہوں اور اپنی شکایت کا اظہار آئینی ذرائع سے کرنا چاہیں تو ان کے لیے صرف ایک راستہ ہے کہ صرف ان کے خواص یعنی بڑے بڑے لیڈر احتجاج کریں۔ مسلم عوام میں ایسی کسی تحریک کا پھیلانا نفع سے خالی اور نقصانات اور خطرات سے بھرا ہوا راستہ ہے۔ سابقہ تجربات اس کی تائید کرتے ہیں۔

شخصی قانون اور اپنی تہذیب کی حفاظت

حفاظتِ دین کی پوری امکانی کوشش تو ناگزیر ہے ہی لیکن بحالتِ موجودہ دو چیزوں کی حفاظت کی طرف خصوصی توجہ کی حاجت ہے۔

(الف) مسلم شخصی قانون (مسلم پرسنل لا) مناسب طریقے سے اسکی کوشش برابر جاری رہنا چاہیے کہ حکومت ہمارے اس قانون کو تسلیم کر لے اور اس پر عملدرآمد کے لیے ہمیں سہولتیں دے۔ اس کے علاوہ بقدر استطاعت خود ہمیں اس پر عمل کرکے اس کی حفاظت کرنا چاہیے۔

(ب) ہماری مروجہ تہذیب خالص اسلامی تہذیب نہیں ہے۔ تاہم اس میں اچھے خاصے اجزا اسلامی تہذیب کے موجود ہیں، ان اجزاء کی حفاظت اور اسلامی تہذیب کی ترویج ہمیں خاص

طور پر پیش نظر رکھنا لازم ہے۔ کیونکہ ایک قوم جب دوسری قوم کو جذب کرتی ہے تو اس کی ابتدا دوسری قوم کی تہذیب ہی سے کرتی ہے۔ اگر یہ محفوظ رہی تو بقیہ اجزا بھی محفوظ رہیں گے، ورنہ نوبت ایمان تک پہونچ جائے تو تعجب نہیں۔

ہماری تہذیب میں اکثر اجزا وہ ہیں جنھیں مسلمانوں کی تہذیب کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اسلامی تہذیب نہیں کہہ سکتے۔ انھیں اسلامی تہذیب سے بدلنا لازم ہے۔ لیکن کسی دوسری تہذیب کے مقابلہ میں ان کی حفاظت بھی لازم ہے۔ بشرطیکہ وہ شرعاً حدود جواز میں داخل ہوں۔

دین میں حکمتِ عملی کا مقام

(از ــــــــــ عتیق الرحمٰن سنبھلی)

ـــــــ (۳) ـــــــ

[اب جب کہ یہ مضمون تیسری قسط سے بھی بڑھ رہا ہے۔ ہم اپنے ناظرین سے یہ کہنے کی ضرورت سمجھتے ہیں کہ اس بحث کا یہ طول، محض "جوابی فریضہ" ادا کرنے کے خیال سے نہیں ہے۔ ہمارا مقصد اگر محض جواب الجواب ہوتا تو اس کے لئے اس طوالت کی حاجت نہ تھی، یہ کام ایک مختصر مضمون سے ہو سکتا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے یہ مسئلہ اٹھا کر، جس کی اہمیت اب تک بہت کم لوگ سمجھ سکے ہیں، دین کے لئے ایک زبردست مسئلہ پیدا کر دیا ہے اور ہم نے اچھی طرح غور کر کے محسوس کیا ہے کہ اگر ہم اس مسئلہ کو سرسری طور سے ٹال دیتے ہیں تو ہم سخت مجرم ہوں گے ! مسئلہ کی اہمیت کیا ہے ؟ یہ بات ان شاء اللہ اگلی قسط سے ظاہر ہو گی جس پر غالباً یہ مضمون ختم ہو جائیگا]

دوسری نو مثالیں "الائمۃ من قریش" کے علاوہ مولانا نے قرآن وحدیث، آثارِ صحابہ اور تصریحات فقہا ومحدثین سے، اپنے موقف کی تائید میں نو مثالیں اور پیش فرمائی ہیں، اب ہم اُن کا ایک ایک کر کے جائزہ لیتے ہیں کہ اُن سے "اقامتِ دین" کے مقصد کے لئے اصولِ دین میں "استثنار" کا اصول اخذ کرنا صحیح ہے یا نہیں ؟ لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ مسئلہ زیرِ بحث کی پوری صورت کو ایک بار پھر آپ کے سامنے رکھ دیا جائے کیونکہ دلائل کی صحت وسقم کو جانچنے کے لئے یہ پہلی ضرورت ہے کہ دعویٰ بھی نگاہ میں ہو۔

مسئلہ یہ تھا کہ کیا "اقامت دین" کا مقصد لے کر اُٹھنے والی کسی تحریک یا قائدِ تحریک کیلئے اس کی گنجائش ہے کہ وہ حصول مقصد کی خاطر، حکمت عملی کے طور پر، دین کے اساسی اصولوں (توحید و رسالت وغیرہ) کو چھوڑ کر باقی اصولوں میں، حسب ضرورت استثنار اور لچک پیدا کر سکے؟——
یہ تھا مسئلہ! اور مولانا کا دعویٰ اس باب میں یہ تھا کہ ہاں اس کی گنجائش ہے۔

اب مسئلہ کی پوری صورت اور مولانا کے موقف کو نگاہ میں رکھ کر دلائل و شواہد کے اُس لشکر کی طرف آیئے جو مولانا نے اپنے دعوے کی پشت پر آراستہ کیا ہے —— حق یہ ہے کہ مولانا نے ان نوؤں کی نوؤں مثالوں سے اس طرح کام لیا ہے کہ ناظرین ترجمان میں سے بہت ہی کم لوگ بچے ہوں گے جو مولانا کے موقف کی صحت پر ایمان نہ لے آئے ہوں ــ اور ان کے دل پکار نہ اُٹھے ہوں کہ جاہل تھے معترضین جو قرآن وحدیث، آثار صحابہ اور تصریحاتِ فقہا و محدثین میں پائی جانے والی اَن گنت مثالوں کے باوجود مولانا کے موقف پر معترض ہوئے۔ مگر ہمیں اس سب کے باوجود جرأت کرنے دیجئے کہ ان مثالوں کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ یہ کہاں تک مولانا کے دعوے کے لئے مفید ہیں۔

مولانا نے سب سے پہلی مثال کلمۂ کفر کی رخصت" کی دی ہے، جو حالت جبر و اکراہ میں قرآن سے ثابت ہے۔ یعنی اگر کسی شخص کو اسلام سے پھرنے پر مجبور کیا جائے اور اس سلسلہ میں ناقابل برداشت اذیت دی جائے یا موت سامنے کھڑی کر دی جائے تو قرآن اجازت دیتا ہے کہ وہ شخص کلمۂ کفر کہہ کر اپنی جان بچا سکتا ہو تو بچا لے، بشرطیکہ دل سے ایمان پر قائم رہے۔

دوسرے نمبر کی مثال ایک رخصت اضطرار کی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر جان پر بن رہی ہو تو قرآن ایسی حالت میں محرّمات قطعیہ (لحم خنزیر وغیرہ) کے بھی بقدر ضرورت استعمال کی اجازت دیتا ہے۔

ہم مولانا سے دریافت کرتے ہیں اور بے ادبی کی معافی چاہتے ہوئے دریافت کرتے ہیں کہ کیا آج تک کسی بھی پڑھے لکھے نے ایسے جبری اور اضطراری افعال کو "حکمت عملی" سے تعبیر کیا ہے، اگر مولانا کی نظر میں ایسی کوئی مثال ہے تو ہم بھی ہوش و خرد کا یہ نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں اور اگر ارباب ہوش و خرد کی تاریخ ایسی مثالوں سے خالی ہے تو ہم مولانا سے باصد ادب عرض

کریں گے کہ حکمت عملی کے طور پر لچک و استثنار کی بحث میں جبری اور اضطراری افعال کا ذکر ان کے شایانِ شان نہیں ہے! مولانا شاید بھول گئے کہ حکمت عملی کے طور پر اصول دین میں لچک اور استثنار کے اصول سے توحید کو وہ خود مستثنیٰ کر چکے ہیں، حالانکہ کلمۂ کفر کی یہ استثنائی رخصت قرآن میں اُس وقت بھی موجود تھی اور اتنی مشہور ہے کہ مولانا کی نظر اُس وقت بھی اس پر ضرور رہی ہوگی، پھر اگر یہ حکمت عملی ہی کے باب سے تھی تو مولانا نے آخر توحید کو وہاں کیوں مستثنیٰ قرار دیدیا تھا۔ بہرحال یہ دونوں مثالیں مسئلے سے قطعاً غیر متعلق، اور اتنی غیر متعلق ہیں کہ ہم ان کا استعمال ذرا بھی مولانا کے شایانِ شان نہیں سمجھتے!

مولانا پر ہمارا مدعا واضح ہونے کے لئے تو اتنی ہی بات کافی ہے۔ مگر عام ناظرین کے خیال سے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ حکمت عملی کی ایک مثال اُن کے سامنے پیش کردیں جس سے وہ اچھی طرح سمجھ سکیں کہ "حکمت عملی" کا مفہوم کیا ہے، اور وہ جبری و اضطراری افعال سے کس درجہ متغائر ہے۔

شاید آپ نے سُنا ہو۔ گرونانک جی کے متعلق بعض حضرات کا خیال ہے کہ وہ دراصل مسلمان ہوگئے تھے اور چاہتے تھے کہ اپنی قوم (ہندوؤں) کو بھی دائرہ اسلام میں لے آئیں، مگر انھوں نے اس مقصد کے لئے صاف صاف اسلام کے نام سے تبلیغ کرنا مناسب نہیں سمجھی بلکہ سکھ پنتھ کے نام سے ایک اصلاحی تحریک کا عنوان اختیار کیا اور اس میں بنیادی چیز توحید رکھی، اس طرح انھوں نے کوشش کی کہ اسلام کی بنیادوں سے مانوس کرتے ہوئے وہ رفتہ رفتہ قوم کو مکمل اسلام تک پہنچا دیں (۱) ــــــ یہ ہے حکمت عملی! یعنی کسی مقصد کے حصول کیلئے متعدد ممکن طریقوں میں سے وہ طریق کار اختیار کرنا جس کے متعلق اندازہ ہو کہ اس میں دقتیں کم پیش آئیں گی اور منزل تک رسائی آسانی سے ہو جائے گی۔ بس اس سے اندازہ کر لیجئے کہ حکمت عملی کے طور پر، ایک کام کے جائز ہونے میں، اور جبر و اضطرار کے تحت جائز ہونے میں کس درجہ مغائرت ہے! یہی وہ مغائرت ہے کہ قرآن میں جبر و اکراہ کے وقت کلمۂ کفر کہہ دینے

(۱) گرونانک جی کے متعلق اس خیال کا ذکر یہاں ہم نے "حکمت عملی" کی حقیقت سمجھانے کے لئے کیا ہے، بجائے خود اس خیال کا غلط یا صحیح ہونا ایک الگ مسئلہ ہے جو اسوقت کی ہماری بحث سے غیر متعلق ہے۔

کی صریح اجازت کے باوجود یہ مولانا کے نزدیک بھی جائز نہیں ہوگا کہ اشاعت اسلام کی نیت سے غیر مسلموں کو اپنے سے مانوس اور قریب کرنے کے لئے کفر و شرک کا وہم پیدا کرنے والی بھی کوئی بات زبان سے نکالی جائے۔ مگر افسوس اس سب کے باوجود مولانا، حکمت عملی کے طور پر لچک پیدا کرنے کی بحث کو حالت جبر و اضطرار کی رخصتوں سے خلط کئے دے رہے ہیں۔

مولانا کی باقی مثالوں پر گفتگو سے پہلے ایک تمہیدی گفتگو کی ضرورت ہے جس سے اصل گفتگو کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں آسانی ہوگی۔

مولانا نے اقامت دین کی جد و جہد میں حکمت عملی کے طور پر، دینی اصولوں میں استثناء اور لچک کے جواز کا دینی فلسفہ یہ بیان کیا ہے، کہ ایک چھوٹی نیکی سے اگر بڑا گناہ لازم آتا ہو تو (شرعاً) اس کا ترک اولیٰ ہے، اور ایک چھوٹی برائی اگر کسی بڑی نیکی یا عظیم تر دینی مصلحت کے لئے ضروری ہو تو اسے اختیار کر لینا بہتر ہے اور دو برائیوں میں سے کسی ایک میں مبتلا ہونا بہر حال ناگزیر ہو جائے تو نسبتاً کم درجے کی برائی کو قبول کر لینا چاہیئے"۔ اور اس فلسفہ کو مستند کرنے ہی کے لئے انھوں نے یہ زیر بحث مثالیں پیش کی ہیں ـــــ جہاں تک اس دینی فلسفہ کا اور شریعت کے اس اصولی ضابطہ کا تعلق ہے، یہ ہمیں من وعن تسلیم ہے، بیشک اسلامی شریعت کا مزاج یہی ہے اور یہ مثالیں مجموعی اعتبار سے اس پر شاہد ہیں، مگر ہمیں جس چیز میں کلام ہے وہ یہ ہے کہ آیا اس فلسفے سے شریعت میں، اس "حکمتِ عملی" کا اعتبار بھی ثابت ہوتا ہے جو مولانا کا مدعا ہے، یا نہیں ہے؟ ـــ مولانا کا مدعا ـــ اگر وہ اپنی دسمبر ۵۶ء والی تحریر پر قائم ہیں تب! ـــ یہ ہے کہ اگر دینی اصول کی رو سے ایک بات کی پابندی ضروری ہے اور نظری طور پر اس پابندی کے ساتھ، اقامت دین کی جد و جہد میں کامیابی بھی ممکن ہے لیکن عملی میدان میں آکر محسوس ہوتا ہے کہ اس پابندی کے ساتھ کامیابی سے ہمکنار ہونا بہت مشکل یا دیر طلب ہے اور اس کی پابندی اگر اٹھا دی جائے تو برسوں کا راستہ مہینوں میں طے ہو سکتا ہے، تو ایسی صورت میں اس پابندی میں وقتی لچک پیدا کر لینا اور تھوڑے سے وقت کو اس سے مستثنیٰ کر دینا نہ صرف جائز بلکہ دینی تحریک کے مفاد کے لئے یہی اولیٰ ہے ـــ کسی ملک میں دین پھیلانے

یا دین کو برسرِ اقتدار لانے کے لئے، میدانِ عمل کی مشکلات کے اس تقاضے کا اعتبار، اِن مثالوں سے ثابت ہوتا ہے یا نہیں؟ بس یہی وہ نقطہ ہے جس پر ساری بحث کا دار و مدار ہے اور اب اسی نقطۂ نظر سے مولانا کی باقی مثالوں کا جائزہ لیجئے!

مولانا نے اس استثناء کی جو تیسری مثال دی ہے وہ "راست بازی اور صداقت شعاری جیسے اہم اسلامی اصول میں استثناء" ہے، کہ حدیث میں بعض ضرورتوں کے لئے جھوٹ کی اجازت آئی ہے، بعض خاص مواقع پر بعض اشخاص کو ایسا کرنے کی اجازت دینا بھی آں حضرتؐ سے ثابت ہے اور ان نظائر کی بنا پر فقہاء و محدثین نے بعض جزئی اور اصولی تصریحات بھی اس باب کے استثناآت سے متعلق کی ہیں۔ چوتھی مثال یہ دی ہے کہ غیبت کی حرمت قرآن سے نہایت شدید انداز میں ثابت ہے۔ مگر متعدد جزئیات میں اس کا نہ صرف جواز بلکہ وجوب تک ثابت ہے۔ نمبر ۵۔ غیر محرم عورت کو برہنہ کرنا قطعاً حرام ہے۔ لیکن فتح مکہ سے پہلے حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ نے ایک عورت کے ذریعہ اہلِ مکہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادے کی اطلاع لکھ کر بھیجی تو حضرت علیؓ نے راستہ میں اُسے گرفتار کرکے خط کی تلاشی کے لئے اُسے برہنہ کرنے کی دھمکی دی جس سے ابن قیمؒ نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ مصلحتِ اسلام و مسلمین کی خاطر تفتیش کی ضرورت پیش آئے تو عورت کو برہنہ کیا جا سکتا ہے۔ (۶) اسلام میں نماز کی اہمیت جیسی کچھ ہے بیان کی حاجت نہیں۔ لیکن بخاری و مسلم کی متفق علیہ روایت ہے کہ حضورؐ ایک جھگڑے میں صلح کرانے کے لئے تشریف لے گئے، نماز کا وقت آیا اور آپ اصلاح بین الناس کے کام میں مشغول رہے، حتیٰ کہ حضرت ابوبکرؓ کی امامت میں جماعت کھڑی ہوگئی اور آپؐ بعد میں آکر شریک ہوئے۔ (۷) انکارِ منکر شریعتِ حقہ کے نہایت اہم واجبات میں سے ہے۔ لیکن جب یہی چیز ایک عظیم تر منکر رونما ہونے کی موجب نظر آئے تو اس سے اجتناب واجب ہے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ "من رأى من اميره ما يكرهه فليصبر ولا ينزعن يدا عن طاعته" (اگر کوئی شخص اپنے امیر میں کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے تو صبر کرے نہ کہ بیعت توڑ کر کھڑا ہو جائے) ـــــ (۸) اسلام میں اقامتِ حدود کے لئے جیسے سخت تاکیدی احکام ہیں اُن سے کون صاحبِ علم ناواقف ہے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے موقع پر چوروں کے ہاتھ کاٹنے سے منع فرما دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمان جاری کیا کہ دشمن کے علاقے میں

جنگ کے موقع پر کسی مسلمان پر حد جاری نہ کی جائے۔ حالت امن کی بھی مثال موجود ہے کہ واقعہ افک" میں تین مخلص مسلمانوں پر حد قذف جاری کی گئی مگر عبداللہ بن اُبَیّ رئیس المنافقین کو چھوڑ دیا گیا جس کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اس پر حد جاری کرنے سے اس کے قبیلے میں فتنے کا اندیشہ تھا (۹) اموال غنیمت میں تمام شرکائے جنگ کے حقوق یکساں ہیں، لیکن غزوۂ اوطاس کے مال غنیمت میں سے حضورؐ نے قریش اور دوسرے قبائل کے مؤلفۃ القلوب کو خوب دل کھول کر عطیے دیے اور انصار کو کچھ نہ دیا۔

ہم نے اوپر کہا تھا کہ یہ مثالیں" مجموعی اعتبار سے" اس اصولی ضابطہ کے حق میں شاہد ہیں جس کی طرف مولانا نے توجہ دلائی ہے۔ اس سے ہمارا مطلب یہ تھا کہ ان میں بعض مثالیں ایسی بھی ہیں (بلکہ اکثر ایسی ہیں) جن کا اس ضابطہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا اب پہلی نظر میں تو ایسی مثالوں کو چُن کر الگ کر لیجئے تاکہ اس بحث میں وہ خواہ مخواہ داخل نہ رہیں ۔۔۔ اکراہ اور اضطرار کی اول الذکر دو مثالوں کو تو ہم پہلے ہی، ایک دوسرے پہلو سے نظر ڈال کر اس بحث سے الگ کر چکے ہیں۔ تاہم فائدے سے خالی نہیں ہے کہ اس دوسرے پہلو سے نظر میں بھی اُن کو شامل کر لیا جائے

مولانا نے جس اصولی ضابطہ پر ان امثلہ کو شاہد بنایا ہے، اس کی تصریح ابھی ایک دو صفحے پیشتر گزر چکی ہے لہٰذا اُس کے اعادہ کی حاجت نہیں، اگر مستحضر نہ رہی ہو تو پیچھے پلٹ کر دیکھ لی جائے۔

حالت اکراہ و اضطرار میں دی گئی رخصتوں کی متذکرہ دونوں مثالوں کو بھی مولانا نے اسی ضابطہ کے تحت داخل کیا ہے، دوسری مثال کی حد تک تو یہ بات صحیح ہے۔ مگر پہلی کے بارے میں قطعاً صحیح نہیں ہو۔ اور مولانا اگر ایسا سمجھتے ہیں تو اُس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اکراہ کی صورت میں کلمۂ کفر کی رخصت کو اس اصولی ضابطے کے تحت بتانے کے لئے مولانا نے یہ توجیہہ کی ہو کہ "شریعت کی نگاہ میں مسلمان کی جان کی قیمت اقرار توحید سے زیادہ ہے"۔ یعنی یہ اجازت اس اصول کے تحت دی گئی ہے کہ نسبتاً ایک بیش قیمت چیز کے مقابلہ میں شریعت کو کم قیمت

چیز کی قربانی گوارا ہے، خواہ فی نفسہ وہ چیز کتنی ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو۔ ہمارے نزدیک اس توجیہہ کی بنیاد ہی غلط اور "توجیہ القول بما لا یرضی بہ القائل" نہیں۔ بلکہ بما لا یسعہ القول کے قبیل سے ہے۔ کلمۂ توحید کے مقابلہ میں اگر شریعت جان مسلم کو زیادہ قیمتی سمجھتی تو رخصت اور اجازت کے کیا معنی تھے، کلمۂ کفر کا وجوب ہونا چاہیئے تھا حالانکہ نہیں ہے، تعجب ہے کہ مولانا اس مقام پر "رخصت" اور "عزیمت" کے الفاظ بول رہے ہیں مگر اُن کا ذہن اس طرف نہیں جاتا کہ عزیمت اسی لئے "عزیمت" ہے کہ اُس میں اعلیٰ چیز کی حفاظت کی جاتی ہے اور رخصت اس لئے "رخصت" اور کمتر ہے کہ اُس میں اعلیٰ کو ادنیٰ پر قربان کر دیا جاتا ہے ——— اور تعجب ہے کہ "الجہاد فی الاسلام" کے مصنف کو اس پر توجہ نہیں ہوتی کہ کلمۂ توحید ہی کی سربلندی — لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا۔ کے لئے اسلام مسلمانوں کی گردنیں، تلواروں کی دھار پر رکھواتا ہے۔ ان کے بچوں کو یتیم اور اُن کی عورتوں کو بیوہ بنواتا ہے اور اُس کا رسول پکار پکار کر کہتا ہے "اُمرت ان أقاتل الناس حتی یقولوا لا إلٰہ الا اللہ!" ——— تعجب اور بڑا ہی تعجب !!

حقیقت یہ ہے کہ اس رخصت کی بنیاد صرف ضعف بشری کی رعایت ہے نہ کہ اعلیٰ اور ادنیٰ کا فلسفہ!

اسی طرح مثال نمبر ۳ کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹ کی اجازت کے واقعاتی ثبوت میں حجاج بن علاط السلمیؓ کا واقعہ، اور اس کی بنیاد پر ابن القیمؒ کی ایک فقہی تصریح جو مولانا نے درج فرمائی ہے، ان دونوں چیزوں کا بھی کوئی تعلق اعلیٰ اور ادنیٰ کے فلسفہ سے نہیں ہے' وہاں بھی اجازت درخصت کا مبنیٰ صرف حاجات بشریہ کی رعایت ہے۔ ورنہ کون سرپھرا ہو جو کہہ دے کہ متاع دنیا کی قیمت متاع اخلاق اور مقام صدق سے زیادہ ہے۔

علیٰ ہذا مثال نمبر ۶ کا اس باب میں لانا بھی بہت ہی تعجب خیز ہے۔ بخاری و مسلم کی اس حدیث میں کہیں کوئی ایسا اشارہ نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ حضورؐ نے اصلاح بین الناس کے کام کے لئے جان بوجھ کر نماز کو مؤخر کرنا گوارا کر لیا بلکہ حدیث میں واقعہ کی جو صورت مذکور ہے، اس سے تو درحقیقت یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ آپ نے نماز کو مؤخر کیا ہو۔ صاف الفاظ ہیں کہ "جب نماز کا وقت آیا تو حضرت بلالؓ نے اذان دی اور جب دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہیں تشریف

لائے تو وہ حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے اور کہا کہ آنحضرتؐ کو تو معلوم ہوتا ہے بنی عمرو بن عوف نے روک لیا، پس کیا آپ نماز پڑھا دیں گے؟ انھوں نے کہا اگر تمھاری رائے ہے تو مجھے عذر نہیں۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ کی امامت میں جماعت کھڑی ہوگئی۔ مگر پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لے آئے اور صفِ اوّل میں جاکر شامل ہوئے" الخ۔ اس صورت واقعہ میں کون کہہ سکتا ہے کہ آپ نے نماز کو مؤخر کیا؟ نماز وقت پر شروع ہوئی اور حضورؐ اس میں پہنچ گئے، حتیٰ کہ روایت میں کسی رکعت کے فوت ہونے کا بھی ذکر نہیں! —— رہی اتنی سی تاخیر کہ حضورؐ نماز شروع ہونے پر پہنچے تو مولانا کو معلوم ہے کہ قبیلہ بنی عمرو بن عوف مدینہ کی ایک نواحی بستی میں آباد تھا۔ اتنے فاصلے سے واپس پہنچنے میں ایک دو منٹ کی تاخیر کو تو "تاخیر" بھی نہیں کہا جا سکتا، چہ جائیکہ جان بوجھ کر تاخیر! مولانا نے بخاری میں دیکھا ہوگا کہ امام بخاریؒ نے اس حدیث پر "خروج الامام الی المواضع لیصلح بین الناس" کا باب باندھا ہے، اگر اس میں اصلاح بین الناس کو نماز پر مقدم کرنے کا شائبہ بھی ہوتا تو امام بخاریؒ کی عادت جاننے والے سمجھ سکتے ہیں کہ موقع و محل کا کھلا تقاضہ تھا کہ ترجمۃ الباب میں وہ اسکی طرف اشارہ کرتے اور اصلاح بین الناس کے کام کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے "خروج الامام الی المواضع" پر اکتفا کرنے کے بجائے "تخلف الامام عن الصلوٰۃ لیصلح بین الناس"... جیسے الفاظ لاتے یا آخر میں "وتخلّفہ عن الصلوٰۃ لذلک" کے الفاظ ضرور بڑھاتے۔

بہرحال اس چھٹی مثال کو بھی متذکرہ اصول کے تحت لانا نہ صرف غلط بلکہ مولانا جیسے کسی صاحب فہم سے بہت ہی تعجب خیز ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو مثال ۷، ۸ اور ۹ کا بھی یہی حال ہے —— یعنی ان میں یا تو سرے سے استثنار اور لچک ہی کا کوئی قصہ نہیں۔ یا اگر کہیں کوئی لچک پائی جاتی ہو تو قربانی کے معنی میں نہیں پائی جاتی۔ حالانکہ یہ ضابطہ جس کے ذیل میں یہ مثالیں لائی گئی ہیں ایک قدر کی دوسری قدر پر قربانی ہی کا ضابطہ ہے نہ کہ مطلق لچک کا! —— لیکن ہم یہاں ان آخری تینوں مثالوں کے اس پہلو سے صرف نظر کرتے ہیں، کیونکہ وہ ذرا خفی ہے، اور تھوڑی دیر کے لئے مانے لیتے ہیں کہ مولانا نے یہ مثالیں ٹھیک درج کی ہیں۔ آگے انشاءاللہ دوسرے پہلو سے

ان پر بحث کرتے ہوئے، اس پہلو کی بھی پوری وضاحت کی جائے گی۔

بس اب مولانا کی نو مثالوں میں سے پانچ مثالیں تو پوری اور ایک مثال کا کچھ حصہ رہ جاتا ہے جن کے متعلق ہمیں یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ـــــ یہ شریعت کے مذکورہ بالا مزاج و اصول پر شاہد ہیں، اس نقطۂ نظر سے غور کرنا ہے کہ ان سے دین کے لئے دینی اصولوں میں، حکمت عملی کے طور پر استثنار اور لچک کا جواز اخذ کرنا کہاں تک صحیح ہے یا ـــــ اس اصولی ضابطہ سے دین کے لئے بھی حکمت عملی کے طور پر بہی سب کچھ کر لینے کی گنجائش سمجھنا (جو ان مثالوں میں نظر آتا ہو) کہاں تک درست ہے؟ مولانا کے استدلال و استنتاج کی ترتیب یہی ہے کہ اولا انھوں نے ان مثالوں کے ذریعہ اُس اُصولی ضابطہ کی طرف رہنمائی کی جس کو ہم کچھ پہلے بیان کر چکے ہیں۔ پھر اِس ضابطہ کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے بھی اس رمز کی طرف توجہ دلائی کہ یہ ضابطہ درحقیقت نتیجہ ہے نظام شریعت میں مختلف قدروں کے درمیان فرقِ مراتب کا جس کا معیار انھیں مثالوں سے معلوم ہوسکتا ہے اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ کم تر قدروں کو بالا تر قدروں پر قربان کیا سکتا ہے، اور اس کے بعد بتلایا کہ انھوں نے دسمبر ۵۶ء کے ترجمان میں جو کچھ لکھا تھا اُس کی بنیاد یہی کچھ تھی[1] ـــــ یعنی نظام شریعت میں قدروں کے فرق مراتب کی بنیاد پر جس طرح ان مثالوں میں لچک اور استثنار کا عمل نظر آتا ہے اور اُسے برحق مانا جاتا ہے، اسی طرح اُن کی اس بات پر بھی اعتراض کی گنجائش نہیں ہے کہ قدروں کے درمیان فرق مراتب کے معتبر معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے دین کے لئے بھی حکمت عملی کے طور پر، کم تر دینی قدروں کو، بالا تر دینی قدروں پر قربان کیا جاسکتا ہے!

ہمارا کہنا ہے کہ مولانا نے اور ساری باتیں تقریباً ٹھیک کہی ہیں، مگر آخری موڑ پر اُن کے اشہب اجتہاد نے سخت ٹھوکر کھائی ہے، نظام شریعت میں قدروں کا فرق مراتب ایک مسلّم حقیقت ہے، اور احکام میں اسکی رعایت کی مثالیں بھی ملتی ہیں مگر معاف فرمائیے! ان مثالوں سے اگر اجتہاد کا وہ راستہ اختیار کرلیا جائے جس پر آپ جا رہے ہیں تو پھر دین کا اور شریعت کا اللہ ہی حافظ ہے! ـــــ اگر یہ درست قرار دے دیا جائے کہ ہر بالا تر قدر پر (نسبتاً) ہر کمتر قدر کو قربان کیا جاسکتا ہے،

(۱) ترجمان القرآن جلد ۵۰، عدد ۲، صفحہ ۱۲۳/۵۰

اور ہر اعلیٰ مقصد کے لئے نسبتاً ہر کم اہم اصول کو توڑا جا سکتا ہے تو پھر ذرا ایک سامنے کی مثال پر غور کیجیے۔ مُنا ہے پاکستان میں عام الکشن ہونے جا رہا ہے اور آپ اس الکشن میں، یہ سوچ کر حصہ لینا طے کر چکے ہیں کہ اقامت دین، جو آپ کا مقصود ہے، اُس کے لئے لابدی ہے کہ آپ اور آپکے ہمخیال حکومت پر قابض ہوں اور اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ الکشن میں کامیاب ہوں ۔۔۔ الکشن کا میدان گرم ہوتا ہے اور آپ دیکھتے ہیں (فرضی طور پر نہیں بلکہ واقعۃً دیکھیں گے اور آج بھی آپکو اس کا پورا اندازہ ہے) کہ مخالف پارٹیاں، جھوٹ، رشوت، دھونس دباؤ اور آخری مرحلہ میں ووٹوں کی خریداری اور جعلسازی سے پالا مارے لئے جا رہی ہیں، یا کم از کم آپ کی کامیابی مشکوک ہوئی جا رہی ہے، کیا حکم ہوگا قدروں کے فرق مراتب کی روشنی میں۔ اور اس اجتہادی اصول کی روشنی میں کہ " ایک اصول پر ایسا اصرار جس سے اس اصول کی بہ نسبت زیادہ اہم دینی مقاصد کو نقصان پہونچ جائے حکمت عملی ہی نہیں حکمت دین کے بھی خلاف ہے "؟ ظاہر بات ہے کہ اقامت دین سے بڑھ کر نہ کوئی مقصد ہوسکتا اور نہ کوئی اخلاقی اصول قدر و قیمت میں اس سے بالاتر ہوسکتا ہے۔ اور اس مقصد کے لئے، الیکشن میں آپ کی کامیابی ضروری ہے لہذا فوری طور پر یہ درمیانی مقصد بھی اتنا ہی قیمتی ہے جتنا اصل مقصد۔ پس لامحالہ "دین کا حکم" اس موقع پر یہ ٹھہرے گا کہ لپیٹ کر رکھ دو ساری صداقت و دیانت، چلاؤ جتنی ضرورت ہو فوٹو، کرو جتنی ضرورت ہو جھوٹا پروپیگنڈا، بھگتاؤ جتنے بھگتا سکتے ہو جعلی ووٹ اور خرید کر حاصل کرو جتنے خرید سکتے ہو کیونکہ الکشن میں کامیابی اس کے بغیر ممکن نہیں اور الیکشن میں کامیابی کے بغیر اقامت دین کا کوئی امکان نہیں، جو سارے دینی مقاصد میں اہم تر ہے!

مگر کیا واقعی یہ دینی حکم ہوگا؟ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اپنے اجتہادی اصول پر اصرار کے نتیجہ میں اگر کوئی شخص اس "دینی حکم" کی ذمہ داری لینے کو تیار بھی ہو تو وہ اسکی جرأت ہرگز نہیں کرسکتا کہ علیٰ رؤس الاشہاد اس کا اعلان کرے، اور اگر کوئی ایسا کر گزرا تو پھر یہ یقینی ہے کہ وہ مسلمانوں کے درمیان پنپ نہیں سکتا۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ فتوٰی ایسا فتوٰی ہوگا جو بداہۃً دین کے خلاف ہے اور جاہل سے جاہل مسلمان بھی اسکو رد کردینے میں تامل نہیں کرسکتا۔

لیکن دوسرے رُخ پر غور کیجئے کہ اگر اصول وہی ہے جو مولانا نے بیان فرمایا ہے تو پھر فتوے اس کے سوا ہو کیا سکتا ہے؟[1]

اب دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو اصول غلط یا پھر فتوے صحیح ہے۔ ہم پورا اطمینان رکھتے ہیں کہ اہل اسلام میں کا کوئی فرد بھی اس فتوے کی صحت کا قائل نہیں ہو سکتا، اور مولانا کے اصول کا یہ صریح نتیجہ سامنے آنے کے بعد وہ بے دریغ اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ اصول غلط ہے! ــــ اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اس اصول میں غلطی کیا ہے اور کہاں سے پیدا ہوئی ہے؟ تو غلطی کی بنیاد یہ ہے کہ مولانا مقاصد دینیہ کو شخصی، خاندانی اور اجتماعی مصالح پر حقوق اللہ کو حقوق العباد پر دینی فائدے کو دینی نقصان پر اور مطلق ضرورت کو مجبوری اور ناگزیر ضرورت پر قیاس کر بیٹھے ہیں، چنانچہ انھوں نے دیکھا کہ زیر بحث مثالوں میں بعض شخصی، خاندانی اور اجتماعی مصالح کے لئے بعض اصولوں میں لچک پیدا کی گئی ہے تو اس سے قیاس کر لیا کہ مقاصد دینیہ کے لئے بھی لچک پیدا کرنے کی گنجائش ہے۔ بعض مثالوں میں دیکھا کہ بندگان خدا کا حق ادا کرنے کے لئے بعض اصولوں سے صرف نظر کی اجازت دی گئی ہے تو اس سے قیاس کر لیا کہ اللہ کا حق ادا کرنے کے لئے بھی اس کے قائم کردہ اصول و احکام کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ بعض مثالوں میں دیکھا کہ دین کو کسی مفسدے سے بچانے کے لئے بعض احکام میں استثناء روا رکھا گیا ہے تو اس سے سمجھ لیا کہ دین کو کوئی فائدہ پہنچانے کے لئے بھی احکام دینیہ میں استثناء کی گنجائش ہے۔ علیٰ ہٰذا ان میں سے بعض مثالوں کی نوعیت یہ تھی کہ اُن میں استثنائی عمل کے لئے

---

(۱) اس سوال سے جان چھڑانے کے لئے زیادہ سے زیادہ جو بات کہا جا سکتا ہے وہ ہمارے خیال میں یہ ہوگا کہ ہمارے اصول کا عام لازمہ تو یہی ہو مگر پبلک زندگی میں اتنے وسیع پیمانہ پر ان باتوں کا ارتکاب چونکہ زبردست اخلاقی بگاڑ کا موجب ہوگا جو ایک عظیم اجتماعی مفسدہ ہے اس لئے اس اصول کے باوجود ان باتوں سے اجتناب ضروری ہوگا ــ مگر یہ منطق گلو خلاصی نہیں کرا سکتی، یہ کہا جائے گا کہ آپ کے سوا تو ساری پارٹیاں خود آپ کے یقین کے مطابق بھی، یہ حرکتیں کریں گی ہی۔ لہٰذا آپ کے یہ سب کچھ کرنے سے اس مفسدے میں کوئی خاص اضافہ تو ہوگا نہیں، البتہ فائدہ یہ ہوگا کہ اگر آپ برسر اقتدار آگئے تو اپنے منشور کے مطابق ان سب مفاسد کا ازالہ کر دیں گے اور اگر خدانخواستہ اس مفسدے کے خیال سے آپ نے الکشن میں ہارنا گوارا کر لیا تو اس کا نقصان یہ ہوگا کہ دوسری پارٹیاں برسر اقتدار آکر ان مفاسد میں اور اضافہ کریں گے ــ پھر تو اصول کا تقاضا یہی رہا کہ آپ ان برائیوں کا ارتکاب گوارا کریں!

ناگزیر ضرورت اور مجبوری کی قید معتبر تھی۔ مولانا نے اس قید کو بھی نظر انداز کر کے مطلق ضرورت کو بھی اسی خانے میں رکھ دیا، حالانکہ یہ تمام قیاسات، قیاس مع الفارق ہیں اور اسی لئے مولانا کو تصریحات فقہاء و محدثین میں بھی اس قسم کے قیاس کی کوئی مثال نہیں مل سکی۔

زیر بحث چھ دوں مثالوں اور اُن کے ذیل کے نصوص و تصریحات کے بارے میں ہمارا یہ تجزیہ کہاں تک صحیح ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے اب ایک ایک مثال اور اُس کے اذیال پر نظر ڈالئے!

اصول صداقت میں استثناء

لچک اور استثناء کی اس مثال کو مدلل کرنے کے لئے مولانا نے جتنی احادیث اور جتنی تصریحات پیش فرمائی ہیں اُن میں یا تو حکمت عملی کا قصہ نہیں بلکہ اضطرار اور مجبوری کا معاملہ ہے۔ یا اُن کا تعلق شخصی، خاندانی یا جماعتی مصالح سے ہے، یا حقوق العباد سے ہے یا بالعموم اُن سب چیزوں سے جو ہمارے تجزیہ میں آئی ہیں، مقاصد دینیہ، منافع دینیہ یا حقوق اللہ سے بالکل نہیں! —— حدیث پیش کی گئی ہے کہ "صلح بین الناس، ازدواجی تعلقات کی درستی اور جنگ کی ضروریات کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہے۔" ان چیزوں میں حکمت عملی بیشک ہے، مگر مقاصد دینیہ، منافع دینیہ، یا حقوق اللہ کے ساتھ کسی ایک کا بھی تعلق نہیں۔ "اصلاح بین الناس" کا تعلق جماعتی مصالح سے، یا الدین النصیحۃ (الحدیث) کے تحت حقوق المسلمین سے ہے۔ میاں بیوی کا ازدواجی تعلقات کی خوشگواری کے لئے آپس میں جھوٹ بولنا، اس کا تعلق شخصی یا خاندانی مصالح سے ہے۔ جنگ میں جھوٹ بولنا؟ تو اس رخصت کا تعلق بیشک اُسی جنگ سے ہے جو اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے لڑی جاتی ہے اور جو اعظم مقاصد دینیہ ہے، مگر جھوٹ کی رخصت اس مقصد کے حصول کی خاطر نہیں ہے، جھوٹ کی رخصت اس لئے ہے کہ جب اس مقصد کی خاطر مسلمانوں کو میدان جنگ میں ڈال دیا گیا ہے اور مقصد صرف اعلاء کلمۃ اللہ کا حصول ہے، مسلمانوں کے نفوس کی قربانی نہیں —— بلکہ مسلمانوں کی جانیں اور پھر اپنے حکم پر سر بکف مسلمانوں کی جانیں! اللہ کو انتہائی عزیز ہیں —— تو اس کی رأفت و رحمت اور حکمت بالغہ کا تقاضہ ہے کہ عالم اسباب سے بالا بھی ان کی حفاظت کا انتظام فرمائے اور اُن کے تحفظ کے وہ سب راستے بھی کھلے چھوڑ دے جن کے وہ عالم اسباب میں محتاج ہیں، چنانچہ جس طرح وہ خود اپنے ان جاں نثاروں کی، غیبی طاقتوں سے پشت پناہی فرماتا ہے۔ اسی طرح اُس نے

ان کے تحفظ خود اختیاری کے لئے اُن تمام تدابیر کی بھی اجازت دی جو صرف جنگ جیتنے ہی کے لئے نہیں، جنگ کے موقع پر اتلافِ نفوس سے بچنے کے لئے بھی ضروری ہیں ـــــ اور ان تدابیر میں (جن کی جامع تعبیر حدیث میں "خدعہ" کے لفظ سے آئی ہے) کسی وقت کذب کی آمیزش بھی ضروری ہوتی ہے ـــــ چنانچہ غور کرکے دیکھا جا سکتا ہے کہ جنگی چالوں میں دشمن سے مار کھا جانے کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوتا کہ شکست ہو جائے اور فتح سے جو مقصد پیش نظر تھا وہ فوت ہو جائے بلکہ اس کا نتیجہ زبردست اتلاف جان و مال کی صورت میں بھی رونما ہوتا ہے۔ بس یہی وہ مضرت و مہلکہ ہے، جس سے مسلمانوں کے افراد اور ان کی جماعات کو بچانے کے لئے جنگ میں کذب کی اجازت دی گئی ہے اور اس طرح اس استثناء کا تعلق بھی، جو بظاہر ایک خالص مقصدِ دینی کی خاطر "استثناء" نظر آتا ہے، درحقیقت مسلمانوں کی جماعت اور اُن کے افراد کی مصلحت سے نکلتا ہے۔

دین کے حق میں، کذب فی الحرب کی اجازت کی یہ توجیہ (جو ہم نے اختیار کی ہے) زیادہ بہتر ہے یا وہ صورت جو بادی النظر میں محسوس ہوتی ہے؟ اور کون سی بات زیادہ دل لگتی اور زیادہ حقیقت پسندانہ ہے؟ کوئی شخص اگر اپنے کسی مقصد کی خاطر ان سوالات سے آنکھیں بند کر لے اور اس استثناء کو "شفقت علی المجاہدین" پر محمول کرنے کے بجائے "اعلاء کلمۃ اللہ کی جد و جہد کی کامیابی کے لئے" کہنے پر اصرار کرے، تاکہ اس کے سہارے وہ اس عنوان سے دین کے دوسرے اصول و احکام میں استثناء کا جواز نکال سکے۔ تو میں صرف اتنا سوال کروں گا کہ جہاد بالسیف کی جگہ اگر اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر انتخابی جنگ لڑی جائے تو کیا وہ صاحب اس جنگ کو جیتنے کے لئے بھی جھوٹ کے جواز کا کھلا فتوے دے سکتے ہیں؟ اگر دے سکتے ہیں تو دیں، اور خواہ مخواہ کی پارسائی قائم رکھنے کی خاطر نصرت دین کا یہ تدبیری دروازہ کھولنے سے گریز نہ کریں! کہ اُن کی پارسائی رسول خدا کی پارسائی سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ اور اگر نہیں دے سکتے تو بتائیں کہ یہاں عدم جواز کی وجہ کیا ہے؟ ـــــ میں سمجھتا ہوں اس دو ٹوک سوال کا کوئی جواب اس کے سوا تشفی بخش نہیں ہو سکتا کہ انتخابی جنگ اور جہاد بالسیف میں فرق ہے، انتخابات میں ہار جانے سے صرف حصول مقصد میں تعویق ہو گی، اور جنگ کی ہار کا نتیجہ مسلمانوں کے

جان و مال کی زبردست ہلاکت کی صورت میں بھی نکلے گا! ــــ اور اس طرح اس سوال و جواب کے بعد یہ بات بالکل منقح ہو جائے گی کہ مقاصد دینیہ کے حصول کی خاطر اصول دین کو نہیں توڑا جا سکتا یعنی اس سوال و جواب سے صرف اسی ایک جزئیہ کا مسئلہ طے نہیں ہو جائے گا بلکہ پوری اصولی بحث طے ہو جاتی ہے اور پھر ہمیں فی الحقیقت اسکی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ باقی مثالوں پر بھی وقت صرف کریں۔ کیونکہ ہمارے مخاطب ہم سے زیادہ اس کے اہل ہیں کہ، اگر اس سوال و جواب سے منقح ہونے والی بات اُن کی سمجھ میں آجائے تو، باقی مثالوں کو وہ نہایت باریک بینی سے صحیح صحیح محمل پر محمول کر سکیں مگر جب وہ مثالیں سامنے آگئی ہیں تو عام ناظرین کا ہم پر یہ حق ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا صحیح محمل بھی واضح کر دیں تاکہ کسی کے لئے وہ باعث خلجان نہ ہوں اور کسی دل میں "لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي" کی تشنگی نہ رہ جائے۔

دوسری حدیث کعب بن اشرف (یہودی) کے قتل کے سلسلہ کی ہو کہ حضور کے ارشاد پر جو صحابی اس کے قتل پر تیار ہوئے تھے، انھوں نے اجازت مانگی کہ اگر اس سلسلہ میں مجھے کچھ غلط بیانی کرنی پڑے تو کر سکتا ہوں؟ حضورؐ نے انھیں اسکی اجازت دی ــــ اس کے بارے میں بھی غور کر لیا جائے تو ذرا شبہ نہیں رہتا کہ حکمت عملی کے طور پر کذب کی اجازت یہاں ضرور رہے مگر کسی مقصد دینی کی خاطر نہیں، کیونکہ یہاں کسی مقصد دینی کے حصول کا معاملہ ہی درپیش نہیں تھا۔ مدینہ کے یہودیوں میں سے ایک شریر اور سنگین یہودی تھا جس نے غزوۂ بدر کے بعد مکہ جاکر مشرکین مکہ کو مدینہ پر حملہ کے لئے اُکسایا۔ اشعار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کی، یہ اشعار مدینے پہنچے تو حضرت حسان بن ثابتؓ صحابی اور ایک صحابیہ نے اسکے جواب میں اشعار کہے۔ اس کے بعد اسکی خباثتوں میں ایک اور اضافہ ہوا۔ اشعار کے ذریعہ قریش مکہ کو اُکسانے اور آنحضرت کی ہجو کرنے کے علاوہ اس نے تشبیب میں مسلمان عورتوں کا ذکر شروع کر دیا۔ عرب میں اشعار نشر و اشاعت کا زبردست ذریعہ تھے، اُدھر شاعر کی زبان سے نکلے اور بچہ بچہ کی زبان پر ہو گئے۔ چنانچہ اس سے مسلمانوں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جتنی اذیت اور پریشانی ہو سکتی تھی وہ ظاہر ہے۔ پس ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنگ آکر فرمایا "من لکعب بن اشرف؟" کون ہے جو اس موذی کو ٹھکانے لگائے۔ اس پر ایک

صحابی نے بڑھ کر لبیک کہا۔ ظاہر ہے کہ نہ اس شخص کا قتل مقاصد دینیہ میں سے کوئی مقصد تھا اور نہ اس کی ایذا رسانیوں اور فتنہ پردازیوں سے نجات پانا مقاصد دینیہ سے کہا جا سکتا ہے، یہ تو مسلمانوں اور خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ضرورت تھی کہ اسکی بیہودگیوں سے امان ملے، اور اس ضرورت کے لئے اُس کا قتل ضروری تھا۔ ــــاور کسی کی جان لینا چونکہ آسان نہیں، اور وہ بھی اُس کے قبیلے میں پہنچ کر اور پھر جب کہ وہ اپنی شرارتوں کی بنا پر چوکنا رہا ہوگا۔ اس لئے قتل کا بیڑا اُٹھانے والوں کو اجازت طلب کرنے پر اس کی بھی اجازت دے دی گئی کہ اس ضروری مہم کی کامیابی کے لئے اگر کچھ غلط بیانی کی ضرورت پڑے تو یہ بھی کر لیا جائے۔

الغرض یہ مہم مقاصد دینیہ سے تعلق نہیں رکھتی تھی بلکہ جیسا کہ اوپر کی تفصیل سے ظاہر ہوا اس کا تعلق سراسر مصالح مومنین اور ان کے اور خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس و حرمت کی حفاظت سے تھا۔ (۱)

(۱) بعض ناظرین کو عرف عام کی بنا پر یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ کیا ناموس رسول کی حفاظت دینی مقاصد میں سے نہیں ہے! بلکہ ہماری اس گفتگو میں بعض دوسرے مواقع پر بھی یہ شبہ ہو سکتا ہے اس لئے ضرورت ہو کہ اس کو صاف کر دیا جائے۔ پہلی بات تو اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ہم اسی مغالطہ سے بچنے کے لئے دینی مقاصد اور دینی مقصد کے بجائے مقاصد دینیہ اور مقصد دینی کے الفاظ استعمال کر رہے ہیں اور اس ذرا سے فرق کے لطیف اشارہ سے غالباً بعض لوگوں کو ہمارا مطلب سمجھنے میں مدد ملی ہوگی، تاہم جن لوگوں کے لئے یہ اشارہ کافی نہیں ہو سکتا اُن کو سمجھ لینا چاہیے کہ عرف عام میں، بلکہ دینی زبان میں بھی، "مقاصد دینیہ" کا دائرہ بہت وسیع ہو اور اس میں ہر وہ چیز آجاتی ہے جس کے کرنے میں اللہ کی رضا یا اُسکے احکام کی تعمیل مقصود ہو، ٹھیک اسی طرح جس طرح دینی نقطۂ نظر سے اصطلاحی عبادات کے علاوہ، انسانی زندگی کے وہ تمام افعال اور حرکات و سکنات بھی عبادت میں داخل ہیں، جن سے اللہ کے حکم کی تعمیل مقصود ہو یا کم سے کم اُن کے کرنے میں اللہ و رسول کے احکام کا لحاظ رکھا گیا ہو، خواہ وہ فی نفسہٖ بالکل دنیوی اعمال ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ اطلاق مجازاً اور علی سبیل التوسّع ہوگا، ورنہ "حقیقی عبادات" وہی مخصوص اعمال رہیں گے جن کو اصطلاح میں عبادت کہتے ہیں اور ان کے اور مجازی "عبادات" کے احکام میں بڑا فرق رہے گا! پس اسی طرح "مقاصد دینیہ" کا مجازی اطلاق تو ہر اُس مقصد پر ہو جائیگا جس میں کوئی بھی دینی پہلو نکل آئے، لیکن حقیقۃً "مقاصد دینیہ" وہی مخصوص امور رہیں گے جن کو ہم کسی وقتی دینی یا مستحسن دنیاوی محرک سے مقصد نہیں بناتے

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

ان حدیثوں کے بعد محدثین کی دو تصریحات سامنے آتی ہیں:

پہلی تصریح ابن حجرؒ کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:-

اتفقوا علی جواز الکذب عند الاضطرار کما لو قصد ظالم قتل رجل وھو مختف عندہ فلہ ان ینفی کونہ عندہ	علمائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ مجبوری کے درجہ کی ضرورت پیش آجانے پر جھوٹ بولنا جائز ہے جیسا کہ اگر کوئی ظالم کسی شخص کو قتل کرنا چاہتا ہے اور وہ کسی کے پاس چھپا ہوا ہے تو اس شخص کے لئے جائز ہے کہ اسکی موجودگی کا انکار کردے۔

اس میں عند الاضطرار کا لفظ حکمت عملی کی گویا کھلی نفی ہے اور آگے جو مثال آئی ہے وہ اس بات کا کھلا قرینہ ہے کہ اس تصریح کا تعلق مقاصد دینیہ سے نہیں بلکہ حقوق العباد وغیرہ سے ہے۔

دوسری تصریح امام نووی کی ہے اور وہ یہ ہے:-

کل مقصود محمود یمکن تحصیلہ بغیر الکذب یحرم الکذب فیہ و ان لم یمکن تحصیلہ الا بالکذب جاز الکذب الخ	ہر اچھا مقصد جس کا حصول جھوٹ کے بغیر ممکن ہو اس کے لئے جھوٹ بولنا حرام ہے لیکن اگر اس کا حصول جھوٹ کے بغیر ممکن نہ ہو تو جھوٹ جائز ہے۔ الخ

اس میں بھی "وان لم یمکن تحصیلہ الا بالکذب" کے الفاظ قریب قریب "اضطرار" کے ہم معنی ہیں۔ یاہم اس کو اردو میں "مجبوری" سے تعبیر کرسکتے ہیں اور کسی کام کو مجبوری کے تحت کرنے اور حکمت عملی کے طور پر کرنے میں جو فرق ہے وہ ہم شروع میں اچھی طرح ظاہر کرچکے ہیں، علاوہ ازیں اس اصول کو بیان کرکے امام نوویؒ نے جو مثال دی ہے وہ بعینہ وہی ہے جو ابن حجرؒ کی تصریح میں گزری اس لئے یہ بات بھی صاف ہو گئی کہ "کل مقصود محمود" میں خالص مقاصد دینیہ شامل نہیں ہیں لیکن اگر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱ سابق) بلکہ خود اللہ نے متعین طور پر اُن کو ہمارا مقصد بنایا ہو اور اُن کیلئے جد وجہد مجموعی طور سے ہماری زندگی کا وظیفہ قرار دیا ہو۔ مثلاً اقامت دین، اظہار دین اور اشاعت دین، اچھی طرح سمجھ لیا جائے کہ ہماری مراد اس بحث میں "مقاصد دینیہ" سے اسی قسم کے مقاصد ہیں، ورنہ تو اس خاص معنی سے صرف نظر کرکے کیا شبہ ہے کہ ناموس رسولؐ کی حفاظت اعلیٰ درجہ کا دینی مقصد ہے۔ اصلاح بین الناس بھی ایک دینی مقصد ہے۔ کسی انسان یا کسی مسلمان کی خیرخواہی بھی ایک دینی مقصد ہے۔ وعلیٰ ہذا

امام نووی کے اس تعبیری اطلاق سے فائدہ اٹھانے پر کوئی مُصر ہی ہو اور ان قرائن کو خاطر میں نہ لانا چاہیئے تو ہم اُسے بتائیں گے کہ امام نووی کا یہ کلام خود اپنا کلام نہیں ہے، بلکہ امام غزالی کی احیاء العلوم سے ماخوذ ہے[1] اور امام غزالیؒ یہ اصول بیان کرکے احادیث سے اس پر استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

فھٰذہ الثلاث ورد فیھا صریح	پس ان تین اُمور (جنگ، صلح بین الناس
الاستثناء وفی معناھا ما عداھا	اور ازدواجی تعلقات کی خوشگواری کے لئے
اذا ارتبط بہ مقصود صحیح لہ	میاں بیوی کی گفتگو) میں تو صراحۃً استثناء
اولغیرہ الخ	وارد ہوا ہے اور ان کے علاوہ دوسرے
(احیاء العلوم جزء ثالث۔ بیان مارخص فیہ من الکذب)	مواقع کی بات چیت کا بھی، یہی حکم ہے جب کہ

اُس سے کسی شخص کا اپنا کوئی صحیح مقصد یا دوسرے کا کوئی صحیح مقصد وابستہ ہو۔

اس عبارت میں لہ اولغیرہ کے الفاظ نے "مقصود صحیح" کے اُس عموم کو بالکل ختم کردیا ہے جو امام نوویؒ کی عبارت میں نظر آتا ہے اور واضح کردیا کہ یہ اصول صرف انسانوں کے ذاتی مقاصد اور ان کی حاجات بشریہ تک محدود ہے۔

ہمیں امید نہیں ہے کہ اس کے بعد بھی کوئی صاحب امام نووی کے الفاظ کے عموم سے فائدہ اُٹھانے پر اصرار کریں گے لیکن اگر ہماری یہ اُمید غلط ہو تو پھر آخری چارۂ کار یہ ہے کہ اسی کذب کی بحث میں جو ایک فیصلہ کن سوال ہم سامنے لا چکے ہیں اُس کو اس موقع پر پھر دُھرائیں یا اسی طرح کی کوئی دوسری مثال سامنے رکھ کر سوال کریں۔ یہ سوالات انشاء اللہ ایسے حضرات کو خود مجبور کردینگے کہ وہ امام نووی کے بیان کردہ اصول کی تحدید کریں۔

غیبت کی حُرمت میں استثناء یہ مولانا کی مثالوں میں سے چوتھی مثال ہے، اور اس کا بھی وہی حال ہے کہ اس ذیل میں جتنے استثنائی مواقع پیش کئے گئے ہیں۔ اُن میں نہ "حکمت عملی" کا کوئی تصور آتا ہے نہ وہاں کسی

---

(۱) امام نوویؒ نے ریاض الصالحین میں جتنی بات اس موقع پر لکھی ہے وہ ان کی تصریح کے مطابق تلخیص ہے اُنکی کتاب الاذکار کے مفصل کلام کی، اور کتاب الاذکار میں انھوں نے صراحت کی ہے کہ یہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اُنکا اپنا نہیں، امام غزالیؒ کے افادات ہیں۔

مقصد دینی کی تحصیل یا اُس کے مفاد کا کوئی قصہ ہے، کوئی شریف آدمی ناواقفی سے کسی بداخلاق شخص کو بیٹی دے رہا ہو، یا کسی بدمعاملہ آدمی سے شرکت کا معاملہ کر رہا ہو تو اس بھلے آدمی کو دھوکہ کھانے سے بچانا تو، ظاہر ہے کہ نہ یہ مقاصد دینیہ میں سے کوئی مقصد ہے، نہ یہ دین کے مفاد کا کوئی کام ہے بلکہ اس کا تعلق محض حقوق العباد اور مصالح مسلمین سے ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس غرض کیلئے اُس بدکردار شخص کی بُرائی بیان کرنا "حکمت عملی" کے قبیل کی کوئی چیز نہیں ہے — رہا احادیث کی تحقیق کے لئے راویوں کی بُرائی بھلائی بیان کرنا تو "حکمت عملی" کا اطلاق اس پر بھی کون کر سکے گا؟ اور اس کے لئے بھی کسی بڑی نظری کاوش کی ضرورت نہیں کہ اس تنقیدی عمل کا منشا بھی کسی مقصد دینی کی تحصیل یا دین کو کوئی فائدہ پہنچانا نہیں بلکہ ایک نقصان کو دفع کرنا ہے جو غلط روایات کی وجہ سے دین کو، بلکہ حقیقتاً اہل دین کو لاحق ہو سکتا تھا، چنانچہ اسی لئے امام نوویؒ نے ریاض الصالحین میں اول الذکر دونوں جزئیات کی طرح اس جزئیہ کو بھی "تحذیر المسلمین من الشر" کے باب میں داخل کیا ہے۔

غیر محرم عورت کو برہنہ کرنے کی اجازت

برہنہ کرنے کی دھمکی دینا تو بیشک حکمت عملی ہے مگر حرمت دھمکی کی نہیں برہنہ کر دینے کی ہے، اور برہنہ کر دینے کا جواز بطور حکمت عملی کے قطعاً ثابت نہیں۔ اسکی اجازت اُس وقت ہے جب مرحلہ اضطرار اور مجبوری کا آجائے، کوئی اور چارۂ کار ہی نہ ہو اور وہ بھی اسلام اور مسلمانوں کو کوئی فائدہ پہنچانے کے لئے نہیں بلکہ محض نقصان سے بچانے کے لئے۔

انکارِ منکر میں استثناء

اس ذیل کی مثال کا بھی کوئی تعلق حکمت عملی سے نہیں دکھایا جا سکتا، اس کے علاوہ انکار منکر (قلبی انکار کے علاوہ) یوں بھی علی الاطلاق واجبات میں سے نہیں ہے۔ خصوصاً اسکی وہ آخری شکل جس سے زیر بحث مثال کا تعلق ہے، یعنی "تغییر بالید"۔ اسکے تو جواز کے لئے بھی بڑے شرائط ہیں، خاص کر جب کہ عملی انکار کی یہ شکل حکومت کے ساتھ کی جائے، پھر جب یہ علی الاطلاق جائز تک نہیں۔ تو اس سے ممانعت کی ایک مثال کو "واجبات دینیہ میں استثناء" کی مثال بنانا کہاں تک درست ہے؟ اس لحاظ سے تو یہ مثال سرے سے استثناء کی بحث سے بھی خارج ہے لیکن اگر یہ کسی طرح استثناء بھی

بن جائے تو دیکھنا یہ ہے کہ استثنا رکس لئے ہے؟ کوئی دینی مقصد حاصل کرنے کے لئے؟ دین کو کوئی فائدہ پہنچانے کے لئے؟ یا مصلحت مسلمین کے لئے کہ خروج علی الامام سے فتنہ، وفساد کا اندیشہ ہے

اقامتِ حدود میں استثنا، اس باب کے استثنا آت میں مولانا نے ایک، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول پیش کیا ہے، ایک آپ کا عمل، اور ایک حضرت عمرؓ کا اثر ـــــ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور حضرت عمرؓ کے فرمان کو لیجئے کہ دونوں میں ایک ہی بات ہے! یہ دونوں بیشک حکمت عملی کے باب سے ہیں مگر حصول مقصد والی حکمت عملی نہیں کہ اقامت حد کسی مقصد کے حصول میں مانع ہو رہی تھی، لہذا اُس میں استثنائی عمل کیا گیا۔ بلکہ یہ وہ حکمت عملی ہے جو احوال وظروف کی رعایت سے، کسی قاعدے اور قانون کو عملی جامہ پہنانے میں اختیار کی جاتی ہے۔ یعنی ایک خاص حالت میں کسی قانون کے نفاذ سے بعض مفاسد ومضرات کا اندیشہ ہے تو اس قانون کے نفاذ کے لئے ایسے وقت کا انتظار کیا جائے۔ جب وہ مفاسد بروئے کار نہ آ سکتے ہوں، یہ ہے وہ حکمت عملی جس کا ان دونوں مثالوں سے اثبات ہوتا ہے۔ یعنی قوانین کا نفاذ اندھا دھند نہیں ہونا چاہیئے بلکہ احوال وظروف کی رعایت کے ساتھ ہونا چاہیئے ـــــ اس میں اور مولانا جس حکمتِ عملی کے درپے ہیں اُس میں، کتنا بون بعید ہے؟ اس کو مولانا خوب سمجھ سکتے ہیں۔

بالفاظ دگر یہاں کسی اصول اور قانون کی قربانی نہیں کی جارہی ہے بلکہ اسکی تعمیل کو کچھ وقت کے لئے مؤخر کیا جارہا ہے، آنحضرتؐ کے ارشاد اور حضرت عمرؓ کے اثر سے یہ کسی نے نہیں سمجھا اور کسی کا یہ مسلک نہیں ہے کہ محاذ جنگ پر اگر کسی سے کوئی قابل حد جرم سرزد ہوجائے تو اس پر حد جاری ہی نہیں ہوگی، بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ سمجھا گیا ہے کہ دشمن کے علاقے میں حد جاری نہیں کی جائے گی، وہاں سے ہٹ کر یا دار الاسلام میں واپس آکر کی جائے گی، اس سے بھی اگر "قربانی" والی حکمتِ عملی کا جواز ثابت ہوتا ہے تو پھر اس کا کوئی جواب نہیں!

اب لیجئے واقعۂ افک والی مثال کو۔

اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ عبد اللہ بن اُبی پر حد جاری نہ ہونا مختلف فیہ ہے۔ ابن القیم کے بیان سے بیشک یہی معلوم ہوتا ہے کہ عبد اللہ بن اُبی پر حد جاری نہیں کی گئی۔ لیکن حافظ ابن

حجرؒ نے اس پر رد کیا ہے۔ ملاحظہ ہو فتح الباری، کتاب التفسیر، سورۂ نور۔
حدیث افک عن عائشہؓ کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

وعند اصحاب السنن من طریق محمد بن اسحاق بن عبد اللہ بن ابی بکر بن حزم عن عمرۃ عن عائشۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اقام حد القذف علی الذین تکلموا بالافک لکن لم یذکر فیھم عبد اللہ بن اُبَیّ و کذا فی حدیث ابی ھریرۃ عند البزار وبنیٰ علی ذلک صاحب الھدی فابدی الحکمۃ فی ترك الحد علی عبد اللہ بن اُبَیّ وفاتہ انہ ورد انہ ذکر ایضا فیمن اقیم علیہ الحد ووقع ذلک فی روایۃ ابی اویس عن حسن بن زید عن عبد اللہ بن ابی بکر اخرجہ الحاکم فی الاکلیل	اور محمد بن اسحاق عن عبد اللہ بن ابی بکر بن حزم عن عمرۃ عن عائشہؓ کی سند سے اصحاب سنن کی روایت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں پر حد قذف جاری کی جنھوں نے اس تہمت طرازی میں حصہ لیا تھا لیکن ان لوگوں میں عبد اللہ بن اُبَیّ کے نام کا ذکر (ان روایات) میں نہیں ہے، اور ایسے ہی مسند بزار میں حضرت ابو ہریرہ کی جو ایک روایت اس قصہ کی ہے اس میں بھی ابن اُبَیّ کا ذکر نہیں ہو اور صاحب زاد المعاد نے اسی سے یہ سمجھ لیا کہ عبد اللہ بن اُبَیّ پر سرے سے حد ہی جاری نہیں کی گئی اور اس کی حکمت بھی ظاہر کر دی لیکن اُن کے علم میں شاید یہ نہیں تھا کہ ایسی روایات بھی ہیں جن میں ان لوگوں کی فہرست میں جن پر حد جاری

کی گئی ابن اُبَیّ کا ذکر بھی موجود ہے اور یہ ابو اویس عن حسن بن زید عن عبد اللہ بن ابی بکر (بن حزم) کی روایت ہے جس کی تخریج حاکم نے الاکلیل میں کی ہے۔

اسی طرح تفاسیر میں معالم التنزیل (للبغوی) خازن اور روح المعانی میں بھی انھیں روایات پر اعتماد کیا گیا ہے جن میں عبد اللہ بن اُبَیّ پر بھی حد جاری کرنے کا ذکر ہے بلکہ صاحب روح المعانی نے تو دوسرا قول نقل کرکے صاف طور سے اُس کو رد بھی کیا ہے (ملاحظہ ہو

روح المعانی ج ۶ ص ۳۴۔ خازن ج ۵ ص ۵۱، اور معالم علی ہامش الخازن ص ۵۱ و ۵۲)

بہرحال یہ تو اس سلسلہ میں پہلی بات ہے اور قطع نظر اس کے کہ کون سا قول زیادہ لائق اعتماد ہو۔ نفس اختلاف سامنے آنے کے بعد مولانا کا استدلال ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ بات یقینی نہیں رہی کہ واقعۂ افک میں عبداللہ بن اُبی پر حد جاری نہیں کی گئی لیکن ہم علی سبیل التنزل اگر مان لیں کہ یہ بات یقینی ہے اور واقعہ میں ایسا ہی ہوا تو پھر دیکھنا یہ ہے کہ اقامت حد کے تاکیدی نصوص کی روشنی میں آیا اس واقعہ کی کوئی ایسی توجیہہ ممکن نہیں ہے جس سے ہمیں اس واقعہ کو اُن نصوص کے خلاف یا ایک استثنائی واقعہ نہ ماننا پڑے؟ تو ابن قیم ہی نے جو باقی قول اسکی توجیہہ میں نقل کئے ہیں، وہ سب ایسے ہی ہیں اور ہم اُن میں سے کسی ایک کو بھی اختیار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل کو اُن تاکیدی نصوص کے خلاف ماننے سے بچ سکتے ہیں۔ خاص طور سے دوسرا، تیسرا اور چوتھا قول اس لحاظ سے بہت صاف ہے اور وہ یہ ہیں :۔

۱۔ اس شخص نے فتنہ پردازی میں تو سب سے زیادہ حصہ لیا مگر فطری ہوشیاری کی وجہ سے یہ ایسے الفاظ نہیں بولتا تھا جو قانونی گرفت میں آئیں۔

۲۔ حد ثابت ہونے کے لئے اقرار یا شہادت ضروری ہے اور یہ فتنہ پرداز جو کچھ کیا کرتا اس نے شہادت سے بھی بچاؤ کر رکھا تھا، اس طرح کہ جو کچھ کہتا تھا اپنے آدمیوں میں کہتا تھا مخلصین کی جماعت میں ایسے الفاظ نہیں بولتا تھا کہ کل کو کوئی اس کے خلاف گواہی دے سکے۔

۳۔ حد قذف کے اجراء کے لئے مقذوف (جس پر تہمت لگائی گئی) کا مطالبہ شرط ہے حضرت عائشہ نے اس کے بارے میں مطالبہ نہ کیا ہوگا۔

ان اقوال میں سے کوئی سا بھی اختیار کر لیجئے، اقامت حدود کے تاکیدی نصوص اپنی جگہ برقرار رہیں گے اور یہ واقعہ شریعت کے عام قوانین کے لحاظ سے اپنی جگہ درست رہے گا۔

غایت مافی الباب مولانا یہ کہہ سکتے ہیں کہ میرے مدعا کیلئے تو بس اتنا ہی کافی ہے کہ اس سلسلہ میں ایک قول یہ بھی ہے اور ابن قیم جیسی معتبر شخصیت نے بھی اسکو لائق اعتنا قرار دیا جس سے کم از کم اتنی بات تو ثابت ہو گئی کہ مصالح کیلئے اصولوں کو قربان کر دینے کی گنجائش یہ حضرات بھی تسلیم کرتے ہیں اور میں اس خیال میں منفرد نہیں ہوں۔

اس سلسلہ میں ہماری اولین گزارش تو یہ ہے کہ جیسے مصالح کے لئے اصول کو قربان کر دینے کی

گنجائش اس قول اور ابن قیم کے اس اعتناء سے بادی النظر میں نکل رہی ہے، ایسے مصالح کے لئے فی الجملہ ہم بھی اس گنجائش کے قائل ہیں، اور اوپر یہ بات بکرات و مرات آچکی ہے، لیکن یہ مصالح اُن مصالح سے مختلف ہیں جن کے لئے آپ اصولوں کی قربانی کو جائز کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ مولانا غور اس پر غور فرمائیں کہ جب حد قذف کے اجراء کے لئے مقذوف کا مطالبہ شرط ہے یا اس کے بغیر اجراء حد لازم نہیں تو پھر مصلحت والے قول کی ہم یہ توجیہ کیوں نہ کریں کہ چونکہ اجراء حد کے لئے حضرت عائشہؓ کا مطالبہ ضروری تھا اور آنحضرتؐ کو اس شخص پر اجراء حد میں فتنہ کا اندیشہ تھا، اس لئے حضورؐ نے حضرت عائشہؓ سے یہ چاہا ہوگا کہ وہ اپنا حق معاف کردیں اور حضرت عائشہؓ کے عدم مطالبہ کی صورت میں اجراء حد کا کوئی سوال ہی نہیں رہتا۔ پس اس لئے آپ نے اُس پر حد جاری نہیں فرمائی۔ گویا ترکِ اقامتِ حد کا جواز مصلحت کی بناء پر پیدا نہیں ہوا بلکہ ایک دوسرے شرعی اصول سے اس کا جواز پیدا ہوا اور مصلحت کی خاطر آپؐ نے اس سے فائدہ اُٹھایا، بہرحال جب مصلحت والے قول کی یہ توجیہ ممکن ہے جس سے یہ قول عام قانون کے تحت آجاتا ہے تو کیوں خواہ مخواہ اس کو ایسے معنی میں لیا جائے جو عام قانون کے خلاف پڑتے ہیں ــ میں سمجھتا ہوں ابن قیم کے یہ الفاظ " ولعلہ ترک لهذا الوجوہ کلها " (یہ مختلف اقوال سے جو مختلف وجہیں نقل کی گئی شاید حضورؐ کا ابن اُبَیّ کو چھوڑنا ان سب ہی وجوہ سے تھا) بھی مصلحت والے قول کے اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو ہم لینا چاہتے ہیں کیونکہ اس قول کی اگر یہ توجیہ نہ کی جائے تو آپ غور کرکے دیکھ لیجئے، یہ قول دوسرے اقوال کے ساتھ کسی طرح بھی جمع نہیں ہوسکتا

مالِ غنیمت کی مساوی تقسیم میں استثناء

اس ذیل کی مثال بھی حکمت عملی سے تعلق رکھتی ہے مگر استثناء فی الواجبات کا اطلاق اس پر بھی غلط ہے۔ مال غنیمت کی مساوات حقوق العباد میں سے ہے اور حقوق العباد کے بارے میں یہ مسلّم ہے عقلاً بھی عرفاً بھی اور شرعاً بھی، کہ اگر صاحب حق سے رضامندی لے لی جائے، یا اُس کی رضامندی کا اعتماد ہو تو اس کے حق میں تصرف کرنا بالکل جائز ہے، غزوۂ اوطاس کی مثال میں یہی صورت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور انصار کا جس طرح تعلق ہے جو رہتی دنیا تک ایک مثال رہے گا، اسکی موجودگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اعتماد تھا اور برحق تھا کہ انصار کے

حق میں، میں جو کچھ تصرف کروں گا وہ بجان و دل اس پر راضی ہوں گے۔ یہی اعتماد تھا جسکی بنیاد پر آنحضرتؐ نے اُن کا حق دوسروں کو دیدیا، چنانچہ بعض انصاریوں کی شکایت[1] سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے مجمع میں جو سراپا اثر خطبہ ارشاد فرمایا جسے ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں درج کیا ہے اس میں اپنے اس فعل کے لئے وجہ جواز یہ نہیں بتائی کہ اسمیں مصلحت[2] ہے بلکہ اُس اعتماد والی بنیاد کی طرف اشارہ کیا۔ فرمایا۔ "اے گروہ انصار! کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لیجائیں اور تم رسول اللہ کو لیکر اپنی اقامت گاہوں کی طرف پلٹو"۔ (ترجمہ مولانا مودودی) یعنی میں نے یہ اسی اعتماد پر کیا ہے تو کیا میرا اعتماد غلط ثابت ہوگا! چنانچہ انصار نے زبان حال وقال سے بتایا کہ حضور کا یہ اعتماد صحیح تھا ——— پھر اس واقعے میں "استثناء" تلاش کرنے کی کیا تک ہے؟ استثناء جب ہوتا جب انصار کی رضامندی یا ان کی رضامندی کا اعتماد نہ ہوتا۔

(باقی)

---

(۱) مولانا کے الفاظ یہ ہیں کہ "انصار نے اس کی سخت شکایت کی"۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایسی بات صرف ایک دو آدمیوں کی زبان سے نکلی، اور جیسا کہ ہوتا ہے جب یہ بات پھیلی تو بعض اور لوگ بھی اس سے متأثر ہوگئے اور چہ میگوئیاں ہونے لگیں، ورنہ انصار نے بحیثیت مجموعی کوئی سخت شکایت نہیں کی تھی۔

(۲) مولانا نے لکھا ہے کہ حضورؐ نے اپنے اس فعل کی مصلحت یہ بتائی کہ یہ لوگ (قریش وغیرہ) تالیف قلب کے محتاج ہیں، اس لئے یہ دولت دنیا اُن میں لٹادی گئی۔ ہمارے سامنے اس وقت صرف زاد المعاد ہے اس میں حضورؐ کی زبان سے اس مصلحت کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ لیکن ہمیں اس سے انکار نہیں ہے کہ حضورؐ کے فعل کی مصلحت یہ تھی، البتہ دیکھنا یہ ہے کہ کیا حضورؐ نے اس مصلحت ہی کو غیر مساوی تقسیم کی وجہ جواز بھی بتلایا؟ دشتان ما بینهما۔

جادۂ حبیب

(از مولانا محمد اشرف خاں صاحب ایم۔ اے اسلامیہ کالج، پشاور)

(۵)

۵۔ محرم الحرام ۱۳۷۷ھ، ۶۔ اگست ۱۹۵۷ء منگل

صبح چار بجے آنکھ کھلی تو جہاز کویت پر لنگر انداز ہو چکا تھا، تقریباً ایک میل کی مسافت پر دور تک بجلیاں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں، دوسری طرف نو کے قریب جہاز لنگر انداز تھے، رات کے پچھلے حصے میں ساحل اور جہاز کی بجلیاں چاند کی دلفریب روشنی میں عجیب سہانا منظر پیش کرتی تھیں

بحری سفر کے مجھ جیسے اجنبی کے لئے یہ ایک انوکھا تجربہ تھا کہ جہاز موجوں کی حرکت اور ہوا کے زور سے باوجود لنگر انداز ہونے کے سمت بدلتا رہتا ہے، چنانچہ فجر سے پیشتر رفقا کو نوافل میں تین مرتبہ قبلہ نما دیکھ کر قبلہ بدلنا پڑا اور اس کا احساس اس طرح ہوتا رہا کہ وہ (آہا) کبھی دائیں کبھی بائیں ہو جاتی تھی۔

صبح صادق کے وقت شفق کی سرخی، فضا کی دلکشی، سمندر کا دل فریب سکون، صانع کی صناعی پر فریفتہ کیے دیتا تھا، جمیل مطلق کی صنعت جمال کا انعکاس، متلاشی نگاہوں کو یوں تو ہر ذرّے میں مل جاتا ہے، لیکن حجلہ نشین ازل جب اپنی زیبائیوں پر سے پردہ ہٹا دے تو کون قابو میں رہ سکتا ہے ؎

شاہدِ دلربا جب سامنے آجائے ہے تھامتا ہوں دل کو پر پہلو سے نکلا جائے ہے

کویت پر انگریزی سرپرستی میں ایک برائے نام شیخؒ کی حکومت ہے، تیل کے ذخائر آج عرب ممالک کے سلاطین و شیوخ کے لئے سونے کی کان ہیں، لیکن یہ دولت آزادی کے لئے

مستقل خطرہ بلکہ اکثر مقامات پر غلامی کا سبب بن چکی ہے، عامۃ الناس مفلوک الحال ہیں اور شیوخ اپنے حال میں مست،

کویت میں تیل کے ذخائر پوری افراط سے موجود ہیں، انگریز کمپنیاں اپنا تجارتی اور سیاسی تسلط جمائے ہوئے ہیں، جزیرۃ العرب کی وہ سرزمین جسے مشرکین سے پاک رکھنے کا اہتمام کیا گیا تھا، آج جگہ جگہ اس ارض مقدس کا سینہ اغیار کے ناسوروں سے چھلنی ہے، عدن، مسقط کویت ایک داغ ہو تو گنا جائے! فالی اللہ المشتکی وبہ المستغاث — اللہ تعالےٰ امت کے انفرادی و اجتماعی گناہوں کو معاف فرمائے ؎

اے حبیب عفو از ما عفو کن
اے طبیب رنج ناسور کہن

کویت میں جہاز تقریباً ۲۳ گھنٹے ٹھہرا، ہندستان سے آیا ہوا مال اس قدر زیادہ تھا کہ صبح ۷ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک متواتر کرین (CRANES) کے ذریعہ چار جگہ اُترتا رہا، اکثر مسافر بھی یہیں اُتر گئے، جہاز میں مسافر بہت کم رہ گئے ہیں، بالکل خالی اور سُونا سُونا معلوم ہو رہا ہے، جہاز سے کویت کی آبادی، عمارات وغیرہ بہت دُھندلی نظر آتی ہیں، لیکن میلوں تک آبادی پھیلی دکھائی دیتی ہے، جہازوں کی آمد و رفت بھی خوب ہے، صبح ۹ جہاز تھے اور ہمارے جہاز کی روانگی کے وقت ۱۴ ہو چکے تھے، اکثر تیل لینے کے لئے آئے ہیں یا مال بردار ہیں،

کویت، مسقط کی طرح عرب کے مشرقی ساحل پر ہے، خوش نصیب مغربی عرب کی اس سرزمین پر پہلے پہنچتے ہیں، جس کا ایک حصہ عرش و کرسی سے بھی زیادہ پاک و مکرم ہے۔

پاکیزہ تر از عرش و سما جنتِ فردوس ۔۔۔ آرام گہہِ پاک رسول عربی ہے
خاک طیبہ از دو عالم خوش تر است ۔۔۔ اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

بعض حسرت نصیب باوجود شوق کے بھی محروم رہتے ہیں، ممکن ہے نیت کا فساد ہو، محبت خام ہو، حکمت الٰہی نے نہ چاہا ہو، اس سال بھی حج کا ارادہ تھا، لیکن تقدیر الٰہی میں نہ تھا، اس لئے ظاہری صورتیں نہ بن سکیں،

صبت الکاس عنا ام عمرو ۔ وکان الکاس مجراھا الیمینا

نسیما جانب بطحا گزر کن ۔ زاحوالم محمد را خبر کن

رفقاء اپنے کام میں مشغول اور دیگر مشاغل سے بے پروا، اپنی دھن میں مست ہیں، ذکر و شغل، دعوت و تبلیغ، تعلیم و مذاکرات، عمومی و خصوصی گشت جاری ہیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ظاہری آثار و نتائج اچھے نظر آرہے ہیں، بعض غیر مسلم ہندو تک متاثر نظر آئے، جہاز کے عملے کے بعض حضرات آج کہنے لگے، ایسے مسافر کم ہی ملتے ہیں، جن کا کام محض اللہ کی پرستش اور مخلوق کی خدمت ہو، ایک ہندو آج "دم" کروانے بھی آئے، اللہ تعالیٰ ان حقیر مساعی کو محض قرب و رضا کا ذریعہ اور ہماری نجات کا سبب بنائے، اللّٰھم انی استغفرک من کل خیر اردت بہ وجھک فخالطنی فیہ مالیس لک، مخلوق پر نظر اللہ کے بندوں کا شیوہ نہیں جو ہو اس کے لئے ہو، وہ راضی ہے تو سب کچھ ہے ورنہ ہیچ ۔

تعارف و تبصرہ

ہندوستانی لسانیات کا خاکہ

از جان بیمز، مترجمہ پروفیسر سید احتشام حسین۔
سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ کاغذ سفید ۲۸ پونڈ، کتابت و طباعت اعلیٰ

ملنے کا پتہ:۔ دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ۔ قیمت ۶؍ غیر مجلد، ۷؍ مجلد

یہ کتاب جان بیمز کے پمفلٹ "این آؤٹ لائن آف انڈین فیلالوجی" کا ترجمہ ہو جس کے ساتھ مترجم کا ایک طویل مقدمہ بھی ہو جس میں زبان کے لسانی ارتقاء پر ہر پہلو سے روشنی ڈالی گئی ہے، جان بیمز نے یہ کتاب ۱۸۶۶ء میں لکھی تھی جبکہ وہ ہندوستان کے مختلف اضلاع اور صوبوں میں رہ چکا تھا، اور اس نے یہاں کی مختلف زبانوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ اس زمانہ میں جبکہ اردو اور ہندی کی بحث ایک زبردست گتھی بن گئی ہو یہ کتاب اس بحث کو سلجھانے میں کافی مدد دے سکتی ہے۔

احتشام صاحب نے ترجمہ کے ساتھ ایک طویل مقدمہ لکھ کر کتاب کی افادیت میں اضافہ کیا ہو۔ یہ مقدمہ موجودہ لسانی جھگڑوں کے پیش نظر کتاب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہو۔ احتشام صاحب ہندوستان کے صف اول کے نقادوں میں ہیں۔ نقاد کا ایماندار اور منصف ہونا ضروری ہو یہ خوبی احتشام صاحب میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس لیے انھوں نے اس مسئلہ کو جس طرح پیش کیا ہو اس سے بہت سے نزاعی معاملات کو حل کرنے میں مدد مل سکتی ہو۔ اردو پڑھنے والوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ صرف تعلیمی اعتبار سے ہی بہتر نہ ہوگا، بلکہ زبان کے ارتقاء ان کے خاندان، دنیا کی زبانوں کی گروہ بندی وغیرہ سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے بھی بہتر ہوگا، البتہ یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ اس کے مطالعہ سے وہی لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو اس موضوع کے مبادی اور خاص فنی اصطلاحات سے واقف ہوں۔

(ش۔ ر)

ماہنامہ مقام رسالت

زیرادارت جناب مولانا سلیم الدین صاحب شمسی، سائز ۲۰×۳۰/۸ صفحات ۴۸، کاغذ گلیز، کتابت و طباعت بہتر، سالانہ چندہ غالباً

پتہ :- ۱۳۲ بریٹو روڈ، کراچی ۵

کراچی کا یہ ماہنامہ کوئی ڈھائی سال سے پوری پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے رسالوں اور اخباروں پر تبصرہ کا کوئی خانہ الفرقان میں نہیں رکھا گیا ہے ـــــ خاص نمبر اس سے مستثنیٰ ہیں۔ لیکن مقام رسالت اپنی ایک خصوصیت کی بنا پر اس عام ضابطہ میں استثنار کا متقاضی تھا چنانچہ مدیر رسالہ کی فرمائش پر ہم نے وعدہ کر رکھا تھا کہ الفرقان میں اس کا تعارف کرایا جائے گا، بلکہ کئی مہینے ہوئے جب تو متعین طور سے بھی وعدہ کرلیا گیا تھا کہ فلاں مہینے میں مقام رسالت پر تبصرہ ہو جائے گا۔ مگر افسوس ہم اپنا یہ وعدہ وقت پر ایفا نہ کرسکے، حتیٰ کہ آج کئی مہینے کی تاخیر کے بعد جناب مدیر کی یاد دہانی پر اس کی نوبت آرہی ہے۔

مقام رسالت کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ انکار حدیث کے پرویزی فتنے کے استیصال کے لیے نکالا گیا ہے اور اس کے زیادہ تر صفحات الا ماشاء اللہ اسی خدمت کے لیے وقف رہتے ہیں۔ پرویز صاحب کتنی ہی گمراہ کن کتابیں اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے تیار کر چکے ہیں! اور اپنے ماہنامہ "طلوع اسلام" کے ذریعہ (اگر وہ اب بھی ماہنامہ ہی ہے) ہر مہینے دو ایک شوشے استخفاف حدیث کے چھوڑتے رہتے ہیں۔ اس مسلسل اور منظم کوشش کا مقابلہ کرنے کے لیے کم از کم ایک ایسی ہی لگاتار کوشش کی ضرورت تھی جو شمسی صاحب اپنے ماہنامہ کے ذریعہ کر رہے ہیں۔

شمسی صاحب اور اُن کے خاص قلمی معاونین کا انداز تنقید بڑا ستھرا اور موثر ہے، وہ گالیاں نہیں دیتے۔ منکرین حدیث کی کمزور رگوں کو پکڑتے ہیں۔ اُن کی ذولیدگیٔ افکار کو نمایاں کرتے ہیں اور واضح طور پر دکھاتے ہیں کہ دلائل کے لحاظ سے یہ گروہ کتنا مفلس ہے۔ اور کس طرح کے مغالطوں اور دھاندلیوں سے یہ اپنا کام چلا رہا ہے ـــــ ہماری خواہش ہے کہ مقام رسالت کا حلقہ اشاعت زیادہ سے زیادہ وسیع ہو، اور "قصۂ زمین" برسر زمیں طے کرنے کے لیے اس کی پشت زیادہ سے زیادہ مضبوط بنائی جائے۔

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

اکتوبر 1958ء

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے
لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، در اصل یہ
اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی
اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے
جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی
زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اس کا
عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السموات والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرة
توفنی مسلما والحقنی بالصالحین۔

"ادارۂ الفرقان"

مسئول
محمد منظور نعمانی

مرتب
عتیق الرحمن سنبھلی

کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات

برکات رمضان

از افادات مولانا نعمانی

اسلام کے اہم رکن "صوم رمضان" اور ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال و وظائف، تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات، اور ان کی روحانی تاثرات کا نہایت مؤثر اور شوق انگیز بیان اور حکیم اُمت حضرت شاہ ولی اللہؒ کے طرز پر اس سلسلہ کی احادیث کی ایسی تشریح جس سے دل بھی متأثر ہو اور دماغ بھی مطمئن۔ قیمت ۱۲/۰/۰

نماز کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اس کی روح و حقیقت سے واقف ہونے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں "کلمہ طیبہ کی حقیقت" کی طرح یہ بھی عقل و جذبات اور دل و دماغ کو یکساں متاثر کرتا ہے۔

قیمت ۱۳/۰

کلمہ طیبہ کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

اس میں اسلام کے کلمۂ دعوت
"لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ"
کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ سطر سطر سے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے
اور دماغ کے ساتھ دل بھی متاثر ہوتا ہے۔

قیمت ۔ ۔ ۶/۰/

آپ حج کیسے کریں؟

حج و زیارت کے متعلق اردو زبان میں بےشمار چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب (جو مولانا نعمانی اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی گویا مشترک تالیف ہے) اپنی بعض خصوصیات میں اب بھی بے نظیر ہے کہ اس کے مطالعہ سے حج کا صحیح اور مسنون طریقہ بہ تفصیل معلوم ہو جاتا ہے اور دل میں عشق و جذب اور ذوق و شوق کی وہ کیفیات بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو دراصل حج کی روح اور جان ہیں۔

کاغذ عمدہ .... قیمت مجلد ۲/۰/۰

آسان حج یہ آسان زبان میں "حج کیسے کریں" کا خلاصہ ہے ایسے کم تعلیم والے حضرات جو صرف آسان اور عمومی مضامین پڑھ سکتے ہیں وہ اس کے مطالعہ سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

طباعت معمولی ...... قیمت ...... صرف ۰/۸/۰

اسلام کیا ہے؟

تالیف مولانا نعمانی

اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں

اس کتاب کے دیکھنے والوں کا عام احساس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کوئی خاص مقبولیت و تاثیر عطا فرمائی ہے پچھلے چند سالوں میں تقریباً تیس ہزار اردو میں اور کئی ہزار گجراتی میں شائع ہو چکی ہے
اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کے لیے ہی نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ اور عمل ان شاء اللہ کافی ہے۔
زبان نہایت آسان ہونے کے ساتھ نہایت شیریں اور پرتاثیر ہے۔ کتابت طباعت اعلیٰ اور معیاری قسم اول کاغذ ۲۸ پونڈ چکنا مجلد ۲/۰/۰ قسم دوم کاغذ ۲۲ پونڈ چکنا غیر مجلد ۱/۴
ہندی اڈیشن کاغذ اعلیٰ مجلد۔ قیمت تین روپے ۳/۰/۰

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

قیمت ۰/۶/۰

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین کے الزامات

قیمت ۱/۸/۰

معرکۃ القلم

اکابر دیوبند کی طرف سے مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا آخری تحقیقی جواب .... قیمت ۱/۰/۰

انیس نسواں

از محترمہ بیگم سید جعفر حسین صاحب

مسلمان خواتین خاص کر تعلیم یافتہ بہنوں میں دین کی طرف سے جو بےفکری اور آخرت کی طرف سے جو غفلت تیزی سے بڑھ رہی ہے اس کے علاج اور انسداد کے لیے ایک محترم بہن نے یہ رسالہ لکھا ہے۔ شروع میں مولانا نعمانی کے قلم سے پیش لفظ ہے۔ ...... قیمت ۰/۱۰/۰

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

تالیف مولانا سید ابو الحسن علی ندوی
شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے قابل قدر فاضلانہ اور مبسوط مقدمہ ۲/۴/۰

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی۔ قیمت ۱/۸/۰

امام ولی اللہ دہلویؒ

از مولانا عبید اللہ سندھیؒ ..... قیمت ۱/۰/۰

جلد (۲۶) | ماہ ربیع الاول ۱۳۷۸ھ مطابق اکتوبر ۱۹۵۸ء | شمارہ (۳)

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہو ——— تو

اس کا مطلب یہ ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہو، براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی، پی ارسال کیا جائے گا۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع زیادہ سے زیادہ ۱۸ تاریخ تک پہونچ جانی چاہیے۔

پاکستان کے خریدار اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت:۔ رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ کو روانہ کر دیا جاتا ہو۔ اگر ۲۰ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔

مقام اشاعت:۔ دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از ــــــــــــــــ محمد منظور نعمانی

ہمارے ملک میں اخلاق و دیانت کا افلاس و زوال جس خطرناک حد تک پہنچ چکا ہو، پچھلی اشاعت کے ان ہی صفحات میں ہم نے اس کا کچھ تذکرہ کیا تھا ــــــــ آج کی صحبت میں حسبِ وعدہ یہ عرض کرنا ہو کہ اس بگاڑ کا سدھار اور اس مرض کا علاج کس طریقہ سے کیا جا سکتا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں جس طرح کی اور جس درجہ کی رسمی کوششیں اب تک ہوتی رہی ہیں وہ مقصد اور نتیجہ کے لحاظ سے قریب قریب بالکل ناکام رہی ہیں، اس لیے ضروری ہو کہ مسئلہ کو نئے ڈھنگ سے سوچا جائے ــــــــ ہم نے جہاں تک غور کیا ہو اس کا صحیح ترین راستہ تو وہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کا طریقۂ اصلاح و تزکیہ رہا ہے۔ یعنی یہ کہ پہلے بندوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا یقین اور اس کے ساتھ عبدیت کا ایک زندہ تعلق اور آخرت کی جزا سزا کا یقین اور وہاں کی فکر پیدا کی جائے اور اس کو بنیاد بنا کر ان کی زندگی کو صرف بددیانتی اور بدنیتی ہی کی ناپاکی سے نہیں بلکہ ہر قسم کی ناپاکیوں سے پاک کر دیا جائے ــــــــ اس طریقہ سے جو ہر جہتی پاکیزگی اور پاکبازی آتی ہے وہ کسی دوسرے طریقہ سے نہیں آسکتی۔ علاوہ ازیں اُس سے سیرت و اخلاق کی اس اصلاح و درستی کے ساتھ ساتھ جس کی ضرورت ہر خدا ناآشنا اور آخرت کے یقین سے محروم معاشرہ بھی محسوس کرتا ہے انسان، اللہ تعالیٰ کی ابدی رحمت و عنایت کا مستحق ہو جاتا ہے جو اس کی سب سے بڑی فیروزمندی ہے۔

لیکن اگر مادّی اور حیوانی فلسفۂ حیات اور اس طرح کے دوسرے عوامل نے ہمارے ملک

کے " بڑوں " کے دل و دماغ کو ایسا بنا دیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بتائی ہوئی سچی حقیقتوں پر اور اُن کے طریقہ پر ایمان و یقین کے لئے خدانخواستہ کوئی گنجائش فی الحال ان میں نہیں رہا ہے اور بدقسمتی سے یہ باتیں اُن کے نزدیک غور و فکر کے لائق ہی نہیں ہیں تو پھر کم از کم اتنا تو وہ کر ہی سکتے ہیں کہ صرف دنیوی اور قومی اخلاق کے محدود تصور اور اسکے بناؤ بگاڑ کے دنیوی نتائج ہی کو سامنے رکھ کر ملک کے مسائل میں اس کو وہ اہمیت دیں جس کا واقعۃً وہ مستحق ہے اور اپنے کو اور عوام کو صرف فریب دینے والی ڈھرے کی فضول کوششوں پر قناعت کرنے کے بجائے اس کے لیے اس طرح کی وسیع اور موثر جد و جہد کا چند سالہ ہی ایک منصوبہ بنائیں جو ایسے کسی اہم مسئلہ کے لیے ہونی چاہیئے، اور پھر اُس منصوبہ کو بروئے کار لانے کے لیے جو کچھ کرنا ضروری ہو اپنی امکانی حد تک اُس میں کمی نہ کریں ــــــــ اس کام کے سلسلہ میں چند اصولی باتوں کی طرف ہم یہاں بھی اشارہ کرتے ہیں۔

(۱) چور بازاری اور رشوت ستانی وغیرہ بد دیانتی کی مختلف صورتیں اخلاقی اور قانونی جرائم ہونے کے علاوہ ظاہر ہے کہ ملک کے لیے سخت تباہ کن اور اس وقت اُس کی ترقی کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں اس لئے وہ ملک کے حق میں چوروں کی چوری اور ڈاکوؤں کی ڈاکہ زنی سے بھی زیادہ مضر اور مہلک ہیں، لیکن ہمارے عوام میں اس پہلو کا شعور اتنا کم ہے کہ گویا نہیں ہے ــــــــ اس لئے اس کام کے سلسلہ کی پہلی ضرورت یہ ہو کہ جس طرح جنگ کے موقع پر ملک کی حفاظت کا داعیہ اور دشمن کے خلاف غصّہ اور نفرت کا جذبہ عوام کے دلوں میں پیدا کرنے کے لئے وسیع پیمانہ پر پروپگنڈا کیا جاتا ہے، لگ بھگ اسی پیمانہ پر بد دیانتی کی ان سب صورتوں کی نفرت دلوں میں پیدا کرنے کے لئے پروپگنڈا کیا جائے اور اس میں عوام کو یہ پہلو سمجھانے کی خاص طور سے کوشش کی جائے کہ یہ سخت ترین ملک دشمنی اور غداری بھی ہے۔

(۲) رشوت وغیرہ ناجائز طریقوں سے دولت کمانے والوں میں بلاشبہ ایک تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو اپنی " ضرورت " کے لیے نہیں بلکہ دولت بڑھانے کے لئے ہی یہ پاپ کرتے ہیں، لیکن اسّی نوّے فیصدی وہ ہوں گے جو صرف اس لئے اس راستہ پر چلنا شروع

کرتے ہیں کہ ان کی جائز آمدنی اُن کے بڑھے ہوئے خرچوں کے لئے پوری نہیں ہوتی ــــ مثلاً ایک بابوجی کی تنخواہ صرف دوسو روپے ہے لیکن ان کی زندگی کا جو معیار ہے اس کے لئے ضرورت پانچسو روپیہ ماہوار کی ہے، اس لئے ابتدا میں تو وہ صرف اس واسطے رشوت قبول کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ اپنے معیار کے مطابق زندگی کی ضرورتیں کسی طرح پوری کر سکیں ــــ لیکن خون منھ سے لگ جانے کے بعد پھر بات ضرورت ہی کی حد تک نہیں رہتی ــــ اس لئے اگر ملک کی خاطر اور اخلاق و شرافت کی خاطر بد دیانتی کے اس طوفان کو روکنا ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ معیار زندگی کی بلندی کا رجحان جس طرح ملک میں بڑھ رہا ہو (بلکہ دانستہ بڑھایا جا رہا ہے) اُسکی ان مضرتوں اور ہلاکتوں کو سمجھا جائے اور اس کو روکنے کی کوشش کی جائے ــــ اور اس کی صورت یہی ہے کہ سادہ معاشرت کے اصول کو اپنایا جائے اور اسی کو ملک کا فیشن بنا دیا جائے ــــ جاننے والے جانتے ہیں کہ کسی طرز زندگی کے فیشن بننے اور عوام میں مقبول ہو جانے کا بڑا دار و مدار ملک کے سر برآوردہ اور برسر اقتدار طبقہ کے طرز عمل پر ہوتا ہے۔ یہ طبقہ جس طرز زندگی کو اختیار کرلے وہ آسانی سے عوام کا فیشن بن سکتا ہے۔ پس اگر ہمارے ملک کے "بڑے" معتدل درجہ ہی کی سادہ معاشرت خود اختیار کرلیں اور عوام میں اس کو مقبول بنانے کے لئے سچے دل اور دیانت داری سے کوشش کریں تو دیکھتے دیکھتے ملک کا فیشن بدل سکتا ہے اور بد دیانتی اور رشوت خوری کی سب سے بڑی بنیاد ختم ہو سکتی ہے۔

میرے ایک دوست جنھوں نے گزشتہ سال ہی چین کا دورہ کیا ہے بتاتے تھے کہ پورے ملک نے سادہ اور کم خرچ معاشرت کے اصول کو ایسا اپنایا ہو کہ اب وہاں کسی کو اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے بڑی آمدنی کی ضرورت نہیں اور وہاں سے رشوت وغیرہ کے ختم ہونے میں اس چیز کو بھی بہت بڑا دخل ہے ــــ وہی دوست بتاتے تھے کہ وزراء تک کا معیار زندگی وہی ہو جو ایک متوسط درجہ کے شہری کا ہے، یہاں تک کہ وزراء اپنی نجی ضرورتوں کے لئے بے تکلف عام شہریوں کی طرح اور اُن کے ساتھ بسوں پر سوار ہوتے ہیں ــــ لیکن ہمارے اکثر وزراء شروانی اور پاجامہ یا کرتا اور دھوتی

تو بیشک وہ کھدر ہی کی پہنتے ہیں (جس کے لئے کسی حد تک مجبور بھی ہیں) لیکن موٹروں، کوٹھیوں اور زندگی کے دوسرے ٹھاٹھ باٹھ میں وہ کسی لارڈ اور کسی بڑے سے بڑے دولتمند سے کم نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان بڑوں کی معاشرت جب تک یہ ہے۔ فیشن اور معیار زندگی کے بارہ میں عوام کا رجحان یہی رہے گا جواب ہے اور اس کے نتیجہ میں عوام کا ایک طبقہ خاص کر سرکاری ملازمین کی بڑی تعداد رشوت خوری اور بددیانتی کو اپنی زندگی کی ضرورت سمجھتی رہے گی اور ملک ان لعنتوں سے کبھی بھی نجات نہ پاسکے گا۔ بات بات میں گاندھی جی کا نام لینے والے ملک کے بڑے اگر معاشرت اور معیار زندگی کے بارہ میں گاندھی جی کی منشا کو صرف ۵۰ فیصدی ہی پورا کرنے کا دیانت دارانہ ارادہ کرلیں تو معیار زندگی کی بلندی کے اس بڑھتے ہوئے بحران کی بہت کچھ اصلاح ہوسکتی ہے۔

(۳) مذکورہ بالا اصلاحی کوششوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ بددیانتی خاصکر خیانت و غبن اور رشوت ستانی کے قانون کو کم ازکم منصوبہ کی محدود مدت ہی کے لیے سخت سے سخت کیا جائے، جرم ثابت ہوجانے پر مجرموں کو عبرتناک سزائیں دی جائیں، ان کی دولت ضبط کی جائے، اور اُن کے جرم کی عوام میں پوری تشہیر کرکے اُن کی حیثیت عرفی کو بالکل گرا دیا جائے۔

(۴) اس سلسلہ کے مقدمات کی سماعت کے لیے اسپشل عدالتیں قائم کی جائیں اور اُن کے لئے ایسے جج منتخب کیے جائیں جن کی دیانت داری اور معاملہ فہمی زیادہ سے زیادہ قابل بھروسہ ہو۔ ان عدالتوں کا طریق کار ایسا ہو کہ معاملہ کا فیصلہ جلد سے جلد ہو اور ثبوت یا صفائی میں حصہ لینے والے عوام کا وقت برباد نہ ہو۔

(۵) جس طرح کسی خطرہ کے وقت سی، آئی، ڈی سے خاص پیمانہ پر کام لیا جاتا ہے اسی طرح منصوبہ کی مدت تک ہی کے لیے اس سلسلہ میں سی، آئی، ڈی کی سرگرمیوں کو وسیع اور تیز کردیا جائے۔

یہ چند اصولی اشارے ہیں، اگر ملک کے بڑے جن پر ملک اور قوم کی ذمہ داری ہے خلوص اور دیانت کے ساتھ اس بارہ میں اپنا فرض ادا کرنے کا ارادہ کریں تو وہ خود اس سے بھی زیادہ سوچ سمجھ سکتے ہیں۔

قرآنی دعوت

(مسلسل)

(اس سلسلہ کی اس سے پہلی قسط میں "سماحت و سخاوت" کے متعلق قرآن مجید کی تعلیم و تلقین ناظرین کرام پڑھ چکے ہیں ـــــ آج اُس سے آگے ملاحظہ فرمائیں!)

استغناء و قناعت:ـ

سماحت و سخاوت کی طرح استغناء و قناعت بھی انسان کے اعلیٰ شریفانہ اخلاق میں سے ہے، بلکہ کہنا چاہیئے کہ یہ دونوں نفس انسانی کی ایک ہی پاکیزہ صفت کے دو رخ ہیں ـــــ استغناء و قناعت کا مطلب یہ ہے کہ انسان، کو جو کچھ اپنے جائز ذرائع اور اپنی محنت کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے، وہ اُسی کو اپنا حق و حصہ اور اپنے لئے کافی سمجھے اور دوسروں کی چیزوں پر للچائی ہوئی نگاہیں نہ ڈالے۔ اور نہ مخلوق میں سے کسی کے سامنے احتیاج و طلب کا ہاتھ پھیلائے ـــــ قرآن مجید کی ہدایت ہو کہ ہر انسان اللہ تعالیٰ کا بندہ ہو اور اللہ تعالیٰ ہی اس کا رحیم و کریم رب ہے، لہٰذا اس کو چاہیئے کہ اپنی حاجتوں کے لیے اس کے سوا کسی کے سامنے اپنا ہاتھ نہ پھیلائے، اللہ کے خزانے میں سب کچھ ہے اور اس کی رحمت بندہ کے لیے کافی ہے ـــــ اس مضمون کی متعدد آیتیں توحید کے بیان میں ذکر کی جا چکی ہیں۔ ایک آیت یہاں اور بھی پڑھ لیجئے ـــــ ارشاد ہے:ـ

أَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ — کیا اللہ اپنے بندہ کے لیے کافی نہیں ؟ ـــ

(زمر ۴۶) (پھر وہ کیوں کسی دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلائے)

اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو جو کچھ اس دنیا میں دے رکھا ہے اُس کی حرص نہ کرنے اور

اس کی طرف طمع کی نگاہ سے نہ دیکھنے کا براہ راست حکم دیتے ہوئے ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ (طٰہٰ ۶)	اور ہرگز آنکھ اٹھا کے نہ دیکھو ان سامانوں کی طرف جن سے ہم نے ان میں کے مختلف لوگوں کو متمتع کر رکھا ہے۔

ایک دوسری جگہ ہدایت فرمائی گئی ہے:۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ (النساء ۵)	اور مت تمنا اور ہوس کرو اس چیز کی جس میں اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر بڑائی اور فوقیت دی ہو۔

مطلب یہی ہے کہ جو چیز اللہ نے اس دنیا میں کسی کو دی اور تمھیں نہیں دی تو تم اسکی ہوس مت کرو بلکہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھو، بس اسی کا نام قناعت ہو۔

توکل!

استغنا اور قناعت کی جڑ بنیاد توکل ہے، اللہ کے جس بندہ کو توکل یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت و ربوبیت پر اعتماد اور بھروسہ نصیب ہو اور اس کا دل اس پر مطمئن ہو کہ اللہ تعالیٰ میری ہر ضرورت کے لئے کافی ہے اور وہ میرا رحیم و کریم پروردگار اور کارساز ہے، اس میں استغنا و قناعت کی صفت کا بدرجۂ کمال موجود ہونا بالکل قدرتی بات ہے ——

—— علاوہ ازیں توکل بذات خود اور بجائے خود اعلیٰ ترین ایمانی صفت ہے، جس بندہ کو توکل نصیب ہو وہ اللہ تعالیٰ کو اور اسکی قدرت اسکے سارے خزانوں اور لشکروں کو ہر وقت اپنے ساتھ سمجھتا اور دیکھتا ہے، اس لئے قرآن مجید اپنے ماننے والوں کو توکل کی صفت اپنے اندر پیدا کرنے کی خاص طور سے تلقین اور تاکید کرتا ہے ——— ایک جگہ ارشاد ہے:۔

إِن يَنصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِن يَخْذُلْكُمْ	اگر اللہ تعالیٰ تمھاری مدد فرمائے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا، اور اگر اللہ

فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْ بَعْدِہٖ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

(آل عمران ع ۱۰۶)

تمہاری مدد سے ہاتھ اٹھالے تو اس کے بعد کون تمہاری مدد کر سکتا ہے، اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر توکل اور بھروسہ کرنا چاہیئے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے:-

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

(تغابن ع ۱۶)

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں (صرف وہی مالک و معبود ہے) اور بس اللہ ہی پر ایمان والوں کو توکل کرنا چاہیئے!

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے:-

وَتَوَکَّلْ عَلَی الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ۔

(الفرقان ع ۵)

اور تم بھروسہ کرو اس زندہ جاوید ہستی پر جس کو فنا اور موت نہیں (اور اس کے سوا سب فانی ہیں)

ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:-

وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمْرِہٖ

(طلاق ع ۱)

اور جو بندہ توکل کرے اللہ پر تو اللہ اس کے لئے بالکل کافی ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ اپنا کام پورا کرنے والا ہے۔

"اَلتَّذْکِیْرُ بِالْقُرْآنْ"

(از افادات حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری مدظلہ)

[رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی گذشتہ مہینے الہ آباد تشریف لے گئے تھے جہاں ان کو ایک تقریر کرنی تھی۔ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب مدظلہ کچھ عرصہ سے الہ آباد ہی میں مقیم ہیں۔ موصوف حضرت ممدوح کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے، اس صحبت میں حضرت ممدوح نے وعظ و تقریر کے متعلق کچھ ارشاد فرمایا، جس کا مقصد یہ تھا کہ سب سے زیادہ مؤثر تذکیر بالقرآن ہے۔ لیکن اب اس کا رواج بہت کم ہو گیا ہے، مولانا ندوی نے استدعا کی کہ اس مضمون کو حضرت قلمبند فرما دیں ـــــ چند روز کے بعد حضرت مولانا کا ایک گرامی نامہ مولانا ندوی کے نام آیا، اس کی اصل حیثیت مضمون یا مقالے کی نہیں، بلکہ مکتوب کی تھی۔ مولانا ندوی نے اس کی اشاعت کیلئے درخواست کی تو حضرت مولانا نے اس کو قبول فرمالیا اور اس میں کچھ اضافات کرکے اس کی افادیت میں اور اضافہ فرمادیا، وہی مکتوب ذیل میں شروع کی چند سطریں حذف کرکے جن کا تعلق مضمون سے نہیں ہے، درج کیا جا رہا ہے ـــــــــــ نعمانی]

مکرمی زاد اللہ عرفانکم ـــــــ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حسن اتفاق ہے جس مضمون کو میں پیش کرنا چاہتا تھا وہ نہایت عمدہ اور بلیغ عنوان سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ کے کلام میں مل گیا اس لیے بعینہ ارسال خدمت ہے، امید ہے کہ نہایت محظوظ ہوں گے۔ وہو ہذا

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ الفوز الکبیر کے مقدمہ میں فرماتے ہیں کہ

نعم الٰہی در بارۂ ایں بندۂ ضعیف بے شمار اند واجل آنہا توفیق فہم قرآن عظیم ست.

حق تعالیٰ کے انعامات اس بندۂ ضعیف وناتوان پر بے شمار ہیں لیکن اُن سب سے بڑھ کر نعمت قرآن شریف کے سمجھنے کی توفیق ہے۔

ومن حضرت رسالت پناہ علیہ الصلوٰۃ والسلام برکمترین امتیاں بسیارند واعظم آنہا تبلیغ فرقان کریم است. آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن را تلقین فرمود بقرن اول تا ایشاں بقرن ثانی رسانیدند وہکذا وہکذا تا آنکہ ایں درماندہ را نیز از روایت ودرایت آں حصہ رسید اللّٰھم صلی علیٰ ہذا النبی الکریم سیدنا ومولانا وشفیعنا افضل صلواتک وابین برکاتک وعلیٰ آلہ واصحابہ وعلماء امتہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین۔

(الفوز الکبیر صـ۲)

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات اپنے اس کمترین امت پر بہت زیادہ ہیں، مگر ان میں سب سے بڑا احسان آپ کا یہ ہو کہ آپ نے قرآن حکیم کو ہم تک پہونچایا (اس طرح سے کہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہؓ کرام کو قرآن کریم مرحمت فرمایا اور پھر صحابہؓ نے تابعینؒ کو پہونچایا اور اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ اس عاجز کو بھی اسکی روایت اور درایت (یعنی تلاوت اور فہم معانی) سے حصہ ملا۔ اے اللہ تو رحمت و برکت بھیج ایسے نبی کریم پر جو ہمارے سید ہیں اور ہمارے مولیٰ ہیں اور محشر میں ہمارے شفیع ہیں، اپنی افضل ترین رحمت اور مبارک ترین برکت، اُن پر بھی اور اُن کے جملہ اصحاب پر بھی اور ان کی امت کے تمام علماء پر بھی، برحمتک یا ارحم الراحمین۔

پھر کچھ دور بعد فرماتے ہیں :-

ومقاصد ایں رسالہ منحصر است در پنج باب۔ (باب اول) دربیان علوم پنجگانہ کہ قرآن عظیم بطریق تنصیص برآنہا دلالت فرمودہ است وگویا

اس رسالہ کے مقاصد پانچ بابوں میں منحصر ہیں، باب اول ان پانچ علوم کے بیان میں کہ قرآن شریف نے بطور تصریح کے ان پر دلالت فرمائی ہے۔

نزول قرآن بالاصالۃ برائے آں بودہ است (باب دوم) دربیان وجوہ خفائے نظم قرآن بہ نسبت اذہان اہل زمان وعلاج آں وجوہ با وضح بیان (باب سوم) دربیان لطائف نظم قرآن وشرح اسلوب بدیع آں بقدر طاقت وامکان (باب چہارم) دربیان فنون تفسیر وحل اختلاف واقع در تفسیر صحابہ وتابعین (باب پنجم) درذکر جملہ صالحہ از شرح غریب قرآن واسباب نزول آں، کہ مفسر را حفظ آں مقدار ضرور است وخوض در تفسیر بدوں ضبط آں ممنوع ومحظور۔

(الفوز الکبیر ص ۲)

بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قرآن کریم کا نزول ہی گویا دراصل انھیں کے بیان کے لیے ہوا ہے۔ باب دوم نظم قرآن کے خفا کے وجوہ کے بیان میں جو اہل زمانہ کے بعض اذہان کے اعتبار سے ہیں اور ان وجوہ کا علاج واضح بیان کے ساتھ باب سوم نظم قرآنی کے لطائف اور خوبیوں کا بیان اور بقدر طاقت وامکان اسکے اسلوب بدیع کی تشریح کے بیان میں۔ باب چہارم فنون تفسیر کے بیان میں اور صحابہ وتابعین کی تفسیر میں واقع شدہ اختلافات کا حل، باب پنجم غرائب القرآن اور اس کے شان نزول سے متعلق اس قدر کلام کہ ہر مفسر کے لیے اس مقدار کا یاد ہونا ضروری ہے، اور علم تفسیر میں بدون اسکے حفظ وضبط کے خوض کرنا منع ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ :۔

باب اول دربیان علوم پنجگانہ کہ قرآن عظیم بطریق تنصیص بیان آں فرمودہ است۔

پہلا باب ان علوم پنجگانہ کے بیان میں کہ قرآن حکیم نے بطور تنصیص وتصریح کے ان کو بیان فرمایا ہے۔

بایددانست کہ معانی منطوقہ قرآن خارج از پنج علم نیست، علم احکام از واجب ومندوب ومباح ومکروہ وحرام خواہ از قسم عبادات باشد یا معاملات

جاننا چاہیے کہ معانی قرآن ان پانچ علوم سے خارج نہیں ہیں علم احکام یعنی واجب ومستحب ومباح اور مکروہ وحرام خواہ عبادات کی قسم سے ہوں یا

یا تدبیر منزل یا سیاسات مدنیہ وتفصیل ایں ذمہ فقیہ است وعلم مخاصمہ با چہار فرقہ ضالہ یہود ونصاریٰ ومشرکین و منافقین وتفریع بریں علم ذمہ متکلم ست، وعلم تذکیر بآلاء اللہ از بیان خلق آسمان و زمین والہام بندگان بانچہ ایشاں را درمی بایست واز بیان صفات کاملہ او تبارک وتعالیٰ وعلم تذکیر بایام اللہ یعنی بیان وقائع کہ آنرا خدائے تعالیٰ ایجاد فرمودہ است از جنس انعام مطیعین و تعذیب مجرمین وعلم تذکیر بموت و مابعد آں از حشر ونشر وحساب ومیزان و جنت ونار وحفظ تفاصیل ایں علوم و الحاق احادیث وآثار مناسبہ آں وظیفۂ واعظ ومذکر ست۔

(الفوز الکبیر فی اصول التفسیر ص۳)

معاملات کی جنس سے ہوں۔ یا تدبیر منزل کی قسم سے ہوں یا سیاست مدنیہ کے قبیل سے ہوں بہر حال اس علم کی تفصیلات کا بیان فقیہ کے ذمہ ہے اور دوسرا علم مخاصمہ اور مناظرہ ہے۔ ان چار گمراہ فرقوں کے ساتھ یعنی یہود، نصاریٰ مشرکین اور منافقین اور اس علم کے مسائل کا بیان کرنا متکلم کا کام ہے۔ اور تیسرا علم تذکیر بالاء اللہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بیان کرنا مثلاً آسمان اور زمین کی تخلیق کا بیان اور اللہ تعالیٰ کا بندوں کو ان کی تمام ضروریات کا الہام فرمانا نیز حق تعالیٰ شانہ کی صفات کاملہ کا بیان۔

اور چوتھا علم تذکیر بایام اللہ ہے یعنی ان واقعات کا بیان کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جنھیں واقع فرمایا جو کہ از قبیل انعام مطیعین اور تعذیب مجرمین کے ہیں۔ اور پانچواں علم تذکیر بموت و مابعد آں ہے یعنی موت اور اس کے بعد پیش آنے والے حالات کا ذکر کرنا، مثلاً حشر ونشر، حساب ومیزان جنت ودوزخ وغیرہ اور ان علوم ثلثہ کے تفاصیل کا محفوظ کرنا اور بیان کرنا اور اس کے ساتھ اس کے مناسب احادیث وآثار کو بھی ملالینا یہ واعظ اور مذکر کا وظیفہ ہے

دیکھئے حضرت شاہ صاحب نے خطبہ میں حمد ونعت کو کس قدر مؤثر اور بلیغ انداز سے ادا فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام (اپنے اوپر) توفیق فہم قرآن اور جناب رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کا سب سے بڑا احسان تبلیغ فرقان کو فرمایا۔

پھر اپنے اس رسالہ کے مضامین کو جن پانچ ابواب میں منقسم فرمایا ہے، ان میں سے پہلے باب میں قرآن عظیم کے ان علوم خمسہ کو بیان کیا ہے جن کے لیے گویا نزول قرآن ہی بالاصالۃ ہوا ہے۔ یعنی علم احکام، علم مخاصمہ با فرق ضالہ، علم تذکیر بآلاء اللہ، علم تذکیر بایام اللہ، علم تذکیر بموت و مابعد آن اور پھر ان علوم خمسہ مذکورہ میں سے اول کو وظیفۂ فقیہ، ثانی کو وظیفۂ متکلم اور بقیہ ثلثہ یعنی تذکیر بآلاء اللہ، بایام اللہ اور بموت و مابعد آں کو وظیفۂ واعظ و مذکر قرار دیا ہے۔

اب آپ خود غور فرمائیے کہ ہمارے واعظین اور مذکرین فی زمانہ کہاں تک اپنے اس وظیفہ پر عامل ہیں، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ لوگوں کی مناسبت دینی آج اس درجہ ضعیف ہو چکی ہے کہ اگر آپ اس بات کو سمجھانا چاہیں کہ واعظ اور مذکر کا کیا وظیفہ ہے تو لوگ اس کو مشکل سے سمجھیں گے کیونکہ وظیفہ کا مفہوم ان کے ذہن میں کچھ اور ہے۔ اس کو کوئی وظیفہ سمجھنے اور کہنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

میں اسی بات کو آپ سے ذرا تفصیل سے عرض کرنا چاہتا تھا، پھر یہ خیال ہوا کہ بجائے اس کے کہ اپنے لفظوں میں کہوں، حضرت شاہ صاحبؒ ہی کے الفاظ نقل کر دوں کہ ان میں برکت بھی ہے اور یہ حضرات تھوڑے سے لفظوں میں معانی کے دریا بہا دیتے ہیں۔

پس جیسا کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ "حفظ تفاصیل ایں علوم و الحاق احادیث و آثار مناسبہ آں وظیفۂ واعظ و مذکر است" اصل منصب واعظ و مذکر کا تو یہی ہے کہ ان امور کو قرآن شریف ہی سے بیان کرے، کیونکہ ان سب مضامین کا ذکر قرآن کریم میں ہے اور اللہ تعالیٰ جس مضمون کو بیان فرما دیں گے تو ظاہر ہے کہ اس سے عمدہ اور اس سے زیادہ مؤثر کس کا بیان ہو سکتا ہے؟ اور جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے ہی متاثر نہ ہوگا تو پھر وہ کسی اور کے کلام سے کیا متاثر ہوگا؟ فبای حدیث بعد اللّٰہ و آیاتہ یومنون۔ ہاں اس کی اجازت ہے کہ وہ اپنے اصل مضامین قرآنیہ کی وضاحت اور تشریح کے لیے اس میں احادیث اور آثار کا بھی الحاق کر لے تو کر سکتا ہے باقی صرف احادیث اور آثار تو یہ قرآن شریف سے ہم کو مستغنی نہیں کر سکتے۔ میں آپ سے یہ بھی کہنا چاہتا تھا کہ لوگوں نے اس زمانہ میں قرآن مجید کو جو کہ ہدایت ہی کے لیے آیا تھا۔ اور ہدایت کا خدائی ذریعہ اور طریق تجویز ہوا تھا اس کو تو چھوڑ رکھا ہے، اور اس کے بدلہ میں دوسری

وہ ہو، کتابوں کو لے رکھا ہو۔ بزرگوں کا کلام دیکھتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کے کلام سے شغف نہیں رہا جب یہ حال ہو تو پھر ہدایت کیسے ہو سکتی ہو اور مسلمانوں کی حالت کیونکر درست ہو سکتی ہو۔ جو قوم قرآن پر ایمان نہ لاوے گی وہ غیر قرآن سے ایمان کیسے حاصل کر سکتی ہو۔ فبای حدیثٍ بعدہٗ یومنون۔ اس سلسلہ کی ایک روایت بھی یاد آئی۔ سنیے :۔

منتخب کنز العمال میں ہے کہ :۔

عن ابی ذرؓ ان بنی اسرائیل	حضرت ابوذرؓ سے مروی ہو کہ بنی اسرائیل
کتبوا کتابا فاتبعوہ وترکوا التوراۃ	نے ایک کتاب لکھی اور اللہ تعالیٰ کی کتاب
(منتخب کنز العمال)	یعنی) تورات کو چھوڑ دیا۔

شامی میں ایک حکایت حضرت امام شافعیؒ کی لکھی ہو کہ

قال المزنی قرأت کتاب الرسالۃ	مزنیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے کتاب
علی الشافعیؒ ثمانین مرۃ فما	الرسالۃ کو حضرت امام شافعیؒ پر اسّی بار
من مرۃ الا وکان یقف علی	پڑھا، مگر ہر بار ایک نہ ایک غلطی کا پتہ چلتا
خطاءٍ فقال الشافعی ھیہ ابی اللہ	پس حضرت شافعیؒ نے فرمایا کہ ہٹاؤ بھی
ان یکون کتابًا صحیحًا غیر کتابہ	اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہی نہیں کہ ان کی
(شامی ص۲ ج ۱)	کتاب کے علاوہ کوئی اور کتاب بالکل صحیح ہو۔

اسی سلسلہ میں ایک بات اور کہنا چاہتا تھا وہ یہ کہ قرآن کریم تاثر اور تاثیر ہی کے لیے نازل ہوا ہو اور لوگ اس سے خود بھی متاثر ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی متاثر کیا ہو۔ چنانچہ روح المعانی میں ہے کہ :۔

قرأ تمیم الداری سورۃ الجاثیہ	حضرت تمیم داریؓ نے مقام ابراہیم کے
فلما اتی علی قولہ تعالیٰ ام حسب	پاس سورۂ جاثیہ تلاوت فرمائی اور
الذین الایۃ لم یزل یکررھا و	جب آیت ام حسب الذین اجترحوا
یبکی حتی اصبح وھو عند المقام۔	السیات پر پہنچے تو اسی کو بار بار پڑھتے
عن بشیر مولی الربیع بن خیثم	رہے اور روتے رہے۔ یہاں تک کہ

ان الربیع کان یصلی الفجر بھذہ الآیۃ ام حسب الذین الخ فلم یزل یرددھا حتی اصبح ، وکان الفضیل بن عیاض یقول لنفسہ اذا قرأھا لیت شعری من ای الفریقین انت؟ (روح المعانی ج ۲۵)

صبح ہو گئی۔ حضرت بشیر جو ربیع بن خثیم کے غلام ہیں کہتے ہیں کہ ربیع نماز پڑھ رہے تھے اور جب اس آیت ام حسب الذین پر گذرے تو اسی کو بار بار صبح تک تلاوت فرماتے رہے۔ حضرت فضیل بن عیاض جب اس آیت کو پڑھتے تو اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتے کہ کاش اے نفس میں یہ جانتا ہوتا کہ ان دونوں فریقوں میں سے تو کس میں سے ہے ؟۔

چنانچہ اس آیت کو اسلاف مبکاۃ العابدین کے لقب سے ملقب فرماتے تھے، کیونکہ بہت سے عباد اس کی تلاوت کر کر کے روتے تھے ـــــ لیکن دوسروں کو وہی لوگ متاثر کر سکتے تھے جو پہلے خود اس سے متاثر ہوں۔ آج دوسرے لوگوں پر آیات کا بھی اثر نہ ہونے کی وجہ یہی ہو کہ یہ لوگ خود ہی متاثر نہیں ہوتے اس لیے دوسروں کو بھی متاثر نہیں کر پاتے۔ اور جب غیر متاثر قلب دوسروں کو بذریعہ قرآن متاثر نہیں کر سکتا تو ایسا شخص غیر قرآن سے تو بدرجہ اولیٰ قوم میں کچھ تاثر نہیں پیدا کر سکتا۔ بس یہی وجہ ہو آج اثر کے ختم ہونے کی۔ ورنہ خیال فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہمارے اندر موجود ہو اور پھر گمراہی؟ کس قدر تعجب کی بات ہے۔

آپ نے حدیث شریف کی کتاب کا ترجمہ کرنے کا ذکر فرمایا تھا۔ اسی پر جی چاہا کہ آپ سے اس سلسلہ میں جو کچھ خود سمجھا ہوا ہوں عرض کر دوں اس لیے مختصراً کچھ پہلے لکھ چکا ہوں اور بعض باتیں لکھنے کا وعدہ جو کیا تھا وہ اب عرض کر رہا ہوں۔ ورنہ یہ مقصد نہیں کہ ہم حدیث سے یا اس کے ترجمہ سے معاذ اللہ مستغنی ہیں۔ نہ اس سے مستغنی ہیں اور نہ اسی کی وجہ سے قرآن شریف ہی سے مستغنی ہو سکتے ہیں۔ اور نہ قرآن شریف کو لے کر علماء سے مستغنی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ قوم کو علماء کی بھی حاجت ہو، حدیث کی بھی قوم محتاج ہو۔ اور قرآن کریم سے تو کسی درجہ میں بھی استغناء نہیں ہو۔ لیکن جہاں یہ سب ہو وہاں یہ بھی سمجھئے کہ علماء کے لیے بھی دوسروں پر اثر ڈالنے کے لیے

صرف حدیث و قرآن کا پڑھ دینا بھی کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے خود ان کا قلب ان مضامین سے پورا پورا متاثر ہو چکا ہو۔ اب اس وقت اگر وہ صرف قرآن شریف کا ایک رکوع یا واعظ اور مذکر اپنے وظیفہ کے مضامین میں کی ایک آیت ہی پڑھ دے گا اور زیادہ تفصیل نہ سہی صرف اس کا ترجمہ ہی کر کے عوام الناس کو سنا دے گا تو مجھے یہ یقین ہے کہ اس کا صرف اتنا بیان بھی غیر متاثر القلب کے لیے بھی تقریروں سے زیادہ نافع ہو گا۔ اور فائدہ اس کا لازم بھی ہو گا اور متعدی بھی۔ یعنی اس کا دوسروں پر بھی اثر ہو گا اور خود اس کو بھی اجر ملے گا۔

نمونہ کے طور پر قرآن کریم کی چند آیات آپ کے سامنے تلاوت کرتا ہوں اور آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ بتائیے قلوب کو متاثر کرنے کے لیے یہ بیان کچھ کم ہے۔

سنئے اللہ تعالیٰ ایک جگہ دوزخیوں کا اور دوزخ میں ان کے کھانے وغیرہ کا کیا ذکر فرماتے ہیں۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

ان شجرت الزقوم ہ طعام	بیشک زقوم کا درخت بڑے مجرم (یعنی
الاثیم ہ کالمھل یغلی فی البطون ہ	کافر) کا کھانا ہو گا جو تیل کی تلچھٹ ایسا
کغلی الحمیم ہ خذوہ فاعتلوہ	ہو گا اور پیٹ میں ایسا کھولے گا جیسا
الی سواء الجحیم ہ ثم صبوا فوق	تیز گرم پانی کھولتا ہے (اور فرشتوں کو
راسہ من عذاب الحمیم ہ ذق	حکم ہو گا کہ) اس کو پکڑو، پھر گھسیٹتے ہوئے
انک انت العزیز الکریم ہ ان	دوزخ کے بیچوں بیچ تک لے جاؤ پھر
ھذا ماکنتم بہ تمترون ہ	اس کے سر پر تکلیف دینے والا گرم پانی
(سورۂ دخان پ۲۵)	چھوڑو (اور اس سے تمسخر کیا جاوے

گا) لے چکھ تو بڑا معزز مکرم ہے (اور دوزخیوں سے کہا جائے گا کہ) یہ وہی چیز ہے جس میں تم شک کیا کرتے تھے۔

اور پھر اس کے بعد جنتیوں کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

ان المتقین فی مقام امین فی	بیشک خدا سے ڈرنے والے امن کی
جنٰت وعیون ہ یلبسون من	جگہ میں ہوں گے یعنی باغوں میں

سندس و استبرق متقابلین ٥ کذالک وزوّجنٰھم بحور عین ٥ یدعون بکل فاکھۃ اٰمنین ٥ لا یذوقون فیھا الموت الا الموتۃ الاولیٰ ووقٰھم عذاب الجحیم ٥ فضلاً من ربّک ذالک ھو الفوز العظیم ٥ فانّما یسّرنٰہ بلسانک لعلّھم یتذکرون ٥ فارتقب انّھم مرتقبون ٥

(سورۂ دخان)

اور نہروں میں وہ لباس پہنیں گے باریک اور دبیز ریشم کا آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ یہ بات اسی طرح ہے اور ہم ان کا گوری گوری بڑی بڑی آنکھوں والیوں سے بیاہ کردیں گے۔ اور وہاں اطمینان سے ہر قسم کے میوے منگاتے ہوں گے۔ اور وہاں بجز اس موت کے جو دنیا میں آچکی تھی اور موت کا ذائقہ بھی نہ چکھیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو دوزخ سے بچالے گا یہ سب کچھ آپ کے رب کے فضل سے ہوگا۔ بڑی کامیابی یہی ہے۔ سو ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان میں آسان کردیا ہے تاکہ یہ نصیحت قبول کریں تو آپ منتظر رہیے، یہ لوگ بھی منتظر ہیں۔

(بیان القرآن)

سبحان اللہ کلام کی شوکت اور شان ملاحظہ فرمائیے، کوئی اہل دل اگر صرف ان آیات کو تلاوت ہی کردے اور صرف ترجمہ ہی کردے تب بھی اہل ایمان کے قلوب ہل جائیں اور بدن میں کپکپی ہونے لگے۔ یہی مطلب میرا تھا کہ اصلاح کے لیے لوگ قرآن شریف کا وعظ کیوں نہیں کہتے۔ صرف قرآن بھی اصلاح کے لیے کافی ہے اور اس میں بھی جو تفصیل جنت و دوزخ اور آخرت حشر نشر کی بیان کی گئی ہے وہ احادیث کے مقابلہ میں گو کم سہی تاہم فی نفسہ وہ بھی بہت ہے ـــــ اور سنیے۔

ایک اور مقام پر مسیئین اور محسنین کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

ام حسب الذین اجترحوا السّیّاٰت ان نجعلھم کالذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت سواءً محیاھم ومماتھم

یہ لوگ جو برے برے کام کرتے ہیں کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر رکھیں گے جنھوں نے

ساء ما یحکمون ٥ (سورۂ دخان)

ایمان اور عمل صالح اختیار کیا کہ اُن سب کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے یہ برا حکم لگاتے ہیں۔ ——— (بیان القرآن)

اس کے شانِ نزول کے متعلق صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ

والآیۃ وان کانت فی الکفّار علیٰ ما نقل عن البحر وھو ظاھر ماروی عن الکلبی من ان عتبۃ وشیبۃ والولید ابن عتبۃ قالوا لعلی کرم اللہ وجہہ وحمزۃ رضؓ والمؤمنین "واللہ ما انتم علیٰ شیٔ ولئن کان ما تقولون حقاً لحالنا افضل من حالکم فی الآخرۃ کما ھو افضل فی الدنیا فنزلت الآیۃ ام حسب الذین اجترحوا السیّٰات وھی متضمنہ للرد علیہم علیٰ جمیع اوجہ کما یعرف بادنیٰ تدبر یستنبط منھا تباین حالی المومن الطائع والمؤمن العاصی وبھذا کان کثیر من العباد یبکون عند تلاوتھا حتیٰ انھا تسمیٰ مبکاۃ العابدین۔ (روح المعانی پ۲۵ ص۱۳۷)

اور یہ آیت اگرچہ کفار کے متعلق ہو جیسا کہ بحر سے منقول ہو اور یہی کلبی کی اس روایت سے بھی معلوم ہوتا ہو کہ عُتبہ و شیبہ اور ولید بن عتبہ نے حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ اور دیگر مومنین سے کہا، خدا کی قسم! تمھارا دین تو کچھ بھی نہیں ہو، اور اگر بالفرض دنیا میں تم لوگوں کی باتیں حق بھی ہوں تب بھی ہمارا حال جس طرح سے کہ دنیا میں تم سے بہتر ہو اسی طرح آخرت میں بھی بہتر ہوگا اس پر یہ آیت نازل ہوئی ام حسب الذین اجترحوا السّیّات اور یہ ان لوگوں پر تمام وجوہ سے رد کو متضمن ہے جیسا کہ ادنیٰ تامل سے معلوم ہو سکتا ہو۔ اس سے یہ بھی مستنبط ہوا کہ مومن مطیع اور مومن عاصی کے احوال بھی متبائن ہوتے ہیں۔ اسی لیے بہت سے عُبّاد اس کو تلاوت کر کر کے روتے تھے۔ چنانچہ اس آیت کا لقب ہی مبکاۃ العابدین (یعنی "عابدوں کو رلانے والی") ہو گیا۔

دیکھیے جس زمانہ میں لوگوں میں قرآن شریف کی تلاوت اور اس سے اثر لینے کا معمول تھا تو لوگ صرف اسی ایک آیت سے کیسا کیسا اثر قبول کرتے تھے۔ اور دل ہی جب اثر سے خالی ہو تو پھر ایک آیۃ کیا سارا قرآن بھی اس کے لیے ناکافی ہو۔ انسان جب اس مرتبہ پر پہونچ جاتا ہو تو اس کا مصداق ہو جاتا ہو کہ ۔

افلا یتدبرون القرآن ام علیٰ قلوبٍ اقفالہا۔ (سورۂ محمد)

تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر قفل لگ رہے ہیں۔ (بیان القرآن)

اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔ باقی عام قفل کا تو یہ قاعدہ ہو کہ وہ کنجی سے کھل بھی جاتا ہو۔ لیکن قلب پر جب قفل پڑ جاتا ہو تو پھر بڑی مشکل سے کھلتا ہے۔ اسی لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث شریف میں یہ دعا مانگی ہے:۔

اللھم افتح اقفال قلوبنا بذکرک واتمم علینا نعمتک واسبغ علینا من فضلک واجعلنا من عبادک الصالحین۔ (مناجات مقبول ص۵۲)

یا اللہ کھول دے قفل ہمارے دلوں کے اپنے ذکر سے اور پورا کر ہم پر اپنی نعمت کو اور کامل کر ہم پر اپنا فضل اور کر دے ہمیں اپنے نیک بندوں میں سے۔

ایک اور جگہ قیامت کا کیا نقشہ کھینچتے ہیں۔ سنیے۔ فرماتے ہیں۔

و للہ ملک السموات والارض ویوم تقوم الساعۃ یومئذ یخسر المبطلون ○ وتریٰ کل امۃ جاثیۃ کل امۃ تدعیٰ الیٰ کتابہا الیوم تجزون ما کنتم تعملون ○ ھذا کتابنا ینطق علیکم بالحق انا کنا نستنسخ ما کنتم تعملون ○ فاما الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت فیدخلھم ربھم فی رحمتہٖ

اور اللہ ہی کی سلطنت ہو آسمانوں میں اور زمین میں اور جس روز قیامت قائم ہوگی اس روز اہل باطل خسارہ میں پڑیں گے اور آپ ہر فرقہ کو دیکھیں گے کہ زانو کے بل گر پڑیں گے۔ ہر فرقہ اپنے نامۂ اعمال کی طرف بلایا جائے گا۔ آج تم کو تمہارے کیے کا بدلہ ملے گا۔ یہ ہمارا دفتر ہو جو تمہارے مقابلہ میں ٹھیک ٹھیک بول رہا ہو ہم تمہارے اعمال کو لکھواتے جاتے تھے۔ پس

ذالک هو الفوز المبین ۝ واما الذین کفروا افلم تکن ایاتی تتلی علیکم فاستکبرتم وکنتم قوماً مجرمین ۝ واذا قیل ان وعد اللّٰہ حق والساعۃ لاریب فیہا قلتم ماندری ما الساعۃ ان نظن الاظنا ومانحن بمستیقنین ۝ وبدالہم سیّأت ماعملوا وحاق بہم ما کانوا بہ یستہزؤن ۝ وقیل الیوم ننسکم کما نسیتم لقاء یومکم ھذا وماوٰکم النار ومالکم من نصرین ۝ ذلکم بانکم اتخذتم ایت اللّٰہ ھزوا وغرتکم الحیوۃ الدنیا فالیوم لایخرجون منہا ولاھم یستعتبون ۝ فللہ الحمد رب السموات رب الارض رب العلمین ۝ ولہ الکبریاء فی السموات والارض وھو العزیز الحکیم ۝

(سورۂ جاثیہ)

جو لوگ ایمان لائے تھے اور انھوں نے اچھے کام کیے تو ان کو ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا اور یہ صریح کامیابی ہے۔

اور جو لوگ کافر تھے (ان سے کہا جاوے گا کہ) کیا میری آیتیں تم کو پڑھ پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں سو تم نے تکبر کیا تھا اور تم بڑے مجرم تھے اور جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ حق ہے اور قیامت میں کوئی شک نہیں ہے تو تم کہا کرتے تھے کہ ہم نہیں جانتے قیامت کیا چیز ہے۔ محض ایک خیال سا تو ہم کو بھی ہوتا ہے۔ اور ہم کو یقین نہیں اور ان کو اپنے تمام برے اعمال ظاہر ہو جائیں گے اور جس کے ساتھ وہ استہزاء کیا کرتے تھے وہ ان کو آگھیرے گا اور کہا جاوے گا کہ آج ہم تم کو بھلائے دیتے ہیں جیسا تم نے اپنے اس دن کے آنے کو بھلا رکھا تھا اور تمھارا ٹھکانا جہنم ہے اور کوئی تمھارا مددگار نہیں، یہ اس وجہ سے ہے کہ تم نے خدائے تعالیٰ کی آیتوں کی ہنسی اڑائی تھی اور تم کو دنیوی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا سو آج نہ تو یہ لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ان سے خدا کی خفگی کا تدارک چاہا جاوے گا۔ سو تمام خوبیاں اللہ ہی کے لیے ہیں جو پروردگار ہے آسمانوں کا اور پروردگار ہے زمین کا،

پروردگار ہے تمام عالم کا اور اسی کو بڑائی ہے آسمان اور زمین میں اور وہی زبردست ہے حکمت والا ہے۔ (بیان القرآن)

دیکھیے ان آیات میں قیامت کا کیسا منظر سامنے کر دیا اثر ڈالنے کے لیے یہ مضمون اور یہ آیتیں کچھ کم ہیں۔ اگر کوئی اس سے متاثر نہ ہوگا تو وہ دوسری اور کتابوں سے بدرجۂ اولیٰ نہ ہوگا۔ مگر جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اثر ڈالنے کے لیے بیان کرنے والے کا خود بھی متاثر ہونا شرط ہے۔

ایک اور جگہ جنت اور دوزخ کی کیفیت بیان کر کے جنت کی ترغیب اور جہنم سے ترہیب کس عنوان سے فرما رہے ہیں۔ سنیے ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

مثل الجنّة التی وعد المتقون تجری من تحتها الانھٰر اکلها دائم و ظلها تلك عقبی الذین اتقوا وعقبی الکٰفرین النار (سورہ رعد)

اور جس جنت کا متقیوں سے (یعنی شرک وکفر سے بچنے والوں سے) وعدہ کیا گیا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس (عمارت اور اشجار) کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی اس کا پھل اور اس کا سایہ دائم رہے گا۔ یہ تو انجام ہوگا متقیوں کا اور کافروں کا انجام دوزخ ہوگا۔ (بیان القرآن)

ایک اور جگہ عذاب کفار کا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

ولا تحسبن اللّٰه غافلاً عما یعمل الظّٰلمون ۵ انّما یؤخرھم لیوم تشخص فیه الابصار ــ مھطعین مقنعی رؤسھم لا یرتدّ الیھم طرفھم و افئدتھم ھوآء ۵ و انذر النّاس یوم یاتیھم العذابُ فیقول الّذین ظلموا ربّنا اخّرنا الیٰ اجل قریب نجب دعوتك

اور (اے مخاطب) جو کچھ یہ ظالم لوگ کر رہے ہیں اس سے خدا تعالیٰ کو بے خبر مت سمجھ ان کو صرف اس روز تک مہلت دے رکھی ہے جس میں ان لوگوں کی نگاہیں پھٹی رہ جاویں گی، دوڑتے ہوں گے اپنے سر اوپر اٹھا رکھے ہوں گے ان کی نظر ان کی طرف ہٹ کر نہ آوے گی اور ان کے دل بالکل بدحواس ہوں گے اور

ونتبع الرسل ، اولم تکونوا	آپ ان لوگوں کو اس دن سے ڈرائیے
اقسمتم من قبل مالکم من زوال ۝	جس دن ان پر عذاب آپڑے گا پھر یہ
وسکنتم فی مسٰکن الذین ظلموا	ظالم لوگ کہیں گے کہ اے ہمارے رب !
انفسہم وتبین لکم کیف فعلنا بہم	ایک مدت قلیل تک ہم کو مہلت دیدیجئے
وضربنا لکم الامثال ۝ وقد مکروا	(اور دنیا میں پھر بھیج دیجئے) ہم آپ کا
مکرہم وعند اللہ مکرہم وان کان مکرہم	سب کہنا مان لیں گے اور پیغمبروں کا اتباع
لتزول منہ الجبال ۝ فلا تحسبن اللہ مخلف وعدہ	کریں گے (جواب میں ارشاد ہوگا کہ کیا
رسلہ ط ان اللہ عزیز ذو انتقام ۝	ہم نے دنیا میں تم کو مہلت طویلہ نہ دی
یوم تبدل الارض غیر الارض	تھی) اور کیا تم نے (اس مہلت کے
والسمٰوات وبرزوا للہ الواحد	طول ہی کے سبب) اس کے قبل (دنیا
القہار ۝ وتری المجرمین یومئذٍ	میں) قسمیں نہ کھائی تھیں کہ تم کو کہیں جانا
مقرنین فی الاصفاد ۝ سرابیلہم	ہی نہیں ہے۔ حالانکہ تم ان لوگوں کے
من قطرانٍ وتغشیٰ وجوہہم النار ۝	رہنے کی جگہوں میں رہتے تھے جنھوں نے
لیجزی اللہ کل نفس ما کسبت ط	اپنی ذات کا نقصان کیا تھا اور تم کو
ان اللہ سریع الحساب ۝ ھذا	یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ہم نے ان کے
بلٰغ للناس ولینذروا ولیعلموا	ساتھ کیونکر معاملہ کیا تھا۔ اور ہم نے تم
انما ھو الٰہ واحد ولیذکر	سے مثالیں بیان کیں اور ان لوگوں نے
اولوا الالباب ۝	اپنی سی بہت بڑی بڑی تدبیریں کی تھیں
(سورۂ ابراہیم)	اور ان کی تدبیریں اللہ کے سامنے تھیں

اور واقعی ان کی تدبیریں ایسی تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی ٹل جاویں بس اللہ تعالیٰ کو اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرنے والا نہ سمجھنا۔ بیشک اللہ تعالیٰ بڑا زبردست پورا بدلہ لینے والا ہے ....

..... جس روز دوسری زمین بدل دی جاوے گی اس زمین کے علاوہ اور آسمان بھی

اور سب کے سب ایک زبردست اللہ کے روبرو پیش ہوں گے۔ اور تو مجرموں کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھے گا۔ ان کے کرتے قطران (تارکول) کے ہوں گے اور آگ ان کے چہروں پر لپٹی ہوئی ہوگی تاکہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کے کیے کی سزا دے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بڑی جلد حساب لینے والا ہے۔ یہ لوگوں کے لیے احکام کا پہونچانا ہے اور تاکہ اس کے ذریعے ڈرائے جاویں اور تاکہ اس بات کا یقین کرلیں کہ وہی ایک معبود برحق ہے اور تاکہ دانشمند لوگ نصیحت حاصل کریں۔ (بیان القرآن)

ایک اور مقام پر مخالفت اور معصیت سے ترہیب کے لیے پچھلی امتوں کے واقعات کا کیا ذکر فرماتے ہیں۔ ارشاد فرماتے ہیں:۔

وقضینا الی بنی اسرائیل فی	اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں یہ
الکتٰب لتفسدن فی الارض مرتین	بات بتلادی تھی کہ تم سرزمین میں دوبار
ولتعلن علواً کبیراً ہ فاذا جاء	خرابی کروگے اور بڑا زور چلانے لگوگے
وعد اولاھما بعثنا علیکم عباداً	پھر جب ان دو باروں سے پہلی بار کی
لنا اولی بأس شدید فجاسوا خلٰل	میعاد آوے گی تو ہم تم پر اپنے ایسے بندوں
الدیار ط وکان وعداً مفعولاً ہ	کو مسلط کریں گے جو بڑے جنگجو ہوں گے پھر
ثم رددنا لکم الکرۃ علیھم وامدد	وہ گھروں میں گھس پڑیں گے اور یہ ایک
نٰکم باموال وبنین وجعلنٰکم اکثر	وعدہ ہے جو ضرور ہو کر رہے گا۔ پھر (جب
نفیراً ہ ان احسنتم احسنتم لانفسکم	تم نادم و تائب ہوگے تو پھر) ان پر
وان اسأتم فلھا ط فاذا جاء	تمہارا غلبہ کردیں گے۔ اور مال اور
وعد الاٰخرۃ لیسوء وا وجوھکم و	بیٹوں سے ہم تمہاری امداد کریں گے
لیدخلوا المسجد کما دخلوہ اول	اور ہم تمہاری جماعت بڑھادیں گے۔
مرۃ ولیتبروا ما علوا تتبیراً ہ عسٰی	اگر اچھے کام کرتے رہوگے تو اپنے نفع
ربکم ان یرحمکم وان عدتم عدنا	کے لیے اچھے کام کروگے اور اگر تم برے
وجعلنا جہنم للکٰفرین حصیراً ہ	کام کروگے تو بھی اپنے ہی لیے۔ پھر جب

(سورہ بنی اسرائیل) پچھلی بار کی میعاد آوے گی تو ہم پھر دوسروں کو مسلط کریں گے تاکہ تمھارے منھ بگاڑ دیں اور جس طرح وہ لوگ مسجد میں گھسے تھے یہ لوگ بھی اس میں گھس پڑیں اور جس جس پر ان کا زور چلے سب کو برباد کر ڈالیں۔ (اس کتاب میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر اس بعثت ثانی کے بعد جب دورہ شریعت محمدیہ کا ہو تم مخالفت و معصیت سے باز آ کر شریعت محمدیہ کا اتباع کر لو تو) عجب نہیں کہ تمھارا رب تم پر رحم فرما دے اور اگر تم پھر وہی کروگے تو ہم بھی پھر وہی کریں گے۔ اور ہم نے جہنم کو کافروں کا جیل خانہ بنا رکھا ہے۔ (بیان القرآن) (باقی آئندہ)

دین میں حکمتِ عملی کا مقام

عتیق الرحمٰن سنبھلی

چوتھی (اور آخری) قسط

یہ ہیں مولانا کی پیش کردہ باقی مثالیں! اور آپنے دیکھ لیا کہ ان کا حال بھی "الائمۃ من قریش" سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ کہیں سکر سے استثنا، اور لچک کا قصہ ہی نہیں، کہیں ہے تو "قربانی" کے معنیٰ ہی نہیں۔ اور جہاں کہیں اس معنیٰ میں ہے وہاں یا تو حکمتِ عملی کے طور پر نہیں، اور حکمتِ عملی کے طور پر ہے، تو مقاصدِ دینیہ کے لئے نہیں!

درحقیقت مولانا نے جس " اصولی ضابطہ" پر شاہد بنا کر ان مثالوں کو پیش کیا ہو، وہ ضابطہ اپنی جگہ ٹھیک اور مسلّم ہے۔ مگر اُس کا انطباق اُس عملی موقف پر کرنا جس پر ہم نے اعتراض کیا تھا۔ اور یہ کہنا کہ اس موقف کی بنیاد یہی ضابطہ تھا، ایسا اجتہاد ہے جس کی صحت پہ کوئی دلیل نہیں لائی جاسکتی! اور اس اجتہادی بے راہ روی کی بنیاد (جیسا کہ ہم گذشتہ قسط میں بھی اشارہ کر چکے ہیں) یہ ہے کہ مولانا ان مثالوں میں " قدروں کے فرقِ مراتب" کا رمز پاکر اس اصول پر گامزن ہوگئے کہ ہر کمتر قدر کو ہر بالاتر قدر کی خاطر قربان کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بس توحید و رسالت جیسے اساساتِ دین تو مستثنیٰ ہیں، کیونکہ اُن سے بالاتر کوئی قدر نہیں۔ باقی دین کے ہر اصول کو نسبتاً کسی زیادہ اہم دینی مقصد (اقامتِ دین وغیرہ) کی خاطر توڑا جا سکتا ہے — حالانکہ دین ہی کی اقامت و اشاعت کے لئے دین کے اصولوں میں استثنار کا جواز تو صاف طور سے یہ مطلب رکھتا ہے کہ دین آپ ہی اپنی نفی کرتا ہے۔ اور یہ کم از کم ایک آلٰہی دین کی شان تو نہیں ہو سکتی۔

مولانا فرماتے ہیں :-

"عملی زندگی میں خیر و شر کی کشمکش کے درمیان انسان کو بہت سے مواقع ایسے حالات سے بھی سابقہ پیش آجاتا ہے، جن میں ایک چھوٹی بھلائی پر اصرار کرنے سے ایک بڑی بھلائی کا نقصان ہوتا ہے۔ یا ایک چھوٹی برائی ترک کرنے سے ایک بڑی برائی لازم آتی ہے۔ ایسے مواقع پر عقل بھی یہ چاہتی ہے کہ ایک کم قیمت چیز پر زیادہ قیمتی چیز کو قربان نہ کیا جائے، اور شریعت آلٰہیہ میں جو حکمت معتبر ہے اس کا تقاضا بھی یہ ہے کہ بڑی برائی سے بچنے کے لیے چھوٹی برائی کو گوارا کیا جائے اور چھوٹی بھلائی کی خاطر بڑی بھلائی کو نقصان نہ پہنچنے دیا جائے"

(ترجمان مئی ۱۹۵۸ء ص۱۱)

یہ درست ہے، لیکن، اگر آپ "بڑی بھلائیوں" میں اقامت دین جیسی "بھلائی" کو بھی شامل کرتے ہیں؟ تو یہ غلط اور بالکل غلط ہے! ہدم دین کرتے ہوئے اقامتِ دین کا خواب، یوں بھی ایک "دیوانے کا خواب" ہے۔ اور اللہ اس سے بے نیاز بھی ہے کہ اُس کے نام کا جھنڈا بلند کرنے کے لئے اُس کے قائم کردہ اصول پسِ پشت ڈالے جائیں۔ اس طریقِ کار کے نتیجے میں اس جماعت کا اقتدار تو قائم ہوسکتا ہے جو دین کا نام لے کر برسرپیکار رہو، لیکن دین بھی اپنے صحیح معنیٰ میں قائم ہوجائے، یہ نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہوسکتا ہے! ——— یہ اصول جس کو مولانا اقامتِ دین کی "بھلائی" تک وسیع کررہے ہیں، اس کا اطلاق درحقیقت صرف اِن حدود میں ہوتا ہے کہ کسی حکمِ دین پر کاربند رہنے کی صورت میں کوئی اہم شخصی یا جماعتی (نہ کہ دین کی) مصلحت فوت ہورہی ہو۔ یا اسی قسم کے کسی متعین مفسدے کے رونما ہونے کا اندیشہ ہو۔ جیسا کہ ہماری گذشتہ بحث کی روشنی میں مولانا ہی کی پیش کردہ مثالیں اس پر شاہد ہیں۔ رہی کشمکشِ خیر و شر کے دوران میں یہ صورت حال کہ یا فلاں برائی کو اختیار کرو، یا دین کی ترقی میں سست رفتاری اور تعویق کو گوارا کرو؟ تو بالکل طے ہے کہ برائی کو اختیار نہیں کیا جائے گا، خواہ دین کے غلبہ میں کتنی ہی دیر لگ جائے ——— یہی دین حق کی اسپرٹ ہے، اور یہی ہدایتِ ربّانی ہے!

معبودِ برحق کا دین اپنی اقامت کے لئے ایسی حکمتِ عملی کو دور سے سلام کرتا ہے جو اُس کے اصولوں کی قربانی مانگتی ہو، کیونکہ انھیں اصولوں کا نام تو دین ہے! سیاسی میدان میں، دین کے

نام لیوا کسی جتھے کی کامیابی ہرگز اقامتِ دین کو متضمن نہیں ہے، یہ کامیابی، اقامتِ دین کے لیے صرف وسیع تر مواقع بہم پہنچاتی ہے۔ اور ان مواقع سے صحیح معنیٰ میں اقامتِ دین کی شکل اُسی وقت بن سکتی ہے، جبکہ اِن مواقع سے پہلے دین کے اصول و احکام پر کاربند رہنے کی جتنی کچھ آزادی میسر تھی، دین کا نام لیوا جتھا اس دائرہ کے اندر پوری طرح ان اصول و احکام پر کاربند رہا ہو اور اپنی حامی پبلک کو اس دائرہ کے اندر دینی احکام پر پابندی کا خوگر بناتا رہا ہو۔ لیکن اگر وہ اپنے اختیار سے بھی دین کے اصول توڑتا رہا ہے اور اپنی کامیابی کے لیے اپنی حامی پبلک سے بھی اس حکمتِ عملی میں کوئی پارٹ ادا کراتا رہا ہے۔ تو پھر نہایت رنج و ملال کے ساتھ اس کا یقین کر لینا چاہیئے کہ اس جتھے کا سیاسی اقتدار کبھی دین کی صحیح اقامت کا اور کسی ملک میں اُس دینی انقلاب کا ذریعہ نہیں بن سکتا جس کے لئے اسلامی فکر و نظر صدیوں سے بیچین ہے۔

(۲)

حکمتِ عملی کے اس نظریہ کی تردید اُسوۂ نبوی اور اُسوۂ صحابہ سے

ہم نے اپنی بحث کی ابتداء میں، مولانا کے اس نظریہ سے اختلاف کی تین بنیادیں ظاہر کی تھیں ایک یہ کہ مولانا کے دلائل، دعوے سے غیر متعلق ہیں۔ دوم یہ کہ اسوۂ نبوی اور اسوۂ صحابہ سے اس نظریہ کی تردید ہوتی ہے۔ سوم یہ کہ اس سے فتنہ اور تلاعب بالدّین کا ایک خطرناک دروازہ کھلتا ہے! ——— ابتک کی ہماری ساری گفتگو پہلی بنیاد سے متعلق تھی۔ اب ہمیں باقی دونوں بنیادوں کی کچھ توضیح کرنا ہے۔ اوپر کی ترتیب کے مطابق پہلے نمبر ۲ کو لیجئے!

ہم کہتے ہیں کہ مولانا اپنی دینی تحریک کی کامیابی کے لیے جن حدود میں "حکمتِ عملی" کے جواز پر مُصر ہیں، ان حدود میں حکمتِ عملی کا جواز، نہ صرف یہ کہ کسی حجّتِ شرعیہ سے ثابت نہیں، بلکہ اسوۂ نبوی اور آثارِ صحابہؓ سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم یہاں صرف تین مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

ا۔ ہم نے اپنے اس دعوے میں " اسوۂ نبوی" کا لفظ بولا ہے۔ جس سے بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہوں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو طرزِ عمل حدیث و سیر میں ملتا ہے ہمارے پیشِ نظر اسی

میں سے کوئی مثال ہے۔ لیکن ہم نے یہ لفظ درحقیقت ذرا وسیع معنیٰ میں استعمال کیا ہے۔ اور ہمارے پیش نظر آنحضرت کا وہ اُسوہ ہے جس کی ہدایت اللہ رب العالمین نے، آپ کو، قرآن مجید میں کی ہے۔

سورۂ انعام میں فرمایا گیا ہے:۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ	اور مت دور کر (اپنے پاس سے) اُن
رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ	لوگوں کو جو پکارتے ہیں اپنے رب کو
يُرِيدُونَ وَجْهَهُ (۵۲)	صبح اور شام، چاہتے ہیں اسی کی رضا۔

مفسر خازن اس آیت کی شانِ نزول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

وروی عن سعد بن ابی	اور سعد بن ابی وقاص رضی سے روایت ہے
وقاص قال کنّا مع رسول اللہ	کہ ہم چھ آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
صلی اللہ علیہ وسلم	کے ساتھ تھے کہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ
ستة نفر فقال المشرکون	علیہ وسلم سے کہا "ان لوگوں کو ہٹا دیجئے
للنبی صلی اللہ علیہ وسلم	کہ یہ ہم پر جری نہ ہو جائیں، اس کے بعد
اطرد ھؤلاء لا یجترؤن	سعد رضی اپنے ساتھیوں کے نام گناتے
علینا قال .... فوقع	ہیں اور کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ
فی نفس رسول اللہ صلی اللہ	علیہ وسلم کے دل میں وہ بات آئی جو
علیہ وسلم ماشاء اللہ	اللہ نے چاہی اور آپ اس کی طرف
ان یقع فحدّث نفسہ	راغب ہونے لگے تو اللہ عزوجل نے
فانزل اللہ عزوجل	یہ آیت نازل فرمائی یہ روایت مسلم
ولا تطرد الذین الآیة	کی ہے ـــــــ ......
اخرجہ مسلم ـــــــ	....
وقال الکلبی قالوا لہ	اور کلبی کا قول ہے کہ سرداران
(یعنی اشراف قریش) اجعل لنا	قریش نے رسول اللہ صلی اللہ
یوماً ولھم یوماً	علیہ وسلم سے کہا کہ ایسا کیجئے کہ

قال لا افعل قالوا فاجعل المجلس واحد أو ا قبل الينا و ول ظهرك اليهم فانزل الله هذه الآیه۔ (تفسیر خازن ج ۲ (مع معالم التنزیل) (ص ۱۳۰)	ایک دن ہمارے لئے خاص کر دیجئے اور ایک دن ان لوگوں کے لیے۔ آپنے فرمایا، نہیں! اس پر انھوں نے کہا اچھا تو ایسا کیجئے کہ جب ہم آئیں تو رخ ہماری طرف کیجئے اور پشت انکی طرف کیجئے۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

سرداران قریش، کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر کان دھرنا کتنی بڑی مصلحت تھی، اس کے بعد ہی اُن کے ایمان کی توقع کی جا سکتی تھی، اور اُن کا ایمان لانا گویا سارے عرب کے مشرف بہ اسلام ہونے کی کنجی تھی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ازحد فکر تھی کہ کسی طرح سرداران قریش کے دل میں اسلام اتر جائے۔ اور اُن کی طرف سے بات سننے کی شرط صرف یہ تھی کہ "ہماری سطح سے کمتر" قسم کے لوگ ہماری مجلس میں شریک نہ ہوا کریں یا کم از کم مجلس میں ہمیں کچھ امتیاز حاصل رہے ــــــ کتنی معمولی سی بات تھی، ایمان کا ذائقہ چکھ لیتے تو خود ہی اس خناس کو بھول جاتے! مگر اس عظیم مصلحت کے باوجود جو سرداران قریش کے اسلام سے وابستہ تھی، اللہ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ ان کا یہ مطالبہ ٹھکرا دو۔

بلکہ ان روایات کے اس جزو کی روشنی میں کہ "اللہ نے آنحضرت کے دل میں اس مطالبہ کو قبول کرنے کا رجحان ڈالا اور پھر اُس پر عمل پیرا ہونے سے روکا" ہم یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اس طریقہ سے یہ بات صاف کر دینا منظور تھی کہ دین کی مصلحت کے لئے کسی ایسی بات کی بھی گنجائش نہیں ہے جو محض دینی روح، اور اس کے عام مزاج سے کچھ مختلف ہو ــــــ چہ جائیکہ دین کے متعین اصول و احکام! ــــــ وہی اللہ جو ایک جان بچانے کے لئے اپنی محرمات کو حلال کر دیتا ہے آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ اس بات کا روادار نہیں ہے کہ دین جلدی سے پھیل جانے اور آسانی سے غالب ہو جانے کے لئے چند دن کے واسطے بھی اسلامی اسپرٹ کے بلند مقام سے ذرا سا نیچے اتر آنے کی اجازت دیدے۔

حد ہو گئی۔ اللہ کی شانِ بے نیازی تو اپنے دین کے بارے میں اس انتہا پر پہنچی ہوئی ہو، کہ اُسے

اسلام کی اشاعت و تقویت کی مصلحت کی خاطر یہ بھی گوارا نہیں کہ اُس کا رسول کسی مومن کی ناوقت آمد اور "دخل در معقولات" پر اُس سے بے اعتنائی کا رویہ اختیار کرے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ مشرکین کے کسی بڑے اہم فرد یا وفد سے مصروف گفتگو تھے کہ ایک نابینا صحابی وارد ہوئے اور اپنی طرف متوجہ کرنے لگے۔ آنحضرت اپنے مزاج کے اعتبار سے تو اس سے کوسوں دور تھے کہ اپنے کسی صحابی کی ادنیٰ دلشکنی بھی روا رکھیں مگر اسلام کی مصلحت کے خیال سے آپ کو ان کی یہ ناوقت مداخلت کچھ گراں ہوئی اور آپ نے انکی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ اس پر پروردگار نے اپنے رسول کو کس انداز میں ٹوکا؟ فرمایا:

عَبَسَ وَتَوَلّٰی۔ اَنْ جَاءَهُ الْاَعْمٰی۔ — چہرہ پر ناگواری آئی اور روگردانی کی، اس بات پر کہ ایک نابینا (ناوقت) آگیا۔

حالانکہ اس وقت اللہ کو اپنے رسول کی گرانی طبع کا اتنا خیال تھا کہ سورۂ احزاب میں مسلمانوں کو صاف صاف تنبیہات کی ہیں کہ وہ آپ کے آرام کے اوقات میں خلل انداز نہ ہوا کریں، آپکے یہاں دعوت ہوا کرے تو فارغ ہوتے ہی اٹھ کر آجایا کریں۔ وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ خلافتِ صدیقیؓ کے آغاز ہی میں مانعین زکوٰۃ کا فتنہ رونما ہوا۔ یہ ایسا نازک اور پر آشوب وقت تھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی خبر پھیلتے ہی قبائل عرب میں جنگل کی آگ کی طرح ارتداد پھیل پڑا تھا۔ اسلام کا شیرازہ اس طرح منتشر ہو رہا تھا، جیسے موسم خزاں میں پت جھاڑ ہو رہا ہو۔ مدینے کے چاروں طرف آگ لگی ہوئی تھی، مسلمان دم بخود تھے کہ دیکھئے کب مدینہ پر چاروں طرف سے یلغار ہو جائے۔ ایسا وقت تھا، جب ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منع زکوٰۃ کی خبر پاکر، ان قبائل پر لشکر کشی کا عزم فرمایا، جنھوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مصلحت اور حالات کا تقاضہ کیا تھا؟ وہ تھا جو تمام اہل الرائے صحابہؓ یک زبان ہو کر حضرت صدیقؓ سے کہہ رہے تھے، کہ یہ وقت اس "برائی" کے خلاف لڑنے کا نہیں ہے۔ اس وقت اِس کو نظر انداز کر جائیے — اس وقت تو یہی بہت ہے کہ "اسلامی اسٹیٹ" کا مرکز (مدینہ) محفوظ رہ جائے۔ اس وقت ہم کسی اقدام کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ اور اگر ہم ایک "برائی" کو مٹانے کی خاطر ایسا کر بیٹھے تو خطرہ ۹۹ فی صدی خطرہ ہے کہ سرے سے اُس "اسٹیٹ" ہی کی جڑ کٹ جائے جس کی بقا پر نظام زکوٰۃ کی بقا کا انحصار ہے!

یہ تھی مصلحت اور مقتضائے حالات کی ترجمانی جس میں ہم نے صرف اتنا تصرف کیا ہے کہ مولانا ہی

کی مخصوص زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسکا جواب ابوبکر صدیقؓ نے کیا دیا؟ کیا حالات کی اس منطق کو غلط ٹھہرایا جس کی بنا پر آپکے ساتھی مانعین زکوٰۃ کو ڈھیل دینے کا مشورہ دے رہے تھے؟ کیا مصلحت کے اس تقاضے کو غلط اندیشی اور عدم تدبّر کا نتیجہ بتایا۔ جو آپکے اہلِ مشورہ آپکے سامنے رکھ رہے تھے؟ تاریخی بیانات بتاتے ہیں کہ اس پہلو سے آپ نے اس مشورہ پر کوئی گفتگو نہیں کی۔ آپ کا جواب ایک اور صرف ایک تھا کہ

اَیُنْقَصُ الدِّیْنُ وَاَنَا حَیٌّ ؟

(کیا یہ ہوسکتا ہے کہ میں زندہ رہوں اور دین میں قطع و برید ہو۔؟)

" کوئی نہیں جاتا ہے تو میں تنہا جاؤں گا اور ان سے اس وقت تک جہاد کروں گا جب تک وہ زکوٰۃ کے حق کی ایک رسّی بھی دینے سے انکار کریں گے "

اور آخر کار تمام صحابہ نے اسی صدیقی طرزِ فکر پر مہرِ تصویب ثبت کردی، کہ بے شک یہی موقف صحیح ہے۔

ہمارے نزدیک حضرت صدیقؓ کی تائید میں صحابۂ کرام کے متفقہ فیصلہ نے ہمیشہ کے لیے یہ فیصلہ کردیا ہے کہ دین کے کسی جزو کو "حکمتِ عملی" کے طور پر "مصلحت" کی قربانگاہ پر بھینٹ نہیں چڑھایا جاسکتا۔ دینی اسٹیٹ قائم کرنا تو الگ رہا۔ دینی اسٹیٹ کو باقی رکھنے کے لئے بھی ایسی حکمتِ عملی کی گنجائش نہیں ہو جس میں دین کے کسی اصول سے دستبردار ہونا پڑے۔

۲۔ غسّان، مسلّمہ طور پر، عرب عیسائیوں کا ایک نہایت طاقتور، کثیر التعداد اور جنگ آزما قبیلہ تھا، اس کا مسکن عین رومی سرحدوں کے قریب تھا، عہدِ فاروقی میں رومی اور اسلامی فوجیں فیصلہ کن لڑائیاں لڑ رہی تھیں، اسی کشمکش کے وقت میں تاجدارِ غسّان جبلہ بن ایہم اسلام لے آیا اور اس طرح ایک زبردست سرحدی طاقت اسلامی کیمپ میں آگئی۔ مگر ہونے والی بات۔ جبلہ حج کے لیے مکہ آیا، ایک دن طواف کعبہ کے دوران میں اسکی قیمتی شال، ایک غریب بدّو کے پاؤں کے نیچے آکر پھٹ گئی۔ نیا نیا اسلام لایا تھا، شاہانہ نخوت ابھی دماغ میں باقی تھی، یہی کیا کم تھا کہ عام آدمیوں کے شانہ بشانہ طواف کر رہا تھا، چادر والی بات وہ برداشت نہ کرسکا اور اس بدّو کے ایک چانٹا رسید کردیا۔ وہ فوراً حضرت عمرؓ کی خدمت میں پہنچا اور دادخواہ ہوا۔ جبلہ کو بلایا گیا۔ اس نے اقرار کیا کہ ہاں میں نے ایسا کیا ہے۔ قانونِ قصاص کی

متعلقہ دفعہ کا حکم صادر ہو گیا۔ جبلہ کی جاہلی رگ ایک بار پھر جوش میں آ گئی۔ اس نے کہا یہ کیسا "اندھا" قانون ہے کہ شاہ و گدا سب برابر؟ میں ایک قبیلہ (بلکہ ایک چھوٹی سی ریاست) کا تاجدار، اور یہ بدو بدلے میں میرے منہ پر طمانچہ مارے! کہا گیا اسلام کا قانون عدل یہی ہے۔ اُس نے کہا اچھا مجھے کل تک مہلت دیجئے، مہلت دیدی گئی، اور وہ رات ہی میں قیصر روم کے پاس بھاگ گیا۔

ایک "چھوٹی" سی "برائی" تھی ــــــ لیکن حضرت عمرؓ نے ایک عظیم تر مصلحت اور "بڑی بھلائی" کو بے دریغ قربان کر دیا اور ادنیٰ لچک کے روادار نہیں ہوئے ــــــ جبلہ کا رویہ اور اس کی جاہلی حمیت کا پارہ دیکھنے کے بعد کیا حضرت عمرؓ جیسے ضرب المثل صاحب فراست سے مخفی رہ سکتا تھا کہ اُن کے فیصلے کا ردِ عمل کیا ہو گا؟ حضرت عمرؓ تو کیا! ایک معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی جبلہ کے رویّہ کی روشنی میں اس کے ارتداد کی پیشین گوئی کر سکتا تھا، اور اُس کے ارتداد کا مطلب تھا۔ ایک زبردست قوت سے اسلام کا محروم ہو جانا، نہ صرف اسلام کا محروم ہو جانا بلکہ برسرِ پیکار دشمن کے کیمپ میں پہنچ جانا۔ کتنی بڑی "بھلائی" تھی جس کو نقصان پہنچ جانا یقینی تھا؟ اور کتنی بڑی "برائی" تھی جو ایک "چھوٹی" برائی سے بچنے میں لازم آ رہی تھی۔ مگر فاروقِ اعظم اپنی ساری مجتہدانہ شان کے باوجود دین میں اس حکمتِ عملی کا جواز نکالنے سے قاصر رہے، جس کو مولانا مودودی "عین حکمتِ دین" سے تعبیر فرما رہے ہیں۔

(۳)

فتنہ کا دروازہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب کے زیر بحث نظریے سے تعرض کرنے کا، ہمارے لئے اصل باعث، اِس نظریے کا یہی پہلو ہے کہ ہم اس کے اندر دین میں ایک عظیم فتنے کا دروازہ کھولنے اور تلاعب بالدین کی ایک وسیع شاہراہ قائم کرنے کی زبردست صلاحیت پاتے ہیں، لیکن اس اہمیت کے باوجود یہ عنوان زیادہ تفصیل کا محتاج نہیں ہے۔ کیونکہ ہم مولانا کی "توضیحات" کے جائزہ میں، ضمناً اس پہلو کی طرف کچھ اشارات کر چکے ہیں۔ اور اب انھیں کو بس ذرا کھولدینا وضاحتِ مدعا کے لیئے کافی ہو گا۔

ہم نے پاکستان کے آنے والے الکشن کی مثال دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر کوئی جماعت (جس کی پہلی مثال خود جماعت اسلامی ہے) پاکستان یا کسی بھی ملک میں اقامتِ دین کے مقصد سے ہمکنار ہونے کے لئے ناگزیر سمجھتی ہے کہ الکشن میں حصہ لے کر ملک کی مقننہ اور انتظامیہ پر قبضہ کیا جائے۔ اور تجربہ بتا رہا ہو کہ الکشن میں کامیابی بدعنوانیوں اور جعلسازیوں کے بغیر ناممکن ہے۔ خصوصاً جبکہ مقابلہ میں ایسی پارٹیاں ہوں جو یقیناً ہر طرح کی بدعنوانیاں کریں گی، تو اِس اصول کی روشنی میں کہ اساساتِ دین کو چھوڑ کر باقی سب دینی اصول واحکام کو اہم تر مقاصد دینیہ کی مصالح پر حسب ضرورت قربان کر دینا نہ صرف جائز بلکہ عین اقتضائے دین ہے، ضروری ہوجاتا ہے کہ صدق ودیانت جیسے دینی اصول واحکام جو الکشن کی بدعنوانیوں اور جعلسازیوں سے مانع ہوتے ہیں۔ کچھ وقت کے لئے بالائے طاق رکھ دیئے جائیں، کیونکہ اِن سے چمٹے رہنے پر اصرار کرنا "اقامت دین" جیسے "بیش قیمت" مقصد کو نقصان پہنچانے کا موجب ہوگا۔

بس اس ایک مثال کی روشنی میں آپ غور کر سکتے ہیں کہ حکمتِ عملی کا یہ نظریہ مُفسدوں، اور فتنہ پردازوں کے ہاتھ میں کیسا زبردست ہتھیار دیتا ہے کہ وہ جس چیز میں "اہم دینی مقصدیت" ثابت کر دیں، یا جو کم سواد مخلصین کسی چیز کو اہم دینی مقصد سمجھ لیں وہ، اُس (مقصد) کے نام پر پوری دینی زندگی کو تلپٹ کر کے رکھ دیں۔ اور اس نظریہ کی صحت تسلیم کر لینے کے بعد کسی کے بھی اِن "پُرحکمت" اقدامات اور مشوروں پر کوئی نکیر نہیں کی جا سکتی۔ گفتگو جو کچھ کی جا سکتی ہے وہ بس کسی شے کی "اہم مقصدیت" میں کی جا سکتی ہے۔ اگر اس شے کو مقصدی اہمیت حاصل ہے تو پھر کرنے دیجئے جو کچھ بھی کوئی اس مقصد کی مصلحت سمجھ کر کرتا ہے، اور مشورہ دینے دیجئے جو کچھ بھی مشورہ اس اہم مقصد کے حصول کی خاطر کوئی ملّت کو دیتا ہے ـــــ اور اگر وہ اتفاق سے برسرِ اقتدار بھی ہے، تب تو نہ پوچھئے اس "مقصدی اہمیت" کے نظریہ کی تباہ کاریاں! بس قدم قدم پر یہ نقشہ ہوگا کہ ع

جو گنہ کیجئے ثواب ہے آج

کیونکہ بقول شخصے "اگر ایک آدمی کی عقل زرخیز ہے" تو وہ ہر قسم کے طرزِ عمل کے لئے "مقصدی اہمیت" اور "عملی حکمت" کا عذر سامنے لا سکتا ہے۔ اور اس طرح باطنیت کا وہ

فلسفہ ایک نئے رنگ میں از سر نو زندگی پا سکتا ہے جسے اسلاف کی بڑی قیمتی کوششوں نے ختم کیا تھا، اور اس کے مٹے ہوئے نشانات آج بھی کہیں کہیں پتہ دے جاتے ہیں کہ اگر اس پر شروع ہی میں بھرپور وار نہ کیا گیا ہوتا، تو دین کا وہ حلیہ ہوتا اور صحیح دینی زندگی کا نقشہ اس طرح ناپید ہوتا کہ بس اللہ ہی تھا جو اصل حقیقت منکشف فرماتا اور امتِ محمدیہ کو اس سرتاپا گمرہی سے نجات دیتا۔

ہمیں تسلیم کہ مولانا مودودی اس لغویت میں مبتلا ہونے والے نہیں ہیں ——— اگرچہ بعض رازدانوں کی طرف سے ادھر علی الاعلان کچھ ایسے انکشافات ہو رہے ہیں جو اس بارے میں شبہ کی کافی گنجائش پیدا کرتے ہیں ——— تاہم تسلیم کہ مولانا اپنی حد تک، صرف انھیں حدود میں اس نظریہ کو برتنے کے قائل ہوں گے جو اب تک کے اُن کے عملی فیصلوں سے سامنے آئے ہیں۔ مثلاً الکشن میں امیدواری سسٹم کا مسئلہ، کہ مولانا نے اقامتِ دین کے عملی راستہ کی ایک ناگزیر برائی سمجھ کر اس کو انگیز کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یا پارلیمنٹ کی ہیئت ترکیبی، اس کے حدود اختیارات اور ارکان پارلیمنٹ کے اوصاف و شرائط کا مسئلہ کہ پاکستان کے اندر، موجودہ صورت میں یہ سب چیزیں بڑی حد تک کتاب و سنت کے منشا کے خلاف ہیں، مگر مولانا اس صورت حال کو بدلنے کے لیے چونکہ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں پاتے کہ پارلیمنٹ کی کرسیوں پر قبضہ کیا جائے (اور کچھ عرصے اگر (اقلیت میں رہنے کی وجہ سے) موجودہ صورتوں کے ساتھ بھی پارلیمنٹ کی کارروائی میں حصہ لینا پڑے تو لیا جائے ——— تسلیم کہ مولانا اپنی حد تک صرف ایسے ہی امور میں اس نظریہ کو برتنے کے قائل ہوں گے ——— اور ہم بلاپس و پیش کہتے ہیں کہ اس قسم کی چیزوں میں ہم کوئی مضائقہ نہیں پاتے[۱] ——— لیکن سوال یہ نہیں ہے کہ مولانا کن حدود تک جائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ مولانا جس اصول سے اپنے موقف کا جواز ثابت فرما رہے ہیں اس کا اطلاق کن حدود تک ہو سکتا ہے۔ اور اس

---

[۱] کیونکہ ہمارے نزدیک ان چیزوں کی وہ حیثیت ہے ہی نہیں جو مولانا نے سمجھ اور سمجھا رکھی ہے اور اسی کی وجہ سے مولانا کو اس فلسفہ طرازی کی ضرورت پیش آئی ہے۔

اصول کو ماننے والے کس حد تک جا سکتے ہیں؟ یا مفسدین اس سے بجا طور پر فائدہ اٹھا کر دین کی کیا گت بنا سکتے ہیں؟

مولانا، اس سخت گمراہ کن اصول کو اپنانے کے باوجود، عملاً کسی غلط روی کا شکار نہیں ہوں گے ــــــ بڑی اچھی بات ہے۔ ہماری بھی خدا سے یہی دعا ہے۔ مگر کیا اس میں شبہ ہو سکتا ہے؟ کہ مولانا نے اس اصول کی مزید وضاحت کرتے ہوئے، اس کو مؤید کرنے کے لئے قرآن وحدیث اور آثار صحابہ وتصریحات فقہاء ومحدثین سے جو مثالیں دے ڈالی ہیں اُن کو جو شخص اسی اصول پر مبنی سمجھے گا وہ کامل شرح صدر کے ساتھ اس بات کا قائل ہو گا کہ مقصد اگر دینی ہے تو ــــــ اور پھر وہ نظام دین میں جتنی بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہو اسی حساب سے ــــــ اس کے حصول کے لئے ضرورت ہو تو جھوٹ اور فریب بھی جائز ہے، حدود اللہ کا معطل کرنا بھی جائز ہے' اور نماز کا عدم اہتمام بھی جائز، بلکہ عین حکمتِ دین کا تقاضا ہے؟ ــــــ اگر اس میں کسی کو شبہ ہو سکتا ہے تو ہم بھی سمجھنا چاہتے ہیں کہ شبہ کی کیا معقول بنیاد ہے؟ اور اگر نہیں ہو سکتا، اور یقیناً نہیں ہو سکتا، تو پھر دین کے لئے اس طرزِ فکر سے بڑھ کر کیا فتنہ ہو سکتا ہے؟ اور کیسے اس بے پناہ فتنہ سامانی کو خموشی کے ساتھ برداشت کیا جا سکتا ہے؟

اس اصول اور نظریہ کے حدودِ اطلاق کی یہ تو وہ چند مثالیں تھیں جو خود مولانا ہی کی دی ہوئی مثالوں سے گویا منصوص اور مصرّح ہو جاتی ہیں۔ باقی اس کے آگے قیاس کا وسیع دروازہ کھلا ہوا ہے۔ آدمی اسی پیمانہ سے "چھوٹی برائی" اور "بڑی بھلائی" کو تولتا جائے اور "چھوٹی نیکیوں" کو "بڑی نیکیوں" کی خاطر حکمت عملی کی قربان گاہ پر چڑھاتا چلا جائے اور خوش رہے کہ وہ بڑا ثواب کما رہا ہے! ــــــ چنانچہ بات محض اندیشہ اور گمان کی نہیں، مولانا کے متاثرین میں اس قیاس کی بسم اللہ بھی ہو لی۔ اور ایک صاحب نے اقامت دین اور اسلامی نظام کے غلبہ کے لئے ووٹوں کی خریداری کو کار ثواب سمجھنے کا مشورہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ پیش کر دیا ہے[1] ــــــ اللہ ری "اقامت دین"! جو ملک میں ضمیر فروشی پھیلا کر بھی عمل

---

[1] ہم اس عبرت پارے کو اسی اشاعت میں "دریچۂ عبرت" کے ایک نئے عنوان کے تحت درج کر رہے ہیں۔ اس سے مولانا مودودی کے بارے میں اس حسن ظن کو بھی کافی نقصان پہنچتا ہے جس کا ہم نے سطور بالا میں اظہار کیا ہو۔

میں آسکتی ہے ـــــــ مگر نہیں! حیرت کی کوئی بات نہیں، اور نہ اُن صاحب کو ملامت کرنے کا کوئی موقع ہے، کیونکہ یہ تو منطقی نتیجہ ہے اس اصول اور نظریہ کا جو انھوں نے مولانا کے اعتماد پر تسلیم کر لیا ہے۔ اُس اصول کے ساتھ یہ انداز فکر بالکل جوڑ کھاتا ہے، اور یہ ایسے ہی ایسے گل کھلائے گا، اور کوئی وہ شخص جو اس اصول کی صحت کو تسلیم کرتا ہو۔ ہرگز ان قیاس آرائیوں پر اعتراض کرنے میں حق بجانب نہیں ہو سکتا۔

بہرحال اس نظریہ کی یہی وہ فتنہ سامانی ہے جس کی بنا پر اللہ کا، اس کے دین کا، اور اس دین پر ایمان لانے والی امت کا ہم پر حق تھا کہ ہم اس پر کھل کر اور اپنی صلاحیت کے بقدر اس کے ایک ایک بال کی کھال نکال کر تنقید کریں۔ خواہ کسی کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ اور کوئی از راہِ ہمدردی اسے ہمارے وقت کا ضیاع ہی کیوں نہ سمجھ رہا ہو! ـــــــ بلکہ ہم تو اس پر حیران ہیں کہ وہ لوگ جو مولانا مودودی سے لوگوں کو قریب کرتے ہوئے اس بات کا اطمینان دلاتے رہے ہیں کہ اگر مولانا مودودی نے کبھی کوئی غلط نظریہ پیش کیا تو وہ اس کے بخیے اُدھیڑنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے، ان میں سے جو لوگ اچھی فہم و فکر کے مالک ہیں، وہ کیسے مولانا کے اس نظریے اور اس نظریے پر اصرار پہ خاموشی کو جائز سمجھے ہوئے ہیں؟ کیا ان کی ناقدانہ نظروں نے اِس نظریہ میں فتنے کے بے پناہ جراثیم کو محسوس نہیں کیا؟ یا ہم یہ بدگمانی کریں کہ اِس باب میں اُن کی بے لاگ نظر مولانا کے پاس و لحاظ میں طرح دے گئی ہے؟ اور یا پھر یہ سمجھ لیا جائے کہ "پاکستان کے "اسلامی محاذ" کو نقصان نہ پہنچنے پائے" کا نظریہ اُن پر بھی اس طرح سوار ہے کہ خواہ اس محاذ کے قائد سے دین کو کتنا ہی نقصان پہنچ جائے مگر اس وقت کچھ نہ بولو؟

ہم جاننا چاہتے ہیں کہ آخر ماجرا کیا ہے؟

حرفِ آخر مولانا کی دسمبر ۵۶ءِ والی تحریر جب ہمارے سامنے آئی تھی تو ہم نے "قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید" کے عنوان سے خالص تأثراتی انداز میں اس پر لکھا تھا، اور ہمارے تأثرات اپنی اصل شکل میں صفحۂ قرطاس پر آ گئے تھے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اُن تأثرات میں بڑی تلخی تھی، مگر قسم ہے خدا کی! کہ مولانا کو بدنام کرنے کی نیت سے

اس میں کوئی نمک مرچ نہیں ملایا گیا تھا۔ ہماری اس تحریر کا ایک ایک لفظ ہمارے واقعی تأثرات کا ترجمان تھا، اور بس! اُن تأثرات میں زیادتی ہوئی ہو یہ ممکن ہے۔ اور تلخی تو ہمیں بھی مسلّم ہو اس لئے اُس تحریر سے اگر کسی کی (اور سب سے پہلے خود مولانا کی) دلآزاری ہوئی تو میں اس کی معافی چاہتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ مولانا کی دسمبر ۵۶ء والے ترجمان کی تحریر، المنبر کی تحلیل سے ایک بم بن کر پھٹی اور دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ گئی۔ اور پھر ایک تلخ آہ تھی جو قلم کا سہارا لے کر کاغذ پر پھیل گئی، لیکن یہ تلخیٔ آہ کتنی ہی مخلصانہ ہو، اگر کسی کی دلآزاری کا باعث بنی ہے تو یقیناً لائق معذرت ہے۔ اور میں اس وقت یہی فرض ادا کر رہا ہوں۔

اس کے بعد مجھے مولانا سے یہ عرض کرنا ہے کہ آپ نے اپنے موقف پر علمی تنقید کی فرمائش کی تھی، میں نے اس طویل مضمون کے ذریعہ اس فرمائش کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ شروع سے آخر تک اپنے امکان بھر اس کا لحاظ رکھا ہے کہ کوئی بات علمی تنقید کے حدود سے متجاوز نہ ہو۔ اور میں اس اطمینان کے ساتھ یہ مضمون ختم کر رہا ہوں کہ میں اپنی (طرزِ گفتگو کے سلسلہ کی) اس کوشش میں کامیاب رہا ہوں ـــــ اور غالباً میرا یہ اطمینان غلط نہیں ہے لیکن اگر کوئی کلمہ علمی تنقید کے حدود سے متجاوز ہو ہی گیا ہو تو میں اس کے لئے عفو خواہ ہوں ـــــ اس لیے میں بجا طور پر یہ توقع رکھتا ہوں۔ (بلکہ اپنی طالبعلمانہ حیثیت کی بنا پر خواہش رکھتا ہوں) کہ مجھے اپنی اس طالبعلمانہ کاوش پر آپ کے قیمتی خیالات جاننے کا موقع ملے گا۔

اس سلسلہ میں گفتگو کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے، میرے نزدیک سب سے مقدم چیز یہ ہو کہ اس تنقید کی ابتدا میں مولانا کے موقف کے بارے میں جو تشقیق کی گئی ہے (کہ اگر مولانا کا موقف "یہ" ہے تو کوئی اعتراض نہیں، اور اگر یہ نہیں "یہ" ہے تو پھر قابل رد ہے) اُس کے کسی پہلو کو مولانا صراحت کے ساتھ متعین فرمائیں۔ پھر اگر وہ پہلو دوسرا ہو، تو مولانا واضح فرمائیں کہ وہ کونسا نکتہ ہو جو ہماری نظر سے اوجھل ہو رہا ہے، اور اس کے اوجھل ہونے کی وجہ سے یہ بات ہمیں قابلِ رد نظر آ رہی ہو۔ اور ان کے دلائل کی وہ کونسی گہرائی ہے جس پر مطلع نہ ہونے کی وجہ سے ہم ان دلائل کو غیر متعلق پا رہے ہیں۔ اور اگر پہلی صورت ہو، تو بحث تو ختم۔ لیکن ایک اُلجھن یہ رہ جاتی ہے کہ اس صورت میں تو حکمت عملی کا کوئی اعتبار باقی نہیں رہتا، سارا اعتبار حکمت دین کا رہتا ہو۔ اور مولانا دسمبر ۵۶ء کی تحریر کو بھی عین حق کہنے پر مصر ہیں، حالانکہ اس میں فیصلہ کی ساری باگ ڈور حکمتِ عملی کے ہاتھ میں دیدی گئی ہے، خواہ اس شرطِ مقدر کے ساتھ دی گئی ہو کہ قدروں کے فرقِ مراتب کا لحاظ رہے گا!

(ختم شد)

دجّالی فتنہ اور سورہ کہف

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی ذہانت و نکتہ رسی کا قابل دید نمونہ

جس میں مغربی تہذیب و تمدن اور ملحدانہ علوم و افکار کے فتنہ کا دجّالی فتنہ سے تعلق ظاہر کر کے دکھایا گیا ہے کہ قرآن مجید کی سورۂ کہف کو اس (موجودہ) فتنہ سے کتنا گہرا تعلق ہے اور اس فتنہ کی بنیاد پر کاری ضرب لگانے اور اس طوفانی عہد میں اپنے سفینۂ ایمان کو غرقابی سے بچانے کے لیے اس سورہ میں کیا کیا ہدایات و اشارات پنہاں ہیں

۱۱۲ صفحات ، الفرقان جیسا سائز ، سفید کاغذ ، قیمت ۱/۸

نقش حیات

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے سوانح حیات خود اپنے قلم سے

جلد اول ۔/۵ .... جلد دوم ۳/۸

مکتوبات شیخ الاسلام

حضرت مولانا مدنیؒ کے علمی، دینی، سیاسی خطوط کا گراں مایہ مجموعہ

جلد اول ۵/۸ .... جلد دوم ۔/۶

محمد بن عبدالوہاب ۲/۸

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ۲/۸

رحمت عالمؐ (مطبوعہ دار المصنفین) ۱/۱۲

تاریخ دعوت و عزیمت

اُمتِ اسلامیہ کے مصلحین و مجدّدین کا بصیرت افروز اور ایمان آفریں تذکرہ اور اُن کے کارناموں کی تفصیل، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے

جلد اول ساتویں صدی ہجری تک کے نامور مصلحین کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔ قیمت ۔/۶

جلد دوم حضرت امام ابن تیمیہ کی سیرت اور علمی و عملی کارناموں کی داستان ہے۔ قیمت ۶/۸

صحیفۂ ہمام بن منبہ ۳/۸

علم الحدیث (مولانا عبداللہ العمادی) ۱/۴

عہد نبوی کے میدان جنگ ۱/۸

بچوں کا دینی نصاب

از حکیم شرافت حسین صاحب

اچھا قاعدہ ۲/، اچھی باتیں اول ۴/، دوم ۵/، سوم ۶/، چہارم ۸/، پنجم ۸/، ششم ۱۲/، اللہ کے رسول ۶/، حضرت ابوبکرؓ ۶/، حضرت عمرؓ ۶/، حضرت عثمانؓ ۶/، حضرت علیؓ ۶/، اچھے قصے ۶/، حضرت خدیجہؓ ۸/، جعفر سوانح ۸/، آسان فقہ ۶/

کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

جادۂ حبیب

ایک دعوتی سفر کے تاثرات و کوائف

(از مولانا محمد اشرف خاں صاحب ایم اے، لیکچرر اسلامیہ کالج پشاور)

(۶)

[ذیل کی قسط یوم عاشورہ کے تاثرات پر مشتمل ہو اور اس میں واقعہ کربلا ٹھیک اسی رنگ میں دکھائی دیتا ہو جو اس کا نہایت پختہ رنگ بن چکا ہو۔ بعض خاص تاریخی اسباب کے نتیجہ میں واقعہ یہ ہو کہ جو شخص بھی اس ضمن کے تمام قابل لحاظ پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اس واقعہ کی کامل تحقیق کے مرحلہ سے نہ گزرے گا وہ معذور رہے، اگر اس واقعہ کو اسی عام رنگ میں دیکھے، مگر ارباب تحقیق جانتے ہیں کہ اصلیت یہ نہیں ہو جو شہرت پاگئی ہو۔ ہم اس پر کئی برس پہلے تفصیلی بحث کر چکے ہیں اور اپنی اس تحقیق کے نتیجہ میں ہم اس رنگ کو بہت غلط سمجھتے ہیں۔ جو واقعہ کربلا کو دیدیا گیا ہو۔ اور ذیل کی سطور میں بھی موجود ہو۔ مگر اس سخت اختلاف کے باوجود ہم ان تاثرات کو اس بنا پر شائع کر رہے ہیں کہ لکھنے والے کا اصل مقصد دین کے لیے قربانی کی تڑپ پیدا کرنا ہو اور بس، اور لاریب سیدنا حسینؓ اس تڑپ کے امین تھے اور یہی تڑپ انھیں میدان کربلا میں لے گئی۔ ——— (مرتب)]

۷ر اگست ۱۹۵۷ء مطابق ۱۰ر محرم الحرام ۱۳۷۷ھ

آج محرم کی دسویں تاریخ ہو اور ہمارا جہاز صبح ہی سے دریائے دجلہ میں داخل ہو چکا ہو۔ اسے کیا کہیے کہ قسمت نے 'عاشورہ' کے دن ہی دجلہ میں پہونچانا تھا، دل و دماغ میں خیالات کا حشر بپا ہے۔ آہ! اقبالؔ مرحوم!

قافلہ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہو تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

اگر اقبالؔ کا یہ شعر نہ ہوتا تو غالباً دل کی ہچکیاں آج کے دن دجلہ کو دیکھ کر شبیرؓ کی یاد میں اس طرح بے قرار نہ کر دیتیں۔

امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کو اقبالؔ نے "رموز بیخودی" میں بہت خوبصورتی اور حکمت سے پیش کیا ہو۔ "شبیری" اقبالؔ کے نزدیک ملت کے لیے ایک اسوہ ہے۔ اور امت

کی نجات کا عنوان ہے ع۔

زندہ حق از قوت شبیری است

اسی لیے وہ کہتا ہے۔ ع

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری

'رموز بیخودی' کے اشعار رگ و پے میں وجد کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ کس والہانہ انداز میں کہتا ہے۔

موسیٰؑ و فرعون و شبیرؓ و یزید	ایں دو قوت از حیات آید پدید
زندہ حق از قوت شبیری است	باطل آخر داغ حسرت میری است
چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت	حریت را زہر اندر کام ریخت
خاست آں سر جلوۂ خیر الامم	چوں سحاب قبلہ باراں در قدم
بر زمین کربلا بارید رفت	لالہ در ویرانہ ہا کارید رفت
تا قیامت قطع استبداد کرد	موج خون او چمن ایجاد کرد
بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است	پس بنائے لا الہ گردیدہ است
مدعایش سلطنت بودے اگر	خود نکردے با چنیں ساماں سفر

"یوم عاشورہ" کی حرمت تو ابتدائے آفرینش سے چلی آتی ہو۔ چنانچہ اس کے مختلف فضائل کتابوں میں آئے ہوئے ہیں، یہود میں دسویں محرم کا روزہ فرض تھا کہ اس دن حضرت موسیٰؑ کو تورات ملی تھی، ابتدائے اسلام میں ہمارے ہاں بھی روزہ فرض تھا، لیکن صیام رمضان کی فرضیت کے بعد مستحب رہ گیا۔ جیسا بخاری وغیرہ میں ہے۔

یوم عاشورہ کی حرمت شہادت حسینؓ سے نہیں، بلکہ حسینؓ کی شہادت کے لیے اس مبارک اور محترم دن کو چنا گیا۔ ذلك فضل الله یوتیه من یشاء بہرحال آج اُمت کا ایک کثیر طبقہ اس دن کی اہمیت کو اس بنا پر سمجھتا ہو کہ ریگ زار کربلا میں جگر گوشۂ بتولؓ اور سبط پیمبر نے قربانی تسلیم و رضا اور تفویض تامہ کا وہ منظر پیش کیا، جو "پور ابراہیم" کی سنت اور قوموں کی حیات اور مقاصد عالیہ کی بقا کے لیے قیامت تک نمونہ ہے۔

سرّ ابراہیمؑ و اسمٰعیل بود یعنی آں اجمال را تفصیل بود

کربلا کا سانحہ ایک اتفاقی حادثہ نہ تھا، بلکہ استقامت کے اس اعلیٰ مقام کا ایک نمونہ تھا، جس مقام سے صدیق اکبر رضؓ نے پکارا تھا، أینقص الدین وانا حیّ۔

مومن کی حیات اوامرِ الٰہیہ کے فروغ کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ جب احکام الٰہی میں نقص آنے لگتا ہو۔ تو اس کا جذبۂ ایمانی بے قرار ہو جاتا ہو۔ اور چاہتا ہو، کہ یا نقش حق کو ثبت کر کے رہوں گا یا جان اسی راہ میں دے دوں گا۔ فدائیت کا یہ مقام جن خوش نصیبوں کو حاصل ہو جاتا ہو وہی اقوام و ملل کی بقاء حیات کا عادی سبب بن جاتے ہیں اور ان کی قربانیوں کو حق جل شانہٗ آلہ کے طور پر قبول فرما کر اپنی مراد، فروغ حق یا اتمام حجت پوری کر دیتا ہے۔

شہادتِ حسینؓ تسلیم و رضا، صبر و استقامت، صدیقیت و فدائیت، قربانی و جرأت کا وہ بے مثل نمونہ ہو جس کی مثال بعد میں بہت کم ملتی ہو، حق کو مٹتا دیکھ کر خود نہ مٹنا، اپنی سی کوشش نہ کرنا اور اگر ضرورت پڑے تو جان پیش نہ کرنا، اہل عزیمت کے نزدیک کمال ایمان کے منافی ہو۔ حضرت امام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی شہادت سے یہ چیز نمایاں کر کے پیش کر دی۔ کہ اہل حق کے لیے منکرات کو ابھرتا دیکھ کر قعود و سکوت مناسب نہیں، اگر کچھ نہ بن پڑے۔ تو اپنے پاس تو جان ہی ہو وہی محبوب کی راہ میں قربان کر کے کامیابی حاصل کی جا سکتی ہو۔ حق کا فروغ اور بچاؤ اللہ تعالیٰ کا کام ہو۔ ہمارے ذمہ تو بس اتنا ہو کہ اپنی قربانی پیش کر دیں، جتنی عظیم اور اخلاص والی قربانی ہوگی۔ اسی قدر اس کے نتائج اللہ تعالیٰ و تبارک بہتر مرتب فرمائیں گے۔ اپنا کام ہو اس کے حکم کے مطابق جان لگا دینا اس پر نتائج مرتب کرنا جس کا کام ہو وہ خود مرتب کرے گا۔

شہادت ہو مطلوب و مقصود مومن نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ ترکت فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی۔ (الحدیث)، ذہن میں آتا ہو کہ اس حدیث شریف میں عترتی سے تمسک کا ایک مفہوم ان کی دینی قربانیوں کا اتباع بھی ہو سکتا ہے کہ عترت نبوت نے جو دین کے لیے قربانیاں دیں اور نقش حق کے باقی رکھنے اور کتاب اللہ کے اوامر کی بقاء و فروغ کے لیے جس طرح اپنی جانوں کو پیش

کیا وہ کتاب عزیمت و ثبوت اور تفویض و تسلیم کا ایک سنہرا باب ہے۔

شہدائے کربلا ہوں یا زید شہید (نفس زکیہ) یا پچھلی صدی میں شہداء بالا کوٹ کے امیر شہیدؒ جس طرح حق کی سربلندی کے لیے ان حضرات نے اپنی جانوں کو پیش کیا وہ ہر اُمت کے لیے ایک بہترین اسوہ ہو سکتا ہے، شہدائے موصوفین کی شہادتوں میں تو مجھے تفویض و تسلیم کی وہ جھلک نظر آتی ہے جو 'ذبح عظیم' — اسمٰعیلؑ قربانی کا خاصہ ہے، امر الٰہی کے لیے جان پیش کر دو' اپنی جان نے دو۔ یہ سوال نہیں کہ کیا ہوگا، دیکھنا یہ ہے کہ امر الٰہی کی بقا کے لیے حکم خداوندی کے مطابق ہم نے کیا کیا۔

بات یہ ہے کہ اکثر قربانی کی ظاہری کامیابی کو دیکھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اصل کامیابی یہ ہے کہ جان اس کے لیے دی جا رہی ہو اور اسی کی رضا کے لیے امتثال امر کے طور پر اسکے دین کا فروغ مقصود ہو، یہ اتنا اونچا مقصد ہے کہ خود صاحب نبوت سید الرسل روحی فداہ، صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام کی تمنا کی۔ لَوَدِدْتُ اَنْ اُقْتَلَ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیٰ ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰ ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰ ثُمَّ اُقْتَلُ۔ (بخاری وغیرہ)

اسی بارگاہ کے ایک تربیت یافتہ نے اپنے ان پیارے نغموں سے دار و رسن کو زینت بخشی تھی۔ ولا ابالی حین اُقتل مومنا بایّ جنب کان اللہ مصرعی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ہر زمانہ میں دین کی بقا کے لیے "شبیری" اسوے اور قربانی کی ضرورت پڑتی ہے کہ نتائج سے بے پروا ہو کر اللہ کی رضا اور حق کے فروغ کے لیے اپنی جان و مال کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرے۔ یہاں تک کہ دعوت حق کے لیے جان و خانماں بھی قربان کرنا پڑ جائے تو اس میں دریغ نہ کرے، کہ

آنکس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند فرزند و عیال و خانماں را چہ کند

یہی شہادت حسینؓ کا درس، یوم عاشورہ کا پیام ہے۔ اور "عشرتی" سے مسلک کا ایک نقصد سمجھ میں آتا ہے۔ والعلم عند اللہ۔

کیا عجیب ہے کہ ایرانی سیاسی ذہن اور عجمی قنوطی فلسفہ نے صبر و استقامت، قربانی و جیداری، حق کے لیے فدائیت کا ایک اعلیٰ ترین اور عملی نمونہ کو ماتم، تعطل، اور اسلامی خلافت کے اعلیٰ اقدار سے گریز اور ۔ دگر دانی قابل افسوس اور مہمل مجموعہ بنا کر رکھ دیا۔ اور ایک طبقہ کے اکثر افراد کو ان مشاغل میں مبتلا کر دیا جس کے متعلق صاف وعید نبوی موجود تھی۔ "من لطم الخدود و شق الجیوب فلیس منا"[1] — ممکن ہے فراست نبوت ان کریہہ مناظر کو دیکھ رہی ہو جنکو گوشہ نبوی کے نام پر آئندہ عالم میں رواج دیے جانے والے تھے۔ فالی المشتکی۔

(باقی)

---

[1] منہ پیٹنے والے اور دامن چیرنے والے ہم میں سے نہیں ہیں۔

دریچۂ عبرت

• ووٹوں کی خریداری اقامت دین کیلئے! • سن تو سہی جہاں میں ہے....

[اس ماہ معاصرین کے صفحات میں دو قابل نقل چیزیں نظر پڑیں۔ ان کے لیے مذکورۂ بالا عنوان ہی کچھ زیادہ موزوں نظر آیا۔ اس کو "انتخاب" کا قائم مقام سمجھئے!]

"اقامت دین" کے لیے ووٹوں کی خریداری بھی جائز!

معاصر "المنیر" (لائلپور) کی ۱۹ ستمبر کی اشاعت میں ایک مراسلہ شائع ہوا ہے اس کا کچھ حصہ آپ بھی پڑھیے، اور اقامت دین کے اس تصور پر رو دیجئے جس کے ساتھ ایسی باتیں بھی جوڑ کھاتی ہیں۔

بخدمت مکرمی و محترمی جناب حضرت مولنا عبد الرحیم صاحب اشرف ایڈیٹر المنیر لائلپور۔
السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ نے المنیر میں مولنا مودودی صاحب کی ایک اجتہادی اور استنباطی رائے پر تنقید کی ہے۔ حالانکہ مولنا موصوف نے اپنی رائے کو قرآن کریم سے مستنبط فرمایا ہے۔ مولنا موصوف نے کمزور ایمان بے شعور ووٹروں کو مؤلفین القلوب کی فہرست میں شمار کر کے ووٹ کی خرید و فروخت جائز قرار دی ہے۔ اب ہمیں دیانتداری کے ساتھ غور و فکر کرنا ہوگا کہ حضرت مولنا مودودی کا مدار استدلال اور طریق استدلال غلط ہے یا صحیح اور مولنا کو اللہ تعالیٰ نے جو بلند علمی مقام عطا فرمایا ہے تو کیا انھیں حق استدلال حاصل ہے یا نہیں۔

(۱) مولفت القلوب کون لوگ تھے، تفسیر ابن کثیر سورۂ توبہ میں ہے۔ و اما المولفۃ قلوبہم فاقسام، منھم من یعطی لیسلم کما اعطی النبی صلی اللہ علیہ وسلم صفوان ابن

امیۃ من غنائم حنین وقد کان شھدھا مشرکاً قال فلم یزل یعطی حتی صار احب الناس الیّ بعد ان کان ابغض الناس الیّ ومنھم من یعطی لیحسن اسلامہ ویثبت قلبہ کما اعطی یوم حنین ایضاً۔ جماعۃ من صنادید الطلقاء واشرفھم مائۃ من الابل مائۃ من الابل وقال انی لاعطی الرجل وغیرہ احب الیّ منہ خشیۃ ان یکبہ اللہ علی وجھہ فی نار جھنم ومنھم من یعطی لما یرجیٰ من اسلام نظرائہ ومنھم من یعطی لیجبیٔ الصدقات ممن یلیہ اولیدفع عن حوزۃ المسلمین الضرر من اطراف البلاد۔

ترجمہ۔ مولفۃ القلوب لوگوں کی کئی قسمیں ہیں بعض ایسے لوگ تھے جن کو حضور علیہ السلام صدقات و مال غنیمت اس لیے عطا فرمایا کرتے تھے تاکہ وہ مسلمان ہو جائیں۔ جیسا کہ صفوان بن امیہ کو حضور علیہ السلام نے حنین کے مال غنیمت سے بہت کچھ عطا فرمایا۔ حالانکہ صفوان ابن امیہ جنگ حنین میں مشرکین کی صف میں کھڑے ہو کر مسلمانوں کے مقابلہ میں لڑا تھا[1]۔ صفوان ابن امیہ نے کہا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مجھے مال غنیمت و صدقات میں عطا فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ میری نظر میں تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہو گئے۔ اس سے پہلے میں ان کا بدترین دشمن تھا۔

بعض لوگ وہ تھے جن کے ایمان ذرا کمزور تھے۔ حضور علیہ السلام ان کو اس لیے دیتے تھے تاکہ ان کا اسلام پختہ ہو جائے اور تذبذب رفع ہو جائے جیسا کہ حنین کے مال غنیمت میں سے مشرکین کے بڑے بڑے لیڈروں اور چودھریوں کو سو سو اونٹ دیا گیا اور ساتھ ہی حضور علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا کہ میں مال غنیمت دے رہا ہوں یہ مجھے محبوب نہیں ہیں۔ ان کو اس لیے دے رہا ہوں کہ کہیں اللہ تعالیٰ ان کو آگ جہنم[2] میں اوندھے منھ نہ پھینک دے۔

بعض لوگوں کو حضور علیہ السلام اس لیے دیتے تھے کہ وہ اپنے ساتھیوں کو مال کی لالچ دے کر اور اسلام کی فیاضی اور دیگر خوبیاں بیان کر کے اسلام کی دعوت دیں۔ بعض وہ لوگ تھے کہ جن کو اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم دیتے تھے کہ یہ لوگ اپنے قبائل و خاندان میں بارسوخ ہیں۔ لہذا اپنے خاندانوں سے مال صدقات وصول کر کے لائیں گے اور اپنے زیر اثر علاقہ سے اعدائے اسلام کو دور رکھیں۔

---

[1] شھدھا مشرکاً کا کیا خوب مطلب بیان ہوا! بعض چھوٹے چھوٹے تصرفات اس ترجمہ میں اور بھی ہیں۔ (الفرقان)

[2] ! (الفرقان)

اب قابل غور معاملہ یہ ہو کہ ضعیف الایمان اور لالچی ووٹر اس فہرست میں داخل ہو سکتے ہیں یا نہیں تو بات صاف ہو کہ جب ایمان جیسی قیمتی اور عزیز ترین متاع پیسوں سے خریدی جا سکتی ہے[51] تو ووٹ کا معاملہ تو اس سے بالکل فروتر ہے، ایک ووٹر کو ایک بے دین دولتمند چند ٹکے دے کر خرید رہا ہے تو اس کے بالمقابل ایک دین پسند دیندار خلوص نیت کے ساتھ نظام اسلامی کے قیام کے لیے کچھ معاوضہ دے کر اپنے یا دوسرے امیدوار ساتھی کے لیے ایک ووٹر کی رائے خرید لے تو اس میں ہرج کی بات کیا ہو اور کون سا اسلامی ستون گر جائے گا. میری رائے تو یہ ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے میرے ہاتھ میں ایک بہت بڑا خزانہ دے دے تو میں وہ خزانہ دیہاتی غربا میں تقسیم کر دوں اور اسلامی نظام کے قیام کے لیے ان سب کے ووٹ حاصل کر لوں. بے دین لوگ دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں اور ان کو بری طرح ناکامی و ذلت کا منھ دیکھنا پڑے. اسلام کے اعزاز و اکرام کے لیے اگر جائز ذرائع و وسائل استعمال کیے جائیں تو اسلام دنیا میں غالب ہو سکتا ہے[52]۔

"سُن تو سہی جہاں میں ہو تیرا افسانہ کیا!"

آسام کے ایک وزیر جناب معین الحق نے پچھلے دنوں ایک سرکاری تقریب کے موقع پر گاندھی جی کی مورتی پر پھول چڑھانے سے انکار کر دیا تھا. معاصر "دعوت" دہلی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے روزنامہ "پرتاب" کا تبصرہ بھی نقل کیا ہو. اس تبصرہ میں جہاں معاصر "پرتاب" نے معین الحق صاحب کے رویہ کی تعریف کی ہو. وہاں مسلمانوں کے ایک ایسی چٹکی بھی لی ہو جسے پڑھ کر غیرت ایمانی کو پسینہ پسینہ ہو جانا چاہیے! — معاصر "دعوت" رقمطراز ہو:-

ایک تیسری بات جو اسی واقعے سامنے آئی ہو یہ ہو کہ ہندوؤں کا وہ طبقہ جو کٹر فرقہ پرست کہلاتا ہو اس طرح کے اصولی اقدامات کو سراہنے پر آمادہ ہو. چنانچہ معاصر "پرتاب" نے اس واقعہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "آسام کے وزیر مسٹر معین الحق نے اچھا کیا جو رواج پر اپنے ضمیر کی آواز کو ترجیح دیتے ہوئے گاندھی جی کی مورتی پر پھول چڑھانے سے انکار کر دیا، ان کے نزدیک یہ بُت پرستی ہو اور اسلام کی رو سے بت پرستی شرک میں داخل ہو" یہ تعریف ثابت کرتی ہو کہ اصول پرستی پر جم جانا بجائے خود ایسا فعل ہو جو اپنی تاثیر پیدا کرتا ہے۔

وزیر مذکور کے اس اقدام کی تعریف کرتے ہوئے معاصر "پرتاب" نے ایک اور مسئلہ کی طرف

---

[51] اسلام کا کوئی بدترین دشمن بھی اس نادان دوست سے بڑھ کر دامن رسالت کو داغدار کر سکتا ہو؟ "ابتدائے عشق ہو دیکھا ہو کیا" (الفرقان) —— [52] بیشک اب اسلام ایسے ہی مقدس ذرائع سے غالب ہوگا۔ (الفرقان)

توجہ دلائی ہو اور وہ یہ ہو کہ مسلمان خود بھی قبر پرستی میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ معاصر لکھتا ہو۔

"حضرت محمدؐ کو اس بات پر بجا فخر حاصل ہو کہ انھوں نے عرب جیسے شرک پسند ملک میں بت پرستی کے خلاف آواز اٹھائی اور اس بات پر نہایت سختی سے قائم رہے کہ بُت پرستی کفر ہو خدا ایک ہو دوسرا نہیں مسلمان بھی حضرت کی اس تعلیم پر قائم رہے ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے آنحضرت کی کوئی شبیہ نہیں بننے دی انکی اصل تصویر تو کیا ہو سکتی ہو لیکن جو نقلی تصویر شائع ہوئی اسکے خلاف انھوں نے پروٹسٹ کیا۔ نہ صرف زبان بلکہ ہاتھ سے بھی۔ عیسیٰ کی بھی کوئی اصل تصویر نہیں ہوگی لیکن چونکہ عیسائیوں کو اپنے پیامبر کی تصویر بنائے جانے پر اعتراض نہیں اسلیے ان کی تصویر دنیا کے سامنے ہو۔ جہاں مسلمانوں نے بُت پرستی کے لحاظ سے اپنے رسول کے حکم کی تعمیل کی ہو۔ وہاں..... افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہو کہ انھوں نے قبر پرستی جیسی بدعت کی پیروی کرکے انکی حکم عدولی کی ہو۔ یہ کہنا مبالغہ میں داخل نہ ہوگا کہ جتنی قبر پرستی مسلمانوں میں پائی جاتی ہو شاید ہی کسی اور قوم میں پائی جاتی ہو، ہندوؤں میں چونکہ مردوں کو دفن کرنے اور انکی قبر بنانے کا رواج نہیں ہو۔ اسلیے ان میں سادھ کی پوجا بہت کم ہو پھر بھی انکے ہاں سادھیں بن رہی ہیں اور لوگ ان پر پھول چڑھاتے ہیں۔ مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ہندو عورتیں بھی دعا مانگنے اور بچے لینے کیلئے مسلمان پیروں کی قبروں پر جاتی ہیں۔ پیروں کی پرستش کرنیوالے مسلمان مردوں اور عورتوں کا تو کوئی شمار نہیں۔ اگر کسی کو یہ دیکھنا ہو کہ مسلمان کیسی بری طرح اس بدعت..... کا شکار ہو چکے ہیں تو وہ لاہور میں داتا گنج بخش کے دربار میں چلا جائے اسے معلوم ہو جائے گا کہ مسلمان کس قدر اپنے رسول کی حکم عدولی اور اپنے مذہب کی توہین کرتے ہیں۔ داتا گنج بخش تو پاکستان میں چلا گیا ہندوستان میں قبر پرستی یا مزار پرستی کا درشیہ دیکھنا چاہتے ہو تو خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ واقع اجمیر میں چلے جاؤ۔ میں نے اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کو ان کی قبر کے سوراخ میں منھ دے کر روتے دیکھا ہو۔ خواجہ کی درگاہ کا ہندوستان کے مسلم مقامات۔ مقدسہ میں نمایاں مقام ہو اور ہر سال خواجہ کے عرس پر ہزاروں کی تعداد میں مسلمان وہاں جاتے ہیں۔ وہاں دو بڑے کڑھاؤ ہیں جن میں عرس کے دن چاول پکائے جاتے ہیں۔ یہ چاول بھگتوں میں بانٹے جاتے ہیں۔ چاول کم ہوتے ہیں اور بھگت زیادہ اس لیے ایک طرح کی لوٹ مچ جاتی ہو اور ہر ایک مسلمان بطور تبرک دیگ کے چاول حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہو۔ اس درگاہ میں مغل بادشاہوں کی بنوائی ہوئی مسجدیں ہیں۔ اکبر بادشاہ نے بھی یہاں ایک مسجد بنوائی تھی حالانکہ مسلم علماء اس کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر چکے ہیں۔ لطف یہ ہو کہ یہ قبر پرستی کھلے بندوں ہوتی ہے اور اس کے خلاف کوئی ـــــ پروٹسٹ نہیں ہوتا۔"

تعارف و تبصرہ

تجلیاتِ عثمانی از ، پروفیسر انوار الحسن صاحب انور شیر کوٹی ۔ ناشر :۔ ادارۂ نشر المعارف چہلیک ۔ ملتان ـــ ۷۱۲ صفحات ، بڑا سائز ، کاغذ متوسط ، کتابت طباعت معمولی ۔ مجلد مع گرد پوش ۔ قیمت ۔/۸/۱۰

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ علوم دینیہ میں اپنے زمانہ کے فرد فرید، اور اپنے بزرگوں کے بعد جماعتِ دیو بند کی صف اول کی شخصیت تھے ۔ خدا ان کی تربت کو ٹھنڈا رکھے ۔ انھوں نے تقسیم ہند سے پہلے اپنے علمی کارناموں سے اپنے شیوخ و اساتذہ کی عظمت کو چار چاند لگائے اور تقسیم کے بعد دنیا کی سب سے بڑی مسلمان مملکت کو اسلامی دستور کی راہ پر ڈال دینے کا ناقابلِ فراموش عملی کارنامہ انجام دیا ۔

بلاشبہ مولانا کی زندگی ، خصوصاً علمی زندگی اس قابل تھی کہ کوئی صاحبِ نظر اور سلیقہ مند مصنف اسکے تمام پہلوؤں کو پوری شرح و بسط کے ساتھ ایک گرانقدر تالیف کی شکل میں سرمۂ بصیرت بنا کر بعد کی نسلوں کے لئے محفوظ کر دے ۔ پروفیسر انوار الحسن صاحب نے اس خدمت کا بیڑا اٹھایا ۔ اور یہ ضخیم کتاب مرتب کر کے پیش کر دی جو اس وقت زیرِ تبصرہ ہے ۔

کتاب کے بڑے بڑے عنوانات یہ ہیں :۔

تعارف ، تجلیات عثمانی ، تصنیفات عثمانی ، مفسر اعظم کا مقام تفسیر ، علامہ عثمانی کا مقام حدیث ، تفقہ عثمانی ، قاسم ثانی ، اور علم الکلام ، علامہ اور منطق و فلسفہ ، ادبی مقام ، شاعری ، عربی ادب ، سیاست عثمانی ، تحریک پاکستان ، پاکستان میں آمد ۔

ان عنوانات کے تحت سینکڑوں ذیلی عنوانات ہیں جو چھ صفحے کی طویل فہرست میں پھیلے ہوئے ہیں۔

ہم پروفیسر صاحب موصوف کو اس احساس فرض پر ہدیۂ تحسین پیش کرتے ہیں جس نے انھیں اس کاوش پر آمادہ کیا۔ اور ہمیں اس کاوش کی داد دینے میں بھی بخل نہیں ہے جو اس ضخیم تالیف کے سلسلے میں موصوف کو لامحالہ کرنی پڑی ہوگی، مگر یہ کد و کاوش اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہے؟ اس بارے میں ہمیں پروفیسر صاحب کے اسلوب نگارش اور انداز استدلال نے بہت مایوس کیا۔

مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی شخصیت اس پایہ کی ہے کہ اگر کوئی سلیقہ مند مصنف اس کا اچھا تعارف کرا سکے، تو ہمارے ملک کی اس "رسم" کے ماتحت کہ یہاں مرنے کے بعد قدر پہچانی جاتی ہے، علم دین کی تاریخ میں ان کا کماحقہ، مقام مسلّم ہو سکتا ہے، مگر ہمارے مصنف کا انداز یہی ہے کہ بجائے اسکے کہ ایسا مواد پیش کرنے پر اکتفاء کریں جسے پڑھ کر قاری کے ذہن پر ان کے علو مرتبت کا آپ سے آپ نقش قائم ہو جائے، اپنی طرف سے "مفسر اعظم" اور "محقق بے بدل" کے خطابات تجویز کر کے قاری کو دیتے ہیں، بلکہ مزید یہ کہ خطابات ہی سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے کہ پہلے اچھی طرح تعارف کرا کے قارئین کے ذہن کو ان خطابات سے متفق ہونے کے لئے تیار کرلیں۔ حالانکہ اب زمانہ اس اندازِ سوانح نگاری کو بہت پیچھے چھوڑ چکا ہے۔ اور یہ چیز فکر و نظر کی سطحیت پر دال سمجھی جاتی ہے۔

خیر یہ تو پھر بھی ایک ذوقی چیز ہے۔ اور جن لوگوں کا یہ مذاق پختہ ہو چکا ہے وہ اس میں معذور سمجھے جا سکتے ہیں، اور تبصرہ نگار، قارئین سے سفارش کر سکتا ہے کہ وہ خطابات نوازی کے اس عنصر سے قطع نظر کر کے کتاب کا مطالعہ کریں۔ مگر کتاب کا جو مواد اور انداز استدلال ہے وہ خود مجموعی طور پر ایسا نہیں ہے جو پڑھے لکھے لوگوں کو متاثر کر سکے۔

مولانا کو "مفسر اعظم" ثابت کرنے کے لیے پروفیسر صاحب کو یہ دکھانا تھا کہ تفسیر کے لئے جن علوم پر عبور ضروری ہے، مولانا ان علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اسی ذیل

میں علم السیر بھی آتا ہے، اس علم پر مولانا کا عبور ثابت کرنے کے لیے پروفیسر صاحب کا پیش کردہ مواد اور استدلال یہ ہے کہ مولانا کے تفسیری حواشی میں سے ایک حاشیہ کی عبارت پیش کی ہے جس کے آخر میں یہ جملہ ہے کہ:۔

"حدیث وسیر سے ثابت ہے کہ ظاہری طور پر بھی فرشتوں نے متعدد مرتبہ آپ کا سینہ چاک کیا" ص۱۲۰

اس عبارت کو پیش کر کے پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:۔

" مذکورہ عبارت میں حدیث وسیر کی کتابوں کے حوالہ سے اُن کا علم السیر پر عبور واضح ہوتا ہے"

جو لوگ مولاناؒ کے علمی مقام سے براہ راست واقف ہیں اُن کو تو پروفیسر صاحب کی اس کد و کاوش کی احتیاج نہیں۔ لیکن جو لوگ واقف نہیں' مولانا کے تفسیری حواشی انھوں نے نہیں دیکھے وہ آخر کیسے پروفیسر صاحب کے اس استدلال سے قائل ہو جائیں گے؟۔ ہمارے نزدیک یہ سادگی کی انتہا ہے۔

اسی طرح مولانا کے مضامین ومقالات کا تعارف کراتے ہوئے، "معارف القرآن" نامی مقالہ کی قدر وقیمت اہلِ علم ناظرین پر اِن الفاظ میں واضح کی گئی ہے:۔

" اہلِ علم جانتے ہیں کہ حضرت عثمانی ہندوستان میں مفسّرِ اعظم کا لقب رکھتے ہیں۔ اسلئے معارف القرآن ان کے مایۂ ناز مضامین کا مجموعہ ہے"

(ص۲۰۲)

یہ آخر استدلال کی کونسی قسم ہے اور اس میں کیا وزن ہے؟

یہ دو مثالیں ہم نے محض نمونہ کے طور پر دی ہیں، ورنہ ایسی مثالیں کتاب میں بے شمار ہیں۔

کوئی خود دوسم کا مفسّر ومصنّف ہو تو اسکے سوانح نگار کو شاید یہ بتانے کی ضرورت ہو کہ میرے ممدوح کو "صرف ونحو" میں بھی قابل اعتماد بصیرت حاصل تھی، مگر مولانا عثمانی جیسا مشہور عالم جو مدتوں دیوبند کی اعلیٰ ترین درسگاہ کے اعلیٰ اساتذہ میں رہا ہو،

اُس کے بارے میں بھی کسی کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت ہے کہ اُسے اچھی صرف ونحو آتی تھی؟ ہم اسے پروفیسر صاحب کی سادگی کے سوا کیا کہیں کہ انھوں نے مولانا کے متعلق یہ بتانے کی بھی ضرورت سمجھی ہے۔

علیٰ ہذا تفسیر میں جو بعض مقامات پر حساب دانی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ پروفیسر صاحب نے اس کے پیش نظر ان تفصیلات میں جانے کی بھی ضرورت سمجھی ہے کہ مولانا نے کتنا حساب پڑھا تھا۔

اور پر ہم نے کہا تھا کہ "کتاب کا مواد مجموعی طور پر ایسا نہیں ہے کہ اس سے پڑھے لکھے لوگ متاثر ہو سکیں"۔ اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ کتاب میں مؤثر مواد بھی موجود ہے۔ اور بے انصافی ہو گی اگر ہم اس کا اعتراف نہ کریں۔ مولانا مرحوم کی تفسیر، شرح حدیث اور کلامی مباحث وغیرہ کے بہت سے ایسے اقتباسات اس کتاب میں ہیں جو مولانا کی علمی بلندی کا بڑا روشن ثبوت ہیں۔ مگر ہمیں یہاں بھی کہنا پڑتا ہے کہ پروفیسر صاحب نے ان اقتباسات اور علمی تحقیقات پر جو تبصرے فرمائے ہیں وہ شاید مفید سے زیادہ مضر ہی ثابت ہوں گے۔ ان میں ایک عجیب سطحی عقیدتمندی ٹپکتی ہے۔ اور بجائے اس کے کہ ان تحقیقات کی گہرائیوں کو اُجاگر کیا جاتا زیادہ تر اُن کا انداز، داد اور والہانہ تحسین و آفرین کا سا ہے۔ جو ظاہر ہے کتاب کے بارے میں آجکل کے مذاق کو کیا تأثر دے گی! ——— درحقیقت کتاب کے تقریباً سارے کمزور پہلوؤں کی بنیاد یہی سطحی انداز کی عقیدتمندی ہے۔ نفسِ عقیدتمندی میں تو کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ سوانح نگاری عموماً ہوتی ہی عقیدتمندی کے جذبے سے ہے، مگر اس جذبہ کی یہ سطح کہ سوانح نگار یہ بھول جائے کہ اس کا کام قارئین کے تأثر کا سامان کرنا ہے نہ کہ اپنے وجد و تأثر کا اظہار کرنا، یہ سطح! ظاہر ہے، کتاب کو کسی کام کا نہیں چھوڑتی ——— کاش جناب مؤلف اپنے وجد و تاثر پر کچھ قابو پا سکے ہوتے تو یہ کتاب خاصی مفید رہتی۔ گو مذاقِ عصر سے غیر متاثر لوگوں کے لئے اب بھی بے کار نہیں۔

انفاسِ قدسیہ

از جناب مفتی عزیز الرحمٰن صاحب نہٹوری۔ ناشر۔ مدینہ بک ایجنسی بجنور، صفحات ۲۴۰۔ کتابت طباعت متوسط، مجلد قیمت ۲/۸

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، اپنی سوانح، "نقش حیات" کے نام سے خود اپنے قلم سے لکھ گئے ہیں، لیکن منتسبین و متوسلین کے لیے پھر بھی اس سلسلہ میں کام باقی ہے۔ مولانا کے تلمیذ و مجاز مفتی عزیز الرحمٰن صاحب نہٹوری نے اس کتاب کے ذریعہ اسی سلسلہ کا اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا خاص وصف اتباع کتاب و سنت تھا، اس کتاب کی خصوصیت بھی یہی ہے کہ اس میں ممدوح کی سیرت کو کتاب و سنت ہی کی روشنی میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس میں تعلیمات قرآنیہ اور سنن نبویہ سے کس درجہ مطابقت پائی جاتی ہے ـــــ مصنف کا یہ انداز سوانح نگاری لائق تحسین بھی ہے اور تبلیغی نقطۂ نظر سے مفید بھی، جو اس تصنیف میں ان کا اصل نقطۂ نظر ہے۔ متعدد مقامات سے جی چاہتا ہے کہ کچھ اقتباسات ہدیہ ناظرین کیے جائیں، کیونکہ کتاب و سنت کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی زندگیوں کے واقعات بڑا موثر تبلیغی ذریعہ ہیں، مگر افسوس ان صفحات میں اسکی گنجائش نہیں۔

تاہم مہماں نوازی کی یہ شان تو ذکر سے چھوڑی نہیں جاسکتی کہ:۔

> "کہ ایک مرتبہ سردیوں کے موسم میں مہمانوں کی اتنی زیادتی ہوئی کہ تمام لحاف و بچھونے ختم ہو گیے تب آپ نے اپنے استعمال کا بستر بھی، مہمانوں کے لیے باہر بھیجدیا۔ اور رات انگیٹھی کے سامنے گزاردی۔"
>
> (ص ۳۳)

اللہ اکبر! مہماں نوازی کا ایک درجہ یہ بھی ہے! ـــ رسول اور اصحاب رسولؐ کے اتباع کی لگن آدمی کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے؟ صحابیٔ رسولؐ حضرت ابو طلحہ انصاریؓ کی ایسی ہی شانِ میزبانی کی توصیف میں آیت نازل ہوئی تھی۔" ویؤثرون علیٰ انفسہم ولو کان بہم خصاصۃ[1]۔

[1] اور اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو مقدم رکھتے ہیں۔ اگرچہ تنگی ہی کی حالت کیوں نہ ہو!

دوسری مثال صفحہ ۹۷ - ۹۸ پر ضبط نفس اور حلم کی ہے جس پر شاید بعض لوگوں کو یقین بھی نہ آئے مگر جنھوں نے مولانا کو کچھ عرصہ تک قریب سے دیکھا ہے انھیں ذرا بھی تامل نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ مولانا باوجود اپنی حدّتِ مزاج کے، اپنے نفس کے معاملہ میں بے نفسی کے جس درجہ پر تھے۔ وہاں ضبط و حلم کی یہ مثال بھی اعجوبہ نہیں)۔ گو فی زمانہ کتنے ہی اچنبھے کی بات ہو۔

حق یہ ہے کہ یہی نادرا وصاف تھے جنھوں نے مولاناؒ کے واقفین و متوسلین میں مولانا کی ذات سے ایک مثالی گرویدگی پیدا کردی ہے، اور اسکے بعض آثار کو ناواقف گروہیٔ عصبیت سمجھ بیٹھتے ہیں۔

اسی گرویدگی کا اثر ہے کہ زیرِ نظر کتاب میں متعدد جگہ عقیدت، غلو کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ مگر مصنف کی اس معذرت کے بعد کہ " خادم کے پاس مخدوم کے حق میں اس (عقیدت) کے سوا کچھ نہیں" کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ البتہ ایک آدھ مقام ایسا ہے کہ اُس سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا ——— " مہماں نوازی " کے باب میں ص۳۱ پر دوسری سطر میں ان الفاظ سے جو جملہ شروع ہوتا ہے کہ " دنیا میں سینکڑوں بزرگ اور " الخ اس پر مصنف کو اپنی تمام عقیدت کے باوجود نظرِ ثانی کرنا چاہیئے۔

علیٰ ہذا ص۴۶ پر ——— " اِعلاءِ کلمۃ اللہ کے لئے پھرتے رہے " ——— حقیقت یہ ضرور ہے کہ حضرت مولانا کے پیشِ نظر ابتغاء رضوان اللہ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ مگر " اعلاءِ کلمۃ اللہ " کا تو وہ میدان ہی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ یوں کہہ لیجیئے کہ کلمۂ حق کے لئے پھرتے رہے۔

بعض مقامات سے ایک چیز یہ بھی سامنے آتی ہے کہ مصنف اپنے ممدوح کی عظمت تسلیم کرانے کے لئے سفارش کا سا لہجہ اختیار کرلیتے ہیں۔ حالانکہ نہ صرف اس کی ضرورت نہیں، کیونکہ مولانا کی کتابِ حیات اُن کی عظمت کی خود گواہ ہے، بلکہ اس کا اثر الٹا ہو جاتا ہو کہ لوگ اسے پروپگنڈا سمجھتے ہیں ——— اور یہ چیز تو کتاب میں بہت ہی ہے کہ مصنف نے اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھا کہ وہ اپنے جیسے معتقدین و متأثرین کے مخصوص حلقے میں بیٹھے " ذکرِ حبیب " کر رہے ہیں، یا ہر قسم کے لوگوں کے وسیع تر مجمع میں ہیں؟ آج کل کی سوانح نگاری میں اس فرق کو ملحوظ رکھنے کی بڑی ضرورت ہے۔ معتقدین کے حلقے کی ایک مخصوص زبان ہوتی ہے،

باہر کر بھی اگر اُسی زبان کو استعمال کیا جائے تو اپنی سعادت مندی کے لئے تو چاہے یہ کتنا ہی مفید ہو، مگر عقیدتمندی کا یہ خاص لہجہ باہر والوں کے حق میں خواہ مخواہ ایک حجاب بن جاتا ہے اور ۹۹ فی صدی حقیقت بھی بے التفاتی کا شکار ہو جاتی ہے، تصانیف اور مضامین کی حیثیت ایک مجمع عام کی گفتگو کی سی ہے، اس لئے اس میں بھی اپنے ذوق کی تسکین سے زیادہ مذاق عام کی رعایت ضروری ہے، جبکہ اس میں کوئی قباحت بھی نہو۔

"رفقائے جیل کے ساتھ" مولاناؒ کے برتاؤ کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف کے قلم سے ایک ایسی بات نکل گئی ہے جو کم از کم مولانا کے کسی مسترشد کے لئے زیبا نہیں ہے۔

> "اس کا صحیح نقشہ تو وہی پیش کر سکتے ہیں جن کو حضرت کے ساتھ رہ کر یہ سعادت اور سنت یوسفیؑ کی ادائیگی کی توفیق ہوئی ہے، لہذا بندہ اُنھیں رفقاء کے حوالہ سے کچھ عرض کرے گا" الخ اور اس کے بعد پہلا نام اچاریہ کرپلانی صاحب کا آتا ہے۔ (ص۵۴)

اچاریہ کرپلانی صاحب اور "سنت یوسفی کی ادائیگی"؟ استغفر اللہ! پتہ نہیں مفتی صاحب کیسے یہ جملہ لکھ گئے۔ اس جملہ نے کتاب کا پورا تاثر غارت کر دیا۔ اس کا تدارک تو مفتی صاحب کو دوسرے ایڈیشن سے پہلے ہی کچھ سوچنا چاہیئے۔

اس ایک جزئی لغزش اور عمومی تعبیر و لہجہ کے قابل اصلاح پہلوؤں سے قطع نظر مفتی صاحب کی یہ کوشش قابل قدر اور بڑی کارآمد ہے۔ ایک اللہ والے کے اس تذکرہ میں دلوں کی زندگی کا سامان ہے ـــــ مولانا کے طریق بیعت و ارشاد کی تفصیل اور خلفاء کی فہرست بھی اس کتاب کا جزو ہے۔ آخر میں کچھ ملفوظات بھی ہیں۔ متفرق ملفوظات کے ذیل میں ملفوظ ۲۰ کے متعلق ہماری رائے ہے کہ وہ ایسے سرسری طور پر "ملفوظات" میں دینے کی چیز نہیں تھی ـــــ دوسرے ایڈیشن کی اگر نوبت آئے تو اغلاط کتابت پر توجہ کی بہت ضرورت ہے۔ غلطیاں صرف لفظی ہی نہیں ہیں، بلکہ کہیں کہیں کتابت کے معروف قاعدوں کے بھی خلاف ہو گیا ہے مثلاً ایک جملہ دو پیروں میں تقسیم ہو گیا

مصنف کوئی ادیب یا مشاق مصنف نہیں ہیں اسلئے اُنکی یہ فرمائش بجا ہے کہ اُنکی اس کاوش کو ادبی نقطۂ نظر سے نہ جانچا جائے۔ مگر ادب بمعنی حسن بیان سے قطع نظر کم از کم صحت بیان پر تو پوری توجہ کرنی ہی چاہیئے۔ اس پہلو سے کتاب کا پہلا عنوان ہی کھٹکتا ہے۔ اچھا ہے کہ مصنف دوسرے ایڈیشن میں ایسی تراکیب پر بھی نظر کریں۔ (ع۔ س)

"انٹروڈاکشن ٹو اسلام" (انگریزی)

(سلسلۂ مطبوعات مرکز ثقافت اسلامیہ پیرس ۱)
مصنفہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ صفحہ ۲۰۰، قیمت درج نہیں ہے۔

ہندوستان میں ملنے کا پتہ :۔ حبیب اینڈ کو، اسٹیشن روڈ، حیدرآباد (دکن)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ ہمارے دور کی ان چند فاضل ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے اسلام اور اس سے تعلق رکھنے والے علوم ہی کو اپنی علمی و تحقیقی کد و کاوش کا موضوع بنالیا ہو۔ وہ اصلاً حیدرآباد (دکن) کے رہنے والے ہیں۔ بعد کو ترک وطن کر کے ترکی چلے گئے اور اب کچھ عرصہ سے فرانس میں مقیم ہیں۔ مگر ہر جگہ ان کو یہی ایک دُھن رہی اور ہے، یعنی قلم کے ذریعہ اسلام کی خدمت کرنا اور اس کی تعلیمات کو غیر مانوس حلقوں میں پہونچانا۔

زیر تبصرہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کا اصل مقصد مغرب کے ان لوگوں کی ضرورت پوری کرنا ہے جو مختصر کتابوں، مقالوں اور رسالوں وغیرہ کے ذریعہ اسلام کا فہم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مغرب میں اسلام سے دلچسپی رکھنے والا حلقہ رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے۔ یہ ہر طرح ایک خوش آئند امر ہے۔ اللہ کے دین کی چھوٹی سی چھوٹی کامیابی پر مسرور ہونا ہمارا حق بھی ہے اور فرض بھی۔ لیکن جو مخلص مسلمان اس بلند کام میں اپنے کو لگائے ہوئے ہیں یا اس کو عزیز رکھتے ہیں ان کو دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

ایک یہ کہ اہل مغرب کی اس دلچسپی کو اس نوع کی دلچپی نہ بننے دیا جائے جس کے ماتحت جدید طرز کی تمام ہی حکومتیں اپنے یہاں آثار قدیمہ کے محکمے قائم کرتی ہیں۔ اور دوسری یہ کہ جو دینی لٹریچر ان کے سامنے پیش کیا جائے وہ اگر ان کی ذہنی سطح کے برابر کا نہ ہو تو اس سے زیادہ گرا ہوا بھی نہ ہو۔

ہمیں خوشی ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ کی اس کتاب میں ان دونوں شرطوں کا خاصہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ معلومات کے اعتبار سے تو ڈاکٹر صاحب نے واقعی دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ شروع کے پندرہ صفحوں میں سیرت پاک پر ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ پھر اسلامی تعلیمات کے ذخیروں کے ان کی اصلی حالت میں محفوظ رہنے پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد اسلامی طرز زندگی، عقائد، عبادت، احسان و تصوف، سیاست، نظام عدل و انصاف اخلاق، معیشت، عورتوں کا رتبہ، اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کی حیثیت، علوم و فنون

کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ، اسلامی تاریخ ——— غرضیکہ اسلام اور اسلامی تہذیب کے مختلف گوشوں اور شعبوں سے متعارف ہونے کے لئے جن ابتدائی باتوں کو جاننے کی ضرورت ہے وہ سب آگئی ہیں۔ آخر میں آٹھ ضمیمے ہیں جن میں نماز پڑھنے کا طریقہ، نماز کے اوقات اور دوسری ضروری چیزیں اس طریقہ سے لکھی گئی ہیں اور تصویروں اور نقشوں کی مدد سے سمجھائی گئی ہیں کہ جو لوگ محض کتابوں ہی کے ذریعہ ان پر عمل کرنا چاہیں ان کو زیادہ دشواری نہ ہو۔

کتاب کے طرز تحریر میں وہ جاذبیت نہیں ہے جو کم از کم تبلیغی لٹریچر کے لیے ضروری ہے۔ بالخصوص جہاں اسلام کے عقائد و اعمال کی تشریح کی گئی ہے وہاں اسلوب نگارش کچھ اتنا خشک ہوگیا ہے کہ پڑھنے والے کی طبیعت کھلنے کے بجائے بند سی ہونے لگتی ہے۔ دراصل باتیں تو سب وہی پرانی ہوتی ہیں مگر ان کو ادا اپنے زمانہ کی بولی میں کرنا چاہیئے۔ اگر اس میں کمی رہ جاتی ہے تو تاثیر میں فرق آجاتا ہے اور تحریر یا تقریر کا اصل مقصد پوری طرح حاصل نہیں ہوتا۔ ثانیاً اسلام کے بارہ میں مغرب کی روایتی غلط فہمیوں اور شکوک و شبہات کو دفع کرنے کی مصنف نے کوئی ایسی کوشش نہیں کی ہے۔ جو نگاہ میں جنچے۔ ہمارے نزدیک جو کتابیں خاص طور پر مغربی پڑھنے والوں کے لیے لکھی جائیں ان میں ——— مناظرانہ انداز اختیار کئے بغیر ——— اس پہلو کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

بحیثیت مجموعی ڈاکٹر صاحب کی تصنیف اسلام پر انگریزی لٹریچر میں ایک اچھا اضافہ ہے جو امید ہے کہ آیندہ اور اضافوں کی محرک ہوگی۔

(م ، ا ، ق)

ترانۂ نعت

(از جناب عمر انصاری صاحب)

تیری خاطر میرے شاہ　　دیدہ و دل فرشِ راہ
آ، کہ تا حدِّ نگاہ　　منتظر ہیں مہر و ماہ
اشھد ان لا الٰہ الخ　　اشھد ان لا الٰہ الخ

رو برو تیرے شہا　　مہر کیا ہے، ماہ کیا
یہ بھی تیرا نقشِ پا　　وہ بھی تیری گردِ راہ
اشھد ان لا الٰہ الخ　　اشھد ان لا الٰہ الخ

نازشِ کون و مکاں　　تاجدارِ انس و جاں
عرش تیرا آستاں　　خُلد تیری جلوہ گاہ
اشھد ان لا الٰہ الخ　　اشھد ان لا الٰہ الخ

تیرا قرآں بے مثال　　تیرا ایماں لازوال
تیری ذات باکمال　　شانِ وحدت کی گواہ
اشھد ان لا الٰہ الخ　　اشھد ان لا الٰہ الخ

شافعِ روزِ جزا　　تاجدارِ انبیاء
مجتبیٰ و مصطفیٰ　　اے مرے شاہوں کے شاہ
اشھد ان لا الٰہ الخ　　اشھد ان لا الٰہ الخ

اُف رے وہ عالم ترا　　منبعِ جود و عطا
پھولوں سے دامن بھرا　　پھر بھی کانٹوں سے نباہ
اشھد ان لا الٰہ الخ　　اشھد ان لا الٰہ الخ

کیوں نہ ہوں قرباں ہم　　تجھ پہ اے شاہِ اُمم
دشمنوں پر بھی کرم　　دوستوں پر بھی نگاہ
اشھد ان لا الٰہ الخ　　اشھد ان لا الٰہ الخ

دل ہو بیتاب و حزیں　　سبز گنبد کے مکیں
تیری فرقت میں کہیں　　آ نہ جائے لب تک آہ
اشھد ان لا الٰہ الخ　　اشھد ان لا الٰہ الخ

پھر ترے در پہ عمرؔ　　آگیا ہے لوٹ کر
اے جمالِ منتظر　　پھر ادھر کوئی نگاہ
اشھد ان لا الٰہ الخ　　اشھد ان لا الٰہ الخ

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

۸
26/11

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا ضامن ہے

لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک ابدی فیصلہ ہے اور

اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی

حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے، اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی

زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں اور اسی لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم اس کا

عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السموات والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرۃ

توفنی مسلما والحقنی بالصالحین

ادارۂ الفرقان

مسئول
محمد منظور نعمانی

مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

ممالک غیر سے ۱۰ شلنگ اعزازی خریداروں سے پندرہ روپے	ماہنامہ الفرقان لکھنؤ (فی کاپی آٹھ آنے)	سالانہ چندہ ہندستان سے ... ... صہ پاکستان سے ... ... ۶/ ششماہی ۳/

جلد (۲۶) بابتہ ماہ ربیع الآخر ۱۳۷۸ھ مطابق نومبر ۱۹۵۸ء شمارہ (۴)

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہے ــــــ تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لئے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی، پی ارسال کیا جائے گا۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع زیادہ سے زیادہ ۲۴ تاریخ تک پہونچ جانی چاہیئے۔

پاکستان کے خریدار اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ کو روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۵ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔

مقامِ اشاعت:۔ دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

گزشتہ مہینے اخبارات میں شری جواہر لال نہرو کا ایک مضمون "بنیادی رویہ" شائع ہوا ہے، جس کا حاصل انھیں کے الفاظ میں یہ ہے کہ:۔

"ہم کو اپنے مسائل کے معاشی پہلوؤں پر غور کرتے وقت ہمیشہ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارا بنیادی طریقۂ کار اور روش پُرامن ذرائع کو اپنانے کی .... ہونی چاہیئے"

نہرو جی کو اپنے یہاں کے معاشی مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے دراصل یہی بات کہنی تھی مگر جیسا کہ انھوں نے شروع مضمون میں لکھا ہے کہ "لیکن ان اندرونی مسائل پر غور کرتے وقت بھی دماغ ناگزیر طور پر ایک وسیع تر میدان میں دوڑنے لگتا ہے"۔ یہی بات پیش آئی اور اس مضمون میں اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں آگئیں، اور اس انداز سے آئیں، جس میں صحیح معنی میں، دماغ کے "دوڑنے" ہی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

اپنے طرزِ فکر کی چنداں وضاحت کے بعد، نہرو جی نے بات یہاں سے شروع کی ہے۔

"انسان کا دماغ آج جس طرح رفتہ رفتہ طبعیاتی رازوں کو دریافت کرتا چلا جا رہا ہے وہ آج کی سب سے حیران کُن خصوصیت ہے ــــ انسان آج کم سے کم ایک بڑی حد تک خارجی حالات کا شکار ہونے پر مجبور نہیں ہے، ایک طرف خارجی حالات کی تسخیر کا یہ سلسلہ جاری ہے، دوسری طرف مجموعی طور پر انسان کے اخلاق اور ضبطِ نفس میں کمی واقع ہوئی ہے۔ میدانِ طبعیات کا فاتح خود اپنے نفس پر قابو

پانے سے قاصر ہے"۔

اس کے بعد اس تضاد کی ایک المناک مثال کے طور پر نہرو جی نے اس تضاد کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایٹمی تجربات کا مُضر ہونا تسلیم کیا جا رہا ہے مگر تجربات جاری ہیں۔ اور پھر لکھا ہے :۔

"ہمارے زمانہ کی داخلی کشاکش اور خلفشار کا یہی سبب ہے، ایک طرف سائنس اور ٹکنالوجی کی یہ زبردست ترقی اور اس کے نتائج ہیں، دوسری طرف خود تہذیب ایک خاص ذہنی تھکاوٹ میں مبتلا نظر آتی ہے"۔

اس کے آگے متصلاً ہی لکھتے ہیں :۔

"مذہب اور عقل میں تصادم ہے، مذہب اور رسوم و روایات کی پابندیاں اُٹھتی جا رہی ہیں لیکن کوئی اخلاقی یا روحانی پابندیاں ان کی جگہ نہیں لے رہی ہیں مذہب عملی شکل میں یا تو ان معاملات سے تعلق رکھتا ہے جو ہماری عام زندگیوں سے علاقہ نہیں رکھتے یا ایسی رسوم و روایات سے بندھا ہوا ہے جو موجودہ دَور سے مطابقت نہیں رکھتیں دوسری طرف عقلیت پسندی اپنی تمام خوبیوں کے باوجود کسی نہ کسی وجہ سے صرف چیزوں کی سطح کو دیکھتی معلوم ہوتی ہے اور اندر کی اصل چیز کو نہیں پاتی"۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

"پرانی تہذیبوں میں بہت سی خوبیاں ہیں لیکن بالکل ثابت ہو چکا ہے کہ ان سے کام نہیں چلتا۔ نئی مغربی تہذیب بھی ان تمام کامرانیوں اور کارناموں نیز اپنے ایٹم بموں کے ساتھ ناکارہ دکھائی دیتی ہے، اس لئے یہ احساس بڑھنے لگتا ہے کہ ہماری تہذیب میں کوئی نقص ہے

دراصل ہمارے مسائل بنیادی طور پر خود ہماری تہذیب کے مسائل ہیں مذہب نے ایک خاص اخلاقی اور روحانی ضبط و نظم دیا تھا، لیکن اس نے توہمات اور رسوم و رواج کو دوامی زندگی دینے کی بھی کوشش کی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان توہمات و رسوم نے مذہب کی اصل روح ہی کو جکڑ لیا تھا، پھر یہ فریب نظر ٹوٹا، فریب نظر ٹوٹنے کے پیچھے پیچھے کمیونزم آتی ہے اور ایک قسم کا عقیدہ اور کچھ ضبط و نظم

پیش کرتی ہے، کسی حد تک وہ ایک خلا کو پُر کرتی ہے، انسان کی زندگی کو ایک گونہ اطمینان بخش کہ وہ ایک حد تک کامیاب ہوتی ہے لیکن اپنی ظاہری کامیابی کے باوجود وہ ناکامیاب رہتی ہے، کچھ تو اپنے کھُرّے پن کی وجہ سے لیکن اس سے بھی زیادہ اس وجہ سے کہ وہ انسانی فطرت کی بعض لازمی ضروریات کو نظر انداز کرتی ہے۔ ...

.... جس چیز کو زندگی کا اخلاقی اور روحانی پہلو کہا جا سکتا ہے اس سے کیمونزم کی حقارت نہ صرف ایک ایسی چیز کو نظر انداز کرتا ہے جو انسان کی بنیادی فطرت ہے بلکہ اس سے انسان کے عادات واطوار معیاروں اور قدروں سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔"

نہرو جی کے مضمون کے ان مختلف ٹکڑوں سے جو مسئلہ سامنے آتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ وہ اس وقت دنیا کا اہم ترین مسئلہ ہے اور اس بارے میں ذہن کی صفائی کے بغیر ہم اجتماعی زندگی کو کوئی ایسا نظم نہیں دے سکتے جو ہمہ وجوہ متوازن اور اطمینان بخش ہو — ہم اس مسئلہ کے بارے میں اپنے خیالات آئندہ اشاعت میں پیش کریں گے۔

معاونین "الفرقان" کی خدمت میں ۔ پاکستان کے حالیہ انقلاب کا الفرقان کے مالیات پر بوجوہ ... اثر پڑا ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، اس لئے معاونین الفرقان سے چند نہایت ضروری گزارشیں کرنی ہیں۔ امید ہے کہ جن صاحب سے جو گزارش متعلق ہوگی وہ اس پر کماحقہ توجہ فرمائیں گے۔

(۱) جن حضرات کے ذمہ الفرقان کا بقایا چل رہا ہے وہ پہلی فرصت میں اسکی ادائگی کی طرف توجہ فرمائیں، ایسے بہت سے حضرات کو گزشتہ دنوں خطوط بھی لکھے گئے تھے، افسوس ہے بہت کم حضرات نے توجہ فرمائی۔ لیکن اسکے بعد بھی اگر بے توجہی کا یہی عالم رہا تو ہم مجبوری کی بنا پر آئندہ سے ان کا رسالہ بند کردیں گے۔

(۲) سعودی عرب، جنوبی افریقہ اور دیگر ممالک کے خریداروں کو ترسیل زر میں جو دقتیں پیش آتی ہیں اُن سے ہم کچھ واقف ہیں مگر موجودہ حالات کے پیش نظر ضروری ہے کہ وہ خصوصی توجہ سے کام لیکر اپنا بقایا اور آئندہ چندہ فوراً ارسال فرما دیں۔

(۳) تیسری گزارش سب ہی مخلصین الفرقان سے ہے کہ ان حالات میں وہ توسیع اشاعت کی کوشش سے الفرقان کی جتنی بھی اعانت فرما سکتے ہوں اُس سے دریغ نہ فرمائیں۔

التذکیر بالقرآن

(از حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری مدظلہ العالی)

(۳)

اسی طرح سے ایک موقع پر اول تو شاہانہ استغناء کے ساتھ شروع فرمایا، پھر اس کے بعد نافرمانوں کو حاکمانہ انداز سے تنبیہ فرمائی اور مطیعین پر اپنی انتہائی شفقت کا اظہار فرمایا، ارشاد فرماتے ہیں کہ :۔

وقل الحق من ربکم فمن شآء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر انا اعتدنا للظلمین ناراً احاط بھم سرادقھا وان یستغیثوا یغاثوا بماءٍ کالمھل یشوی الوجوہ بئس الشراب وساءت مرتفقا ۝

اور آپ کہہ دیجئے کہ حق تمھارے رب کی طرف سے ہے سو جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کافر رہے۔ بیشک ہم نے ایسے ظالموں کے لیے آگ تیار کر رکھی ہے کہ آگ کی قناتیں ان کو گھیرے ہوں گی اور اگر فریاد کریں گے تو ایسے پانی سے ان کی فریاد رسی کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوگا مونہوں کو بھون ڈالے گا۔ کیا ہی برا پانی ہوگا اور وہ دوزخ کیا ہی بری جگہ ہوگی۔

انّ الذین آمنوا وعملوا الصّٰلحٰت انا لا نضیع اجر من احسن عملاً ۝ اولٰئک لھم جنّٰت عدن تجری من تحتھم الانھار یحلون فیھا من اساور من ذھب ویلبسون ثیاباً خضراً من سندسٍ واستبرقٍ

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے تو ہم ایسوں کا اجر ضائع نہ کریں گے جو اچھی طرح

متکئین فیھا علی الارائک نعم الثواب ط وحسنت مرتفقا ۞ (سورۂ کہف) — کام کو کرے۔ ایسے لوگوں کے لیے ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان کو وہاں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور سبز رنگ کے کپڑے باریک اور دبیز ریشم کے پہنیں گے۔ وہاں مسہریوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔

کیا ہی اچھا صلہ ہے، اور کیا ہی اچھی جگہ ہے۔ (بیان القرآن)

ایک جگہ حق تعالیٰ کے سامنے مجرمین کی پیشی اور وہاں ان کی بے کسی اور بے بسی کا نقشہ کیا کھینچا ہے، فرماتے ہیں کہ:-

وبرزوا للہ جمیعا فقال الضعفآء للذین استکبروا انا کنا لکم تبعا فھل انتم مغنون عنا من عذاب اللہ من شیء ط قالوا لو ھدنا اللہ لھدینٰکم ط سواء علینا اجزعنا ام صبرنا ما لنا من محیص ۞ (سورۂ ابراہیم) — اور خدا کے سامنے سب پیش ہوں گے پھر چھوٹے درجے کے لوگ بڑے درجے کے لوگوں سے کہیں گے کہ ہم تمہارے تابع تھے تو کیا تم خدا کے عذاب کا کچھ جزو ہم سے ہٹا سکتے ہو۔ وہ کہیں گے کہ اگر اللہ ہم کو راہ بتلاتا تو ہم تم کو بھی راہ بتلا دیتے ہم سب کے حق میں دونوں صورتیں برابر ہیں خواہ ہم پریشان ہوں خواہ ضبط کریں ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

(بیان القرآن)

بعض روایات میں ہے کہ یہ لوگ پانچ سو برس تک جزع فزع کریں گے اور پھر پانچ سو برس تک صبر کریں گے مگر سب بیکار ہوگا۔

قال مقاتل یقولون فی النار تعالوا نجزع فیجزعون خمس مأئۃ عام فلا ینفعھم الجزع فیقولون تعالوا نصبر فیصبرون خمس مأئۃ عام — حضرت مقاتل فرماتے ہیں کہ وہ لوگ دوزخ میں آپس میں کہیں گے کہ آؤ فریاد کریں، پس وہ لوگ پانچسو سال تک جزع فزع کریں گے، لیکن کچھ

فلا ینفعھم الصبر فحینئذ یقولون سواءٌ علینا اجزعنا ام صبرنا مالنا من محیص۔
(منقول از تفسیر مظہری ص۱۳ پ۱۳)

نفع نہ ہوگا، پھر کہیں گے کہ آؤ اب صبر ہی کر کے دیکھیں، چنانچہ پانچسو سال تک صبر کریں گے، مگر صبر سے کچھ نفع نہ ہوگا۔ اس وقت کہیں گے کہ ہم سب کے حق میں دونوں صورتیں برابر ہیں، خواہ ہم پریشان ہوں خواہ ضبط کریں۔ ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

ایک جگہ جنت اور اہل جنت کا ذکر کر کے کس مؤثر عنوان سے اس کی جانب ترغیب اور تشویق فرمائی ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

اِن الابرار لفی نعیم ٥ علی الارائك ینظرون ٥ تعرف فی وجوھھم نضرة النعیم ٥ یسقون من رحیق مختوم ٥ ختمه مسك ط و فی ذلك فلیتنافس المتنافسون ٥ و مزاجه من تسنیم ٥ عینا یشرب بها المقربون ٥

نیک لوگ بڑی آسائش میں ہوں گے مسہریوں پر بیٹھے بہشت کے عجائبات دیکھتے ہوں گے۔ اے مخاطب تو ان کے چہروں سے آسائش کی بشاشت پہچانے گا، اُن کو پینے کے لیے شراب خالص سر بمہر جس پر مشک کی مہر ہوگی ملے گی اور حرص کرنے والوں کو ایسی چیز ہی کی حرص کرنا چاہیے۔ اور اس کی آمیزش تسنیم سے ہوگی یعنی ایک ایسا چشمہ جس سے مقرب بندے پئیں گے۔

انّ الذین اجرموا کانوا من الذین آمنوا یضحکون ٥ و اذا مروا بھم یتغامزون ٥ و اذا انقلبوا الی اھلھم انقلبوا فکھین ٥ و اذا راوھم قالوا ان ھولآء لضالون ٥ وما ارسلوا علیھم حافظین ٥ فالیوم الذین آمنوا من الکفار یضحکون علی

جو لوگ مجرم تھے وہ ایمان والوں سے ہنسا کرتے تھے اور جب ان کے سامنے سے ہو کر گزرتے تھے تو آپس میں آنکھوں سے اشارے کرتے تھے۔ اور جب اپنے گھروں کو جاتے تھے تو دل لگیاں

الارائک ینظرون ہل ثوب	کرتے اور جب ان کو دیکھتے تو یوں کہا
الکفار ما کانوا یفعلون	کرتے کہ یہ لوگ یقیناً غلطی میں ہیں،
(سورۃ التطفیف)	حالانکہ یہ لوگ ان پر نگرانی کرنے والے

کر کے نہیں بھیجے گئے۔ سو آج ایمان والے کافروں پر ہنستے ہوں گے مسہریوں پر (بیٹھے ان کا حال) دیکھ رہے ہوں گے، واقعی کافروں کو ان کے کیے کا خوب بدلہ ملا۔ (بیان القرآن)

ایک جگہ منکرین کی تعذیب کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح پرشوکت انداز میں کلام فرماتے ہیں۔ ارشاد ہو کہ:۔

والفجر ولیال عشر والشفع	قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور
والوتر والیل اذا یسر هل	جفت اور طاق کی اور رات کی جب
فی ذلك قسم لذی حجر الم	وہ چلنے لگے۔ کیوں اس میں عقلمند کے
ترکیف فعل ربك بعاد	واسطے کافی قسم بھی ہو۔ کیا آپکو معلوم
ارم ذات العماد التی لم	نہیں کہ آپ کے پروردگار نے قوم
یخلق مثلها فی البلاد وثمود	عاد یعنی قوم ارم کے ساتھ کیا معاملہ
الذین جابوا الصخر بالواد	کیا جن کے قد و قامت ستون جیسے تھے
وفرعون ذی الاوتاد الذین	جن کے برابر شہروں میں کوئی شخص نہیں
طغوا فی البلاد فاکثروا فیها	پیدا کیا گیا، اور قوم ثمود کے ساتھ جو
الفساد فصب علیهم ربك	وادی القریٰ میں پتھروں کو تراشا کرتے
سوط عذاب ان ربك لبالمرصاد	تھے اور میخوں والے فرعون کے ساتھ
(سورۃ الفجر)	جنھوں نے شہروں میں سر اٹھا رکھا

تھا اور ان میں فساد مچا رکھا تھا، سو آپ کے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا، بیشک آپ کا رب گھات میں ہے۔ (بیان القرآن)

میں یہی آپ سے کہنا چاہتا تھا کہ وعظ اور مذکر کا جو وظیفہ ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم

میں اس کو علیٰ وجہٍ لامزید علیہ بیان فرمادیا ہے، انھیں چیزوں کی کچھ تفصیل حدیث شریف میں آئی ہے، مثلاً قرآن شریف میں حوض کوثر، نہر، باغ، محل وغیرہ کا ذکر ہے۔ اور حدیث میں اس کی وسعت، اس کے دروازے، جنت کے برتنوں اور پیالوں کی تعداد وغیرہ کا بیان ہو جس سے مزید معلومات تو ضرور ہو جاتی ہو۔ لیکن یہ سب مقاصدِ قرآن نہیں ہیں۔ جتنا حصہ بیان سے مقاصد قرآن میں سے تھا وہ پورا پورا قرآن شریف میں مذکور ہو اور یہ اس لیے کہ قرآن کریم شاہی قانون کی حیثیت رکھتا ہو اور بادشاہوں کا کلام مجمل ہی ہوتا ہو۔ اس کی شرح وزراء فرماتے ہیں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ قرآن شریف سے وعظ کہنا اور اس کا وعظ کہنا آج لوگوں نے بالکل چھوڑ ہی دیا ہو۔ حالانکہ سلف صالحین اس کی ایک ایک آیۃ سے متاثر ہوتے تھے اور دوسروں کو متاثر کرتے تھے اور لوگ شب کی تنہائی میں جس چیز سے اپنا غم غلط کرتے تھے وہ تلاوتِ قرآن ہی ہوتی تھی، صحابۂ کرام تہجد کی فرضیت منسوخ ہو جانے کے بعد بھی شب کو اُٹھتے تھے اور ذکر و تلاوت میں مشغول ہوتے تھے۔ اس کے متعلق چند آیتیں سُنئے اور پھر اس کی تفسیر بھی سنیئے:۔

ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

وَتوکل علی العزیز الرّحیم ٥	اور آپ خدائے قادر رحیم پر توکل رکھیے
الّذی یرٰئک حین تقوم ٥ و	جو آپ کو جس وقت آپ کھڑے
تقلبك فی السّٰجدین ٥ اِنّہٗ ھُوَ	ہوتے ہیں اور نمازیوں کے ساتھ آپ
السمیع العلیم ٥	کی نشست و برخاست کو دیکھتا ہو (۵)

خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے۔　　(بیان القرآن)

اس کے تحت صاحب کشاف لکھتے ہیں:۔

(علی العزیز الرحیم) علی الّذی	آپ توکل کیجئے عزیز رحیم پر یعنی اس
یقھر اعداءك بعزّتہ وینصرك	ذات پر جس نے کہ آپ کو عزت دے کر
علیھم برحمتہ۔ ثم اتبع کونہ	آپ کے دشمنوں کو مقہور و مغلوب کر دیا
رحیما علیٰ رسولہ ما ھو من	اور اپنی رحمت سے آپ کی ان کے
اسباب الرحمۃ وَھو ذکر ما	مقابلہ میں نصرت فرمائی، اپنے رسول

كان يفعله فى جوف الليل من قيامه للتهجد وتقلبه فى تصفح احوال المتهجدين من اصحابه يطلع عليهم من حيث لا يشعرون ويستبطن سرائرهم وكيف يعبدون الله وكيف يعملون لآخرتهم كما يحكى انه حين نسخ فرض قيام الليل طاف تلك الليلة ببيوت اصحابه لينظر ما يصنعون لحرصه عليهم وعلى ما يوجد منهم من فعل الطاعات وتكثر الحسنات فوجدها كبيوت الزنابير لما سمع منها من دندنتهم بذكر الله والتلاوة.

(كشاف ص ۱۳۰ ج ۲)

پر اپنا رحیم ہونا بیان کرکے پھر اسباب رحمت کو بیان فرمایا یعنی اس چیز کا ذکر فرمایا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی یعنی تہجد کے لیے آپ کا شب میں قیام فرمانا اور اپنے تہجد پڑھنے والے اصحاب کے تفتیش احوال کے لیے ادھر ادھر آنا جانا تاکہ وہ تو نہ جانیں اور آپ ان کے ظاہری حالات سے ان کے قلبی حالات اور کیفیتِ عبادت معلوم فرمالیں، نیز یہ دیکھیں کہ یہ لوگ خدا اور آخرت کے لیے کیا عمل کرتے ہیں۔ جیسا کہ مروی ہے کہ جبکہ قیام لیل کی فرضیت منسوخ ہوگئی تو اسی شب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کے حجروں اور اُن کے گھروں کا چکر لگایا تاکہ آپ دیکھیں اب یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ (یعنی فرضیت تہجد منسوخ ہونے کی وجہ سے اب اس کو ترک کر دیتے ہیں یا اللہ تعالیٰ سے تعلق اور محبت نیز ذکر اللہ سے اُنس ہو جانے کی وجہ سے اب بھی پڑھتے ہیں) اور یہ اس لیے کہ آپ ان سب پر، ان کے طاعات کرنے پر اور ان کی تکثیر حسنات پر حریص تھے (چاہتے تھے کہ لوگ یہ سب کام زیادہ سے زیادہ کریں) چنانچہ آپ نے ان کے حجروں اور گھروں کو بھڑوں کے چھتوں کے مانند پایا، یعنی یہ کہ ان میں سے آہستہ آہستہ ذکر اللہ اور قرآن کی تلاوت کرنے کی وجہ سے آواز کی گنگناہٹ سنائی دے رہی تھی جو بھڑوں کی بھنبھناہٹ کے مشابہ تھی۔

نیز اس کے آگے کی آیتیں سُنیے ارشاد فرماتے ہیں :-

هل اُنبّئکم علیٰ من تنزل الشیاطین ۝	کیا میں تم کو بتلاؤں کہ کس پر شیاطین
تنزل علیٰ کل افاك اثیم ۝ یلقون	اترا کرتے ہیں، ایسے شخصوں پر اُترا کرتے
السمع واکثرھم کٰذبون ۝ والشعراء یتبعھم	ہیں جو دروغ گفتار بدکردار ہوں اور جو کان
الغاوٗن الم تر انھم فی کل وادٍ یھیمون و	لگاتے ہیں اور بکثرت جھوٹ بولتے
انھم یقولون ما لا یفعلون ۝	ہیں اور شاعروں کی راہ تو بے راہ لوگ
الا الذین آمنوا وعملوا الصٰلحٰت و	چلا کرتے ہیں، اے مخاطب کیا تم کو معلوم
ذکروا اللہ کثیرا وانتصروا من	نہیں کہ وہ ہر میدان میں حیران پھرا کرتے
بعد ما ظلموا ۝ وسیعلم الذین	ہیں اور زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں
ظلموا ایّ منقلب ینقلبون ۝	جو کرتے نہیں، ہاں مگر جو لوگ ایمان
(سورہ شعراء)	لائے اور نیک کام کیے اور انھوں نے

کثرت سے اللہ کا ذکر کیا اور انھوں نے بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہو چکا ہو بدلہ لیا اور عنقریب ان لوگوں کو معلوم ہو جائے گا جنھوں نے ظلم کر رکھا ہو کہ کیسی ..... جگہ ان کو لوٹ کر جانا ہے۔ (بیان القرآن)

اس آخری آیت کے متعلق کشاف میں ہو کہ :-

ومعناها ان الذین ظلموا	معنی اس کے یہ ہیں کہ وہ لوگ جنھوں
یطمعون ان ینفلتوا من	نے ظلم کیا ہو ان کی خواہش تو یہ ہوگی
عذاب اللہ وسیعلمون ان	کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے چھوٹ
لیس لھم وجه من وجوه	جائیں حالانکہ عنقریب وہ لوگ جان
الانفلات وھو النجاة اللھم	لیں گے کہ چھٹکارے اور نجات کے
اجعلنا ممن جعل ھذه الآیة	اسباب میں سے ان کے پاس کوئی
بین عینیه فلم یغفل عنھا۔	بھی سبب نہ ہوگا۔ اے اللہ تو ہمیں

بھی ان لوگوں میں سے کر دے جنھوں نے اس آیۃ کو اس طرح سے اپنی نگاہوں

کے سامنے رکھ لیا ہے کہ ذرا دیر کے لیے بھی اس سے غافل نہیں ہوتے۔

نیز لکھتے ہیں کہ:۔

ختم السورة بآية ناطقة بما	پھر اللہ تعالیٰ نے اس سورہ کو ایسی آیت
لاشئ اهيب منه واهول ولا	پر ختم کیا جس کا مضمون ایسا ہو کہ
انكى لقلوب المتاملين ولا اصدع	کوئی شے اس سے بڑھ کر ہول اور خوف
لاكباد المتدبرين وذلك قوله	کی نہیں ہو اور نہ غور وفکر اور تدبر کرنے
(وسيعلم) وما فيه من الوعيد	والوں کے قلب وجگر کو رنج والم دینے
البليغ وقوله (الذين ظلموا) و	والی، بلکہ اس کو پاش پاش کرنے والی
اطلاقه وقوله (اى منقلب	ہو اور اس مضمون کو سیعلم کے وعید
ينقلبون) وابهامه وقد تلاها	بلیغ اور الذین ظلموا کے اطلاق اور
ابوبكر لعمر رض حين عهد اليه و	ای منقلب ینقلبون کے ابہام کے
كان السلف الصالح يتواعظون	ذریعہ ادا فرمایا گیا ہو اور اسی آیۃ کو حضرت
بها ويتناذرون شدتها.	ابوبکر صدیق رض نے بوقت سپردگی خلافت
(کشاف ص ۱۳۱ ج ۲)	حضرت عمر رض کے روبرو تلاوت فرمایا تھا

اور سلف صالحین کا اس کے ذریعہ سے باہم وعظ فرمانا اور ایک دوسرے کو ڈرانا ہمیشہ سے معمول رہا ہے۔

دیکھئے اس آیۃ کو مصنف رح تمام آیات سے زیادہ اھیب۔ اھول۔ انکی لقلوب المتاملین اور اصدع لاکباد المتدبرین فرما رہے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ اسلاف اسی کا وعظ کہتے تھے اور اس کی شدت سے ایک دوسرے کو ڈراتے تھے، چنانچہ حضرت عمر رض جیسے متقی شخص کو جب حضرت صدیق رض نے خلافت سپرد فرمائی ہو تو اس وقت یہ آیت بھی تلاوت فرمائی ــــ

میں نے بھی جب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب میں دیکھا کہ ایک شاگرد خاص نور اللہ نامی کی اولاً بہت تعریف فرمائی۔ چنانچہ یہ فرمایا ؎

لقد بلوتك فى سلم و فى عتب   فما وجدتك الا خالص الذهب

ولم تسم بنور الله الا لانه عما قليل تكون النور فارتقب

تحقیق میں نے تم کو صلح اور نرمی میں بھی آزمایا اور غصہ اور عتاب میں بھی آزمایا لیکن بہر حال تم کو خالص سونا ہی پایا یعنی ہر امتحان میں تم پورے اُترے۔ اور تمھارا نام جو نور اللہ ہو تو یہ اسی لیے ہو کہ

عنقریب تم نور ہو جاؤ گے (انشاء اللہ) وقت کا انتظار کرو۔

(تفہیمات۔ ج ۱)

اور پھر ان کو اجازت بھی دی۔ لیکن آخر میں یہ بھی فرما دیا کہ۔

فان وفى بالشرط فذلك ظنى به وان نكث فسيعلم الذين ظلموا اى منقلب ينقلبون ○

پس اگر انھوں نے سب شرائط کو پورا کیا تو (سبحان اللہ) اور مجھے ان سے یہی توقع بھی ہے اور اگر (خدانخواستہ) میرے عہد کو توڑا تو عنقریب ان کو معلوم ہو جائے گا جنھوں نے ظلم کر رکھا ہو کہ کیسی جگہ ان کو لوٹ کر جانا ہے۔

(تفہیمات، ج ۱)

تو مجھے تعجب ہوا کہ ایسے شخص کے بارے میں شاہ صاحب یہ کیا فرما رہے ہیں۔ مگر اس روایت کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ سنت صدیقی ہے۔

بہر حال سلف صالحین کے نزدیک جو آیت، اس درجہ اہتمام کی تھی اور وہ حضرات اس کا اتنا اثر لیتے تھے، آج ہم اس پر سے کس طرح گذر جاتے ہیں۔ ہم بھی اس کو پڑھتے ہیں مگر قلب پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا، بس اسی کی ضرورت ہو کہ پہلے حضرات اہل علم آیات قرآنیہ سے خود متاثر ہوں اور اس کی تلاوت کو اپنا وظیفہ بنائیں اس کے بعد جب دوسروں کو سنائیں گے تب ان پر بھی اثر ہوگا۔ مگر اپنی اس خامی کو یہ لوگ محسوس کرتے ہیں اسی لیے جب اپنی تقریر کا دوسروں پر اثر ہوتا نہیں دیکھتے تو اشعار وغیرہ پڑھ کر اس کو مؤثر بنانا چاہتے ہیں۔ ورنہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کے قلب میں قرآن شریف سے اثر قبول کرنے کی استعداد اور اس کا مادّہ پیدا فرما دے تو اس کا آیات قرآنیہ کا سیدھا سادہ پڑھ دینا وعظ سننے والوں میں وہ اثر پیدا کر دے جیسا کہ ہونا چاہیے۔

اسی طرح موت اور ما بعد الموت کے بیان میں ایک حدیث نقل کرتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ اس زمانہ میں ایسے ہی مضامین کے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

(عن ابی سعید الخدری) کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول اذا وضعت الجنازۃ فاحتملھا الرجال علی اعناقھم فان کانت صالحۃ قالت قدمونی وان کانت غیر ذالک قالت لاھلھا یا ویلھا این یذھبون بھا یسمع صوتھا کل شئ الا الانسان ولو سمع الانسان لصعق۔

(رواہ البخاری)

(باب قول المیت وھو علی الجنازۃ قدمونی)

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جب میت کو تابوت میں رکھا جاتا ہے اور لوگ اس کو کاندھوں پر اٹھاکر (قبرستان کی جانب) لے چلتے ہیں تو اگر وہ مردہ صالح ہوا تو کہتا ہے کہ مجھے جلدی لے چلو، اور اگر ایسا نہ ہوا تو اپنے رشتہ داروں سے کہتا ہے، ہلاکت ہو میرے لیے یہ تم لوگ مجھ کو کہاں لیے جا رہے ہو (اور) اس کی اس آواز کو تمام چیزیں سنتی ہیں، سوا انسان کے اور اگر انسان بھی کہیں سُن لے تو بیہوش ہو کر گر جائے۔

(باقی)

اخلاقی انحطاط کا مسئلہ

اور

اُس کا صحیح حل

(از ڈاکٹر محمد آصف صاحب قدوائی، ایم اے، پی، ایچ، ڈی)

مغرب والوں نے یہ دیکھ کر کہ ہماری معاشرت میں مذہبی طرز کی رسمیں، تیوہار، میلے اور اشنان قدم قدم پر بکھرے ہوئے ہیں۔ ہمارے یہاں مذہب کا دھندا کرنے والے سادھوؤں اور فقرار کی تعداد بہت زیادہ ہو جن کی ہم فراخدلی سے کفالت کرتے ہیں۔ نیز ہم مذہب کے نام پر آپس میں لڑنے مرنے کو ہمہ وقت تیار رہتے ہیں، ہماری بابت یہ رائے قائم کرلی کہ ساری دنیا میں ہم سے زیادہ مذہب سے قریب اور کوئی آبادی نہیں ہو۔ اور ہم ان کے غلام تو تھے ہی ان کی اس رائے سے ایسا متاثر ہوئے کہ بلا سوچے سمجھے خود بھی اپنے بارے میں یہی تصور کرنے لگے، حالانکہ مذہبی عقائد و رسوم سے قطع نظر اخلاقی اور عملی اعتبار سے ہمارے پاس بحیثیت مجموعی خود کو ان قوموں سے جن کو ہم مادہ پرست، دہریہ اور نہ جانے کیا کچھ کہتے ہیں افضل سمجھنے کا کوئی حق اس وقت بھی نہ تھا جب ان سے ہمارا پہلے پہل رابطہ قائم ہوا تھا۔ اور اب تو بالکل ہی نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مغرب میں سیرت و تمدن کا تصور محض مادی ہے۔ وہاں کے نظام اخلاق میں مذہب کا کوئی اثر نہیں ہے اور نہ طبیعتوں اور مزاجوں پر اس کا کوئی اقتدار اور نگرانی ہے، مغربی اخلاقیت اصولِ افادیت کے اندر محصور ہے، نیکی اور اخلاق کا معیار تمام تر مادی کامیابی ہے۔ چنانچہ وہاں انہی محاسن کی قدر ہوتی ہے جو سوسائٹی کے مادی مفاد پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں، مثلاً کاروبار میں دیانت،

معاملت میں صفائی، عہد کی پابندی، باہمی تعاون، انسانی ہمدردی، شجاعت، جفاکشی، وقت کی پابندی، فرض شناسی، حب الوطنی اجتماعیت کا احساس قومی مقاصد کی خاطر انفرادی مقاصد کی قربانی وغیرہ وغیرہ اور اور جن نیکیوں میں کوئی واضح مادی نفع نہیں ہے جیسے کہ شرم وحیا، عفت وعصمت، بڑوں کا ادب، چھوٹوں سے شفقت، کنبہ پروری، وسیع القلبی، نرم دلی، محبت والفت، انسانیت کا احترام، غیر اقوام کے حقوق کا پاس وغیرہ، ان کی قیمت میں روز بروز کمی ہوتی چلی جارہی ہو۔ لیکن اس سب کے باوجود جو چیز مغرب کے کردار کو ہمارے کردار پر ممتاز کرتی ہو وہ یہ ہے کہ وہاں کے لوگ جو بھی اصول اپنے اخلاق وعادات کی رہنمائی کے لیے وضع کرتے ہیں اُن کی کم وبیش ایمانداری کے ساتھ پابندی کرتے ہیں۔ اور ہم ایسا نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہاں اخلاق، سیاست اور معاشرت کا قریب قریب ہر عمل کسی نہ کسی اصول کے ماتحت ہوتا ہے اور ہمارے یہاں بے اُصولی ہی سب سے بڑا اصول بن گئی ہو۔

روزمرہ کی زندگی میں سیرت وعادت کے اس بنیادی فرق کے نتائج کو ان مثالوں سے سمجھیے۔

پچھلی جنگ کے زمانے میں لندن میں ایک بار ایسا ہوا کہ راشن کی ایک دوکان سے شکر کا ہفتہ وار کوٹہ تقسیم ہوتے وقت مقررہ مقدار سے کچھ زیادہ شکر لوگوں کو دے دی گئی۔ دو ایک روز بعد جب دوکاندار کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے اخبار میں اشتہار دے دیا کہ ایسی صورت ہوگئی ہے۔ لہٰذا جو لوگ شکر لے گئے ہیں وہ اپنے حصہ سے جو فاضل ہو وہ دوکان کو لوٹا دیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اسّی فیصدی سے کچھ اوپر خریداروں نے اشتہار دیکھتے ہی زائد شکر واپس کردی اور تقریباً پندرہ فی صدی نے دوکاندار کو اطلاع کردی کہ شکر ہم سے خرچ ہوگئی ہو اب واپسی ناممکن ہو اس لیے ہمارے آئندہ ہفتہ کے کوٹہ سے اسے مجرا کرلیا جائے۔ مشکل سے پانچ فیصدی خریداروں نے بددیانتی کی اور فاضل شکر دبالی۔

ہمارے یہاں بھی آج کل بڑے شہروں میں حکومت کی طرف سے کم آمدنی والوں کے لیے سستے غلے کی دوکانیں کھولی گئی ہیں جن سے قانوناً فائدہ وہی اُٹھاسکتے ہیں جن کی آمدنیاں ایک مقررہ حد کے اندر ہیں۔ لیکن روزمرہ کا مشاہدہ ہو کہ اس حد سے باہر آمدنی والے طرح طرح کے فریب کرکے وہاں سے غلہ لیتے رہتے ہیں۔ کم آمدنی والے بھی اپنے گھر والوں کی تعداد زیادہ لکھواتے ہیں اور سرکاری دوکانوں سے غلہ لے کر بلا جھجک بازار میں زیادہ داموں پر فروخت کردیتے ہیں۔

ہمارے جن جاننے والوں کو لندن میں رہنے کا اتفاق ہوا وہ بتاتے ہیں کہ وہاں کا ایک عام دستور یہ ہو کہ رات کو مکان کے دروازے بند کرتے وقت لوگ دودھ کی خالی بوتلیں اور پیسے صدر دروازے کے باہر رکھ دیتے ہیں۔ صبح دودھ والا آتا ہو۔ خالی بوتلیں اور پیسے اٹھالیتا ہو اور اُن کی جگہ دودھ کی بھری بوتلیں اور مکھن وغیرہ رکھ کر چلا آتا ہے۔ نہ کوئی دودھ مکھن چراتا ہے نہ پیسے، اسی طرح وہاں اخبار عموماً بچے بیچتے ہیں، ایک اخبار فروش بچہ سڑک پر جگہ جگہ اخبار رکھ دیتا ہے۔ لوگ آتے ہیں۔ اخبار اُٹھاتے ہیں اس کے دام اسی جگہ رکھ دیتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، بچہ گھوم گھوم کر پیسے اُٹھاتا رہتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ پیسے حساب سے کم نکلیں۔

اس کے برعکس گذشتہ یوم آزادی کے موقع پر چند کانگریسیوں نے پٹیالہ میں تجربہ کے طور پر گھریلو صنعت کی ایک دوکان کھولی اور اس میں پانچسو کا مال رکھ کر ہر سامان پر اس کی قیمت درج کردی۔ اور دام ڈالنے کے لیے ایک بکس رکھ دیا، دوکان پر کوئی دوکاندار نہیں تھا، خریدار آتے، سامان اُٹھاتے اور دام بکس میں ڈال کر چلے جاتے۔ لوگوں کا کہنا ہو کہ خریدار بیشتر پڑھے لکھے اور خوشحال قسم کے آدمی نظر آتے تھے۔ لیکن بعد میں جب سارا سامان فروخت ہوگیا اور بکس کھولا گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں بجائے پانچسو کے صرف پینتالیس روپیوں کے پیسے تھے۔

قومی اخلاق و کردار کی بلندی کا ایک عجیب وغریب واقعہ ابھی چند مہینے ہوئے امریکا کی مشہور میگزین "ریڈرس ڈائجسٹ" میں شائع ہوا ہے جو ہر شخص کے پڑھنے کے لائق ہے۔ وہاں کے ایک جیل کے اخبار میں ایک روز یہ اشتہار شائع ہوا کہ "کینسر کی ریسرچ کے سلسلہ میں والینٹروں کی ضرورت ہے جن کے خون میں کینسر کے زندہ جراثیم انجکشن کے ذریعہ پہونچائے جائیں گے، اور اس کے اثرات مابعد پر غور کیا جائے گا۔ لیکن جو قیدی اس کام کیلئے اپنے کو پیش کرینگے ان کی میعاد قید میں اس کے عوض میں کوئی کمی نہ کی جائے گی۔" کینسر جیسے ہولناک مرض کے زندہ جراثیم اپنے جسم میں داخل کروالینا اور وہ بھی معاوضہ کی کسی امید کے بغیر ایک ادل درجہ کا دشوار کام تھا۔ اس لیے اس مہم کے نگراں ڈاکٹر کو جیل خانے سے کام بھر کے رضاکار ملنے کی بہت کم توقع تھی۔ لیکن جب وہ اس عمل کے لیے جیل پہونچا تو اُسے یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ دس بیس نہیں

پورے ایک سو نئیس قیدی موت کی اس خوفناک دعوت کو قبول کرنے کے لیے صف باندھے کھڑے تھے۔ ان کی عمریں تیس اور ستاون سال کے درمیان تھیں اور ان میں نصف کے قریب شادی شدہ تھے۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ وہ کیوں اس خطرناک تجربہ پر آمادہ ہوئے تو بعض نے جواب دیا کہ ان کے فلاں عزیز اس موذی مرض کا شکار ہو چکے ہیں اس لیے وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ اسکے ازالہ کے لیے اپنی قربانی پیش کریں، بعض نے کینسر کے مریضوں کو تڑپتے دیکھا تھا چنانچہ اعلان پڑھ کر انھوں نے سوچا کہ جو خدمت اس سلسلہ میں ان سے ہو سکتی ہے اس سے گریز نہ کریں۔

ان قوموں کے جرائم پیشہ طبقوں میں بھی انسانی ہمدردی، ایثار و قربانی کا اتنا قوی جذبہ موجود ہے۔ اور ایک ہم ہیں کہ ہمارے اعلیٰ سے اعلیٰ معاشرتی سطح کے لوگ دوسرے کی تکلیف سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تو دو چار ٹھنڈی سانسیں لے لیں یا زبان سے ہمدردی کے چند کلمات کہہ دیے اور سمجھ لیا کہ اس بارے میں ان کو جو کچھ کرنا تھا کر چکے۔ اسی لکھنؤ میں ایسے واقعات بھی دیکھنے میں آئے ہیں کہ سڑک پر ایک شدید حادثہ ہو گیا، ایک شخص کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور سر میں بھی بہت چوٹ آئی۔ قریب ہی ایک صاحب رہتے تھے جن کا موٹر ان کے مکان کے سامنے کھڑا تھا کچھ لوگوں نے ان سے درخواست کی کہ اپنے ڈرائیور سے کہہ دیں کہ موٹر میں زخمی شخص کو ہسپتال پہونچا دے۔ اور انھوں نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ زخمی کے خون سے کار کی سیٹ خراب ہو جائے گی۔ حد یہ ہے کہ ایک بار ایک سنیما گھر کے سامنے کچھ بدمعاشوں نے ایک شخص کے پیٹ میں چھرا بھونک دیا۔ ایک صاحب جو اپنے پیشہ میں شہر میں بڑی نمایاں حیثیت رکھتے تھے ان کا مکان ذرا دور پر تھا۔ محلہ کے کچھ لوگ جن میں ایک وکیل صاحب بھی شامل تھے دوڑے ہوئے ان کے پاس گئے کہ پولیس کو فون کر دیں۔ انھوں نے سنتے ہی دروازے بند کر لیے۔ لوگوں نے لاکھ احتجاج کیا مگر انھوں نے اس کی مطلق پرواہ نہ کی۔ صبح کو وکیل صاحب نے ان سے ان کے غیر معقول رویّہ کی شکایت کی تو انھوں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا کہ "خواہ مخواہ ایک کی ہمدردی کر کے دوسرے کی مخالفت مول لینے سے فائدہ ؟"

یہاں یہ ساری تفصیل اس لیے کی گئی ہے کہ ہم اپنے عادات و اخلاق کی موجودہ حالت کو صحیح روشنی میں دیکھ سکیں، کیونکہ اپنی کوتاہیوں کو دیانتداری کے ساتھ محسوس کیے بغیر اصلاح کی

اُمید کرنا ایک عمل بے سود ہے، ہمارے موجودہ نظامِ اخلاق کی اصل بنا خود غرضی ہے، ہمارا فکری محور اُصول و اخلاق نہیں ذاتی منفعت اور پست جذبات کی تشفی ہے۔ ہماری قوم کے ہر طبقہ میں نفع اندوزی اور موقع پرستی کی ذہنیت پیدا ہوگئی ہے، سارے ملک میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو۔ وہ سرکاری دفاتر اور کچہریاں ہوں یا صنعتی کارخانے اور تجارت کی منڈیاں' تعلیمی ادارے ہوں یا تفریح گاہیں۔ سب پر ایک المناک اخلاقی انحطاط چھایا ہوا ہے، اور ستم یہ ہو کہ ہم زبان سے اس کا اقرار بھی کرتے ہیں۔ لیکن دل میں اس کے خلاف عملی جدوجہد کرنے کا کوئی جذبہ نہیں پاتے، گویا کہ یہ نقائص کسی دوسری دنیا کی باتیں ہیں اور ہم کسی دوسری دنیا میں رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا اخلاقی شعور اتنا مضمحل ہوگیا ہے کہ ہم میں نہ تو اپنے بارے میں اپنی ذمہ داری محسوس کرنے کا مادّہ باقی رہا ہے اور نہ معاشرہ کے بارے میں ہم میں ہر شخص ایک معاشرتی خلا میں رہتا ہے۔ جیسا کہ مولانا سید ابوالحسن علی نے 'الفرقان' کی جولائی کی اشاعت میں لکھا تھا "آج ملک میں جس پیمانے پر رشوت خوری، دولت ستانی، اقربا نوازی، ذخیرہ اندوزی، مجرمانہ گراں فروشی اور غبن اور بد دیانتی ہے وہ اس دور سے پہلے کبھی نہ تھی" لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایسا آپ ہی آپ ہو گیا ہے۔ اور اس میں خطا صرف انہی کی ہے جو یہ ذلیل اور مجرمانہ حرکتیں کرتے ہیں اور باقی لوگ بری الذمہ ہیں؟ کیا ان جرموں میں پوری سوسائٹی شریک نہیں ہے جس کے تعاون اور چشم پوشی کے بغیر ان کا کم از کم اس درجہ میں عام ہو جانا محال تھا؟ سرکاری محکموں میں قدم قدم پر رشوت چلتی ہے ——— یہ صحیح ہے، لیکن اس افسوسناک صورت حال کی ذمہ داری کیا محض انہی پر ہے جو رشوت لیتے ہیں اور رشوت دینے والوں کا اس میں برابر کا حصہ نہیں ہے؟ رشوت لینے والے عموماً معمولی حیثیت کے لوگ ہوتے ہیں مگر رشوت دینے والوں میں بڑی تعداد ایسوں کی ہوتی ہے جو حیثیت میں ان سے بہتر ہوتے ہیں، سوسائٹی میں زیادہ عزت رکھتے ہیں اور اپنی برادری میں تن کر چلتے ہیں۔ کیا ان سے یہ توقع کرنا کہ معاملات میں معمولی دیانتداری سے کام لیں کوئی ایسی بعید بات ہے۔ مزید برآں یہ برابر دیکھنے میں آ رہا ہو کہ معمولی معمولی تنخواہ پانے والے لوگ جب اپنی ملازمتوں سے ریٹائر ہوتے ہیں تو بڑے بڑے مکانات بنواتے ہیں، یا کسی اور شکل میں جائدادیں خرید لیتے ہیں اور ان کی آمدنی سے بڑی

فراغت سے بسر کرتے ہیں اور اس فراغت سے متاثر ہو کر سوسائٹی بغیر یہ سوچے کہ آخر اتنی دولت ان کے پاس کہاں سے آگئی ان کو زیادہ عزت بھی دے دیتی ہے اور معاشرے میں ان کیلئے مختلف آسانیاں بھی پیدا کر دیتی ہے، یا ایک شخص غبن کرتا ہے اور سزایاب بھی ہوتا ہے۔ مگر جب وہ قید کی میعاد پوری کر کے جیل سے لوٹتا ہے تو نہایت اطمینان سے اسی جگہ آ کر رہنے لگتا ہے جہاں اس واقعہ سے قبل رہا کرتا تھا۔ اسے اپنے پرانے پڑوسیوں سے آنکھیں چار کرنے میں ذرا بھی حجاب نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے کہ پڑوسی اس کے شرمناک فعل کو بھول جانے کے لیے اس سے زیادہ مستعد ہوتے ہیں۔ اس کی برادری میں جو عزت اسے پہلے حاصل تھی وہ پھر حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اگر اس نے قانون کو دھوکہ دے کر غبن کیا ہوا روپیہ محفوظ بھی کر لیا ہے تو اس عزت میں اسی کی مناسبت سے اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔ اس طرح سوسائٹی کی قیادت دن بدن اس طبقہ کے ہاتھوں میں آتی جاتی ہے جسے اپنی سماجی بد اعمالیوں کے باعث حقیقتاً ذلیل ہونا چاہیے تھا۔ اور جن لوگوں کو اپنے کردار کی مضبوطی اور دیانتداری کی بنا پر سوسائٹی میں نمونہ و مثال کی حیثیت حاصل ہونا چاہیئے وہ اخلاقی قدروں کے مسخ ہو جانے کے سبب سے گمنام ہوتے چلے جاتے ہیں، کیونکہ عزت و وقعت کا معیار ہمارے موجود ماحول میں اخلاق و کردار نہیں بلکہ مال و دولت ہو گیا ہے۔ اس سے دولت کی ہوس بڑھتی ہے اور لوگوں کو ترغیب ملتی ہے کہ اسے ہر ممکن طریقہ سے پورا کریں۔

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کا مزاج ابتدا سے کچھ اس قسم کا رہا ہے کہ یہاں زندگی کے حقائق کو متوازن طور پر اُبھرنے کے صحیح مواقع جیسے کہ چاہیے تھے نہیں ملے۔ یہاں شروع سے اصل زور عقیدہ، علم اور اصول پر صرف کیا گیا اور عمل کو ایک کم درجہ کی چیز سمجھ کر اس کی طرف سے کافی غفلت برتی گئی۔ عملی اخلاقیت کو مذہبی نظام میں کوئی موثر جگہ نہیں مل سکی۔ ذہن اور جسم یا اصول اور عمل میں مطابقت پیدا کرنے پر زیادہ اصرار نہیں کیا گیا، گیان اور دھیان ہی کو نجات کا راستہ بتایا گیا اور یہ تعلیم دی گئی کہ علم صحیح ہی نجات کاری ہے۔ اس کے نتیجہ میں اصول و عمل کی عدم مطابقت رفتہ رفتہ ہماری عادت سی بن گئی، چنانچہ آج بھی یہی ہے کہ ہم اصول تو اعلیٰ سے اعلیٰ بناتے ہیں۔ لیکن عمل کے وقت ان کو بڑی آسانی سے بھول جاتے ہیں، اور اُصول و عمل اور قول و فعل کا یہ بُعد ہمارے اندر کوئی خلش بھی نہیں پیدا کرتا ہے۔

ہم یہ نہیں سوچتے ہیں کہ اصولوں کی خوبی بس اسی میں ہے کہ ان پر پورا پورا عمل کیا جائے ورنہ خالی اصول ہم کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہونچا سکتے ہیں۔ کیا کوئی مریض محض کسی اصولِ طبّی کو صحیح مان کر بیماریوں سے نجات پا سکتا ہے۔ جب تک کہ وہ ان اُصولوں پر عمل بھی نہ کرے؟

اب اس بُعد کو مٹانے کی شدید ضرورت ہے۔ کیونکہ یہی ہماری اخلاقی ابتری کی اصلی جڑ ہے۔ اس کو مٹائے بغیر ملک کی اصلاح و ترقی کا کوئی منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ کام صرف وعظ و تلقین سے تکمیل کو نہیں پہونچ سکتا ہے، اور نہ محض قانون سازی کے ذریعہ ہی یہ مہم سر کی جا سکتی ہے۔ رشوت ستانی، خیانت، غبن وغیرہ کے خلاف ملک میں قانونوں کی کمی نہیں ہے، رشوت کے خلاف تو حکومت کا ایک مستقل محکمہ بھی قائم ہے۔ مگر جب ہم اس کی کارگزاریوں پر غور کرتے ہیں تو یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ حکومت آخر اس پر پبلک کا روپیہ کیوں ضائع کرتی ہے۔ اس کے لیے سارے ملک میں ویسا ہی زبردست اخلاقی شعور پیدا کرنا ہو گا جیسا کہ سیاسی شعور گاندھی جی اور کانگریس نے انگریزی سامراج کے خلاف پیدا کیا تھا۔ جن لوگوں نے دنیا کی مختلف اصلاحی تحریکوں کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ شعور خوفِ خدا کو معاشرت میں اپنا رہنما بنائے بغیر نہیں پیدا کیا جا سکتا ہے، کیا ہمارے رہنمایانِ قوم اپنے نظریاتی تعصبات سے الگ ہو کر اس نکتہ پر غور کریں گے؟۔

دین اور اقتدار

(از جناب ڈاکٹر احمد حسین کمال بھوپالی)

"اسباب زوال اُمت" قریباً سو ڈیڑھ سو سال سے اہلِ قلم حضرات کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ اس موضوع پر مسلمانوں کے علاوہ مستشرقین یورپ نے بھی طویل بحثیں کی ہیں اور شاید جدید طرز کی تحریروں کا آغاز بھی ان ہی کے قلموں سے ہوا ہے، میرا گمان ہے کہ اس صدی کے جدید تعلیمیافتہ مسلمانوں میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جو کسی نہ کسی طرح ان کے نقطۂ نگاہ سے متاثر نہ ہوا ہو، وہ نہایت تفصیل و دلسوزی سے مسلمانوں کی مادی کمزوریوں کو زوال اسلام کا بنیادی سبب قرار دیتے ہیں۔ ان کمزوریوں کو وہ دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، ایک یہ کہ مسلمانوں کا وہ مملکتی نظام قائم نہیں رہ سکا جو انھوں نے صدر اول میں قائم کیا تھا۔ اور وہ مادی اقتدار سے محروم ہوگئے۔ دوسرے یہ کہ ان کے اندر وہ تنظیمی طاقت باقی نہیں رہی، جو انھیں ایک دوسرے سے مربوط کیے ہوئے تھی۔

وہ یہ بات درحقیقت اس بنا پر کہتے ہیں کہ اُن کے نزدیک اسلام کی اولین کامیابی بھی اس اقتدار کی بدولت تھی جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہونچ کر ایک ریاست کی صورت میں قائم کیا تھا، وہ جناب رسول اللہ کی مکّی زندگی کو، نعوذ باللہ ناکامی کا دور بتاتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ اسلام سیاسی قوت و اقتدار کے ذریعہ قائم ہوا اور پھیلا۔ اور اُس کے زوال کا سبب بھی یہی سیاسی قوت و اقتدار کا زوال ہے، کیونکہ وہ اسلام کو رسول اللہ کی شخصی اور ذاتی تحریک کہتے ہیں جو آپ کے اولوالعزمانہ مقاصد کے تحت وجود میں آئی تھی، اس لیے وہ نہایت بے باکی سے سیاسی قوت اور ریاستی اقتدار کو تمام اسلامی کامیابیوں کا واحد سبب قرار دیتے ہیں۔

اگرچہ رسول اللہ کے مشن کی یہ تعبیر اور آپ کی مکی و مدنی زندگی کی اس طرح کی تقسیم بمقام رسالت و نبوت کے قطعی منافی اور سیرت رسول و تاریخ اسلام کی نہایت غلط تشریح ہے، تاہم اُن کے نہایت تفصیلی اور بظاہر غیر جانبدارانہ تجزیوں نے اور اس صدی کے مادی افکار و نظریات اور جدید فلسفۂ سیاست و اجتماع نے مسلمان مفکرین کی بھی ایک بڑی کھیپ کو کم و بیش اسی قسم کے انداز فکر کا قائل کر دیا ہے۔ وہ بھی مادّی تصورات پر مبنی تنظیمات و تحریکات کو اسلام اور مسلمانوں کے شاندار مستقبل کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں اور صاف صاف کہتے ہیں کہ اقتدار نہ ہونے کی وجہ سے مکی زندگی میں اشاعت اسلام کی رفتار سست رہی اور جب مدینہ میں بقول اُن کے سب سے پہلے ایک ریاست اور حکومت قائم کر لی گئی تو اسلام نہایت تیزی کے ساتھ پھیلتا چلا گیا ــــــ قطع نظر اس کے کہ یہ بات حقیقت سے کس قدر مختلف ہے، اور اسلام کے "دین اللہ" ہونے کو کس قدر اشتباہ میں ڈال دینے والی ہے۔ اسلام کے بارے میں اُن کے طرز فکر کو مستشرقین کے نظریات سے بہت ہی قریب کر دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس قدر یہ بات سچی ہو کہ "جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی" اس سے بھی زیادہ یہ بات صحیح ہے کہ اگر دین کو سیاسی اقتدار کے تحت کر دیا جائے تو پھر نہ صرف دین بے اثر ہو کر رہ جائے گا، مسخ کر دیا جائے گا بلکہ سیاست دانوں اور اقتدار رکھنے والوں کے ہاتھوں میں اُن کے اغراض کا آلہ کار بن کر رہ جائے گا، ماضی اور حال کی تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں، اور اگر ایسے اقتدار کے تحت کبھی کسی جگہ صحیح اسلام قائم ہو بھی گیا تو وہ خود اپنی قوت سے نہیں بلکہ اقتدار کے وسیلے سے قائم رہے گا اور اقتدار کے گرتے ہی خود بھی ختم ہو جائے گا۔

مقام شکر ہے کہ سلف صالحین، صدر اول کے بعد سے ہی اس نازک صورت حال کی طرف سے غافل نہیں رہے ــــــ دین و اقتدار کا تعلق نہایت نازک ہو۔ اس میں ذرا سی افراط و تفریط بے شمار مفاسد کا دروازہ کھول سکتی ہے، یہ ضروری نہیں کہ دین کو اقتدار کا ذریعہ بالارادہ بنایا جائے، بلکہ عین ممکن ہے کہ نہایت نیک نیتی سے ایک شخص دین کی خدمت کے لیے ہی ایسا کرے لیکن اس کی یہ خواہش بھی بجائے خود ایک فتنہ بن سکتی ہو۔ کیونکہ اقتدار کو سامنے رکھ

لینے کے بعد وہ اور اس کا گروہ اپنے سے جائز اختلاف رکھنے والوں کو بھی شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھے گا ـــــ وہ ہرگز گوارا نہیں کرے گا کہ اس کے دائرۂ کار میں کوئی دوسرا شخص مداخلت کرے، خواہ وہ مداخلت کتنی ہی ضروری، جائز اور دین کے لیے ہو ـــــ وہ تمام مسائل کو اپنے نقطۂ نگاہ سے حل کرے گا اور اسی نقطۂ نگاہ کو دینی نقطۂ نگاہ بتائے گا ـــــ وہ دوسروں کا مشورہ اپنی رائے کی حمایت کے لیے تو قبول کرلے گا لیکن اصلاح و تردید کے لیے نہیں ـــــ وحی و رسالت کے انقطاع کے بعد اب اس کی عقل و بصیرت ہی فیصلہ کن ہوگی اور اگرچہ وہ نبوت کا مدعی نہ ہو لیکن مقام نبوت کی رعایتوں اور خصوصیات سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہے گا۔ اور حقیقت یہ ہو کہ اس کا احساس فرض (اگر شعوری طور پر نہیں تو) غیر شعوری طور پر ہی احساس برتری میں تبدیل ہوئے بغیر نہیں رہے گا۔

اور یہ صورت حال نہ صرف اُمت کی اجتماعیت کے لیے مضر ہو جائے گی بلکہ مسلمانوں کے فرض عبدیت کا رُخ بھی پھیر سکتی ہے۔ چنانچہ اسی لیے ایک عظیم تربیت یافتہ جماعت، ایک صاحب کردار معاشرہ اور ایک مضبوط و بالاتر شورائیت کے بغیر، دین و اقتدار کے باہمی تعلق کو موجودہ دور میں متوازن رکھنا ناممکن ہو اور جب تک ایسا نہیں ہو جاتا یہ بات دینی مصلحت اور دینی حکمت کے عین مطابق ہو کہ اقتدار اور دین کے درمیان واضح امتیاز قائم رکھا جائے

اقتدار خالص دینی ہو اور دین کے لیے ہو تو یقیناً وہ مقاصد پورے ہو سکتے ہیں جن کی طرف قرآن و سنت نے رہنمائی فرمائی ہے۔ ورنہ بصورت دیگر دین کے نام سے بے دینی کا وہ فساد و طوفان اُٹھے گا جو تاریخ پر نظر رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں، خوارج و معتزلہ کی بے راہ رویاں دین کو اقتدار سے باندھ دینے کی ہی کارفرمائیاں تھیں اور دنیا کی بہت سی دیگر بڑی بڑی ناانصافیاں بھی مذہب کے نام سے عمل میں آئیں اور اس وقت عمل میں آئیں جبکہ مذہب کے نام سے اشخاص و جماعتوں نے اپنا اقتدار قائم کیا ہوا تھا ـــــ اسلام کو بھی اس صورت حال کی ذمہ داری میں شامل کر دینا بجز نادانی کے اور کیا ہے؟

جب تک خالص و کامل دینی اقتدار کا ماحول و موقعہ نہیں میسر آجاتا ہو اور جب تک اس قسم کا موقعہ و ماحول بنا لینے کی کوششیں بار آور نہیں ہو جاتی ہیں اس وقت تک

دین اور اقتدار کے مابین امتیاز رکھتے ہوئے، اصلاحِ احوال اور دعوت و ہدایت کی کوششیں ضروری اور قابلِ قدر ہیں بلکہ یہ کوششیں ہی اس ماحول اور موقع کو پیدا کرنے والی ہیں جس میں، اسلام کی اصولی اور معیاری حکومت قائم ہو سکتی ہو اور جس سے دنیا کا ہر سعید و صالح انسان اتفاق کرے گا۔

اسلام کی برتری اور عظمت کا راز اس کی عظیم روحانی قوتوں میں ہے جن سے صرفِ نظر کرنے کی تعلیم اول اول یورپ کے مستشرقین نے دی۔ انھوں نے اسلام پر جو کچھ بھی لکھا مادی نقطۂ نگاہ سے لکھا، اور غلط مفروضات و قیاسات پر لکھا، جن لوگوں نے ان ذرائع سے اسلام کا مطالعہ کیا اور متاثر ہوئے، انھوں نے بھی اسلام کی ایسی ہی تعبیرات کو صحیح تعبیرات سمجھا مستشرقین نے، قبل اسلام عرب کے حالات کو اس طریقہ پر پیش کیا ہے کہ گویا اسلامی انقلاب کو بروئے کار لانے کے لیے تمام وسائل و اسباب موجود تھے، صرف ان کو استعمال کرنے والوں کی ضرورت تھی، اور یہ ضرورت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے رفقا (رضوان اللہ علیہم اجمعین) نے پوری فرما دی۔ اسی طرح انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی و مدنی زندگی کو، غیر سیاسی و سیاسی حیثیتوں میں تقسیم کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اسلام کی کامیابی کا تمام تر دارومدار حصولِ اقتدار پر ہے۔ اور اسی طرح وہ خلافتِ راشدہ کے دورِ حکومت پر بھی اپنی فرضی اور قیاسی آراء کے حاشیے چڑھاتے جاتے ہیں، ایک معترض و مخالف کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک دوست اور مورخ کی حیثیت سے، اس سے ان کا مقصد دراصل یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلام کو دین کے بجائے محض ایک وقتی تحریک بتائیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول اللہ کے بجائے، ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا سیاسی و عسکری مدبر و مفکر قرار دیں، اور اس طرح پورے رسالت و خلافتِ راشدہ کے دور کو صرف چند صاحبِ فکر اولوالعزم انسانوں کا دَور ٹھہرا دیں جن کی شخصی کوششوں سے وقت کی ایک سیاسی اور تہذیبی تاریخ وجود میں آگئی اور اس نے دین و مذہب کی صورت اختیار کر لی۔ اب اگر ان ہی افکار کو نئے اسلوب و انداز پر احیاءِ اسلام کی بنیاد بنایا جائے تو یقیناً اول تو اسلام کی روحانی حیثیت کا انکار کرنا پڑے گا اور اس کی کامیابی کا دارومدار تمام تر

ریاست واقتدار پر رکھنا ہوگا۔ اور یہ ریاست واقتدار موجودہ دور کے اُن طریقوں سے ہی حاصل ہو سکے گا جسے یورپ کے فلسفۂ ریاست واجتماع نے مرتب کیا ہے۔ یہ فلسفۂ سیاست اول تو ایک چیز کو صرف نظری حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اس نظریہ سے ایک طبقہ کے جذبات کو سیراب کرتا ہے اور شدت کے ساتھ اصول پرستی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ لیکن جب عمل واقدام کا موقعہ آتا ہے تو وہ سابقہ نظریت واصول پرستی سے سخت بیزار ہونے لگتا ہے۔

اب اسکے سامنے صرف حصول اقتدار و قیام اقتدار کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم رہ جاتا ہے۔ اور پہلا مقصد و نظریہ اس کی توضیح و تاویل کا کھلونا بن جاتا ہے۔ ماضی قریب کی یورپ کی چند نظری تحریکات کا یہ حشر سب کے سامنے ہے۔ اس قسم کے طور طریقوں میں جو ردعمل کی کیفیت پائی جاتی ہے جب تک اس سے انھیں پاک وصاف نہ کر لیا جائے اس وقت تک اسلامی مقاصد کے لیے انھیں استعمال کرنا اسلام کیلئے کم اور استعمال کرنے والے گروہ کیلئے زیادہ فائدہ بخش اور دین کو روحانیت سے جدا کر کے مادیت کے تابع کر دینے کے مترادف ہے۔

مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

از، محمد منظور نعمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اب سے ایک سال پہلے میں پاکستان گیا تھا، اس وقت وہاں مختلف صحبتوں میں یہ بات سننے میں آئی تھی کہ دیوبند کے علمی اور دینی سلسلہ سے تلمذ اور عقیدت کی نسبت رکھنے والے یہاں کے حضرات علماء میں ایک نیا اختلاف مسئلہ حیات النبی کے بارہ میں پیدا ہو گیا ہے لیکن جن لوگوں سے میں نے اس بارے میں وہاں کچھ سنا، وہ یا تو اصل حقیقت سے واقف نہ تھے یا اپنے علم و فہم کی خاص سطح کی وجہ سے نقطۂ اختلاف کو صحیح طور پر سمجھے ہوئے نہ تھے اس لئے ان کے بیانوں سے میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ اس اختلاف کی اصل حقیقت کیا ہے ـــــ اور جن حضرات اہل علم کا اس نزاع کے فریق کے طور پر نام لیا جاتا تھا، اتفاق سے ان میں سے کسی سے بھی اس سفر میں ملاقات کی نوبت نہیں آئی، اس لئے اپنے ان بزرگوں اور دوستوں سے حسن ظن کی بنا پر میرا یہی خیال رہا کہ یہ اختلاف غالباً نزاع لفظی کے قبیل سے ہوگا۔

پھر پاکستان سے میری واپسی کے بعد مختلف اوقات میں اس سلسلہ میں میرے پاس کچھ خطوط بھی آتے رہے، اور ان سے معلوم ہوتا رہا کہ یہ کش مکش برابر بڑھ رہی ہے اور ایک نئے تفرقہ کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔

اس سلسلے کے بعض خطوط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض لوگ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "آب حیات" کا حوالہ دے کر جماعت دیوبند کا مسلک یہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم پر موت طبعی وارد ہی نہیں ہوئی، بلکہ آپ جس حیات کے ساتھ اس دنیا میں رونق افروز تھے، اسی حیات کے ساتھ قبر مبارک میں منتقل کر دیے گئے۔۔۔۔۔۔ ان میں سے بعض خطوط میں یہ بھی تھا کہ بعض دوسرے اہل علم اس مسئلہ کی وجہ سے علماء دیوبند پر سخت طعن و تشنیع کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور مجھ سے اصرار کیا گیا تھا کہ اس بارہ میں جو کچھ میں صحیح سمجھتا ہوں اس کو "الفرقان" میں لکھوں، پھر گزشتہ مہینے (اکتوبر میں) رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی پاکستان سے تشریف لائے تو انھوں نے بھی بتلایا کہ یہ اختلاف و نزاع وہاں ایک اچھا خاصا فتنہ بنتا جا رہا ہے اور اس کے اور بڑھنے کا خطرہ ہے اور اسی بنا پر انھوں نے مجھے مشورہ دیا بلکہ اصرار سے فرمایا کہ اس بارہ میں کچھ لکھنا ضروری ہے۔۔۔ الغرض یہی باتیں ان سطور کے لکھنے کی محرک ہوئی ہیں۔

میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اس کی حیثیت ہرگز کسی فیصلے اور محاکمے کی نہیں ہے، مجھے تو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ واقعہ میں اصل نقطۂ اختلاف کیا ہے۔۔۔ بہرحال جو کچھ اس مسئلے میں میں سمجھے ہوئے ہوں اور جو کچھ میرے نزدیک حق ہے اور ہمارے اکابر کا مسلک ہے وہ میں عرض کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔ پہلے چند مسلّمہ دینی اور تاریخی حقیقتیں ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) سب جانتے اور مانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترسٹھ سال (۴۰ سال نبوت سے پہلے اور ۲۳ سال نبوت کے بعد) اس عالم ناسوت میں قیام فرما کر ہجرت سے ٹھیک دس سال بعد ربیع الاول کے مہینے میں "کل من علیہا فان" اور "کل نفس ذائقۃ الموت" کے عام قانون کے مطابق داعی اجل کو لبیک کہا، اور رفیق اعلیٰ سے واصل ہو گئے۔ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وبارک وسلم)

(۲) بہت سے صحابہ کرام پر اس صدمہ کا ایسا اثر پڑا کہ ہوش و حواس بجا نہ رہے، حضرت عمرؓ کا حال تو اس وقت یہ ہو گیا کہ قسم کھا کھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے انکار کرتے تھے، اور بعض روایات میں ہے کہ اس وقت اس معاملے میں ان کی شدت کا یہ عالم تھا کہ کہتے تھے کہ جو کوئی کہے گا کہ حضور کی وفات ہو گئی میں تلوار سے اس کا سر قلم کر دوں گا۔

(۳) جب صدیق اکبرؓ اپنی قیام گاہ سُنح سے تشریف لائے (جہاں حضور کی اجازت سے وہ کچھ دیر پہلے چلے گئے تھے) اور آپ نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ لوگوں کے سامنے اس طرح کی باتیں کر رہے ہیں

تو اپنے کو سنبھال کے اور سب لوگوں کو جمع کر کے مسجد نبوی میں خطبہ دیا جس میں پوری صدیقی شان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا واشگاف اعلان کرتے ہوئے آپ نے صحابہ کرام سے فرمایا:۔

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّداً	تم میں سے جو کوئی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)
فَإِنَّ مُحَمَّداً قَدْ مَاتَ	کی عبادت کرتا تھا اسے معلوم ہونا چاہیئے
وَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ اللّٰهَ	کہ وہ تو رحلت کر گئے اور جو کوئی اللہ تعالیٰ
فَإِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ	کی عبادت کرتا تھا، تو بیشک اللہ تعالیٰ
	زندہ ہے اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔

اور اس کے بعد آپ نے قرآن مجید کی یہ آیت بھی تلاوت فرمائی:۔

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ	اور محمد تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک
مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ	رسول ہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے رسول
مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَى	گزر چکے ہیں۔ کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے
أَعْقَابِكُمْ، وَمَنْ يَنْقَلِبْ	یا وہ دشمنوں کے ہاتھوں شہید ہو جائیں
عَلَى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللّٰهَ	تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جو کوئی
شَيْئاً وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشَّاكِرِينَ	الٹے پاؤں پھرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کا کچھ
	نہیں بگاڑ سکے گا اور شکر کرنے والے بندوں کو
(آل عمران)	اللہ تعالیٰ یقیناً اچھا بدلہ دے گا۔

اور بعض روایات میں ہے کہ صدیق اکبرؓ نے اس موقعہ پر حضور کی وفات سے متعلق قرآن مجید کی چند اور آیتیں بھی تلاوت فرمائیں۔

بہر حال آپ کے اس خطبہ کے بعد صحابہ کرام اس مسئلہ میں یکسو ہو گئے، حضرت عمرؓ نے بھی اپنی غلطی محسوس کر لی اور اگلے دن مجمع عام میں اس کا اعلان بھی کر دیا۔

(۴) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال ہی کی بنیاد پر خلافت و امامت کا مسئلہ اٹھا اور آخر کار سقیفۂ بنی ساعدہ میں ابوبکر صدیقؓ کو آپ کا خلیفہ منتخب کیا گیا اور بیعت ہوئی۔

(۵) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے پہنے ہوئے کپڑوں ہی میں غسل دیا گیا، پھر

کفن پہنایا گیا۔

(۶) پھر صحابۂ کرام نے ایک خاص طریقہ اور ترتیب سے آپ کی نماز جنازہ پڑھی، یعنی اس طرح کہ چند چند صحابۂ کرام (بعض روایات کے مطابق دس دس) کی جماعتیں حجرۂ مبارک میں داخل ہوتی تھیں اور بغیر کسی کو امام بنائے نماز جنازہ پڑھ کر باہر آجاتی تھیں۔ اسی طرح تمام صحابۂ کرام نے آپ کی نماز جنازہ پڑھی (اور ابن سعد وغیرہ کی ایک روایت کے مطابق حضرت علی مرتضیٰ رضؓ نے کسی کو امام نہ بنانے کی وجہ یہ بتائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے زندگی میں امام تھے اسی طرح بعد وفات بھی امام ہیں "ھو إمامنا حیاً ومیتاً") ——— بہرحال یہ مسلّم ہے کہ آپ کی نماز جنازہ صحابۂ کرام نے بغیر کسی امام کے پڑھی۔

(۷) آپ کا وصال دوشنبہ کے دن چاشت کے وقت ہوا تھا، اس دن اس کے بعد کی رات اور سہ شنبہ کا پورا دن، جنازہ اسی طرح حجرۂ شریف میں رکھا رہا اور لوگوں کی ٹولیاں باری باری نماز جنازہ ادا کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ شبِ چہار شنبہ میں آپ کو اسی حجرۂ مقدسہ میں دفن کر دیا گیا۔

یہ سب وہ مسلم دینی اور تاریخی حقائق و واقعات ہیں جو حدیث و سیر کی کتابوں میں عام طور سے مذکور ہیں، اسی لئے میں نے کسی کتاب کا حوالہ دینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی ——— مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کسی بات سے بھی کسی صحیح العقیدہ صاحب علم کو انکار یا اختلاف نہ ہوگا۔

(۸) اسی طرح کسی صاحب علم پر یہ بھی مخفی نہیں ہو سکتا کہ قرآن مجید میں ان بندگان خدا کو جو راہِ حق میں قتل کئے گئے اور دشمنان حق نے بظاہر جن کو موت کے گھاٹ اتار دیا "احیاء" یعنی زندہ کہا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ "وہ اپنے رب کے پاس شاداں و فرحاں ہیں اور ان کو وہاں انواع و اقسام کا رزق اور طرح طرح کی نعمتیں مل رہی ہیں۔

(۹) اور یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام بہرحال ان سے افضل ہیں اور بدرجہا افضل ہیں، یقیناً ان کا انجام اور مقام ان شہداء کرام سے خوشتر اور بلندہی ہونا چاہیئے اور اسی لئے اس دنیا سے جانے کے بعد ان کی حیات، شہداء کی حیات سے اعلیٰ اور اقویٰ ہی ہونی چاہیئے۔[۱]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۱۰) اور نص قرآنی کے اسی "اشارہ" اور اسی "اقتضاء" کی وضاحت ان احادیث سے ہوتی ہے جو کتب حدیث میں انبیاء علیہم السلام کی حیات کے بارہ میں روایت کی گئی ہیں — جہاں تک اس ناچیز کو علم ہے ان حدیثوں کو سب سے پہلے امام بیہقی نے ایک مستقل رسالے میں جمع کیا ہے پھر اس رسالے کے قریب قریب پورے مواد کو ساتویں اور آٹھویں صدی کے جلیل القدر محدث و فقیہ شیخ تقی الدین سبکی نے اپنی کتاب "شفاء السقام" میں نقل کر دیا ہے — اور متاخرین حفاظ حدیث میں سے علامہ سیوطی نے بھی اس مسئلہ پر مستقل رسالہ لکھا ہے جس میں اس موضوع سے متعلق حسب عادت ہر طرح کی روایات کو جمع کر دیا ہے۔ زرقانی شرح مواہب میں بھی یہ حدیثیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

ان سب احادیث اور روایات سے مجموعی طور پر یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ جس طرح اس دنیا سے جانے کے بعد شہداء کو ایک خاص طرح کی حیات حاصل ہو جاتی ہے، جس میں وہ دوسرے مومنین سے ممتاز ہیں اور جس کی بنا پر قرآن مجید میں انکو "اَحیاء" کہا گیا ہے، اسی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام کو ایک خاص الخاص حیات اس دنیا سے منتقل ہونے کے بعد حاصل ہو جاتی ہے اور وہ تمام انبیاء علیہم السلام کو اور خاص کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔[1]

---

[1] علامہ ابن القیم نے قرطبی سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ان کے شیخ احمد بن عمر و حیات انبیاء کے مسئلہ کی ان حدیثوں کی طرف اشارہ کر کے فرماتے تھے کہ "یحصل من جملتہا القطع بان موت الانبیاء انما ھو راجع الی ان غیبوا عنا بحیث لا ندرکھم" (کتاب الروح صفحہ ۵۴)

اس سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ مسئلہ میں اس طرح خیال کرنے والوں میں صرف زرقانی، ابن حجر ہیثمی، سیوطی، اور شیخ عبدالحق دہلوی جیسے حضرات ہی نہیں ہیں بلکہ اس (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰) [1] حافظ ابن القیم نے "کتاب الروح" میں قرطبی کے حوالہ سے ان کے شیخ احمد بن عمر و کا ایک قول نقل کیا ہو جس کی ۲-۳ سطریں یہ ہیں۔ ان الشھداء بعد قتلھم وموتھم احیاء عند ربھم یرزقون فرحین، مستبشرین وھذہ صفۃ الاحیاء فی الدنیا واذا کان ھذا فی الشھداء کان الانبیاء بذالک احق واولی"۔

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا (جس سے غالباً کسی صاحبِ علم کو بھی اختلاف نہ ہوگا) اس سے لازمی نتیجہ کے طور پر دو باتیں ثابت ہو جاتی ہیں۔

ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ناسوتی کا جو سلسلہ پیدائش سے لے کر ۶۳ سال کی عمر شریف تک جاری رہا تھا وہ تو وفات کے دن ختم ہو گیا اور "کل نفس ذائقة الموت" کے قانون عام کے مطابق آپ پر وہ کیفیت وارد ہوئی اور آپ اس منزل سے گذرے جس کی تعبیر موت کے لفظ سے کی جاتی ہے ــــ آپ کی اس رحلت کو صحابہ کرام نے موت ہی کہا اور موت ہی سمجھا، اور حضرت عمرؓ وغیرہ کو (کسی وقتی غلط فہمی یا غلبۂ حال کی وجہ سے) اس کے ماننے میں ابتداءً جو تامل اور تردد تھا وہ بھی حضرت ابوبکرؓ کے خطبہ کے بعد ختم ہو گیا اور آخر الامر تمام صحابہ کرام کا اس پر اجماع ہو گیا کہ آپ کی ناسوتی حیات کا خاتمہ ہو چکا اور آپ پر موت

(بقیہ حاشیہ صـ۲) فہرست میں ان سے بہت پہلے ابوعبداللہ قرطبی اور شیخ احمد بن عمرو کے نام بھی اس فہرست میں ہیں ــــ لیکن ان حضرات کی ایسی عبارتوں کا یہ مطلب قرار دینا کہ انبیاء علیہم السلام پر موت وارد ہی نہیں ہوئی اور ان کو اپنی قبروں میں بعینہٖ دنیا والی ناسوتی حیات حاصل ہے، ایسا سمجھنے والوں کی خوش فہمی کے علاوہ ان بزرگوں پر تہمت بھی ہے ــ اسی طرح ہمارے بعض بزرگوں کی تحریروں میں مثلاً "التصدیقات" میں انبیاء علیہم السلام کی قبر والی حیات کو جو "حیوٰۃً دنیویۃً" کہا گیا ہے تو اس کا بھی ہرگز یہ مطلب نہیں ہے۔ اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ وہ حیات دنیا کی سی ہے یعنی مع الجسد ہے، صرف برزخی روحانی نہیں ہے جو تمام مومنین کو بھی حاصل ہے جن کے اجسام مٹی ہو چکے ہیں۔" التصدیقات" کے اردو ترجمہ ہی میں غور کرنے سے یہ مطلب خود واضح ہو جاتا ہے ــــ علاوہ ازیں ان بزرگوں کی ایسی عبارتوں کا یہ مطلب بیان کرنا اور ان کا یہ مسلک بتانا کہ انبیاء علیہم السلام پر موت وارد ہی نہیں ہوئی اور قبروں میں وہ بعینہٖ دنیا والی ناسوتی حیات کے ساتھ موجود ہیں، صریحاً ان پر یہ الزام لگانا ہے کہ اس مسئلہ میں ان کی رائے قرآن و حدیث کے صریح نصوص و بینات اور اجماع صحابہ اور اجماع امت کے خلاف ہے ــــ میں نہیں یقین کرتا کہ ہمارے علماء میں سے کسی نے ایسی لغویات کہی ہو۔ سبحانک ھٰذا بہتان عظیم ہ

وارد ہو چکی اور قرآن حکیم کی بات " اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ " پوری ہو گئی۔ اور پھر اسی بنا پر آپ کو آخری غسل دیا گیا، موت کے بعد والا لباس یعنی کفن پہنایا گیا، قبر میں دفن کیا گیا (حالانکہ اگر کسی آدمی میں ناسوتی حیات کا شائبہ بلکہ شبہ بھی ہو اور اس کی موت کا پورا یقین نہ ہو چکا ہو تو اس کو دفن کر دینا شدید ترین شقاوت اور قطعاً حرام ہے۔ اور کسی پیغمبر کے ساتھ شقاوت و ظلم کا یہ معاملہ کرنا تو صرف حرام ہی نہیں بلکہ سخت ترین اور خبیث ترین کفر ہے۔

اور دوسری بات مذکورہ بالا دینی اور تاریخی حقائق و واقعات سے یہ معلوم ہوئی کہ صحابۂ کرام نے آپ کی وفات کو بالکل دوسرے آدمیوں کی سی موت نہیں سمجھا بلکہ اس کی نوعیت عام انسانوں سے کچھ مختلف سمجھی، اسی لئے آپ کو آخری غسل پہنے ہوئے کپڑوں میں دیا گیا، کرتا تک جسم اطہر سے نہیں اتارا گیا، نماز جنازہ بھی عام اموات مسلمین کی طرح نہیں پڑھی گئی بلکہ دوسرے طریقہ سے پڑھی گئی (بلکہ بعض روایات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ معروف نماز جنازہ کے بجائے صرف صلوٰۃ و سلام عرض کیا گیا اور آپکے احسانات کے اعتراف کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے آپکے لئے بس دعا کی گئی) اور اس سے بڑھ کر یہ کہ مُردوں کے دفن کرنے کے بارہ میں تاخیر نہ کرنے کا شریعت کا جو عام تاکیدی حکم ہے اسکے بالکل برخلاف قریباً پورے دو دن گزر جانے کے بعد دفن کیا گیا اور اس غیر معمولی تاخیر میں کوئی ہرج نہیں سمجھا گیا اور کوئی اندیشہ نہیں محسوس کیا گیا، اور کسی ایک صحابی نے بھی اس معاملہ میں جلدی کرنے کا تقاضا نہیں کیا ـــــــ پھر آپ کی ایک خاص ہدایت کے مطابق آپ کی زندگی کے عزیز مسکن یعنی حضرت صدیقہ کے اُس حجرہ ہی کو آپ کا مدفن اور آپ کی دائمی آرام گاہ بنا دیا گیا اور آپ اسی میں دفن کئے گئے۔

اسی طرح آپ کی ایک ہدایت کے مطابق آپ کی املاک میں ترکہ اور وراثت کا عام قانون جاری نہیں کیا گیا بلکہ آپ کی حیات طیبہ میں ان کا جو مصرف اور نظام تھا وہی بدستور قائم رکھا گیا، اور وہ خلافت کی تولیت میں رہیں۔

اسی طرح آپ کی ازواج مطہرات کا یہ حق سمجھا گیا کہ وہ اپنے مسکونہ حجروں کو تا زیست اپنے استعمال میں رکھیں اور رسول اللہ صلعم کے املاک سے اپنا نفقہ تاحیات حاصل کرتی رہیں جیسا کہ حضور کے سامنے ان کو یہ دونوں حق حاصل تھے، حالانکہ کسی مسلمان کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ بیوی کے

یہ حقوق صرف عدت کی مختصر مدت تک رہتے ہیں۔

ان سب استثنائی اور اختصاصی احکام و معاملات سے یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی نوعیت دوسرے تمام لوگوں کی موت سے بہت کچھ مختلف ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ اتنی بات سے ہمارے حلقے کے کسی صاحب علم کو اختلاف ہوگا۔ اسی طرح بعض احادیث سے جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیز دیگر انبیاء علیہم السلام کو اپنے مدفنوں میں ایک خاص قسم کی حیات حاصل ہے (جو اس عالم کے مناسب ہے اور بعض حیثیات سے دنیا والی ناسوتی[1] حیات سے بھی اعلیٰ و اقویٰ ہے) غالباً اس سے بھی کسی صاحب علم کو اختلاف نہ ہوگا ——— ہاں! اس کے آگے موت و حیات کی نوعیت کی تعیین اور تفصیلات میں کچھ اختلاف ہو سکتا ہے اور اسکی گنجائش بھی ہے اور ایسے اختلافات خود اہل سنت میں بلکہ اہل سنت کے ایک ایک حلقے میں بھی ہمیشہ رہے ہیں، ان کو اہمیت دینا اور ان باتوں کا باعث تفرقہ بنانا بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔

اس کے بعد چند کلمات میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ "آب حیات" کے مضمون کے متعلق بھی عرض کرتا ہوں۔

جن حضرات نے حضرت نانوتویؒ کی تصنیفات اور مکاتیب کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ آپ کی اکثر تحریریں اردو زبان میں ہونے کے باوجود مضامین کے لحاظ سے اتنی مشکل اور ادق ہیں کہ آجکل کے ہمارے اصحاب درس علماء میں بھی شاذ و نادر ہی ایسے نکلیں گے جو انکو پوری طرح سمجھ سکیں، اور اس ناچیز کے خیال میں آپ کی تصنیفات میں سب سے مشکل اور دقیق ترین یہی "آب حیات" ہے ——— درس نظامی کے جملہ فنون میں سب سے مشکل منطق، فلسفہ اور کلام سمجھے جاتے اور ان فنون کی درسی کتابوں میں سب سے مشکل ہمارے درسی حلقوں میں قاضی، حمد اللہ، صدرا اور خیالی کو سمجھا جاتا ہے۔ اس عاجز نے یہ کتابیں پڑھی بھی ہیں اور ان میں جو مشکل ترین ہیں وہ مدرسی کے زمانہ میں پڑھائی بھی ہیں، میں خود اپنا تجربہ عرض کرتا ہوں کہ ان میں سے کسی کتاب کے سمجھنے میں مجھے اتنی مشکل پیش نہیں آئی، جتنی کہ "آب حیات" کے سمجھنے میں پیش آئی تھی ——— میں نے آب حیات کا مطالعہ پہلی دفعہ اپنی عربی طالبعلمی کے آخری دور میں اس وقت کیا تھا، جب کہ

---

[1] اس تحریر میں "حیات ناسوتی" سے ہر جگہ میری مراد وہ حیات ہے جس کے لوازم اور خصائص اس متغیر مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہیں، اور اسی کا سلسلہ ختم ہو جانے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست وہ استفادہ کوئی نہیں کر سکتا جو آپ کی اس ناسوتی حیات میں ہر شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کر سکتا ہے۔

منطق و فلسفہ اور کلام کی سب درسی کتابیں میں پڑھ چکا تھا، اور ان فنون کے وہ مباحث مجھے خوب مستحضر تھے جن کے استحضار کے بغیر آب حیات کو نہیں سمجھا جا سکتا، لیکن مجھے خوب یاد ہے کہ اس وقت بھی میرا احساس یہی تھا کہ میں نے ساری عمر میں جو کتابیں دیکھی یا پڑھی ہیں ان میں سب سے زیادہ مشکل اور صعب الفہم یہی کتاب ہے۔ اپنے اس ذاتی تجربہ کی بنا پر مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ ہمارے حلقہ کے علماء میں بھی آب حیات کو پوری طرح سمجھنے والے ہند و پاک کے طول و عرض میں اب گنتی کے چند ہی ہوں گے[1] اور بغیر کسی تکلف اور انکسار کے عرض کرتا ہوں کہ

---

[1] مجھے اپنی اس رائے پر مزید اطمینان اپنے مکرم و محترم مولانا قاری محمد طیب صاحب زید مجدہم سے ابھی حال میں یہ سن کر ہوا ــــ کہ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحبؒ سابق مہتمم دار العلوم دیوبند نے اپنے اخیر دور حیات میں ایک دن ان سے فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں تم کو آب حیات پڑھا دوں، لیکن مجھے اس کا مطالعہ کرنا ضروری ہوگا اس لیے تم اس کا ایک نسخہ لا کر میرے سرہانے رکھ دو میں رات کو مطالعہ کر لیا کروں گا ــــ قاری صاحب کا بیان ہے کہ میں نے نسخہ لا کر رکھ دیا۔ لیکن پھر یا تو مطالعہ کا وقت نہیں مل سکا یا کوئی اور وجہ پیش آگئی کہ اسباق پڑھنے پڑھانے کی نوبت نہ آسکی۔ یہاں تک کہ حضرت مولانا مرحوم کا وقت موعود آگیا اور یہ کام رہ ہی گیا۔

اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آب حیات کس قسم کی کتاب ہے کہ مولانا محمد طیب صاحب جیسے ذکی عالم و فاضل کو بھی اس کے پڑھنے کی ضرورت تھی اور حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب مرحوم جیسے راسخ العلم اس کے پڑھانے کے لیے پہلے مطالعہ کر لینا ضروری سمجھتے تھے ــــ پھر جب کل ۷ر نومبر کو اس ناچیز نے اپنی یہ تحریر سہارن پور میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہم العالی کو سنائی تو دو واقعے حضرت ممدوح نے بھی اس کی تائید میں سنائے۔

ایک یہ کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا جب وصال ہوا تو حضرت شیخ الہندؒ نے منطق و فلسفہ کی کتابیں پڑھانی چھوڑ دیں۔ حالاں کہ پہلے پڑھایا کرتے تھے، جب بہت اصرار کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ان کتابوں کو ہم صرف اس لیے پڑھایا کرتے تھے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی باتیں سمجھنے میں ان سے مدد ملتی تھی، اب جب وہی نہیں ہے تو کیوں ہم خواہ مخواہ ان کتابوں پر مغز ماریں۔

دوسرا واقعہ اسی سلسلہ کا یہ سنایا کہ حضرت شیخ الہندؒ کے تدریسی دور میں بار بار یہ طے ہوا اور اس کا

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اب میں بھی ان میں سے نہیں ہوں، کیونکہ اس کے سمجھنے کے لیے منطق و فلسفہ اور کلام کے جو مباحث مستحضر ہونے چاہئیں وہ اب مجھے مستحضر نہیں رہے ہیں، تاہم چونکہ ایک دفعہ اس کو سمجھ کر مطالعہ کیا تھا، اس لیے اس کا حاصل و مدعا اور مرکزی مضمون الحمدللہ اب تک ذہن میں ہے۔ پھر ان سطروں کے لکھنے سے پہلے بھی میں نے اس پوری کتاب کا ایک سرسری مطالعہ حال ہی میں کیا ہے۔ اور میں علیٰ وجہ البصیرت یہ کہنے کا اپنے کو حقدار سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات و ممات کے بارہ میں اس میں کوئی بات بھی جمہور امت اور اہل سنت کے ان تمام دینی اور تاریخی مسلمات اور معتقدات کے خلاف نہیں ہے، جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اور حیات بعد الممات کی خاص نوعیت کی تحقیق اور تعیین میں حضرت نانوتویؒ نے اپنے خاص طرز پر ایک نہایت دقیق و عمیق کلام کیا ہے (اور اسی کے ساتھ دجال کی حیات و ممات کی خاص نوعیت کے بارے میں بھی اسی طرز پر کچھ کلام کیا ہے) اور بلاشبہ یہ تحقیق اتنی دقیق ہے کہ عوام کے علاوہ اوساط کے فہم سے بھی بالاتر ہے ـــــ پس اس کو عوامی مسئلہ بنانا از قبیل اتباع متشابہات اور غریب عوام کو فتنے میں ڈالنا ہے، وہ بیچارے اصل حقیقت کو تو سمجھ نہ سکیں گے، پھر یا تو کچھ کا کچھ سمجھ کے اندھی عقیدت میں اسی کو اپنا عقیدہ بنا کے گمراہ ہوں گے یا حضرت نانوتویؒ پر گمراہی اور بد اعتقادی کے فتوے لگائیں گے۔ ہمارے علماء کرام کو للہ سوچنا چاہیے کہ اس سارے ضلال و فساد کا ذمہ دار عند اللہ کون ہوگا۔

دیوبندیت کیا ہے؟ آخر میں چند کلمات "دیوبندی مسلک و مشرب" کے بارہ میں بھی

بقیہ حاشیہ صفحہ (۳۵)

منصوبہ ہے کہ حضرت کے خاص تلامذہ حضرت مدنیؒ اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ وغیرہ (جب کہ ان حضرات کے پڑھانے کا زمانہ تھا) حضرت نانوتویؒ کی تصانیف حضرت شیخ الہندؒ سے سبقاً سبقاً پڑھیں۔ لیکن اس کی نوبت غالباً نہیں آئی۔

بہرحال جن حضرات نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشکل تصانیف آب حیات وغیرہ خود نہیں دیکھی ہیں وہ ان واقعات سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کس قسم کی کتابیں ہیں، اور اردو خواں عوام تو عوام آج کل علماء میں بھی کتنے ہیں جو ان کو سمجھ سکتے ہیں۔" ۱۲

عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

ظاہر ہے کہ ہمارے اکابر و اساتذہ حضرات علماء دیوبند کا کوئی الگ اعتقادی یا فقہی مکتب فکر نہیں ہے، عقائد میں ہم اہل سنت و جماعت کے طریقہ پر، اور فقہ میں حنفی ہیں۔ البتہ احناف اہل سنت میں ہمارے اکابر کا ایک خاص رنگ ہے۔ بس اسی کی تعبیر "دیوبندیت" سے کی جاتی ہے اور وہ رنگ مندرجہ ذیل خصوصیات کے اجتماع سے پیدا ہوتا ہے۔

(۱) فقہ حنفی پر اطمینان، اور اس کے مطابق فتویٰ اور عمل کے ساتھ حدیث و سنت سے خاص تعلق و شغف، نیز دوسرے آئمہ مجتہدین اور اسی طرح حضرات محدثین کا ادب و احترام اور دل میں ان سب کی عظمت و محبت۔

(۲) اس فقہی اور علمی خصوصیت کے ساتھ حضرات صوفیائے کرام کی "نسبت" کی طلب و تحصیل، یا کم از کم دل میں ان کی عظمت و محبت۔

(۳) اس سب کے ساتھ اتباع سنت، اور شرک و بدعت سے نفرت اور اس معاملہ میں ایک خاص صلابت و حمیت

(۴) اور پھر اس سب کے ساتھ اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ اور اس راہ میں مر مٹنے کا شوق۔

پس "دیوبندیت" دراصل اس خاص رنگ کا عنوان ہے جو ان عناصر اربعہ کے اجتماع سے پیدا ہوتا ہے، ہمارے اس سلسلہ کے اکابر و اساطین مثلاً حضرت نانوتویؒ و حضرت گنگوہیؒ (نور اللہ مرقدہم) اور ان کے خواص تلامذہ اور مسترشدین ان چیزوں کی جامعیت ہی میں ممتاز تھے۔ ورنہ یہ خصوصیات جدا جدا دوسرے حلقوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔

میں یہ بھی عرض کر دوں کہ "دیوبندیت" کی یہ تحقیق اور اس کا یہ تجزیہ ایک صحبت میں اس عاجز نے مولانا عبید اللہ سندھیؒ مرحوم سے سنا تھا، اس کے بعد سے جتنا جتنا اس پر غور کیا اتنا ہی اس کو صحیح اور واقعہ کے مطابق پایا۔

بہرحال طریق اہل سنت اور فقہ حنفی سے وابستگی کے بعد یہ ہے وہ خاص رنگ یا خاص مشرب، جس کا عنوان دیوبندیت ہے۔ پس جو ہم میں سے جتنا اس رنگ میں کامل یا ناقص ہے اتنا ہی وہ "دیوبندیت" میں کامل یا ناقص ہے۔

اور سب سے پہلے میں اقرار و اعلان کرتا ہوں کہ میں اپنے حال اور عمل کے لحاظ سے بہت ہی ناقص قسم کا دیوبندی ہوں لیکن الحمد للہ میں نے اصل دیوبندیوں کو دیکھا ہے اور انکے طریقہ اور انکے حال پر جینے اور مرنے کی آرزو رکھتا ہوں۔ احب الصالحین ولست منھم لعل اللہ یرزقنی صلاحاً

آخر میں میں پھر عرض کرتا ہوں کہ بخدا نہ مجھے ابتک کسی ذریعے سے معلوم ہو سکا ہے اور نہ میں خود غور کر کے سمجھ سکا ہوں کہ اس مسئلہ میں ہمارے علماء میں اصل نقطۂ اختلاف کیا ہے ۔ میں خود جس طرح اس مسئلہ کو سمجھے ہوئے ہوں اور جو میرے نزدیک حق ہے اور ہمارے اکابر کا مسلک ہے وہ میں نے ان صفحات میں اپنے امکان کی حد تک صاف اور منقح طور سے پیش کر دینے کی کوشش کی ہے۔

یہ ناچیز دو تین دن سے مخدومنا حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری دامت برکاتہم کی خدمت میں رائے پور آیا ہوا ہے۔ اپنی اس تحریر کی تکمیل بھی یہیں کی ہے، اور حضرت ممدوح اور مخدومی حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ العالی شیخ الحدیث مظاہر علوم کو یہ تحریر میں نے لفظ بہ لفظ سنا بھی دی ہے۔ اور میرے اور پوری جماعت کے ان دونوں بزرگوں نے اسکی تصویب بھی فرمائی ہے ــــ ہمارے جن بزرگوں اور دوستوں کی رائے اس بارہ میں کوئی اختلاف پیدا ہو گیا ہے پورے ادب و احترام اور اخلاص کے ساتھ ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ جو کچھ ناچیز نے اس تحریر میں عرض کیا ہے اگر وہ صرف اتنے پر متفق ہوں تو اختلاف ختم ہو جانا چاہیے، اور اس سے آگے کے کسی نکتہ میں اگر بالفرض اختلاف ہو بھی تو اس کو ہرگز وجہ تفریق نہیں بننا چاہیے، بلکہ اعلان ہو جانا چاہیے کہ یہ اختلاف اس قسم کا علمی اختلاف ہے جو ایک حلقہ کے اہل علم میں بھی ہو سکتا ہے، خود ہمارے اساتذہ اور مشائخ میں بعض مسائل کی تحقیق میں اختلاف ہوا ہے اور رہا ہے، اگر ضرورت ہو تو یہ عاجز اس کی بیسیوں مثالیں گنا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے، کہ ہم غیر ضروری بنیادوں پر تفریق کا باعث نہ بنیں۔

یہ تحریر مکمل کر لینے کے بعد میں دیوبند بھی حاضر ہوا، اور وہاں استاذی حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب صدر المدرسین دار العلوم دیوبند کو بھی میں نے یہ تحریر سنائی۔ حضرت ممدوح نے آبحیات کے مضمون پر بڑی بصیرت افروز روشنی ڈالی جو بلاشبہ آپ ہی کا حق ہے۔

(باقی صفحہ ۵۳ پر)

جادۂ حبیب

ایک دعوتی سفر کے تاثرات و کوائف

از، مولانا محمد اشرف خاں صاحب ایم اے۔ لکچرر اسلامیہ کالج پشاور

(۷)

بقیہ ۱۰ محرم ۱۳۸۷ھ

ہمارا سفر اب دریائے دجلہ میں تھا، دریا کا پاٹ کافی چوڑا ہے۔ ایک کنارے پر عراق کی سرزمین ہے، دوسری طرف ایران کا ملک، گویا اس وقت ہم دو ملکوں کے درمیان چل رہے ہیں۔ بینھما برزخ لا یبغیان' گاہے ایران کی ہوا آجاتی ہے، اور پھر رگ جاں کے تار پارسی زمزموں سے چھڑ جاتی ہے۔

گہے شعر عراقی را بخوانم گہے آتش بزرر رومی بجانم

ایران کی سرزمین اگر ہمیں رومی جامی، عطار و سنائی، حافظ و سعدی کے نغموں کے سوا کچھ بھی نہ دیتی، تو اس کا یہ کم احسان نہ تھا، لیکن یہاں تو محدثین، مفسرین، فقہاء و صوفیہ حکما و علما ہر طبقہ اپنے علوم و حکمت کے خزانوں سے امت کا دامن بھرتا رہا ہے ——— یہاں تک کہ تعصب کی ایک آندھی اٹھتی ہے اور ایران کی مردم خیز زمین عقیم ہو کر رہ جاتی ہے۔

نہ اٹھا پھر کوئی رومی، عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایراں وہی تبریز ہے ساقی

اور عراق تو ہمارے 'باپ' ابراہیم خلیلؑ کا مولد و منشاء اور ان کی دعوت کا پہلا

ٹھکانا ہے۔ یہ ابراہیم علیہ السلام کی توحید خالص کا ہی وہ لاینفک جذبۂ قلبی ہے جو گورے کالے سرخ و زرد، عربی، عجمی، ہندی، حبشی، امریکی، روسی، افریقی، مختلف رنگ، مختلف نسل مختلف طبائع کے لوگوں کو ایک ایسے رنگ میں رنگ دیتا ہے کہ ہر ایک وجد میں آکر پکار اٹھتا ہے:

ابی الاسلام لا اب سواہ اذا افتخروا بقیس وتمیم

ملت مسلمہ کی تاسیس ان اعلیٰ اور ربانی اقدار پر کی گئی ہے کہ ان حقیقتوں کو ماننے والے ایک رابطہ اخوت میں خود بخود منسلک ہو جاتے ہیں۔ "باپ ابراہیم" نے جس ملت کا نام "مسلمین" رکھا تھا اسکے تمام افراد اپنے روحانی باپ کے بیٹے بن کر ایسی مضبوط 'اخوۃ' کی عروۃ الوثقیٰ میں لازماً بندھ جاتے ہیں جو نسلی اخوت سے بھی قوی اور دائمی رہے۔ سلامتی ہو امت حنیفی کے مؤسس اول، پر اور درود وسلام ہو ملت اسلامیہ کے اس داعی کامل پر جو سلسلہ انبیاء و مرسلین کے ختم پر آیا۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمتوں اور برکات کے لامتناہی خزانے پورے عالم کے لئے ہر زمانے کے واسطے بکھیر گیا۔ جس کی ملت وطنی، ....، نسلی، ملکی قبائلی محدود حد بندیوں میں سما نہ سکی، اور اس نے پوری انسانیت کو ایک ایسے معاشرے اور عالمگیر برادری کی (آلہی حقائق کے ایمان ویقین سے) تشکیل کی دعوت دی۔ جو انسانیت کا سر امتیاز اور آدمیت کا اوج کمال ہے۔

انوکھا سب سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

جہاز آبادان کی سمت رواں ہے۔ دریا کے دونوں کناروں پر کھجور کے گھنے اور پکی کھجوروں سے لدے ہوئے درخت دور تک پھیلے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ کراچی کے بعد آج خشکی کے اتنا قریب ہوئے ہیں۔ انتہائی شاداب علاقہ ہے، اتنے گھنے باغات زرخیز زمین ہی میں لگ سکتے ہیں، درختوں کے جھنڈوں کے درمیان کہیں کہیں سبزہ اور گھاس کا خوشنما منظر ہے۔ کچھ کچھ فاصلہ پر دیہاتی صاف ستھرے کچے، ایک منزلہ مکانات نظر آجاتے ہیں۔ صبح سے ۱۱ بجے تک یہی منظر قائم رہا۔ مجھے تو سرینگر یاد آ گیا۔ جہلم کے کنارے مکانات ہاؤس بوٹ اور ڈل کے مناظر ایک ایک کر کے ۱۵ سال بعد نگاہوں میں پھر گئے۔ وہ اپنا حسن رکھتا ہے اور اس کا جمال اپنا ہے۔ خالق کائنات خود عین جمال ہے۔ اور حسن جمال

کو پسند کرتا ہے۔ جہاں مبدء فیاض کے خزانۂ ازلی نے اپنی صنعت کاریوں پر جمالی زیبائش کا چھینٹا زیادہ دے دیا ہے۔ انسان کی جمال پسند طبیعت کی لغزش کا سبب بن گیا ہے۔ ابتلاء میں کامیابی یہی ہے کہ "جمال" کے "ظلال وعکوس" میں الجھا نہ جائے، بلکہ اُسے دیکھے جو دیکھا نہیں جاسکتا۔ اس میں کیف پائے، جو کیف وکمیت سے پاک ہو۔ وراء الوراء کے حسن وجمال میں جو لذت وسکون طمانیت وکیف ہے اس کا ادراک بھی مجھ جیسے ذہنوں کے لئے مشکل ہے، لیکن کیا کیا جائے "قلب" کا اندرون بغیر اس حجلہ نشین ازل کے تصور ودھیان کے اطمینان نہیں پاتا۔

قرب بے غیب نماز عاشقاں | فی صلوٰۃ دائمونم آرزو ست
قلب را تاباں کن از انوار ماہ | زانکہ از آسیب ذنب شد دل سیاہ

کہہ یہ رہا تھا کہ دجلہ حسین ہے۔ دجلہ کے دونوں کنارے جمیل ہیں، اور نہ معلوم کیا کیا حسن وجمال کھجور کے ہر ہر پتے، درختوں کی ایک ایک ٹہنی، مکانوں کی ایک ایک اینٹ، غرض ہر چیز سے پھوٹ رہا ہے۔

جہاز رواں دواں ہے، ہم بھی چل رہے ہیں، دل ودماغ بھی اپنے سفر میں مشغول ہے، لیجئے آبادان کی شہرہ آفاق تیل کی (Refinery) (تیل صاف کرنے کا کارخانہ) شروع ہو گئی۔ مغربی تاجروں کی شاطرانہ سیاست اور آبادان کے واقعات آبادان سے کم مشہور نہیں، مجھے اس کا تذکرہ کرنا مقصود نہیں، لیکن آبادان کی آبادی دیکھتے ہی انگریز مع اپنے جملہ 'فنون' کے نگاہوں میں آگیا، کاش مشرق 'فتنہ مغرب' کے داؤ پیچ کو جانتا، اور اپنی زندگی اپنے ہاتھ میں لیتا۔

آبادان کی آبادی ہمارے داہنے ہاتھ چل رہی ہے۔ میلوں تک کارخانہ پھیلا ہوا نظر آرہا ہے۔ ابتداءً سیمنٹ سے بنے ہوئے پختہ گودام کچی مٹی میں دور تک (تیل کے اسٹاک کے لئے) پھیلے چلے گئے ہیں۔ اسکے بعد کارخانے کی لوہے کی چادروں وغیرہ کے محل ہیں، دور تک چمنیاں نظر آتی ہیں، بلا مبالغہ میلوں تک یہ (Refinery) پھیلی ہوئی ہے۔ نلوں اور پائپوں کے ذریعے صاف تیل جہازوں کے لئے دریا تک لایا گیا ہے، دریا

میں جہازوں کے لئے پٹرول پمپ تیار کئے ہیں، کافی تعداد میں ہیں، نوتک کا نمبر تو میں نے دیکھا۔ جہاز اسکے قریب آکر کھڑے ہوتے ہیں اور تیل لیتے ہیں۔ تیل بردار جہازوں کے علاوہ دوسرے جہاز بھی اپنا تیل یہاں سے لیتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے جہاز نے بھی اسی قسم کے ایک "پٹرول پمپ" پر اپنا لنگر ڈال دیا۔ ۱۱½ بجے دن کو لنگر ڈالا گیا اور دوسرے دن صبح ۷ بجے تک "تیل لینے" کا کام ختم ہوا اور روانگی ہوئی ——— دریا میں بہت سے جہاز کھڑے ہیں۔ تیل کی اتنی افراط ہے کہ دریا کے پانی میں بہہ کر چلا جاتا ہے۔ اور دریا پر صاف تیل و پٹرول نظر آتا ہے اور اسکی بو لطیف طبیعتوں پر بار ہوتی ہے۔ یہ تیل (جیسا کہ سنا گیا) دو گھنٹے کی مسافت سے اس "معمل" میں لایا جاتا ہے، اور یہاں صاف ہوتا ہے۔ Tanks بھی تیل لے جاتے ہیں، ریل بھی یہاں تک آئی ہے۔ پٹری بچھی ہوئی جہاز سے نظر آتی ہے۔ اسکے ذریعے بھی برآمد کیا جاتا ہے۔ "معمل" (Refinery) سے آگے تیل کے ڈرم Drums (پیپے) ہیں۔ جہاں بڑے بڑے پائپوں کے ذریعے تیل اُن میں بھر کر بند کیا جاتا ہے۔ پھر مال گاڑی یا جہاز میں لادے جاتے ہیں۔ ریل کی پٹری وہاں تک پہنچی ہوئی ہے۔

ہمارا جہاز جہاں کھڑا ہے، کارخانہ کی بیرونی حالت اور نقشہ ایک حد تک نظر آتا ہے۔ موٹروں کی چلت پھرت، لوگوں کی چہل پہل صاف دکھائی دیتی ہے۔ رات کو آبادی بجلی کی روشنی سے بقعۂ نور بنی رہی۔ قیاس ہے کہ رات دن کام ہوتا ہے۔

دس محرم کا دن تھا، خلاف امید ہمارے جہاز کو تیل مل گیا۔ کارخانہ سے آگے چل کر کام کرنے والوں کے لئے پُر فضا اور خوبصورت مکانات، بنگلے اور کوارٹرز نظر آئے۔ شاید افسروں کے لئے ہوں گے کہ کافی عمدہ اور اچھے بنے ہوئے تھے۔ ممکن ہو عام عملہ کے رہنے کے کوارٹرز کارخانہ کی پچھلی طرف ہوں۔ ان بنگلوں میں خلاف دستور کھجور کے علاوہ دوسرے درخت لگے ہوئے نظر آئے۔ بہرحال ۱۰ محرم کا دن اور گیارھویں کی رات گذار کر فجر کی نماز کے بعد ۶½ بجے (پاکستانی ٹائم) ہمارا جہاز تیل کی اس آبادی آبادان سے تیل لیکر روانہ ہوا۔ اگلی منزل خرم شہر کی ہے۔

۸ اگست ۱۹۵۷ء مطابق ۱۱ محرم الحرام ۱۳۷۷ھ بروز جمعرات

دریائے دجلہ کے دونوں کناروں کا منظر دیکھتے ہوئے ۹ بجے کے قریب خرم شہر (آبادان) سے کوئی تین میل کے فاصلے پر جہاز نے لنگر ڈالا۔ اور سامان جہاز سے اترنا شروع ہوا۔ بستی نظر نہیں آتی تھی۔ سامان کشتیوں پر جا رہا تھا۔ نہ معلوم یہاں 'کون' بستا ہے کہ شہر کا نام 'خرم شہر' رکھا گیا۔ رومی تو کہتے ہیں:۔

خرم آں شہرے کہ آنجا دلبر است

ہم اپنی تعلیم میں مشغول ہو گئے۔ ½ ۱۲ بجے جہاز روانہ ہو گیا۔ اور ساڑھے چار بجے کے قریب بصرہ کے مضافات میں داخل ہو گیا۔ کنارے پر مسلسل کھجور کے باغات چلے گئے ہیں۔ کہیں باغات میں اچھے نئے طرز کے مکانات بنے ہوئے ہیں۔ کہیں کچے مکانات، کہیں جھونپڑے۔ بعض تیراکی اور کشتی رانی کے کلب بھی نظر آئے، آخر بصرہ کی بندر "عشانہ" آ ہی گئی۔ اور نو دن کے سفر کے بعد پونے چھ بجے جہاز نے لنگر ڈال دیا۔ معمولی سا بندر ہے۔ زیادہ ڈاک D o c k نظر نہیں آئے۔

جہاز پر ہی پاسپورٹ کا اندراج دخول ہو گیا۔ اور ڈاکٹری معائنہ بھی جہاز ہی میں ہوا۔ آخر ان سے فارغ ہو کر کسٹم میں آئے۔ قلی نے کسٹم تک لانے کے لئے سامان کا ایک روپیہ (پاکستانی) فی نفر لیا۔ کسٹم میں گو بعض لوگوں کی بڑی سختی سے چھان بین ہوئی۔ اور بعض کے پاس سے قابل کسٹم اشیا بھی نکلیں لیکن بحمد اللہ تعالیٰ ہمارا معاملہ "حسابًا یسیرا" گویا صرف نام کی جانچ پڑتال کا تھا۔ اللہ تعالیٰ قیامت میں حساب اور جانچ پڑتال سے بچائے۔ یہاں بھی سرکاری طور پر قلیوں، اور باربرداری کے باہر تک لیجانے کے لئے ۲ روپے فی نفر ادا کئے۔ باہر آئے، مغرب کا وقت تھا۔ نماز سڑک ہی کے کنارے جماعت سے ادا کی گئی۔ شہر میں داخلے کی دعا پڑھی۔ ایک صاحب جہاز میں حسن نامی (جو اپنے کو خلیل عنبر کا چھوٹا بھائی بتاتے ہیں) ساتھی ہو گئے تھے۔ انھوں نے ہماری ہوٹل تک سامان کی گاڑی کے پانچ روپے پاکستانی طے کئے۔ اور ہم پیدل ہوٹل میں پہنچے۔ پہلے جو امریکہ اور انگلینڈ تبلیغی جماعتیں گئیں تھیں۔ وہ بھی یہیں ٹھہری تھیں۔ ہوٹل بندر سے ۴۔۵ منٹ کے راستے پر ہے۔ اچھا صاف ستھرا ہوٹل ہے، مسجد بھی قریب ہے۔ ۲۴ گھنٹے فی کس ۱۵۰ فلس طے ہوئے۔

(باقی ص۴۸ پر)

دریچۂ عبرت

ع۔ س

مسجد تو بنا دی دم بھر میں!

پاکستان کی اندرونی سیاست بالآخر اس موڑ پر پہونچ گئی جس کا بہت دن سے اندیشہ، اور گذشتہ چند مہینوں سے زبردست امکان پیدا ہو گیا تھا، سہروردی کے زوال کے بعد سے جو زبردست اندرونی اکھیڑ پچھاڑ چل رہی تھی وہ مسلسل انتباہ دے رہی تھی کہ اب اس تماشہ کا ڈراپ سین نام نہاد جمہوریت کے خاتمہ کی شکل میں ہوگا اور سب سے آخر میں مشرقی پاکستان اسمبلی میں جو خونی ہنگامہ ہوا وہ اس خطرہ کی گویا آخری گھنٹی تھی جس کے بعد فوجی ڈکٹیٹر شپ کے لیے بس صبح و شام کا انتظار تھا۔

چنانچہ تین ہفتے مشکل سے گذرنے پائے تھے کہ فوج نے زمام سیاست اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس میدان کے پیشہ ور کھلاڑیوں کا بستر لپیٹ کر رکھ دیا۔ اس انقلاب کے ہیرو جنرل محمد ایوب خاں نے جو اپنی ایک ابتدائی تقریر میں کہا تھا کہ بیس روز سے اس انقلاب کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان اسمبلی کے خونی ہنگامہ کے فوراً ہی بعد یہ کارروائی شروع ہو گئی تھی۔

بہرحال پاکستان کی سیاست میں یہ نیا موڑ آ گیا اور اس وقت وہاں جنرل ایوب خاں کی صدارت میں فوجی ڈکٹیٹر شپ یا صدارتی طرز کی حکومت قائم ہے۔

اس انقلاب کے آئندہ نتائج کیا ہوں گے اس کے بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ البتہ اس انقلاب کا ایک کارنامہ بہت بڑا ہے کہ اس نے پیشہ ور اہل سیاست اور سماج دشمن عناصر کی پوری طرح نقاب کشائی کر دی۔ اس میں پہلے بھی شبہ نہیں تھا کہ پاکستان کا سب سے بڑا

روگ موجودہ اہلِ سیاست ہی ہیں ان کا ہر وقت کا جوڑ توڑ پتہ دیتا تھا کہ یہ کس درجہ خود غرض اور بندگانِ جاہ و اقتدار ہیں۔ لیکن چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی میں بھی طاق ہیں، یہ بھید مارشل لا کی روشنی میں کھلا، مملکت کا وزیر دفاع موٹر کاروں کی چور بازاری میں پکڑا گیا، وزیر اعظم نے اسی ہزار من گیہوں کے ذخیرے کا اعتراف کیا، اور بعض صوبائی وزراء نے بتایا کہ ان کے پاس تقریباً دو لاکھ من گیہوں کا ذخیرہ ہے —— ایسے رکھوالوں کی موجودگی میں پاکستان کا جو کچھ حشر نہ ہوتا وہ تھوڑا تھا! ایسے لوگوں کے زیر سایہ جتنی بھی ذخیرہ اندوزی ہوتی، جتنی بھی چور بازاری اور اسمگلنگ ہوتی وہ کم ہی کم تھی۔

پاکستان کی گیارہ سالہ تاریخ میں اہلِ بصیرت کے لیے عبرت کا بڑا سامان ہے۔ بلکہ بیجا نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ یہ چند سالہ تاریخ پوری کی پوری ایک کتابِ عبرت ہے اور اس پر اقبال کا یہ شعر، جنھیں تخیلِ "پاکستان" کا خالق کہا جاتا ہے، پوری طرح راست آتا ہے ؎

مسجد تو بنا دی دم بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی تھا، برسوں میں نمازی بن نہ سکا

واحسرتا! کہ لوگوں نے اقبال سے "پاکستان" کا تخیل تو لیا، مگر اُس کے اس شعر سے وہ کوئی سبق نہ لے سکے۔ انھوں نے وہی کیا جس کا انجام اقبال کی نظر میں بڑا حسرتناک تھا، انھوں نے لوگوں کے جذبۂ ایمانی کو اپیل کیا اور واقعتہً "دم بھر" میں مسجد "پاکستان" تو بنا لے گئے۔ مگر اس کا نتیجہ وہی نکلا کہ یہ "مسجد" عبادت گاہ بننے کے بجائے حرص و آز کی آماجگاہ بنی، اور بجائے اس کے کہ یہاں "رکوع و سجود" اور "انابت و خشیت" کے مناظر پیش ہوتے، زمین کا یہ ٹکڑا اس اُکھیڑ پچھاڑ کے لیے وقف ہو کر رہ گیا کہ "تولیت" کس کے ہاتھ میں رہے؟ اس "وقف" کی آمدنی سے گھر کس کا بھرے، اور کون یہاں "انا ولا غیری" کا ڈنکا بجائے؟

نہیں، نہیں!! یہ تو فسق و فجور اور صلاح و تقویٰ کی بات شروع ہو گئی، اس کو الگ رکھ دیجئے! نہ ہوتے "رکوع و سجود" کے مناظر، نہ ہوتی فکر آخرت میں ڈوبی ہوئی حیات، کم از کم دنیوی نقطۂ نظر ہی سے کچھ اچھے چال چلن ہوتے، ملک کچھ مادی ترقی کرتا، جس قوم کے لیے ایک الگ ملک بنوایا گیا تھا اس کی حالت سُدھرتی، اس کی فلاح و ترقی کے کچھ کام ہوتے اور دُنیا کی

آزاد قوموں میں اس کا کسی درجہ میں کوئی مقام بنا ہوتا! افسوس کہ معاملہ اس پہلو سے بھی صفر ہی رہا، بلکہ اس حد تک بگڑا کہ "پاکستانی" ہونا ایک شرم و خجالت کی بات بن گئی۔

یہ سب کیوں؟ اس لیے کہ "مسجد" بنانے سے پہلے قوم کو "نمازی" نہیں بنایا گیا۔ ایسے افراد نہیں تیار کیے گئے جن کے لیے اس مسجد کی اصل غرض و غایت مقصدِ حیات بن گئی ہو، جن کی نظر میں ذاتی منافع، قومی مقاصد کے سامنے ہیچ ہو چکے ہوں، جو تولیت کے لیے لڑنے کے بجائے مقاصد میں تعاون کی اسپرٹ رکھتے ہوں، چنانچہ قیامِ پاکستان کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں باگ ڈور آئی، چند ہی سال کے بعد یہ بات کھل گئی کہ ان کا واحد مقصد ملک کو ترقی دینا نہیں بلکہ اپنی تولیت برقرار رکھنا ہے چاہے جس قیمت پر بھی ہو، اور اس طبقہ کے جو لوگ ایوانِ اقتدار سے باہر رہ گئے ہیں اُن کا واحد مقصد کسی نہ کسی طرح قیادت کے حرم میں پہونچ جانا ہے۔ چنانچہ اسی بنیادی فتور کے وہ سارے تماشے تھے جو اب تک سامنے آتے رہے اور صرف اہلِ پاکستان کو نہیں بلکہ سارے عالم کے مسلمانوں کو اور خود اسلام کو شرمندہ کراتے رہے۔

خدا کرے اب جو غیر سیاسی طبقہ برسرِ اقتدار آیا ہے وہ صاحبِ احساس ہو، اور اُس کے انقلابی عمل کا محرک یہی ہو کہ یہ رسوائے عالم تماشے ختم ہونے چاہئیں۔

یوم الحساب حساب کا ایک دن تو وہ ہے جو مرنے کے بعد آئے گا، اور کوئی اُس سے بچنے نہیں پائے گا، مگر کبھی کبھی اس دُنیا میں بھی یوم الحساب آجاتا ہے۔ آخرت والے یوم الحساب میں تو صرف حسرت ہی کا موقع ہوگا۔ لیکن دنیا میں اگر کسی کا یوم حساب آپہونچے تو وہ مقامِ عبرت بھی ہے۔ پاکستان کا فوجی انقلاب سچ پوچھیے تو وہاں کے اربابِ اقتدار اور ریاست پیشہ لوگوں کے لیے "یوم الحساب" لے کر آیا ہو۔ چھوٹے سے پیمانے پر یوم تبلی السرائر فماله من قوة ولا ناصر[۱] کا کیا عبرتناک منظر ہے؟

یہ وزیر اعظم ہیں، ان کے یہاں اسّی ہزار من گیہوں کا ذخیرہ تھا، جبکہ ملک میں غلہ کی

---

[۱] ترجمہ۔ وہ دن کہ جب عریاں کر دیے جائیں گے ــــ پوشیدہ احوال اور نہ ہوگی انسان کو اس سے بچنے کی کوئی طاقت اور نہ کوئی مددگار۔

شدید ضرورت تھی۔ یہ ایک صوبہ کے وزیر اعلیٰ ہیں ان کے یہاں چالیس ہزار من گیہوں کا اسٹاک تھا! یہ لوکل سیلف گورنمنٹ کے وزیر تھے ان کے یہاں دو لاکھ من گیہوں جمع تھا۔ یہ فلاں نائب وزیر ہیں ان کے یہاں اتنے ہزار من بورے سیمنٹ بھرا تھا، یہ فلاں وزیر ہیں، چوربازاری کرتے ہوئے پکڑے گئے، یہ فلاں وزیر ہیں جو فلاں بدعنوانی کے مرتکب نکلے، اور یہ فلاں ہیں، یہ فلاں ہیں، وغیرہ ذالک ——— یہ سب نتیجہ ہے انجام سے بے نیازی کا، کاش انھوں نے سوچا ہوتا کہ ملک وقوم کے مفاد سے مکمل بے نیازی کے ساتھ، جنگِ اقتدار میں منہمک رہنے کی مہلت انھیں کب تک ملی رہے گی؟ جمہوریت میں اقتدار کے لیے رسہ کشی ہوا ہی کرتی ہے۔ مگر اس کے سوا کوئی کام ہی نہ رہے، اور شب و روز کا ہر ہر لمحہ اسی میں صرف ہو، یہ تو چلنے والی چیز نہیں ہے۔ اس کا انجام تو یہی ہے کہ نہ صرف وہ بساط اُلٹ جائے جس پر یہ "ترکتازیاں" ہو رہی تھیں۔ بلکہ ان مہروں کا پالش بھی کھرچا جائے، اور دنیا دیکھے کہ اس پالش کے نیچے کیسی گھنونی صورتیں پنہاں تھیں ——— فاعتبروا یا اولی الابصار

چار دن کی "خدائی"

اواخر ۱۹۵۴ء کی بات ہے مسٹر غلام محمد (سابق گورنر جنرل پاکستان) کی عنایت سے میجر جنرل اسکندر مرزا صاحب پاکستان کے نئے نئے وزیر داخلہ بنے تھے۔ اس دوران میں یہ دونوں صاحبان دَورے تشریف جانے کے لیے لکھنؤ کے ہوائی اڈے پر اُترے، مرزا صاحب اس زمانہ میں پاکستان کے مردِ آہن بنے ہوئے تھے۔ پاکستان میں اسلامی دستور کا جو مطالبہ ان دنوں ہو رہا تھا، اس کے بارے میں ایک اخباری نمائندے نے آں قبلہ سے سوال کیا تو ارشاد ہوا تھا کہ یہ ہندوستان سے گئے ہوئے مولویوں کی "اُودھم" ہے میں ان کو چاندی کی کشتی میں لگا کر یہیں بھیج دوں گا"۔ ——— مگر ہائے رے شوخیٔ پیرِ فلک! مولوی بیچارے تو وہیں کے وہیں رہے، پر چار سال بعد[۵] آنجناب کو ضرور جنرل ایوب خاں نے ٹھیک اسی شان سے لندن روانہ کر دیا ——— رہے نام اللہ کا!

---

[۵] یہ مہینہ ربیع الثانی ۱۳۷۴ھ ہے۔ غالباً چار سال پہلے کا مہینہ بھی یہی تھا، کیونکہ ربیع الثانی ۱۳۷۴ھ ہی کے الفرقان میں ہم نے مرزا صاحب کے اس ارشادِ عالی کے بارے میں کچھ لکھا تھا۔

انسان کتنا کم ظرف ہے۔ ذرا اقتدار ملا اور یہ نشہ میں بھرا۔ اور لگا اقتدار اعلیٰ کا ڈھول پیٹنے۔ مگر اقتدار اعلیٰ جس ذات بے ہمتا کا ہے، وہ بھی ایسے کم ظرفوں کی آنکھیں خوب ہی کھولتی ہو۔ جنرل اسکندر مرزا تقریباً چار سال پاکستان کے "رب اعلیٰ" بنے سارے ملک کو انگلیوں پر نچاتے رہے۔ اسی سال پاکستان کا سب سے اعلیٰ اعزازی نشان بھی اپنے ہی ہاتھ سے اپنے آپ کو دیا مگر جب حقیقی رب اعلیٰ نے اس مصنوعی خدائی کو ٹھوکر لگانا چاہی تو مرزا صاحب آن کی آن میں "بے تخت و تاج" تھے۔ اور کوئی یار و مددگار تو کیا ہوتا، ہر طرف سے "خس کم جہاں پاک" کی آوازیں تھیں۔ پتہ نہیں مرزا صاحب کے دل نے بھی یہ صدا دی یا نہیں ع

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

(بقیہ صد ۴۳) ——— ان تھک اور مستعد بھائی انور اور مولانا صاحب خورد و نوش کے بندوبست کے لئے گئے ہیں اور امیر صاحب لیٹ گئے، تھکاوٹ بہت محسوس ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان بزرگوں کی دعا اور رفقاء کی مہربانی ہے کہ مجھ جیسا معذور اس سفر کی سعادتیں حاصل کر رہا ہے، ورنہ اپنے ضعف کو دیکھتے ہوئے ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ "رب المستضعفین" کے قربان جائیے۔

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل   نسیم صبح تیری مہربانی

جہاز کے چند اور مسافر بھی یہیں پھر شریک ہو گئے۔ کھانا آیا، کھا، وضو کیا، اور ہوٹل ہی میں باجماعت نماز ادا کی، اور تھکے ہارے تو تھے ہی، لیٹتے ہی نیند آ گئی۔

تعارف و تبصرہ

صدیق اکبرؓ مرتبہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایم۔ اے۔ شائع کردہ ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔ صفحات ۴۰۰، سائز الفرقان جیسا، کتابت وطباعت روشن، کاغذ اعلیٰ قیمت غیر مجلد سات روپے۔ مجلد آٹھ روپے ــــ کتب خانہ الفرقان سے بھی مل سکتی ہے۔

صدیق اکبرؓ مولانا اکبرآبادی کی نہایت اہم تالیف کی حیثیت سے سامنے آئی ہے، جس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیرت و سوانح پر، اور عہد صدیقی کے تمام چھوٹے بڑے واقعات نیز اُس دَور کے اہم دینی، سیاسی اور تاریخی مباحث پر بڑی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

کتاب کے شروع میں پندرہ صفحہ کا ایک عالمانہ مقدمہ خود مصنف کے قلم سے ہے، جس میں کتاب کی ضرورت اور خصوصیات وغیرہ کی گفتگو ہے۔ تمہیداً اور ضمناً کچھ اور کام کی باتیں بھی اس میں آگئی ہیں۔ یہ صفحات کتاب کے صفحات کی گنتی میں شامل نہیں ہیں ــــ اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے اور ۵۶ صفحے تک حضرت ابوبکر صدیقؓ کے وہ حالات و سوانح بیان کرتی ہے جن کا تعلق آغاز اسلام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال تک کے عرصہ سے ہے، اس پورے حصہ کے حقائق و واقعات سے جو چیز نہایت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے وہ صدیق اکبرؓ کی افضلیت اور سرکار دو عالمؐ کی آپ کے ساتھ خصوصیت ہے، اس کے بعد کا سارا دَور آپ کی خلافت کا ہے نبیؐ کی جانشینی کا مسئلہ کس طرح ہوا، خلافت کے لئے ابوبکرؓ ہی کا انتخاب کیوں ہونا چاہیئے تھا، آپ کے دَور خلافت کے کارنامے کیا ہیں؟ آپ کے نظام حکومت کا نقشہ کیا تھا، سیاسی خدمات کے علاوہ اپنے دَور خلافت میں خالص دینی نوعیت کی کیا کیا اہم خدمات آپ نے انجام دیں، اجتہاد و قیاس کے میدان میں آپ نے کیا اسوہ چھوڑا، اور کون کون سے اہم مسائل کی گرہ کشائی کی۔ علمی مفاخر و کمالات میں آپ کا کیا پایہ تھا مکارم و اخلاق کی رفعت کا کیا حال تھا۔ ان عنوانات کے تحت واقعات پیش کرتی اور ذیلی مسائل و مباحث سے گزرتی ہوئی "ذاتی حالات و سوانح" کے بیان پر کہنا چاہیئے کہ کتاب ختم ہو جاتی ہے،

اس کے بعد تبصرہ کے عنوان سے چھ سات صفحے اور آتے ہیں، جس میں صدیق اکبرؓ کے مقام اور کام پر مصنف نے اپنے تاثرات پیش کئے ہیں بلکہ اُن نتائج کو قلمبند کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اس تذکرہ کے مطالعہ سے نکلتے ہیں۔

ابوبکر صدیقؓ کی عظمت ہر مسلمان کے ایمان کا جزء ہے، لیکن یہ عظمت تقلیدی اور روایاتی کے بجائے علیٰ وجہ البصیرت ہو اور تمام واقعی پہلوؤں سے ہو تو نورٌ علیٰ نور، یہ کتاب یہی کام انجام دیتی ہے۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر ہم کہیں کہ یہ اسلامی لٹریچر میں ایک وقیع اضافہ ہے، عہدِ صدیقی کی اتنی جامع اور تحقیقی روداد شاید اور کہیں نہ مل سکے اور نہ شاید اس کا پورا اندازہ کہیں اور سے ہو سکے کہ سیاسی بیدار مغزی اور تدبّر و اصابت رائے میں صدیق اکبرؓ کا کیا پایہ تھا، صدیق اکبرؓ کے مصنف نے اس پہلو کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ جس طرح مولانا شبلی کی الفاروق نے اپنے وقت کی نئی مسلمان نسل کے ذہن و فکر پر فاروق اعظمؓ کی عظمت کا سکّہ رواں کیا تھا، اسی طرح مولانا اکبر آبادی کی یہ تصنیف اس وقت کے نو تعلیم یافتہ طبقہ کو "صدیق اکبرؓ" کی شخصیت سے متاثر کرنے میں کامیاب ہوگی۔

نہایت جامع اور محققانہ سوانح نگاری کے علاوہ اس کتاب کی اہم خصوصیت، اُن تاریخی، فقہی اور کلامی مسائل کی بحث ہے جو عہدِ صدیقی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً حضرت ابوبکرؓ سے حضرت علیؓ کی بیعت، خلافت کے شرائط، ارتداد و بغاوت کے اسباب، مالک ابن نویرہ کا قتل اور حضرت خالدؓ، خیبر و فدک کے مسئلہ میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت فاطمہ زہراؓ کے اختلاف و رنجش کی حقیقت، ان مباحث میں سے بعض اگرچہ سیر حاصل نہ ہوں یا کسی پہلو سے محلِ نظر ہوں جیسا کہ ہم آگے چل کر ظاہر کریں گے تاہم ان کی ایک قیمت ہے اور وہ اہمیت کے قابل ہے۔

اصحابِ رسولؐ اور قرنِ اول سے متعلق تاریخی مباحث میں ایک بڑے نکتہ کی بات یہ ہے کہ مصنفین و باحثین قرآن کی اُن شہادات اور تزکیۂ رسولؐ کی اُس اثر انگیزی کو بھی نظر میں رکھیں جو اہلِ تاریخ کے بیانات سے زیادہ قطعی اور یقینی ہیں، بلکہ تاریخی تحقیق کا صحیح طریقہ ہی یہ ہے کہ جن اشخاص سے متعلق کسی خاص واقعہ کی صحیح نوعیت معلوم کرنا اور اس سلسلہ میں رائے قائم کرنا پیش نظر ہو وہاں اُس واقعہ

الگ ہو کر ان اشخاص کا عام کردار اور ان کی خصوصیات معلوم کرنا چاہئیں اور پھر ان اختلافات کی روشنی میں غور کرنا چاہیئے کہ جس واقعہ کی تنقیح پیش نظر ہے اُس کی وہ نوعیت کیا ہو سکتی ہے جو اس کردار سے ہم آہنگ ہو۔ اللہ کا فضل ہے کہ اُس نے مولانا اکبر آبادی کو یہی راہ تحقیق اپنانے کی توفیق بخشی اور اس کی بڑی اعلیٰ مثال صفحہ ۴۱۵ لغایتہ صفحہ ۴۱۶ کا وہ مضمون ہے جو "حضرت فاطمہؓ کے طرز عمل" کے عنوان کے تحت اُن کے قلم سے نکلا ہے۔ قرن اوّل کی معظم ہستیوں کے متعلق بعض تاریخی روایات کے ظاہر الفاظ سے ایک مومن کے دل و دماغ میں جو اُلجھنیں پیدا ہوتی ہیں اُنکے سُلجھاؤ کا درحقیقت یہی راستہ ہے جس سے ایک طرف ...... تاریخ کے جھول بھی نکلتے ہیں، دوسری طرف فکر و نظر کی گتھیاں بھی سلجھتی ہیں۔

مشہور ہے کہ حضرت فاطمہؓ کی وفات ہوئی تو حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ وغیرہ کو اطلاع کئے بغیر اُن کے دفن سے فراغت کر لی۔ یہ بات اُسی نقطۂ نظر کی وجہ سے جو ابھی ہم نے پیش کیا بالکل دل کو نہیں لگتی۔ مولانا اکبر آبادی نے اس کی تردید میں اس کے بالکل برعکس ایک روایت پیش کی ہے۔ ہم یہاں اگرچہ محسوس کرتے ہیں کہ بات بہت تشنہ رہی، کچھ اور تفصیلی بحث چاہیئے تھی۔ مگر اس وقت اس سے سرو کار نہیں ہے، مدعا کچھ اور ہے اور وہ یہ بتانا ہے کہ اسی ضمن میں مولانا ایک بڑے پتہ کی بات لکھ گئے ہیں اور اہل بیت اور حضرت ابوبکرؓ کے تعلقات کے بارے میں روایات کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرنے والوں کو اس پر ضرور غور کرنا چاہیئے اگرچہ بڑی احتیاط کے ساتھ۔ مولانا اکبر آبادی نے لکھا ہے کہ

"اصل یہ ہے کہ بنو اُمیہ میں کچھ لوگ ایسے ضرور تھے جن کا آئینۂ قلب گردِ کدورت سے صاف نہیں تھا، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، وہ لگائی بجھائی باتیں کرتے رہتے تھے، عام مجلسوں میں اس کا تذکرہ ہوتا ہوگا اور اس سے بدگمانیاں پھیلتی ہوں گی یہی وہ بدگمانیاں جن کا اثر روایات میں ظاہر ہے"۔ (صفحہ ۴۴۹)

پانچسو صفحے کی ضخیم کتاب میں کوئی لفظی یا معنوی اختلاف رائے کسی قاری کو مصنف سے نہ ہو یا کسی پہلو سے کوئی کمی نظر نہ آئے، یہ تو بہت ہی نادر بات ہے۔ چنانچہ اس کتاب کے بھی

متعدد مقامات ہماری نظر میں قابل نظر ثانی یا وضاحت طلب ہیں، جن کی طرف ہم ضروری اشارات کریں گے، مگر ان جزئیات سے قطع نظر ایک چیز کتاب کی مجموعی حیثیت اور روح سے تعلق رکھتی ہے پہلے ہم اسی کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اور تمام خوبیوں کے ساتھ ایک بنیادی خلا، اس کتاب میں یہ رہ گیا ہے اور اُس سے کتاب کی روح متاثر ہوئی ہے کہ ابوبکر صدیقؓ کی شخصیت میں "صدیقیت" کو جو مرکزی بلکہ کہنا چاہیئے کلیدی مقام حاصل ہے، وہ اس کتاب میں نظر نہیں آتا۔ حالانکہ صدیق اکبرؓ کی سیرت کا مرکزی نقطہ آپ کی "صدیقیت" ہی کو بننا چاہیئے تھا ـــــ یوں تو حقائق باطنیہ کا مکمل عرفان رکھنے والے ہی جان سکتے ہیں کہ صدیقی زندگی کے کون کون سے فعل و عمل میں "صدیقیت" کا اظہار پایا جاتا ہے لیکن حیاتِ صدیقی کے بعض سوانح ایسے ہیں کہ "صدیقیت" کے بارے میں نہایت مجمل، ناقص اور محض کتابی علم رکھنے والا بھی جب اُن پر نظر ڈالتا ہے تو صاف محسوس کرتا ہے کہ یہ محض "صدیقیت" کی کارفرمائی ہے۔ اس معاملہ میں سب سے روشن مثال جیش اسامہؓ کی ہم برقرار رکھنے کی ہے۔ یہ سیرت صدیقی کا وہ مقام ہے جہاں صدیقیت کا ناقص اور ظنی علم رکھنے والے کو صدیقیت کے کم از کم ایک پہلو کا عرفان نصیب ہوتا ہے اور وہ علیٰ وجہ البصیرت محسوس کرتا ہے کہ ابوبکرؓ کو اس فیصلہ پر آمادہ کرنے والی شے بجز "صدیقیت" کے اور کچھ نہیں ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا اکبرآبادی نے ایسے مقامات پر بھی "صدیقیت" کو نمایاں کرنے اور اُسے بحیثیت روحِ واقعہ اور بحیثیت عامل و محرک سامنے لانے کی کوشش نہیں فرمائی ہے، حالانکہ انھوں نے کتاب کا جو نام رکھا ہے خود اُس کا یہ طبعی سا تقاضہ ہے کہ اس میں صدیقیت کو اظہار پانا چاہیئے اور لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ صدیق کے لقب میں کیا معنویت ہے؟ یہ محض یونہی کوئی لقب ہے یا کسی خاص قسم کی سیرت کا جامع عنوان ہے؟

جیش اسامہ والے واقعہ میں ص۱۳۳ پر "لیکن وہ جو خلیفۂ رسولؐ تھا" کے الفاظ سے شروع کر کے جو چند سطریں لکھی گئی ہیں وہ ہماری نظر میں ہیں۔ لیکن ایک تو ان میں "صدیقیت" کی طرف ذہن کو لے جانے والی کوئی چیز نہیں ـــــ اور یہ کمی صرف اس ترمیم سے پوری ہو سکتی تھی کہ "لیکن وہ جو صدیق تھا" ـــــ دوسرے، آگے مولانا نے صدیق اکبرؓ کے اس فیصلہ کی توجیہہ اور تحسین میں

جو بعض مغربی مفکرین کے اقوال نقل کئے ہیں اور پھر اُس سے بھی آگے بڑھ کر تبصرہ کے زیرِ عنوان خود بھی جو اس کا رشتہ تدبر و سیاست سے جوڑ دیا ہے، اُس کے بعد اس کا امکان ہی نہیں رہتا کہ کوئی اس فیصلہ کا منبع "صدیقیت" کو سمجھے اور اس سے مقام صدیقیت کی رفعتوں کا ادراک کرے۔

ہمارے نزدیک اس پہلو کی اہمیت صرف نظری اور حقیقت پسندی کے طور پر نہیں ہے بلکہ توجیہ کے اس فرق سے قاری پر دو مختلف قسم کے اثر مرتب ہوتے ہیں، اگر یہ باتیں صرف عنوم و تدبر کے قبیل سے بھیں تو پڑھنے والا صرف داد دے سکتا ہے، لیکن یہی باتیں اگر پڑھنے والے کے سامنے اس طرح آئیں کہ جیش اُسامہ کی روانگی نتائج سے بے پرواہ ہو کر ــــ جیسا کہ اس موقع کا صدیقی ارشاد گواہ ہے ــــ صرف اس لئے کی گئی ہے کہ نبیؐ کا منشا پورا ہونا چاہیئے اور مرتدین سے لڑ جانے کا فیصلہ اس لئے کیا گیا کہ دین کی قطع و برید پر راضی ہونا مومن کی شان نہیں ہے۔ تو اس سے کم از کم مسلمان کے سامنے ایک اسوہ آتا ہے۔ اور پھر جب وہ ان اقدامات کے نتائج پر نظر ڈالتا ہے تو وہ تھوڑی دیر ہی کے لئے سہی صدیق کے اس یقین سے بہرہ یاب ہوتا ہے کہ نبیؐ کا منشا پورا کرنے میں نقصان نہیں ہو سکتا اور دین کی حمایت میں سربکف ہونے والوں کی مدد اللہ کی طرف سے یقینی ہے اور وہ کافی ہے ــــ ہمارے نزدیک سیرت صدیقی کا یہی سب سے مبارک اثر ہے جو قارئین پر پڑنا چاہیئے اور وہ جب ہی پڑ سکتا ہے جب صدیق اکبرؓ کے کارناموں کو صراحت کے ساتھ صدیقیت سے وابستہ دکھایا جائے۔ (باقی آئندہ)

(بقیہ مضمون حیات النبی ص ۳۵) لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں وہ صرف خواص اہل علم کے سننے اور سمجھنے والی بات ہے، اس لئے میں اس کو اس تحریر کا جزء بنانا نہیں چاہتا) اور ساتھ ہی مجھ سے فرمایا کہ اس تحریر کے آخر میں یہ اضافہ اور کر دو کہ "آبحیات" کے مضمون کو جو شخص ٹھیک ٹھیک سمجھے گا وہ اس کے نصوصِ قرآن و حدیث یا اجماعِ اُمت کے خلاف ہونے کا شبہ بھی نہیں کریگا۔ یہ شبہ اسی کو ہوگا جو اس کا مطلب صحیح سمجھ نہ سکے گا اور جو شخص اس کا مطلب ایسا بیان کرے جو نصوص اور اجماع کے خلاف ہو، تو سمجھنا چاہیئے کہ اس نے اس کا مطلب صحیح نہیں سمجھا (اسی کے ساتھ مولانا ممدوح نے فرمایا کہ) آبحیات والی تحقیق ایک نہایت دقیق علمی تحقیق اور ایک عمیق علم ہے اس کا سمجھنا یا ماننا نہ اہل سنت ہونے کی شرط ہے نہ دیوبندی المشرب ہونے کی، لہٰذا اس مسئلہ کو ہرگز وجہ تفریق نہیں بننا چاہیئے۔ دونوں فریق ہمارے ہی اور ہماری جماعت کے افراد ہیں۔ ــــ دار العلوم دیوبند ــ ۱۱ ـ نومبر ۱۹۶۰ء

الجزائر کا محاذ آزادی

الجزائر کی جنگ آزادی کی داستان اسی روز سے شروع ہوئی ہے جب فرانس نے اس پر پہلی مرتبہ تسلط جمالیا تھا امیر عبدالقادر کی قیادت میں الجزائری پندرہ سال تک جہاد آزادی لڑتے رہے اور آخرکار کچھ اپنوں کی بے وفائی اور کچھ مقابل کی بے پناہ مادی طاقت سے عہدہ برآ نہ ہوسکنے کی وجہ سے انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور ۱۸۴۸ء میں الجزائر کو فرانس کا آئینی حصہ دار قرار دے دیا گیا۔

تاہم اس کے بعد بھی الجزائریوں نے مزاحمت جاری رکھی جب بھی انھیں موقع ملا پرچم آزادی بلند کردیا اور مدتوں فرانس کو ناکوں چنے چبواتے رہے۔

جو جنگ آزادی ۱۹۵۴ء سے شروع کی گئی ہے وہ اس عرصے کی سب سے بڑی جنگ ہے اس جنگ کے بیج ۱۹۴۵ء میں پڑ گئے تھے جب یوم فتح کے موقع پر دس ہزار مسلمانوں نے سطیف کے مقام پر (جو الجزائر کی آزاد حکومت کے وزیر اعظم مسٹر فرحت عباس کا شہر ہے) مظاہرہ کیا اور مصالی الحاج کی رہائی کا مطالبہ کیا یہ مظاہرہ بدقسمتی سے تشدد میں تبدیل ہوگیا اور کچھ یورپین مارے گئے۔

اس مظاہرے کی خبر قبائلیہ پہاڑوں میں پہنچی تو وہاں بھی یورپین قتل کئے گئے فرانسیسیوں نے اس کا انتقام اندھا دھند بمباری اور قتل عام سے لیا خود ایک فرانسیسی سیاستداں کے اندازے کے مطابق ۲۰ ہزار الجزائری انتقام کی اس آگ کا شکار ہوئے۔

اس وحشیانہ کارروائی نے الجزائری حریت پسندوں کو اس نتیجے پر پہنچادیا کہ الجزائر مسلح بغاوت کے بغیر غلامی کی زنجیروں کو نہیں کاٹ سکتا۔ چنانچہ حریت پسند لیڈروں نے دنیا کی فوجی تاریخ کا مطالعہ کیا خصوصاً گوریلا جنگ کے طور طریق کا بڑا گہرا جائزہ لیا اور ان کے خطوط کار پر ایک خفیہ تنظیم قائم کی اس تنظیم میں بہت جلد تین ہزار رنگروٹ بھرتی کرلئے گئے اور ہتھیاروں کا ایک خاصا بڑا ذخیرہ کرلیا گیا۔ علاوہ ازیں عام ارکان کی تعداد بھی جلد ہی بڑھنے لگی۔ حریت پسندوں نے جنگ کی بنیادی پالیسی یہ رکھی اگر فرانس ہتھوڑے سے کام لے تو اس کے مقابلے میں مچھر بن جایئے۔ انھوں نے ایک بڑی

فوج بنانے کے بجائے اسے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ دیا اور ان کی ٹریننگ کی جانب توجہ دی جب محاذ آزادی کے مراکز ملک بھر میں جال کی طرح پھیلا دیے گئے تو محمد بن بیلا جو فرانسیسی فوج میں نان کمیشنڈ آفیسر رہ چکے تھے مصر پہنچے اور امداد کی گفتگو کی ۱۹۵۴ء میں یوم سینٹس کے موقع پر ٹھیک ایک بجے رات کو الجزائر کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تیس حریت پسند دستوں نے حملہ کر دیا۔ جنگ آزادی شروع ہو چکی تھی۔

فرانس نے فوجوں پر فوجیں بھیجنا شروع کیں حتیٰ کہ ۱۹۵۶ء کے وسط تک ان فوجوں کی تعداد چار لاکھ تک پہنچ گئی جو جدید ترین اسلحہ سے لیس تھیں، اگلے سال تونس اور الجزائر کی سرحد بند کرنے کے لئے ایک سو پچاس میل لمبا برقی جنگلہ کھڑا کیا گیا۔ جب یہ جنگ پہاڑیوں اور دیہات سے بڑھ کر ساحلی علاقوں اور بڑے بڑے شہروں تک پھیل گئی اور بم پھینکنے کی وارداتیں روزمرہ کا معمول بن گئیں تو فرانسیسی استعمار کی اعصابی قوت نے جواب دے دیا، چنانچہ اس نے گاؤں کے گاؤں نذر آتش کرنا شروع کر دیئے فرانسیسی فوج جس جگہ پہنچتی ہے وہاں کی آبادی کو اپنا مشق ستم بناتی ہے، جو شخص بھی ہاتھ آتا ہے اسے مشتبہ قرار دے کر ظالمانہ طریقوں سے موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔

محاذ آزادی کی فوج میں رفتہ رفتہ اضافہ ہونے لگا اور آج جبکہ جنگ کے چار سال گزر چکے ہیں یہ فوج ایک لاکھ ۲۰ ہزار تک پہنچ چکی ہے اس عرصہ میں یہ ملک کے اکثر علاقوں پر قابض ہو چکی ہے جیسا کہ نقشہ میں ظاہر کیا گیا ہے، ان علاقوں میں محاذ آزادی کے اپنے میر محصل اور انتظامیہ کے افسر ہیں۔ محاذ آزادی کی فوج جدید امریکی اور برطانوی اسلحہ سے مسلح ہے یہ ہتھیار زیادہ تر وہ ہیں جو برطانیہ نے مصر سے نکلتے وقت ہزاروں کی تعداد میں وہیں چھوڑ دیئے تھے جمال ناصر نے انھیں محاذ آزادی کے حوالے کر دیا ہے ان ہتھیاروں میں برین گنیں، جرمنی کے ساختہ مارٹر اور ۵،۷ ملی میٹر کی امریکی رائفلیں شامل ہیں خط موریس اور تونسی سرحدوں کے درمیان حریت پسندوں نے ایک بہت بڑا سپلائی ڈپو اور ٹریننگ سنٹر قائم کر رکھا ہے۔ جس کی حفاظت طیارہ شکن توپوں سے کی جا رہی ہے، تونس میں بھی حبیب بورقیبہ کی علانیہ اجازت سے محاذ آزادی کی پانچ کمانڈنگ چوکیاں دو قائم مقام ڈپو آٹھ ہسپتال ۹ میگزین اور تین ٹریننگ کیمپ قائم کئے۔

محاذ آزادی کی فوج اگرچہ نہایت اعلیٰ طور پر منظم ہے تاہم وہ آمنے سامنے جم کر لڑنے کے بجائے گوریلا جنگ کا طریقہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ (ماخوذ)

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا اِلٰہ اِلّا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے

لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، وہ اس ع

اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی

اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی

زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم اس کا

عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السمٰوٰت والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرۃ

توفنی مسلماً والحقنی بالصالحین

"ادارہ الفرقان"

مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسئول
محمد منظور نعمانی

کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات

کلمۂ طیبہ کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

اس میں اسلام کے کلمۂ دعوت
"لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ"
کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ سطر سطر سے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے
اور دماغ کے ساتھ دل بھی متاثر ہوتا ہے۔

قیمت ... ۶/۰/

نماز کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اس کی روح و حقیقت سے واقف ہونے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں "کلمۂ طیبہ کی حقیقت" کی طرح یہ بھی عقل و جذبات اور دل و دماغ کو یکساں متاثر کرتا ہے۔

قیمت ۱۲/۰/

برکات رمضان

از افادات مولانا نعمانی

اسلام کے اہم رکن "صوم رمضان" اور ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال و وظائف، تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات، اور ان کی روحانی تاثیرات کا نہایت مؤثر اور شوق انگیز بیان اور حکیم امت حضرت شاہ ولی اللہؒ کے طرز پر اس سلسلہ کی احادیث کی ایسی تشریح جس سے دل بھی متاثر ہو اور دماغ بھی مطمئن۔ قیمت ۱۲/۰/

اسلام کیا ہے؟

تالیف مولانا نعمانی

اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں

اس کتاب کے دیکھنے والوں کا عام احساس یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کوئی خاص مقبولیت و تاثیر عطا فرمائی ہو، پچھلے چند سالوں میں تقریباً تیس ہزار اردو میں اور کئی ہزار گجراتی میں شائع ہو چکی ہے

اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کے لیے ہی نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ اور عمل انشاء اللہ کافی ہے۔

زبان نہایت آسان ہونے کے ساتھ نہایت شیریں اور پر تاثیر ہو۔ کتابت طباعت اعلیٰ اور معیاری قسم اول کاغذ ۲۰ پونڈ چکنا مجلد ۲/۸/۰ قسم دوم کاغذ ۲۲ پونڈ چکنا غیر مجلد ۱/۱۴/

ہندی اڈیشن کاغذ اعلیٰ مجلد۔ قیمت تین روپے ۳/۰/۰

آپ حج کیسے کریں؟

حج و زیارت کے متعلق اردو زبان میں بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب (جو مولانا نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی گویا مشترک تالیف ہو) اپنی اس خصوصیت میں اب بھی بے نظیر ہو کہ اس کے مطالعہ سے حج کا صحیح اور مسنون طریقہ بھی تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہے اور دل میں عشق و جذب اور ذوق و شوق کی وہ کیفیات بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو در اصل حج کی روح اور جان ہیں۔

کاغذ عمدہ .... قیمت مجلد ۲/۰/۰

آسان حج

یہ آسان زبان میں "حج کیسے کریں" کا خلاصہ ہے۔ ایسے کم تعلیم والے حضرات جو صرف آسان اور معمولی اردو ہی پڑھ سکتے ہیں وہ اس کے مطالعہ سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

طباعت معیاری .... قیمت .... صرف ۸/۰/

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

تالیف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے قابل دید فاضلانہ اور مبسوط مقدمہ ۲/۸/۰

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی۔ قیمت ۱/۸/۰

امام ولی اللہ دہلویؒ

از مولانا عبید اللہ سندھیؒ ...... قیمت ۱/۰/۰

انیس نسواں

از محترمہ بیگم سید اصغر حسین صاحب

مسلمان خواتین خاص کر تعلیم یافتہ بہنوں میں دین کی طرف سے جو بے فکری اور آخرت کی طرف سے جو غفلت تیزی سے بڑھ رہی ہو اس کے علاج اور انسداد کے لیے ایک محترم بہن نے یہ رسالہ لکھا ہے۔ شروع میں مولانا نعمانی کے قلم سے پیش لفظ ہے۔ ...... قیمت ۱۰/۰/

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

قیمت ۶/۰/

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین کے الزامات

قیمت ۱/۸/۰

معرکۃ القلم

اکابر دیوبند کی طرف سے مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا آخری تحقیقی جواب .... قیمت ۱/۰/۰

(فی کاپی آٹھ آنے ۸)

جلد (۲۶) ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۸ھ مطابق دسمبر ۱۹۵۸ء شمارہ (۵)

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

نہرو جی کے مضمون کے جو چند اقتباسات ہم نے ان صفحات میں پیش کیے تھے اُن میں حسب ذیل افکار نظر آتے ہیں۔

۱۔ ہمارے مسائل بنیادی طور پر ہماری تہذیب کے مسائل ہیں۔

۲۔ تہذیبی صحت مندی و توانائی اور چیز ہے، سائنسی ترقی اور چیز! اول کا تعلق انسان کے اندرون سے ہے، جبکہ ثانی بالکل باہر کی چیز ہے۔

۳۔ تہذیبی صحت مندی و توانائی، ضبطِ نفس اور اخلاقی و روحانی پابندیوں پر موقوف ہے۔

۴۔ اخلاقی و روحانی پابندیوں کا جو سلسلہ سماج میں قائم تھا وہ اسلیے ختم ہوتا جا رہا ہے کہ وہ "مذہب" سے وابستہ تھا، اور عقلیت پسندی کا جو رجحان آج پھیل گیا ہے وہ مذہب کو دور از کار یا از کار رفتہ پا کر رد کر رہا ہے اس لیے "مذہب" کے ساتھ اس کے ثمرات بھی رخصت ہوئے۔

۵۔ "مذہب" اگر اوہام پرست اور دور از کار باتوں کا مجموعہ تھا تو عقلیت پسندی کو کسی نامعلوم وجہ سے سطح بینی اور بظاہر گرفتاری کا عارضہ ہو۔ پس عقل کے ماتحت بھی جو فیصلے اور اقدامات کیے جا رہے ہیں وہ مسائل کی اصل حقیقت سے بے خبری کے ساتھ ہیں۔ ــــــ یہی وجہ ہو کہ عقلیت پسندی کے ماتحت جو نئی تہذیب وجود میں آئی تھی وہ ناکارہ ثابت ہو رہی ہے۔

۶۔ محض ضابطہ اور محض کوئی عقیدہ انسانی زندگی کو اطمینان و سکون ــــ جو نتیجہ ہوتا ہی تہذیبی صحت و توانائی کا ــــ نہیں بخش سکتا۔ ضابطہ اور عقیدہ ایسا ہونا چاہیے جس میں اخلاقی اور روحانی پہلو بھی ہو۔ اسلیے کہ یہ انسانی فطرت کا ایک لازمی تقاضہ ہو۔

۷۔ انسانی زندگی کے روحانی اور اخلاقی پہلو کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو پھر کوئی مستقل قدر اور انسانی عادات و اطوار کی برائی بھلائی کا کوئی دائمی پیمانہ نہیں رہ جاتا ــــ جو تہذیبی صحت و توانائی کی اوّلین ضرورت ہے۔

ان افکار میں بڑی حد تک صداقت ہو۔ اور ان سب سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ

تہذیبی نظام کی درستی کے بغیر انسانیت کے مسائل اطمینان بخش طور پر حل نہیں ہو سکتے اور

تہذیبی نظام کی درستی ایک ایسے عقیدے کے بغیر نہیں ہو سکتی جس سے اخلاقی و روحانی پابندیوں کی

کونپلیں پھوٹتی ہوں، اور ان مستقل قدار کا تعین ہوتا ہو جو انسانی زندگی کی دائمی رہنمائی کریں۔

یہ نتیجہ ہو جو اس سلسلۂ افکار سے برآمد ہوتا ہو، اور یہ بالکل حق ہو ــــ اور غالباً نہرو جی بھی ان مقدمات کی روشنی میں اس پر پہونچے ہوں گے ــــ مگر سوال یہ ہے کہ اس قسم کا عقیدہ حاصل کیسے ہو؟

عقیدہ کسے کہتے ہیں؟

اس سوال کا جواب حاصل کرنے کی کوشش اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتی جب تک ہم یہ نہ جانیں کہ عقیدہ کسے کہتے ہیں؟

عقیدہ نام ہے ماورائے محسوسات سے متعلق اس علم و خیال کا جو جزم و یقین بن کر قلب میں جاگزیں ہو جائے۔ عقیدے کی یہی خصوصیت ہے جس کی بنا پر انسان اُن پابندیوں کے احترام پر خود کو مجبور پاتا ہے جو کسی عقیدہ کا تقاضہ بن کر سامنے آتی ہیں، اسکے برخلاف اگر کسی علم و خیال میں قلبی یقین کی کیفیت نہ ہو تو وہ انسان کے سامنے اپنے تقاضے لا تو سکتا ہے مگر اُن کے احترام پر اس کو مجبور نہیں کر سکتا۔

عقیدے کی یہ تعریف اگر صحیح ہے تو تنہا اسی سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا کہ عقیدہ فلسفہ سے نہیں، مذہب ہی کی بارگاہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ مذہب کا نزول (وحی و الہام کے ذریعہ) ایک قلب پر ہوتا ہے اور پھر اس قلب سے نکل کر باقی انسانوں کے قلوب ہی کو وہ براہ راست اپیل کرتا ہے، جبکہ فلسفہ عقل و نظر کی پیداوار ہے اور مجرد عقل و نظر کا ثمرہ دماغ کی حد تک جو کچھ بھی بن جائے قلب کا یقین ہرگز نہیں بنا کرتا، جیسا کہ فطرت انسانی کا تجربہ گواہ ہے[1]۔

---

[1] مذہب اور فلسفہ کے اس فرق کی مزید وضاحت یوں ہو سکتی ہو کہ فلسفہ فکر و نظر کے عمل کا نتیجہ ہو۔ اور فکر و نظر کا ہر نتیجہ اس امکان کی زد میں رہتا ہو کہ کوئی دوسرا نظری عمل اسے کسی وقت بھی رد کر دے۔ جیسا کہ فلاسفہ کا اختلاف اور اُن کی آراء کا ارتقاء اس پر شاہد ہو۔ مگر مذہب چونکہ وحی و الہام کے خبری سرچشمہ سے برآمد ہوتا ہو۔ وہ چونکہ کسی نظری عمل کا رہین منت نہیں ہوتا اسلیے اس خطرہ سے باہر رہتا ہو جو فلسفہ کا لازمہ ہو۔ بلکہ وہ جس قلب پر اولاً نزول کرتا ہو دنیا کی سب سے بڑی صداقت بن کر نزول کرتا ہو اور اس یقین اور عقیدت کے ساتھ اس "خبر" کو اٹھانے والا قلب جب دوسروں تک اس کو پہنچاتا ہو تو قبول کرنے والے اس "خبر" کو اسی یقین کے ساتھ قبول کرتے ہیں کہ یہ دنیا کی صادق ترین خبر ہو۔ غرض مذہب اور فلسفہ کا اصلی فرق دونوں کے سرچشموں کا فرق ہو۔ مذہب کا سرچشمہ طبعاً ہے ہی ایسا کہ اسکے ثمرات کو قبول کرنے کے ساتھ یقین و اعتماد کی کیفیت لازم ہو۔ برخلاف فلسفہ کے سرچشمہ کے کہ اس کے ساتھ ارتیاب و تردد بالفعل نہیں تو بالقوہ ضرور لازم ہے۔ ۱۲

بہرحال ہم تو یہاں تک غور کرتے ہیں یہی پاتے ہیں کہ نفس عقیدہ ہی مذہب کے سوا کہیں اور سے نہیں مل سکتا۔ لیکن اگر کسی کے نزدیک یہ ضروری نہ ہو تب بھی جس قسم کے عقیدے کے سرچشمے کی ہمیں تلاش ہو اس کے پیش نظر تو یہ ماننا ہی پڑے گا کہ اس کا واحد سرچشمہ مذہب ہی ہو سکتا ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت خود یہ صورت حال ہو جس کا اعتراف پنڈت جی کو بھی ہے۔ کہ مذہب کا "طلسم" ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور روحانی پابندیاں بھی ختم ہو رہی ہیں۔ علاوہ ازیں خالص نظری انداز پر بھی ہم یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ اس کائنات کی ابتداء و انتہا اور اس میں اپنے مقام کے بارے میں جو جوابات ہمیں مذہب سے ملتے ہیں صرف وہی کسی انسان کے اندر اخلاقی اور روحانی احساسات کو بیدار کر سکتے ہیں۔ ورنہ عقلیت تو ہمیں صرف افادی اخلاق کا سبق پڑھا سکتی ہے۔ اور روحانیت ایک لفظ بے معنی ہے اگر انسان کا رشتہ ایک خالق و مالک سے نہ قائم ہو۔

بہرحال یہ تو طے ہو کہ مذہب ہی ہمیں ایسے عقائد بخش سکتا ہے، جو انسان کی اپنی خوشی سے اس پر روحانی اور اخلاقی پابندیاں عائد کریں، اب رہا یہ مسئلہ کہ "مذہب عملی شکل میں یا تو ان معاملات سے تعلق رکھتا ہے جو ہماری عام زندگیوں سے علاقہ نہیں رکھتے۔ یا ایسی رسوم و روایات سے بندھا ہوا ہو جو موجودہ دور سے مطابقت نہیں رکھتیں"۔ تو ہمارا خیال ہو کہ پنڈت جی نے اپنے گرد و پیش کے مذہب کو دیکھ کر جنس مذہب کے بارے میں یہ رائے قائم کرلی ہے۔ ورنہ کم از کم ایک مذہب —— اسلام —— کے بارے میں تو ہم علیٰ وجہ البصیرت کہہ سکتے ہیں کہ اس پر یہ تجزیہ صادق نہیں آتا، اگر پنڈت جی نے اس کا کما حقہ، مطالعہ کیا ہے اور اس کے بعد بھی اُن کی یہی رائے ہے تو ہم چاہیں گے کہ پنڈت جی اُن چیزوں کی کچھ نشان دہی فرمائیں جو وہ اسلام میں اس تجزیے کے مطابق پاتے ہیں۔ ہو سکتا ہو کہ ایک کارآمد مذہب کسی غلط فہمی کی وجہ سے انھیں بے کار نظر آ رہا ہو، اور اس غلط فہمی کے ازالہ کے بعد انھیں اس مسئلہ کا حل مل جائے جس کی خاطر وہ اپنے مضمون (بنیادی رویہ) میں بے حد پریشان نظر آتے ہیں۔

التذکیر بالقرآن

(از حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب مدظلہم العالی)

۳

آخر میں جی چاہتا ہے کہ علم اور علماء کی فضیلت سے متعلق بخاری شریف کا ایک ترجمۃ الباب اور فتح الباری سے اس کے بعض حصص کی شرح لکھ دوں جو مضمون ہذا سے غیر مربوط بھی نہیں ہے اس لیے اس کا بیان بے محل نہ ہوگا۔ وہو ہذا۔

باب العلم قبل القول والعمل لقول اللہ تعالیٰ فاعلم انہ لا الٰہ الا اللہ فبدأ بالعلم وان العلماء ہم ورثۃ الانبیاء ورثوا العلم من اخذہ اخذ بحظ وافر ومن سلک طریقا یطلب بہ علما سہل اللہ لہ طریقا الی الجنۃ۔ وقال جل ذکرہ انما یخشی اللہ من عبادہ العلمأ وقال ما یعقلہا الا العالمون وقالوا لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحاب السعیر وقال ہل

باب اس میں کہ علم قول اور عمل سے پہلے ہوتا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ فاعلم انہ لا الٰہ الا اللہ اور اس میں ابتدا علم ہی سے فرمائی ہے اور یہ کہ علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں اور یہ کہ انبیاء علم ہی کا وارث بناتے ہیں سو جس شخص نے اس کو لیا اس نے بڑا حصہ پایا، اور یہ کہ جو شخص کسی ایسے راستے پر چلا جس کے ذریعہ علم طلب کرنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ سہل فرما دیں گے، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ کے بندوں میں

یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من یرد اللہ بہ خیراً یفقھہ فی الدین وانما العلم بالتعلم۔ الخ

(بخاری شریف ج ۱)

سے علماء ہی اس سے خشیت رکھتے ہیں۔ اور فرمایا کہ ان کو نہیں سمجھ سکتے مگر علماء۔ اور فرمایا کہ یہ کفار کہیں گے کہ اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو ہم اہل دوزخ میں نہ ہوتے، نیز فرمایا کہ کیا برابر ہیں وہ لوگ جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے۔

اور فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو دین میں تفقہ مرحمت فرما دیتے ہیں۔ اور علم تو تعلم یعنی سیکھنے ہی سے حاصل ہوتا ہے ـــــ (آگے فتح الباری سے اسکی تشریح ملاحظہ فرمائی جائے)

(قولہ باب العلم قبل القول والعمل) قال ابن المنیر اراد بہ ان العلم شرط فی صحۃ القول والعمل ولا یعتبران الا بہ فھو متقدم علیھما لانہ مصحح للنیۃ المصححۃ للعمل فنبہ المصنف علی ذالک حتی لا یسبق الی الذھن من قولھم ان العلم لا ینفع الا بالعمل تھوین امر العلم والتساھل فی طلبہ۔

مصنف نے یہ جو فرمایا کہ علم کا درجہ قول اور عمل سے پہلے ہے تو ابن منیرؒ فرماتے ہیں کہ بخاریؒ کی مراد اس سے یہ ہے کہ قول اور عمل کی صحت کے لیے علم شرط ہے۔ یعنی یہ دونوں بدون اس کے معتبر ہی نہیں ہیں لہٰذا علم ان دونوں سے مقدم ہوا اسلئے کہ وہی نیت کو صحیح کرنے والا ہے جو کہ عمل کو درست کرنے والی ہو۔ پس مصنفؒ نے اس پر اس لیے تنبیہ فرمائی کہ مبادا لوگوں کے اس مقولہ سے کہ علم بدون عمل کے نافع ہی نہیں ہوتا، علم کی ناقدری یا اسکے طلب میں سستی کا خیال کسی کے ذہن میں راہ نہ پا جائے۔

(قولہ وما یعقلھا) ای الامثال المضروبۃ (قولہ لو کنا نسمع) ای سمع من یعی ویفھم (قولہ او نعقل) عقل من یمیز وھذہ اوصاف

اور نہیں سمجھتے ان کو یعنی ان امثال کو

اهل العلم فالمعنی لوکنا من اهل العلم لعلمنا ما یجب علینا فعملنا به فنجونا۔ (فتح الباری ص۱۲۱ ج۱)

جو بیان کی جاتی ہیں "کاش کہ ہم سنتے" یعنی سُن کر بات کو اسکو سمجھنے اور محفوظ رکھنے والوں کا سا سننا سنتے۔ اور یہ جو فرمایا کہ "کاش ہم سمجھتے" یعنی سمجھنا اس شخص جیسا جو انشار کے نیک و بد کی تمیز بھی کرتا ہو۔ اور یہ دونوں چونکہ اہلِ علم کے اوصاف میں سے ہیں لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ کاش ہم بھی اہلِ علم میں سے ہوتے تو اپنے ذمہ جو امور واجبہ تھے ان کو جانتے اور عمل کرتے تاکہ نجات پاتے۔

حضرت بخاریؒ نے تو یہاں صرف سورۂ ملک کی ایک ہی آیت لی ہے۔

وقالوا لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحاب السعیر۔

یعنی اور کہیں گے کہ اگر ہم سنتے اور سمجھتے تو ہم اہلِ دوزخ میں نہ ہوتے۔

لیکن اس کے آگے فرماتے ہیں کہ:

فاعترفوا بذنبهم فسحقا لاصحاب السعیر۔

یعنی غرض اپنے جرم کا اقرار کریں گے سو اہلِ دوزخ پر لعنت ہے۔

ان میں دوزخیوں کا بیان ہو کہ دوزخ میں جا کر اقرار کریں گے کہ دُنیا میں ہم نے سماع قبول نہیں کیا تھا اور عقل و فہم سے کام نہیں لیا تھا، اور اب یہاں اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے اور وہاں اپنے کیے پر نادم ہوں گے۔ حیث لا ینفعهم الندم۔

اس کے بعد والی آیت میں مومنین کا بیان ہے کہ:

ان الذین یخشون ربهم بالغیب لهم مغفرة واجر کبیر۔

یعنی۔ بے شک جو لوگ اپنے پروردگار سے بے دیکھے ڈرتے ہیں ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔

اس میں ان کی جزا یعنی مغفرت اور اجر کبیر کو ان کی دنیاوی خشیت پر مرتب فرمایا ہے یعنی آخرت میں ان کو مغفرت اور اجر کبیر اس لیے ملے گا کہ وہ دنیا میں خشیت خداوندی کے ساتھ متصف تھے۔ یہ تو فریقین کا الگ الگ حال بیان ہوا۔ یہاں سے میں یہ کہتا ہوں کہ قرینۂ تقابل سے معلوم ہوا کہ کفار نے جس طرح سے دنیا میں سمع اور عقل سے کام نہیں لیا تھا، اسی طرح ان کو دُنیا میں

خشیت بھی نہ تھی اور اسی کے نہ ہونے کی وجہ سے اعتراف بالذنب بھی ان کو نہ تھا، اور مومن کو چونکہ دنیا میں خشیت حاصل ہوتی ہے اس لیے وہ اس کے مقدمات یعنی سمع و عقل سے بھی متصف ہوتے ہیں اور ان کو دنیا ہی میں اعتراف بالذنب بھی حاصل ہوتا ہے۔

اب ان دونوں آیتوں کو ملانے سے مومن کامل کے اوصاف معلوم ہوئے کہ سمع و عقل، خشیت اور اعتراف بالذنب یہ سب مومن کی صفات ہیں۔

اسی طرح سے ایک اور جگہ اہلِ دنیا اور اہلِ علم کے اوصاف کا ذکر اس طرح سے فرمایا ہے۔ سورۂ قصص میں قارون کے ذکر میں فرماتے ہیں کہ :-

فخرج علیٰ قومہ فی زینتہ ۚ قال الذین یریدون الحیوٰۃ الدنیا یٰلیت لنا مثل ما اوتی قارون انہ لذو حظٍ عظیم ۝ (سورۂ قصص)	پھر وہ اپنی آرائش سے اپنی برادری کے سامنے نکلا۔ جو لوگ دنیا کے طالب تھے کہنے لگے کیا خوب ہوتا کہ ہم کو بھی وہ ساز و سامان ملا ہوتا جیسا قارون کو ملا ہو۔ واقعی وہ بڑا صاحب نصیب ہو۔ (بیان القرآن)

یہ تو دنیا داروں کا قول نقل فرمایا جس سے ان کا وصف معلوم ہوا کہ دوسرے کی نعمتِ عاجلہ دیکھ کر ریجھ پڑتے ہیں۔ اور اس کے بعد اہلِ علم کا جواب نقل فرماتے ہیں سنئے۔ فرماتے ہیں :

وقال الذین اوتوا العلم ویلکم ثواب اللہ خیر لمن آمن وعمل صالحا ولا یلقٰھا الا الصابرون ۝ (سورۂ قصص)	اور جن کو فہم عطا ہوئی تھی وہ کہنے لگے، ارے تمہارا ناس ہو اللہ تعالیٰ کے گھر کا ثواب ہزار درجہ بہتر ہو جو ایسے شخص کو ملتا ہو کہ ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور وہ ان ہی کو دیا جاتا ہے جو صبر کرنے والے ہیں ـــــــ (بیان القرآن)

اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ علم کی یہ شان ہے کہ ہر وقت ان کی نظر اللہ تعالیٰ کے ثواب پر اور آخرت پر ہوتی ہے۔ یہ بھی عالم کا ایک مخصوص وصف ہے۔

عالم کے جن اوصاف کا یہاں تک ذکر ہوا یعنی سماع، عقل، خشیت، اعتراف بذنبہم، اور

نظر بر ثواب آخرت ان سب کے ذکر کی حیثیت تو ترغیب کی سی ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب بعض امور بطور ترہیب کے بھی بیان کر دیے جائیں تاکہ ترغیب اور ترہیب دونوں کے مجموعہ سے تاثر قوی پیدا ہو کہ یہی مقصود بیان ہے۔

اس سلسلہ میں ترمذی شریف کے ابواب الزہد کی ایک روایت نقل کرتا ہوں۔

حدثنا سوید بن نصر قال حدثنا	حدیث بیان کی ہم سے سوید بن نصر نے کہا
عبد الله بن المبارك نا حیوة	حدیث بیان فرمائی ہم سے عبد اللہ بن مبارک
بن شریح نا الولید بن ابی الولید	نے انھوں نے فرمایا کہ حدیث بیان کی ہم سے
ابو عثمان المدائنی ان عقبة بن	شریح نے انھوں نے فرمایا کہ ہم سے بیان
مسلم حدثه انه دخل المدینة	کیا ولید بن ابی الولید ابو عثمان مدائنی نے
فاذا هو برجل قد اجتمع علیه	کہ عقبہ بن مسلم نے ان سے بیان کیا کہ جب وہ
الناس فقال من هذا فقالوا	مدینہ میں داخل ہوئے تو وہاں دیکھا کہ ایک
ابو هریرة! فدنوت منه حتی	بزرگ بیٹھے ہیں اور ان کے ارد گرد لوگوں کا
قعدت بین یدیه وهو یحدث	ایک مجمع ہے۔ حضرت عقبہ بن مسلم نے دریافت
الناس فلما سکت وخلا قلت له	کیا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ لوگوں نے بتایا
اسألك بحق وبحق لما حدثتنی	کہ یہ حضرت ابو ہریرہ رض ہیں۔ (کہتے ہیں کہ)
حدیثاً سمعته من رسول الله	پھر میں ان کے قریب گیا وہ لوگوں سے
صلی الله علیه وسلم عقلته و	حدیث بیان فرما رہے تھے۔ میں بھی ان کے
علمته فقال ابو هریرة افعل	سامنے جا کر بیٹھ گیا جب وہ خاموش ہوئے
لاحدثنك حدیثاً حدثنیه رسول	اور تنہا رہ گئے تو میں نے عرض کیا کہ آپ سے
الله صلی الله علیه وسلم عقلته	حق کے واسطہ سے اور پھر حق کے واسطہ
وعلمته ثم نشغ ابو هریرة نشغة	یہ درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھ سے ضرور
فمکث قلیلاً ثم افاق فقال لا	بالضرور ایک ایسی حدیث بیان فرمائیں جسکو
حدثنك حدیثاً حدثنیه رسول	آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہو

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ھذا
البیت ما معنا احد غیری
وغیرہ ثم نشغ ابوھریرۃ
نشغۃ شدیدۃ ثم افاق
ومسح وجھہ وقال افعل
لاحدثنک حدیثا حدثنیہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ و
سلم انا وھو فی ھذا البیت ما
معنا احد غیری وغیرہ ثم
نشغ نشغۃ شدیدۃ ثم مال
خاراً علی وجھہ فاسندتہ
طویلاً ثم افاق فقال ثنی
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ان اللہ تعالیٰ اذا کان یوم
القیٰمۃ ینزل الی العباد
لیقضی بینھم وکل امۃ جاثیۃ
فاول من یدعو بہ رجل جمع
القرآن ورجل قتل فی سبیل
اللہ ورجل کثیر المال فیقول
اللہ للقاری الم اعلمک ما
انزلت علی رسولی قال بلیٰ
یارب قال فماذا عملت فیما
علمت قال کنت اقوم بہ اناء

اور سمجھا ہو اور سیکھا ہو۔ حضرت ابوہریرہؓ نے
فرمایا کہ میں ایسا کروں گا اور تم سے ضرور ایسی
ہی حدیث بیان کروں گا جو مجھ سے رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہو۔
اور میں نے اسے سیکھا اور سمجھا ہے۔
یہ کہہ کر ابوہریرہ بیہوش ہو گئے اور تھوڑی
دیر کے بعد جب افاقہ ہوا تو پھر فرمایا کہ میں تم
سے ایسی ہی حدیث بیان کروں گا جو مجھ سے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حجرہ میں
بیان فرمائی تھی کہ میں تھا اور حضورؐ تھے اور
ہمارے علاوہ کوئی تیسرا نہ تھا یہ کہا اور پھر
(دوبارہ) سخت بیہوش ہو گئے۔ پھر جب ہوش
آیا تو اپنا چہرہ وغیرہ صاف کر کے فرمایا کہ
میں یہ کام کروں گا یعنی تم سے ایسی حدیث
ضرور بیان کروں گا جس کو مجھ سے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا تھا دراں
حالیکہ میں اور آپؐ اسی گھر میں تھے، اور
ہمارے ساتھ کوئی اور نہ تھا، (تیسری بار)
پھر سخت دورہ غشی کا پڑا اور منھ کے بل
گرنے لگے تو میں نے اپنی گود میں آپ کو
ٹیک لیا۔ پھر جب بہت دیر کے بعد افاقہ ہوا
تو پھر ارشاد فرمایا کہ حدیث بیان فرمائی مجھ
سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بروز

اللیل و آناء النہار فیقول اللہ
لہ کذبت و تقول الملائکۃ
لہ کذبت و یقول اللہ لہ بل
اردت ان یقال فلان قاری
و یؤتی لصاحب المال
فیقول اللہ لہ الم اوسع علیک حتی لم ادعک
تحتاج الی احد قال بلی یا رب
قال فماذا عملت فیما آتیتک
قال کنت اصل الرحم و اتصدق
فیقول اللہ لہ کذبت و تقول
الملائکۃ کذبت و یقول اللہ
بل اردت ان یقال فلان
جواد وقد قیل ذالک ۔
و یؤتی بالذی قتل فی
سبیل اللہ فیقول اللہ لہ فیما
ذا قتلت فیقول امرت بالجہاد
فی سبیلک فقاتلت حتی قتلت
فیقول اللہ لہ کذبت و تقول
الملائکۃ کذبت و یقول اللہ بل
اردت ان یقال فلان جریئ
فقد قیل ذلک ۔
ثم ضرب رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم علی رکبتی فقال

قیامت جب اللہ تبارک و تعالیٰ بندوں کا
فیصلہ فرمانے کے لیے نزول فرمائیں گے اور
سب کے سب لوگ زانو کے بل پڑے ہوں گے
تو سب سے پہلے جن کو بلایا جائے گا (وہ تین قسم
کے لوگ ہوں گے) ایک تو وہ ہوگا جو قاری
یعنی عالم بالقرآن ہوگا ۔ دوسرا وہ ہوگا جس نے
اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کیا ہوگا ۔ اور
تیسرا وہ شخص ہوگا جو دنیا میں مالدار ہوگا ۔ پس
اللہ تعالیٰ اس عالم قرآن سے سوال فرمائیں
گے کہ کیا میں نے تجھ کو اس کتاب کا عالم
نہیں بنایا تھا جو میں نے اپنے رسول پر نازل
فرمایا تھا ؟ وہ کہے گا کہ بے شک اے میرے
پروردگار ایسا ہی تھا ، ارشاد ہوگا کہ پھر
تو نے اپنے علم پر کیا عمل کیا ؟ کہے گا میں اس کی
رات اور دن کی گھڑیوں میں تلاوت کرتا تھا
اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ تو جھوٹا ہے
اور فرشتے بھی اس سے کہیں گے کہ تو جھوٹا ہے ۔
اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ بات نہیں ہے بلکہ تو
یہ چاہتا تھا کہ تجھ کو قاری اور عالم کہہ کر پکارا
جائے (سو دنیا میں تو کہا جا چکا)
اسی طرح صاحب مال لایا جائے گا ، اللہ
تعالیٰ اس سے بھی فرمائیں گے کہ کیا میں نے
تجھ پر وسعت نہیں کی تھی ؟ یہاں تک کہ دنیا

يا ابا هريرة اولئك الثلاثة
اول خلق الله تسعر بهم النار
يوم القيامة *

قال الوليد ابو عثمان المدائني
فاخبرني عقبة ان شفيّا هو الذي
دخل على معاوية فاخبره بهذا
قال ابو عثمان وحدثني العلاء
ابن ابي حكيم انه كان سيافا
لمعاوية قال فدخل عليه
فاخبره بهذا عن ابي هريرة
فقال معاوية قد فعل بهؤلاء
هذا فكيف بمن بقي من الناس
ثم بكى معاوية بكاءً شديداً
حتى ظننا انه هالك وقلنا
قد جاءنا هذا الرجل بشرّ ثم
افاق معاوية ومسح عن وجهه
وقال صدق الله ورسوله
من كان يريد الحيوة الدنيا
وزينتها نوف اليهم اعمالهم فيها
وهم فيها لا يبخسون اولئك
الذين ليس لهم في الآخرة الا
النار وحبط ما صنعوا فيها و
باطل ما كانوا يعملون. هذا

میں تجھ کو کسی کا محتاج نہیں رکھا تھا۔
وہ کہے گا کہ بیشک اے میرے پروردگار
ایسا ہی تھا، فرمائیں گے کہ پھر میری اس نعمت
کو پاکر تو نے کیا عمل کیا؟ وہ کہے گا کہ میں صلہ
رحمی کرتا تھا۔ صدقہ وخیرات دیتا تھا۔ اللہ
تعالیٰ یہ سن کر فرمائیں گے کہ تو جھوٹا ہے، اور
فرشتے بھی کہیں گے کہ تو جھوٹا ہے اور اللہ تعالیٰ
فرمائیں گے کہ یہ بات نہیں تھی بلکہ تو نے یہ سب
اس لیے کیا تھا کہ کہا جائے کہ فلاں شخص بڑا
سخی ہے سو دنیا میں یہ کہا جا چکا۔

پھر شہید کو پیش کیا جائے گا اور اللہ
تعالیٰ فرمائیں گے تو کیوں اور کس سلسلہ میں
مارا گیا۔ وہ عرض کرے گا یا رب آپ نے اپنی
راہ میں جہاد کا حکم فرمایا تھا اس لیے میں نے
قتال کیا، یہاں تک کہ تیری راہ میں کام آگیا۔
اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تو جھوٹا ہے، اور
فرشتے بھی کہیں گے کہ تو جھوٹا ہے، اللہ تعالیٰ
فرمائیں گے کہ یہ بات نہیں ہے بلکہ تو نے
اس لیے قتال کیا تھا کہ لوگ کہیں کہ فلاں
شخص بڑا جری اور بہادر ہے۔ چنانچہ تیرے
متعلق یہ خوب کہا جا چکا۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ پھر
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے زانو

حدیثٌ حسنٌ غریبٌ ؎ (ترمذی شریف ص۱۱ ج ۲)

پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ اے ابوہریرہ یہی ہیں وہ تین شخص کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے پہلے جہنم میں یہی لوگ ڈالے جائیں گے۔ اور دوزخ انھیں سے روشن کی جائے گی۔

حضرت ولید ابو عثمان مدائنی کہتے ہیں کہ مجھ کو عقبہ نے یہ خبر دی کہ شفیاؔ ہی وہ شخص ہیں جو کہ حضرت امیر معاویہؓ کے پاس گئےؒ اور ان کو اس حدیث کی خبر دی۔

ابو عثمان کہتے ہیں کہ علاء ابن ابی حکیم نے یہ بھی فرمایا کہ وہ حضرت معاویہ کے سیّاف تھے تو جب وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کو اس حدیث کی خبر دی کہ ابوہریرہؓ ایسا ایسا بیان فرماتے ہیں۔ تو حضرت معاویہ نے فرمایا کہ ان مذکورہ اشخاص کے ساتھ تو یہ معاملہ ہوگا پھر ان کے علاوہ اور جو لوگ ہوں گے ان کا کیا حشر ہوگا؟ یہ کہہ کر حضرت معاویہ بہت روئے یہاں تک کہ ہم لوگوں نے تو یہ سمجھا کہ ان کی جان ہی نکل جائے گی اور ہم نے یہ منظر دیکھ کر کہا کہ کہاں سے یہ برا شخص یہ خبر لایا۔ جب پھر حضرت معاویہ کو افاقہ ہوا تو انھوں نے اپنا چہرہ وغیرہ صاف کیا اور فرمایا کہ سچ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے۔ (اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے)

جو شخص محض حیاتِ دنیوی اور اس کی رونق چاہتا ہے تو ہم ان لوگوں کے اعمال ان کو دنیا ہی میں پورے طور پر بھگتا دیتے ہیں اور ان کے لیے دنیا میں کچھ کمی نہیں ہوتی۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں بجز دوزخ کے اور کچھ نہیں اور انھوں نے جو کچھ کیا تھا وہ آخرت میں سب ناکارہ ہوگا اور جو کچھ کر رہے ہیں وہ بے اثر ہے۔ (یہ حدیث حسن غریب ہے)

نیز ابن ماجہ کی ایک حدیث ہے کہ :-

عن جابر بن عبد اللہ رضؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تعلموا العلم لتباھوا بہ العلماء ولا لتماروا بہ السفھاء ولا تخیزوا المجالس فمن فعل ذلک فالنار النار ؎	حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علم اس لیے نہ سیکھو کہ اس کے ذریعہ سے علماء پر بڑائی چاہو اور نہ اس لیے کہ اس کے ذریعہ سے بے وقوفوں سے جھگڑا کیا کرو اور نہ اس لیے کہ مجلس میں اس کی وجہ سے صدر مقام حاصل

(ابن ماجہ باب الانتفاع بالعلم والعمل) (ج ۱ ص ۲۲)

کرو۔ پس جس شخص نے ایسا کیا وہ جہنم سے ڈرے اور دوزخ کا خوف کرے۔

قولہ ولا تخیزوا کے تحت حاشیہ میں حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی رح نے نقل فرمایا ہے کہ

والتحیز التمکن والتقرر المراد منہ لا تمکنوا فی قلوب الناس لتکونوا صدراً للمجالس فانہ من اشد اغراض الدنیا لان آخر ما یخرجہ من قلوب الصدیقین حب الجاہ وھذہ عقبۃ کئودۃ للعلماء لا ینجو منہ الا المخلصون۔ انتہیٰ

(حاشیہ ابن ماجہ شریف)

تحیز کے معنی تمکن اور تقرر کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ علم سے یہ نہ مقصود ہو کہ لوگوں کے دل میں جگہ حاصل کرو تاکہ ہر جگہ صدر مقام ہی پر بٹھائے جاؤ۔ (اور یہ اس لیے برا ہو کہ) یہ چیز اغراض دنیویہ میں سب سے سخت ترین ہے کیونکہ صدیقین کے قلوب سے سب سے آخر میں جو شے نکلتی ہے وہ حبِ جاہ ہی ہے۔ اور علماء کے لیے یہ ایک سخت اور دشوار گذار گھاٹی ہے جس سے مخلصین ہی نجات پاتے ہیں۔

دیکھیے ترمذی شریف کی اس حدیث میں اور ابن ماجہ شریف کی اس حدیث اور اس کی شرح میں جو حاشیہ پر ہے کس قدر مؤثر ترہیب ہے علماء کے لیے کہ اگر آج اسی قسم کی احادیث ہمارے پیش نظر ہو جائیں تو اخلاص پیدا کرنے کے لیے یہی اتنا کافی ہے۔ اہلِ علم کے ایک مجمع میں یہ بات آئی کہ آج علماء میں جو غفلت ہے اس کا سبب ان کا پڑھنا پڑھانا ہے۔ چنانچہ جو لوگ یہ کام کرتے ہیں ان میں غفلت ہو جاتی ہے۔ پھر کسی نے کہا کہ بھائی حدیث کی کتابوں میں کتاب الرقاق اور کتاب الزہد بھی تو ہے۔ (جن میں ایسی ایسی روایات بھی ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں) پس غفلت کا سبب تعلیم و تعلم نہیں ہے، بلکہ ان ابواب کا پیش نظر نہ ہونا ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ آج علماء ان ابواب کو اور اس قسم کی روایات کو پیش نظر رکھیں اس سے غفلت زائل ہوگی۔ بس اسی پر مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق بخشے۔ والسلام

"آزاد کی کہانی"
نقد و نظر کی کسوٹی پر

(از:- مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

[جناب مولانا نسیم احمد صاحب فریدی سے ناظرین الفرقان واقف ہیں، انھیں مسلمانانِ ہند کی دینی اور روحانی تاریخ سے خاص شغف اور دلچسپی ہے۔ الفرقان کے پچھلے بیس سالہ فائلوں میں ان کے قلم سے بزرگوں کے کتنے ہی تراجم و تذکرے اور ان کے ملفوظات و مکتوبات کے ترجمے نکل چکے ہیں، جو ان کے اسی شغف کا عملی ثبوت ہیں۔ پھر ان کے اس شغف کو سلسلۂ مجددی اور خاندانِ ولی اللّٰہی کے بارے میں کچھ اور بھی خصوصیت کا درجہ حاصل ہے ـــــ اور ہندوستان کے طول و عرض میں، اہل حق کی راہ کو عزیز رکھنے والا کون مسلمان ہے جو ان ہر دو خانوادوں کی ممنونیت کا احساس اپنے اندر نہ پاتا ہو؟ ـــــ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ "مولانا آزاد کی کہانی" (بروایت مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی) جب ان کے سامنے آئی، جس میں "مولانا آزاد کی زبانی" اُن کے والد ماجد کی طرف سے خاندانِ ولی اللّٰہی کے پاک و شفاف دامن پر بہت سے داغ دھبے لگائے گئے ہیں۔ اور مولانا کے والد کے نانا کو اس خاندان کا شاگرد بتاتے ہوئے، اس کے مسلکِ حق کا سرگرم مخالف دکھایا گیا ہے۔ پھر یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ یہ دونوں حضرات گویا (اپنے دور میں) یکتائے روزگار اور مرجع انام تھے، تو مولانا نسیم احمد صاحب نے اِن کے حالات و واقعات (مندرجہ "کہانی") کی تحقیق کا ارادہ کیا اور اسکے نتیجہ میں یہ مفصل تبصرہ تیار ہو گیا جو ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:-

مولانا آزاد نے (بروایت ملیح آبادی صاحب) اگرچہ شاہ شہیدؒ وغیرہ پر لگائے ہوئے اپنے والد کے بعض الزامات کو خود ہی بہتان تک قرار دیدیا ہے۔ اور اختلافِ مسلک میں اپنے والد کی تائید نہیں کی ہے مگر چونکہ نہ الزامات کی کوئی باقاعدہ تردید کی گئی اور نہ اُن کے مسلک کی غلطی کی طرف اشارہ کیا گیا۔ مزید برآں، کتاب کے مطالعہ سے مولانا کے والد اور والد کے نانا دونوں حضرات کی بے پناہ علمیت اور پاکبازی و روشن ضمیری کا سکہ قارئین کے قلوب پر جمنا لازمی ہے؛ جس کے بعد خاندان ولی اللّٰہی کے مخالف مسلک کو قدرتی طور پر وہ الٰہی اور روحانی وزن حاصل ہوتا ہے جس سے وہ آجتک محروم رہا ہے۔ اس لئے اس کتاب پر ایک تحقیقی تبصرے کی ضرورت تھی ہمیں خوشی ہو کہ یہ کام مولانا فریدی جیسے اہل کے حصہ میں آیا۔ اور انھوں نے تحقیقی کاوش کا حق ادا کر دیا۔" علاوہ اس خاص پہلو کے خالص علمی و ادبی نقطۂ نظر سے بھی یہ تبصرہ ایک گرانقدر خدمت کی حیثیت رکھتا ہے جس کی داد اہل نظر ہی دے سکتے ہیں اور وہی اسکی ضرورت سمجھ سکتے ہیں۔

تبصرہ اگرچہ بہت طویل ہے، مگر ہمارا خیال ہے کہ اس کو بالاقساط شائع کرنا، اہلِ ذوق پر بہت شاق ہوگا۔ خود ہم بھی اس کو ایک ہی دفعہ میں شائع کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ اس لئے ایسا ہی کیا جا رہا ہے۔]　　　　(ادارہ)

مولانا آزاد مرحوم جنھیں دنیا سے رخصت ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے علم و فکر اور فہم و نظر کے اعتبار سے ہندوستان ہی کی نہیں تمام دنیائے اسلام کی ایک قابل فخر شخصیت تھے۔ اُن کا علمی شغف و انہماک اُن کی وسعت نظر، ان کا حافظہ، ان کی تاریخی معلومات، ان کا نہ ختم ہونے والا شوق مطالعہ، اُن کی قوت اخذ و استنباط، اللہ کا ایک ایسا عطیہ تھا جس کا فیضان ان کی تمام تحریروں اور تقریروں میں نمایاں ہے ــــــ انھوں نے اپنی خداداد ذہانت و فطانت، ذکاوت و فراست، اور تجربہ و مہارت کی مدد سے سیاسیات ہی میں نہیں، بلکہ تاریخ و ادب کلام و عقائد میں بھی بہترین قلمی شاہکار چھوڑے اور اردو زبان کو ایسے علمی و ادبی خزانے سے مالا مال کیا جس سے ہر دور کا مؤرخ و ادیب فیض یاب ہوتا رہے گا۔ انھوں نے ترجمان القرآن لکھ کر، اردو کی پرشکوہ تفسیر اور شاندار ترجمے کے ذریعے قرآن کی شوکت و عظمت کا اور اسکے معانی و بیان کی سربلندی کا بہترین انداز میں اظہار کیا غرضکہ وہ نصف صدی تک، علم و ادب، خطابت و بیان، سیاست و فراست

کی مملکت کے فرماں روا ہے۔ اور چار دانگ عالم میں اُن کے علمی کمالات کی شہرت ہوئی ــــ لیکن ان کے مفصّل اور مکمل سوانح حیات نہ تو اُن کے قلم سے اُن کی حیات میں شائع ہوئے اور نہ کسی اور ہی نے ابتک یہ کام انجام دیا۔

البتہ ان کی وفات کے معاً بعد مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے، جس کے متعلق ان کا بیان ہے کہ آج سے ۳۷ سال پہلے ۱۹۲۱ء میں جب مولانا نظر بند کئے گئے اور ملیح آبادی صاحب کو بھی اُن کی رفاقت میسر آئی تو جیل کی اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے مولانا سے خواہش کی کہ وہ اپنے حالات قلبند کرادیں، اور پھر مولانا جو کچھ املا کراتے گئے یہ اس کو لکھتے گئے۔ اس طرح ایک نامکمل "سوانحعمری" انھوں نے مرتب کرلی، جیسا کہ کتاب کے دیباچہ میں ملیح آبادی صاحب لکھتے ہیں:۔

"آزاد کی کہانی کی شان...... یہ ہے کہ ۱۹۲۱ء میں ہم سب جیل کے پرندپرند بن چکے تھے۔ جیل کی عجیب زندگی کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو جیل میں رہ چکے ہیں.........................

.... میں نے مولانا کو اُکسانا شروع کیا کہ تذکرہ کی دوسری جلد لکھادیں ــــ ہفتوں میرے بھائی میرے کہ کرٹالتے رہے مگر میں بھی بھلا پیچھا چھوڑنے والا ــــ تقاضا جاری رکھا، آخر راضی ہوگئے اور کتاب لکھانا شروع کردی، بولتے جاتے تھے اور میں پنسل سے گھسیٹتا جاتا تھا رات کو مسودہ صاف کرلیتا تھا، مولانا نے یہ کتاب اس طرح لکھوادی کہ سامنے نہ کوئی نوٹ ہوتا تھا اور نہ کبھی مجھ سے پوچھا کل کیا لکھوایا تھا" ص۱۹،۱۸

اس کے بعد لکھتے ہیں:۔

"یہ کتاب خاص اہمیت رکھتی ہے مولانا نے اپنے والد مرحوم کے حالات بھی لکھوادئے ہیں اور خود اپنے حالات بھی چار سال کی عمر سے" (ص۲۱)

اسی صفحے پر لکھتے ہیں:۔

"اس کتاب کو یہ امتیاز بھی حاصل ہو کہ مولانا کی روزمرّہ کی بات چیت قلبند ہوگئی ہے"

ایک جگہ دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"تو میں نے مولانا کو پھُسلانا شروع کیا۔ پھُسلانے کا لفظ جان بوجھ کر لکھا ہے ــــ بھلا مولانا کو کون پھُسلا سکتا تھا، مگر دل کی محبت کا عالم اور ہی ہوتا ہے، آخر راضی ہوگئے

اور تذکرہ میں جن معاملات کا اجمال ہے ان کی شرح بھی آگئی۔ مگر ہوا کیا دوسرے دن صبح ہی مسودہ لوٹا لیا گیا، فرمایا نظر ثانی کر لوں۔ عرض کیا آپ کی نظر ثانی کا حال معلوم ہے یعنی مسودہ غائب اور رہا بھی یہی۔" (ص۲۰، ۲۱)

ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

" اس کتاب میں بعینہ وہی کچھ ہے جو مولانا کی زبان سے نکلا تھا میں نے اس میں کسی قسم کا بھی تصرف یا تغیر و تبدل کرنا خلاف دیانت سمجھا ہے۔ عجائبات روزگار میں سے یہ کتاب بھی اس لحاظ سے ایک عجوبہ ہے کہ مولانا اپنی پوری زندگی میں شاید کوئی چھوٹی سی چھوٹی بات بھی بھولے نہیں۔ مگر لکھا دینے کے بعد اس کتاب کو بالکل ہی بھول گئے —— مجھے حق الیقین ہے کتاب یاد آجاتی تو "نظر ثانی" کے بہانے ضرور چھین لیتے اور کتاب اُن کے بے شمار مسودوں میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتی...... ہر ملاقات پر دل دھڑکتا کہیں کتاب کا تاک نہ بیٹھیں خود میں بھی اپنی جگہ بڑا "کائیاں" تھا —— کتاب کا معاملہ اس طرح غائب رکھا جیسے موجود ہی نہیں آپ کو کئی جگہ حاشیے میں نظر آئے گا "مسودے میں جگہ خالی ہے" اسی لئے کہ مولانا کو یاد ہوا نہیں اور کتاب دنیا سے محروم ہو گئی۔ (ص۲۲)

میں نے اس کتاب کو جو بقول مولانا ملیح آبادی عجائبات روزگار میں سے ایک عجوبہ ہے —— ذوق و شوق کی نظر سے دیکھا۔ کتاب واقعی بڑی دلچسپ ہے، اور ایک تاریخی عظمت رکھنے والے انسان کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے اس میں ایک خاص دلکشی بھی ہے —— لیکن تنقید کی نظر سے دیکھا جائے تو پھر یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ مولانا آزاد ہی کی لکھائی ہوئی اور بعینہ انہیں کے الفاظ میں ہے —— یہ صحیح ہے کہ مولانا نے یہ کتاب اس طرح لکھوائی کہ کوئی نوٹ تک اُن کے سامنے نہ ہوتا تھا۔ لیکن مولانا کے خداداد حافظہ کے پیش نظر جس کا مولانا ملیح آبادی نے بھی ذکر کیا ہے اور خود مولانا نے بھی اپنے بعض مضامین و خطوط میں اللہ کے اس انعام کا تذکرہ کیا ہے، یہ بات مستبعد نظر آتی ہے کہ مولانا کو اپنی ذات یا اپنے بزرگوں کے حالات و واقعات لکھواتے وقت ایسا تسامح ہوا ہو جس سے واقعہ کا وقوع ہی تاریخی و تحقیقی حیثیت سے ناممکن ہو جائے۔

یا واقعات کے ضبطِ سنین میں ایسا تضاد و تناقض ہو کہ جس سے واقعہ کے وقوع ہی کی نفی ہوتی ہو۔ اس کتاب میں جو بہت سی تاریخی غلطیاں ہیں وہ تسامح اور سہو کے ذیل میں نہیں آتیں، اور نہ اسماء رجال، اسماء کتب اور اسماء آثار کی بعض اغلاط کو کاتب کے سر ڈالا جا سکتا ہے۔ حد یہ ہے کہ مولانا کے ایک استاذ کا نام تک بار بار غلط آتا ہے۔

اس کتاب کو برادرم حکیم سید حسن مثنیٰ صاحب رضوی ندوی مدظلہ نے بھی غور و خوض کے ساتھ ملاحظہ فرمایا۔ جنھیں مولانا سے اجراء الہلال کے زمانے ہی سے غیر معمولی عقیدت پیدا ہو گئی تھی اور بعض اہم علمی اور تاریخی موضوعوں پر ان کی مکاتبت بھی رہی اور ملاقاتیں بھی ہوئیں[1]۔ انھوں نے بعدِ مطالعہ اس کتاب کے قابلِ تحقیق اور لائقِ تنقید مقامات کی نشاندہی کی اور اجمالی طور پر کچھ زبانی تبصرہ فرمایا، اسکے بعد میں نے دوبارہ اِن مقامات کو دیکھا، اور متعدد کتابوں اور بعض اہلِ تحقیق اُدباء سے اِن کے بارے میں رجوع کیا ــــــ میں نے جتنا جتنا اس کتاب کے قابلِ تنقید مقامات پر غور کیا میرے دل نے بے ساختہ یہ کہا، کاش یہ کتاب صرف "کہانی" نہ ہوتی مولانا آزاد کی شان کے مطابق اُن کی زندگی کی آئینہ دار ہوتی، اس میں حقائق ہوتے، صحیح واقعات ہوتے ــــــ

مجھے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑی دشواری پیش آ رہی ہے اِدھر مولانا آزاد کی کہانی اور بقول ملیح آبادی صاحب انھیں کی زبانی میرے سامنے ہے اور دوسری طرف تاریخی حقائق کی روشنی میں بات کچھ کی کچھ ہے۔

مولانا ملیح آبادی پر (جن کی حیثیت محض ناشر و کاتب کی ہے) خیانت و عدم دیانت کا الزام بلا دلیل لگایا نہیں جا سکتا ــــــ وہ خود لکھتے ہیں کہ میں نے اس میں کسی قسم کا تصرف یا تغیر و تبدل کرنا خلافِ دیانت سمجھا ہے ــــــ بلکہ ایسا گمان کرنا بھی مشکل ہے۔ اس لئے کہ مولانا ملیح آبادی کا مولانا مرحوم سے جیسا تعلق معلوم ہے وہ اس طرح کی کسی بات کے بالکل منافی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا آزاد ایسی صریح غلطیاں کریں اور ایسی ہوائی باتیں املا کرائیں جیسی اس کتاب میں موجود ہیں ــــــ کیا اچھا ہوتا اگر مولانا ملیح آبادی جرأت و ہمت سے کام لے کر مولانا کی

---

[1] حاشیہ اس مضمون کے آخری صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔ "الفرقان"

زندگی ہی میں اس کہانی کو شائع کر دیتے۔ اب کس سے دریافت کیا جائے کہ حقیقت کیا ہے؟ اور کون جواب دے ـــــــ تسوید و ترتیب کے ۴ سال بعد اور مولانا کی وفات کے معاً بعد اس کا منصۂ شہود پر آنا پتہ نہیں کس مصلحت پر مبنی ہے؟ مولانا ملیح آبادی مجھے معاف فرمائیں میں اپنے دل کی بات کہہ رہا ہوں کہ بہتر یہی ہوتا کہ ترجمان القرآن کا مؤلف جلیل، الہلال کا مدیر اعلیٰ اس کہانی کے پورے مسودے کو غائب کر دیتا اور اس "اعجوبۂ روزگار" کے مطالعہ کا موقع کسی کو نہ ملتا۔

بہرحال اب جبکہ یہ کہانی سامنے آچکی ہے، تو یہ فیصلہ تو وہ لوگ کریں جو اس کی اہلیت رکھتے ہیں اور جن کے پاس اس باب میں کچھ معلومات ہوں کہ اس کہانی کی اصلیت کیا ہو۔ میں نے تو محض سامنے آئی ہوئی ایک کتاب پر تنقید کی حیثیت سے اس کے کچھ واقعات اور بیانات کو تاریخی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے پرکھا ہے اور وہی قارئین کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ اس تبصرے سے میری غرض تاریخی حقائق کا اجاگر کرنا ہے اور بس ـــــــ میں مولانا آزاد کی علمی اور ادبی بلندی کا قائل و معترف تھا اور ہوں۔ اُن کی محبت اور ان کی تحریروں سے قلبی تعلق مجھے شروع سے ہے۔

میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں نے اس تبصرے میں کتاب کے تمام گوشوں کو لے لیا ہے، اور یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ تنقید کرتے وقت خود مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی ـــ مگر جہاں تک میری استطاعت کا تعلق ہے میں نے خوب تلاش و جستجو کر کے یہ مختصر تبصرہ لکھا ہے ـــــ میرے اس تبصرے میں خاندان شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے واقعات پر دوسرے واقعات کے مقابلے میں کچھ زیادہ تفصیل ملے گی ـــــ اور سچ پوچھیے تو اس تبصرے کا خاص محرک بھی یہ جذبہ ہے کہ خاندان ولی اللہی کے صاف و شفاف دامن پر جو غلط دھبے لگائے گئے ہیں وہ صاف ہو جائیں ـــ قلتِ فرصت کے باعث اس نقطۂ نظر سے بھی کچھ گوشے تشنۂ تنقید رہ گئے ہوں تو بعید نہیں۔

سب سے پہلے اسماء رجال اور اسماء کتب وغیرہ کو لیجیے ـــــ اور ملاحظہ فرمائیے یہ تسامحات

مولانا کی مشہور و مسلّم قوت حافظہ سے کس قدر بعید معلوم ہوتے ہیں۔

(۱) ص۴۴، ۴۵ پر مولانا منور الدین کے شاہیر تلامذہ کے نام گناتے ہوئے لکھا ہے:۔

"مولوی محبوب علی جو غدر سے پہلے دہلی کے مشہور عالم تھے۔ مولوی فضل امام جو فضل حق کے والد تھے، مولوی فضل رسول بدایونی اور مولانا محمد علی گوپامئوی صاحب کشاف اصطلاحات الفنون وغیرہ۔"

اس جگہ صرف آخری "شاگرد" کے متعلق عرض کرنا ہے (مولانا منور الدین کے دوسرے "شاگردوں" کی بحث آگے آرہی ہے) ـــــ صاحب کشاف اصطلاحات الفنون کا اسم گرامی تو قاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ ہے، جو تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کے ساکن تھے، مولانا محمد علی گوپامئوی (بشرطیکہ اس نام کے کوئی مشہور عالم گوپامئو میں گذرے بھی ہوں) صاحب "کشاف اصطلاحات الفنون" نہیں ہیں ـــــ کہانی کے ص۲۶۲ پر ان صاحب کو مولوی علی تھانوی فرمایا ہے ـــــ "ایک عجیب رسالہ مولوی علی تھانوی صاحب اصطلاحات الفنون کا بھی ملا" (ص۲۶۲) اس جگہ نسبت مکانی صحیح ہے نام پھر غلط ہے۔

(۲) ص۶۷ پر مشہور مناظر و ادیب مولانا رشید الدین دہلویؒ شاگرد شاہ عبد العزیز دہلویؒ کو مولانا رشید الدین معقولی صاحب رشیدیہ لکھا ہے ـــــ حالانکہ رشیدیہ کے مصنف دوسرے ہیں ان کا نام نامی شیخ محمد رشید جونپوریؒ ہے جو گیارہویں صدی ہجری کے مشہور و جلیل القدر عالم اور شیخ طریقت تھے، یعنی شاہ عبد العزیز صاحب سے بھی متقدم!

(۳) قصبہ نیمی ضلع عظیم آباد (پٹنہ)، کے مشہور محدث و ادیب جو خود مولانا آزاد کے اُمدو شاعری میں استاد ہیں یعنی ابو الخیر مولانا محمد ظہیر احسن شوق نیموی نقشبندی، مجددیؒ ان کا نام مختلف جگہ مختلف ہے۔

ایک جگہ ہے ـــــ "مولوی ظہیر الحسن مرحوم جن سے میں نے شاعری میں اصلاح لینی شروع کی تھی۔" ص۲۱۲

دوسری جگہ ہے ـــــ "اس زمانے ایسا ہوا کہ شاعری کے متعلق کتابوں کی جستجو میں اصلاح اور ازاحتہ الاغلاط لکھنؤ سے منگوایا یہ دونوں رسالے مولوی

ظفر احسن شوق نیموی کے تھے" ص۲۴۱

(۴) عہد بہادر شاہ کے مشہور درباری طبیب حکیم احسن اللہ جو بعض سیاسی خصوصیات کی بنا پر ۱۸۵۷ء کی تاریخی شخصیت ہیں ان کا نام ص۱۵ پر دو جگہ احسان اللہ کر دیا گیا ہے۔

(۵) "مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے تقویۃ الایمان اور جلاء العینین وغیرہ میں لکھا ہے"

(آزادی کی کہانی ص۱۶۵)

مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی جلاء العینین ـــــ کوئی کتاب نہیں ہے، غالباً یہاں علامہ نعمان آلوسی کی کتاب جلاء العینین فی محاکمۃ الاحمدین کا تشابہ لگ گیا، البتہ مولانا شہیدؒ کی ایک کتاب کا نام تنویر العینین ضرور ہے۔

(۶) "اسی زمانے میں معیار الحق دیکھی اور اس کا جواب ارشاد الحق مولانا ارشاد الحق کا ...... اور صاحب ارشاد الحق کا علمی ضعف صاف صاف نظر آگیا"

معیار الحق مؤلفہ مولانا نذیر حسین مرحوم کے جواب میں ارشاد الحق کوئی کتاب نہیں ہے۔ انتصار الحق ہے جو مولانا ارشاد الحق رامپوری کی نہیں، مولانا ارشاد حسین مجددی رامپوریؒ کی ہے ـــ تذکرۂ کاملان رام پور میں مولانا ارشاد حسینؒ کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"تصانیف میں ایک ضخیم کتاب انتصار الحق بزبان اردو بجواب معیار الحق مولانا نذیر حسین محدث دہلوی تصنیف کی ہے اور مطبوعہ ہے یہ کتاب دوبارہ طبع ہو چکی ہے" (تذکرۂ کاملان رام پور ص۲۳)

(۷) فقہ کی مشہور کتاب الجوہرۃ النیرہ کو ص۳۵۵ پر جواہر نیرہ لکھا ہے۔

(۸) "چنانچہ بیگم اورنگ کی مسجد میں ایک مدرسہ قائم کیا یہ مسجد چھوٹے پیمانے پر جامع مسجد کے نمونے پر ہے .... شاہ عبدالقادر مترجم قرآن اس کے منتظم تھے" (ص۴۲)

اوّل تو اس نام کی کوئی مسجد دہلی میں نہیں، دوسرے شاہ عبدالقادرؒ کا قیام جس مسجد میں رہتا تھا وہ اکبر آبادی مسجد تھی جس کو اکبری مسجد بھی کہہ دیتے ہیں۔

(۹) "زمان شاہ بن احمد شاہ" ص۳

حالانکہ زمان شاہ تیمور شاہ کا بیٹا اور احمد شاہ ابدالی کا پوتا ہے۔

مولانا آزاد کا خاندانی سلسلہ

شیخ جمال الدین "میرے خاندانی سلسلے میں سب سے پہلے شیخ جمال الدین معروف ...... بہ بہلول دہلوی کا نام بہت ممتاز نظر آتا ہے ان کا وطن دہلی مرحوم تھا، اور عہد اکبری کے مشاہیر علماء اور اصحاب سلوک و طریقت میں سے تھے الخ" (صـ۲۵)

شیخ جمال الدین دہلوی کا ذکر کرتے ہوئے منتخب التواریخ، تذکرۃ الواصلین اور اخبار الاخیار کا حوالہ دیا گیا ہے۔ منتخب اور تذکرۃ الواصلین تو اس وقت میرے پاس نہیں ہے البتہ اخبار الاخیار (مولفہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی) کو دیکھا تو عجیب حیرت انگیز انکشاف ہوا وہ یہ کہ شیخ جمال الدین دہلوی کے فضائل کا ذکر کرتے ہوئے کہانی میں شیخ عبدالحق دہلویؒ کی جو جو شہادتیں بحوالہ اخبار الاخیار پیش کی ہیں وہ شیخ جمال الدین کے بارے میں نہیں ہیں دوسرے بزرگوں سے متعلق ہیں۔

اخبار الاخیار میں شاہ قمیصؒ کا تذکرہ ہے اس میں شیخ محدث دہلویؒ ارقام فرماتے ہیں:۔

"و از انجملہ شیخ عبدالرزاق المشہور بشیخ بہلول مرید و خلیفہ او ست جامع است میان علم شریعت و طریقت از اول فطرت برنشاۃ عبادت و تقویٰ و صلاح برآمدہ و بعصمت ذاتی نشو ونما یافتہ، بعد تحصیل علوم دینی بہ تہذیب اخلاق و تبدیل صفات موفق شد، والحق دریں زمان در زمرۂ درویشان سالکان اینچنیں مردم در سلوک ایں طریق و رسوخ قدم و اتباع سنت حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نادر و عزیز الوجود اند" (اخبار الاخیار صـ۱۹۹ مطبوعہ محمدی دہلی)

کہیں کہیں ایک دو لفظوں کا فرق کرکے بعینہ یہی عبارت آزاد کی کہانی میں شیخ جمال الدین کے بارے میں ملے گی (صـ۳۲)

غالباً شیخ جمال الدین کی عرفیت شیخ بہلول دہلوی اسی لئے تجویز کی گئی ہے کہ شیخ عبدالرزاق المشہور بشیخ بہلول کا خلعتِ کمال اُن کے جسم زیبا پر کچھ نہ کچھ درست آجائے۔ مگر اسکا کیا علاج کہ شیخ بہلول کا نام عبدالرزاق ہے اور اتفاق سے سکونت بھی دہلی کی نہیں ہے۔

کہانی کے صـ۳۱ پر انہی شیخ جمال الدین کے حق میں اخبار الاخیار کی یہ عبارت بھی بتائی گئی ہو۔

" شیخ قطب عالم می گفت کہ چوں بملازمت او رسیدم بجہت غلبہ وعظ و نصیحت ....

بے سابقہ تقریب سر برآوردہ فرمود، چہ دیہ فرقہ ضالہ اند"

حالانکہ یہ عبارت شیخ داؤد مرید و خلیفہ مخدوم شیخ حامد الحسنی الجیلانی کے بارے میں ہے۔

شیخ قطب عالم، شیخ داؤد کے پاس پہونچے تھے نہ کہ شیخ جمال الدین دہلوی کے پاس (دیکھئے اخبار الاخیار صـ۱۹۹)

کہانی میں صاحب تذکرہ کے حوالے سے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا یہ قول بھی شیخ جمال الدین کے بارے میں درج ہے کہ

" واز تصنیفات اوست شرح اصول بزدوی الخ (صـ۳۲)

مگر شیخ محدث نے تو اخبار الاخیار میں شرح بزدوی کو قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی تصنیف بتایا ہے اور دو جگہ اسکا ذکر کیا ہے ایک تو خود قاضی دولت آبادی کے تذکرے میں دوسرے شیخ محمد عیسیٰ جونپوری کے ذکر میں کہ شیخ جونپوری کی خاطر شرح اصول بزدوی قاضی صاحب نے لکھی ہے۔ (ملاحظہ کیجئے اخبار الاخیار صـ۱۷۲ اور ۱۷۳)

شیخ محمد " شیخ جمال الدین کے لڑکے شیخ محمد تھے .... ان پر تصوف و سلوک کا غلبہ تھا اور دلّی میں حضرت سید (؟) احمد سرہندی مجدد کے خلیفہ تھے..... مجدد صاحب کے مکتوبات کے تیسرے حصے میں ان کے نام دو خط ہیں ایک فارسی میں دوسرا عربی میں " (صـ۳۳)

زبدۃ المقامات میں مولانا ہاشم کشمی نے حضرت مجدد کے قریب قریب تمام خلفاء کا ذکر کیا ہے احقر کا ایک مقالہ جو تذکرہ خلفاء مجدد الف ثانی کے عنوان سے الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر میں شائع ہوا ہے اسی سے ماخوذ ہے ـــــ اس میں کہیں شیخ محمد دہلوی کا نام حضرت مجدد الف ثانی کے خلیفہ کی حیثیت سے نہیں اور نہ کسی اور کتاب میں ان کی یہ حیثیت معلوم ہوئی اور نہ مکتوبات کی تیسری جلد (بلکہ ہر سہ جلد) میں ان کے نام کے دو خط ملے جو فارسی و عربی میں ہوں۔

شیخ محمد احسن کے صاحبزادے " شیخ محمد احسن کے تین لڑکے تھے سب سے بڑے شیخ محمد یوسف تھے جنھوں نے شاہ عبدالعزیز سے علوم کی تکمیل کی تھی

.... غدر سے سات آٹھ سال پہلے جب شاہ محمد اسحٰق و شاہ محمد یعقوب نے ہجرت کی تو یہ بھی اُنکے ساتھ چلے گئے۔" ص۶۳

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں سے شیخ محمد یوسف نام کے کوئی بزرگ کسی کتاب میں نظر سے نہیں گذرے۔ تعجب ہو کہ یہ دہلی کے باشندے تھے اور معمولی خاندان کے آدمی بھی نہ تھے پھر ذاتی حیثیت سے بھی اُنکی یہ خصوصیت تھی کہ آفتاب علم و عمل حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی شاگردی کا فخر حاصل تھا پھر بھی دہلی اور بیرون دہلی کے کسی مُورّخ اور تذکرہ نگار نے ان کا ذکر نہیں کیا۔

علاوہ ازیں شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ اور ان کے برادر خُرد شاہ محمد یعقوب محدث دہلوی نے ۱۲۵۸ھ میں ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سے تقریباً پندرہ سال پہلے ہجرت کی ہے۔ نہ کہ سات آٹھ سال پہلے ــــ میر ظہور علی صاحب نے اُن کی تاریخ ہجرت یوں لکھی ہے۔[۱]

مولوی اسحٰق صاحب، باکمال ترکِ خانہ کرد، سوئے کعبہ رفت
سال تاریخش چنیں گفتہ ظہور یک ہزار و دوصد و پنجاہ و ہشت

۱۲۵۸ھ

(احکام العیدین مولفہ نواب قطب الدین دہلویؒ)

اس موقع پر اتنا عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ شیخ محمد اور شیخ محمد احسن کے درمیان جو چھ سات پیڑیاں ہوں گی انمیں سے کسی کا ذکر نہیں ہے، یہ کیونکر باور کیا جائے کہ مولانا کو اپنے ان درمیانی اجداد کے نام معلوم نہ تھے اور اس وجہ سے یہ سلسلہ غیر متصل رہ گیا ــــ یہ بھی نہیں معلوم ہوسکا کہ شیخ جمال الدین دہلوی کا خاندان دہلی کے کس محلے میں بود و باش رکھتا تھا حتیٰ کہ خود مولانا کے دادا اور والد کے متعلق

---

[۱] مولوی بشیر نے دارالحکومت دہلی میں اور جناب غلام رسول مہر نے جماعت مجاہدین میں شاہ محمد اسحاق محدث کی تاریخ ہجرت ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) لکھی ہے مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی مولف شاندار ماضی نے الفرقان کے شہید نمبر میں ۱۲۶۲ھ میں انکی ہجرت تحریر کی ہے ــ حیات ولی میں ۱۲۶۲ھ تاریخ وفات بتائی ہے اور تاریخ ہجرت کا ذکر نہیں کیا ــ نواب قطب الدین دہلویؒ مولف مظاہر حق نے جو کہ حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کے شاگرد تھے) احکام العیدین کے دیباچے میں دو تاریخیں انکی ہجرت کی درج کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انکا صحیح سال ہجرت ۱۲۵۸ھ ہے۔

اس کتاب سے یہ نہ معلوم ہوسکا کہ وہ دہلی کے کس محلے میں رہتے تھے۔

شیخ منورالدین اس کتاب میں سب سے زیادہ معرکۃ الآرا شخصیت مولانا منورالدین کی ہے جو مولانا آزاد کے والد (مولانا خیرالدین) کے نانا تھے ان کے متعلق مولانا آزاد کی زبانی تفصیلی حالات درج کیے گیے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم علماء لاہور سے حاصل کی اسکے بعد وہ اپنے والد کی اجازت کے بغیر دہلی آگئے اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔

۱۸۰۳ء کو یہ دہلی پہونچے تھے چھ سال تک تحصیل علم میں مشغول رہے۔ مکان پر کسی کو اپنے دہلی آنے کی اطلاع نہیں دی ـــــ شاہ صاحبؒ کے اولین تلامذہ مولانا رشیدالدینؒ مولوی برہان الدین مولانا اسمٰعیل شہیدؒ، شاہ احمد سعید اور مولانا محمد وجیہہ وغیرہ اُن کے ہم درس تھے۔ چھ سال کے بعد جب ان کے والد کے شہید ہونے کی خبر آئی تو یہ قصور چلے گئے اور وہاں سے اپنے اعزہ کو لاکر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی، اپنا ایک مستقل حلقۂ درس قائم کیا۔ بنگال اور دیگر اطراف ہند سے طلبہ جوق در جوق مولانا منورالدین کے پاس آنے لگے۔

مولانا سدیدالدین، مولوی محبوب علی، مولوی فضل امام جو مولانا فضل حق خیرآبادی کے والد تھے مولوی فضل رسول بدایونی اور صاحب کشاف اصطلاحات الفنون مولانا منورالدین کے شاگرد تھے

(دیکھئے ازص۴۱ تا ۴۵)

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ مولانا منورالدین نام کی دہلی میں کوئی ایسی شخصیت ہوئی بھی ہے جس کی یہ امتیازی خصوصیات ہوں ؟ مجھ کو باوجود تلاش بسیار اس نام کا کوئی ایسا شخص نہ ملا جو شاہ صاحب کی شاگردی کا شرف بھی رکھتا ہو اور اطراف ہند سے طلبہ جوق درجوق اس کے حلقۂ درس میں آتے ہوں ـــــ حیات عزیزی، حالات عزیزی تذکرۂ علماء ہند نیز اُس زمانے کے فتاویٰ اور اُن کی مہروں کو دیکھا کہیں اس عظیم الشان شخصیت کا نام ونشان نہ ملا۔

ذرا غور تو فرمایئے ـــــ مولانا منورالدین ۱۸۰۳ء میں دہلی پہونچے ہیں چھ سال (۱۸۰۹ء تک) تعلیم میں مشغول رہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کو فارغ ہوئے کئی سال گذر گئے تھے کیونکہ حضرت شہیدؒ سولہ سال کی عمر میں فارغ ہوئے ہیں۔ ۲۹ اپریل ۱۷۷۹ء آپ کا سال پیدائش ہے۔

۱۸۰۳ء میں جب مولانا منورالدین نے دہلی آکر پڑھنا شروع کیا ہے مولانا شہیدؒ کی عمر تقریباً ۲۴ سال ہوتی ہے۔ اس وقت آپ کو درس دیتے ہوئے بھی چھ سات سال ہوچکے تھے اور ۱۸۰۹ء میں جب مولانا منورالدین فارغ ہوئے (جیسا کہ کہانی میں مذکور ہے) اس زمانے میں تو شاہ صاحبؒ کا آفتاب علم نصف النہار پر چمک رہا تھا پھر مولانا منورالدین کا شاہ صاحب کا ہمدرس ہونا کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے۔ مولانا رشیدالدین دہلویؒ بھی شاہ صاحب کے قدیم ترین تلامذہ میں سے ہیں اور وہ یقیناً مولانا اسمٰعیل شہیدؒ سے بھی پہلے فارغ ہوچکے تھے۔ اُن کا مولانا منورالدین کا ہمدرس ہونا اور بھی بعید ہے ——— شاہ[5] احمد سعید دہلوی مہاجرؒ نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے نہیں بلکہ اُن کے شاگردوں سے پڑھا ہے: وہ کہاں سے ہمدرس ہوسکتے ہیں۔ رہ گئے مولوی برہان الدین اور مولانا محمد وجیہ، ان سے مجھے کوئی واقفیت نہیں اور پتہ نہیں کہ یہ کس کے شاگرد تھے۔

سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ مولانا منورالدین کے تلامذہ کی فہرست میں مولانا محبوب علی مولانا فضل امام، مولوی فضل رسول بدایونی اور صاحب کشاف اصطلاحات الفنون نمایاں طور پر نظر آرہے ہیں ——— حالانکہ ان میں مولانا محبوب علی تو حضرت شاہ صاحب کے مشہور شاگرد ہیں ——— رہے مولانا فضل امام وہ ایک علمی خانوادے کے بانی اور حضرت شاہ صاحب کے معاصرین میں سے اور مولانا سید عبدالواحد کرمانی خیرآبادی کے شاگرد رشید ہیں اور مولانا منورالدین کے دہلی آنے سے مدتوں پہلے دہلی کے صدر الصدور تھے ——— مولانا فضل حق مرحوم کا ہی شاگرد مولانا منورالدین ثابت کرنا مشکل ہے چہ جائیکہ اُن کے والد جو مولانا منورالدین کے پیدا ہونے سے بھی پہلے صاحب درس و افادہ اور مشاہیر علماء میں سے تھے۔

مولوی فضل رسول بدایونی کے متعلق سنئے وہ تحصیل علم کے لئے دہلی ہی نہیں آئے چہ جائیکہ مولانا منورالدین کے آگے زانوئے تلمذ طے کرتے ——— ان کے استادوں کی فہرست اکمل التواریخ

---

[5] انوارالعارفین ص ۴۹۹ پر شاہ احمد سعیدؒ کے تذکرے میں ہے، علوم عقلیہ از مولوی فضل امام و مفتی شرف الدین وغیرہما خواندند و حدیث شریف از تلامیذ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ مثل رشیدالدین خاں وغیرہ خواندند۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے انکے آخری دور میں صرف اجازت اسانید علم حدیث حاصل کی ہو تو بعید نہیں جیسا کہ بعض کتب سے ظاہر ہوتا ہے۔

جلد دوم مولفہ محمد یعقوب بدایونی میں حسب ذیل ہے:۔

(۱) ان کے والد (۲) دادا (۳) مولانا نور الحق فرنگی محلی (۴) حکیم ببر علی موہانی (۵) شیخ محمد عابد مدنی (۶) مولانا عبد اللہ سراج مکی (اکمل التواریخ ص۱۵ تا ۲۰)

اس فہرست میں مولانا منور الدین کا نام کہیں بھی نہیں۔

اب رہ جاتے ہیں صاحب کشاف اصطلاحات الفنون قاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ وہ حضرت شاہ صاحبؒ سے بھی عمر میں کہیں بڑے تھے[۱]۔ بھلا جو شخص شاہ صاحب سے بھی عمر میں بڑا ہو اور جس نے شاہ صاحبؒ کے پیدا ہونے سے بھی ایک سال پیشتر کشاف اصطلاحات الفنون جیسی معرکۃ الآراء کتاب تألیف کی ہو، کوئی تک ہے کہ اس کو مولانا منور الدین صاحب کا شاگرد بتایا جائے! الغرض نہ تو مولانا منور الدین شاہ صاحبؒ کے اولین یا آخرین تلامذہ میں سے ہیں اور نہ ان کے شاگرد وہ اشخاص ہیں جو فہرست میں دکھائے گئے ہیں ۔۔۔ مجھے تو ان بزرگوار کا وجود ہی دہلی کے علماء میں نہیں مل سکا ۔۔۔ میں حیران ہوں کہ مولانا منور الدین کو کس کا شاگرد اور کس کا استاد قرار دوں۔

ایک اور تعجب انگیز بات ان بزرگ کے متعلق سنئے:۔

"بالآخر جب انکی (مولانا منور الدین کی) شہرت بہت ہوئی اور علم کے علاوہ سلوک و طریقت میں بھی مشہور ہوئے جس کا سلسلہ انھیں اپنے والد اور شاہ عبد العزیز سے پہونچا تھا تو شاہ عالم ثانی کے عہد آخر میں ان کو مغلیہ سلطنت کا رکن المدرسین بنا دیا گیا" ص۴۵

قطع نظر اس بات کے کہ یہ بزرگ حضرت شاہ صاحبؒ سے علم باطن میں منسلک تھے یا نہیں؟ اور ان کے والد کون سے روحانی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے؟ غور طلب یہ امر ہے کہ شاہ عالم ثانی کے عہد آخر میں یہ رکن المدرسین کس طرح بنے جب کہ ۱۸۰۹ء میں فارغ ہوئے اور شاہ عالم کا انتقال

---

[۱] نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے سلسلۃ العسجد فی مشائخ السند کے آخر میں جو اپنے کتب خانہ خاص کی فہرست دی ہو اس میں کشاف اصطلاحات الفنون کا اندراج بھی ہو ۔۔۔ انھوں نے اس کتاب کا سن تالیف ۱۱۵۸ھ لکھا ہو۔ اس لحاظ سے قاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ حضرت شاہ عبد العزیزؒ کی پیدائش سے بھی پیشتر صاحب تصنیف و تالیف تھے ان کے نام حضرت شاہ عبد العزیزؒ کا ایک مکتوب (غیر مطبوعہ) دیکھنے سے اتنا معلوم ہوتا ہو کہ شاہ صاحبؒ نے ان کا زمانہ پایا ہے۔

(۲ رمضان ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء کو) انکے فارغ ہونے سے تقریباً تین سال پیشتر ہو چکا تھا۔
علاوہ ازیں رکن المدرسین بھی عہد مغلیہ میں کوئی عہدہ تھا؟ جو ایک طرح کی وزارت تعلیم تھی، اس کو علم تاریخ کے ماہرین خصوصاً مغل سلاطین کے انتظام سلطنت اور قوانین مملکت سے واقفیت رکھنے والے ہی اچھی طرح بتا سکتے ہیں۔ کم از کم میری نظر سے تو عہد مغلیہ کے آئین و دستور میں اس نام کا یا ملک العلماء نقیب الاولیاء اور ملک الاطباء کا کوئی عہدہ نہیں گزرا اور نہ وہ فرائض و اختیارات جو اس کتاب میں بیان کیے گئے ہیں نظر سے گذرے۔ آئین اکبری میں ان چاروں عہدوں میں سے کسی کا وجود نہیں اور اگر اس کے بعد یہ عہدے قائم ہوئے تھے تو جہانگیر سے لے کر اکبر شاہ ثانی تک کی تاریخوں میں ان کا تذکرہ ہوتا۔ ماثر الامراء اور مآثر عالمگیری میں چھوٹے چھوٹے عہدے دارا اور امراء تک کا بھی ذکر ہے مگر ان چاروں القاب میں سے کسی ایک لقب کے ساتھ بھی کسی عہدے دار کا ذکر نہیں۔

جامع مسجد دہلی کا مدرسہ نیز دیگر مدارس اور مولانا منور الدین

"جامع مسجد کے مدرسے اور بعض اطراف کے مدرسوں میں تقریباً پانچسو طلباء کی ضروریات کا انتظام ہوتا تھا شاہ صاحبؒ کے انتقال کے بعد انھوں نے (مولانا منور الدین نے) شاہ صاحبؒ کے نہج کے حلقۂ درس کو جو شاہ ولی اللہؒ کے وقت سے چلا آتا تھا ایک باقاعدہ مدرسہ کی صورت میں مدرسۂ عزیزیہ کے نام سے بنا دیا...... مختلف مساجد جو غیر آباد تھیں انھوں نے ان میں مدرسے قائم کیے چنانچہ بیگم اورنگ کی مسجد میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا جو اب حصار کے متصل چھاؤنی میں آگئی ہے۔ یہ مسجد چھوٹے پیمانے پر جامع مسجد کے نمونے پر ہے اس میں دو رویہ تقریباً ساٹھ حجرے ہیں اور لکھا ہے کہ ان سب میں طالب علم تھے اور شاہ عبدالقادر مترجم قرآن اس کے منتظم تھے۔ جامع مسجد کے تینوں دروازوں کے بالائی حجروں میں شاہجہاں نے مدرسہ قائم کیا تھا اور اوپر کی گیلری بھی مدرسے کے کام آتی تھی۔ شاہ عبدالرحیم اس مدرسے میں درس دے چکے ہیں لیکن تنزل حکومت کے بعد یہ مدرسہ بالکل بند ہو گیا تھا۔ مگر انھوں نے (مولانا منور الدین نے) اپنے زمانۂ رکن المدرسی میں از سر نو اسے جاری کیا اور مفتی صدر الدین جو اس وقت نئے نئے فارغ ہوئے تھے اس کے مہتمم و صدر مدرس قرار پائے یہ درسگاہ غدر سے کچھ پہلے تک رہی الخ" (صفحہ ۴۷، ۴۸)

اس بیان کے متعلق حسب ذیل گزارشات ہیں:۔

(۱) شاہ صاحب کے انتقال کے بعد مولانا منور الدین نے شاہ صاحب کے پنج کے حلقۂ درس کو جو شاہ ولی اللہ کے وقت سے چلا آتا تھا مدرسہ عزیزیہ بنا دیا ــــ یہ ایک ایسا نیا انکشاف ہے جو نہ واقعات دارالحکومت کے مؤلف کو معلوم نہ حیات ولی اور حیات عزیزی کے جامع و مرتب کو ــــ کاش کہ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی پتہ چلتا کہ مدرسہ رحیمیہ کہاں تھا؟ اور یہ پنج کا حلقۂ درس کس محلے میں تھا؟ پھر مولانا منور الدین نے مدرسۂ عزیزیہ کا سنگ بنیاد کس جگہ نصب کیا ــــ؟

(۲) جس مسجد میں شاہ عبدالقادر رہتے تھے وہ اکبرآبادی مسجد تھی (اورنگ کی مسجد نہ تھی) شاہجہاں کی زوجہ فتحپوری بیگم کی مسجد فتحپوری جس طرح آباد رہی اسکی دوسری بیوی اکبرآبادی بیگم کی مسجد بھی ۱۸۵۷ء تک بڑی شان و شوکت کے ساتھ گلزار بنی رہی ــــ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے دور میں تو وہ مسجد ایک خاص تبلیغی مرکز کی حیثیت رکھتی تھی۔ مجاہدینؒ کا ملجاو ماویٰ تھی۔ حضرت سید احمد شہید اور اُن کے رفقاء کا مرجع و موقف تھی ــــ ان حضرات کے بعد بھی اس مسجد کی مرکزیت میں کوئی فرق نہیں آیا ــــ یہ مسجد ۱۸۵۷ء تک کبھی غیر آباد نہیں رہی اس مسجد کی مرکزیت ہی کو پیش نظر رکھ کر انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں اس مسجد کو تباہ و برباد کر دیا۔

(۳) "جو اب حصار کے متصل چھاؤنی میں آگئی ہے، یہ مسجد چھوٹے پیمانے پر جامع مسجد کے نمونے پر ہے اس میں دو رویہ تقریباً ساٹھ حجرے ہیں" (کہانی)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد منہدم نہیں ہوئی ابھی موجود ہے۔ چھاؤنی کے اندر آگئی ہو اگر ایسا ہوتا تو اسکا تذکرہ دارالحکومت دہلی یا آثار الصنادید میں ضرور ہوتا[۱] لیکن دہلی مرحوم کا ہر تذکرہ اس مسجد کے تذکرہ سے خالی ہے۔

دارالحکومت دہلی میں لکھا ہے کہ:۔

"فیض بازار ہی میں یہ مسجد تھی جو غدر کے بعد ڈھایا ڈھوئی کی نذر ہوئی" محل وقوع

---

[۱] الفرقان ــــ آثار الصنادید (مطبوعہ نولکشور پریس) حصہ سوم ص۲۷ پر "مسجد پنجابی کٹرہ" کے نام سے ایک مسجد کا ذکر ہے۔ اس ذیل میں یہ بھی درج ہے کہ یہ مسجد اورنگ زیب عالمگیرؒ کی اہلیہ نواب اورنگ آبادی بیگم نے بنوائی تھی، کہیں اسی مسجد کو تو "کہانی" میں "اورنگ کی مسجد" سے نہیں تعبیر کر دیا گیا ہے مگر شاہ عبدالقادر صاحبؒ سے اس مسجد کے تعلق کا مسئلہ پھر بھی باقی رہے گا۔

اس کا موجودہ ایڈورڈ پارک ہے"۔

اس کے آگے لکھا ہے:۔

"جس وقت اس کے (پارک) لئے زمین ہموار کی جانے لگی تو مسجد کا چبوترہ اور بنیادیں جوں کی توں مثل گنج نہاں کے زمین میں مدفون تھیں ویسے ہی ڈھک دی گئی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خانہ خدا اور یہ بے نظیر عمارت نظروں سے پوشیدہ ہو گئی [۱]

(۴) جامع مسجد دہلی کا مدرسہ تینوں دروازوں کے بالائی حجروں میں نہیں تھا۔ بلکہ مدرسہ کی عمارت جامع مسجد کے نیچے تھی اور جامع مسجد دہلی کے ساتھ ہی اسکی تعمیر ہوئی تھی اس مدرسے کا نام دارالبقاء تھا۔ مرقع سلاطین مولفہ منشی محمد عبد الغفور دہلوی میں لکھا ہو:۔

"دارالشفاء، دارالبقاء — یہ دونوں مکان جامع مسجد کے ساتھ تعمیر ہوئے تھے اور بادشاہ کی طرف سے حکیم مقرر تھے بیماروں کو (دارالشفاء میں) دوا ملتی تھی — اور دارالبقاء مدرسہ ہے۔

ابتدار کا نشان بھی باقی نہیں رہا وہاں اب صرف کنیر کے درخت ہیں (مرقع سلاطین ص۲۲)

اتحاف النبلاء مولفہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم میں بھی تذکرہ مفتی صدر الدین دہلوی کے ضمن میں۔ "مدرسہ دارالبقاء زیر جامع مسجد دہلی" لکھا ہوا ہے — (اتحاف النبلاء ص۲۶)

(۴) شاہ عبد الرحیم دہلویؒ نے دارالبقاء میں کبھی درس نہیں دیا۔ انھوں نے تمام عمر میں صرف ایک مرتبہ اپنے ایک ہمدرس مولانا حامدؒ کے اصرار اور والدہ ماجدہ کے حکم سے فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب و تصحیح کے زمانے میں عالمگیرؒ کے یہاں ملازمت کر لی تھی لیکن اُن کے پیر و مرشد خلیفہ ابو القاسمؒ نے اس ملازمت سے منع کیا۔ اتفاق سے تصحیح فتاویٰ کے سلسلے میں ایک ایسی بات پیش آگئی کہ انھیں یہ ملازمت ترک کر دینی پڑی۔ عالمگیرؒ نے انکو جاگیر دینی چاہی مگر اس سے بھی انکار کر دیا۔ (انفاس العارفین ص۲۷) — غرضکہ شاہ عبد الرحیمؒ کا اس شاہی مدرسۂ دارالبقاء سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ وہ حکومت کے کسی شعبے میں — سوائے ان چند ایام کے جو تصحیح فتاویٰ میں گزرے — ملازم رہے۔

(۵) مفتی صدر الدینؒ کے بارے میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم (جنھیں مفتی صاحبؒ سے تلمذ کا شرف

---

[۱] الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر مقالہ مولانا گیلانی بحوالہ دارالحکومت دہلی۔

حاصل ہے) تحریر فرماتے ہیں۔

"در عصر خود یگانۂ روزگار ونادرۂ عصر بود" ــــــ اسکے بعد لکھتے ہیں:۔

"ریاستِ درس و تدریسِ معقولات بالخصوص وافتائے ممالکِ محروسۂ مغربیہ ملکہ شرقیہ و شمالیۂ دہلی وامتحان مدارس وصدارت حکومت دیوانی بوے منتہی شدہ"۔

اس کے بعد رقمطراز ہیں ــــــ "صاحب وجاہت بودنزد امراء وعلماء وحکام ورعایائے شہر" ان کے مکان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

سوائے بادشاہ وقت کے، اعیان واکابر دہلی ونواح دہلی میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو اُن کے مکان پر حاضر نہ ہوتا ہو ــ طلباء اخذ علم کے لئے۔ اہل دنیا مشورہ معاملات کی غرض سے، انشاء نگار اصلاح انشاء کے واسطے اور شعراء برائے مشاعرہ ان کے مکان پر آتے جاتے ہیں"

اُن کے اخلاق واحسان کا تذکرہ کرتے ہوئے اُن کے اس سلوک کا ذکر بھی کیا ہے جو وہ طلباء دار البقاء کے ساتھ طعام ولباس اور وظائف کی شکل میں کیا کرتے تھے۔

(ماخوذ از اتحاف النبلاء صفحہ ۲۶)

اس سے بھی بڑھ کر سرسید احمد خاں مرحوم سے سنیئے! آثار الصنادید میں اُن کا تذکرہ شروع ہی اس شعر سے کرتے ہیں:۔

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبیست

(باب چہارم صفحہ ۴۲ مطبوعہ نولکشور پریس)

اس کے بعد چار سطر کے القاب لکھ کر نام زبان پر لاتے ہیں اور کہتے ہیں:۔

"قلم کو کیا طاقت کہ انکے اوصافِ حمیدہ سے ایک حرف لکھے، اور زبان کو کیا یارا کہ اُن کے محامدِ پسندیدہ سے ایک لفظ کہے" (صفحہ ۴۳)

پھر قلم بھی اٹھاتے ہیں تو اعتراف کرتے ہیں:۔

مجلس تمام گشت و بپایاں رسید عمر ما ہمچناں در اوّلِ وصف تو ماندہ ایم

(ایضاً)

آپنے دیکھا کہ مفتی صدر الدین صدر الصدور کی علمی وجاہت اور عظیم شخصیت کسقدر بلند

بام اور عالی مقام ہے۔ وہ مفتی صدر الدینؒ جو درس و تدریس کے علاوہ افتاء، امتحاناتِ مدارس اور صدارت حکومت دیوانی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ بادشاہ وقت کو چھوڑ کر تمام روساء اور اکابر ان کے مکان پر حاضر ہوتے تھے ـــــ جو اپنے وقت کے صاحب وجاہت عالم تھے ـــــ اُن کو مولانا منور الدین "رکن المدرسین" کے مقابلے میں نیا نیا فارغ التحصیل بتاکر مولانا منور الدینؒ کا مقرر کردہ مہتمم وصدر مدرس بتایا جارہا ہے! آخر یہ کیونکر سمجھ میں آنے والی بات ہے؟ ـــــ اور مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ مولانا منور الدین نے جو حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے سخت مخالف تھے، صدر مدرس اس شخص کو بنایا جو حضرت شہیدؒ کی تعریف میں رطب اللسان رہتا تھا! نواب صدیق حسن خاں مرحوم لکھتے ہیں :۔

"بارہا از زبانش ثنا وصفت مولانا محمد اسمٰعیل شہید و مولوی اسحٰق دہلوی نزیل مکہ مکرمہ شنیدہ شدہ" (اتحاف)

حیرت کی بات ہے کہ مولانا منور الدین جن کے توسط سے دہلی اور اطراف دہلی کے پچاس سے زائد مدارس کو قلعہ دہلی سے وظیفے ملتے تھے۔ (تحفۂ ہمانی صفحہ) اور جنھوں نے "مدرسہ شاہجہانی دارالبقاء کو از سر نو زندہ کیا" انکا کسی تذکرہ نویس نے ذکر نہیں کیا اور مفتی صدر الدینؒ کا اس زمانے کے ہر تذکرہ نویس نے ذکر کیا ہے۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ مدرسہ دارالبقاء کو از سر نو آباد کرنے والے مفتی صاحبؒ ہی تھے۔ وہی اس کے سرپرست اور وہاں کے طلباء کے کفیل تھے۔ سرسید احمد خاں آثار الصنادید میں لکھتے ہیں :۔

"یہ مدرسہ بالکل خراب و برباد ہو گیا تھا اور بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا تھا .... جناب ممدوح (جناب مولانا مولوی صدر الدین خاں بہادر صدر الصدور) نے اپنی عالی ہمتی سے اس دارالبقاء کو زر خطیر صرف کرکے از سر نو مرتب کیا ہے، اور شاہجہانی طور پر جو حجرے

---

[1] آثار الصنادید ہی کو دیکھ لیجئے۔ مفتی صدر الدین صاحبؒ کا جیسا والہانہ ذکر ہے، وہ تو ہے ہی۔ اُن حضرات کا بھی تذکرہ اس میں ملتا ہے جن کو مولانا منور الدین کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ مگر نہیں ملتا تو مولانا منور الدین کا تذکرہ۔ آخر ان سب تذکرہ نگاروں کو مولانا موصوف سے ہی ایسی کیا کد ہو گئی تھی؟

اُس کے ٹوٹ گئے تھے، اُن کو نئے سرے سے بنایا ہے، اور مدرس نوکر ہیں اور طالب علم پڑھتے ہیں، اُن کی خبرگیری نان و پارچہ کی اُن کی سرکار عالی سے ہوتی ہے۔ سبحان اللہ غور کرو کہ یہ کیا چشمۂ فیض ہے جو اُن کی ذات فیض آیات سے جاری ہے۔"

(باب سوم صفحہ ۱۲)

ڈولے کی رسم اور مولانا منور الدین

"بہرحال اکبر کے وقت سے یہ رسم جاری تھی اور بڑے بڑے بادشاہ اسی طرح پیدا ہوئے اس لئے معاملہ بہت نازک ہو گیا تھا۔ کیونکہ اگر اسکے عدم جواز پر زور دیا جاتا تو یہ معنیٰ تھے کہ جہانگیر، شاہ جہاں، دارا شکوہ، شجاع اور فرخ سیر تک کی پیدائش معرض بحث میں آجاتی، اسی لئے یہ ایک ایسا موضوع تھا کہ علماء دنیا کبھی اس طرف اشارہ تک نہ کرتے اور اپنے لئے موجب ہلاکت تصور کرتے تھے۔" (کہانی صفحہ ۵)

"مولانا منور الدین ڈولے کی رسم کی علانیہ مخالفت کرتے اور اُسے حرام بتاتے تھے۔"

(صفحہ ۵ وا)

معلوم نہیں کہ دارا شکوہ اور شجاع کو ڈولے کی پیدا وار کیسے قرار دے لیا گیا حالانکہ یہ دونوں شہزادے، اورنگ زیب عالمگیرؒ کے حقیقی بھائی اور ممتاز محل ارجمند بانو بیگم کے بطن سے تھے ___ جو اعتماد الدولہ آصف خاں کی صاحبزادی نورجہاں بیگم کی بھتیجی اور مرزا غیاث الدین کی پوتی تھیں اور شاہجہاں کی سوائے ان کے کسی دوسری بیگم کے بطن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ جو اولاد ممتاز محل کے سامنے زندہ رہی وہ حسب ذیل ہے:۔

(۱) دارا شکوہ (۲) شاہ شجاع (۳) مرزا مراد بخش (۴) اورنگ زیب عالمگیر (۵) انجمن آرا (۶) گیتی آرا (۷) جہاں آرا۔ (مخدرات تیموریہ مولفہ سید ظہور الحسن دہلوی صفحہ ۳۷)

مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا منور الدین

"مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ مولانا منور الدین کے ہمدرس تھے۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے انتقال کے بعد جب انھوں نے تقویۃ الایمان اور جلاء العینین لکھی اور ان کے مسلک کا ملک میں چرچا ہوا تو تمام علماء میں ہلچل پڑ گئی۔ ان کے رد میں سب سے زیادہ سرگرمی و سربراہی

مولانا منورالدین نے دکھائی، کتابیں لکھیں" ص۵۶

میں پہلے ثابت کر چکا ہوں کہ مولانا منورالدین ہرگز مولانا شہیدؒ کے ہمدرس نہیں تھے اور جلاء العینین نام کی کوئی کتاب مولانا شہیدؒ کی تالیف یا تصنیف نہیں ہے — رہی مولانا منورالدین کی مخالفت شہیدؒ میں سرگرمی و سربراہی، اسکے متعلق عرض ہے کہ مولانا منورالدین کا اوّل تو ان امتیازی خصوصیات کیساتھ وجود ہی عنقا ہے، علاوہ ازیں حضرت شہیدؒ کی علمی شخصیت اور خاندانی وجاہت کے آگے بڑے سے بڑے مخالف کی جرأت نہ ہوئی کہ ان کی مخالفت میں سرگرمی دکھائے۔ اگر کسی معاصر نے علمی حیثیت سے تہذیب و متانت کے ساتھ بعض مسائل پر ان سے تحریری مناظرہ کیا ہے تو وہ مولانا فضل حق خیرآبادی تھے۔ —

تقویۃ الایمان کے متعلق اتنا عرض کر دوں کہ وہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کے زمانہ حیات ہی میں سید صاحب اور مولانا شہیدؒ کے سفر حج سے پہلے تصنیف ہو چکی تھی۔

مولانا منورالدین نے خدا جانے کون کون سی کتابیں لکھیں، کاش ان کتابوں میں سے کسی ایک کتاب کا سراغ مل جاتا جو مولانا منورالدین نے حضرت شہیدؒ کی رد میں لکھی تھیں۔

جامع مسجد دہلی کا مباحثہ

" مولانا منورالدین نے ۱۲۴۰ھ والا مشہور مباحثہ جامع مسجد میں کیا، تمام علماء ہند سے فتویٰ مرتب کرایا پھر حرمین سے فتویٰ منگایا۔ انکی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ابتدا میں مولانا اسمٰعیل اور اُن کے رفیق اور شاہ صاحب کے داماد مولانا عبدالحیؒ کو بہت کچھ فہمائش کی اور ہر طرح سمجھایا لیکن جب ناکامی ہوئی تو بحث و رد میں سرگرم ہوئے اور جامع مسجد کا شہرۂ آفاق مناظرہ ترتیب دیا جس میں ایک طرف مولانا اسمٰعیل اور مولانا عبدالحیؒ تھے اور دوسری طرف مولانا منورالدین اور تمام علماء دہلی — بحث اُن تمام مسائل پر تھی جو تقویۃ الایمان کیوجہ سے چھڑ گئے تھے" ص۵۶

جامع مسجد دہلی کا یقیناً یہ وہی مباحثہ ہے جس کی مفصل روداد مولوی فضل رسول بدایونی نے اپنی کتاب سیف الجبار میں (ص۴۵ سے ص۴۸ تک) درج کی ہے جس سے مندرجہ بالا بیان کے برخلاف امور ذیل ثابت ہوتے ہیں:-

(۱) یہ مجلس مناظرہ سنہ ۱۲۴۰ھ میں منعقد ہوئی ۔ سنہ ۱۲۴۸ھ میں نہیں ۔ بھلا سنہ ۱۲۴۸ھ میں مولانا عبدالحئی رحؒ اور مولانا شہیدؒ کہاں تھے؟ مولانا عبدالحئی سنہ ۱۲۴۳ھ میں وفات پا چکے تھے اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ سنہ ۱۲۴۶ھ میں جام شہادت پی چکے تھے۔

(۲) مولانا منورالدین نام کے کوئی صاحب اس مجلس مناظرہ میں معروف یا غیر معروف حیثیت کے موجود نہیں تھے ۔ اگر وہ سرگرم مخالف، بانی مناظرہ اور سربراہ ہوتے تو مولوی بدایونی اُن کا ذکر ضرور کرتے خصوصاً جب کہ کہانی کے بیان کے بموجب مولوی فضل رسول مولانا منورالدین کے شاگردوں میں تھے۔

(۳) حرمین سے کوئی فتویٰ مخالفین نے نہیں منگایا تھا۔ دہلی ہی کے کچھ علماء کی مہریں ایک استفتاء پر تھیں۔

(۴) مناظرانہ گفتگو آخر تک صرف مولانا عبدالحئیؒ سے ہوئی تھی۔

رسالہ ما اُھل بہ لغیر اللہ اور مولانا منورالدین

"(مولانا منورالدین کا) ایک رسالہ ما اہل بہ لغیر اللہ کے جھگڑے کی نسبت ہے اس میں جنھیں بڑی مشکل پیش آئی، اس لئے کہ یہ مسئلہ دراصل شاہ عبدالعزیزؒ کی وجہ سے چھڑا۔ انھوں نے تفسیر فتح العزیز میں اس کی تفسیر کرتے ہوئے صاف لکھ دیا کہ اہلال سے مقصود ندا ہے نہ کہ عندالذبح اس کا منسوب کرنا اگرچہ شاہ صاحب ان کے استاد ہیں تاہم اس مسئلے میں بڑی سختی سے ان کا رد کیا ہے اور اپنے نزدیک یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تمام مفسرین سلف کے خلاف انھوں نے تفسیر کی ہے۔ اس کے آخر میں بہت سے علماء کی تقریظیں و تحریریں ہیں جن میں ایک تقریظ مفتی صدرالدین کی بھی ہے" ص ۵۸، ۵۹

اوّل تو اس معرکۃ الآراء رسالے کا وجود ہی مشتبہ ہے۔ اور اگر ہو بھی تو جہاں تک مفتی صدرالدین دہلویؒ کی تائید و تقریظ کا تعلق ہے اس کے متعلق پورے وثوق سے عرض کرتا ہوں کہ یہ ہرگز صحیح نہیں ہے۔

منحۃ المؤمنین من کید الحاسدین (مولفہ قاضی محمد حسین مطبوعہ پونہ) کے ص ۵۰ پر ایک فتویٰ اسی مسئلے سے متعلق حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی تائید میں درج ہے۔

اس پر مولانا محمد قطب الدین دہلویؒ، مولانا محبوب علی، مولانا محمد کریم اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا عبدالخالق، مولانا مخصوص اللہ، مولانا مملوک علی، مولانا حیدر علی، اور مولانا احمد علی کے ساتھ ساتھ نمایاں طور پر مفتی محمد صدر الدین صدر الصدور کے دستخط بھی ثبت ہیں۔ اسی کتاب منہج المومنین کے صفحہ ۱۱۶ پر مولانا عبدالقیوم صاحب صدیقی ابن مولانا عبدالحیٔ بڈھانوی مفتی بھوپال کا یہ خط بھی نقل کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صدر الدین صاحب اس مسئلے میں اپنے استاد کے مسلک پر تھے۔

مکرما! دما اہل بہ لغیر اللہ نزد عاجز واکثر علماء
بلاشبہ حرام است ذبیحہ بلا خلاف حرام واگر کسے را
اختلاف است در غیر ذبیحہ است نہ در ذبیحہ
چنانچہ در بنیادہ یک رسالہ الموسوم بزبدۃ النصائح
از تصنیف مولوی تراب علی صاحب لکھنوی
کہ مواہیر علماء دہلی مثل مفتی صدر الدین صاحب
...... وغیرہ مطبوع شدہ ازاں وضاحت
مسئلہ مذکور طلب باید کہ ہمہ اقوال مختلف وغیر مختلف
علماء متقدمین ومتاخرین دراں مندرج اند واقی
توضیح وتنقیح معنی ایں آیت شریفہ آنچہ در تفسیر
عزیزیہ مرقوم است در دیگر کتب کمیاب ازاں
تشفی خاطر خود خواہند ساخت کہ دقیقہ از
دقائق دراں فروگذاشت نگردیدہ و اشتیاق
رسامی باد۔ والسلام
(۵ رمضان المبارک ۱۲۷۱ھ)

مکرما! جو جانور غیر اللہ کا نامزد ہو کر ذبح
کیا جائے وہ میرے اور اکثر وبیشتر علماء کے
نزدیک بلا خلاف حرام ہے۔ کسی کو اگر اختلاف
ہے تو غیر ذبیحہ کے بارے میں ہے نہ کہ ذبیحہ کے۔
اس مسئلہ میں ایک رسالہ زبدۃ النصائح نام کا
ہے جو مولوی تراب علی لکھنوی کی تصنیف ہے اور
جس میں علماء دہلی مثلاً مفتی صدر الدین صاحب
وغیرہ کی مہریں ہیں اور جو طبع ہو گیا ہے اس
رسالے سے مسئلہ مذکور کی وضاحت معلوم کریں
اس میں علماء متقدمین ومتاخرین کے تمام مختلف
وغیر مختلف اقوال درج ہیں۔ یہی اس آیت شریفہ
کی توضیح وتنقیح تو جو کچھ تفسیر عزیزی میں شاہ
عبدالعزیزؒ نے لکھا ہے وہ دوسری کتابوں میں
کمیاب ہے، اس سے اپنی تشفی خاطر کریں اس میں
کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا ہے۔

پھر بھلا وہ کس طرح اپنی تحقیق اپنے مسلک اور اپنے عقیدہ کے خلاف مولوی منور الدین کے رسالہ پر تقریظ لکھ سکتے تھے۔

نواب سکندر بیگم اور مولانا منور الدین | بات یہیں ختم نہیں ہوتی کہ مولانا منور الدین شاہ عبدالعزیزؒ

کے ارشد تلامذہ میں سے تھے یا نہیں؟ اور وہ رکن المدرسین کے بلند پایہ عہدے پر فائز رہے یا نہیں؟، انھوں نے جامع مسجد دہلی میں مخالفینِ شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ کے ہمراہ ہو کر مجلس مناظرہ میں گرمی کے ساتھ حصہ لیا تھا یا نہیں؟ اُن کے دیگر کارہائے نمایاں کی طرح اُن کا سفر بھوپال بھی بڑا دلچسپ اور بڑا ہی حیرت انگیز ہے۔ اور اس سفر کی داستان پڑھ کر ایک مستقل سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان بزرگوار نے سفر بھوپال کیا بھی ہے یا نہیں؟ ان کے بھوپال پہونچنے پر نواب سکندر بیگم کا ان کے ہاتھ پر تائب ہونا اپنے عیش محل کو مسجد بنانا جہانگیر محمد خاں کا "جو نواب سکندر بیگم سے غایت درجہ وابستہ تھا" (یعنی شوہر نہیں تھے) بیگم کی نظر التفات سے محروم ہونے کی بنا پر اُن سے حسد کرنا اور رقابت میں زہر دینا خود اُن کا بھی مولانا منورالدین کے ہاتھ پر تائب ہونا اور انکی جوتیاں اٹھا کر پالکی کے ساتھ دوڑنا اور اسے اپنے لئے باعث سعادت سمجھنا، یہ سب واقعات ... تک کہانی کے اندر درج ہیں۔

پہلے اس سلسلے کے کچھ ضروری اقتباسات پیش کر دوں پھر اس بارے میں عرض کروں گا۔

"ان کے بعد (مولانا محمد اسحاقؒ کے بعد) مولانا منورالدین بھی ہندوستان سے برداشتہ خاطر ہو گئے اور ہجرت پر آمادہ ہوئے ان کے مریدین و معتقدین تمام شمالی ہند و پنجاب میں پھیلے ہوئے تھے انھوں نے یہ سنا تو جوق جوق آنے لگے اور کچھ دنوں کے لئے دہلی کا یہ حال ہو گیا کہ ہزاروں آدمی اس کی آبادی میں بڑھ گئے اس ہجوم کی وجہ سے وہ اس سال نہ جا سکے اور دوسرے سال روانہ ہوئے ...... چنانچہ یہ بھی روانہ ہوئے جب بھوپال پہونچے تو نواب سکندر بیگم کا زمانہ تھا وہ ان کا ذکر خیر پہلے سے سن چکی تھیں، انھوں نے نہایت اصرار کے ساتھ کہا کہ چند دن بھوپال میں قیام فرمائیں — نواب سکندر بیگم کے حالات ویسے ہی ناخوش گوار تھے جیسے عموماً اُمراء کے ہوا کرتے تھے — مولانا کو ان حالات کی اطلاع تھی۔ یہ شہر سے باہر رک گئے اور کہلا بھیجا کہ میں اس شرط سے آسکتا ہوں کہ بیگم صدق دل سے تائب ہو۔ بیگم خود شہر سے باہر آکر ان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس درجہ متاثر ہوئی کہ اُن کے ہاتھ پر تائب ہو گئی اور شہر میں لاکر اسی محل میں ٹھہرایا، جسے پہلے ایک تالاب کے وسط میں عیش و نشاط کے لئے بنایا تھا اور اب مسجد کر دیا تھا۔ چند دن کے بعد مولانا نے آگے بڑھنا چاہا مگر بیگم مانع ہوئی اور چند روز توقف کرنے کی درخواست کی۔ اس پر انھوں نے مستعجل رفقاء کو سفر کی اجازت دیدی اور خود اس سال ٹھہر گئے۔ بھوپال میں ان کی وجہ سے بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔

نواب بیگم کی بالکل کایا پلٹ ہوگئی اور ایک بڑی خلقت اُن کے ہاتھ پر تائب ہوکر مرید ہوئی۔

قیام بھوپال کے زمانے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا نواب جہانگیر خاں، جو نواب سکندر بیگم سے نہایت درجہ وابستہ تھا، جب مولانا کے ہاتھ پر (بیگم کے) تائب ہونے کی وجہ سے بیگم کی نظر التفات سے محروم ہوگیا تو اُن سے سخت حسد و رنج پیدا ہوا...... نواب جہانگیر خاں نے انھیں زہر دے دینا چاہا، چنانچہ ایک روز جب بیگم کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے اور متعدد امراء اور خود جہانگیر خاں بھی دسترخوان پر تھے اور بیگم خود اپنے سامنے سے کھانے کی قابیں اٹھا اٹھا کر مولانا کے سامنے رکھتی تھی کہ ایک پلیٹ مزعفر کی بیگم نے اُن کے سامنے اٹھا کے رکھی اسی میں درحقیقت زہر تھا۔ مولانا کو کسی طرح یہ بھید معلوم ہوگیا اور انھوں نے وہ قاب اٹھا کر نواب جہانگیر خاں کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھائی نواب صاحب، یہ آپ کے کھانے کی چیز ہے۔ نواب پر اس بات کا ازحد اثر پڑا اس نے اسے انکی کرامت تصور کیا۔ بے اختیار کانپنے لگا اور اسی وقت قدموں پر گر کر سچے دل سے تمام معاصی وفسوق سے توبہ کی پھر تو اس کی یہ حالت ہوئی کہ ان کی جوتیاں اٹھا کر پالکی کے ساتھ دوڑتا اور اسے اپنے لئے باعث سعادت سمجھتا"۔ (کہانی ص۶۱ تا ۶۲)

اب تاج الاقبال تاریخ بھوپال مولفہ نواب شاہجہاں بیگم سے بقدر ضرورت کچھ اقتباس تحریر کرتا ہوں یہ اقتباس بھی ذہن نشین رہے:-

(۱) غرہ رمضان ۱۲۵۳ھ کو نواب صاحب بہادر (جہانگیر محمد خاں) بتجویز صدر...... صدر نشین ہوئے...... ششم جمادی الاولیٰ ۱۲۵۴ھ کو اسلام نگر میں میری ولادت ہوئی...... ۱۲۵۶ھ میں محلہ جہانگیر آباد آباد کیا۔ اٹھائیسویں ذی قعدہ ۱۲۶۰ھ کو چھبیس ۲۶ برس کی عمر میں انکا (نواب جہانگیر محمد خاں کا) انتقال ہوا۔ نور باغ میں مدفون ہوئے۔

(تاج الاقبال دفتر اول ص۴۱ و ۴۲)

(۲) (نواب سکندر بیگم) ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئیں اٹھارویں ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ کو انکا نکاح (نواب جہانگیر محمد خاں سے) ہوا پندرھویں محرم ۱۲۶۳ھ کو مختار ریاست ہوئیں، نویں شوال ۱۲۷۶ھ کو برضامندی میری اور منظوری نواب گورنر جنرل بہادر نائب السلطنت فرمانفرمائے ہند، صدر نشین بھوپال ہوئیں اور رئیس مستقل ٹھہریں۔ سیزدہم رجب ۱۲۸۵ھ کو اس دار فانی سے سرائے جاودانی

کو گئیں۔" (تاج الاقبال دفتر دوم ص۶)

اسکے بعد یہ طے کرنا ہے کہ مولانا منور الدین نے یہ سفر کس سن میں کیا ہے؟ ۔ آزاد کی کہانی میں صراحۃً کوئی سن نہیں ملتا ـــــ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد اسحاقؒ کی ہجرت کے بعد "یہ بھی ہندوستان سے بردا شتہ خاطر ہو گئے اور ہجرت پر آمادہ ہوئے"........ مگر جب ذرا غور کیا تو خود اسی کتاب سے ضمناً سفر ہجرت اور سفر بھوپال کا زمانہ نکل آیا ـــــ اگرچہ حساب لگانے میں رجعت قہقری کرنا پڑی مگر گتھی سلجھ گئی ـــــ دیکھئے کہانی کے ص۶۲ و ۶۳ پر ہے:۔

"ایک سال کے بعد مولانا (منور الدین) بھوپال سے بمبئی عازم ہوئے......یہاں (بمبئی میں) دو سال قیام رہا تیسرے سال مکہ معظمہ پہونچے اور پانچ سال میں پانچ حج کر کے وہیں انتقال کیا اسی سال ہندوستان میں غدر ہوا۔"

ہندوستان میں "غدر" ۱۲۷۳ھ میں ہوا ہے ـــــ اس میں سے پانچ سال قیام مکہ کے کم کیے ۱۲۶۸ھ برآمد ہوئے اس میں سے دو سال قیام بمبئی اور ایک سال قیام بھوپال کے کم کیے احتیاطاً ایک سال سفر حج کا بھی کم کیا تو تقریباً ۱۲۶۴ھ برآمد ہوئے۔ یہ زمانہ اُن کے بھوپال آنے کا ہے .... اور اس وقت نواب جہانگیر محمد خاں کا انتقال ہوئے کم از کم چار سال گذر چکے تھے ـــــ خود کہانی کے اندر بھی موجود ہے کہ "جب بھوپال پہونچے تو نواب سکندر بیگم کا زمانہ تھا"۔ نواب سکندر بیگم ۱۵ محرم ۱۲۶۳ھ کو مختار ریاست ہوئی ہیں اس سے پہلے اپنے شوہر نواب جہانگیر محمد خاں کے زمانہ حیات میں وہ مختار ریاست نہیں تھیں خود اُن کے شوہر والی ریاست تھے۔ جیسا کہ تاج الاقبال تاریخ بھوپال کے حوالے سے لکھا جا چکا ہے ـــــ اس حقیقت کے بعد کیا اصل رہ جاتی ہے نواب جہانگیر محمد خاں کے مولانا منور الدین سے حسد و رنج کرنے، زہر کھلانے کی کوشش فرمانے اور پھر ان کے ہاتھ پر توبہ کی اور انکی پالکی کے ساتھ ان کی جوتیاں اٹھا کر دوڑنے کی؟ علاوہ ازیں نواب جہانگیر محمد خاں مرحوم تو نواب سکندر بیگم کے شوہر اور بھوپال کے فرماں روا تھے ـــــ "وابستگی" کے کیا معنی اور نظر التفات سے محروم ہونے کا کیا مطلب؟

مزخرفی کتاب میں زہر کھلا دینے کا قصہ اگرچہ بیّن طور پر ختم ہو گیا لیکن قطع نظر تاریخی حقائق کے خود اس واقعے کے اجزا اس کے عدم وقوع پر دلالت کر رہے ہیں۔

غور تو کیجئے ـــــ بیگم جب مولانا منور الدین کے ہاتھ پر تائب ہو چکی تھیں تو نواب جہانگیر محمد خاں جو

مولانا منورالدین کے مخالف تھے اور بیگم کی نظر التفات سے محروم بھی ہوچکے تھے پھر دعوت میں کس تدبیر سے آئے اور یہ زہر آلود پلیٹ بیگم کے دسترخوان پر کس طرح پہونچی؟ علاوہ ازیں زہر کا علم رئیسہ کو تھا یا نہیں؟ اگر تھا تو خود رئیسہ نے جہانگیر محمد خاں سے مولانا کی مخالفت میں سازش کرلی تھی؟ اگر علم نہ تھا تو پھر رئیسہ نے وہی قاب مولانا کے سامنے کیوں بڑھائی اس میں سے خود کیوں نہیں کھایا۔۔۔ کیا اس میں رئیسہ کی بھی کرامت شامل تھی؟۔۔۔ اور خود مولانا منورالدین کی مذہبی حمیت نے یہ کیسے گوارا کیا کہ وہ ایک غیر محرم رئیسہ کے ساتھ کھانا تناول فرمائیں؟ اور بعد میں جب نواب جہانگیر محمد خاں نادم و تائب ہوگئے اور مولانا کی جوتیاں اٹھائے اٹھائے پالکی کے ساتھ پھرتے تھے تو ان پر اور انکے خاندان پر اور ان کے حلقۂ اثر پر مولانا منورالدین کے خیالات و عقائد کا اثر کیوں نہیں پڑا؟۔

حقیقت یہ ہے کہ بھوپال میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا اور کیسے پیش آتا جب کہ مولانا مذکور کے بھوپال آنے کے وقت نواب جہانگیر محمد خاں کا دنیا میں وجود ہی نہ تھا۔

تاریخ بھوپال شاہد ہے کہ وہاں کبھی ایسے عالم کو جو قرآن و حدیث پر بطریق صحیح عامل نہ ہو، خاندان ولی اللہی کے مسلک کا سخت مخالف ہو۔ کوئی امتیاز نہیں ملا ہے۔ نواب جہانگیر محمد خاں مرحوم سے لیکر نواب سلطان جہاں بیگم تک سب کے سب بدعات سے نفور اور اہل حق کے معتقد رہے ہیں (اور آج بھی بحمداللہ یہ علاقہ شیوع بدعات سے محفوظ ہے) چنانچہ خود نواب جہانگیر محمد خاں کے عہد حکومت میں مولانا شریف حسین دہلوی قاضی ریاست تھے۔ نواب سکندر بیگم کے زمانے میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم پہلے میر منشی رہے پھر مرحومہ نے اُن کے علم و فضل کو ملاحظہ فرماکر ریاست بھوپال کا مہتمم عملہ تاریخ نگاری مقرر کیا پھر وہ افسر محکمہ مدارس اسلامیہ بھوپال بنائے گئے۔۔۔ منشی جمال الدین مرحوم مدارالمہام بھوپال کو یہ عظیم الشان شرف حاصل ہے کہ انھوں نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفا کو سب سے پہلے ہندوستان میں طبع کرایا۔[۱]

---

[۱] منشی جمال الدین مرحوم مدارالمہام ریاست بھوپال کے مختصر حالات، مآثر صدیقی (مؤلفہ صفی الدولہ حسام الملک نواب سید محمد علی حسن خاں ابن نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم) میں اس طور پر درج ہیں:۔

"یہ منشی وحید الدین مرحوم بن محی الدین بن حسام الدین کے بیٹے تھے، سلسلہ نسب ان کا محمد بن ابی بکر رضؓ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نواب سکندر بیگم ایک عفت مآب، عصمت شعار، پابند صوم وصلوٰۃ اور خوش عقیدہ رئیسہ تھیں۔ انھوں نے ۱۲۸۰ھ میں اس زمانے میں حج کیا جب ہندوستان کے نوابوں[۵۱] میں حج کا رواج نہیں تھا۔ حجاز میں انھوں نے ہزارہا روپیہ خیرات کیا، قیام حجاج کے لئے رباط بھوپال کو بنایا اور اس کے تمام مصارف ریاست سے ادا کرتی تھیں۔ جب حج کو گئیں تو مولانا عبد الحیٰ بڈھانوی رفیق حضرت سید احمد شہیدؒ کے اکلوتے صاحبزادے مولانا عبد القیوم[۵۳] محدثؒ کو بھوپال تشریف لانے کی دعوت دی چنانچہ مولانا عبد القیوم انھیں کی درخواست پر بھوپال آئے اور یہاں بیٹھ کر تشنگان علم حدیث و قرآن کو مدتوں سیراب کیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱) پر منتہی ہوتا ہو قدیم وطن انکا بوریہ سہارنپور تھا...... منشی جمال الدین خاں مرحوم ۱۲۱۶ھ میں پیدا ہوئے۔ جب سن تمیز کو پہونچے تو تحصیل علم کی غرض سے دار السلطنت دہلی میں آئے...... مولوی مملوک علی صاحب مدرس مدرسہ انگریزی کے حلقۂ درس میں داخل ہو گئے اور مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے مجالس وعظ میں شریک ہونا انھوں نے اپنے اوپر لازم کر لیا" اس کے بعد لکھا ہو کہ کچھ حالات ایسے پیش آئے کہ تحصیل علم کا سلسلہ منقطع سا ہو گیا۔ اور پھر ایک خاص واقعہ درج کر کے لکھا ہو کہ "تحصیل علم کا سلسلہ از سر نو شروع کیا مولانا شاہ عبد العزیز صاحبؒ اور مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلویؒ کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے اور مولوی محمد اسحاق صاحبؒ اور محمد یعقوب صاحبؒ مہاجر مکہ معظمہ سے تعلیم کی تکمیل کی"

اس کے بعد نواب سکندر بیگم صاحبہ کے عہد میں بھوپال پہنچنے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہو:۔

"پہلے وہ محض ایک معمولی خدمت پر مامور ہوئے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد...... ۱۲۶۳ھ میں نائب اوّل (مدار المہام) کے منصب جلیلہ پر فائز ہو گئے......... مدار المہام صاحب اعتقاداً وعملاً موحد متبع سنت مدبر، بیدار مغز اور بڑے راسخ الاعتقاد تھے...... حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خاندان سے اُن کو خاص ارادت تھی...... شاہ صاحب کی بہترین تصنیف حجۃ اللہ البالغہ...... انھیں کی وسعت فیاضی اور علم پروری سے پہلے پہل ۱۲۸۶ھ میں چھپ کر شائع ہوئی۔

۲۷ محرم ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۱ء کو مدار المہام محمد جمال الدین خاں بہادر مرحوم نے شب کے گیارہ بجے رحلت کی"

(مآثر صدیقی حصہ دوم صفحہ ۴۴ تا صفحہ ۵۶)

واضح رہے کہ مآثر صدیقی کے مؤلف، مدار المہام مرحوم کے حقیقی نواسے تھے۔

---

۵۱ تاج الاقبال دفتر دوم ۵۲ تاج الاقبال دفتر دوم ۵۳ جماعت مجاہدین صفحہ ۲۹۴

نواب سکندر بیگم کی صاحبزادی نواب شاہجہاں بیگم جو پابندی احکام دین، عقل و فہم، عدل و انصاف اور انتظام سلطنت میں بے نظیر امتیاز رکھتی تھیں انھوں نے اپنا نکاح ثانی نواب صدیق حسن خاں مرحوم سے کیا۔
ایک فرماں روا رئیسہ کا زمانے اور ماحول کے رسم و رواج کے خلاف نکاح ثانی کر لینا ایک زبردست اصلاحی انقلاب تھا جس کو شاہ ولی اللہؒ کے وصیت نامے اور حضرت سید احمد اور حضرت شہیدؒ کی جد و جہد کا زریں نتیجہ کہنا چاہیئے۔

سلطان جہاں بیگم کی دینداری اور خوش عقیدگی بھی مسلم الثبوت ہے وہ قطب الوقت، عالم ربانی حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہیؒ سے بوکالت وسفارتِ مولانا قاضی محی الدین مراد آبادیؒ ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ میں (حضرت گنگوہیؒ کی وفات سے تقریباً دو ماہ قبل) بیعت[۱] ہوئی تھیں۔

آخر میں اتنا اور عرض کر دوں کہ بھوپال کے تالاب میں کسی ایسی عمارت کا جو پہلے نواب سکندر بیگم کا "نشاط محل" ہو اور پھر مسجد میں تبدیل کر دی گئی ہو کوئی نشان نہیں نہ بھوپال کی تاریخ میں اس کا تذکرہ ہے۔

نہر زبیدہ اور مولانا خیر الدین

"ان کے (مولانا خیر الدین کے) زمانہ قیام حجاز کا ایک یادگار اور تاریخی واقعہ نہر زبیدہ کی مرمت بھی ہے....... اسی زمانے میں ایک سال کے حج میں پانی بالکل بند ہو گیا اور ہزاروں آدمی پیاس سے مر گئے، والد مرحوم نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور منیٰ ہی میں ارادہ کر لیا تھا کہ دوسرے حج کے آنے سے پہلے ہی وہ اس کار خیر کو کر کے چھوڑیں گے....... اس زمانے میں ان کے مریدین میں حاجی عبد الواحد جو کلکتے اور بمبئی میں حاجی واحد نا کے نام سے مشہور ہیں اور ان کے شریک کار حاجی زکریا تھے.......... اور یہ دونوں اس سال کے حج میں موجود تھے اور والد مرحوم کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے — جب قسطنطنیہ کی طرف سے ناامیدی ہو گئی تو والد نے سب سے پہلے حاجی عبد الواحد اور حاجی زکریا سے تحریک کی اور انھوں نے دو لاکھ کی پہلی رقم پیش کر دی...... اسکے بعد والد نے سات آدمیوں کی ایک مجلس بنائی اور یہ فنڈ اس کے انتظام میں

---

[۱] تذکرۃ الرشید جلد دوم ص ۱۰۲

دے دیا......... لیکن افسوس ہے روپیہ کی کمی کی وجہ سے یہ کام پورا نہ ہو سکا البتہ نہر کی اس درجے درستگی ہو گئی کہ تیس برس تک پھر کسی طرح کی خرابی واقع نہ ہوئی۔"

(آزادی کی کہانی صفحہ ۹۸ تا ۹۹)

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں نہر زبیدہ کی مرمت کا ہونا مولانا[1] رحمت اللہ صاحب کرانوی مہاجر مکہ صاحب اظہار الحق و بانی مدرسہ صولتیہ کا کارنامہ ہے، جن کا علاوہ ہندوستان کے حجاز و ترکی میں کافی اثر و رسوخ تھا، مولانا رحمت اللہ کرانوی کی سوانح عمری میں لکھا ہے:-

"نہر زبیدہ امتداد زمانہ سے بہت زیادہ قابل مرمت و اصلاح تھی اور پانی کے لیے ساکنان حرم کو کافی دقت و زحمت پیش آتی تھی۔ اسی زمانہ میں سیٹھ عبدالواحد عرف "واحدنا سیٹھ" مکہ معظمہ آئے اور اس سلسلے میں ایک مشورتی اجتماع مدرسہ صولتیہ میں منعقد ہوا سیٹھ عبدالواحد صاحب باتوفیق صاحب ہمت و دولت مند تھے۔ حضرت مولانا مرحوم (مولانا رحمت اللہ) نے نہر زبیدہ کی از سر نو اصلاح و مرمت کا بیڑا اٹھایا اور اس کے لئے حکومت کی اجازت و حالات کے لحاظ سے ایک مستقل مجلس قائم کی گئی جس میں مہاجرین مکہ معظمہ کے ہر طبقہ میں سے ہر قوم کے ممتاز افراد مجلس میں ممبر بنائے گئے اس مجلس کی صدارت کے لئے حضرت مولانا مرحوم کو منتخب کیا گیا مگر آپ نے اپنے شاگرد رشید فضیلت مآب مولانا شیخ عبدالرحمٰن سراج صاحب مرحوم مفتی احناف و شیخ العلماء مکہ معظمہ کو اس کے لیے موزوں سمجھا اور خود نائب صدر کی حیثیت سے اس عظیم الشان کام کی ذمہ داری اٹھائی۔ سیٹھ عبدالواحد صاحب نہر زبیدہ کے خزانچی اور متولیہ ارمقرر ہوئے خدا کا شکر و احسان ہے کہ یہ صدقۂ جاریہ ان بزرگوں کی ہمت سے دوبارہ زندہ ہوا۔" (ایک مجاہد معمار صفحہ ۵۳)

مولانا خیرالدین کا حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء پر بہتان عظیم

کہانی میں ہے:-

"اس بارے میں انکا (مولانا خیرالدین کا)

---

[1] انکا تعلق اس جماعت اہل حق سے ہو کہ جس کے مولانا خیرالدین سخت مخالف تھے چنانچہ کہانی کے صفحہ ۵۰ پر لکھا ہو — "نتیجہ یہ نکلا کہ چند دنوں کے بعد اچانک اس جماعت کے اکتیس آدمی گرفتار کر لئے گئے جن میں مولانا رحمت اللہ صاحب اظہار الحق بھی تھے۔"

بیان یہ تھا کہ جب شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی تمام جائداد اپنے عزیزوں میں تقسیم کردی باقی کے لیے بھی وصیت نامہ لکھ دیا اور مولوی اسمٰعیل کے لیے کچھ بھی نہ رہا تو اب دنیا کی طلب دل میں سمائی اور یہ ڈھنگ نکالا کہ پیری مریدی کا ایک نیا کارخانہ جمایا جائے سید احمد بریلوی فوج میں ایک اَن پڑھ سپاہی تھے ان سے سازش کرکے انھیں پیر بنایا۔ مولوی عبدالحی شاہ صاحب کے داماد، کہ وہ بھی بیٹی کے محروم رہ جانے سے برداشتہ خاطر تھے وہ شریک سازش ہو گئے اور صورت یہ قرار دی کہ خدا کی دین میں کسی کا کیا لینا دینا ہے ہم نواسے (؟) اور داماد تھے مگر محروم رہ گئے، اور شاہ صاحب کا تمام باطنی فیض ٹونک کے اس سپاہی کو مل گیا آدمی (مولانا اسمٰعیل شہیدؒ) ذہین اور لسّان تھا بہت جلد لوگوں میں ایک غلغلہ مچا دیا، لوگوں نے جب دیکھا کہ ایک معمولی اَن پڑھ آدمی کو شاہ صاحب کے نواسے (؟) نے پیر مان لیا ہے اس کی پالکی پکڑ کے جوتی بغل میں داب کے دوڑتا ہو اور علانیہ اپنی محرومی اور انکی فیض یابی کا اقرار کرتا ہو تو اس سے لوگوں میں بڑا ہی رنگ جما اور ہر طرف سے چاندی سونے کی بارش ہونے لگی" الخ (ص ۳۶۴)

اس میں شک نہیں کہ مولانا آزاد اپنے والد کے اس قسم کے بیانات سے متفق نہیں تھے اور وہ حضرت سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء کے مداحوں میں سے تھے۔ اُن کے والد کے اس قسم کے غالیانہ اور انتہا پسندانہ خیالات و عقائد نے ہی درحقیقت بطور ردّ عمل مولانا کو وادیٔ تشکک میں لاکر کھڑا کر دیا تھا۔ مولانا آزاد نے اس طرح کے بیانات پر بعض جگہ ریمارک بھی کئے ہیں اور بعض جگہ انھوں نے اپنے والد کی اس قسم کی باتوں کو فتنے سے تعبیر کیا ہے اس مقام پر بھی خیریت سے "بہتان عظیم" کا عنوان موجود ہے، لیکن بہت سی خلافِ تحقیق اور سراسر لغو باتوں پر تنقید نہیں کی گئی ہے ــــ ساتھ ہی ساتھ مولانا کے والد کی علمیت اُن کے اخلاق عالیہ ان کے تزکیہ نفس اور روحانی کمالات کے اس قدر واقعات کہانی میں بیان کئے گئے ہیں جن کو سامنے رکھ کر بہت سے ناواقفوں کو شبہ ہی نہیں یقین ہو سکتا ہے کہ مولانا خیرالدین جیسا صاف باطن اور "صاحب بصیرت" شخص جو کچھ بھی مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور رفقاء سید احمد شہیدؒ کے بارے میں کہہ رہا ہے وہ صحیح ہوگا ــــــ حالانکہ خاندان شاہ ولی اللہؒ اور رفقاء سید احمد شہیدؒ کے بارے میں جو کچھ بھی انھوں نے "گوہرافشانی" کی ہے وہ سراسر بہتان ہی بہتان ہے ــــ یہ ملحوظ رہے کہ ان بہتانوں کا سرچشمہ اور منبع، مولوی فضل رسول بدایونی کی

کتاب سیف الجبار ہے۔ یہ وہی مولوی فضل رسول ہیں جن سے مولانا خیرالدین کو بڑی مناسبت تھی چنانچہ مولانا آزاد فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان کے گذشتہ علماء میں صرف مولوی فضل رسول بدایونی جنھوں نے تقویۃ الایمان کے رد میں ..... لکھی ہے ٹھیک اسی رنگ پر تھے جو اس بارے میں والد مرحوم کا تھا"

(کہانی ص۱۶۴)

حتیٰ کہ مولوی احمد رضا خاں بریلوی جن سے مولانا خیرالدین کے اچھے تعلقات تھے اور جن کو صحیح الاعتقاد فرمایا کرتے تھے جب وہ کلکتہ میں اُن سے ملے اور ایک مسئلے میں اختلاف ہوا تو

"ان کے جانے کے بعد ہم سے کہا کہ اس شخص کے عقیدے میں بھی فتور ہے"[ف] (کہانی ص۱۶۶)

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مولانا خیرالدین کو مولوی فضل رسول بدایونی کی بات پوری طرح یاد نہیں رہی تھی وہ تو یوں "گل افشانی" فرما رہے ہیں:۔

(۱) "شاہ عبدالعزیز صاحب نے آخر عمر میں اپنا تمام مملوکہ منقولہ کہ ہر جنس کثرت سے تھی حرم اور نواسوں وغیرہ کو ہبہ کر کے خالص کرا دیا مگر مولوی اسمٰعیل کو کچھ نہ دیا"

(سیف الجبار ص۱۷ و ۱۸)

(۲) "جب شاہ صاحب نے اپنی ساری مملوکات اوروں کو ہبہ کر دی مولوی اسمٰعیل گھبرائے اور مولوی عبدالحئی شاہ صاحب کے داماد ...... موقوف ہو کر دہلی میں آئے دونوں نے مل کر سید احمد نام ...... شاہ صاحب کے مرید کو پیر بنایا اور ساتھ لے کر شہروں میں پھیری شروع کی۔ اور دربدر گھر بگھر قرآن و حدیث کے درس کو وسیلہ ٹھہرایا" (ص۳۴)

ف جس مسئلہ میں اختلاف ہوا تھا، ضمناً اس کی بھی سنئے! ــــ لکھا ہے "اختلاف مولوی احمد رضا خاں صاحب کے ایک رسالہ پر پیدا ہوا۔" "جس میں انھوں نے عدمِ ایمان اَبَوَینِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ایمانِ ابوطالب پر زور دیا تھا" حالانکہ مولوی احمد رضا خاں صاحب کا مسلک اس کے بالکل عکس ہے وہ ایمانِ ابوینِ اور عدمِ ایمانِ ابوطالب کے قائل ہیں۔ اُن کی تصانیف و ملفوظات میں جابجا اس بارہ میں تصریحات ہیں۔

کہانی میں اسماعیلیہ اور اسحاقیہ کے عنوان سے ص۱۶۵ پر مولانا خیر الدین کی بے نظیر تحقیق پیش کی گئی ہے وہ بھی سیف الجبار ہی کے ص۱۵۰ سے ناتمام طریقے پر ماخوذ ہے۔

اب میں بہتان عظیم کا مختصر جواب دینے سے پہلے میاں سید احمد علی بجنوری (شاگرد حضرت شاہ عبد العزیزؒ) کے خط کا اقتباس پیش کرتا ہوں جس میں شاہ صاحبؒ کی بیماری اور وفات کے چشم دید حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اس خط کا ترجمہ مولانا ذوالفقار احمد بھوپالیؒ نے اپنی کتاب الروض المطور فی ملا شرح الصدور میں درج کر دیا ہے ۔۔۔ اس خط کا فقط وہ حصہ جس سے مولانا خیر الدین کے "بہتان عظیم" کی جڑ کٹ جاتی ہے یہاں پر نقل کیا جا رہا ہے۔

"(حضرت شاہ عبد العزیزؒ نے) روز شنبہ کہ دن درس کا تھا بکمال بے طاقتی منبر پر آرام کر کے تفسیر آیہ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۔۔۔ فرما کر بس کیا۔ پھر دن باقی رہے، فقیر کو طلب فرما کے کاغذ وصیت نامہ مشتمل بر ہبہ فرش وکتب خاص ذات خود، بمولوی محمد اسحاق دام ظلہم و دیگر امورات کا لکھوا کر مہر فقیر کی اس پر ثبت کرائی من بعد مولوی رشید الدین خاں صاحب وغیرہ کو طلب کر کے ان کی مہریں ثبت کرائیں اس دن حال بہت متغیر تھا.....

جمعہ کے دن چاہا کہ موافق معمول کے مدرسہ میں آئیں نہ آسکے ۔۔۔ درس موقوف ہوا مگر زیارت سب کو میسر ہوئی۔ وقت شام کے تفسیر مدارک و تفسیر رحمانی سنی بعدہ جو کچھ نقدی تھی اس کو برادر زادوں اور ذوی الارحام حاضر و غائب کو تقسیم فرمایا...... (اس کے دو دن بعد) بعد نماز فجر ساتویں ماہ شوال روز یکشنبہ ۱۲۳۹ھ ۔ داعی اجل کو لبیک اجابت فرمائی اور اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف انتقال فرمایا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون"۔ (الروض المطور ص۲۰۱)

دیکھئے معتبر ترین شاہد کا بیان ہے کہ شاہ صاحبؒ نے حاضر و غائب برادر زادوں و ذوی الارحام کو ۔۔۔ جو کچھ نقدی ان کے پاس تھی تقسیم کر دی تھی ۔ حضرت شاہ محمد اسمٰعیلؒ جو شاہ صاحب کے برادر زادے تھے وفات شاہ صاحب کے وقت دہلی میں موجود نہ تھے۔ مگر حصہ ان کو بھی دیا گیا ایسا نہیں ہوا کہ ان کو محروم کر دیا گیا ہو۔ البتہ مولانا محمد اسحٰق صاحبؒ اپنے نواسے کو بحیثیت اپنے جانشین اپنی کتابیں اور فرش فروش ضرور ہبہ کئے ۔۔۔ اس میں مولانا اسمٰعیل شہید کی تخفیص نہیں۔ مولوی محمد موسیٰ، مولوی مخصوص اللہ

وغیرہا برادر زادگان کو بھی کچھ نہیں ہبہ کیا گیا ـــــ علاوہ ازیں شاہ عبدالعزیزؒ کے پاس جو ایک درویش صفت متوکلانہ زندگی بسر کرنے والے محدث تھے، کونسے ایسے خزانے اور کونسا ایسا مال کثیر رکھا ہوا تھا جس کا یہ پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے اور اسکی بنیاد پر حضرت سید احمد شہیدؒ کی اصلاحی تحریک کو بدنام کرنے کی کوشش فرمائی جارہی ہو ـــــ حضرت شاہ صاحب کو کفن تک گاڑھے کا دیا گیا تھا، اور وہ خود وصیت فرما گیے تھے کہ میرا کفن اس کپڑے کا ہو جو میں پہنتا ہوں۔

"کرتا آپ کا دھوتر کا اور گاڑھے کا پاجامہ ہوتا تھا" (الروض الممطور و کمالات عزیزی)

اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ مولانا اسمٰعیل شہید، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے بھتیجے تھے مگر مولٰنا خیرالدین کے اس بہتان عظیم کو بیان کرتے ہوئے دو جگہ شاہ شہیدؒ کو نواسہ لکھا گیا ہے ـــــ علاوہ ازیں مولانا عبدالحیٔؒ کی اس زوجہ سے جو شاہ عبدالعزیزؒ کی صاحبزادی تھیں کوئی اولاد نہیں ہوئی اور ان صاحبزادی کا انتقال شاہ صاحب کے سامنے ہی ہو گیا تھا ـــــ پھر داماد کو شاہ صاحب کے مال میں آرزو کرنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔؟

حضرت شاہ ولی اللہ اور کتاب التوحید

کہانی میں بیان کیا گیا ہے:۔

"شاہ ولی اللہ مرحوم کو جو عین محمد بن عبدالوہاب نجدی کے ظہور و شیوع عقائد کے زمانے میں حرمین میں مقیم تھے اس کی کتاب التوحید ملی۔ اور اسکی وجہ سے ان کے خیالات میں بھی یک گونہ فتور ہوا وہ اس فتنے کو اپنے ہمراہ ہندوستان لائے ان کی کتابوں میں مولوی اسمٰعیل کو کتاب التوحید ملی" (کہانی ص۳۶۵)

یہ عظیم ترین بہتان بھی مولانا خیرالدین کے "حقائق و معارف" کا ایک نمونہ اور ان خیالات کی ایک جھلک ہے جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کے متعلق وہ رکھتے تھے ـــــ غور تو کیجیے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے قیام حرمین کا زمانہ ۱۱۴۳ھ سے ۱۱۴۵ھ تک کا ہے ۱۱۷۶ھ میں ان کا وصال ہو گیا اور مولوی فضل رسول بدایونی جو مولانا خیرالدین کے معتمد علیہ اور "مولانا اسمٰعیل دشمنی" میں ان کے خاص ہم مشرب و ہم مزاج ہیں سیف الجبار میں یہ ارقام فرمارہے ہیں کہ کتاب التوحید ۱۲۲۱ھ میں اواخر ایام سلطان سلیم ثالث میں مکہ معظمہ کے اندر آئی تھی، پھر قیام حرمین کے زمانے میں یہ کتاب حضرت شاہ ولی اللہؒ

کے ہاتھ کیسے لگ گئی۔ اس موقع پر بھی اگر مولانا خیرالدین کو مولوی فضل رسول بدایونی کی پوری بات یاد رہتی تو وہ وہی کہتے جو انھوں نے سیف الجبار میں لکھی ہے ـــــ دیکھئے مولوی بدایونی کتنا عجیب انکشاف فرماتے ہیں ـــــ وہ حضرت شہیدؒ اور رفقاء سید احمد شہیدؒ پر الزامات بیجا لگاتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:۔

"ان ہی سامانوں سے سیر و سیاحت کرتے پھرتے تھے کہ تیسرا فساد ظاہر ہوا یعنی کتاب التوحید نجدیہ کی مراد آباد میں کہ وہاں پہلے سے کسی قدر اس مذہب کی گفتگو تھی ـ ہاتھ لگی ـــ اس مذہب کو پسند کیا اور تقویۃ الایمان تصنیف کی گویا اسی کتاب التوحید کی شرح ہے۔"

(سیف الجبار ص۴۳)

ایک غلط بات کتنے تک سے کہی گئی تھی کہ کتاب التوحید مراد آباد سے مل گئی تھی ـ مولانا خیرالدین نے اسکو تاریخی اعتبار سے خواہ مخواہ پیچیدہ اور دور از کار بنا دیا کہ شاہ ولی اللہ صاحب حرمین سے کتاب التوحید لائے اور شاہ اسمٰعیل صاحب کو اپنے دادا کے کتب خانہ سے وہ کتاب ہاتھ لگ گئی معاندین شاہ اسمٰعیل تقویۃ الایمان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں بناتے رہے ہیں، کوئی کہتا ہو کہ سید صاحب اپنے رفقاء کے ساتھ حج کو گئے تو وہابیوں سے متاثر ہوئے اور وہاں کتاب التوحید مل گئی اور تقویت الایمان لکھی ـ کوئی کہتا ہے مراد آباد سے کتاب التوحید مل گئی تھی اس کا دوسرا ایڈیشن تقویۃ الایمان ہو گیا، کوئی کہتا ہو دادا کے کتب خانہ سے کتاب التوحید برآمد کر لی تھی اور اس کا چربہ تقویت الایمان ہے ـــ ٹھکانہ ہے ان محققین کی ژولیدہ بیانی اور اختلاف رائے کا۔؟

حضرت شاہ عبدالعزیز کی سجادہ نشینی

اب اس سے بھی بڑا بہتان جس کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور سن لیجئے۔

"دال مرحوم (مولانا خیرالدین) کہتے تھے کہ جب انکے (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے) انتقال کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی سجادہ نشینی کی مجلس ہوئی اور شاہ فخرالدین مرحوم نے ان کے سر پر پگڑی رکھی تو کان میں کہا تھا ـ تمھارے خاندان کی چادر پر ایک دھبہ لگ چکا ہے اپنی سعی وہمت سے اُسے دھو ڈالنا ـــــ یہ شاہ ولی اللہؒ کی طرف اشارہ تھا اور مشہور تھا کہ اُن کو اپنے ذوق تفنن میں اعتزال کی طرف میلان رہا ہے۔" (ص۳۶۷)

مولانا منورالدین نے تو حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت مولانا عبدالحئیؒ کے عقائد پر مصنوعی فضا

میں ہوائی حملے کئے ہی تھے اور آگے بڑھ کر اپنے فرضی استاد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ پر بھی ہاتھ صاف کیا تھا اور انکی تفسیر اور اُن کے فتویٰ کو عالم خیال میں مضبوط دلائل سے رد کر دیا تھا۔ اب ان کے نواسے مولانا خیرالدین کا زمانہ آیا تو انھوں نے باوجود اس ادعا کے کہ وہ خاندان ولی اللہی سے رشتہ تلمذ رکھتے ہیں شاہ عبدالعزیزؒ کا رد بقول مولانا آزاد (بروایت کہانی) "سو تفسیروں" کے حوالوں سے ما اھل بہ لغیر اللہ کے مسئلے میں کیا اور جب اس سے بھی تسکین خاطر نہ ہوئی تو صاحب حجۃ اللہ البالغہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کو اوّل محمد بن عبدالوہاب کی کتاب التوحید کا خوشہ چیں بتایا اور پھر معتزلی بنا کے چھوڑا ــــ اور کتنے مقدس انداز میں اپنے دل کی بات شاہ فخرالدین کی زبان سے شاہ عبدالعزیز کے کان میں چپکے سے کہلوا دی ــــ شاہ فخرالدین نے چپکے سے جو بات شاہ صاحب کے کان میں کہی تھی وہ مولانا خیرالدین کو غالباً مولانا منورالدین کے واسطے سے معلوم ہوئی ہوگی ــ مولانا منورالدین ہی ایک ایسی نادر روزگار شخصیت ہیں جو اپنے استاد شاہ عبدالعزیز کی دستار بندی کے وقت بھی موجود ہو سکتے ہیں ــ

میں پوری بصیرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ دستار بندی کی داستان محض بے اصل ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی سجادہ نشینی کی کوئی تقریب نہیں ہوئی جس میں حضرت شاہ فخرالدین چشتی نے دستار باندھی ہو اگر ایسا ہوتا تو شاہ عبدالعزیزؒ اپنے ملفوظات میں اس کا ذکر فرماتے، کوئی تذکرہ نویس لکھتا، خود شاہ فخرالدین کے ملفوظات میں اس کا ذکر ہوتا ــــ علاوہ ازیں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اپنے والد ماجد کی حیات ہی میں فارغ التحصیل ہو کر منازل سلوک طے کر چکے تھے، وہ عملاً اپنے والد کے جانشین ان کی زندگی ہی میں ہو چکے تھے، پھر کیا ضرورت تھی جشن سجادہ نشینی منعقد کرنے اور شاہ فخرالدینؒ سے ایسی بات سننے کی؟ ــــ اور کمال یہ کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے باکمال باپ پر جو استاد اور پیر و مرشد بھی تھا اور جس سے غایت درجہ تعلق تھا، جیسا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کی تحریروں سے ظاہر ہے ــــ اتنا بڑا بہتان سُنا اور وہ چیں بہ جبیں نہ ہوئے ــ

اس قسم کی باتوں سے کہانی بھری پڑی ہے ــ مولانا خیرالدین جن کو ایک پاکباز اور تقدس مآب کی حیثیت سے بار بار پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے وہابیوں، اسماعیلیوں، اور اسحاقیوں کو تمام عمر جو کوری کوری سُنائی ہیں اس سے تو کتاب کا بڑا حصہ لبریز ہے۔

مولانا خیرالدین کا سفر عراق "انھوں نے عراق کا سفر کیا اور چھ سات ماہ ٹھہرے اس زمانہ میں شیخ عبدالرحمٰن نقیب الاشراف تھے، ان کے یہاں مہمان ہوئے، اُن سے طریقۂ قادریہ کی اجازت لی اور انھوں نے اُن سے طریقۂ نقشبندیہ کی۔" (کہانی ص۱۸)

مولانا آزاد نے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی مرحوم کے نام ایک مکتوب میں لکھا ہے:۔

"والد مرحوم جب ۱۲۹۱ھ میں عراق گئے تھے تو سید عبدالرحمٰن نقیب مرحوم کے والد سید علی رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین تھے اُن ہی کے یہاں ٹھہرے۔" (کاروانِ خیال ص۶۵)

معلوم نہیں ان دونوں باتوں میں کون سی بات صحیح ہے، آیا وہ شیخ عبدالرحمٰن نقیب الاشراف کے زمانے میں عراق گئے تھے یا سید علی کے زمانے میں؟ ۔

پوری کتاب سے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ مولانا خیرالدین سلسلۂ نقشبندیہ میں کس بزرگ سے بیعت تھے؟ اور یہ بھی تعجب ہے کہ مولانا خیرالدین نے صاحب روح المعانی پر حیات و ممات خضر کے مسئلے میں اعتراض کرتے وقت یہ غور نہ فرمایا کہ سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک بلند پایہ صاحب علم ظاہری و باطنی بزرگ حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ خود حیات خضر کے قائل نہیں ہیں؟ مکتوبات معصومیہ میں اُن کا مکتوب اور اُسکے دلائل ملاحظہ فرما لیتے تو پھر شاید اس مسئلہ پر قلم اُٹھانے کی ہمت نہ فرماتے۔

مولانا آزاد کا سفر عراق و حجاز مولانا کے بھائی کے تذکرے میں ہے کہ:۔

"بلاد اسلامیہ کی سیاحت کا اُن کو بہت شوق تھا، چنانچہ اسی سلسلے میں جب ایک ساتھی یعنی حافظ عبدالرحمٰن امرتسری مل گئے تو انھوں نے عراق کا ارادہ کیا۔ عراق ہم دونوں ساتھ گئے لیکن میں وہاں پہنچ کر سخت بیمار ہو گیا اور واپس چلا آیا۔" (کہانی ص۱۷۹)

اس موقع پر سن روانگی نہیں بیان کیا گیا لیکن ص۳۱۱ پر ہے:۔

"۱۹۰۴ء میں ایسے حالات پیش آئے کہ میں عراق چلا گیا اور پھر کوئی نبرلسان الصدق کا نہیں نکلا وہاں سے واپس آیا تو مولانا شبلی مرحوم سے ملاقات ہوئی یہ پہلی ملاقات تھی۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سفر ۱۹۰۴ء میں اپنے برادر بزرگ کی معیت میں ہوا۔ مولانا واپس آگئے اور وہ وہیں رہے اور اواخر ۱۹۰۶ء میں وہ صاحب فراش ہو کر واپس آئے حتیٰ کہ اوائل ۱۹۰۷ء میں کلکتہ میں ان کا انتقال ہو گیا، گویا وہ تقریباً تین سال بلاد اسلامیہ کی سیاحت میں مصروف رہے ـــــ مولانا وسط

۱۹۰۴ء میں واپس آگئے تھے۔ اسی زمانے میں مولانا شبلی سے اُن کی پہلی ملاقات ہوئی اور مولانا نے انھیں حیدرآباد آنے کی دعوت دی اور الندوہ سے ان کے تعلق پر اصرار کیا۔ چنانچہ کہانی میں ہے:۔

"دو تین ہفتے بعد وہ حیدرآباد چلے گئے اور وہاں سے برابر خطوط بھیجتے رہے کہ میں حیدرآباد آؤں" (ص۳۱۳)

ص۳۱۴ پر الندوہ کی ادارت کے سلسلے میں ہے:۔

"یہ ٹھیک اس وقت کی بات ہے کہ دسمبر کا آخری ہفتہ تھا اور لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس تھا، میں اور بھائی مرحوم اس کی شرکت کی غرض سے لکھنؤ پہونچے تھے اور وہیں مولانا کا خط مجھے ملا تھا"

کانفرنس کا یہ اجلاس لکھنؤ میں دسمبر ۱۹۰۴ء میں منعقد ہوا تھا جس میں مولانا نے اپنے بھائی مرحوم کے ساتھ شرکت کی —— اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ ان کے بھائی دسمبر ۱۹۰۴ء میں ہندستان میں موجود تھے پھر ۱۹۰۴ء میں اُن کی معیت میں عراق کا سفر کس طرح ہوسکتا ہے؟ دونوں بھائیوں کی دسمبر ۱۹۰۴ء میں کانفرنس میں شرکت کی تائید مولانا ضیاء الحسن علوی ندوی مرحوم کے ایک مضمون سے بھی ہوتی ہے جو الندوہ ۱۹۴۲-۴۳ء میں ان دونوں بھائیوں کی لکھنؤ میں ملاقات کے متعلق شائع ہوا ہے۔ لکھنؤ سے واپسی پر مولانا چند ماہ بمبئی میں رہے اور لکھنؤ نہ جا سکے، لیکن آخرکار

"اس مرتبہ میں نے قطعی فیصلہ کرلیا اور لکھنؤ پہنچ گیا ..... اور الندوہ کی ایڈیٹری انھوں نے میرے متعلق کردی، تقریباً سات آٹھ مہینہ وہاں قیام رہا"۔ (ص۳۱۴)

(جولائی ۱۹۰۵ء لغایت فروری ۱۹۰۶ء)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا قیام ۱۹۰۴ء سے اوائل ۱۹۰۶ء تک بمبئی اور لکھنؤ میں رہا۔ مارچ ۱۹۰۶ء میں پھر بمبئی گئے اور لاہور میں انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے معاً بعد جو اپریل ۱۹۰۶ء میں منعقد ہوا تھا وکیل کی ادارت سنبھالی اور اپنے بھائی کے انتقال تک امرت سر میں رہے۔ بھائی کے انتقال کی خبر معلوم ہونے پر (اوائل ۱۹۰۷ء میں) ادارت وکیل چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے اور چند ماہ قیام کے بعد پھر امرت سر واپس آئے اور دوبارہ وکیل کے فرائض ادارت انجام دیئے۔ جون ۱۹۰۸ء تک امرت سر رہے۔ پھر ترک تعلق کرکے بھوپال آگئے۔ جولائی ۱۹۰۸ء میں

پونا چلے گئے اور وہیں قیام تھا کہ والد کی شدید علالت کا ایک تار سے علم ہوا اور کلکتے چلے گئے جس روز پہونچے اس کے چند گھنٹے بعد والد ماجد کا انتقال ہوگیا (دسمبر ۰۸ء میں) دیکھیے آزاد کی کہانی ص ۳۲۱ تا ۳۲۵

ان تمام تحریروں سے ثابت ہوا کہ ۰۴ء سے ۰۸ء تک مولانا کا قیام مسلسل ہندستان میں رہا اور وہ ہندستان سے باہر کہیں نہیں گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے بڑے بھائی ۰۳ء میں اپنے والد کے ساتھ دوبارہ حجاز چلے گئے تھے اور مولانا جنھیں گھر کی زندگی سے، کئی سال پہلے دل برداشتگی ہوگئی تھی اور اب تک باقی تھی (ص ۳۱۳) مبئی ہی میں مقیم رہے اور لسان الصدق نکالتے رہے۔ بڑے بھائی والد کے ساتھ (جو اواخر ۰۴ء میں حجاز سے واپس آئے تھے ص ۱۴۴) واپس آگئے اور دسمبر ۰۴ء میں مولانا کے ساتھ لکھنؤ کانفرنس میں شرکت کی۔ مولانا اس کے بعد الندوہ سے متعلق ہوگئے اور پھر وکیل سے۔ ۰۶ء میں جب مولانا وکیل میں تھے ان کے بھائی تنہا عراق و بلاد اسلامیہ کی سیاحت کی غرض سے گئے اور وہاں سے جو خطوط بھیجتے تھے وہ "وطن" امرت سر میں برابر شائع ہوتے رہتے تھے (ص ۱۴۸) — مولانا کا ان پانچ سال ۰۴ تا ۰۸ء میں عراق کا سفر کسی طرح صحیح نہیں۔

کہانی میں سفر عراق ۰۴ء میں بتایا گیا ہے لیکن کاروان خیال کے جس خط میں سفر عراق کا ذکر فرماتے ہیں اُسوقت اپنی عمر ۲۰۔۲۱ سال کی بتائی ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ شک و انکار کے بعد یقین و اعتقاد کا حصول، عقلیت و الحاد کے بعد حقیقت کی روشنی نمودار ہو چکی تھی (ص ۲۶۱) تو یہ زمانہ ۰۹ء کا ہوتا ہے اور اس وقت اُن کے بڑے بھائی وفات پا چکے تھے۔ مولانا کا قیام والد کی وفات سے پہلے اور اس کے بعد اجراء الہلال ۱۲ء تک مسلسل و غیر منقطع طور پر ہندستان ہی میں رہا۔ لہٰذا اس زمانہ میں بھی جیسا کہ مذکورہ بالا حوالہ جات سے ثابت ہے یہ سفر نہیں ہو سکتا۔

کہانی میں عراق کا جانا بھائی کی معیت میں بتایا گیا ہے لیکن مولانا نے اپنے مکتوب کاروان خیال میں جو کوائف تحریر فرمائے ہیں اس میں کہیں بھائی کی موجودگی کا تذکرہ بھی نہیں اور یہ ممکن نہ تھا کہ دونوں بھائی ساتھ ہوں اور چھوٹے بھائی کی تو علماء و اکابر عراق پذیرائی کریں اور بڑے بھائی کو جو کسی لحاظ سے بھی اُن سے کم نہ تھے پوچھیں تک بھی نہیں — نیز ۰۴ء میں

مولانا شک وانکار کے دور میں تھے، پھر اس وقت علامہ نعمان آلوسی زادہ کا "من این اخذت هذا المشرب" کہنا کیا معنی رکھتا ہے۔

ان مسلسل واقعات کی روشنی میں جو مولانا کی اس کہانی میں موجود ہیں عراق کا سفر تنہا یا بھائی کی معیت میں ۰۴ء میں یا اُس کے بعد ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح ۰۵ء میں سفر حجاز کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا جب کہ دسمبر ۰۴ء لغایت اپریل ۰۶ء مولانا کا قیام مسلسل بمبئی اور لکھنؤ رہا۔ ۰۵ء کا حج ۱۴۔ فروری ۰۵ء میں اور ۰۶ء کا ۴۔ فروری ۰۶ء میں ہوا۔ اور اس زمانے میں بھی مولانا الندوہ کے ایڈیٹر اور لکھنؤ میں قیام پذیر تھے۔ پھر یہ سفر کس طرح ۰۵ء میں ہو سکتا ہے۔

الغرض مولانا کی زندگی کے مسلسل واقعات سے یہ امر ثابت اور ناقابل بطلان ہے کہ وہ ۱۸۹۵ء میں (جب کہ ان کی عمر سات سال کی تھی) ہندوستان آنے کے بعد ۱۹۵۱ء تک ہندستان سے کہیں باہر نہیں گئے — مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم جن کے مولانا سے پچاس سال تک برابر تعلقات رہے۔ علمی وسیاسی معیت ورفاقت بھی برابر رہی۔ الہلال میں بھی کچھ عرصہ بحیثیت رفیق ومعین کار، مولانا کی اعانت فرمائی اور جو مولانا کی نجی زندگی، مشاغل، گھریلو حالات اور سفر وحضر کے واقعات سے پورے پورے واقف تھے، ایک موقع پر تحریر فرماتے ہیں کہ:-

> "مولانا جب سے وادی غیر ذی زرع سے ہندستان آئے پھر کبھی ہندستان سے باہر نہیں گئے۔"

اسی طرح ۱۹۰۱ء میں لاہور کا سفر — انجمن حمایت الاسلام[۱] کے اجلاس میں شرکت، مولانا حالی سے ملاقات بحیثیت مدیر لسان الصدق تعارف بھی کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ لسان الصدق کا اجراء ۰۲ء میں ندوہ کے اجلاس کلکتہ کے بعد ہوا ہے اور ندوہ کا یہ اجلاس اواخر ۱۹۰۱ء میں منعقد ہوا تھا — تو پھر جب ۱۹۰۱ء میں لسان الصدق جاری نہیں ہوا تو اس کے ایڈیٹر کی حیثیت سے تعارف اور مولانا حالی کا استعجاب کیونکر صحیح ہو سکتا ہے — غالباً اس موقع پر ضبط سن میں تسامح ہوا ہے ص۳۳۲ پر "انجمن حمایت الاسلام میں لکچر" کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سفر مارچ ۰۲ء میں ہوا۔ مولانا نے ندوہ کے اجلاس کلکتہ کے بعد لاہور پہنچنے سے پہلے شیخ عبدالقادر کو خط لکھ دیا تھا

---

[۱] آزاد کی کہانی ص۳۰۰ و ۳۰۹

اور شیخ عبدالقادر سے ندوۃ العلماء کے جلسہ کے موقع پر ملاقات ہو چکی تھی[(۱)] ــــ غالباً اسی اجلاس انجمن لاہور میں جو ندوہ کے اجلاس کلکتہ کے بعد ہوا اُن کی مولانا حالی سے بھی ملاقات ہوئی ہوگی۔ جیساکہ ان کی زبانی بیان کیا گیا ہے ــــ "انجمن میں دوسرے سال پھر گیا اور تقریر کی (یعنی سنہ ۲ء کے اجلاس انجمن کے بعد سنہ ۳ء میں) مولانا حالی مرحوم سے ملاقات کا حال پہلے کہہ چکا ہوں جو اس سے پہلے سفر میں (یعنی سنہ ۲ء کے سفر میں حاصل ہوئی تھی[(۲)]"۔

بہرحال ہندستان کے اسفار، اخبار و رسائل کے اجراء اور ان کی تقدیم و تاخیر ظاہر کرنے کے لئے بیشتر تو سنین کا تذکرہ ہی نہیں اور اگر ہے تو وہ تضاد و تناقص سے خالی نہیں[(۳)]۔

---

(۱) کہانی ص۳۳۲ (۲) کہانی ص۳۳۳ (۳) اس آخری عنوان کا کُل مضمون مولانا حکیم سید حسن مثنی صاحب رضوی کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے۔ (فریدی)

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۱)

مولانا حکیم سید حسن مثنی صاحب رضوی ان گمنام اہل علم اور اہل فکر و نظر میں سے ہیں، جو اپنی خداداد ذہانت ذوق صحیح، وسیع مطالعہ اور سلامت فکر کے لحاظ سے بڑے بلند مقام کے حامل ہیں لیکن اپنی گوشہ نشینی اور خاموشی کی وجہ سے بہت کم معروف ہیں۔ مولانا کا ددھیال امروہہ کا مشہور رضوی سادات کا خاندان ہے اور ننھیال خانوادہ سید احمد شہیدؒ ہے۔ ان کے دادا مولانا حکیم علی حسن صاحب نامور طبیب حضرت مفتی صدرالدین خاں صاحب کے شاگرد رشید تھے، اور نواب صدیق حسن خاں وغیرہ کے ہم سبق تھے بیعت کا تعلق حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ سے تھا ــــ مولانا کے والد حکیم سید عزیزالرحمٰن صاحب امروہی بڑے حاذق طبیب اور بڑے ذہین تھے ــــ حکیم حسن مثنی صاحب نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم پائی۔ ان کو حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ سے بھی تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ تاریخ و انساب پر ان کی بڑی وسیع اور گہری نظر ہے اور کم لوگ اس موضوع پر ان کے پایہ کے ہیں۔ عربی اور اُردو ادب اور شعر و سخن کا بھی بڑا بلند اور پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔ اپنے بعض عوارض اور امراض کی وجہ سے وہ عرصہ سے گوشہ گیر ہیں۔ اگر وہ تصنیف و تالیف کا کام کرتے تو ہندستان کے صف اول کے مصنفین میں ان کا شمار ہوتا۔

موسم سرما کے بہترین تحفے
ماء اللحم خاص ـــــ شبابی ـــــ لبوب کبیر خاص
فی بوتل آٹھ روپے ـــــ فی شیشی ساڑھے سات روپیہ ـــــ فی شیشی چار روپیہ
یہ تینوں دوائیں۔ جملہ اعضائے رئیسہ کی کمزوری اور خرابی نیز عام جسمانی ناتوانی اور تھکاوٹ کو دور کر کے ازسر نو طاقت اور توانائی بخشتی ہیں۔
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
موسم سرما کا لٹریچر۔ مقامی ایجنسی یا براہ راست یہاں سے طلب فرمائیں۔
(۱) لکھنؤ۔ امین آباد جنرل اودھ اسٹور۔ (۲) کان پور۔ جین گنج۔ (۳) بنارس دال منڈی (۴) بلیا۔ گدری بازار
(۵) ناگ پور۔ مومن پورہ۔ (۶) بریلی۔ نینی تال روڈ

تعارف و تبصرہ

صدیق اکبرؓ (گزشتہ سے پیوستہ)

اب ہم بعض جزئیات کی طرف آتے ہیں

(۱) ص ۳۶ اور ص ۳۷ پر لَوْلَا کِتَابٌ مِّنَ اللّٰہِ سَبَقَ الآیہ کے بارے میں عتاب کا سبب بیان کرنے میں جو مشہور روایت سے اختلاف کیا گیا ہے وہاں مصنف کا بیان بہت تشنہ رہ گیا ہے۔ مسلم کی حدیث سے معلوم نہیں ہوتا کہ اس سے مشہور قول کی تردید کس طرح ہوتی ہے اس کی کچھ وضاحت ہونی تھی

(۲) ص ۱۸ پر حضرت علیؓ کی ایک بات کے بارے میں جو لکھا گیا ہے کہ "یہ وہی بات ہے جس کو ارباب معانی کی زبان میں "نکتہ بعدالوقوع کہتے ہیں"۔ اگر ہماری کور ذوقی نہیں ہے تو ہم نہیں سمجھ سکے کہ ایک ادب شناس صحابیؓ کے قلم سے یہ فقرہ کیسے نکل سکتا ہے، یہاں ہمیں اس کتاب کے مقدمہ کے ص ۲ کے یہ الفاظ یاد آرہے ہیں کہ "یہ چیز (جو حضرت علیؓ کی طرف منسوب کی جارہی ہے) حضرت علیؓ کی بے نفس اور پاکباز و پاک طینت شخصیت کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے؟"

(۳) ص ۶۰ پر مسند احمد کی روایت سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی زبان سے حدیث سننے کے بعد حضرت سعد بن عبادہؓ نے (سقیفہ میں) حضرت ابوبکرؓ سے بخوشی بیعت کرلی تھی لیکن بخاری کی جو روایت (حضرت عمرؓ کے خطبہ کی) اس واقعہ کے سلسلے میں ص ۶۳ اور ص ۶۵ پر درج کی گئی ہے، مولانا نے غور نہیں فرمایا کہ اس میں اور اس میں تضاد ہے۔ سعد بن عبادہؓ ہی اگر سب سے پہلے بیعت کرلیتے تو پھر دیگر انصار کو اختلاف ہی کیوں رہتا۔ اور بیعت ابی بکرؓ کی نوعیت فلتۃً کی کیوں رہتی؟

(۴) ص ۱۰۱ پر حدیث الائمۃ من قریش کے بارے میں مولانا نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ خبر ہی

نہ انتشار ہمارے خیال میں "ما اقاموا الدین" وغیرہ الفاظ جو آگے آتے ہیں ان کے ساتھ مولانا کا بیان کردہ مطلب جوڑ نہیں کھاتا۔ ان الفاظ کے مفہوم کے ساتھ تو خبر یا انتشار ہی کی صورت جوڑ کھاتی ہے، واضح رہے کہ انتشار ماننے سے بعض وجوہ سے ہمیں خود انکار ہے۔

(۵) مالک ابن نویرہ کے قتل کے سلسلہ میں تو مصنف کی بحث سے حضرت خالدؓ کی پوزیشن بڑی حد تک صاف اور بے داغ ہو جاتی ہے۔ مگر مالک کی بیوی سے نکاح کے بارے میں بحث تشفی بخش نہیں ثابت ہوتی۔ خصوصاً اس مسئلہ کی صفائی کا یہ انداز کہ

"ام تمیم نے فوراً ہی اسلام قبول کر لیا ہوگا" ص۲۰۰

یہ تو بالکل غیر تاریخی انداز ہے، اس طرح کی قیاس آرائیاں تو مسئلہ کو صاف نہیں کر سکتیں۔ پھر اس ذیل کی یہ بات بھی اچنبھے کا باعث ہے کہ قتل و نکاح کے معاملہ میں نہایت پُر زور اور با وثوق صفائی کرنے کے بعد مولانا نے ص۲۱۱ پر حضرت خالدؓ کے ان دونوں افعال کو بے احتیاطی بھی قرار دے دیا ہے اور اس طرح قتل مالک کی دیت کا مسئلہ سُلجھانے کی کوشش کی ہے۔

(۶) ص۲۸۱ لغایۃ ص۲۸۲ پر قیصر کی جنگی تیاریوں کا جو ذکر کیا گیا ہے یہ بڑی کام کی چیز ہے مگر اس کے لئے کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔ حوالہ کی ضرورت تھی۔

(۷) ص۲۸۲ پر شام پر حملہ کے سلسلہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ ماہ صفر میں حضرت ابوبکرؓ نے ایک مجلس مشاورت بلائی اور ص۲۸۶ پر بلاذری کی روایت نقل کی گئی ہے کہ یکم صفر کو لشکروں کی روانگی عمل میں آگئی، اس تناقض کو دور کرنے کی ضرورت تھی۔

(۸) ص۲۹۰ سے "فتوحات کے اسباب" کے تحت مغربی مصنفین کے خیالات نقل کرتے ہوئے ص۲۹۵ پر اُن کی جزوی صداقت کا اقرار کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے کہ مسلمان مصنفین اور خاص طور پر قدیم طرز تعلیم کے لوگوں کا خاصہ ہو کہ کوئی مغربی مصنف مسلمانوں کی غیر معمولی کامیابی میں کسی اقتصادی اور معاشی وجہ کو دخیل بتا دے تو وہ چڑھ سے جاتے ہیں۔ ہم ادب سے عرض کریں گے کہ مولانا چڑھنے کی پوری بات ہے ایک تو جو چیز زیادہ سے زیادہ محرک جنگ کہلائی جا سکتی ہے اس کو سبب فتح و کامرانی کہا جا رہا ہے۔ دوسرے محرک جنگ کی بات بھی یہ ہے کہ مغربی مصنفین تو جو چاہیں کہیں مگر آپ تو

غور فرمائیں کہ اعتبار کن لوگوں کے محرکات کا ہوتا ہے، سربراہ اور اولوالامر کے محرکات کا یا عام فوجیوں کی کچھ تعداد کے محرکات کا؟ ظاہر ہے کہ ہمیں اس میں تو شبہ نہیں ہو سکتا کہ ابوبکر صدیقؓ آپ کے ماتحت قائدین اور راسخ الایمان مسلمانوں کے حق میں تو جنگ کا محرک صرف رضائے الٰہی اور غلبۂ اسلام تھا، غیر تربیت یافتہ قبائل اور نومسلم افراد کی شرکت جہاد کے محرک معاشی وجوہ ہوں تو ہوا کریں۔ حضرت خالد کی ایک تقریر کا جو اقتباس مولانا نے اس موقع پر مغربی مصنفین کی تائید میں پیش کیا ہے (ص۲۹۴ و ص۲۹۵) اس سے خود اس کا عکس ثابت ہوتا ہے جو مولانا ان مصنفین کی تائید میں ثابت کرنا چاہتے ہیں، حضرت خالدؓ تو یہ فرما رہے ہیں کہ اگر ہمارا مقصد رضائے الٰہی نہ ہوتا تو صرف معاشی نقطۂ نظر سے بھی اس جہاد میں نفع ہی نفع تھا۔ کیا اس پیرایہ میں معاشی نقطۂ نظر کا تذکرہ بھی اس قابل ہے کہ اس سے مغربی مصنفین کی تائید حاصل کی جائے؟

(۹) ص۳۱۲ پر "انتم اعلم بامور دنیاکم" الحدیث سے استدلال بالکل سمجھ میں نہیں آیا اس کا۔ محل حقوق العباد یا دہ امور دنیا تو قطعاً نہیں ہیں جن کی بات ہو رہی ہے۔

(۱۰) ص۳۳۴ پر مجاعہ کی لڑکی سے حضرت خالد کا نکاح اور اس پر حضرت ابوبکرؓ کا تہدیدی خط پڑھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت خالد کی سیرت کے اس پہلو کی صفائی بڑی ضروری تھی جو بار بار سامنے آتا ہے اور یقیناً بعض قارئین پر برا اثر چھوڑے گا۔ ہر چند کہ یہ "سیرت خالد" نہیں ہے "سیرت صدیقؓ" ہے تاہم یہ بات ضروری معلوم ہوتی ہے۔

(۱۱) ص۳۴۲ پر مولانا نے زکوٰۃ کو "اسٹیٹ ڈیوٹی" قرار دیا ہے مگر ایک طالب علم کو یہ سوال پریشان کرتا ہے کہ جب اسٹیٹ قائم نہ رہے تو پھر یہ ڈیوٹی کیونکر قائم رہ جاتی ہے۔ اچھا ہوتا اگر مولانا اس کی وضاحت فرما دیتے۔

تبصرہ ضرورت سے زیادہ پھیل گیا اور چند باتیں پھر بھی رہ گئیں۔ اب آخر میں بس مختصراً یہ عرض ہے کہ تبصرہ کے آخری حصہ سے ناظرین کو کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ اس قسم کی جزئیات تو ہر انسان کی تصنیف میں نکل آتی ہیں۔ مجموعی طور پر کتاب کی افادیت کے سامنے ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ مولانا اکبرآبادی کی یہ کتاب انشاء اللہ زندہ رہے گی۔

سردیوں میں بچے کبھی کبھی سوتے میں بستر پر پیشاب کر دیتے ہیں، بعض بچے اس مرض میں اسدرجہ مبتلا ہوتے ہیں کہ کوئی رات مشکل سے خالی جاتی ہے. شاذ ونادر یہ مرض بڑوں کو بھی ہو جاتا ہے جو انکے لئے بہت پریشانی اور شرم کا باعث بنتا ہے.

اس مرض کے لئے

شربت ماسک البول

تیر بہدف ہے، بچے ہوں یا بڑے اگر وہ اس مرض میں مبتلا ہیں تو یہ شربت انشاءاللہ ان کے لئے بہت مفید ہوگا.

(مقدار خوراک) ایک ایک بڑے چمچے کے برابر صبح، دوپہر، شام

بچوں کو چوتھائی چمچہ سے آدھے چمچہ تک پلایا جائے

قیمت ــــ ۶

اپنے قریب کے کسی دوا فروش اور جنرل مرچنٹ سے طلب کیجئے یا براہ راست ہم سے حاصل کیجئے

الفرقان
لکھنؤ
ماہنامہ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، دراصل یہ اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اس کا عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ

"ادارۂ الفرقان"

مسئول
محمد منظور نعمانی

مرتب
عتیق الرحمن سنبھلی

جلد (۲۶) | بابت ماہ جمادی الاخری ۱۳۷۸ھ مطابق جنوری ۱۹۵۹ء | شمارہ (۶)

اگر اس دائرہ میں ⭘ سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں۔ یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، ورنہ اگلا رسالہ بصیغہ وی، پی ارسال کیا جائے گا۔

چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۳۰ تاریخ تک پہونچ جانی چاہیے۔

پاکستان کے خریدار :۔ اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں، اور منی آرڈر کی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت :۔ رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ کو روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۵ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

سورۂ ابراہیمؑ کا ایک تأثر

عالمِ انسانیت کی بہاریں، مادّی ہوں یا روحانی، نظر بہ ظاہر، صدقہ ہوتی ہیں اولوالعزم افراد کی قربانیوں کا، یہ قربانیاں آرام و راحت کی بھی ہوتی ہیں، مال و دولت کی بھی جسم اور جان کی بھی، اور جذبات و خواہشات کی بھی، انسانی نفوس اگر ان قربانیوں کا حوصلہ نہ کریں تو انسانیت کا یہ چمن یکسر بہار ناآشنا ہو کر رہ جائے، نہ علم و فکر کو ترقی نصیب ہو۔ نہ تمدن کوئی نیا رنگ پائے۔ نہ تہذیب کے رخ پر نکھار آئے۔ نہ روح ارتقاء کا کوئی نیا میدان پائے اور نہ مادہ کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو ظہور کا موقع میسّر آئے، یہ سب کچھ اگر ہوتا ہے اور عالم انسانیت کو نت نئی بہاروں سے ہمکنار ہونے کا موقع ملتا ہے تو ظاہراً، صرف اس لیے کہ کچھ لوگ ہوتے ہیں، جو مال و دولت کی جسم اور جان کی یا جذبات و خواہشات کی قربانی پیش کرتے ہیں اور یہ قربانیاں بہاروں کو کھینچ بلاتی ہیں۔

ایسی ہی ایک قربانی تھی جو سیکڑوں برس قبلِ مسیحؑ مشرقِ وسطیٰ کے ایک سہ نفری خاندان نے دی تھی ــــ یہ خاندان تھا، باپ بیٹا اور ماں ــــ اس خاندان کی قربانی نے، انسانیت کو اس عالمگیر اور جانفزا بہار کا تحفہ دیا۔ جو خزاں کے ہزار حملوں کے باوجود آج تک کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے، اور انسانیت کو طلب ہے، طلب نہیں تو احتیاج ہے، کہ ایک بار پھر اس کی تجدید ہو

اس قربانی کا ذکر قرآن مجید میں اس انداز سے آیا ہے:۔

رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ــــ اے پروردگار! میں نے بسایا ہے اپنی اولاد

بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ	کا کچھ حصہ ایک بے آب و گیاہ وادی میں.
الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ.	تیرے مقدس گھر کے پاس۔ پروردگار یہ اس
(سورہ ابراہیم ع ۶)	لیے کہ یہ قائم کریں نماز۔

یہ کہنے والے ابراہیمؑ تھے۔ واقعہ کی تفصیل کسی حد تک لوگوں کو معلوم ہی ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) جب وطن اصلی عراق سے ہجرت فرما کر سرزمین شام میں سکونت پذیر ہو گیے، تو جناب باری سے حکم ہوا کہ اپنی ایک حرم حضرت ہاجرہ اور ان کے اکلوتے، شیر خوار بچے کو سیکڑوں میل دور اس وادیٔ غیر ذی زرع میں لے جا کر بسا دیں، جہاں آج اللہ کا پاک "گھر" خانۂ کعبہ ہے، اُس وقت وہاں یہ "گھر" تھا نہ کوئی اور گھر۔ پہاڑوں سے گھرا ہوا ایک چٹیل میدان تھا۔ زیست کے ہر سامان سے محروم۔ اور ہلاکت کے سامانوں سے بھرپور۔ حضرت ابراہیم نے تعمیل حکم کی۔ اللہ کی قدرت نے اس خشک اور بے آب و گیاہ وادی میں زیست کے سامان پیدا کیے۔ حتیٰ کہ وہ شیر خوار بچہ (اسمٰعیل علیہ السلام) کام کاج کی عمر کو پہنچ گیا — اب ابراہیم علیہ السلام کو ایک دوسرا حکم ملا۔ کہ جا کر اس وادی میں اللہ کا "گھر" بنائیں۔ اس کی طرف قرآن میں یوں اشارہ کیا گیا ہے:۔

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ	اور جب ہم نے ٹھیک کر دی ابراہیم کے لیے
الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا	"گھر" کی جگہ (اور حکم دیا کہ صرف میرے
(الحج ع ۴)	نام سے بناؤ) نہ شریک کرو میرے ساتھ کسی اور کا نام۔

باپ بیٹوں نے مل کر یہ "گھر" بنایا، قرآن نے اس تعمیری کام کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ	اور جب اٹھا رہے تھے ابراہیم اور
مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمٰعِيلُ۔	اسمٰعیل اُس گھر کی بنیادیں۔

(بقرہ ع ۱۵)

"گھر" بن گیا اور حضرت اسمٰعیل اُسکے جوار میں رہنے لگے۔ اللہ نے ان کی نسل کے لیے بھی انتظام فرما دیا تھا۔ ہو سکتا ہے اُن سے نسل بھی شروع ہو چکی ہو جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پروردگار کو خطاب کر کے یہ عرض کیا کہ "پروردگار میں نے اپنی یہ اولاد یہاں اس لیے بسائی ہے کہ ان کے دم سے نماز قائم ہو!"

ظاہر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو خود سے یہاں لاکر نہیں بسایا تھا۔ کہ اُن کے پیش نظر اپنا سوچا ہوا کوئی مقصد ہوتا۔ یقیناً یہ مقصد اللہ ہی کا متعین کردہ تھا۔ اور ابراہیم علیہ السلام کے قول کا مطلب یہ تھا کہ پروردگار تو نے جس مقصد (یعنی اقامت صلوٰۃ) کے لیے مجھے اس "نوآبادکاری" کا حکم دیا تھا میں نے اسکی تعمیل کر دی ہے۔

"لیقیموا الصلوٰۃ" کا کیا مطلب ہے؟ کیا صرف یہ کہ "یہ لوگ نماز پڑھیں" اور اللہ کی عبادت کریں؟ اس کے لئے اتنے پاپڑ بیلنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کام کیا سرزمین شام میں نہیں ہو سکتا تھا؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے باقی متعلقین کیا یہ کام نہیں کرتے تھے جو ان کی اسی شاخ کے لیے شام میں عبادت الٰہی کا میدان تنگ ہوگیا تھا؟ یقیناً "اقامت صلوٰۃ" کا صرف یہ مطلب نہیں تھا۔

پھر اس کا مطلب کیا تھا؟ اس عُقدے کو بعد کے واقعات کھولتے ہیں، اور بتاتے ہیں کہ یہ دراصل دنیا میں ایک انقلاب کی داغ بیل تھی۔ پوری انسانی آبادی میں شرک اور جاہلیت کے جراثیم پھیل چکے تھے، اور بندگی کا نظام جس کی صحیح تعلیم انسان کو ابتدائے آفرینش سے ملتی رہی تھی۔ ان جراثیم سے اس درجہ فاسد ہو گیا تھا کہ اس فساد کو دور کرنے کی کوئی کوشش کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ انبیا آتے اور کم و بیش ایک محدود تعداد کی اصلاح کرتے کرتے انکا وقت پورا ہو جاتا۔ ان جراثیم کا استیصال کرنے کے لیے ایک پوری نئی نسل کی ضرورت تھی جس کی بنیاد اس فاسد ماحول سے باہر پڑے۔ اور جو تمام بُرے اثرات سے بچ کر بندگی کے صحیح نظام کے ماتحت پروان چڑھے۔ پھر اس کے مسکن کو اظہار عبدیت کا عالمی مرکز قرار دے کر گرد و پیش کی تمام انسانی آبادیوں کو اس مرکز سے وابستہ کیا جائے[1]۔ اور مناسب وقت آنے پر اس نوآباد

---

[1] چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا تھا:-

وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ـ وَاَذِّن فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ ـ (الحج ع ۴)	اور پاک رکھ میرا "گھر" طواف کرنے والوں قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے۔ اور پکار دے لوگوں میں کہ وہ چلیں اس گھر کی طرف۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نسل کے ذریعہ اس مرکز سے عالمی ہدایت کا کام لیا جائے۔

چنانچہ مشیت الٰہی کے اس غیبی فیصلہ کی طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے دعا کے پیرایہ میں یوں ایک لطیف اشارہ بھی کرا دیا گیا تھا۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۔ (بقرہ - ع ۱۵)	اے پروردگار ہمارے! اور اٹھا ان میں ایک رسول انھیں میں کا۔ جو تلاوت کرے ان پر تیری آیات۔ اور سکھائے ان کو کتاب اور پکی باتیں۔ اور سنوارے انکا ظاہر و باطن بے شک تو ہی ہو اصل زبردست (اور) حکمت والا۔

یہ "ایک رسول کی بعثت" ہی اس انقلاب کا نقطۂ آغاز تھی جس کی داغ بیل ایک وادیٔ بے سبزہ و آب میں اولادِ ابراہیم کو بسا کر اور "بیت محرم" بنا کر ڈالی گئی تھی۔ جب وقت آگیا اور دنیا ایک عالمی دعوت کے لیے تیار ہو گئی، تو مشیت کا یہ فیصلہ بھی جس کی طرف ابراہیمؑ کی زبان اشارہ کر گئی تھی، وجود کے سانچے میں ڈھل گیا، اور ٹھیک اسی "گھر" کے جوار سے وہ رسولِ خاتم الرسل مبعوث ہو کر دنیا کے سامنے آگیا جس کو اس انقلاب کا آغاز اور کارِ رسالت کا اتمام کرنا تھا۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۔ (جمعہ ع ۱)	وہی اللہ ہے جس نے اٹھایا امیوں میں سے ایک رسول کہ تلاوت کرتا ہو ان پر اسکی آیات اور سنوارتا ہو ان کو نیز تعلیم دیتا ہو ان کو کتاب اور حکمت کی۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے ضلال مبین میں گرفتار تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ) اور معاً اس آوازۂ حق کے اثر کی نوید بھی سنا دی گئی تھی۔

يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ (ایضاً)	چلے آئیں گے تیری طرف پیادہ پا، اور سوار ہو کر ہر دور و دراز رستے سے۔

اس رسول نے مبعوث ہو کر یہی کام شروع کئے جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔ اور جب اس کے تزکیہ و تعلیم سے اس نسل کی ایک تعداد اس "ضلال" کے زنگ سے پاک صاف ہو گئی جو امتدادِ زمانہ نے اس پر لگا دیا تھا، تو اس "رسول اُمّی" کے وجود میں آئی ہوئی بہار کا دروازہ ساری دنیا پر کھل گیا۔ اِن فیض یافتگانِ رسول سے کہا گیا:۔

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ۔ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ۔ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ۔ (الحج۔ ع ۱۰)	اور حق ادا کرو اللہ کی راہ میں سعی و شقت کا۔ اس نے منتخب کیا ہے تم کو۔ اور دین میں تمہارے لیے کوئی تنگی اور پریشانی کی بات بھی نہیں رکھی۔ یہ تمہارے باپ ابراہیم ہی کا تو طریقہ ہے۔ اسی نے نام رکھا تمہارا "مسلمین" پہلے بھی اور اس کتاب میں بھی۔ (تم کو اللہ نے جس غرض سے منتخب کیا ہو وہ یہ ہی) کہ سکھائے تم کو رسول اور تم سکھاؤ باقی دنیا کو۔

اور انھوں نے اس فرمانِ عالی کی ایسی تعمیل اور منشاء الٰہی کی ایسی تکمیل کی کہ یا تو صرف اللہ کی بندگی کرنے والا اور بندگی کے ڈھنگ پر زندگی بسر کرنے والا مشکل سے کہیں چھپا چھپایا ملتا تھا یا اب عالم انسانی کے ہر خطہ پر صدائے اشھد ان لا الٰہ الا اللہ گونج اٹھی۔ اور اس زور سے گونجی کہ وقت کی ساری صدائیں اسکے سامنے پست ہو گئیں۔ انھوں نے زندگی کو بندگی کے سانچہ میں ڈھالا۔ اور اس سانچہ کو عام کرنے کے لیے دنیا میں اس طرح پھیلے کہ

دشت تو دشت دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

انکی اس جد و جہد سے معمورۂ حیات شرک کی ظلمتوں سے نکلا، نظامِ بندگی کے ظاہری اور باطنی فساد سے جو زندگی کا پورا نظام بگڑا ہوا، اور اس درجہ بگڑا ہوا تھا کہ انسانیت کے لئے ننگ و عار ہو رہا تھا، اِن کی کوششوں نے اُسے ایک نئے نظام سے بدلا جو انسان کے لئے

کھڑی ہوگئی ہے ـــ اس دنیا میں بڑے بڑے حادثے ہوئے ہیں، طوفان آئے ہیں، زلزلے آئے ہیں، قحط پڑے ہیں، طاعون اور کالرا جیسی مہلک وبائی بیماریاں آئی ہیں جنھوں نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ختم کردیا ہے، لیکن یہ حادثہ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی اکثریت ایمان اور خدا پرستی کی دولت سے خود محروم ہوکر پوری انسانی دنیا کی بھی اس سے محرومی اور دوری کا ذریعہ بن گئی ہے' ان سب حادثوں سے بڑا حادثہ ہے۔ ـــــ "فلیبک علی الاسلام من کان باکیا"۔

اس کے بعد میں عرض کرتا ہوں کہ ہماری زندگیوں کا جو حصہ گزر چکا اب اس کو تو واپس نہیں لایا جاسکتا، اس کے لیے تو اللہ تعالیٰ سے بس معافی اور مغفرت ہی مانگی جاسکتی ہے، اور اگر ہم سچے دل سے توبہ و استغفار کریں تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا اور بخشنے والا ہے ـــ لیکن زندگی کا جو وقت باقی ہے اس کے بارے میں ہمیں سوچ سمجھ کے فیصلہ کرنا چاہیے کہ اس کو ہم کس طرح گزارنا چاہتے ہیں ـــ ایک صورت تو یہ ہے کہ خدانخواستہ ہم اس بگاڑ پر راضی اور مطمئن ہوجائیں، اور خدا فراموشی اور نفس پرستی کی زندگی کو شعور اور ارادہ کے ساتھ اپنالیں' اور دنیا کی دوسری قوموں کی طرح دنیا طلبی اور دنیا پرستی ہی کو اپنی زندگی کا مقصد اور مصرف بنالیں۔

مجھے یقین ہو کہ آپ میں سے کوئی بھی اپنے لیے یہ فیصلہ نہیں کرے گا، یہ فیصلہ تو دراصل مرتد ہونے کا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کے دین اور طریقہ سے اپنا تعلق منقطع کرنے کا فیصلہ ہوگا، اور کسی ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کہلانے والے کے متعلق بھی یہ شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے لیے ایسا فیصلہ کرسکے گا۔ مسلمانوں کا بگاڑ بے شک حد کو پہونچ چکا ہے، لیکن یہ سارا بگاڑ غفلت اور ضعف ایمان کا نتیجہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اللہ و رسول اور اسلام پر ان کا عقیدہ نہ رہا ہو اور ان کے دلوں میں انکار آگیا ہو، گرے سے گرے فاسق فاجر مسلمانوں کا حال بھی یہی ہو کہ وہ اللہ و رسول اور اسلام سے تعلق توڑنے کو سوچ بھی نہیں سکتے ـــ اس لیے یہ مسئلہ طے شدہ ہے کہ ہم اور آپ اور پوری مسلمان قوم اپنی موجودہ بگڑی ہوئی زندگی پر راضی اور مطمئن نہیں ہوسکتے۔ جب بھی فکر اور سنجیدگی کے ساتھ اس سوال کو اٹھایا جائے گا تو سب کے دلوں کی آواز یہی ہوگی کہ ہم نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ایمان اور خدا پرستی والی زندگی چھوڑ کے اور خدا فراموشی اور نفس پرستی کی یہ زندگی اختیار کرکے خودکشی کی ہے اور اپنے کو برباد کیا ہے، اور

ہمیں اب بھی وہی زندگی پسند ہو جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔

بہرحال جہاں تک عام مسلمانوں کے عقیدہ اور دل کے جذبہ کا تعلق ہو مجھے پورا اطمینان اور یقین ہو کہ وہ بالکل یہی ہو اور اس بارہ میں ان سے کوئی نیا فیصلہ کرانے کی اور دلائل سے منوانے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے دعاؤں کے ساتھ تن من دھن سے اس کوشش میں لگ جانے کی ضرورت ہو کہ ہم میں اور اس پوری امت میں پھر وہ ایمان اور وہ ایمان والی زندگی پیدا ہو جائے جس کے لیے دنیا میں یہ اُمت پیدا کی گئی تھی۔

میرے بھائیو اور بزرگو! یہ کام جس کا نام "تبلیغ" پڑ گیا ہو اور جس کے کرنے والوں کا نام آپ سے آپ "تبلیغی جماعت" مشہور ہو گیا ہو، اور جس کے سلسلے میں یہ اجتماع ہو رہا ہو، دراصل یہی کوشش اور اسی مقصد کے لیے دوڑ دھوپ ہو۔ شاید آپ میں سے بہت سے بھائی جو اس کام کی حقیقت سے پوری طرح واقف نہیں ہیں اس طرح کے اجتماعات سے یہ سمجھتے ہوں کہ ان اجتماعوں اور تقریروں کا نام تبلیغ ہے اور یہی وہ کام ہو جسکی تبلیغ کے نام سے ہم کو دعوت دی جاتی ہو، اور ان اجتماعوں میں شرکت ہی تبلیغی کام میں شرکت ہو، تو میں صفائی سے بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ "تبلیغ" کے لفظ کے لغوی اور عرفی معنی کچھ بھی ہوں، لیکن ہم جس تبلیغ کی دعوت دیتے ہیں اور "تبلیغی جماعت" کا جو اصل موضوع ہو وہ جلسہ یا قول نہیں ہو بلکہ ایک عمل اور زندگی کا ایک طریقہ ہو، ان اجتماعات میں تقریروں کے ذریعہ اُس کی دعوت دی جاتی ہے اور لوگوں کو اس پر آمادہ کیا جاتا ہو، بہرحال یہ اجتماع اور یہ تقریر خود وہ تبلیغ نہیں ہو، تبلیغ والا عمل تو اُس وقت شروع ہوگا جب اس اجتماع کے ختم ہونے کے بعد آپ اس عمل کے لیے جماعتی شکل میں کہیں کو نکل جائیں گے اور اپنے دن اور اپنی راتیں ان ہدایات کے مطابق گزارنے کی کوشش کریں گے جو یہاں اس سلسلہ میں آپ کو دی جائیں گی۔ آپ میں سے جو بھائی اصول کی پابندی کے ساتھ کبھی تبلیغی جماعتوں میں پھرے ہیں تو وہ تو جانتے ہیں کہ جس تبلیغ کی ہم دعوت دیتے ہیں اس کا مطلب کیا ہو اور جنھیں ابھی اس کا موقع نہیں ملا ہے وہ پوری طرح جب ہی سمجھ سکیں گے جب اس کا تجربہ کرلیں گے۔

میں کبھی کبھی کہا کرتا ہوں کہ بہت سے لوگوں کے لیے یہ "تبلیغ" کا لفظ بھی اس کام کے سمجھنے میں حجاب بن جاتا ہو۔ کیونکہ تبلیغ کے معروف معنی کسی بات کے پہونچانے کے ہیں، اور یہ پہونچانا

عام طور سے، یا تقریر سے ہوتا ہے یا تحریر سے۔ لیکن تبلیغی جماعت والے اپنے جس کام کو تبلیغ کہتے ہیں وہ نہ تقریر ہے نہ تحریر، بلکہ جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا تھا وہ ایک زندگی ہے جو کچھ اصولوں کی پابندی کے ساتھ خاص مشاغل میں گزاری جاتی ہے ـــــ اسی طرح ایک غلط فہمی یہ بھی ہے کہ جماعت سازی اور انجمن بازی کے اس دور میں تبلیغی جماعت کے لفظ سے بہت سے بھائی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی کوئی اسی طرح کی انجمن یا جماعت ہے جیسی کہ اس زمانے میں بنا کرتی ہیں، جن کے ممبران ہوتے ہیں۔ ارکان ہوتے ہیں اور چند عہدہ دار ہوتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایسی کوئی جماعت نہیں ہے، بلکہ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ بس ایسی جماعت ہے جیسی ہر مسجد میں پانچ وقت نماز کی جماعت ہوتی ہے۔ اللہ کے جو بندے نماز کے لیے وقت پر جمع ہوگئے اور انھوں نے مل کر نماز ادا کرلی، بس وہ ایک جماعت ہوگئی، بالکل یہی معاملہ ہے، یہ تبلیغ ایک دینی عمل ہے۔ اس کے لیے اللہ کے بندوں کو پکارا جاتا ہے، بلایا جاتا ہے۔ جو بندے وقت پر تیار ہوگئے اور ایک جماعت بن کر اس دینی عمل کے لیے چل دیئے بس وہی ایک جماعت بن گئی اور جب وہ عمل ختم ہوگیا اور اپنے دوسرے کاموں میں لگ گئے تو وہ جماعتی حیثیت بھی ختم ہوگئی اور بس مسلمان ہی مسلمان رہ گئے۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، تبلیغ کے لفظ اور تبلیغی جماعت کے لفظ سے جو غلط فہمی بہت سے بھائیوں کو ہوتی ہے اس کو دور کرنے کے لیے یہ چند لفظ میں نے درمیان میں کہہ دیے، ورنہ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اُمّتِ مسلمہ میں ایمان اور خدا پرستی والی زندگی پیدا کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر ایک جد و جہد کی ضرورت ہے، اور تبلیغ کے نام سے یہ جو کام ہو رہا ہے یہ دراصل وہی جد و جہد ہے ـــــ ہمارے جو بزرگ اس کام کے اصل داعی ہیں اور جن سے اللہ تعالیٰ اس زمانہ میں یہ کام لے رہا ہے اور جنھوں نے ہر طرف سے یکسو ہوکر اسی کام کو اپنی زندگی کا اصل کام بنالیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اُمّتِ مسلمہ کے ظاہر و باطن میں جس تبدیلی کی ضرورت ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ عام مسلمانوں کو اس کی دعوت دی جائے کہ وہ اپنے اپنے موجودہ ماحول اور مشغلوں سے نکل کر ایک خاص مدت صرف اُن کاموں اور ان مشغلوں میں مصروف رہ کر گزاریں جن سے ایمان پیدا ہوتا اور بڑھتا ہے۔ اور جن سے ایمان والی زندگی کی تعمیر اور ترقی ہوتی ہے ـــــ وہ چیزیں یہ ہیں۔

(۱) کلمہ شریف سے تعلق بڑھانا، کلمہ شریف کی عظمت دل میں بٹھانا، کلمہ شریف کی حقیقت کو

دل میں اتارنا اور جمانا، اور اس کے تقاضے کے مطابق زندگی گزارنا۔

(۲) نمازیں اہتمام اور فکر سے پڑھنا، صحیح طور سے اور خشوع وخضوع سے پڑھنے کی عادت ڈالنا، نماز سے اپنا تعلق بڑھانا، یعنی پانچ وقت کی جن نمازوں کے ہم عادی ہیں اُن کے علاوہ تہجد اور اشراق وچاشت وغیرہ ان نفلی نمازوں کی عادت ڈالنا جن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی ترغیبیں دی ہیں اور ان کی بڑی بڑی تاثیریں اور برکتیں تبلائی ہیں، اسی طرح اس کی عادت ڈالنا کہ جب کوئی پریشانی اور مشکل پیش آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور آپ کے طریقہ کے مطابق نماز حاجت پڑھ کر اس مشکل کے حل ہونے کے لیے اور پریشانی کے دور ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے۔ اسی طرح اس کی عادت ڈالنا کہ جب کسی کام کے بارے میں تردد ہو تو نماز استخارہ پڑھ کے اس بارہ میں اللہ تعالیٰ سے رہنمائی طلب کر لی جائے، اگر شیطان یا نفس کے بہکانے سے کوئی گناہ ہو جائے تو صلوٰۃ توبہ پڑھ کے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی جائے اور توبہ کر لی جائے ۔۔۔ یہ سب وہ نمازیں ہیں جن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی اور آپ کے اور صحابہ کرام کے معمولات میں تھیں لیکن اب عام امت کو ان نمازوں سے گویا تعلق ہی نہیں رہا ہے ۔۔۔ بہرحال نماز سے تعلق بڑھانے میں یہ سب باتیں شامل ہیں اور ان سب سے ایمان میں اور تعلق باللہ میں وہ ترقی ہوتی ہے جو کسی اور تدبیر سے نہیں ہو سکتی۔

(۳) تیسرا کام اس سلسلہ کا یہ ہے کہ اُن مقدس کلمات کے ذریعہ اللہ کا ذکر کیا جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائے ہیں (مثلاً کلمۂ تمجید، اور استغفار اور درود شریف [illegible] اسی طرح قرآن مجید کی تلاوت) اور اس کے علاوہ اٹھتے بیٹھتے، اترتے چڑھتے، کھانا شروع کرنے کے وقت اور کھانے کے ختم پر، رفع حاجت کے لئے جاتے وقت اور اس سے فارغ ہو کے، سونے کے لیے لیٹتے وقت اور بستر سے اٹھتے ہوئے، سواری پر چڑھتے وقت اور سواری سے اترتے ہوئے، مسجد میں داخل ہوتے وقت اور مسجد سے نکلتے ہوئے اور اسی طرح دوسرے احوال واوقات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے اور جس طرح ہر موقع پر اس سے دعائیں کرتے تھے اسی طرح اس ہمہ وقتی ذکر و دعا کی بھی عادت ڈالی جائے۔

(۴) اس کی بھی عادت ڈالی جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری ہدایت کے لئے جو علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے تھے اس کی تحصیل اور اس کے مذاکرہ میں بھی ہمارا کچھ وقت

گزرا کرے، اور علم نبوی میں ہماری یہ مشغولیت صحابہ کرام کے طرز پر ہو، یعنی جو پڑھیں یا سنیں عظمت واحترام اور ادب کے ساتھ پڑھیں اور سنیں، اس پر ایمان لائیں، اس کا یقین دل میں جمائیں، اس پر عمل کریں۔

(۵) پانچواں کام جس کی نکلنے کے اس زمانہ میں خاص طور پر مشق کرنی اور عادت ڈالنی ہوگی اس کا تعلق اخلاق اور حقوق العباد سے ہے۔ اور وہ یہ ہو کہ ہم اپنے دوسرے بھائیوں کے حقوق ادا کریں خواہ وہ ہمارے حقوق ادا کریں یا نہ کریں ہم دوسروں کو آرام اور نفع پہنچانے کی کوشش کریں اور نقصان رسانی اور ایذا رسانی سے بچیں خواہ ان کا طرز عمل کچھ بھی ہو ـــ یہ بات کہنے میں آسان اور ہلکی ہے میں نے بڑی آسانی سے چند سکنڈ میں کہہ دی لیکن اس پر عمل اور اس کو عادت بنانے میں کامیاب ہونا بڑا مشکل ہے۔ خود قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے " وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۔ یعنی اس میں کامیابی بس ان ہی بندوں کو ہوگی جو اپنے میں صبر کا جوہر پیدا کرلیں گے اور جو بڑے نصیبہ ور ہوں گے۔

بہرحال تبلیغ کے نام پر نکلنے کے زمانہ میں ان سب باتوں کی مشق کرنا اور ان کو اپنی زندگی کی عادات بنانا ہوگا۔

(۶) اور ان پانچ کاموں کے علاوہ ایک چھٹا کام یہ کرنا ہوگا کہ ایمان اور ایمان والے ان اعمال کی دعوت کو لے کر اللہ کے بندوں کے پاس جانا ہوگا اور ان کو بھی اس طرز زندگی پر آمادہ کرنے کے لیے ہر طرح کی کوششیں اور ان کی خوشامدیں کرنی ہوں گی، اس دعوت کے لیے عمومی اور خصوصی گشت کا طریقہ بھی استعمال کیا جائے گا اور اجتماعات کے ذریعہ بھی یہ دعوت دی جائے گی، اس سلسلہ میں بعض وقت بڑی نامناسب اور تکلیف دہ باتیں بھی سننی پڑیں گی، بعض مقامات پر کسی غلط فہمی سے مسجدوں سے نکالا بھی جائے گا، اس سلسلہ میں مسلسل سفر کرنے ہوں گے جن میں اپنا خرچ کرنا ہوگا، طرح طرح کی زحمتیں اٹھانی پڑیں گی، وقت پر نہ سو سکنے کی، اسی طرح وقت پر کھانا نہ ملنے کی اور عادت و مزاج کے مطابق نہ ملنے کی تکلیفیں خوب پہنچیں گی، ساتھیوں میں ہر طرح کے اور ہر مزاج کے ہوں گے، اور ہر مزاج کے اور ہر طرح کے مسلمانوں سے واسطہ پڑے گا اور ان سب کے ساتھ اکرام کا معاملہ کرنا ہوگا اس طرح یہ ایک

مستقل مجاہدہ ہوگا۔

(۷) ساتویں خاص بات اس سلسلہ میں ہمارے یہ بزرگ یہ بتلاتے ہیں کہ سب کاموں میں اخلاص کی یعنی اللہ کو راضی کرنے کی نیت کی مشق کی جائے، یعنی ذکر و عبادت، علمی مذاکرہ اور علم میں مشغولیت اللہ کے بندوں کے ساتھ حسن معاملہ اور ان کا اکرام اور ان باتوں کی دعوت لے کر پھرنا اور اللہ کے بندوں کے پاس جانا اور اجتماعات کرنا اور ان میں کہنا سننا، سب صرف اللہ کی رضا اور ثواب کی نیت سے ہو اور ایک اہم بنا کر اسکی مشق کی جائے کہ یہ بات عادت بن جائے، یہ بات بھی کہنے میں آسان ہے اور عمل میں بہت مشکل۔

بہرحال تبلیغ کے لفظ سے جس زندگی کی دعوت دی جاتی ہے وہ دراصل یہ زندگی ہے، چار چار مہینے اور ایک ایک چلّہ کا وقت اسی لیے مانگا جاتا ہے کہ اس مدت کی مسلسل مشق سے ان چیزوں کا کچھ ذوق پیدا ہو جائے اور کچھ رنگ چڑھ جائے، اور پھر اسی راستہ پر چلتے ہوئے آدمی ترقی کرتا ہے اور اُسے حقیقی ایمان اور عبدیت والی زندگی نصیب ہو جائے۔

بھائیو! اب آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ چند مہینے لگا کے اور تھوڑی سی تکلیفیں اٹھا کے اگر اس دولت کا کوئی حصہ نصیب ہو جائے تو یہ سودا آپکے لیے نفع کا ہوگا یا نقصان کا ــــ عرفی نے تو کہا تھا

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال صد سال میتواں بتمنا گریستن

آخر میں بس ایک بات اور کہتا ہوں ــــ امت مسلمہ کے اپنے مقصد و مقام سے ہٹ جانے کا اور اس کے جس بگاڑ کا میں نے ذکر کیا ہے اور جس کو آپ کی آنکھیں بھی دیکھ رہی ہیں، یہ واقعہ ہے کہ وہ کوئی آج کا یعنی ہمارے ہی اس دور کا اور ہماری اس صدی کا حادثہ نہیں ہے، بلکہ یہ بگاڑ صدیوں پہلے سے ہم میں آچکا ہے لیکن اب تک زمانہ ایسا رہا ہے کہ اس بگاڑ کی وجہ سے ہماری دینی اور ایمانی حالت گرتی تو رہی مگر اس کے باوجود اللہ رسول پر اور ان کے دین پر ہمارا عقیدہ اتنا باقی رہا کہ ہم اب تک مسلمان رہے اور مسلمان ہیں۔ لیکن الحاد اور مادہ پرستی کی جو طاقتور تحریکیں ہمارے اس دور میں آندھی اور سیلاب کی رفتار سے چل رہی ہیں، ان کا مقابلہ یہ بے جان عقیدہ اور اس زمانہ کے مسلمانوں کا یہ نیم جان اور سسکتا ہوا ایمان نہیں کر سکتا، فضا میں جب سکون ہو، ہوا بھی نہ چل رہی ہو تو پرندہ کا پر اور درخت سے گرا ہوا سوکھا پتا بھی

اپنی جگہ پڑا رہتا ہے۔ لیکن جب آندھیاں اور سیلاب آئیں تو کمزور جڑوں والے درخت بھی اکھڑ کر بہہ جاتے ہیں اور صرف مضبوط جڑ والے درخت ہی اپنی جگہ قائم رہتے ہیں ـــــ میرے بھائیو اور بزرگو! میں کوئی صاحب کشف و الہام نہیں ہوں، گنہگار قسم کا ایک عامی مسلمان ہوں، اللہ تعالیٰ نے جو عام سمجھ اور بصیرت بخشی ہے اسکی بنا پر کہتا ہوں اور یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہمارے اس دور کے مسلمانوں میں حقیقی ایمان اور ایمان والی زندگی پیدا کرنے اور عام کرنے کے لیے اگر کوئی خاص جد و جہد وسیع پیمانہ پر اس دور میں نہ کی گئی اور یہ عام امت اسی حال میں رہی جو اس وقت اس کا بگڑا ہوا حال ہے تو یہ بیجان عقیدہ اور یہ ٹوٹا پھوٹا اسلام بھی اس کے پاس باقی نہ رہ سکیگا ـــــ الحاد و مادہ پرستی اور دجالیت کے آنے والے طوفانوں کے مقابلہ میں اللہ کے وہی بندے دین و ایمان پر قائم رہیں گے جن کے دلوں کو حقیقی ایمان و یقین نصیب ہوگا اور جن کی زندگی اہل ایمان والی ہوگی ـــــ اور اسی کے ساتھ یہ بھی یقین سے کہتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مدد سے اس وقت عام مسلمانوں میں ایمان اور ایمانی زندگی پیدا کرنے کے لئے وسیع پیمانہ پر کوئی جد و جہد صحیح طریقہ پر کرلی گئی اور اس کے نتیجہ میں اس امت کی زندگی میں اور اسکے اصل مقصد و منصب میں مطابقت پیدا ہوگئی تو انشاء اللہ پوری انسانی دنیا کے لیے ہدایت کا دروازہ کھل جائے گا اور قرآن مجید کی بات وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ قریبی دور میں پوری ہوجائے گی ـــــ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو وقت کی رفتار اور اس کا تقاضا سمجھنے کی اور اپنا فرض ادا کرنے کی توفیق دے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

درس قرآن

پہلی منزل ——— (سورۃ الفاتحہ، البقرہ، آل عمران، النساء)

سائز ۳۰×۲۰/۸ صفحات ۶۷۲، جلد نہایت خوبصورت سنہری، ہدیہ دس روپے (محصولڈاک معاف)

پندرہ روزہ درس قرآن کا سلسلہ جولائی ۱۹۵۵ء سے جاری ہے اس کے پہلے ۴۶ شماروں کے اسباق کو نظر ثانی کے بعد درس قرآن کی پہلی منزل کی صورت میں چھپوا دیا گیا ہے۔ یہ منزل قرآن حکیم کے پہلے سوا پانچ پاروں کی نہایت سادہ آسان اور عام فہم تفسیر و تشریح ہے۔ طرز تحریر پندرہ روزہ درس قرآن کے مطابق ہے۔ جس کا اندازہ یہ ہے:-

عنوان { اوپر دائیں طرف جدا جدا الفاظ — بائیں طرف مسلسل آیت
نیچے جدا جدا لفظوں کا ترجمہ — نیچے سلیس اردو ترجمہ

اس کے بعد آیت کے اہم الفاظ کی تشریح ——— آخر میں مختصر تفسیر اور حسب ضرورت شان نزول

ہر تین جلدوں پر قیمت میں پانچ روپے کی رعایت۔ لائبریریوں اور ساجد کو ۱۲½ کمیشن ——— پندروزہ درسِ قرآن کا چندہ سالانہ پانچ روپے ———

ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور

ہندوستانی خریدار اپنی رقوم دفتر الفرقان کو بھیج کر لاہور اطلاع دیں۔

ترجمہ قرآن کا مکمل نصاب

(مرتبہ مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی)

جو قرآن مجید کا ترجمہ سکھانے میں نہیت کامیاب ثابت ہو چکا ہے ——— رحمانی قاعدہ عربی با تصویر (۵ر آنے) رحمانی قاعدہ اردو با تصویر (۵ر آنے) مفتاح القرآن حصہ اوّل (۵ر آنے) حصہ دوم (۱۰ر آنے) حصہ سوم (ایک روپیہ) حصہ چہارم (ایک روپیہ چار آنہ) حصہ پنجم (ایک روپیہ آٹھ آنے) معلم القرآن (ایک روپیہ چار آنے)

کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

تدوین حدیث

(از حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری مدظلہ العالی)

"ابن سعد نے زہری سے روایت کی ہو کہ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ چاہا کہ سنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمع کرلیا جائے اسکے لیے ایک مہینے تک انھوں نے استخارہ کیا، آخر ایک روز صبح کے وقت اس کے خلاف فیصلہ کرلیا اور فرمایا کہ ہمیں ایک قوم یاد آئی جس نے خود کتاب لکھی اور اس میں پھنس گئی اور خدا کی کتاب کو چھوڑ دیا" (اصح السیر)

حضرت عمرؓ کے اس [illegible] کو منکرین حدیث، حجیت حدیث کے [illegible] بطور حجت پیش کرتے ہیں اور اس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ خلفاء راشدین کو حدیث سے کوئی اعتناء نہ تھا، حالانکہ اس میں احادیث کو جمع کرنے اور اس کو کتابی صورت میں مدون کرنے کی تو ممانعت معلوم ہوتی ہے، لیکن اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہو کہ حدیث کا یاد کرنا یا اس کو سینہ میں محفوظ رکھنا کوئی شئ ہے چہ جائیکہ حضرت عمرؓ کے ارشاد کا مطلب یہ سمجھا جائے کہ بس دین کے باب میں صرف قرآن شریف ہی قابل اتباع ہے اور احادیث کا معاذ اللہ کوئی درجہ ہی نہیں ہے۔ حالاں کہ نص قرآنی ہے۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی اور یہ ظاہر ہے کہ بعد والوں کے لیے آپ کی اتباع کا واحد ذریعہ آپ کی سنن ہی کا اتباع ہے۔ اسی سے احادیث کی اہمیت اور ضرورت سمجھ لیجیے۔

واقعہ یہ ہو کہ حضرات صحابہ کرامؓ ہی سے احادیث کا لکھنا بھی ثابت ہو۔ بلکہ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض صحابی کے لیے اپنے خطبہ کو لکھ کر دینے کے لیے امر فرمایا ہے۔ لیکن ابتداءً چونکہ قرآن کا غیر قرآن سے خلط ملط ہوجانے کا اندیشہ تھا اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام طور پر کتابت حدیث سے منع فرما دیا تھا، مگر بعد میں یہ نہی منسوخ ہوگئی۔

اس موضوع پر میں نے کتاب مفتاح السنۃ تالیف علامہ محمد عبدالعزیز خولی مدرس شریعۃ الاسلامیہ مدرسۃ القضاء الشرعی مصر میں نہایت مختصر اور جامع مضمون دیکھا، ناظرین کے افادہ کے لیے بعینہ نقل کرتا ہوں۔ و ہو ہٰذا۔

"قرن اول (یعنی صحابہ اور اکابر تابعین کے زمانہ) میں احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کتابوں کے اوراق میں مدوّن نہ تھیں بلکہ دلوں کے صفحات پر لکھی ہوئی تھیں۔ چنانچہ لوگوں کے سینے ہی شریعت نبویہ کا گہوارہ، فتاوی کے مصدر اور اخلاق و حِکَم کا سرچشمہ تھے۔

لوگوں نے سنن و احادیث کو کتابوں میں اس لیے نہیں لکھا کہ (ابتداءً) ان کے لکھنے کی ممانعت فرما دی گئی تھی، چنانچہ صحیح مسلم میں ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ وحدثوا عنی فلا حرج ومن کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری باتیں لکھا مت کرو اور جس شخص نے مجھ سے غیر قرآن کو لکھا ہو وہ اس کو مٹا دے۔ ہاں زبانی میری بیان کردہ باتیں نقل کرو اس میں کچھ حرج نہیں ہے۔ (لیکن یہ سمجھ رکھو کہ) جس شخص نے میری جانب غلط باتیں منسوب کیں تو وہ اپنا ٹھکانا بس جہنم ہی سمجھ لے۔

بہت سے علماء نے یہ فرمایا ہے کہ آپ نے (صلی اللہ علیہ وسلم) صحابہ کو کتابت حدیث سے اس لیے منع فرمایا تھا کہ اس وقت اس کی وجہ سے اختلاط بالقرآن کا اندیشہ تھا اور یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ جس وقت التباس سے امن ہو تو اس کی کتابت جائز ہو۔ اس تقریر سے حدیث نہی عن الکتابۃ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں جو آپ نے مرض وفات میں فرمایا تھا۔

"ایتونی بکتاب اکتب لکم کتاباً" "کاغذ لاؤ تاکہ میں ایسا نوشتہ لکھ دوں کہ

لا تضلوا بعدہ۔" پھر تم اس کے بعد گمراہ نہ ہوگے"
یا آپ کے فتح مکہ کے موقع کے اس ارشاد میں کہ
"اکتبوا لابی شاہ" "ابوشاہ کے لیے لکھ دو"
نیز عبداللہ بن عمرو کو حدیث لکھ لینے کی اجازت دینے میں توافق کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔

اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوگیا تو پھر صحابۂ کرام نے سب سے پہلے اس سلسلے میں جو کام کیا تھا وہ یہ تھا کہ آپ کے زمانۂ مبارک میں قرآن عظیم کے جو کتبات متفرق طور سے تھے ان سب کو ایک جگہ جمع کیا اور اس مجموعہ کا نام (المصحف) رکھا۔ اس وقت ان حضرات نے صرف یہی کام کیا۔ باقی کتابت حدیث کی جانب اور اس کو ایک جگہ جمع کرنے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں فرمائی، جیسی کہ جمع قرآن کی جانب توجہ کی ہاں یہ ضرور کیا کہ اپنی کوششوں کو بطریق روایت نشر احادیث میں صرف فرمایا۔ کبھی بعینہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے ہوئے الفاظ ہی دوسروں کو پہونچا دیے، اگر وہ اذہان میں محفوظ ہوئے۔ ورنہ اگر الفاظ بعینہ یاد نہ ہوئے تو روایت بالمعنی کردی (اور اس میں کچھ حرج بھی نہ تھا) اس لیے کہ احادیث سے مقصود تو معنی ہی ہوتے ہیں، الفاظ کی کوئی خاص بات نہیں ہوتی۔ بخلاف قرآن کے کہ یہاں اس کے معجز ہونے میں خود الفاظ کو بھی دخل ہوتا ہے۔ لہذا اس کے تو کسی لفظ کو دوسرے لفظ سے بدلنا جائز ہی نہیں تھا گو وہ اس کا مرادف ہی کیوں نہ ہو، (پس صحابۂ کرام نے جمع قرآن کی جانب جو سبقت کی اور حدیث کی جانب نہیں متوجہ ہوئے تو اسی لیے کہ اس کے ہر ہر لفظ کی حفاظت ضروری تھی۔ ان کو خوف ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مرور زمان کی وجہ سے ذہن سے اس کا کوئی ایک لفظ بھی ذہول ہوجائے، لہذا جلد سے جلد کتابت کی قید سے اس کو مقید اور محفوظ کرلینا ضروری تھا، رہی حدیث تو اس کا بھی لکھ لینا مباح تھا جبکہ اختلاط والتباس سے امن ہو۔" (مفتاح السنۃ ص۱۶)

یہاں ایک بات اور سمجھ لیجئے کہ مصنفؒ نے یہ جو فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرات صحابہ نے جمع قرآن کی جانب مبادرت کی اور صرف اسی کو لکھا کتابت حدیث کی جانب توجہ نہیں کی۔ تو اول امر میں جمع قرآن کے لیے بھی جلیل صحابہ مثلاً حضرت صدیقؓ آمادہ نہ تھے، بلکہ اس کے بارے میں بھی یہ فرماتے تھے کہ جس کام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانۂ مبارک میں نہیں کیا اس کو ہم کیونکر کریں۔ لیکن بالآخر آپ کو شرح صدر ہوا اور آپ نے جمع فرمانے کا عزم بالجزم کرلیا۔ اور حضرت زید بن ثابتؓ کو جو کاتب وحی تھے اس کام پر مامور فرمایا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ

عن زید بن ثابت قال ارسل الیّ	حضرت زید بن ثابتؓ سے مروی ہو کہ مجھے حضرت
ابوبکر مقتل اھل الیمامہ فاذا عمر بن	ابوبکرؓ نے اہل یمامہ کے قتل کے بعد بلوا بھیجا ان
الخطاب عندہ فقال ابوبکر ان عمرا	کے پاس اس وقت حضرت عمر بن خطابؓ بھی
اتانی فقال ان القتل قد استحر یقراء	موجود تھے، (مجھے مخاطب کرکے) حضرت صدیقؓ
القرآن وانی اخشی ان یستحر القتل	نے فرمایا کہ یہ عمر میرے پاس آئے ہیں، اور
بالقراء فی المواطن فیذھب کثیر من	کہتے ہیں کہ قاری قرآن بہت زیادہ تعداد میں
من القرآن وانی اری ان تامر بجمع	شہید ہو چکے ہیں اور مجھے اندیشہ ہو کہ کہیں اگر
القرآن فقلت لعمر کیف نفعل شیئاً	چند بار لڑائیوں میں اسی طرح سے کچھ اور قراء
لم یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ	کام آگئے تو پھر تو قرآن کا بہت سارا حصہ ہی
وسلم قال عمر ھذا واللہ خیر فلم	ہم سے ضائع ہو جائے گا، لہذا میری یہ رائے
یزل یراجعنی حتی شرح اللہ صدری	ہو کہ آپ جمع قرآن کا حکم فرمائیں، یہ سن کر
لذالک ورایت الذی رای عمر قال	میں نے عمر سے کہا کہ ہم اس کام کے کرنے کی
زید قال ابوبکر انک شاب عاقل	کیسے جرأت کریں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ
لا نتھمک وقد کنت تکتب الوحی لرسول	وسلم نے نہیں کیا۔ عمرؓ بولے کہ خدا کی قسم یہ جو میں
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتتبع القرآن	کہہ رہا ہوں اس میں خیر ہی خیر ہے، بہر حال اسی
فاجمعہ فواللہ لو کلفونی نقل جبل من	طرح انھوں نے کئی دفعہ مجھ سے اس مسئلہ میں گفتگو
الجبال ما کان اثقل علیّ مما امرنی	کی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ میں مجھے

به من جمع القرآن قلت كيف تفعلان شيئاً لم يفعله رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم قال هو والله خير فلم يزل ابو بكر يراجعني حتى شرح الله صدري للذي شرح له صدر ابي بكر وعمر فتتبعت القرآن اجمعه من العسيب واللخاف وصدور الرجال ووجدت آخر سورة التوبة مع خزيمة الانصاري لم اجدها مع غيره لقد جاءكم رسول حتى خاتمة براءة فكانت الصحف عند ابي بكر حتى توفاه الله ثم عند عمر حياته ثم عند حفصة بنت عمرؓ

(منقول از شرح المعانی ص۲ ج ۱)

بھی شرح صدر فرما دیا، اور میری بھی وہی رائے ہوگئی جو عمر کی رائے ہو۔ حضرت زید فرماتے ہیں کہ پھر حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ تم چونکہ ایک سمجھ دار جوان ہو ہم تم کو امین جانتے ہیں کیونکہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی تھے لہٰذا تم پر ہر طرح سے اطمینان ہو، پس تم ہی قرآن کو تمام جگہ سے تلاش کر کے جمع کرو۔ حضرت زید کہتے ہیں کہ بخدا اگر لوگ مجھے کسی پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا مکلف بناتے تو یہ بوجھ مجھ پر اتنا بھاری نہ ہوتا جتنا یا میں نے اپنے لیے جمع قرآن کے اس حکم کو محسوس کیا۔ جب کہا کہ آپ دونوں حضرات نے کیسے ہمت فرمائی اس کام کے کرنے کی جسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ اس پر حضرت صدیق نے (بھی وہی) فرمایا (جو حضرت عمر نے کہا تھا) کہ خدا کی قسم اس میں خیر ہی خیر ہے۔ پھر بار بار ابوبکرؓ بھی مجھ سے اس مسئلہ پر گفتگو فرماتے ہی رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سینے کو بھی اس چیز کے لیے کھول دیا، جس کے لیے حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کے سینوں کو کھولا تھا۔ پھر میں نے قرآن کو تلاش کرنا شروع کیا اور اسکو جمع کیا کھجور کے پتوں اور سفید پتھروں کے نوشتوں سے، اور لوگوں کے سینوں سے چنانچہ سورہ توبہ کے آخری حصے کو میں نے حضرت خزیمہ انصاری کے پاس پایا اور کسی کے پاس یہ حصہ نہ تھا (یعنی لقد جاءکم رسول سے لے کر ختم سورہ تک کی آیتیں) پس یہ صحف حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس رہے۔ پھر آپ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس ساری عمر رہے۔ پھر آپ کے وصال کے بعد آپ کی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت حفصہ کے پاس رہے۔

میرا مقصد اس روایت کو یہاں بیان کرنے سے یہ ہے کہ دیکھئے حدیث تو حدیث خود قرآن کریم کے جمع و تالیف میں اول وہلہ میں صحابہ متفق نہیں تھے، لیکن جب اس کی ضرورت سب پر واضح ہوگئی تو ہر ایک کو شرح صدر بھی ہوتا چلا گیا، پس جس طرح سے کہ قرآن شریف کے ایک زمانہ تک مصحف کی شکل میں نہ آنے سے اس کی قطعیت پر کچھ اثر نہیں پڑا، اسی طرح سے اگر احادیث نے بھی صحابۂ کرام کے زمانہ میں کتابی صورت نہ اختیار کی تو محض اس کی وجہ سے وہ ساقط الاعتبار کیوں ہو جائیں گی، جبکہ یہ بھی معلوم ہو چکا کہ ان کے جمع نہ کرنے کی وجہ التباس بالقرآن اور اسی کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منع فرمانا تھا، چنانچہ جب اور جہاں اختلاط سے امن ہوا تو آپ نے کتابت کی اجازت دے دی۔ اسی کے متعلق صاحب مفتاح السنۃ فرماتے ہیں کہ:۔

"پس تم نے دیکھا کہ علماء نے ان احادیث متعارضہ میں[۵] جمع اور توافق کا مسلک اختیار فرمایا ہے۔ لیکن میں نے علامۂ ابن قیمؒ کا قول ان کی کتاب زاد المعاد میں واقعہ فتح مکہ کے بیان کے سلسلہ میں یہ دیکھا کہ:" اس واقعہ میں یہ بھی ہے کہ ایک شخص صحابی رسول جن کو ابوشاہ کہا جاتا تھا، کھڑے ہوئے اور درخواست کی کہ میرے لیے تحریر فرما دیا جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں بھائی ابوشاہ کے لیے لکھ دو، یعنی آپ کا بیان فرمودہ خطبہ۔" ——— تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم (حدیث) کی کتابت جائز ہے۔ اور اس سے جو ممانعت فرمائی گئی تھی اب وہ منسوخ فرما دی گئی۔ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے فرمایا تھا کہ جس شخص نے مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ اور لکھا ہو وہ اس کو مٹا دے، اور یہ ممانعت ابتداء اسلام میں تھی۔ جبکہ وحی متلو (یعنی قرآن) کا وحی غیر متلو (یعنی حدیث) سے اختلاط کا اندیشہ تھا۔ لیکن بعد میں اس حدیث کے ذریعہ کتابت کی اجازت ہوگئی، چنانچہ (صحابہ کا عمل بھی اس پر تھا) حضرت عبداللہ بن عمرو کا آپ کی باتوں کو لکھنا ثابت ہے۔ ان کے مخطوطات میں ایک صحیفہ تھا جس کا نام "صادقہ" تھا۔ یہ وہی مجموعہ ہے جس کو ان کے پوتے عمرو بن شعیب نے عن ابیہ

۵۔ جن کا ذکر اوپر مفتاح السنۃ کی عبارت میں آچکا ہے۔

عن جدہ کی سند سے روایت کیا ہے، اور یہ نہایت صحیح احادیث سمجھی جاتی ہیں چنانچہ بعض ائمہ حدیث نے تو اس سند کو ایوب عن نافع عن ابن عمرؓ (جیسی جید سند) کا ہم پلہ گردانا ہے اور ائمہ اربعہ اور ان کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اس سے احتجاج فرمایا ہے۔

خود میرا رجحان بھی نسخ ہی کے قول کی جانب ہو۔ اس لیے کہ قرآن کا اسلوب بیان اگرچہ انوکھا تھا اور اس کے الفاظ کا نظم گوکہ نرالا ہی تھا جسکی وجہ سے وہ اعجاز میں اپنے غیر سے ممتاز ہوسکتا تھا: تاہم مسلمان ابتداء اسلام میں چونکہ اس کی معیت کا زمانہ کم پائے ہوئے تھے کیونکہ نیا نیا نازل ہوا تھا، اور نازل بھی جو ہوتا تھا تو وہ تھوڑا تھوڑا۔ اس لیے اس کا اپنے غیر سے امتیاز ابھی نفوس میں راسخ نہیں ہوا تھا، اور لوگ خاطر خواہ اس کو سُن کر ہی قرآن سمجھ لینے کے خوگر نہ ہوئے تھے۔ لہٰذا بعید نہ تھا کہ بہت سے ایسے لوگوں پر جو میدانِ بلاغت کے شہسوار نہیں ہیں وحی متلو اور غیر متلو میں اشتباہ ہوجائے اس لیے اس کی تمیز کتابت کے ذریعہ لازم تھی۔ لیکن جب نفوس اس کے اسلوب ادا اور اندازِ بیان کے خوگر ہوگئے اور اس کو سنتے اور تلاوت کرتے ایک زمانہ گذر گیا یہاں تک کہ لوگوں کا یہ حال ہوگیا جب کسی آیۃ یا سورت کو تلاوت ہوتے سنتے تھے تو اول کلمہ جو ان کے کان میں پڑتا تھا بس اسی کو سن کر سمجھ جاتے تھے کہ یہ وحی متلو (قرآن شریف) ہے۔ اور یہ شناخت ان کے نفوس میں اس درجہ راسخ ہوچکی تھی کہ اب اس بارے میں شبہ ان کے پاس سے بھی ہوکر نہیں گذرتا تھا جب یہ صورت ہوچکی ہو تب ان کو کتابتِ حدیث کی اجازت دی گئی، کیونکہ اب وجہ ممانعت باقی نہ تھی یعنی التباس سے امن ہوچکا تھا۔

اور کیا عجب کہ ابتداءً کتابتِ حدیث کی ممانعت اور بالآخر اسکی اجازت دینے کے وجوہ میں سے ایک وجہ یہ بھی ہو کہ کتابت سے جو حضرات واقف تھے وہ اوائل اسلام میں بہت کم تھے۔ لہٰذا حکمت بھی اسی کو مقتضی تھی کہ ان سے صرف کتابتِ قرآن کا کام لیا جائے۔ لیکن جب بعد میں کاتبین کی تعداد زیادہ ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابتِ حدیث کی بھی اجازت فرمادی۔"

اوپر کے بیان سے معلوم ہوا کہ ابتداء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابتِ حدیث سے منع فرمایا تھا، لیکن بعد میں آپ نے اس کی اجازت دے دی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ صحابہ کا زمانہ حدیث کی کتابت اور اس کے مجموعہ سے خالی تھا، ایسا نہیں تھا، بلکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کے زمانہ میں بھی خاصا ذخیرہ حدیث کا مدون ہو چکا تھا۔ چنانچہ مفتاح السنۃ میں ہو کہ :-

"میرے سابقہ بیان سے آپ کہیں اس نتیجہ پر نہ پہونچیں کہ قرنِ اول میں احادیث اور سنن کا کچھ بھی حصہ مدون نہیں ہو سکا تھا (اگرچہ زیادہ تر احادیث کا معاملہ تو یہی ہوا کہ وہ اس وقت تک مدون نہ ہو سکیں) تاہم حضرت عبد اللہ بن عمرو رضؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتے تھے اس کو لکھ لیا کرتے تھے۔ ابو عمر یوسف بن عبد البر اپنی کتاب "جامع بیان العلم و فضلہ" میں مطرف بن طریف سے نقل کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے شعبی سے سنا وہ کہتے تھے کہ مجھ سے ابو جحیفہ نے کہا کہ میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضؓ سے پوچھا کہ کیا آپ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی اور چیز موجود ہو سوا قرآن کے؟ انھوں نے فرمایا کہ نہیں تو۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے دانے کو پھاڑا اور جان کو پیدا فرمایا کچھ اور نہیں ہو سوا اس کے کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اپنی کتاب کا فہم عطا فرما دیں اور سوا اس کے کہ جو اس صحیفہ میں ہے۔ ابو جحیفہ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ اس صحیفہ میں کیا ہے؟ فرمایا دیت کے کچھ مسائل اور قیدیوں کی رہائی کے بعض مسائل اور یہ کہ کافر کے بدلہ میں مسلم قصاصاً قتل کیا جائے اسی طرح سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات، دیات، اور فرائض و سنن سے متعلق حضرت عمرو بن حزم کو کچھ باتیں لکھ دی تھیں، نیز حضرت ابو جعفر محمد بن علیؑ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار کے دستہ میں ایک تحریر ملی جس میں لکھا تھا کہ

"ملعون من اضل اعمیٰ عن سبیل	"ملعون ہے وہ شخص جو کسی نابینا کو رستہ سے بھٹکائے۔ ملعون ہے وہ شخص جو زمین کے
ملعون من سرق تخوم الارض	کنارے کی چوری کرے (مثلاً یہ کہ دوسرے کی
ملعون من تولی غیر موالیہ ۱ھ	

قال ملعون من جحد نعمۃ من انعم علیہ۔" پیڑا اپنے کھیت میں شامل کرلے) ملعون ہے وہ شخص جو اپنے مولیٰ کے غیر کی جانب خود کو منسوب کرے۔ یا یہ فرمایا کہ ملعون ہے وہ شخص جو کہ اپنے محسن اور منعم کے انعام سے انکار کرے۔"

اسی طرح حضرت معن سے مروی ہے کہ عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعود نے مجھے ایک کتاب دکھائی اور مجھ سے قسم کھا کر کہا کہ اس کو میرے والد صاحب نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔

اسی طرح سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ وہ ابن عباسؓ کے ساتھ تھے تو ان سے جو حدیث سنتے تھے اس کو اپنے کجاوہ کی لکڑی پر لکھ لیتے تھے اور جب اس سے اترتے تو اس کو مٹا دیتے تھے۔

اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابوالزناد اپنے والد سے بیان کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ تو صرف حلال اور حرام کو لکھتے تھے لیکن ابن شہابؒ جو کچھ بھی سنتے تھے انکو لکھ لیتے تھے پھر جب ان مسائل کی حاجت پڑی تو میں نے جانا کہ وہی سب سے بڑے عالم ہیں۔

اور حضرت ہشام بن عروۃ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ یوم حرہ میں خلافت یزید کے زمانے میں ان کی سب کتابیں جل گئیں اس پر وہ فرمایا کرتے تھے کہ کاش ان کتابوں کے بجائے میرے سب اہل وعیال اور میرا سب مال جل جاتا۔"

(مفتاح السنۃ ص۱۸)

سبحان اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں اور دینی ذخیرہ ان حضرات کو کس درجہ محبوب تھا۔

دین میں حکمتِ عملی کا مقام

[ناظرینِ الفرقان کو یہ خیال نہ ہو کہ اس عنوان کے تحت جو مضمون چار قسطوں میں نکل کر ختم ہو چکا تھا۔ اب اس کی کوئی پانچویں قسط نکل آئی، ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے مضمون پر ایک سوال اور مولانا مودودی کے قلم سے اس کا جواب تازہ ترجمان القرآن میں اسی عنوان سے شائع ہوا ہے۔ ہم اسی کو یہاں نقل کر رہے ہیں، تاکہ ہماری تنقید کا جواب بھی لوگوں کے سامنے آجائے۔ اور وہ کسی فیصلہ پر یکسو ہو سکیں۔ اس لئے کہ جیسا کہ سائل نے خیال ظاہر کیا ہے، یہ مسئلہ علمی اور عملی ہر لحاظ سے نہایت اہمیت رکھتا ہے۔

ہم نے جہاں ضرورت سمجھی ہے، حاشیہ میں اس سوال و جواب پر کچھ عرض کر دیا ہے گویا حواشی تمام کے تمام ہماری طرف سے ہیں ــــ اہلِ علم سے گذارش ہے کہ وہ اگر ضرورت سمجھیں تو اس مسئلہ میں اظہارِ خیال فرمائیں۔ الفرقان کے صفحات ان کے لئے حاضر ہیں۔] (ادارہ)

سوال:۔ "دین میں حکمتِ عملی کے مقام" سے متعلق ایک لمبا چوڑا مضمون رسالہ "الفرقان" لکھنؤ میں نکل رہا ہے جس کی آخری قسط تازہ الفرقان میں آچکی ہے۔ پتہ نہیں مضمون مذکور آپ کی نظر سے گذر رہا ہے یا نہیں لیکن میں اس سے متعلقہ دو ایک باتوں پر آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

گو کہ مضمونِ مذکور سے مجھے اکثر جگہ اختلاف رہا ہے لیکن " ائمۃ من قریش" اور

مئی کے ترجمان میں "کیا دین کے سب ہی اصول بے لچک ہیں" والے مضمون کے تحت دی گئی ہوئی نو مثالوں پر تنقید جان دار معلوم ہوئی۔ فاضل مضمون نگار نے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ کی دی ہوئی مثالیں محض شخصی اجازتیں، وقتی رخصتیں اور اضطراری وقتوں کے تحت آتی ہیں اور ان کا مساعیٔ اقامتِ دین سے کوئی علاقہ نہیں۔

مضمون کی ایک اور بات سے مجھے اتفاق ہے وہ یہ کہ گو آپ نے حکمتِ عملی والی بات چند جزئی امور جیسے "امیدواری سسٹم" اور دیگر جماعتوں سے تعاون وغیرہ کے سلسلے میں کہی ہے لیکن آپ نے جس انداز سے ان پر اسوۂ رسول سے دلائل دیئے ہیں (جو صاحبِ مضمون کے نزدیک تمام کی تمام غیر متعلق ہیں) ان سے غیر سنجیدہ، مفاد پرست طبقہ کے لیے دین میں کتر بیونت کا موقعہ ہاتھ آجاتا ہے اور یہ بہت سے فتنوں کا دروازہ کھول دے گا۔ اپنے اس شبہ کے ثبوت میں مضمون نگار نے رسالہ کے اسی شمارہ میں "المنبر" کے حوالہ سے "ووٹوں کی خریدی" سے متعلق ایک عملی مثال بھی دی ہے جس میں ایک صاحب نے "المنبر" کے اڈیٹر صاحب کو لکھا تھا کہ حضور "تالیف القلب" کے سلسلے میں جب لوگوں کے ایمان خریدتے تھے تو اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں ووٹوں کی خریدی برحق ہے اور یہ کہ ان صاحب کو ایک خزانہ ہاتھ آجائے تو تمام لوگوں کے ووٹ خرید کر اسلامی نظام کے قیام کی کوشش فرمائیں۔ ....

...... فاضل مضمون نگار کا کہنا ہے کہ آپ کے حکمتِ عملی والے مضمون سے متاثر ہو کر لوگ اتنی پستی تک بھی گر سکتے ہیں تو ــــــ آئندہ ایسے فلسفہ کی مختلف طریقہ سے توجیہ کر کے دین کی کئی اہم قدروں کو منہدم کر سکتے ہیں۔

آپ یہ کہتے ہیں کہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں توحید، رسالت اور دیگر اہم اصولوں کے استثناء سے دوسرے نسبتاً کم اہم اصولوں کو موقع کی نزاکت کے لحاظ سے قطع نظر کیا جا سکتا ہے جب کہ ان پر اصرار کرنے سے دیگر اہم اصولوں کو نقصان پہنچ رہا ہو ــــــ جماعت کے معترض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اگر دین کا قیام ہوگا تو

اپنے پورے اصول برقرار رکھتے ہوئے ہوگا ورنہ ایسی کسی جد وجہد میں کسی بھی اصول کو قربان کیا گیا تو وہ اقامت دین کی جد وجہد نہیں ہے اور اگر یہ جد وجہد کامیاب ہو بھی گئی تو اسلامی نظام کے بجائے کسی کے خود ساختہ نظام کا قیام عمل میں آئے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اور اگر حالات کا دباؤ ایسا ہو بھی تو دعوتِ دین کے شیدائیوں کو چاہیئے کہ دین کو اپنے تمام اصولوں کے ساتھ قائم کرنے پر مصر رہیں یا دعوتِ دین سے دستبردار ہوں۔ غرضیکہ صاحبِ مقالہ کا استدلال یہ ہے کہ احکام دین میں استثناء کی گنجائش شخصی اضطرار اور ذاتی مصالح کے لئے تو ہو سکتی ہے۔[1] لیکن دینی مقاصد اور دینی مصالح کی خاطر اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

چونکہ مسئلہ کا تعلق "دعوتِ دین اور اس کے طریقۂ کار" کے بنیادی امور سے ہے اس لئے بہت سے حضرات جو جماعت کے بیجا حامی ہیں نہ اس کے غالی مخالف اس کو فی الواقع سمجھنا چاہتے ہیں۔ اس بارے میں آپکے دسمبر اور مئی والے ترجمان کے رسائل و مسائل کے تحت دیئے ہوئے جوابات پوری طرح تشفی بخش نہیں ہیں۔ اسلئے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ایک مفصل مضمون جو قرآن، حدیث اور اسوۂ صحابہ کی مثالوں سے جو صرف اقامتِ دین کی جد وجہد سے علاقہ رکھتی ہوں مشرح ہو ترجمان القرآن میں رقم کیا جائے تو جہاں یہ بہت سی غلط فہمیوں کے ازالہ کا باعث ہوگا وہاں بہت سے تعلق خاطر رکھنے والے حضرات کے اضطراب کیلئے تشفی بخش ہوگا۔ باعتبی لحاظ سے ہٹ کر بھی اس کی خالص علمی لحاظ سے بھی بڑی اہمیت ہے۔"

جواب:۔ "الفرقان" کی جس بحث کا آپ نے ذکر کیا ہے اس کے موقع ومحل اور انداز سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اصل بنائے بحث بجائے خود یہ مسائل نہیں ہیں بلکہ دل کا ایک پرانا بخار ہے جو مدتوں سے موقع کی تلاش میں دبا پڑا تھا اور اب اس کو نکالنے کے لئے کچھ مسائل بطور حیلہ ڈھونڈ لئے

الفرقان [1] جناب سائل سے یہاں ہماری ترجمانی میں کوتاہی ہوئی ہے۔ ہم نے استثناء کو صرف شخصی اضطرار اور ذاتی مصالح میں محدود نہیں کیا ہے، بعض اور مواقع میں بھی اس کی گنجائش مانی ہے۔ ۱۲

گئے ہیں۔[۱] اگر کوئی شخص یہ ارادہ کر کے بیٹھ جائے کہ کسی کو متہم کرنا ہے تو دنیا میں کوئی نہیں ہے جو ایسے شخص کی مار سے بچ جائے۔ آپ جس بڑے سے بڑے قدیم یا جدید مصنف کا نام چاہیں لے لیں، میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ متہم کرنے کا ارادہ کر لینے کے بعد اس کے ہاں سے کیسے کیسے سخت الزامات کی بنیادیں برآمد کی جا سکتی ہیں۔[۲] دوسروں کو چھوڑیے، اگر خدا کا خوف اور ایک ایک لفظ پر اس کے حضور باز پرس کا خطرہ نہ ہوتا تو میں بطور نمونہ بتاتا[۳] کہ خود ان حضرات کو ضالّ اور مضلّ ثابت کر دینا

---

[۱] یہ "دل کے بخار" کی بات بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔ جس غریب کے مضمون پر یہ سوال و جواب ہے اس سے مولانا کا آخر کب کوئی ایسا تصفیہ پیش آیا تھا جس کی بنا پر دل کے بخار کا احتمال پیدا ہو؟ کیا مولانا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ چونکہ صاحبِ الفرقان کی جماعت اسلامی سے علیحدگی کے مدتوں پرانے قصہ کی بنا پر صاحبِ الفرقان کے بارے میں وہ یہی سمجھتے ہیں، اور مضمون نگار کو صاحب الفرقان سے نسبت ہے۔ اسلئے صاحبِ الفرقان کے "دل کا بخار" ضرور کچھ نہ کچھ اسکے دل میں بھی منتقل ہو گیا ہو گا! بظاہر یہی مدعا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس وہمی منطق کا جواب کس کے پاس ہو سکتا ہے؟ الّا یہ کہ اگر واقعی کسی کے دل میں بخار ہو تو وہ اس منطق کے جواب میں اچھی طرح اپنا بخار نکال لے، کیونکہ نفسیاتی طور پر یہ باتیں بخار نکالنے کا بہترین موقع فراہم کرتی ہیں مگر الحمدللہ یہاں کوئی بخار رہے ہی نہیں۔!

[۲] الفرقان کا پورا مضمون پڑھ جائیے، انشاء اللہ مولانا پر کوئی "الزام" اس میں آپ کو نہ ملے گا۔ ساری تنقید مشروط انداز میں کی گئی ہے (کہ اگر مولانا کا یہ مدعا ہے تب اس پر یہ نقد ہے) اور مولانا کا یہ حق بہر واجبی حد تک تسلیم کیا گیا ہو کہ وہ اپنے ارشادات کا جو چاہیں مطلب بیان فرمائیں۔ مضمون کی پہلی قسط میں یہ بات بڑی وضاحت اور صراحت کے ساتھ آئی ہے، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ سائل کو مولانا سے تعلق خاطر کے باوجود مضمون سے یہ شکایت کسی درجہ میں بھی نہیں ہوئی کہ اس میں مولانا کے ساتھ کوئی ناانصافی کی گئی ہے۔

[۳] کیا جناب سائل مولانا کی توجہ اس طرف بھی مبذول کرا سکتے ہیں کہ یہ جو آپ نے "تہمت تراشی" کا الزام الفرقان کے مضمون نگار کو دیا ہے۔ اس کی کیا بنیاد ہے؟ اور اگر کوئی بنیاد نہیں ہے تو کیا یہ "تہمت" نہیں ہے، اور یہ ان چیزوں میں سے نہیں ہے جن پر اللہ کے حضور باز پرس کا خطرہ ہو؟

بلکہ انھیں دین اور ملت کے لئے سب سے بڑا خطرہ ٹھیرا دینا کتنا آسان ہے اور آدمی تقویٰ و خشیت کا لباس زور پہن کر کیسی کچھ باتیں خود ان لوگوں کے خلاف بنا سکتا ہے۔

میرا قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی شخص کی تنقید میں مجھے اس طرح کے محرکات محسوس ہوتے ہیں تو میں اسکا جواب دینے سے پرہیز کرتا ہوں، کیونکہ وہ تو اپنے مقصد کی خاطر ہر وادی میں بھٹکتا پھریگا، میں اپنا مقصد چھوڑ کر اس کے پیچھے کہاں کہاں بھٹک سکتا ہوں۔ اور آخر اس طرح کے لوگوں سے الجھ کر میں پھر اور کسی کام کے لئے وقت بھی کہاں سے لا سکتا ہوں۔ اسی لئے آپ دیکھتے ہیں کہ بعض حضرات پندرہ پندرہ سولہ سولہ برس سے مسلسل مجھ پر حملے کر رہے ہیں، اور ابھی چند سال سے تو کچھ لوگوں نے میرے خلاف الزام تراشیاں کرنا اپنا مستقل مشغلہ ہی بنا رکھا ہے۔ مگر میں نے کبھی ان کی کسی بات کا جواب نہ دیا، یا حد سے حد اگر کبھی ضرورت سمجھی تو اپنی پوزیشن کی وضاحت کر دی اور اس کے بعد انھیں چھوڑ دیا کہ جب تک چاہیں اپنا نامہ اعمال سیاہ کرتے رہیں۔[ف۱]

آپ "الفرقان" اور "المنیر" کے مضامین سے اگر دھوکا کھاتے رہیں گے تو میرے لئے بہ سخت مشکل ہوگا کہ وہ آئے دن آپکے دل میں ایک نیا وسوسہ ڈالیں اور میں اپنے سارے کام چھوڑ چھاڑ کر آپکے وسوسے دور کرنے میں لگا رہوں، بہتر یہ ہے کہ آپ صبر کے ساتھ دونوں طرف کی چیزیں پڑھتے رہیں۔ اگر آپ کی سمجھ میں حقیقتِ حال آجائے تو اچھا ہے، ورنہ جہاں اور بہت

ف۱ جواب کی اس ساری تمہید کو پڑھ کر ہمیں جماعت اسلامی ہند کے آرگن دعوت (دہلی) کا کئی سال پیشتر کا وہ شذرہ یاد آرہا ہے جس کا عنوان کچھ اس قسم کا تھا "ان سے ہشیار!" اور اس کے ذیل میں متعدد رسائل و جرائد کے نام گنا کر (جن میں سے ایک الفرقان بھی تھا، اور الفرقان ہی کے بعض مضامین سے خفا ہو کر یہ شذرہ غالباً لکھا بھی گیا تھا) لوگوں کو بتایا گیا تھا کہ یہ دین و ایمان اور ضمیر و شرافت کو بالائے طاق رکھ کر جماعت اسلامی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کی باتوں پر کان نہ دھرنا! انہیں تو یونہی اپنا نامہ اعمال سیاہ کرتے رہنا ہے۔ اس پر ایک تدارک کی مضمون میں امیر جماعت اسلامی ہند نے غالباً یہ بھی لکھا تھا کہ یہ تو وہی حربہ ہے جس کے استعمال کی شکایت ہمیں اپنے بعض مخالفین سے ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ صاحب کا مسلک وہی ہے جو ادارۂ دعوت نے اختیار کیا تھا۔

سے لوگ ان وسوسہ اندازیوں کے شکار ہوئے ہیں وہاں ایک آپ بھی سہی۔

تاہم چونکہ آپ نے پہلی مرتبہ مجھ کو ان کے ڈالے ہوئے وساوس کے بارے میں لکھا ہو اس لئے میں صرف ایک دو باتوں کی وضاحت کئے دیتا ہوں تاکہ بات سمجھنے میں آپ کو مدد مل سکے۔

(۱) اختیارِ اَھون کے اصول کی وضاحت میں جو مثالیں میں نے دی ہیں ان کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ ان سے صرف[1] شخصی مشکلات اور بندوں کو پیش آنے والی حاجات ہی میں اضطرار کے موقع پر رخصت کا ثبوت ملتا ہے، رہا اقامتِ دین کا کام تو اس میں اس قاعدے کے استعمال کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اب ذرا آپ خود سوچیں کہ اگر بات یہی ہے تو رواۃِ حدیث کی جرح و تعدیل کے سلسلے میں محدثین نے بے شمار زندہ اور مردہ راویوں کی جو غیبت کر ڈالی، اسکا باعث آخر کونسا شخصی اضطرار تھا[2]؟ دوسری مثالوں کو تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ دیجئے، صرف یہی ایک مثال اس امر کے ثبوت میں کافی ہے کہ بڑے مفسدے سے بچنے کے لئے چھوٹے مگر ناگزیر مفسدے کو اختیار کرلینا، اور بڑی بھلائی کی خاطر چھوٹی بھلائی کا نقصان بقدرِ ضرورت گوارا کرجانا، صرف شخصی حاجات ہی کے لیے جائز نہیں بلکہ خالص دینی مصالح کے لئے بھی جائز ہے، اور راس قاعدے کے

---

[1] یہ کہیں نہیں کہا گیا، مولانا نے اگرچہ ہمارا مضمون ملاحظہ فرمایا ہو، جیساکہ جواب کے بین السطور سے معلوم ہوتا ہو، مگر افسوس کہ انھوں نے، ہماری ترجمانی میں سائل کے الفاظ کی کوتاہی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیں ایک غلط موقف میں پیش کرکے جواب ارشاد فرمادیا ہم نے استثناء کے جواز کو صرف شخصی مشکلات و حاجات ہی میں محدود نہیں مانا ہے، بلکہ بعض اور مواقع میں بھی اس کے جواز کو تسلیم کیا ہے۔

[2] جی ہاں! یہاں کوئی شخصی اضطرار نہیں تھا۔ مگر یہاں جو کچھ اور تھا وہ ہم نے آپ کی اس مثال پر کلام کرتے ہوئے واضح کردیا ہے۔ یہ تو نہیں تھا کہ بس جوازِ استثناء کی صورتیں بیان کرکے چھوڑ دی گئی ہوں، اور مثالوں کو الگ الگ ان اصولی صورتوں پر منطبق نہ کیا گیا ہو، ہم نے تو آپ کی ایک ایک مثال کے متعلق بتایا ہو کہ وہ کس صورت کے ذیل میں آتی ہو۔ چنانچہ اس جرح و تعدیل والی مثال کے متعلق بھی ہم نے بتایا تھا کہ یہ مثال آپ نے جہاں سے لی ہو یعنی امام نوویؒ کی ریاض الصالحین سے، وہاں امام نوویؒ نے خود بتایا ہو کہ یہ مثال "تحذیر المسلمین من الشر" (یعنی عامۃ المسلمین کے دینی ضرر کی روک تھام) کے ذیل میں آتی ہے۔

معاملے میں بندوں کی ضروریات اور سعی اقامتِ دین کی ضروریات کے درمیان جو فرق ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ محدثین نے ہزارہا راویوں کے عیوب کی پردہ کشائی اپنے "پیشے" کی ضروریات، یا اپنی تصنیف و تالیف کے مقاصد کی خاطر تو نہیں کی تھی۔ یہ صریح حرام، بلکہ قرآن کی تعبیر کے مطابق نہایت گھناؤنا کام انھوں نے صرف اس دلیل کی بنا پر کیا تھا کہ اگر اس برائی کا ارتکاب نہ کیا جائے گا تو اس سے بہت زیادہ بڑی برائی یہ لازم آئی گی کہ دین میں بہت سی وہ باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے داخل ہو جائیں گی جو حضورؐ نے نہیں فرمائیں اور اس طرح دین کا حلیہ بگڑ کر رہ جائے گا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ خالصتہً اقامتِ دین کے سلسلے کا ایک نہایت اہم اور نمایاں کام نہ تھا۔[۵] اس میں تو شخصی مصالح

۵؎ محدثین کے اس کام کی توجیہ میں امام نووی کی رائے ذکر کرنے سے پیشتر ہم نے بطور خود جو بات کہی تھی وہ بعینہ یہی تھی جو مولانا نے ذرا مختلف الفاظ میں فرمائی ہے۔ یعنی یہ کام دین کو نقصان (فساد) سے بچانے کے لیے کیا گیا۔ مگر اس کے بعد یہ ارشاد کہ "یہ اقامتِ دین ہی کے سلسلہ کا ایک اہم کام تھا" یہ ہم سے حقیقتہً اختلاف نہیں، بلکہ غلط مبحث ہے۔ وسیع معنیٰ میں تو "اقامتِ دین کے سلسلہ کے کام" کا اطلاق کم و بیش ہر دینی خدمت پر کیا جا سکتا ہے۔ مگر گفتگو اس وسیع معنیٰ میں تو نہ تھی۔ گفتگو تو "اقامت دین" کے اس خاص اصطلاحی معنیٰ میں ہے جو جماعت اسلامی کا شعار ہے۔ اور جس کی بنا پر اس کا دعویٰ ہے کہ روئے زمین پر تنہا وہی جماعت ہے جو کامل اقامتِ دین کی علمبردار ہے۔ یعنی حکومتِ الٰہیہ کا قیام ——— جو پہلے جماعت اسلامی کے نصب العین کے لیے "اقامت دین" کی جگہ پر بولا بھی جاتا تھا ——— اور جس کی دوسری تعبیرات "غلبۂ دین" وغیرہ کے الفاظ ہیں! ——— پھر یہ مولانا اس خاص اصطلاحی معنیٰ کی بحث میں اس وسیع معنیٰ کو کیوں لا رہے ہیں؟ کیا مولانا اسکے لئے تیار ہیں کہ آج دینی درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور وعظ و تبلیغ کے حلقوں میں سے کوئی دعویٰ کرے کہ وہ بھی اقامت دین کے کام میں مولانا اور انکی جماعت کے ہمسر ہیں، تو مولانا اسکی تصدیق فرما دیں؟ اگر نہیں! اور یقیناً نہیں، تو مولانا کو کوئی ایسی مثال لانی چاہیئے جو "غلبۂ دین" کے لیے دین کے کسی اصول کو حکمتِ عملی کے طور پر قربان کرنے کی نظیر بن سکے۔ یا جو مثالیں انھوں نے دی تھیں انھیں میں سے کسی کے متعلق ہمارے نتیجہ بحث کے برعکس یہ ثابت کرنا چاہیئے کہ انکی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وضاحت کے کسی شائبے تک کی نشان دہی نہیں کی جاسکتی۔ اور یہ وہ کام ہے کہ جسے ایک قابلِ معافی جرم نہیں بلکہ کارِ ثواب سمجھ کر امت کے اگلے پچھلے تمام فقہاء اور محدثین نے بالاتفاق کیا اور تمام امت نے بالاجماع اسے کارِ ثواب مانا، حالانکہ فی الاصل اس کے غیبت ہونے سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

(۲) دین کے کسی قاعدے کو بیان کرنے میں یہ احتمال کہ اس سے مفاد پرست لوگوں کو ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع مل جائے گا، بظاہر بڑا اہم محسوس ہوتا ہے، لیکن غور کیجئے، کیا اس اندیشے سے اللہ اور اسکے رسولؐ نے اور امت کے اہلِ علم نے کسی ضروری چیز کو بیان کرنے سے اجتناب کیا ہے؟[ف۱] قرآن، حدیث اور فقہ کے صفحات میں بکثرت باتیں ایسی موجود ہیں جن سے اگر کوئی جاہل اور بدنیت آدمی ناجائز فائدہ اٹھانے پر اتر آئے تو فسق و فجور اور گمراہی کی آخری حدوں کو بھی پار کرجائے۔ لیکن ان اندیشوں سے نہ خدا نے نہ اس کے رسولؐ نے اور نہ علمائے امت نے کوئی ایسی بات کہنے سے پرہیز کیا جو اپنے صحیح محل میں درست ہو اور جس کا بیان کرنا دین کی پیروی کرنے والے نیک نیت لوگوں کی رہنمائی کے لیے ضروری ہو۔ اب اگر وہ باتیں جو میں نے زیرِ بحث مضامین میں کہی ہیں، بجائے خود درست ہیں[ف۲] اور ایک ایسے قاعدے کی نشاندہی کرتی ہیں جو واقعی دین میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نوعیت ٹھیک یہی ہو، ورنہ یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ اس نوعیت کی کوئی مثال اُنکے پاس نہیں ہو — یہ غلط مبحث والی حکمت عملی تو نہ اُنکے شایان شان ہو اور نہ اس سے کوئی فائدہ ہے، بجز اسکے کہ بحث طول کھینچتی رہے۔

ف۱ جی! ہرگز نہیں کیا۔ اور نہ علمائے امت کو کرنا چاہیئے۔

ف۲ جی نہیں! اسی میں تو کلام ہو۔ "وہ باتیں" بجائے خود درست نہیں ہیں۔ بلکہ غلطی اس نامنجار "تہمت تراشی" سے یہ ہوئی کہ اُس نے اُن حدود میں اس نظریہ کے استعمال کی تصویب کردی جن حدود میں ابتک مولانا کی طرف سے اسکا استعمال سامنے آیا ہوا اور غالباً سائل نے بھی ہماری ترجمانی میں یہی بات کہی ہو، مگر مولانا نے اس تصویب کو اصل "باتوں" کی تصویب بنا دیا۔ اور پھر سوال بن گیا کہ اگر بات درست ہو تو پھر کسی مفسد کی فتنہ پردازی کے احتمال کا کیا وزن؟ حالانکہ عرض یہ کیا گیا تھا کہ بات جتنی وسعت کے ساتھ کہی جارہی ہو وہ غلط اور خود فتنہ انگیز ہے، اگرچہ مولانا جن حدود میں ابتک اس نظریہ کو برتتے ہوئے سامنے آئے ہیں ان میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

موجود ہے، تو آپ خود سوچ لیں کہ ان لوگوں کی باتیں کیا وزن رکھتی ہیں اور مجھے ان کو کیا وزن دینا چاہیئے جو ان پر مجھے متہم کرنے کے لئے یہ احتمال پیدا کرتے ہیں کہ ان امور کے بیان کرنے سے فتنوں کا دروازہ کھلے گا، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر لوگوں کے دلوں میں یہ وسوسے ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ میں خود فتنے میں پڑنے اور دین کے نام سے بے دینی کی خدمت کرنے کے لیے یہ دروازے کھول رہا ہوں۔[1]

اس کا جواب تو یہی ہو سکتا ہے کہ آدمی صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جائے اور ان لوگوں کو جو کچھ بھی یہ کہنا چاہیں کہنے دے۔

(۳) "ووٹوں کی خریداری" کے موضوع پر جو کچھ "المنیر" نے لکھا اور "الفرقان" نے اسکے صفحات سے نقل کیا، اس سے مقصود اس امر کا ثبوت بہم پہنچانا ہے کہ جس فتنے کے دروازے کھلنے کا وہ احتمال ظاہر کرتے تھے وہ تو پہلے ہی کھل چکا ہے اور میں کر ہی کھولے کھلا ہے۔ یہ کرتب جو کمال درجہ تقویٰ کے ساتھ دکھائے جا رہے ہیں، میں صبر کے ساتھ ان پر خاموش ہی رہنا مناسب سمجھتا تھا، کیونکہ یہ الزام تراشیاں اور دوسروں کو متہم کرنے کے لیے یہ سرگرمیاں اور بے تابیاں اپنے اندر جو روح رکھتی ہیں۔ میں ہر وقت خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ انکی مدافعت کی کوشش کہیں مجھے بھی اس کی چھوت نہ لگا دے۔[2] لیکن افسوس ہے کہ آپ جیسے سادہ دل حضرات آدمی کو صبر سے خاموش بھی نہیں بیٹھنے دیتے اور ان باتوں پر جواب طلبی شروع کر دیتے ہیں۔ اب دیکھیے کہ معاملے کی اصل حقیقت کیا ہے اور پھر خود مجھے بتائیے کہ ان چیزوں کی آخر کیا جواب دہی کی جا سکتی ہے۔

پہلے "المنیر" نے مجھ پر یہ سراسر جھوٹا الزام لگایا کہ میں روپے کے ذریعہ سے ووٹ خریدنے کو جائز رکھتا ہوں اور اسے "مولفۃ القلوب" کی مد میں شمار کرتا ہوں (حالانکہ اس بیان میں سدا نشہ کا شائبہ تک نہ تھا، یہ بات میری زبان پر آنا تو درکنار کبھی میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آئی تھی۔ اور اس چیز کو "المنیر" کے صفحات میں دیکھنے سے ایک سکنڈ پہلے تک کبھی میں نہ سوچ سکتا تھا کہ مجھ پر یہ الزام بھی کبھی لگایا جا سکتا ہے۔) پھر اسی المنیر نے کسی دوسرے صاحب کا ایک

---

[1] مولانا کے نظریہ کو نہایت خطرناک سمجھنے کے باوجود یہ سوء ظن جو نہیں کیا گیا کہ مولانا اس نظریہ کو لے کر کوئی غلط کام کرنا چاہتے ہیں۔ یہ غالباً اسی کا صلہ ہے! [2] افسوس ہے کہ لگ گئی۔

خط شائع کر دیا جس میں وہ اپنی دانست کے مطابق ووٹوں کی اس خریداری کے حق میں کچھ دلائل پیش کرتے ہیں (اور یہ بالکل ان کا اپنا ہی فعل ہے، مجھ سے اس معاملہ میں نہ انکا نہ کسی اور شخص کا سرے سے کبھی کوئی تبادلۂ خیال ہوا ہی نہیں، اور ان کے استدلال یا خیالات کا مجھ سے قطعاً کوئی واسطہ نہیں ہے)۔ اسکے بعد جناب "الفرقان" اس سارے معاملے کو میرے سر تھوپ[1] کر لوگوں کو یہ تاثر دے رہے ہیں کہ دیکھو، یوں اس شخص کے خیالات سے متأثر ہونے والے لوگ اخلاقی قیود کو بالائے طاق رکھے دے رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ میں نے کب یہ کہا یا لکھا تھا کہ روپے سے ووٹ خریدنا جائز ہے؟ یہ ایک خالص بہتان تھا جو صاحبِ "المنیر" نے محض اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین کے لیے خود ہی گھڑا اور شائع کر دیا۔ ....

.... اب اگر ایک بالکل غیر متعلق شخص اس جھوٹی روایت پر اپنے کچھ خیالات پیش کرتا ہے تو کیا میں اس کی بھی جواب دہی کرتا پھروں؟ صرف یہ بات کہ وہ شخص اپنے خیالات پیش کرنے کے ساتھ میری تعریف میں بھی کچھ کلمات لکھ دیتا ہے، کیا اس کے لیے کافی ہے کہ مجھے اس کی ہر بات کا ذمہ دار ٹھیرا دیا جائے؟ یہ طرزِ مواخذہ اختیار کیا جائے تو اگلے پچھلے علماء و مشائخ اور بزرگانِ دین میں سے کون بچ جائے گا جس کے معتقدین و مداحین کی ہر غلطی اس کے سر چیپاں کر کے اُسے سرچشمۂ ضلالت ثابت نہ کیا جا سکے۔ شاید بگڑی ہوئی حکومتوں کے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر بھی لوگوں کو ماخوذ کرنے میں یہ سرگرمی اور چابکدستی تو نہ دکھاتے ہوں گے۔

---

[1] پہلے الفرقان کی پوری فردِ جرم پڑھ لیجئے اور اس کے بعد صرف یہ ایک واقعہ سن لیجئے کہ الفرقان کے حوالہ سے لکھنؤ کے مؤقر روزنامہ قومی آواز نے مذکورہ خط کے مضمون کو اپنے ایک ادارتی نوٹ میں مولانا کی طرف منسوب کر کے تنقید کر ڈالی تو یہ تہمت تراش، وسوسہ انداز الفرقان کا مضمون نگار ہی تھا جسے باپ "بخار قلب" اس غلطی کی تصحیح کرانے کی توفیق نصیب ہوئی۔ یعنی اس نے ایڈیٹر قومی آواز کو خط لکھ کر اس غلطی کی طرف متوجہ کیا اور انھوں نے دوسرے یا تیسرے ہی دن اس کی تصحیح شائع کر دی ـــــ اگر کوئی صاحب چاہیں گے تو امید ہے کہ ایڈیٹر صاحب قومی آواز اسکی تصدیق فرمائیں گے ـــــ اسی سے اندازہ فرمالیجئے کہ الفرقان نے مولانا کے سر کیا کچھ تھوپا ہوگا!

(۴) الائمۃ من قریش کے متعلق جو مفصل بحث میں نے "رسائل و مسائل" حصہ اول میں کی ہے اگر اسے آپ نے پڑھ لیا ہوتا تو شاید آپ "الفرقان" کی تنقید میں وہ وزن محسوس نہ کرتے جس کا اظہار آپ نے کیا ہے۔[۵] سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر احادیث میں کوئی چیز تو ایسی تھی جس کی بنا پر صدر اول سے لے کر شاہ ولی اللہ صاحب کے دور تک بالعموم فقہائے اسلام خلافت کے لیے قرشیت کو قانونی شرط کے طور پر بیان کرتے رہے۔ اگر حضور کے ارشادات سے یہ منشا سرے سے ظاہر ہی نہ ہو رہا ہوتا کہ آپ کے بعد خلافت قریش کے لوگوں کو دی جائے تو کیا فقہاء اتنے نادان تھے کہ محض پیشین گوئیوں کو بالاتفاق حکم سمجھ بیٹھتے اور موجودہ دور کے بعض حضرات سے پہلے کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی کہ یہ تو محض خبریں ہیں، ان کا منشا یہ ہے ہی نہیں کہ خلیفہ قریش میں سے ہو۔

"الائمۃ من قریش" حکم ہے یا خبر، اس کے متعلق شاہ ولی اللہ صاحب کی رائے ملاحظہ ہو:۔

"واز انجملہ (یعنی من جملۂ شرائط خلافت) آنست کہ قریشی باشد باعتبار نسب آبا خود زیرا کہ حضرت ابوبکر صدیق صرف کردند انصار را از خلافت باین حدیث کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمودہ اند الائمۃ من قریش" (ازالۃ الخفاء، مقصد اول، ص۳)

اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ شاہ صاحب اس حدیث کے معنی ائمہ قریش میں سے ہوں گے سمجھ رہے ہیں یا قریش میں سے ہوں؟ اگر بالفرض اسے اور اس معنی کی دوسری احادیث کو لفظاً خبر بھی قرار دیا جائے تو فقہاء و محدثین نے عام طور پر اس خبر کو امر ہی کے معنی میں لیا ہے بخاری کی حدیث لایزال ھذا الامر فی قریش کے متعلق علامہ قرطبی کہتے ہیں کہ "یہ حدیث مشروعیت کی خبر دیتی ہے، یعنی امامتِ کبریٰ منعقد نہ ہوگی مگر قرشی کے لیے"۔ ابن المنیر کہتے ہیں "اس کا مقتضیٰ جنسِ امر کا قریش میں محصور ہونا ہے، گویا حضورؐ نے دراصل یہ فرمایا کہ 'لا امر الا فی قریش' اور یہ ایسا ہی ہے جیسے حضورؐ کا یہ ارشاد کہ الشفعۃ فی ما لم یقسم"۔ اور علامہ ابن حجر فرماتے ہیں "یہ حدیث اگرچہ خبر کے الفاظ میں ہے مگر امر کے

---

[۵] جناب سائل "رسائل و مسائل" کی بحث ضرور پڑھیں اور نوٹ کریں کہ زیر بحث حدیث کے بارے میں مولانا کا موقف بعینہ وہی ہے یا نہیں جو الفرقان کے مضمون نگار کا ہے۔

معنی میں ہے، گویا حضورؐ کا ارشاد یہ تھا کہ خاص طور پر قریش ہی کو امام بناؤ۔ حدیث کے باقی طُرق اسی معنی کی تائید کرتے ہیں، اور صحابہ نے بالاتفاق اس کو حصر ہی کے مفہوم میں لیا بخلاف اُن لوگوں کے جو اس معنی کا انکار کرتے ہیں۔ اور اسی بات کی طرف جمہور اہلِ علم گیے ہیں کہ امام کے لیے قرشی ہونا شرط ہے۔" (فتح الباری جلد ۱۳ صفحہ ۹۶ - ۹۷)

علاوہ بریں علماء کی اس رائے کا انحصار محض اُن احادیث پر ہی نہ تھا جو خبر کے الفاظ و انداز میں ہیں۔ یا جن کے اندر محض خبر ہونے کا احتمال ہے بلکہ متعدد احادیث امر کے الفاظ میں بھی مروی ہیں، مثلاً قدموا قریشا ولا تقدموھا (قریش کو آگے کرو اور ان سے آگے نہ بڑھو) جسے بیہقی، طبرانی اور امام شافعی نے نقل کیا ہے' اور قریش قادۃ الناس (قریش لوگوں کے لیڈر رہیں) جسے امام احمد نے حضرت عمرو بن عاص سے روایت کیا ہے۔

دراصل اس مسئلے کے متعلق مختلف الفاظ میں کثرت سے جو ارشادات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہوئے ہیں ان کا مجموعی اثر یہ تھا کہ علمائے اسلام صدیوں تک بالاتفاق خلافت کے لیے قرشیت کو ایک قانونی شرط کی حیثیت سے بیان کرتے رہے ہیں اور خوارج و معتزلہ کے سوا کسی نے اس معاملہ میں اختلاف نہیں کیا ہے۔ قاضی عیاض تو اس معاملہ میں اجماع تک کا دعویٰ کرتے ہیں۔ انکے الفاظ یہ ہیں:-

"امام کے لیے قرشیت کا شرط ہونا تمام علماء کا مذہب ہے اور انھوں نے اسے اجماعی مسائل میں شمار کیا ہے۔ سلف میں سے کسی سے اس کے خلاف کوئی رائے منقول نہیں ہوئی ہے۔ اور اسی طرح بعد کے ادوار میں بھی امصار مسلمین میں سے کہیں کے علماء نے اس سے اختلاف نہیں کیا ہے۔" (فتح الباری، حوالۂ مذکور)

اب اس کا کیا علاج کیا جائے کہ بات اطفالِ مکتب تک پہنچ چکی ہے[ل] جو بے تکلف دعویٰ کرتے

ل اب آئی بات سمجھ میں کہ مولانا کی تحریر سے اس قدر بدمزگی اور برہمی کیوں ٹپک رہی ہے .... جبکہ جس مضمون پر سوال و جواب ہے اس میں اول سے آخر تک کوئی قابلِ شکایت لفظ نہیں بلکہ اس کا اختتام اپنی ایک سابقہ تحریر کے لیے عفو خواہی پر ہوا ہے جس میں کچھ تلخی اور بے اعتدالی آگئی تھی ____ معلوم ہوا کہ اصل قصہ صرف یہ ہے کہ ایک طفل مکتب نے مولانا پر (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

ہیں کہ یہ تو محض خبر تھی جس میں امر کا شائبہ تک نہ تھا، گویا پچھلی صدیوں میں جہالت اتنی عام تھی کہ خبر اور امر کا فرق بھی کسی کی سمجھ میں نہ آیا اور اس کے امر ہونے پر سب اتفاق کر بیٹھے اور صدیوں تک اتفاق کیے رہے! ان جسارتوں پر حال یہ ہے کہ یہی لوگ دوسروں پر الزام دھرتے ہیں کہ انکی تحریروں سے سلف کا اعتماد و احترام ختم ہوا جا رہا ہے اور عوام اس غلط فہمی میں پڑ رہے ہیں کہ دین ان سے پہلے کسی نے نہ سمجھا۔

میری رائے اس مسئلے میں اب بھی وہی ہے جس کی وضاحت میں اس سے پہلے "رسائل و مسائل" میں کر چکا ہوں، اور اب تک کوئی ایسی علمی بحث میرے سامنے نہیں آئی ہے جس سے مجھ کو اس پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہو۔ میرے نزدیک یہ ثابت ہے کہ حضور نے قریش ہی کو منصب خلافت دیے جانے کی ہدایت فرمائی تھی۔ یقیناً یہ آپ کا حکم تھا، محض پیشگوئی نہ تھی۔ مگر اس حکم کی بنیاد یہ نہ تھی کہ شرعاً خلافت ایک خاص قبیلے کا حق تھی جس کے سوا کسی دوسرے قبیلے یا نسل کا کوئی شخص اس منصب کا سرے سے مستحق ہی نہ ہو سکتا تھا، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ عملی سیاست کے نقطۂ نظر سے حضور کے بعد صرف قریش ہی کی خلافت کامیاب ہو سکتی تھی جس کے وجوہ حضور نے خود اپنے متعدد ارشادات میں واضح فرما دیے تھے، اس لیے آپ نے حکم دیا کہ خلافت قریش ہی میں رکھی جائے، تاکہ اسلامی نظام حکومت مشکلات میں مبتلا نہ ہو اور مسلمان محض اسلامی اصول مساوات کا مظاہرہ کرنے کے لئے کسی غیر قرشی کو خلیفہ بنا کر اُن نتائج سے دوچار نہ ہو جائیں جو ایک با اثر گروہ کے مقابلے میں کسی بے اثر یا کم اثر گروہ کے آدمی کو خلیفہ بنا دینے سے پیش آ سکتے تھے۔

فقہاء اسلام نے اگر حضور کے اس حکم کو مستقل دستوری قانون کے معنی میں لیا تو یہ بھی بے وجہ نہ تھا حضور کے بعد صدیوں تک قریش کی وہی پوزیشن برقرار رہی جس کی بنا پر آپ نے ابتداءً یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵) تنقید کی جسارت کر ڈالی اور لوگوں نے اسے جائز قرار دیدیا۔ حالانکہ ہم سمجھتے ہیں یہ کوئی بدمزہ ہونے کی بات نہ تھی، خصوصاً جب کہ تنقید نگار نے اپنی اس حیثیت کا اعتراف خود ہی "طالبعلمانہ حیثیت" کے الفاظ سے کر لیا تھا۔ خیر طفل مکتب ہونا ہی اگر کوئی جرم ہے تو ظاہر ہے کہ اسکی تلافی مجرم کے بس میں نہیں۔

حکم دیا تھا۔ اس لیے قرناً بعد قرنٍ فقہاء اس بات کو کہ "خلیفہ قریشی ہونا چاہیے" ایک دستوری قاعدے کے طور پر بیان کرتے چلے گئے۔ لیکن حضورؐ کے وہ ارشادات اُس زمانے میں بھی کسی سے پوشیدہ نہ تھے جن سے یہ ایما نکلتا تھا کہ یہ حکم قریش کے ایک خاص نسل سے ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ چند اوصاف کی بنا پر ہے جو ان میں پائے جاتے تھے اور اس وقت تک کے لیے ہے جب تک ان میں اس منصب کی اہلیت باقی رہے۔ مثلاً آپ کا یہ ارشاد کہ ما اقاموا الدین (جب تک وہ دین قائم کرتے رہیں) اور ما اذا حکموا فعدلوا وعدوا فوفوا واسترحموا (جب تک وہ اپنے فیصلوں میں عدل کرتے رہیں اور اپنے وعدے وفا کرتے رہیں اور خلقِ خدا پر رحم کرتے رہیں) یہ ارشادات خود ظاہر کر رہے تھے کہ خلیفہ کے لیے قریشی ہونے کی شرط ایک دائمی دستوری قاعدہ نہیں ہے۔ اسی بات کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سقیفۂ بنی ساعدہ میں واضح فرمایا تھا کہ ان ھذا الامر فی قریش ما اطاعوا اللہ واستقاموا علی امرہٖ (یہ حکومت قریش ہی میں رہے گی جب تک وہ اللہ کی اطاعت کرتے رہیں اور اس کے حکم پر ٹھیک ٹھیک چلتے رہیں)۔ مزید براں حضرت عمرؓ نے اپنے اس قول سے کہ "اگر میری موت کے وقت ابوعبیدہ زندہ نہ ہوں تو میں معاذ بن جبل کو خلیفہ بناؤں گا" یہ بات کھول دی تھی کہ خلافت محض نسل و نسب کی بنا پر قریش کا کوئی مستقل قانونی حق نہیں ہے۔

(ترجمان دسمبر ۱۹۵۸ء)

---

۵۱ "الائمۃ من قریش" کی بحث کے سلسلہ میں یہ جو کچھ ارشاد ہوا ہے، اس پر دو باتیں قابلِ گزارش ہیں۔

۱۔ یہ کہ اصل بحث یہ نہیں تھی کہ اس حدیث کا مفہوم کیا ہے، بلکہ اصل بحث یہ تھی کہ اس سے دین کے اصولوں میں استثناء کا جواز ثابت ہوتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو ہمارے مضمون کی پہلی قسط۔ اس میں ہم نے حدیث کے مفہوم کی بحث چھیڑتے ہوئے صراحۃً یہ بات کہی تھی کہ یہ بحث ایک زائد بحث ہے، اصل مسئلہ کے سلسلہ میں اسکی کوئی حاجت نہیں ہے، کیونکہ اسکو حکم اور ہدایت ماننے کی صورت میں بھی مولانا کا مدعا اس سے ثابت نہیں ہوتا یعنی یہ کسی استثناء کی مثال بہرحال نہیں بنتی ـــــ اس مختصر حوالہ کے بعد یہ عرض ہے کہ جناب مانا کہ یہ ارشادِ نبوی بمعنی الامر ہی ہے۔ اور ہمارا یہ خیال غلط ہے کہ یہ بمعنی الخبر ہے۔

مگر اس سے اصل مسئلہ میں ہماری تنقید پر کیا اثر پڑا؟ جب کہ ہم پہلے ہی علیٰ سبیل التنزل اس کو مان کر دیکھ چکے ہیں ـــــ پس محض اس کو امر ثابت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں جب تک کہ استثنا بھی ثابت نہ کیا جائے ـــــ اسکی استثنائیت کے دعوے پر ہماری تنقید مضمون کی قسط اول میں پڑھ لی جائے اور پھر فرمایا جائے کہ اسکے بارے میں کیا ارشاد ہے! جب اس بحث کا تصفیہ ہو جائے تب شوق سے حدیث کے مفہوم کی بات کر لی جائے۔ ورنہ ہم اس مناظرانہ حربہ کا شکار ہونے کو تیار نہیں ہیں کہ لوگوں کے ذہن کو اصل بحث سے ہٹا کر ضمنی مباحث میں الجھا دیا جائے۔

۲۔ یہ کہ اگر الفرقان کے مضمون نگار نے الائمۃ من قریش کو خبر کہہ کر گویا ابتک کے تمام علمائے اہلسنت کو "جاہل" بنا دیا ہے، تو اس جرم میں مولانا کو الفرقان کے مضمون نگار پر تقدم حاصل ہے۔ مولانا کی ایک عبارت چراغ راہ کے اسلامی قانون نمبر سے اسی بحث میں' الفرقان' میں نقل کی گئی ہے۔ اس میں انھوں نے خود اس حدیث کے "حکم" ہونے کی صراحۃً نفی کی ہے اور صراحۃً اس کو پیش گوئی بتایا ہے۔ نیز ترجمہ بھی وہی کیا ہے جس پر آج وہ شاہ ولی اللہ کے حوالہ سے رد فرمانے کے انداز میں پوچھ رہے ہیں کہ

"شاہ صاحب اس حدیث کے معنی ائمہ قریش میں سے ہوں گے سمجھ رہے ہیں یا قریش میں سے ہوں؟"

حتیٰ کہ "رسائل مسائل" جس کا مولانا بار بار حوالہ دیتے ہیں اس میں بھی حدیث الائمۃ من قریش کا یہی ترجمہ کیا گیا ہے اور یہی محمل بتایا گیا ہے۔ رسائل و مسائل کے بار بار حوالہ کے بعد یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ مولانا نے اب اس خیال سے رجوع فرما لیا ہے۔ رسائل و مسائل تو اس وقت ہمارے پاس نہیں ہے ورنہ اس کا بھی اقتباس پیش کر دیا جاتا، البتہ چراغ راہ والے مضمون کی عبارت ایک بار پھر ہدیۂ ناظرین ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:-

"وہ احادیث جن میں ارشاد ہوا ہے کہ "ائمہ قریش سے ہوں گے" (یا اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ) تو دراصل ان میں حکم اور قانون نہیں بیان کیا گیا ہے، بلکہ پیش گوئی کی گئی ہے کہ جب تک قریش اس منصب کے اہل رہیں گے۔ خلفاء اور ائمہ انھیں میں سے ہوں گے۔"

(چراغ راہ اسلامی قانون نمبر ۱۰۵)

پس اب پوچھیے مولانا سے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ اور الفرقان کے مضمون نگار سے پہلے خود ان کے پاس

قیامت تک باعثِ مجد و شرف ہے۔

دنیا کی یہ یادگار بہار، صدقہ تھی ایک خاندان کی قربانی کا! ــــــ ابراہیمؑ، اسمٰعیل اور ہاجرہ کی قربانی کا! ــــــ اس بہار کا شباب عرصہ ہوا ختم ہو چکا ہے، بلکہ اب تو اس کے آثار و نشان تک خزاں کی زد میں ہیں۔ خود وہ امت جسے اس قربانی نے پیدا کیا تھا، اقامت صلوٰۃ کی بلندی سے گر چکی ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ کا وصف توحید اور عبدیت کی جس روح سے وابستہ تھا، سرد ہو چکی ہے۔ اور اس سردی کے جو نتائج بڑے پیمانہ پر بعثتِ خاتم الرسل سے پہلے، خود اولادِ ابراہیم میں ابھر آئے تھے، چھوٹے پیمانہ پر کچھ ویسے ہی نتائج اس امت میں رونما ہو چکے ہیں۔ باہر کی دنیا میں پرانے شرک کا بازار بھی گرم ہے۔ اور اس سے زیادہ باعث فساد وہ نیا شرک و کفر ہے جو نو تراشیدہ "بتوں" کے باعث وجود میں آیا ہے' اور پوری دنیا کو، حتیٰ کہ کبھی کی "امت مسلمہ" کو بھی' اپنے حلقہ اثر میں لیتا جا رہا ہو، آخرت کا تو ذکر کیا، اس بے راہ روی کی وجہ سے دنیا ہی میں انسان کی بےچینی اور پریشانی کا جو حال ہے وہ سامنے ہے۔ نتائج کی اس خوفناکی نے اچھے اچھے خدا فراموشوں کو روحانی انقلاب کی باتیں کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ــــــ مگر اس روحانی انقلاب کے لئے ویسی ہی قربانی درکار ہے جس کی طرح ابراہیم اور اُن کے خاندان نے ڈالی تھی۔ اور جس کی ذمہ داری اب مِلّت ابراہیمی کے نام لیواؤں پر عائد ہوتی ہے۔ اس قربانی کا راستہ یقیناً "وادیٔ غیر ذی زرع" سے ہو کر گزرتا ہے اور اس ہری بھری، آرام و آسائش کے وسائل سے پٹی ہوئی دنیا میں رہتے ہوئے ان سب کو تج دینے کا قصد کر لینا ہوگا۔ مگر ابراہیمؑ کی وہ دعا بھی اس راہ کے ہر راہرو کے ساتھ موجود ہے، جو انھوں نے اپنی اولاد کو اس راہ میں ڈال کر کی تھی۔

فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِىٓ اِلَيْهِمْ۔ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ۔ (ابراہیم)	پس کر دے تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل۔ اور مہیا فرما ان کے لیے زمین کی پیداوار شاید کہ یہ شکر کریں۔

اس دعا کے اثر سے مکّہ کی وادیٔ غیر ذی زرع آج تک فیض پا رہی ہو۔ اور گواہی

دے رہی ہے کہ اللہ اپنی راہ میں قربانی کا حوصلہ دکھانے والوں کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔

تصحیح } الفرقان جمادی الاولیٰ ۱۳۷۵ھ کے صفحہ ۴۰ سطر ۱۹ (مضمون آزادی کی کہانی) میں شاہ ولی اللہؒ کا سنِ وفات ۱۱۷۴ھ چھپ گیا ہے۔ صاحبِ مضمون مولانا نسیم احمد صاحب فریدی نے توجہ دلائی ہے کہ یہ غلط ہے ۱۱۷۶ھ ہونا چاہیے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔ (ایڈیٹر)

معذرت اور گزارش } افسوس ہے کہ الفرقان کا یہ شمارہ بعض غیر اختیاری حالات کی بنا پر ۴ دن کی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ جو حضرات انتظار کر کے شکایتی خطوط روانہ کر چکے ہوں عنایت ہوگی اگر وہ رسالہ پہنچنے پر دوسرا خط لکھ دیں۔

(منیجر الفرقان)

ضروری اعلان } جمادی الاولیٰ ۱۳۷۵ھ مطابق دسمبر ۱۹۵۵ء کا شمارہ دفتر میں ختم ہو گیا ہے۔ براہ کرم اب کوئی صاحب اس کے بارے میں خط و کتابت نہ فرمائیں۔

(منیجر الفرقان)

اپنی اس تحریر کا کیا جواب ہو۔

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو!

رسائل و مسائل کے مضمون کے متعلق بھی ہم ناظرین سے اصرار کے ساتھ درخواست کریں گے کہ وہ اُسے پڑھیں اور دیکھیں کہ " اُس سے الفرقان کی تنقید کا وزن گھٹتا ہے یا بڑھتا ہے ؟

خدا کا شکر ہے کہ سلف کے اعتماد کو ختم کرنے کا الزام ہمارے اوپر ایک ایسے مسئلہ میں آیا جس میں مولانا پر بعینہ وہ الزام پہلے آتا ہے۔ اب اگر مولانا تسلیم کرلیں کہ ہاں انھوں نے یہ جرم کیا ہے تب تو اپنی صفائی ہمیں خود ہی کرنا ہوگی ــــ اور ہم انشاء اللہ اسے کرلیں گے ــــ ورنہ جس جوابدہی سے مولانا کی جان بچے گی وہ ہمارے کام آخر کیوں نہ آئے گی؟ ــــ کسے خبر کہ مولانا کی تحریر سے یہ احساس کس بری طرح ٹپک رہا ہو کہ اس حدیث کے مفہوم میں وہ خود بھی الفرقان کے مضمون نگار کے شریکِ خیال ہیں۔ اور کس طرح انھوں نے خود اپنے اس خیال کو دوسرے پر اعتراض کے ساتھ نبھایا ہے۔ کوئی اگر اس صورتِ حال کو سمجھ لے تو بڑی ہی پُرلطف ہے۔ ہم اس پُرتحفظ اندازِ گفتگو کو زیادہ کھولنا نہیں چاہتے بس اتنا ایک اشارہ کردینا چاہتے ہیں کہ مولانا کا یہ پورا بیان پڑھ لیجئے۔ کہیں آپ کو صاف الفاظ میں مولانا کی اپنی طرف سے یہ دعویٰ نہ ملے گا کہ حدیثِ الائمۃ من قریش امر او حکم ہے، بلکہ اس مضمون کے صاف دعوے صرف دوسروں کے نام سے نقل کئے گئے ہیں، باقی اپنی طرف سے ہر جگہ " اس حدیث" کے ساتھ " اس معنیٰ کی دوسری احادیث"، "حضور کے دوسرے ارشادات" کا جوڑ لگا ہوا ہے۔ یا بات کو گول لڑکا دیا گیا ہے۔ بغرض صرف اس حدیث کے بارے میں اظہارِ خیال سے بکمالِ مہارت گریز فرمایا گیا ہے ــــ کیونکہ رسائل و مسائل کے حوالہ کی بات کچھ اسی طرح لیپا پوتی کے ساتھ بن سکتی ہے!

کیا مولانا یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس لیپا پوتی سے ساری دنیا کو بے وقوف بنا لیں گے؟ بیشک ان کا یہ اعتماد صحیح ہے کہ عام طور پر ناظرین کا حافظہ کمزور ہوتا ہے، مگر جس نے صرف یہی دیکھنے کے لیے رسائل و مسائل کا مطالعہ کیا ہو کہ اس میں مولانا نے حدیث " الائمۃ من قریش " کا کیا مطلب اور محل بیان کیا ہے۔ کم از کم اس کا حافظہ تو اس آسانی سے دھوکہ نہیں کھا سکتا! ــــ اگر صرف یہ لکھ دینے سے کہ حدیث الائمۃ من قریش .... امر کے نہیں خبر کے معنی میں وارد ہوئی ہے، یہ لازم آجاتا ہو

کہ علماء اہلسنت نے "قرشیت" کو شرط خلافت قرار دے کر جہالت کا ثبوت دیا ہو تو مولانا یہ فرمائیں کہ پہاں کہ مسائل میں جہاں تک اس حدیث اور اس کے تمام طرق کا تعلق ہے، خود مولانا کی تحریر پر یہ فرد جرم کیوں نہیں عائد ہوتی؟ اور اگر خاص اس حدیث کے بارے میں اس طرح کا خیال رکھتے ہوئے بھی امامت کے مسئلہ میں علماء و فقہائے اُمت کے موقف کی کوئی معقول توجیہ کی جا سکتی ہے، جیسا کہ مولانا نے لیپا پوتی کے انداز میں یہاں (پیش نظر ارشادات میں) کرنے کی کوشش کی ہے، تو الفرقان کے مضمون نگار کے لیے اس توجیہ کا راستہ کیوں بند ہے؟

مولانا کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس بحث میں الفرقان میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ یونہی آنکھیں بند کر کے نہیں لکھ دیا گیا تھا۔ متقدمین و متاخرین کے یہ سارے اقوال جو انھوں نے زیب قرطاس فرمائے ہیں۔ ان سب کو سامنے رکھتے ہوئے اور پورے مالہٗ و ما علیہ کو سمجھتے ہوئے لکھا گیا، جو کچھ لکھا گیا تھا۔ یہ تو خیال تھا کہ مسئلہ کے اطراف و جوانب سے کسی ناواقف کی طرف سے یہ سوال ہو سکتا ہے کہ پھر علماء نے قرشیت کو شرط خلافت میں کیوں شامل کیا؟ مگر یہ خیال ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ خود مولانا جو اس کشش و پیچ سے گزر چکے ہیں، وہی اس ناواقفانہ سوال کو ایک حربہ بنا کر اٹھائیں گے، کہ دیکھو! الفرقان نے سارے متقدمین و متاخرین کو "جاہل" بنا ڈالا، اور بھول جائیں گے کہ اس حربہ کی پہلی زد تو خود ان پر پڑتی ہے، الفرقان کی باری تو بعد میں آئے گی!

ہمیں بہت ہی افسوس ہے کہ مولانا نے ایک علمی تنقید پر یا تو لوگوں کو زبردستی کا یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ یہ دل کا بخار نکالنے کی باتیں ہیں، اور یا پھر اس قسم کے حربوں سے کام لیا، حالانکہ ایک طفل مکتب کی بساط ہی کیا تھی کہ اس کے لیے یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت ہوتی۔

کاپی پریس جا رہی تھی کہ جماعت اسلامی ہند کے سہ روزہ دعوت دہلی کی ۱۳ جنوری کی اشاعت موصول ہوئی، اس اشاعت میں معاصر نے مسٹر محمد علی جناح پر سابق برطانوی وزیر اعظم لارڈ اٹیلی کی حالیہ تنقید اور اس پر پاکستانی پریس کے رد عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے اتفاق سے ایسی بات لکھ دی ہے کہ بیساختہ کہنے کو جی چاہتا ہے

مؤذن مرحبا! بروقت بولا تری آواز مکّے اور مدینے

مولانا اس تحریر میں ہمارے "جرم تنقید" پر جس بے پناہی کے ساتھ برسے ہیں اس کو سامنے رکھئے ــــ اور یہ بھی ملحوظ رکھئے کہ ہماری تنقید کا تعلق مولانا کی ذات سے نہیں افکار سے تھا ــ اور پھر معاصر دعوت کے یہ الفاظ پڑھئے!

"اس وقت پاکستانی اخباروں میں برطانیہ کے سابق وزیر اعظم مسٹر اٹیلی پر کافی لے دے ہو رہی ہے، کیونکہ انھوں نے پاکستان کے بانی قائد اعظم محمد علی جناح پر تنقید کی ہے۔ اس تنقید میں انھوں نے مسٹر جناح کی ایک پارسی عورت سے شادی کا تذکرہ کیا نیز یہ کہا کہ آخر عمر میں وہ دکھاوے کے لیے پکے مسلمان بن گئے تھے ورنہ وہ دل سے ایسے نہیں تھے۔

اس تنقید پر پاکستانی پریس اور وہاں کے لیڈر جی کھول کر برسے ہیں۔ اپنی کسی محبوب شخصیت پر نکتہ چینی کے نتیجہ میں ناگواری کا احساس ایک قدرتی سی بات ہو لیکن اہل پاکستان کو اس معاملہ میں ایک اور نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اور وہ یہ ہے کہ ان کے عقیدے کے مطابق نبی اکرم صلعم کے علاوہ کوئی شخصیت بھی تنقید سے بالاتر نہیں، جناح صاحب بہت سی غلطیوں کا مجموعہ ہو سکتے تھے اب اگر فی الواقع ان پر کسی نقاد نے صحیح تنقید کی ہے تو اسے ٹھنڈے دل سے برداشت کرنا چاہیے۔ لیکن اگر کوئی تنقید غلط ہے تو مناسب الفاظ میں اس کی تردید کرنا چاہیے، نہ یہ کہ نقاد کو چھچھورا، اوچھا، غبی، کند ذہن، جاہل اور گھٹیا وغیرہ الفاظ سے یاد کیا جائے جیسا کہ آج کل پاکستانی پریس اور وہاں کے رہنماؤں کا عام لہجہ ہے۔"

تعارف و تبصرہ

عثمانؓ صرف تاریخ کی روشنی میں

از ڈاکٹر طٰہٰ حسین، مترجمہ مولانا عبدالحمید نعمانی۔ ضخامت ۲۴۴ سائز کلاں، کتابت طباعت اور کاغذ بہتر، قیمت ۵/۰
ملنے کا پتہ:۔ مدرسۂ ملت، مالیگاؤں (ضلع ناسک)

خلافت راشدہ میں حضرت عثمان اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا دور نہایت پیچیدہ اور نازک دور ہے مصر کے مشہور نقاد اور ادیب ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس دور کی تاریخی تحقیق و تنقید میں الفتنۃ الکبریٰ کے عنوان سے دو کتابیں عثمان اور علیؓ و بنوہ لکھی ہیں۔ ان میں سے پہلی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ دوسری کتاب کا ترجمہ بھی غالباً مولانا عبدالحمید صاحب نعمانی مکمل کر چکے ہیں۔ مگر اس کی اشاعت ابھی تک نہیں ہوئی ہو۔ شاید جلد ہی وہ بھی کتاب کی شکل میں آجائے گا۔ ویسے ماہنامہ برہان دہلی میں اس کے کچھ حصّے کی بالاقساط اشاعت ہو رہی ہے۔

ترجمہ کی حیثیت سے یہ ایک اچھا ترجمہ ہے اور مولانا عبدالحمید صاحب [illegible] نظر سے اردو داں طبقہ کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ کہ ان کی محنت و کاوش سے ایک مصری فاضل کی کتاب اردو میں آگئی، مگر دینی نقطۂ نظر سے ہم ان کی اس کاوش کو سراہنے سے خود کو معذور پا رہے ہیں۔ اس لیے کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے حضرت عثمانؓ اور اس دور کے دوسرے کرداروں کی تصویر کشی میں صرف تاریخی روایات پر اعتماد کیا ہو۔ حالانکہ صحابۂ کرام کے بارے میں یہ انداز نظر اصولاً غلط ہے، صحابہؓ کی سیرت و صورت کے اصل خط و خال وہ ہیں جو ہمیں قرآن و حدیث میں نظر آتے ہیں، ان کو نظر میں رکھ کر ہمیں وہ تصویر دیکھنی چاہیے۔ جو تاریخی روایات سے بنتی ہے۔ اور پھر جہاں کہیں یہ تصویر ان خطوط و خال سے مختلف نظر آئے وہاں تاریخی روایات کی تنقید کی جانی چاہیے۔ قرآن و حدیث کے نصوص سے بے نیاز ہو کر صحابۂ کرام کو "صرف

"تاریخ" کی روشنی میں دیکھنا ایک غلط کام ہے جس میں آدمی خود بھی گمراہ ہو سکتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں متعدد مقامات ایسے آتے ہیں جہاں لکھنے والا، ایک معنیٰ میں صاف "ضَلَّ فَاَضَلَّ" کا مصداق نظر آتا ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ ضرورت کے احساس کے باوجود ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اس کتاب پر کوئی تفصیلی تبصرہ کریں اور اُن مقامات کی نشاندہی کریں جہاں مصنف نے "تاریخ کی روشنی" میں ٹھوکر کھائی ہے۔ لیکن یہ اہلِ علم پر ایک فرض ہے جسے جلد سے جلد ادا ہونا چاہیے، ہم نے اس کتاب پر تبصرہ کرنے میں اسی خیال سے بہت دیر لگائی کہ فرصت میسر آجائے تو مفصل تبصرہ کیا جائے، مگر اس کے لیے جتنی فرصت درکار تھی وہ آج تک میسر نہ آسکی، اس میں کچھ دخل اس بات کا بھی ہے کہ مصنف نے صرف شروع میں تاریخی ماخذ کی فہرست دے دی ہے، اس کے بعد کسی روایت پر حوالہ نہیں دیا کہ کہاں سے ماخوذ ہے، ورنہ کام قدرے آسان ہو جاتا ـــــ بہر حال اب تبصرہ نہ سہی تو کچھ تعارف ہی اس کتاب کا حاصل کر لینا چاہیے۔ اس لیے کہ نام سے اس کے اندر کا صحیح اندازہ نہیں ہو پاتا، نام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت عثمانؓ کی سیرت ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے، یہ دراصل اس فتنے کا تذکرہ اور اس کے دور و نزدیک کے اسباب و عوامل سے ایک بحث ہے جو حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت اور آپ کی شہادت کی صورت میں رونما ہوا۔

(۱) حیات وحید الزماں

از مولانا محمد عبد الحلیم چشتی، صفحات ۱۹۵، سائز کلاں (۲۰×۲۶)، کتابت، طباعت اور کاغذ بہتر ـــــ قیمت ۴/- روپے

(۲) کتاب التوحید مترجم اردو

تالیف شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی، ترجمہ مولانا ابو عبد اللہ محمد بن یوسف السورتی، ضخامت ۱۴۴، مجلد قیمت ۳/- روپے

(دونوں کتابوں کے ملنے کا پتہ ـــــ نور محمد کارخانۂ تجارت کتب، آرام باغ کراچی)

(۱) مولانا وحید الزماں وقار نواز جنگ مرحوم (متوفی ۱۳۳۸ھ) مشہور مترجم حدیث اور مصنف گزرے ہیں۔ صحاح ستہ کے اردو ترجمے اور وحید اللغات کے نام سے حدیث کی ایک مبسوط لغت اُن کا اہم کارنامہ ہے۔ تذکرۃ الوحید کے نام سے انھوں نے خود بھی اپنی زندگی کے حالات لکھے تھے، اب مولانا عبد الحلیم صاحب چشتی نے اُن کے سوانح حیات، اوصاف اور علمی و عملی کارناموں کا یہ تذکرہ تیار کیا ہے،

جو بظاہر کافی محنت اور دیدہ ریزی سے لکھا گیا ہے، افسوس ہے کہ مولانا آخر میں کچھ شیعیت سے متأثر ہو گئے تھے اور اس قسم کے خیالات رکھنے لگے تھے۔

"ایک سچے مسلمان کا جس میں ذرہ برابر بھی پیغمبر صاحب کی محبت ہو، دل یہ گوارا کرے گا کہ وہ معاویہ کی توصیف و تعریف کرے" الخ (ص۱۰)

اسی طرح تفضیلیت بھی ان کے کلام میں صاف طور سے ملتی ہے (ص۱۰۳ تا ص۱۰۶)۔ اس بنا پر تذکرہ نگار کو اُن کے خیالات پر نرمی کے ساتھ تنقید بھی کرنا پڑی ہے۔

---

(۲) شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور اُن کی کتاب "کتاب التوحید" کافی مشہور اور "بدنام" ہیں۔ انھیں کی طرف نسبت کرکے ہندوستان کے اہلِ حق کو مدتوں سے "وہابی" کہا جاتا رہا ہے۔ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی "تقویۃ الایمان" کو کتاب التوحید ہی کا دوسرا اڈیشن بتایا جاتا ہے۔ جو سراسر ایک افسانہ ہے۔ بہرحال یہی کتاب التوحید ہے جو اردو ترجمہ کے ساتھ نور محمد کارخانۂ تجارت کتب نے شائع کی ہے۔ شروع میں مترجم کے قلم سے شیخ کا مختصر تذکرہ بھی ہے۔

ترجمہ ٹھیٹ اور خالص لفظی قسم کا ہے (بلکہ بعض جگہ تو ناقص ہے) جبکہ کتاب ایسے مختصر اور مجمل متن کے انداز کی ہے کہ اس کی تفہیم کے لیے نہ صرف بامحاورہ ترجمہ کی بلکہ قدرے تشریح کی بھی ضرورت ہے۔ موجودہ صورت میں کتاب مترجم ہونے کے باوجود محض اردو خواں لوگوں کے پلے بہت کم پڑے گا۔ ایک دوسری بات یہ ہے کہ شیخ ابن عبدالوہاب کے غلو اور بے اعتدالی کی جیسی شہرت ہے مترجم اُن سے بھی کئی ہاتھ آگے معلوم ہوتے ہیں۔ شیخ نے حدیث "لا یؤمن احدکم حتیٰ اکون احبّ الیہ" الخ سے فائدہ اخذ کیا ہے کہ "نفی الایمان لا یدل علی الخروج من الاسلام" (یعنی ایمان کی نفی ہر جگہ خروج عن الاسلام پر دلالت نہیں کرتی) اس پر مترجم نے حاشیہ میں استدراک فرماتے ہوئے لکھا ہے — "جو شخص اللہ و رسول کی محبت میں ڈوبا ہوا نہ ہو، وہ قطعاً مسلمان نہیں ہے۔ یہ ایمان و اسلام سے خارج محض نام کا مسلمان ہے"۔ (ص۹۹) —— اسی طرح ابتداءِ کتاب میں شیخ کا جو مختصر تذکرہ مترجم نے لکھا ہے اس میں بھی شیخ کا دفاع کرتے ہوئے اس طرح کے عدم توازن کا ثبوت دیا گیا ہے، شیخ کے مخالفین و معاندین کو بے دھڑک "وقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ" کے حکم میں داخل کر دیا گیا ہے۔ (ص۱۹)

اچھا ہوتا اگر کسی پختہ فکر اور معتدل عالم کے حصہ میں اس کتاب کا ترجمہ آیا ہوتا۔

انقلاب روس

از م۔م۔جوہر۔ صفحات ۶۲۸، سائز ۳۰×۲۰/۱۶، کتابت، طباعت اور کاغذ بہتر۔ مجلد قیمت سات روپے۔ ناشر:۔ مکتبۂ برہان، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔

اس کتاب کا پورا نام ہے "انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد" یہ دو حصوں پر مشتمل ہے جو بجائے خود الگ الگ دو کتابیں ہیں۔ اور غالباً مصنف کے ذہن میں ان کی اشاعت الگ الگ دو جلدوں ہی میں تھی جیسا کہ دوسرے حصہ کے شروع میں مصنف کی "گزارش" سے معلوم ہوتا ہے، اگرچہ اس وقت یہ دونوں حصے ہمارے سامنے ایک ہی جلد میں ہیں۔ پہلے حصہ میں روس کے اشتراکی انقلاب کی مفصل تاریخ اور ان حالات و اسباب کا بیان ہے جو انقلابی تحریک کی کامیابی کا ذریعہ بنے۔ دوسرا حصہ ان حالات و واقعات پر مشتمل ہے جو لینن کے انتقال کے بعد اسٹالن کے آخری دور تک روس، اہل روس اور کمیونسٹ پارٹی کو پیش آئے، یعنی اسٹالن اور ٹراٹسکی کی کشمکش، اسٹالن پارٹی کا استبداد، سوویت روس اور مغربی طاقتوں کے معاملات اور دوسری جنگ عظیم وغیرہ کتاب کے دونوں حصے از اول تا آخر نہایت معلومات افزا اور بصیرت افروز ہیں، کم از کم ہمارے مطالعہ میں انقلاب روس اور ما بعد انقلاب سے متعلق اردو میں ایسی ٹھوس کتاب نہیں آئی۔ ہم مصنف کو اردو لٹریچر میں اس وقیع اضافے پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اور ہر اردو خواں صاحب ذوق سے خصوصاً عربی مدارس کے باذوق طلباء و اساتذہ سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔

(۱) میر کی آپ بیتی

مرتبہ نثار احمد صاحب فاروقی، صفحات ۱۹۲
قیمت مجلد ۲/۸

(۲) سلاطین ہند حصۂ دوم

از جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی، صفحات ۳۰۰
کتابت، طباعت اور کاغذ بہتر، مجلد قیمت، ۳/۱۲

(دونوں کتابیں ملنے کا پتہ:۔ ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد دہلی)

(۱) یہ میر تقی میر کی خود نوشت سوانح "ذکر میر" کا اردو ترجمہ ہے، جس میں مصنف نے ایک مقدمہ کے علاوہ کچھ حواشی و تعلیقات کا بھی اضافہ کیا ہے۔ چونکہ "ذکر میر" نظر سے نہیں گزری تھی اس لیے خیال تھا کہ اس میں ان کی زندگی کے شاعرانہ پہلو کا بھی خاصا حصہ ہوگا، مگر دیکھا تو اس کتاب کو اس پہلو سے کوئی تعلق نہ نکلا۔ نصف کتاب میں میر کے اپنے بزرگوں کا درویشانہ تذکرہ ہے جو بقول مترجم

"مسائلِ تصوف" سے بھرا ہوا ہے۔ باقی نصف میں اپنی زندگی کی تلخیوں، اور نشیب و فراز کی سرگذشت، میر کا زمانہ ۱۷۲۲ء تا ۱۸۱۰ء کا ہے۔ یہ زمانہ ہندوستان میں کافی پُر آشوب رہا ہے۔ اس دور کے کافی چشم دید حالات و واقعات بھی اس سرگزشت میں آگئے ہیں۔

کتاب میں عام دلچسپی کی چیز کوئی نہیں ہے، یہ ایک خاص طرح کا تاریخی و ادبی ذوق رکھنے والوں ہی کے کام کی چیز ہے۔

(۲) ندوۃ المصنفین دہلی نے تاریخ ملت کا جو سیٹ تیار کرایا ہے، یہ اس کا گیارھواں حصہ ہے۔ جس میں کشمیر اور گجرات کی مسلم سلطنتوں نیز سلاطین بہمنیہ اور عماد شاہی، قطب شاہی و عادل شاہی خاندانوں کا تذکرہ اختصار کے ساتھ اور شاہانِ مغلیہ کے حالات خاصی تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، مفتی انتظام اللہ صاحب کافی پرانے لکھنے والوں میں سے ہیں مگر نہ معلوم انھوں نے یہ کتاب کن حالات میں لکھی ہے کہ کسی طرح بھی ایک پرانے لکھنے والے کے شایان شان نظر نہیں آتی۔ بیان میں ژولیدگی اور عبارت میں صفحہ صفحہ پر نا پختگی کی مثالیں سامنے آتی ہیں۔ اقتباسات اور اپنے الفاظ کو جگہ جگہ اس طرح غت ربود کیا گیا ہے کہ بس حیرت ہی ہوتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسکولی طلبا کے لیے اس کتاب کی کس طرح سفارش کی جائے۔ جبکہ ان کے لیے نہایت صاف و سلیس عبارت اور دلچسپ اندازِ بیان کی ضرورت ہوتی ہے۔

ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ
ہماری دعوت
لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ
اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے
لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، وہ یہ
اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی
اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔
جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی
زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اس کا
عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔
فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ
تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ
"ادارہ الفرقان"
مسئول
محمد منظور نعمانی
مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

قیمت فی کاپی آٹھ آنے

جلد (۲۶) | بابت ماہ رجب سنہ ۱۳۷۸ھ مطابق فروری سنہ ۱۹۵۹ء | شمارہ (۷)

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہے ——— تو

اس کا مطلب یہ ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہو، براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی، پی ارسال کیا جائے گا، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع زیادہ سے زیادہ ۱۴ تاریخ تک پہونچ جانی چاہیے۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت:۔ رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ کو روانہ کردیا جاتا ہے۔ اگر ۲۵ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔

مقام اشاعت:۔ دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

گمراہیوں کی بہت سی شکلیں اور بہت سی قسمیں ہیں۔ لیکن بڑی خطرناک گمراہی وہ ہوتی ہے جس کو وقت کے برسر اقتدار طبقہ کی حمایت و سرپرستی حاصل ہو اور جس کے فروغ و اشاعت سے اس کو خاص دلچسپی ہو ـــــ ایسی گمراہیاں سیلاب اور آندھی کی رفتار سے بڑھتی اور پھیلتی ہیں۔ اور ان کے خلاف زبانوں کا کھلنا اور قلموں کا چلنا مشکل ہو جاتا ہے ـــــ پھر ان گمراہیوں کا زور اور ان کی طاقت سینکڑوں گنا بڑھ جاتی ہے اگر بدقسمتی سے علماء دین کا کوئی طبقہ خواہ دنیا پرستی اور مداہنت کی راہ سے (جو علماء سوء ہی سے ممکن ہے) یا کسی مزعومہ قومی یا دینی مصلحت کی خاطر، یا رائے کی غلطی اور فکر کی لغزش سے (جو کسی باخدا عالم دین سے بھی ہو سکتی ہے) ایسا رویہ اختیار کرلے جس سے وقت کی اس گمراہی کو مدد ملے یا کم از کم یہ کہ عوام اس کو ہلکی اور معمولی بات سمجھنے لگیں ـــــ

ایسی گمراہیوں کے مقابلہ میں اعلاء کلمۃ الحق اور اُن کے خلاف جدوجہد کی توفیق جن مخلص اور باخدا بندوں کو ملے اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ان کا خاص مقام ہوتا ہے اور وہ اپنے وقت میں نبی کے خاص نائب اور وارث ہوتے ہیں۔

دوسری اور تیسری صدی ہجری میں عقیدہ خلق قرآن کی بدعت ایک ایسی ہی گمراہی تھی، اللہ تعالیٰ نے اپنے جن مخلص بندوں کو اس فتنہ کے مقابلے میں کھڑے ہونے کی توفیق دی، اُن میں حضرت امام احمد بن حنبل کا خاص مقام ہے۔ انھوں نے اس گمراہی کے مقابلہ کے لیے اپنی آبرو، اپنا خون اور اپنی جان تک کو بالکل بے قیمت کردیا اور انھیں کی

قربانی نے اس گمراہی کو دفن کر دیا جو عقلیت اور روشن خیالی کے نام پر عباسی حکومت کی سرپرستی میں تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھی اور جس کی رو میں وقت کے بہت سے بڑے بڑے اہلِ علم بھی بہہ چکے تھے۔ جن کے پاس سب کچھ تھا لیکن امام احمد والی عزیمت اور اللہ کی توفیق نہیں تھی۔

خیر یہ واقعہ تو بہت پرانا یعنی قریباً ۱۱۔۱۲ صدی پہلے کا ہے۔ لیکن اب سے ساڑھے تین ہی صدی پہلے ہمارے اسی ملک ہندوستان میں بھی اسی قسم کا ایک عظیم واقعہ پیش آیا ہے جس کی روشنی ایسے نازک موقعوں پر اور ایسے سخت فتنوں کے وقت میں قیامت تک اس امت کی رہنمائی کرتی رہے گی۔

اکبر نے اپنی سلطنت کے استحکام کے لیے ——— (جس کو ہمارے اس زمانہ میں آسانی سے مسلمان قوم کی مصلحت کا نام بھی دیا جا سکتا ہے) ——— ضروری سمجھا کہ اپنے کو، اپنے ماحول اور نظامِ حکومت کو وہ ایسے سانچے میں ڈھال دے کہ یہاں کے غیر مسلم اس کو اپنے ہی میں کا ایک آدمی اور اس کی حکومت کو "اسلام کی اور مسلمانوں کی حکومت" سے زیادہ "اپنی حکومت" سمجھیں ——— "تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری"

اس مقصد کے لیے اس نے ایسی روش اختیار کی اور اسلام میں کچھ ایسی ترمیمیں کیں جو اسلام اور کفر اور توحید اور شرک کے اس فرق و امتیاز کو ختم کر دینے والی تھیں جس کے ختم ہونے کے بعد اسلام اور توحید ختم ہو کر صرف کفر اور شرک ہی رہ جاتا ہے۔

بدقسمتی سے اس عہد کے بعض علماءِ دنیا اور علماءِ سوء بھی اس اسلام کُش منصوبہ میں اس کے معاون اور مددگار بن گئے ——— بلاشبہ بڑی سخت آزمائش اور بڑا ہی سخت فتنہ تھا کہ طاقت ور اور مدبر مسلمان بادشاہ (واللہ اعلم دانستہ یا نادانستہ) اس ملک میں اسلام کو زندہ درگور کرنے کے لیے اپنے پورے وسائلِ سلطنت کے ساتھ آمادہ ہو گیا اور اپنے اس منصوبہ کو بروئے کار لانے کے لیے جو کچھ وہ کر سکتا تھا اس کے کرنے میں اس نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ وقت بھی اسے کافی ملا ——— لیکن اللہ تعالیٰ نے یہاں بھی اپنے ایک خاص بندہ کو جس کا نام احمد ہی تھا ——— یعنی امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندیؒ کو ——— توفیق بخشی کہ وہ ایمانی عزم و ہمت کے ساتھ اس فتنے کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے اور

اللہ کی خاص مدد سے انھوں نے نہ صرف یہ کہ بیچارے عام مسلمانوں کو اس فتنہ سے بچا لیا بلکہ وہ حکومت کے رخ کو بھی اس حد تک موڑنے میں کامیاب ہو گئے کہ اولاً خود اکبر کے بیٹے اور اس کے جانشین جہانگیر نے اپنے باپ کی پیدا کی ہوئی بہت سی غلطیوں کی اصلاح کی، پھر پوتے شاہجہاں نے اس اصلاحی کام کو اور آگے بڑھایا۔ یہاں تک کہ آخر میں پڑپوتے اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے نہ صرف یہ کہ اس اصلاحی سلسلہ کی تکمیل ہی کی بلکہ حق یہ ہے کہ دین کے لیے وہ کچھ کیا کہ اگر اللہ کے قانون میں گنجائش ہو تو یہ دادا اکبر بھی اس کے صدقہ میں بخشا جائے — یہ سارا اصلاحی کام اور مغلیہ حکومت کے طرز میں یہ حیرت انگیز تبدیلی، مجدد الف ثانیؒ کی خاموش جد و جہد ہی کا ثمرہ تھا۔ عالمگیرؒ آپ کے صاحبزادہ اور جانشین حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ کا حلقہ بگوش تھا۔ اور حضرت خواجہ نے اپنے صاحبزادہ حضرت خواجہ سیف الدین کو خود عالمگیرؒ کی استدعا پر سلوک کی تربیت ہی کے لیے دہلی بھیجدیا تھا۔ اور عالمگیرؒ نے انھیں کی رہنمائی میں نقشبندی سلوک کا ایک نصاب باقاعدہ طے کیا تھا۔ مکتوبات معصومیہ اور رقعات عالمگیری میں بھی اس کے بارہ میں واضح اشارات ہیں۔

آج ہماری اسلامی دنیا کو، اور خاص کران ممالک کو جہاں حکومتی اقتدار بھی مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں ہے ایسے ہی موفق من اللہ ربانی امام اور صاحب قلب و صاحب عزیمت بندۂ مومن کی ضرورت ہے۔

فضلاء دارالعلوم دیوبند سے

ایک ضروری مشورہ

دارالعلوم دیوبند ۱۲۸۳ھ میں قائم ہوا، اس وقت سے اب تک ۶ ہزار سے زائد علماء اس ادارہ سے فارغ ہو کر ملک اور بیرون ملک میں پھیل چکے ہیں۔ ان فضلاء کرام نے اپنے حلقۂ اثر میں شاندار اسلامی خدمات انجام دیں۔ مگر پھر بھی ان حضرات کی خدمات سے ایک بہت بڑا حصہ ملک

بیرون ملک کا آج تک مستفید نہیں ہو سکا۔ یہی وجہ ہو کہ آئے دن مختلف مقامات پر اسلام کے نام پر طرح طرح کے فتنے اٹھتے رہتے ہیں، جن اضلاع کے دیہات یا قصبات میں یہ فتنے سر اٹھاتے ہیں ان اضلاع کے فضلاء کرام کو خبر بھی نہیں ہوتی، مگر دارالعلوم میں اس کی اطلاع پہونچ جاتی ہو، چونکہ اس وقت تک مختلف اضلاع کے فضلاء اور مرکزی دارالعلوم کے درمیان کوئی باضابطہ ربط قائم نہیں ہو اس لیے مرکز ان اضلاع کے فضلاء کو ان فتنوں کی جانب متوجہ بھی نہیں کر سکتا، خود مرکزی دارالعلوم ہی سے ان فتنوں کے استیصال کا انتظام کرنا پڑتا ہو۔ جس میں بسا اوقات تاخیر ہو جاتی ہو، اور افراد کی قلت کی وجہ سے ہر جگہ آدمی پہونچ کر کام بھی نہیں کر پاتے۔

دوسرے یہ کہ ایک ہی ضلع کے تمام فضلاء کرام میں کوئی باہمی ربط نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی دینی و سماجی اصلاح کا کام منظم طریقہ پر نہیں ہوتا، اس لیے ضرورت ہو کہ ایک ضلع کے تمام فضلاء کرام ضلع کی کسی مرکزی جگہ پر جمع ہو کر غور فرمائیں کہ مرکز سے واسطہ رکھ کر اپنے ضلع کے مسلمانوں کی دینی و سماجی اصلاح کرنے کے لیے ایسا کون سا طریقہ اختیار کیا جائے کہ:-

(۱) دیہات و قصبات میں جب بھی کوئی فتنہ اٹھے اس کی اطلاع فوراً ضلع کے مرکزی مقام میں اور اس مرکزی مقام سے دارالعلوم دیوبند میں پہونچ جائے اور اس فتنہ کو اصلاحی طریقہ پر دفع کرنے کے لیے جلد از جلد انتظامات ہو سکیں۔

(۲) علماء کرام اپنے ضلع کے دیہاتوں میں فرصت کے اوقات میں پھر کر عوام کو صحیح اسلامی زندگی سے روشناس کرائیں۔ اور ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے وظائف میں جو غیر اسلامی رسوم داخل ہو گئی ہیں ان کی اصلاح اپنے نمونۂ عمل سے کریں، اور مرکز کو ان خدمات کی اطلاع دیتے رہیں۔

(۳) دارالعلوم کا لٹریچر ضلع کے مرکزی مقام کے ذریعہ سے ضلع کے ہر حصہ میں پہونچ سکے اور لوگ اسے پڑھ کر اس کی روشنی میں اپنی اصلاح کی طرف مائل ہو سکیں۔

(حضرت مولانا) محمد طیب (صاحب)

مہتمم دارالعلوم دیوبند

از دفتر جلسۂ دستار بندی دارالعلوم دیوبند۔

قرآنی دعوت

(مسلسل)

تواضع

قرآن مجید نے جن اخلاق پر خاص طور سے زور دیا ہے اُن میں سے ایک تواضع بھی ہے۔
تواضع تکبر کی ضد ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی دوسروں سے اپنے کو کمتر سمجھے، اس کی روش اللہ کے عاجز بندوں کی سی ہو۔ اور دوسروں کے ساتھ معاملت و برتاؤ نیچا بن کے کرے۔
تواضع کا ظہور رفتار میں بھی ہوتا ہے، گفتار میں بھی، اور کردار میں بھی، حتیٰ کہ نشست برخواست میں بھی۔

سورۂ فرقان میں جہاں اللہ کے خاص مقبول بندوں کے اوصاف و اطوار بیان فرمائے گئے ہیں وہاں ایک صفت ان کی یہ بھی بیان فرمائی گئی ہے کہ وہ فروتنی کی چال چلتے ہیں ــــ ارشاد ہے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (الفرقان ع ۶)	اور رب رحمٰن کے (خاص) بندے تو وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر نیچے بن کر۔

اور سورۂ لقمان میں حضرت لقمان کی زبان سے تواضع کے بارے میں یہ جامع نصیحت نقل فرمائی گئی ہے ــــ انھوں نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ	اور اپنے گال نہ پھلا لوگوں کے لیے (یعنی

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ ۚ إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ۝ (لقمان ع ۲)

اُن کے ساتھ غرور کے ساتھ پیش نہ آ) اور زمین پر اِتراتا ہوا اور اکڑ کے نہ چل، اللہ تعالیٰ کسی متکبر اور مغرور کو پسند نہیں کرتا، اور اپنی رفتار میں اعتدال پیدا کر، اور اپنی آواز نیچی رکھ (یعنی متکبروں کی طرح گرج کر نہ بولا کر) آوازوں میں سب سے بُری گدھوں کی آواز ہے۔

بلاشبہ ان دو آیتوں میں تواضع کا نہایت ہی جامع اور بڑا ہی مؤثر درس ہے۔ فھل من مدکر؟ قرآن مجید میں تواضع کی تاکید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات خاص کو مخاطب بنا کے بھی کی گئی ہے تاکہ سمجھ لیا جائے کہ دنیا میں کسی کو خواہ کتنی ہی بڑائی اور عظمت حاصل ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کے ساتھ تواضع اور فروتنی سے پیش آئے اور ان کے سامنے اپنی بڑائی کا مظاہرہ نہ کرے ——— دنیا میں فضیلت و عظمت کا سب سے اونچا مقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے تاہم قرآن مجید میں آپ کی ذاتِ پاک کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ (حجر ع ۶)

اور اپنے بازو نیچے کرو ایمان والے بندوں کے لیے (یعنی ان کے ساتھ تواضع کا برتاؤ کرو)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (الشعراء ع ۱)

اور جھکا دو اپنے بازو اُن اہل ایمان کے لیے جنھوں نے آپ کی پیروی اختیار کی ہے۔

ان دونوں آیتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تواضع اور فروتنی اُن ہی بندوں کا حق ہے جو صاحب ایمان ہوں۔ ان کے علاوہ جو لوگ ایمان سے محروم اور کفر و شرک کی گندگیوں میں مبتلا ہیں، اگر وہ ہمارے خلاف برسرِ پیکار اور درپے آزار نہیں ہیں تو ان کے ساتھ رواداری اور حسنِ اخلاق اور حسب موقع احسان و ترحم کا معاملہ تو کیا جائے گا (جیسا کہ قرآن مجید میں اس کا حکم دیا گیا ہے) لیکن کفر و شرک کی وجہ سے وہ تواضع کے مستحق نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ تواضع سے پیش آنا غیرتِ ایمانی کے خلاف ہے، اس لیے قرآن مجید میں تواضع کا حکم صرف اہلِ ایمان کے لیے دیا گیا ہے۔

تکبّر اور غرور:۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا تواضع کی ضد تکبّر اور غرور ہے۔ اس لیے تواضع اللہ تعالیٰ کو جس قدر محبوب ہے غرور اور تکبّر اسی قدر مبغوض ہے۔ قرآن مجید میں جا بجا تکبّر اور متکبّرین کی مبغوضیت کا اظہار فرمایا گیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا ہے

لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ○ (النحل ع ۳)

ضروری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کے ظاہر و باطن کو جانتا ہے، یقینی ہے کہ وہ تکبّر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ○ (النساء ع ۶)

یقیناً اللہ تعالیٰ ایسے آدمی کو پسند نہیں کرتا جو متکبر، مغرور اور اپنی بڑائی ظاہر کرنے والا ہو۔

ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے کہ جنّت اُن ہی بندوں کا گھر بنے گی جو دنیا میں بلند و بالا ہونے کے خواہش مند نہ ہوں اور ان کا مزاج تکبّر پسند نہ ہو ——— ارشاد ہے

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ (قصص ع ۶)

رہنے کا وہ آخری گھر (یعنی جنّت) ہم اس کو کر دیں گے اُن بندوں کے لیے جو نہیں چاہتے دنیا میں اونچا بننا اور فساد کرنا۔

اس آیت کے اشارہ سے معلوم ہوا اور تجربہ بھی بتلاتا ہے کہ دنیا کے سارے فساد، بڑائی اور بالاتری کی خواہش ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے تکبّر ہی سارے فساد کی جڑ بنیاد ہے۔

تکبّر کی ایک بڑی نحوست یہ بھی ہے کہ وہ حق و ہدایت کے قبول کرنے سے بھی مانع ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں کتنے ہی پیغمبروں کے تذکرہ میں بتایا گیا ہے کہ ان کی قوموں کے متکبّرین نے صرف غرور و تکبّر ہی کی وجہ سے ان پر ایمان لانے اور ان کا اتباع کرنے سے انکار کیا۔

سورۂ نمل میں فرعون اور اس کی قوم کے بارہ میں تو صراحت سے یہاں تک فرمایا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اُن کے پاس اللہ کی جو نشانیاں لے کر آئے انھیں دیکھ کر ان کے دلوں کو اگرچہ اس کا پورا یقین ہو گیا کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہیں اور اُن کے لانے والے موسیٰ اللہ کے نبی ہیں۔ لیکن اپنی متکبرانہ ذہنیت کی وجہ سے انھوں نے زبان سے پھر بھی انکار کیا اور کفر ہی پر قائم رہے اور انجام کار عذاب الٰہی کا شکار ہوئے۔

وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا	اور انھوں نے اللہ کی ان نشانیوں کا انکار کیا
أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا ۚ	حالانکہ اُن کے دلوں نے اُن کا یقین کر لیا تھا
فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ	(اس دلی یقین کے بعد بھی انھوں نے انکار) صرف
الْمُفْسِدِينَ ۝	ظلم اور غرور و تکبر کی بنا پر کیا، پھر دیکھو کیسا
(النمل ع ۱)	انجام ہوا ان مفسدین کا۔

اور سورۂ والصّٰفّٰت میں جہنمیوں کے ایک طبقہ کا حال بیان کرتے ہوئے اُن کی بدبختی کا خاص سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ۔

إِنَّهُمْ كَانُوا إِذَا قِيلَ لَهُمْ	ان لوگوں کا وطیرہ یہ تھا کہ جب انکو توحید کا پیغام
لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُونَ ۝	دیا جاتا اور صرف ایک خدا کی پرستش کو کہا جاتا
وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُوا	تو وہ ازراہ تکبر ناک بھوں چڑھاتے تھے اور کہتے
آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَجْنُونٍ ۝	تھے کہ کیا ہم ایک دیوانے شاعر کے کہنے سے اپنے دیوتاؤں
(والصّٰفّٰت ع ۲)	کو چھوڑنے والے ہیں۔

اور شیطان کی مردودیت کا بنیادی سبب بھی قرآن مجید نے اس غرور و تکبر ہی کو بتایا ہے ــــ قرآن پاک کا بیان ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اُس کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا تو اُس نے اس حکم کی تعمیل نہیں کی، اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا۔

مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ	کس چیز نے تجھے سجدہ کرنے سے روکا جبکہ
أَمَرْتُكَ	میں نے تجھے حکم دیا تھا؟

اُس نے کہا

"انا خیر منہ" میں اس سے بہتر ہوں اور وہ مجھ سے گھٹیا ہے
(الاعراف ع ۲) (پھر میں اس کو کیوں سجدہ کروں)

بہر حال شیطان کو اس کے اس غرور اور تکبر ہی نے اس سرکشی اور بغاوت پر آمادہ کیا۔

اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ○ (بقرہ ع ۴) اس نے حکم ماننے سے انکار کیا اور غرور اختیار کیا اور ہو گیا کافروں میں سے ○

تکبر عزازیل را خوار کرد بزندانِ لعنت گرفتار کرد

حلم اور درگزر:-

حلم اور درگزر کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی ایذا رسانی اور اشتعال انگیزی کو فراخ حوصلگی' اور عالی ظرفی سے برداشت کر لیا جائے اور انتقام لینے اور سزا دینے کی پوری قدرت رکھنے کے باوجود اس غلط کار اور قصوروار شخص سے کوئی تعرض نہ کیا جائے اور اس کی جہالت اور ناسمجھی کو لائق نظر اندازی سمجھ کر اس کو معاف کر دیا جائے، بلاشبہ اخلاق میں اس کا بڑا بلند مقام ہے۔ اور قرآن مجید نے اس کی بڑی ترغیب دی ہے۔

سورۂ آل عمران میں، ایک جگہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور جنت اور اس کی خاص محبت کے حقدار بندوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ○ (آل عمران ع ۱۴) وہ بندے جو راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں خوش حالی میں بھی اور تنگی میں بھی' اور جو پی جانے والے ہیں غصہ کو اور معاف کر دینے والے ہیں لوگوں کے قصور' اور اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکار بندوں سے محبت کرتا ہے۔

اور سورۂ شوریٰ میں ہر ظلم و زیادتی کا مناسب بدلہ لینے کا قانونی جواز بیان فرمانے کے بعد، برداشت کر لینے اور معاف کر دینے کی ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ اور جو بندے برداشت کر لیں اور معاف

لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔ (شوریٰ ع ۴) — کر دیں تو یہ بڑی عزیمت اور بلند ہمتی کی بات ہے۔

اور اسی سورۃ کے اسی رکوع میں چند آیتیں پہلے آخرت میں اللہ کے خاص انعامات سے سرفراز ہونے والے اہلِ ایمان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ان کا ایک خاص وصف یہ بھی بیان کیا گیا ہے۔

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝ (شوریٰ ع ۴) — اور جب (کسی شرارت اور بد تمیزی پر) ان کو غصہ آتا ہو تو وہ (انتقام نہیں لیتے بلکہ) معاف کر دیتے ہیں۔

اور سورۂ نور میں اپنے قصورواروں کو معاف کر دینے کی ترغیب کس قدر موثر انداز اور کیسے دلنشین پیرایہ میں دی گئی ہے۔ ارشاد ہے

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۗ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (النور ع ۲) — اور ایمان والوں کو چاہیے کہ جس سے ان کے حق میں کوئی زیادتی اور قصور ہو جائے (اس کو) وہ معاف اور نظر انداز کر دیا کریں، کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تمھیں معاف کر دے اور اللہ بخشنے والا اور بہت مہربان ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ جو بندہ یہ چاہے اور اس کی تمنا اور آرزو رکھے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ مہربانی اور بخشش کا معاملہ کریں اُسے چاہیے کہ وہ اپنے قصورواروں کے ساتھ مہربانی کا معاملہ کرے اور ان کو معاف کر دیا کرے، اگر وہ ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے ساتھ مغفرت اور رحمت کا معاملہ فرمائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کی بخشش و رحمت اُس کی عالی شان کے مطابق ہوگی ——— پھر ترغیب کا ایک دوسرا پہلو اس آیت میں یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس طرزِ عمل کا ہم کو حکم دے رہا ہے وہ فرماتا ہے کہ خود میرا بھی وہی طرزِ عمل ہے، میں اپنے گنہگار بندوں کو بخشنے والا اور ان پر رحم کرنے والا ہوں، تم بھی اپنے قصوروار بھائیوں کے قصور معاف کر دیا کرو اور اس طرح میرا صفاتی قرب حاصل کر کے میرے رنگ میں رنگ جاؤ۔

قرآن پر اور قرآن کے نازل فرمانے والے ربِّ رحیم پر ایمان رکھنے والا کون بندہ ہوگا جو اس پیامِ رحمت سے متاثر نہ ہو۔

قریب قریب یہی مضمون سورۂ تغابن میں ان الفاظ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا — اور اگر تم درگزر کیا کرو اور نظر انداز کر دیا

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ (تغابن ع ۲) — کرو اور معافی دے دیا کرو، تو اللہ بھی بہت بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے۔

یہاں تک جو آیتیں درج ہوئیں وہ خطاب عام کے قبیل سے تھیں، اب ایک آیت اعراف کے آخری رکوع کی پڑھیے جس میں خاص طور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا گیا ہے۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ ۝ (اعراف ع ۲۴) — (لوگوں کی بیہودہ باتوں اور جاہلانہ حرکتوں سے) آپ درگزر کرنے اور معاف کردینے کا شیوہ اختیار کیجئے اور نیک کاموں کے لیے کہتے رہیے۔ اور ان جاہلوں ناسمجھوں (کی جاہلانہ باتوں) کا کچھ خیال نہ کیجئے اور کوئی اثر نہ لیجئے!

اور سورۂ قصص میں اللہ کے خاص فضل و انعام کے مستحق اہل ایمان کے اوصاف اخلاق کا بیان کرتے ہوئے ان کی ایک خاص صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے۔

وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِيْنَ ۝ (قصص ع ۶) — اور جب وہ سنتے ہیں (جاہلوں اوباشوں سے) کوئی بیہودہ بات تو اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ بھائی! ہمیں اپنے کیے کا بدلہ لے گا اور تم کو تمہارے کیے کا، بس ہمارا اسلام لو، ہم جاہلوں سے الجھنا نہیں چاہتے۔

اسی طرح سورۂ فرقان میں بھی اللہ کے خاص مقبول بندوں کی یہ صفت بیان کی گئی ہے۔

وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا ۝ (فرقان ع ۶) — اور جب جاہل لوگ اُن سے جہالت کی باتیں کرتے ہیں تو وہ (اُن سے اُلجھتے نہیں بلکہ) کہتے ہیں بس بھائی! ہمارا اسلام!

اگر قرآن مجید کی اس تعلیم و تلقین پر عمل کیا جائے تو دنیا کے کتنے جھگڑے فساد ختم ہو جائیں اور باغ عالم میں امن و سکون اور الفت و محبت کی کیسی بہار آجائے!

ہاں ایک بات یہاں قابل لحاظ ہے، اور وہ یہ کہ حلم و درگزر کی اس قرآنی تعلیم کا تعلق

ذاتی اور نجی معاملات و حقوق سے ہے۔ مثلاً اگر کوئی میری ذات کو دکھ پہونچاتا ہو اور میرا ہی قصوروار
ہے تو میرے لیے بہتر یہی ہے کہ میں اس کو معاف کر دوں۔ قرآن مجید کی تعلیم و ترغیب میرے لیے یہی ہے۔
لیکن اگر کوئی فرد یا گروہ دنیا میں فساد یا گمراہی اور بداخلاقی پھیلاتا ہے یا اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں
کو توڑتا ہے اور اس طرح فضا کو خراب کرتا ہے تو وہ ہرگز اس حلم اور درگزر کا مستحق نہیں ہے۔ اس کے
ساتھ نرمی اور درگزر کا برتاؤ کرنے میں اللہ کی مخلوق کی اور اللہ کے مقرر کیے ہوئے قانون کی حق تلفی
ہوگی، اس لیے اس کے شر و فساد کے انسداد کے لیے مناسب کارروائی کرنی ضروری ہوگی۔ قرآن
میں جہاں جہاں مختلف قسم کے مجرموں اور بدکاروں کے حق میں شدت اور غلظت برتنے کا حکم دیا گیا
ہے وہ ایسے ہی مواقع کے لیے ہے۔ اس فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے!

نیا ارتداد

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ایک عربی مضمون کا ترجمہ)

اسلام کی تاریخ میں ارتداد کے متعدد واقعات پیش آئے ہیں۔ سب سے بڑا اور سخت سانحہ ارتداد عرب قبائل کا ارتداد تھا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے معاً بعد پیش آیا۔ یعنی وہ زبردست باغی تحریک جس کو ابوبکر صدیقؓ نے اپنے بے نظیر عزم و ایمان سے سر اٹھاتے ہی کچل دیا تھا۔ دوسرا بڑا ارتدادی واقعہ نصرانیت اختیار کر لینے کی وبا تھی جو ہسپانیہ سے مسلمانوں کے اخراج کے بعد پھیلی۔ اور بعض ان دوسرے ملکوں میں بھی رونما ہوئی جو مسیحی مغربی طاقتوں کے زیر نگیں تھے۔ اور عیسائی پادری اور مشنری وہاں اس مقصد کے لیے سرگرم عمل تھے۔ ان معتد بہ واقعات کے علاوہ ارتداد کے وہ اکا دکا واقعات بھی ہیں کہ مثلاً ہندوستان میں کسی خفیف العقل اور پست طبیعت فرد نے اسلام کو چھوڑ کر برہمنیت یا آریہ سماجیت اختیار کر لی۔ لیکن ایسے واقعات شاذ و نادر ہی ہوئے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ـــــ اگر بدنصیب ہسپانیہ کے فتنۂ نصرانیت کو ارتداد کہنا صحیح ہے تو اس کو مستثنیٰ کر کے کہا جا سکتا ہے کہ ـــــ مسلمانوں کی تاریخ کسی عام ارتداد سے آشنا نہیں ہوئی ہے۔ جیسا کہ مورخین مذاہب کا اعتراف ہے۔

اور یہ جو واقعات کبھی پیش آئے ان پر ہمیشہ دو اثر مرتب ہوئے (۱) مسلمانوں کی طرف سے سخت ناراضگی اور ناپسندیدگی۔ (۲) اسلامی سوسائٹی سے قطع تعلق۔ یعنی جو کوئی اپنے دین سے منحرف ہوتا تھا وہ مسلمانوں کے سخت غیظ و غضب کا نشانہ بنتا تھا۔ اور اس اسلامی معاشرہ سے خود بخود منقطع ہو جاتا تھا جس میں اسکی بود و باش ہوتی۔ مجرد ارتداد سے اسکے اور اسکے اہل قرابت

کے درمیان تمام رشتے اور تعلقات کٹ جاتے تھے۔ اور ارتداد کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ آدمی گویا ایک دوسرے معاشرے اور ایک دوسری دنیا میں منتقل ہو گیا۔ مرتد کا خاندان اس کا بالکلیہ بائیکاٹ کر دیتا تھا۔ اب نہ رشتہ رہتا تھا نہ نکاح، نہ اخوت نہ وراثت۔ ارتداد کی اگر کوئی لہر کبھی اٹھتی تھی تو اس سے بین الادیانی کشمکش برپا ہوتی اور مسلمانوں میں مقاومت اور اسلام کے دفاع کی روح بیدار ہو جاتی تھی۔ جب اسلامی ملک میں ایسے واقعات پیش آجاتے تھے وہاں کے علماء و داعیان اسلام اور اہل قلم پُرجوش طریقہ سے ان کے خلاف صف آرا ہو جاتے، ان کے اسباب کا کھوج لگاتے اور اسلام کے محاسن و فضائل کو سامنے لاتے تھے۔ اس مسلمان معاشرہ کا حال یہ ہو جاتا جیسے قلق و اضطراب اور غیظ و غضب کی ایک موج آکر سب کو تہ و بالا کر گئی ہو۔ یہ حوادث مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے، اور کیا خواص و کیا عوام سب کے لئے ایک ہی بات اور ایک ہی فکر ہوتی تھی ——— یہ ہوتا تھا اسلامی سوسائٹی پر واقعات ارتداد کا ردِ عمل اور ان کی لازمی خصوصیت! حالانکہ نہ یہ کسی وسیع پیمانہ پر پیش آتے تھے اور نہ زندگی پر ان کے کچھ ایسے اثرات ہی پڑتے۔

لیکن اب کچھ عرصہ سے دنیائے اسلام کو ایک ایسے ارتداد سے سابقہ پیش آیا ہے جس نے اُسکے اِس سرے سے اُس سرے تک آفت مچائی ہے، یہ اپنی شدت و قوت اور وسعت و عمق میں اب تک کی تمام ارتدادی تحریکوں سے بازی لے گیا ہے۔ کوئی ملک نہیں ہے جو اسکی غارتگری سے بچا ہوا ہو۔ بلکہ ملک تو ملک، خاندانوں میں ایسے مشکل ہی سے تھوڑے بہت ہوں گے جو اسکی دستبرد سے محفوظ ہوں۔ یہ وہ ارتداد ہے جو شرقِ اسلامی پر یورپ کی سیاسی اور تہذیبی تاخت کے پیچھے پیچھے آیا ہے۔ یہ سب سے عظیم ارتداد ہے جو عہد رسالت سے لے کر آج تک کی اسلامی تاریخ میں رونما ہوا ہے۔

شریعتِ اسلامی کی اصطلاح میں "ارتداد" کسے کیا معنی ہیں؟ ایک دین کے بدلے دوسرا دین اور ایک عقیدے کے بدلے دوسرا عقیدہ اختیار کرنا! رسول جو تعلیمات لے کر آیا، جو کچھ اس سے تواتراً منقول ہے اور جو کچھ اسلام میں قطعی طور پر ثابت ہے اس سے انکار کرنا!!۔ اور ایک مرتد کیا روپہ اختیار کرتا تھا؟ رسالتِ محمدی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا انکار کرتا تھا اور مسیحیت، یہودیت یا برہمنیت کی طرف منتقل ہو جاتا تھا۔ یا الحاد کی راہ اپناتا اور

وحی و رسالت اور آخرت سے منکر ہوتا تھا۔ یہ ارتداد کے وہ معنیٰ ہیں جن سے پرانی دنیا یا پرانی سوسائٹی واقف تھی۔ ہر وہ شخص جو اپنا دین چھوڑتا تھا، اگر مثال کے طور پر نصرانی بن جاتا تو کلیسا میں داخل ہوتا یا ہیکل میں جاتا۔ یا اگر برہمنیت اختیار کرتا تو بُت خانہ کی راہ لیتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ یہ ارتداد سب پر روشن ہو جاتا تھا اور مرتد دور سے پہچان لیا جاتا تھا۔ اس کی طرف انگلیاں اٹھتی تھیں، اور مسلمان اس شخص سے تمام امیدیں منقطع کر لیتے تھے۔ الحاصل عام طور پر کسی کا ارتداد کوئی راز نہیں ہوا کرتا تھا۔

یورپ نے مشرق میں وہ فلسفے پہنچائے جو دین کی بنیادوں کے انکار پر مبنی تھے جن کی بنیاد اس عالم میں کارفرما (متصرف) قوت کے انکار پر تھی۔ وہ باشعور قوت جو اس دنیا کو عدم سے وجود میں لائی، اور جس کے دستِ تصرف میں کائنات کی زمام کار ہے۔ (الا لہ الخلق والامر۔ خبردار! اسی نے تخلیق کی اور اسی کا حکم چلتا ہو) وہ فلسفے جو عالم غیب، وحی، نبوت، شرائع سماویہ اور روحانی و اخلاقی قدروں کے انکار پر مبنی تھے۔ یہی نقطۂ نظر کے لئے ہوئے تمام فلسفوں کی مشترک بنیاد، جن میں کوئی علم الحیات اور ارتقاء کے مسائل سے بحث کرتا تھا کسی کا تعلق اخلاق سے تھا کسی کا محور علم النفس تھا۔ اور کسی کا موضوعِ بحث سیاست و اقتصاد۔ یہ فلسفے اپنے موضوعات و الوان میں خواہ باہم کتنے ہی مختلف تھے تاہم اس نقطے پر سب ملتے تھے کہ انسان اور کائنات کو محض مادّی نظر سے دیکھیں اور ان دونوں کے ظاہری احوال و افعال کی مادی توجیہ کریں۔

یہ فلسفے مشرقی اسلامی معاشرے پر حملہ آور ہوئے اور اسکے باطن تک گھس گئے۔ یہ فلسفے سب سے بڑا دین تھے جو تاریخ میں اسلام کے بعد پیدا ہوا۔ سب سے بڑا دین اپنی وسعت اشاعت کے لحاظ سے، سب سے گہرا دین اپنی جڑوں کے لحاظ سے اور سب سے طاقتور دین دلوں اور دماغوں کو مسخر کرنے کے لحاظ سے۔ اسلامی ملکوں کا وہ طبقہ جو علم و فہم کے لحاظ سے ممتاز تھا اس دین پر فریفتہ ہو گیا۔ اس نے اسے نہایت خوشگواری کے ساتھ حلق سے اتارا اور اطمینان کے ساتھ ہضم کر لیا۔ وہ اس دین کا ٹھیک اسی طرح پیرو بن گیا جس طرح ایک مسلمان اسلام کا اور ایک مسیحی مسیحیت کا۔ حتیٰ کہ وہ اس پر جان دیتا ہے۔ اسکے شعائر کی عزت کرتا ہو۔ اس کے

رہنماؤں اور داعیوں کی عظمت کا کلمہ پڑھتا ہے، اپنے ادب اور تالیفات میں اس دین کی دعوت دیتا ہے اور جو دین، جو نظام اور جو طرزِ فکر اسکے معارض ہوتا ہے اسکی تحقیر کرتا ہے۔ اس دین کے ہر پیرو سے وہ اخوت کا رشتہ استوار کرتا ہے اور اس طرح یہ تمام افراد ایک امت ایک خاندان اور ایک گروہ بن گیے ہیں۔

یہ نیا دین ـــــ اگرچہ اسکے پیرو اس کو "دین" کا نام دینے سے انکار کرتے ہوں۔ کیا ہے؟ کائنات کو وجود میں لانے والی اس علیم وخبیر ہستی کا انکار جو مالکِ تقدیر بھی ہے اور رہنمائے حیات بھی (الذی خلق، فہدیٰ) حیات بعد الموت، حشر، جنت و دوزخ اور ثواب و عذاب کا انکار، نبوت و رسالت کا انکار۔ شرائعِ سماویہ اور حدودِ شرعیہ کا انکار۔ اور اس حقیقت کا انکار کہ اللہ نے اپنی تمام مخلوق پر اپنے عظیم تر رسول (خاتم الرسلؐ) کی اطاعت فرض کی ہے، اور ہدایت وسعادت کو اسکی پیروی میں منحصر کر دیا ہے اور اس بات کا انکار کہ اسلام وہ آخری اور دائمی پیغام ہے جو دین و دنیا کی تمام سعادتوں کا کفیل ہے اور زندگی کا ایک نظام ہے جو سب سے اعلیٰ اور افضل ہے اور یہی وہ دین ہے جس کے علاوہ کوئی دین اللہ کے یہاں مقبول نہیں اور جس کے بغیر دنیا کی فلاح وسعادت کا کوئی امکان نہیں، اور اس کا انکار کہ دنیا انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے اور انسان اللہ کے لئے۔

آج جس طبقہ کے ہاتھ میں اکثر ممالکِ اسلامیہ کی زمامِ حیات ہے وہ اسی دین کا پیرو ہے۔ اگرچہ یہ سب پختگیٔ ایمان اور سرگرمیٔ عمل میں ایک درجہ کے نہوں۔ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طبقہ میں ایسے افراد بھی ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اسلام کی پیروی کرتے ہیں مگر اس طبقہ کا وہ وصف جو افسوس ہے کہ اس پر غالب ہو گیا ہے اور اس کے اکثر اور مقتدر افراد کا دین یہی مادہ پرستی اور زندگی کا مغربی فلسفہ ہے جو الحاد پر مبنی ہے۔

میں پھر کہتا ہوں کہ یہ وہ ارتداد ہے جس نے عالمِ اسلامی کو اس سرے سے اس سرے تک تاراج کیا ہے، گھر گھر اور خاندان خاندان اس کا حملہ ہوا ہے۔ یونیورسٹیوں، کالجوں، اسکولوں اور اداروں سب پر اس کی یورش ہوئی ہے۔ مشکل ہی سے کوئی ایسا خوش قسمت خاندان ہوگا، جس میں اس دین کا کوئی پیروکار، پرستار اور عقیدت گزار موجود نہ ہو۔ تم جب

ذرا اس سے تنہائی میں باتیں کروگے، کچھ چھیڑوگے اور اندر کی بات اگلواؤگے تو دیکھوگے کہ یا وہ ایمان باللہ سے محروم ہوگا، یا ایمان بالیوم الآخر سے خالی ہوگا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ رکھتا ہوگا یا قرآن کو ایک معجزِ وابدی کتاب اور دستورِ حیات نہ مانتا ہوگا۔ اور ان میں سب سے غنیمت وہ ہوگا جو کہے گا کہ میں اس قسم کے مسائل پر غور نہیں کرتا اور ان کو کوئی بڑی اہمیت نہیں دیتا۔

بلاشبہ یہ ارتداد ہے۔ لیکن اس نے مسلمانوں کی توجہ اپنی طرف نہیں کھینچی، کیوں؟ اسلئے کہ اس ارتداد کا مارا ہوا کلیسا یا ہیکل میں نہیں جاتا۔ اور نہ اپنے ارتداد اور تبدیلیٔ مذہب کا اعلان کرتا ہے۔ نہ معاشرہ اس پر چونکتا ہے کہ احتساب وعتاب کی صورت پیش آئے اور فصل وانقطاع کا معاملہ درپیش ہو۔ پس وہ بدستور اسی سوسائٹی اور معاشرہ میں رہتا ہو اپنے تمام حقوق حاصل کرتا ہے بلکہ معاشرہ پر حاوی ہونے تک کا موقع اس کو مل جاتا ہو۔ یہ عالم اسلامی کا نہایت اہم مسئلہ اور بڑا قابل فکر معاملہ ہے، ارتداد پھیلتا ہو، اسلامی معاشرہ پر حملہ آور ہوتا ہے اور کوئی اس پر چونکتا تک نہیں۔ علماء امت اور رجال دین اس سے کوئی پریشانی اور بےچینی نہیں محسوس کرتے۔ پہلے جب کوئی پیچیدہ مسئلہ پیش آتا تھا تو لوگ اس کو حل کرنے کے لیے حضرت علیؓ کو یاد کیا کرتے تھے۔ ایسے موقع پر ضرب المثل تھی "قضیۃ ولا اباحسن لھا" اس ارتداد کے موقع پر بےساختہ حضرت ابوبکرؓ کی شان عزیمت یاد آتی ہے اور کہنا پڑتا ہے قضیۃ ولا ابابکر لھا۔

لیکن یاد رکھیے یہ مسئلہ جنگ نہیں چاہتا اور نہ اس پر رائے عامہ کو بھڑکانا درست ہے۔ یہ برافروختگی اور سختی سے حل نہیں ہوسکتا، بلکہ سختی الٹا نقصان پہنچائے گی اور فتنہ کو اور بھڑکا دے گی۔ اسلام خفیہ تحقیقاتی عدالتوں سے آشنا نہیں ہے، اور نہ وہ جبر وظلم کا روادار ہے۔ یہ معاملہ عزم وحکمت اور صبر وتحمل چاہتا ہے اور اس سے نپٹنے کے لئے غور وفکر اور گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے۔

یہ نیا دین اسلامی دنیا میں کیونکر پھیل سکا؟ کیسے اسے یہ طاقت ہوسکی کہ مسلمانوں پر عین ان کے گھر کے اندر جاکر حملہ آور ہوسکے؟ اور کیونکر اس کے لئے ممکن ہوا کہ لوگوں کی عقلوں اور طبیعتوں پر اس قدر قوت کے ساتھ مستولی ہوجائے؟ یہ سب سوالات ہیں جو بڑی گہری اور دقیق فکر اور بڑے وسیع مطالعہ کو چاہتے ہیں۔

قصہ یوں ہوا ہے کہ انیسویں صدی عیسوی میں دنیائے اسلام پر تھکاوٹ اور بڑھاپے کے آثار طاری ہونے لگے۔ دعوت وعقیدہ اور علم وعقلیت کے لحاظ سے وہ انتہائی ضعف و انحطاط میں مبتلا ہوگئی ــــ اسلام تو بے شک بڑھاپے کی منزل سے آشنا نہیں ہے۔ اسکی مثال سورج کی سی ہے کہ قدیم ہونے کے باوجود ہر وقت جدید اور ہر دم جوان۔ لیکن یہ مسلمان تھے جو ضعف و پیری کا شکار ہوگئے ــــ نہ علم میں وسعت رہی، نہ فکر میں ندرت، نہ عقل کی عبقریت، نہ دعوت کا جوش و ولولہ اور نہ الاّ ماشاء اللہ، اسلام کو موثر طریقہ پر پیش کرنے کا سلیقہ۔

مزید براں یہ ہوا کہ تعلیمیافتہ نوجوانوں سے ربط نہیں رکھا گیا اور نہ ان کے ذہن کو متأثر کرنے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ مستقبل کا دور انھیں کا تھا۔ اس نوخیز نسل کو اس بات کا قائل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ اسلام ایک سدابہار پیغام اور دین انسانیت ہے۔ قرآن ہی تنہا وہ معجز اور ابدی کتاب جس کے عجائبات کی انتہا نہیں، جس کے ذخائر فکریہ کا اختتام نہیں اور جس کی جدت پر کہنگی کا گزر نہیں۔ رسول اپنی ذات سے ایک زبردست معجزہ، تمام نسلوں کا رسول اور تمام زمانوں کا امام ہے۔ اسلامی شریعت، قانون سازی کا ایک معیاری نمونہ ہے۔ اس میں زندگی کے ساتھ چلنے اور اسکے صحیح مطالبات کا جواب دینے کی پوری صلاحیت ہے۔ ایمان وعقیدہ اور اخلاق و روحانی اقدار ہی وہ بنیادیں ہیں جن پر ایک شریف سوسائٹی اور پاکیزہ تمدن کی عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے۔ نئی تہذیب کے پاس صرف ذرائع و وسائل ہیں، اخلاق وعقائد اور غایات ومقاصد کا سرچشمہ صرف انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات ہیں۔ اور ایک متوازن اور صالح تمدن کا قیام صرف اسی طرح ہوسکتا ہے کہ مقاصد و وسائل صحیح تناسب کے ساتھ جمع ہوں۔

یہ صورت حال اور یہ وقت تھا جب یورپ، اپنے فلسفوں کا لشکر لے کر اسلامی دنیا پر حملہ آور ہوا۔ وہ فلسفے جن کی تدوین اور تراش وخراش بڑے بڑے فلاسفہ اور یگانۂ روزگار شخصیتوں کی

ذہنی کاوشوں کا ثمرہ تھی جنھوں نے ان پر ایسا علمی اور فلسفیانہ رنگ چڑھا یا تھا کہ معلوم ہو یہ فکر انسانی کی معراج ہے۔ مطالعہ وتحقیق اور عقل انسانی کی پرواز اس پر ختم ہے اور غور وفکر کا یہ وہ نچوڑ ہے جس کے بعد کچھ اور سوچا نہیں جاسکتا۔ حالاں کہ ان فلسفوں میں کچھ چیزیں وہ تھیں جو تجربات ومشاہدات پر مبنی تھیں اور وہ صحیح تھیں۔ اور بہت سی چیزیں وہ تھیں جو محض ظن وتخمین اور فرض وتخئیل پر مبنی تھیں، گویا ان میں حق بھی تھا اور باطل بھی، علم بھی تھا اور جہل بھی، مضبوط حقائق بھی تھے اور شاعرانہ تخیلات بھی ——— شاعری' یہ نہ سمجھئے کہ نظم وقافیہ بندی ہی میں منحصر ہے یہ فلسفہ وعلم کے میدان میں بھی ہوتی ہے۔

یہ فلسفے مغربی فاتحین کے جلو میں آئے اور مشرقی عقل وطبیعت نے فاتحین کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت بھی قبول کرلی۔ مشرق کے تعلیم یافتہ طبقہ نے بڑھ کران کو قبول کیا؛ ان لوگوں میں وہ بھی تھے جنھوں نے سمجھ کر قبول کیا تھا، مگر وہ کم تھے، زیادہ تر وہ تھے جو ذرا بھی نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن معتقد اور مؤمن سب، اور سب ایک سحر سے مسحور۔ ان فلسفوں پر ایمان لانا ہی عقل وخرد کا معیار بن گیا، اور اس کو روشن خیالوں کا شعار سمجھا جانے لگا۔

اس طرح یہ الحاد وارتداد اسلامی ماحول اور اسلامی دائروں میں بغیر کسی شورش اور کش مکش کے پھیل گیا۔ نہ باپ اس انقلاب پر چونکے، نہ اساتذہ اور مربیوں کو خبر ہوئی اور نہ غیرت ایمانی رکھنے والوں کو کوئی جنبش ہوئی۔ اسلئے کہ یہ ایک خاموش انقلاب تھا۔ اس الحاد وارتداد کو اختیار کرنے والے کسی کلیسا میں جاکر نہیں کھڑے ہوئے۔ نہ کسی معبد میں داخل ہوئے۔ نہ کسی بت کے آگے انھوں نے ڈنڈوت کی۔ اور نہ کسی استھان پر جاکر قربانی پیش کی۔ اگلے دور میں یہی سب علامات تھیں جن سے کفر وارتداد اور زندقہ کا علم ہوتا تھا۔

اگلے مرتدین اسلامی سوسائٹی کو خیرباد کہہ کر اس سوسائٹی سے منسلک ہوجایا کرتے تھے جس کا دین انھوں نے اختیار کیا ہوتا تھا۔ اور اپنے عقیدے کی تبدیلی کا صراحت اور جرأت کے ساتھ اعلان کردیتے تھے۔ پھر جو کچھ نئے مذہب کی راہ میں انھیں برداشت کرنا پڑتا تھا برداشت کرتے تھے انھیں اس پر اصرار نہیں ہوتا تھا کہ پرانی سوسائٹی میں جو حقوق اور منافع انھیں حاصل تھے ان کو محفوظ رکھنے کے لیے اس سوسائٹی سے چپکے رہیں۔ لیکن آج جو لوگ دین اسلام سے اپنا تعلق منقطع کرتے ہیں وہ

اس پر تیار نہیں ہوتے کہ اسلامی سوسائٹی سے کبھی اپنا رشتہ کاٹ لیں، حالانکہ دنیا بھر میں اسلامی معاشرہ ہی تنہا وہ معاشرہ ہے جس کی تاسیس و ترکیب عقیدے کی بنیاد پر ہوتی ہے، اور مخصوص عقائد کے بغیر اسلامی معاشرہ وجود ہی میں نہیں آتا۔ لیکن یہ نئے مرتدین اصرار کرتے ہیں کہ اس معاشرہ کے نام پر فوائد حاصل کرتے ہوئے اپنی جگہوں پر جمے رہیں اور اسلام کے بخشے ہوئے تمام حقوق سے متمتع ہوتے رہیں۔ یہ ایک نرالی صورت حال ہے جس سے اسلام کی تاریخ کو کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔

اس صورت حال کا ہمیں ہمت و استقلال اور حکمت و دانائی کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔ دنیائے اسلام پر آج ایک دینی، فکری اور تہذیبی ارتداد کی سخت مصیبت آئی ہوئی ہے۔ یہ مصیبت ان تمام لوگوں کے غور و فکر کا موضوع بنی چاہیئے جو اسلام کا درد رکھتے ہیں۔ آج ہر اسلامی ملک کے جدید تعلیمیافتہ طبقہ کا حال یہ ہے کہ اعتقاد و ایمان کا سرشتہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے۔ اخلاقی بندشیں وہ توڑ کر پھینک چکا ہے۔ انداز فکر اس کا سرتا سر مادی ہو چکا ہے اور ریاست میں اس نے لادینیت کا نظریہ اپنا لیا ہے۔ اگر "اکثر" کا لفظ بولتے ہوئے مجھے خوف بھی ہو تو میں یہ ضرور کہوں گا کہ ان میں بہت سے ایسے ہیں جو اسلام پر ایک عقیدے اور ایک نظام کی طرح ایمان نہیں رکھتے۔

اور مسلمان عوام ——— باوجودیکہ ان میں خیر و صلاح کے تمام جوہر موجود ہیں۔ اور وہ اپنی طبیعت سے انسانیت کا صالح ترین گروہ ہیں ——— اس طبقہ کی علمی بالاتری، ذہنی تفوق اور اثر و نفوذ کی بنا پر اسکے ماتحت اور مطیع ہیں۔

اگر یہ صورت حال یونہی چلتی رہی تو یہ الحاد و فساد ان عوام میں بھی گھس کر رہے گا۔ دیہاتوں کے سادہ دل مسلمان بھی اس کی لہروں سے نہ بچ سکیں گے اور کھیت اور کارخانوں کے مزدوروں کا بھی دین و ایمان یہ تلپٹ کر کے چھوڑے گا۔ یہ سب کچھ اسی رفتار اور انداز سے یورپ میں ہو چکا ہے، اور اگر حالات کا رخ اور رفتار یہی رہی، اور اللہ کا ارادہ قاہرہ بیچ میں حائل نہ ہو گیا، تو مشرق میں بھی یہی سب کچھ ہونے جا رہا ہے۔

ہمیں اعتراف کرنا چاہیئے کہ یہ دنیائے اسلام جس کے ہم نے بہت گن گائے ہیں اور اس کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ، خاص طور سے، ایک نئی اسلامی دعوت کا شدید محتاج ہے۔ ہمیں اعتراف کرنا چاہیئے کہ آج جو لوگ دعوتی کام کر رہے ہیں، ان کا یہ نعرہ اور نشانہ کہ "آؤ پھر سے ایمان لاؤ"[1]

[1] "الی الایمان من جدید"

درست ہے۔ مگر محض نعرہ کافی نہیں ہے، عمل سے پہلے ضروری ہو کہ لائحہ عمل کا بہت سنجیدگی سے جائزہ لے لیا جائے۔ اور نہایت پرسکون اور گہری فکر کے ساتھ یہ سوچا جائے کہ یہ تعلیمیافتہ طبقہ جو زندگی کے سارے شعبوں پر قابض ہو اسے کس طرح از سر نو اسلام کی طرف لوٹایا جائے۔ ہم کیسے اس میں ایمان اور اسلام پر اعتماد کی روح پھونک دیں۔ کیسے ہم اس کو مغربی فلسفوں، لادینی نظریوں اور تہذیب حاضر کی غلامی سے آزاد کرائیں؟۔

یہ دعوت ـــ جس کے متعلق میرا یقین ہو کہ اس زمانہ میں سب سے افضل دعوت اور سب سے افضل جہاد ہے ـــ ایسے مردان کار چاہتی ہو جو صرف اسی کے ہو رہیں۔ اپنا علم، اپنی صلاحتیں اور اپنا مال و متاع اس کے لیے وقف کر دیں۔ کسی جاہ و منصب یا عہدہ و حکومت کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھیں۔ کسی کے لیے اُنکے دل میں کینہ و عداوت نہو۔ فائدہ پہنچائیں مگر خود فائدہ نہ اٹھائیں۔ دینے والے ہوں لینے والے نہوں۔ جو طبقہ جس چیز کے لیے مرتا ہو اس کو اسی کے لیے چھوڑ دیں، حرص و ہوس کے میدان میں کسی سے کوئی مزاحمت نہ کریں۔ جتیٰ کہ ان پر کوئی تہمت نہ لگائی جا سکتی ہو، اور شیطان اُنکے خلاف کوئی ہتھیار فراہم کر کے نہ دے سکتا ہو۔ اخلاص اُن کا شعار ہو اور نفس پرستی، خود پسندی اور ہر قسم کی عصبیت سے بالاتر نظر آتے ہوں۔

اس دعوت کا مزاج سیاست اور پارٹی بازی کے مزاج سے قطعاً مختلف ہو۔ اس کے لیے اگر کوئی نمونہ ہو تو وہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائبین کی سیرت میں ہو۔ جیسے کہ حسن بصری، احمد بن حنبل، ابو حامد الغزالی، عبدالقادر جیلانی، عبدالرحمٰن بن الجوزی، ابن تیمیہ اور شیخ احمد مجدد الف ثانیؒ۔

اس فریضہ کی ادائیگی میں ایک دن کی بھی تاخیر کا موقع نہیں ہے۔ دنیائے اسلام کو ارتداد کی بڑی زبردست لہر کا سامنا ہو۔ ایسی لہر جو اس کے عزیز ترین طبقوں اور بہترین حصوں میں پھیل چکی ہے۔ یہ اُس عقیدے، اُس نظام اخلاق اور ان اقدار کے خلاف بغاوت ہو جو دنیائے اسلام کی سب سے برتر متاع ہے۔ اگر یہ دولت ضائع ہوگئی جو رسول کا ترکہ ہو، جسے نسلوں پر نسلیں منتقل کرتی ہوئی لائی ہیں اور جس کی راہ میں اسلام کے جانبازوں نے مصائب کے کتنے ہی پہاڑ اٹھائے ہیں، تو سمجھ لیجیے کہ عالم اسلام بھی گیا۔

نوٹ:۔ اس مضمون کا دوسرا حصہ "دعوۃ جیل یا ۲" ان شاء اللہ اگلے پرچہ میں شائع ہوگا۔ (مدیر)

مجددیت کی حقیقت

(از محمد منظور نعمانی)

[امام ربانی مجدد الف ثانیؒ سے متعلق چند مقالات کا ایک مجموعہ "تذکرۂ مجدد الف ثانیؒ" کے نام سے شائع ہو رہا ہے (جس کا مفصل تعارف ناظرین کرام "الفرقان" کی اس اشاعت میں کہیں ملاحظہ فرمائیں گے۔ اس مجموعہ کے تمام مقالات مجدد نمبر ۱۳۵۷ ہجری سے ماخوذ ہیں، صرف یہ ایک مضمون (جو ذیل میں درج ہو رہا ہے) نیا ہے جو اس مجموعہ ہی کے لئے لکھا گیا ہے ـــ اس کی اشاعت الفرقان میں بھی اس لئے مناسب سمجھی گئی کہ جن حضرات کے پاس الفرقان کا مجدد نمبر ہو ان کو صرف اس مضمون کے لئے یہ مجموعہ خریدنا نہ پڑے]

اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان پر جو گوناگوں احسانات فرمائے ہیں ان میں سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ ان کی ہدایت کے لئے اور اپنے قرب و رضا اور جنت کا ان کو مستحق بنانے کے لئے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری فرمایا، انسانی دنیا کے آغاز سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک یہ سلسلہ اس طرح جاری رہا کہ جب اور جس خطۂ زمین میں انسانوں پر گمراہی کا غلبہ ہوا اور انھیں آسمانی ہدایت کی ضرورت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنا کوئی نبی ان میں بھیج کر ان کی رہنمائی اور دستگیری فرمائی، اس طرح ہزاروں سال یہ سلسلہ جاری رہا، اور انسانوں کی روحانی استعداد فطری طور پر بھی اور انبیاء علیہم السلام کی مسلسل تعلیم و تربیت کے ذریعہ بھی برابر ترقی کرتی رہی، یہاں تک کہ اب سے کوئی چودہ سو برس پہلے جب انسانیت روحانی استعداد کے لحاظ سے گویا بالغ ہو گئی اور دنیا کے مختلف حصوں کے درمیان اسی زمانہ میں روابط اور تعلقات بھی قائم ہونے کی صورتیں پیدا ہو گئیں اور آمد و رفت کے وہ وسائل پیدا ہونے لگے جن کی وجہ سے ایک طرف کے علوم و افکار دوسری طرف منتقل ہونا ممکن ہو گیا اور مختلف حصوں میں بٹی ہوئی دنیا جب اس طرح

ایک دنیا بن گئی تو حکمت الٰہی نے فیصلہ کیا کہ اب ایک ایسی کامل ہدایت اور ایسا مکمل دین پوری انسانی دنیا کو عطا فرمایا جائے جو سب قوموں کے حسب حال ہو اور جس میں آئندہ کبھی کسی ترمیم و تنسیخ کی ضرورت نہ ہو اور ایک ایسے نبی و رسول کے ذریعہ اس ہدایت اور اس دین کو بھیجا جائے جو سب ملکوں اور سب قوموں کا نبی ہو اور پھر اسی نبی پر نبوت کے اس سلسلہ کو ختم کر دیا جائے۔

حکمت خداوندی نے اس فیصلہ کے مطابق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین بنا کر ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا اور ان کے ذریعہ بھیجے ہوئے مقدس صحیفہ قرآن مجید میں ختم نبوت اور تکمیل دین کا اعلان بھی فرما دیا۔

پھر سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جس وسیع اور عالمگیر پیمانہ پر اس دین حق کی تبلیغ و اشاعت ہوئی اور آپ کی دعوت و تعلیم کے نتیجہ میں جو عظیم الشان روحانی اور اخلاقی انقلاب دنیا میں برپا ہوا اور پوری انسانی دنیا کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت و ہدایت کا جیسا دروازہ کھلا اور آپ کا اتباع کر کے دنیا کی مختلف قوموں میں جتنے لوگ حق آگاہ اور خدا رسیدہ بنے اور دنیا میں تہذیبوں اور تمدنوں کے ہزاروں انقلابوں کے باوجود انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی تمام شعبوں میں رہنمائی کے لیے آپ کا لایا ہوا دین تقریباً ڈیڑھ ہزار سال سے آج تک جیسا کافی ثابت ہو رہا ہے ــــ یہ سب باتیں ہر سلیم الفطرت انسان کے لیے ہر حسی معجزہ سے بڑھ کر اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ بیشک ساری انسانی دنیا کے لئے آپ نبی برحق اور خاتم الانبیاء ہیں اور آپ کا لایا ہوا دین کامل و مکمل اور آخری دین ہے۔

پھر جس حکمت خداوندی نے ختم نبوت اور تکمیل دین کا یہ فیصلہ کیا اسی کا فیصلہ یہ بھی تھا کہ دوسرے عام نبیوں کی طرح خاتم انبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عمر طبعی ہی دی جائے گی، چنانچہ بعثت کے ۲۳ سال بعد ۶۳ سال کی عمر میں آپ کو اس دنیا سے اٹھا لیا گیا اور آپ کے بعد قیامت تک کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کے لائے ہوئے دین کی حفاظت کا ذمہ خود لے کر اس کا ایک ظاہری انتظام اس عالم تکوین میں یہ تجویز کیا کہ ہر زمانہ اور ہر دور کی ضرورت کے مطابق ایسے لوگ آپ کی امت میں پیدا ہوتے رہیں جو اس دین کی حفاظت و خدمت ہی کو اپنا وظیفۂ حیات بنائیں۔ چنانچہ ماضی کی تاریخ اور حال کا مشاہدہ گواہ ہے کہ ہر دور میں اس امت میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی رہی ہے جنھوں نے دین کے تعلم و تعلیم اور حفاظت و خدمت ہی کو اپنا خاص شغلہ اور وظیفہ بنایا۔ یہاں تک

کہ آج بھی جبکہ مادہ پرستی اور دنیا طلبی پوری انسانی دنیا پر گویا چھائی ہوئی ہے، امت محمدی میں لاکھوں کی تعداد میں ایسے افراد موجود ہیں جو دین کے تعلم و تعلیم اور اس کی حفاظت و خدمت ہی کے کسی کام کو اپنی زندگی اور اپنی توانائیوں کا مصرف بنائے ہوئے ہیں ـــــ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کے تجویز کئے ہوئے اسی انتظام اور اس کی مشیت کے اسی فیصلہ کا ظہور ہے جس کا ذکر اوپر کی سطروں میں کیا گیا ہے۔

اور چونکہ یہ دین قیامت تک کے لئے اور دنیا کی ساری قوموں کے لئے تھا اور مختلف انقلابات سے اس کو گزرنا اور دنیا کی ساری قوموں اور ملتوں اور ان کی تہذیبوں سے اس کا واسطہ پڑنا تھا اور ہر مزاج و قماش کے لوگوں کو اس میں آنا تھا اس لیے قدرتی طور پر ناگزیر تھا کہ جس طرح پہلے نبیوں کے ذریعہ آئی ہوئی آسمانی تعلیم و ہدایت میں طرح طرح کی تحریفیں اور آمیزشیں ہوئیں اور عقائد و اعمال کی بدعتوں نے ان میں جگہ پائی اسی طرح خدا کی نازل کی ہوئی اس آخری ہدایت و تعلیم میں بھی تحریف و تبدیل کی کوششیں کی جائیں اور فاسد مزاج عناصر اس کو اپنے غلط خیالات اور اپنی نفسانی خواہشات کے مطابق ڈھالنے کے لئے حقائق دینیہ کی غلط تاویلیں کریں اور سادہ لوح عوام ان کے دجل و تلبیس کا شکار ہوں اور اس طرح یہ امت بھی عقائد و اعمال کی بدعات میں مبتلا ہو جائے، اس لئے سلسلۂ نبوت ختم ہو جانے کے بعد اس دین حق کی حفاظت کے لئے ایک خاص انتظام یہ بھی ضروری تھا کہ ہر دور میں کچھ ایسے بندگان خدا پیدا ہوتے رہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین کی خاص فہم و بصیرت عطا ہو جس کی وجہ سے وہ اسلام اور غیر اسلام اور سنت و بدعت کے درمیان امتیاز کی لکیر کھینچ سکیں۔ اور اسی کے ساتھ دین کی حفاظت کا خاص داعیہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دلوں میں ڈالا جائے اور اس راہ میں ایسی عزیمت بھی انکو عطا فرمائی جائے کہ ناموافق سے ناموافق حالات میں بھی وہ اس قسم کے ہر فتنہ کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو جائیں اور دین حق کے چشمۂ صافی میں الحاد و بدعت کی کوئی آمیزش نہ ہونے دیں۔ اور امت کے عقائد یا اعمال میں جب کوئی زیغ یا فساد پیدا ہو یا غفلت اور بے دینی کا غلبہ ہو تو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک وفادار لشکری کی طرح وہ اس کی بیخ کنی کے لئے اپنی پوری طاقت کے ساتھ جد و جہد کریں اور کوئی لالچ اور کوئی خوف ان کے قدم نہ روک سکے ـــــ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت کے لیے اس ضرورت کا بھی تکفل فرمایا اور اس کے آخری رسول حضرت

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف موقعوں پر حکمت الٰہی کے اس فیصلہ کا اعلان فرمایا کہ ـــــــ اللہ تعالیٰ میری امت میں قیامت تک ایسے لوگ پیدا کرتا رہے گا جو دین کی امانت کے حامل و امین اور محافظ ہوں گے، وہ اہل افراط و تفریط کی تحریفات، اہل زیغ و ہویٰ کی تراشی ہوئی بدعات اور حق ناآشنا جاہلوں کی تاویلات سے دین کو محفوظ رکھیں گے اور اس کو اسکی بالکل اصلی شکل میں (جس میں کہ وہ ابتدا میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آیا تھا) امت کے سامنے پیش کرتے رہیں گے اور اس میں نئی روح پھونکتے رہیں گے ـــــــ اسی کام کا اصطلاحی عنوان **تجدید دین** ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے جن بندوں سے یہ کام لے وہی **مجدد دین** ہیں۔

بعض لوگوں کی باتوں سے محسوس ہوتا ہے کہ مجددیت کے بارہ میں ان کا تصور کچھ ایسا ہے کہ گویا وہ نبوت سے چھوٹے درجہ کا کوئی خاص منصب ہے، اور ہر صدی میں اللہ تعالیٰ اپنے کسی ایک خاص بندے کو اس منصب پر فائز کرتا ہے اور اس صدی کے مسلمانوں کی فلاح و سعادت اور دینی و روحانی کمالات کا حصول اس پر موقوف ہوتا ہے کہ وہ اپنی صدی کے اس مجدد کو پہچانیں اور اس کا اتباع کریں۔

اس عاجز کو کافی تلاش اور مطالعہ کے بعد بھی مجددیت کے اس تصور کی کتاب و سنت میں کوئی اصل و بنیاد نہیں مل سکی ـــــــ سنن ابی داؤد اور مستدرک حاکم وغیرہ کی وہ مشہور حدیث جو اس مسئلہ تجدید کی گویا تنہا اساس و بنیاد ہے، اس کا مطلب و مفاد جو اس کے الفاظ سے سمجھا جا سکتا ہے وہ بس اتنا ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ (جو اپنے اعلان و منشور" اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ؀" کے مطابق دین کی حفاظت کا ذمہ لے چکا ہے) ہر دور میں ایسے بندے پیدا کرتا رہے گا جو آمیزشوں اور آلائشوں سے دین کو صاف کرتے اور نکھارتے رہیں گے اور اس کی رگوں میں اپنی جدوجہد سے تازہ خون دوڑاتے رہیں گے ـــــــ حدیث کے الفاظ (جو چند صفحے پہلے بھی درج ہو چکے ہیں[1]) یہ ہیں۔

"اِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا"

اس میں جو مَنْ کا لفظ ہے وہ جس طرح واحد اور فرد کے لیے استعمال ہوتا ہے اسی طرح

[1] یعنی زیر طبع کتاب "تذکرہ مجدد الف ثانیؒ" میں جہاں اس حدیث کی تخریج اور اسکی سندی حیثیت پر مفصل کلام کیا گیا ہے۔ ۱۲

جمع اور جماعت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے بلکہ شارحین حدیث نے خاص اسی حدیث کی شرح میں بھی اسکی تصریح کی ہے (ملاحظہ ہو "مرقاۃ الصعود" از علامہ سیوطیؒ اور "مرقاۃ شرح مشکوٰۃ" از علامہ علی قاری مکیؒ) اسی طرح جن حضرات نے اس حدیث کے لفظ راس کی وجہ سے کسی کے مجدد ہونے کے لئے بطور شرط کے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ اس کا تجدیدی کام صدی کے سر پر (یعنی صدی کے شروع میں یا آخر میں) جاری ہونا چاہیئے، اور صدی سے انھوں نے یہی معروف ہجری صدی مراد لی ہے، (اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے) ان سے یقیناً لغزش ہوئی ہے سنہ ہجری کا یہ نظام تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت سے قائم ہوا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو یہ نظام تھا ہی نہیں اور یہ اصطلاح اس وقت تک وضع ہی نہیں ہوئی تھی، اسلئے اس حدیث کے لفظ "کل مائة سنة" سے ہجری صدی مراد لینا صحیح نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کا مطلب بس "کل قرن" ہوگا اور پھر راس کی قید کو اتفاقی ہی ماننا پڑے گا[۱]۔ اور اس بنا پر حدیث کا مطلب بس یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہر قرن اور ہر دور میں اس امت مسلمہ میں ایسے بندے پیدا کرتا رہے گا جو اس امت کے لئے دین کی تجدید کرتے رہیں گے —— یعنی ماحول اور زمانہ کی آلائشوں اور آمیزشوں سے اسکو صاف کرتے اور نکھارتے رہیں گے اور اسکی رگوں میں تازہ خون دوڑاتے رہیں گے۔

اور اس امت کی تاریخ گواہ ہے کہ ایسے بندے ہر دور میں برابر پیدا ہوتے رہے ہیں، اور دین کی تجدید کا یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا ہے اور ہماری دینی تاریخ ہی اس کی بھی شاہد اور مصدق ہے کہ تجدید کا یہ کام کبھی اور کسی ملک میں ہجری صدی کی ابتدا میں ہوا ہے کبھی اور کہیں

---

[۱] اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ حدیث کے لفظ "کل مائة سنة" سے صدی کا کوئی متعین نظام مراد ہو ہی نہیں سکتا، سنہ ہجری کی اصطلاح تو اس وقت وضع ہی نہیں ہوئی تھی، اس کے علاوہ ولادت نبوی یا بعثت نبوی یا وفات نبوی کے حساب سے صدی کا نظام متعین کرنے کا بھی کوئی قرینہ حدیث میں نہیں ہے اس لیے اسکے سوا کوئی چارہ نہیں کہ حدیث کے لفظ "کل مائة سنة" کا مطلب بس "کل قرن" سمجھا جائے اور ظاہر ہو کہ جب اس لفظ سے صدی کا کوئی متعین نظام مراد نہیں رہا تو پھر "راس" کے لفظ کو قید اتفاقی بلفظ دیگر مقحم ہی ماننا پڑے گا جیسے کہ عربی "بین علیٰ رؤس الاشہاد" میں رؤس کا لفظ مقحم ہے، اور فارسی یا اردو میں "برسر منبر" اور "برسر مجلس" میں سر کا لفظ مقحم ہوتا ہے۔

وسط میں اور کبھی اور کہیں اواخر میں ــــ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے "حجج الکرامہ" میں اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے بعض اہل علم سے نقل کیا ہے کہ

مراد برأس مائۃ بدایت مائۃ نیست بلکہ مقصود بعثت مجدد در ہر مائۃ است خواہ در اول مبعوث باشد یا در وسط یا در آخر وقید رأس اتفاقی است وغرض آنست کہ ہیچ مائۃ از وجود کرام مجدد دین خالی نباشد وجود مجدد دین در ہر مائۃ از اوائل واواسط واواخر مؤید تصحیح این احتمال است۔ (حجج الکرامہ ص ۱۳۴)	"رأس مائۃ" سے مراد خاص صدی کا آغاز نہیں ہے بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر صدی میں مجدد کھڑے کرے گا، خواہ شروع میں خواہ درمیان میں خواہ آخر میں، اور رأس کی قید محض اتفاقی ہے، اور غرض حدیث کی صرف یہ ہے کہ کوئی صدی کسی مجدد کے وجود سے خالی نہ رہے گی، اور ہر صدی کے اوائل اور اواسط اور اواخر میں مجددین کا ہونا اس احتمال کے صحیح ہونے کی تائید کرتا ہے۔

اس حدیث تجدید کی شرح کے سلسلہ میں ایک یہ بات بھی سوچنے اور سمجھنے کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا اصل منشا اور اس سے آپ کا مقصد کیا ہے؟ بعض حضرات کی تحریروں اور ان کے طرز عمل سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس ارشاد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ ہے کہ امت حق و ناحق میں تمیز کرنے کے لئے اور دین [illegible] حاصل کرنے کے لیے اپنی صدی کے مجدد کو تلاش کیا کرے اور پہچانا کرے اور جب کسی کے بارہ میں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اس صدی کا مجدد ہے تو اس کا اتباع کیا کرے، حقیقی فلاح و سعادت بس اسی کے اتباع سے نصیب ہوگی۔

اس ناچیز کے نزدیک ایسا سمجھنا غلط اور بہت غلط ہے، اس صورت میں تو یہ حدیث امت میں سخت اختلاف و تفرق اور فتنہ کی بنیاد بنے گی، ہر طبقہ اپنے علم و اندازہ اور اپنی عقیدتمندی کے لحاظ سے کسی کو مجدد کہے گا اور اصرار کرے گا کہ فلاح و سعادت بس اسی کے اتباع سے وابستہ ہے اور جو لوگ اس کے دامن سے وابستہ نہیں ہیں وہ فلاح و سعادت سے محروم ہیں اور ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے ہمیشہ امت میں نئے نئے اختلافات پیدا ہوتے رہیں گے اور امت ان اختلافات

کی وجہ سے مختلف گروہوں اور فرقوں میں تقسیم ہوتی رہے گی۔ اس لئے اس حدیث کا یہ مقصد و منشا تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔

دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد اس ارشاد سے امت کو یہ اطمینان دلانا ہے کہ یہ دین کبھی محرف نہیں ہو سکے گا اور نہ مرور زمانہ سے یہ بوسیدہ ہوگا اور نہ زمانہ کے انقلابات اس کی حقیقت کو بدل سکیں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ اس کی بقا و حفاظت اور تجدید کا انتظام برابر کرتا رہے گا اور ہر دور اور ہر قرن میں ایسے بندے پیدا ہوتے رہیں گے جو دین پر سے اس گرد و غبار کو برابر جھاڑتے رہیں گے جو زمانہ کی ہواؤں سے اس پر پڑے گا اور اس کی کہنگی دور کرنے کے لیے اس کی رگوں میں تازہ خون اپنی جدوجہد سے دوڑاتے رہیں گے۔ اس تشریح کی بنا پر یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے محکم وعدے "اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْن" کے سلسلہ کے ایک الٰہی انتظام کا بیان ہوگی اور ان دوسری حدیثوں کے ہم معنی ہوگی جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کو دوسرے الفاظ میں اور دوسرے عنوانوں سے بیان فرمایا ہے:۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں "ابواب الاعتصام بالکتاب والسنۃ" کے زیر عنوان اس حدیث کی جو تشریح کی ہے اور اپنے خاص انداز میں اسکے مقصد و منشا اور اسکی حقیقت پر جو روشنی ڈالی ہے اس کا حاصل یہی ہے جو اس عاجز نے عرض کیا۔۔۔ کم از کم اس کی ابتدائی چند سطریں یہاں بھی پڑھ لی جائیں۔ فرماتے ہیں:۔

قولہ صلی اللہ علیہ وسلم "لا تجتمع ھٰذہ الامّۃ علی الضلالۃ" وقولہ صلی اللہ علیہ وسلم "یبعث اللہ لھٰذہ الامّۃ علی رأس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا" وتفسیرہ فی حدیث اٰخر "یحمل ھٰذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین وانتحال المبطلین وتاویل الجاھلین۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "میری یہ امت کبھی گمراہی پر متفق نہ ہوگی" اور آپ کا یہ ارشاد کہ "اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر صدی کے سرے پر ایسے بندے پیدا کرتا رہے گا جو اسکے لئے اسکے دین کو تازہ کرتے اور نکھارتے

رہیں گے"۔۔۔۔۔۔ آپ کے اِن ارشادات کی وضاحت اور تشریح آپ کی اُس حدیث سے ہوتی ہے (جو کتب حدیث میں مروی ہے) کہ میرے لائے ہوئے اُس علم یعنی دین کی امانت کو ہر زمانے کے اچھے اور نیک بندے سنبھالیں گے اور اُس کی خدمت وحفاظت کا حق ادا کرینگے، وہ غلو اور افراط والوں کی تحریفوں سے اور کھوٹے سکّے چلانے والوں کی ملمع کاریوں سے اور جاہلوں کی فاسد تاویلوں سے اس دین کی حفاظت کرینگے"

اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے اپنے خاص حکیمانہ اور عارفانہ انداز میں اس پر روشنی ڈالی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین کی حفاظت وتجدید کے اس نظام اور فیصلہ کا اصل سِرّ اور راز کیا ہو لیکن ہم نے جس مقصد کے لیے شاہ صاحبؒ کا حوالہ دیا تھا وہ انکی اتنی ہی عبارت سے پورا ہو جاتا ہے جو ہم نے اوپر نقل کی ہے۔۔۔۔۔۔ منقولہ عبارت میں جن تین حدیثوں کا ذکر ہے، شاہ صاحبؒ کے نزدیک ان سب کا مقصد ومنشا ایک ہی ہے اور وہ یہی ہے کہ امت مطمئن رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی آپ کا لایا ہوا دین محفوظ رہے گا اور آپ کا روشن کیا ہوا چراغ ہدایت ہمیشہ یوں ہی روشن رہے گا اور اللہ تعالیٰ اس امت ہی میں سے ایسے بندے ہر دور میں کھڑے کرتا رہے گا جو اللہ ورسول کی اس امانت کی حفاظت کرینگے اور اس کو اس کی اصلی شکل میں پیش کرتے رہیں اور اس طرح آپ کی لائی ہوئی ہدایت؛ انسانی نسل کی آپ کے بعد بھی ہمیشہ ہمیشہ رہنمائی کرتی رہے گی اور اللہ کے بندے اس کی روشنی میں سعادت کی راہ پر چلتے رہیں گے۔ اور اس دین کی حقیقت تحریفوں اور تاویلوں کے پردوں میں کبھی اس طرح گم نہ ہوسکے گی جس طرح پہلے نبیوں کے ذریعہ آئی ہوئی ہدایتیں دنیا سے گم ہوگئیں۔

بس یہی ہے اس حدیثِ تجدید کی اور اس مضمون کی سب حدیثوں کی روح اور مراد اور اسی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ اس کارِ تجدید میں ہر دور کے ان سب بندگان خدا کا حصہ ہو جن سے اللہ تعالیٰ نے دین کی اس قسم کی خدمات لیں، اس طرح امت میں مجددین کی تعداد صرف ۱۳۔۔۔۱۴ ہی نہ ہوگی (جن کی تعیین میں اختلافات ہوں اور ہر حلقہ اپنے ہی کسی بزرگ کے مجدد ہونے پر اصرار اور دوسروں سے تکرار کرے) بلکہ اللہ کے ہزاروں وہ بندے جن سے اللہ تعالیٰ

نے دین کی ایسی خدمتیں مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں لی ہیں سب ہی اس کار تجدید میں حصہ دار ہوں گے اور سب ہی مجدد دین میں ہوں گے۔

ہاں! ایسا بیشک ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی زمانہ میں اپنے کسی بندے سے کوئی بہت بڑا تجدیدی کام لیا ہے اور اسکے ذریعہ دین کے بہت سے شعبوں کی تجدید کرائی ہے۔ اور کبھی کسی سے اس سے کم درجہ کا اور دین کے کسی خاص شعبہ میں تجدیدی کام لیا ہے اور یہ فرق ایسا ہے جو نبیوں رسولوں کے کاموں اور ان کے درجوں میں بھی رہا ہے، "تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ" ــــ چنانچہ اس امت کے ابتدائی دور میں اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں سے تجدیدی نوع کی خدمات لیں ان میں خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا کارنامہ بہت ممتاز ہے، اسی طرح اس اخیر دور میں (جس کا آغاز ہزارۂ دوم (الف ثانی) کے آغاز سے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر ایک ہزار سال گزرنے کے بعد سے ہوتا ہے) امام ربانی شیخ احمد سرہندیؒ سے دین کی تجدید وحفاظت اور احیاء شریعت کا جو عظیم کام ہمارے اس ملک ہی میں لیا وہ بھی اسلام کی پوری تاریخ میں ایک خاص امتیازی شان رکھتا ہے اور اسی وجہ سے ان کا لقب **مجدد الف ثانی** ایسا مشہور ہو گیا ہے کہ بہت سے لوگ ان کا نام بھی نہیں جانتے صرف مجدد الف ثانی کے معروف لقب ہی سے ان کو پہچانتے ہیں ــــ

اللہ تعالیٰ ان پر اور اپنے ان سب بندوں پر اپنی خاص رحمتیں نازل فرمائے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر خود مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے آپ کے لائے ہوئے مقدس دین کو تازہ اور اسکے باغ کو سرسبز و شاداب کرنے کے لئے اپنی توانائیاں صرف کیں اور امت کو ان کے فیوض سے استفادہ کی اور ان کی اقتداء و پیروی کی توفیق دے۔

انتخاب

عراق انقلاب کے بعد

(ظفر اسحاق انصاری)

عرب ممالک کی سیاست میں تغیرات کی ایک نئی اور تند و تیز لہر اٹھی ہے جس کی وجہ سے عرب ممالک کی پالیسیوں میں کافی سرعت سے تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ کل اور آج میں اچھا خاصا فرق واقع ہو چکا ہے۔ ابھی حال تک روس سے دوستانہ روابط رکھنے کی بنا پر اس بات کا باور کرنا دشوار تھا کہ جمال عبدالناصر کمیونسٹوں کی سرکوبی کے سلسلہ میں موثر اقدامات کر سکیں گے۔ لیکن اب وہ اپنی تقریروں میں کھل کر کمیونسٹوں کی مخالفت کر رہے ہیں اور ان کی حدود ریاست میں کمیونسٹوں پر سختیوں کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔ مصر اور شام میں کئی سو کمیونسٹوں کو گرفتار کیا جا چکا ہے۔ متعدد کمیونسٹ اشاعتی ادارے اور اخبارات بند کیے جا چکے ہیں اور قاہرہ کے ریڈیو اور اخبارات سے کمیونزم اور کمیونسٹوں کے خلاف پروپیگنڈے کی جنگ شروع کی جا چکی ہے۔

دنیا کے اکثر ممالک میں آئے دن کمیونسٹوں پر سختیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لہٰذا اس قسم کی خبروں کی فی نفسہ بہت زیادہ اہمیت نہیں۔ لیکن عرب ممالک میں اس قسم کے واقعات رونما ہونا بڑی اہمیت رکھتا ہے اس لیے کہ گذشتہ چند سال سے وہاں عرب نیشنلزم اور کمیونزم کی تحریکیں آپس میں شیر و شکر تھیں۔ اب نہ صرف یہ کہ ان کا رشتۂ اتحاد اور دوستی ٹوٹ چکا ہے بلکہ یہ تحریکیں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو چکی ہیں۔ عرب نیشنلزم کا کمیونزم کے بارے میں معاندانہ موقف اختیار کرنا دراصل عراق کے حالیہ واقعات سے سبق آموزی اور کمیونزم کے بارے میں خوش گمانیوں کے طلسم کے ٹوٹ جانے کا نتیجہ ہے۔ عربوں کے بہت سے مسائل میں روس کی تائید مغربی ممالک کا عرب ممالک کے بارے میں اہانت آمیز رویہ، امریکہ کی حد سے بڑھی ہوئی اسرائیل نوازی، ان تمام باتوں نے مل کر روس اور کمیونزم کے لیے

عربوں کے دل میں ایک نرم گوشہ پیدا کر دیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ روس واقعی عربوں کا مخلص دوست اور حق و انصاف کا حامی ہے۔ پوری ملت اسلامیہ عراق کی کمیونسٹ تحریک کی شکرگزار ہے کہ اس نے خود آگے بڑھ کر اس فریب کا پردہ چاک کر دیا۔ اس خطرناک فریب نظر کے دور ہونے کے بعد اب عربوں کے بارے میں اس بات کی توقع کی جا سکتی ہو کہ مستقبل میں وہ زیادہ اعتدال و توازن اور واقعیت پسندی سے کام لیں گے اور سفید سامراج کی لعنت سے چھٹکارا پانے کے بعد سرخ سامراج کی فریب کاریوں کا شکار نہ ہو سکیں گے۔

جولائی ۵۸ء کے انقلاب عراق کے بعد سے اب تک دجلہ و فرات کی سرزمین میں حالات کا ارتقا جس رخ پر ہوا ہے وہ واقعی اس درجہ خطرناک ہے کہ اس پر مسلمانوں کا بالعموم اور عربوں کا بالخصوص چوکنا رہنا اور اپنے رویئے پر نظر ثانی کرنا بجا اور درست ہے۔ جولائی ۵۸ء سے اب تک جو واقعات رونما ہوئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اب عراق میں ایک نیم کمیونسٹ حکومت قائم ہو چکی ہے اور عراق کے وزیر اعظم عبدالکریم قاسم نے کمیونسٹ نہ ہوتے ہوئے بھی کمیونسٹوں کو انقلابی حکومت کے عوامی ستون کی حیثیت دے رکھی ہے۔

انقلاب عراق کے بعد پبلک زندگی کے افق پر دو اہم شخصیتیں نئے انقلاب کے ہیرو کی حیثیت سے ابھریں۔ یہ شخصیتیں عراقی فوج کے دو اہم فوجی افسروں کی تھیں۔ بریگیڈیر عبدالکریم قاسم اور کرنل عبدالسلام عارف۔ انقلاب کی کامیابی میں ان دونوں کا ہاتھ تھا۔ قاسم کا دماغ اور عارف کی جرأت و ہمت دونوں ہی یکساں اہم تھے۔ لہٰذا انقلاب کے بعد تمام تر اقتدار اور قوت کے مالک یہی دونوں افراد تھے۔ ان میں سے عارف ایک متدین، اسلام پسند، نیک، بے لوث عرب اتحاد کا پرجوش علم بردار، اور جمال عبدالناصر کا شیدائی تھا۔ اس انقلاب سے اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ عراقی قوم نوری السعید کے مظالم سے نجات حاصل کر لے اور پھر عراق ناصر کی قیادت میں عرب جمہوریہ میں شامل ہو کر عرب اتحاد کے نصب العین کو روبہ عمل لانے میں اپنا حصہ ادا کر سکے۔

یہ بات بالکل واضح تھی کہ اگر عراق عرب جمہوریہ میں شامل ہو جاتا ہے تو قاسم اور عارف دونوں کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ جائے گی۔ لیکن عارف جیسے بے لوث آدمی کے نزدیک کسی بڑے مقصد کے لیے ذاتی اقتدار کی قربانی کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی۔ لہٰذا انقلاب کے بعد عارف کا اصرار

یہ تھا کہ عراق فوراً عرب جمہوریہ میں مدغم ہو جائے۔ اپنے جوش اور جذبے کی دھن میں عارف یہ بھول گیا کہ سیاست کے کھیل میں ذاتی اقتدار کی ہوس کتنا اہم پارٹ ادا کرتی ہے۔

لیکن اقتدار اور قوت کی شراب کے چند ہی جرعوں نے قاسم کے سوچنے کا ڈھنگ بالکل بدل دیا تھا۔ اسکو بنیادی فکر اپنے اس اقتدار کے تحفظ کی تھی جس سے وہ انقلاب عراق کے بعد ہی لذت آشنا ہوا تھا۔ لہٰذا ابتدا سے ہی اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ عارف کے اس فیصلہ کی مزاحمت کرے گا کہ عراق متحدہ عرب جمہوریہ میں مدغم ہو جائے۔ اس فیصلے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی انقلاب عراق کو تین ماہ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ اچانک دنیا نے یہ خبر سنی کہ عارف کو حکومت کی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا گیا ہے۔ قاسم اور عارف کی اس آویزش نے واقعات کا سارا رخ بدل کر رکھ دیا۔ اور وہ انقلاب جو قومی جذبات اور قومی مقاصد کی خاطر لایا گیا تھا وہ کمیونسٹوں کی تقویت کا باعث بنا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ حالات کے دباؤ سے مجبور ہو کر قاسم کو کمیونسٹوں کا تعاون اور ان کی تائید حاصل کرنی پڑی۔ کمیونسٹوں کے علاوہ اگر کوئی دوسری اہم سیاسی طاقت تھی تو وہ عرب نیشنلسٹوں کی تھی۔ لیکن عرب نیشنلسٹ عارف کو اپنا ہیرو سمجھتے تھے اور اس پر ہی اعتماد کرتے تھے۔ پھر ان کا نصب العین بھی یہی تھا کہ تمام عرب ریاستوں کو مدغم کر کے ایک متحدہ عرب ریاست وجود میں لائی جائے اور ظاہر ہے کہ اس نظریہ کے علمبرداروں کے ساتھ چلنا قاسم کے لیے اسی وقت ممکن تھا جب کہ وہ سیاسی خودکشی پر آمادہ ہوتا۔ بہرکیف قاسم نے جب عارف اور عرب نیشنلسٹوں کی طاقت کو ختم کر دینے کا فیصلہ کیا تو اس وقت کمیونسٹوں کی امداد اور تائید حاصل کرنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ کمیونسٹ خود متعدد اسباب کی بنا پر (جن کا ذکر آگے آئیگا) عرب جمہوریہ میں شمولیت کے مخالف تھے، لہٰذا باہمی تعاون اور دوستی کے لیے ایک اچھی بنیاد فراہم ہو گئی۔ گذشتہ تین ساڑھے تین ماہ کے عرصہ میں دوستی کی پینگیں برابر بڑھتی ہی رہی ہیں۔

انقلاب کے فوراً بعد ہی یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ عراق میں کمیونسٹوں کی طاقت بہت بڑھ چکی ہے اور عراق کی سیاسی زندگی میں کوئی ایسی سیاسی طاقت موجود نہیں جو کمیونسٹ پارٹی کی طرح مضبوط اور منظم ہو۔ نوری السعید کی کمیونزم دشمن پالیسی کے پیش نظر بظاہر یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اس کے دور حکمرانی میں حکومت کی سختیوں کے باوجود بھی یہ تحریک برابر آگے بڑھتی رہی اور اسکی طاقت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ

کمیونسٹوں کا یہ فروغ نوری السعید کی اندھی پالیسی کا نتیجہ تھا۔ کمیونسٹ تحریک..... اپنی پشت پر ایک سو سال سے زیادہ عرصے تک تحت الارض سرگرمیوں کا وسیع تجربہ رکھتی ہے۔ آئین و قانون کا احترام کمیونسٹوں کی لغت میں بے معنی الفاظ ہیں اس لیے کہ پرولتاریہ کے مفاد میں ہر کام جائز ہے لہٰذا کمیونسٹ تحریک کی راہ حکومت نے جو رکاوٹیں پیدا کی تھیں وہ بہت زیادہ موثر ثابت نہ ہو سکیں اس کے برعکس عراق میں جو دوسری فکری، اور سیاسی تحریکیں ابھر کر آج کمیونسٹوں کی راہ میں مزاحم ہو سکتی تھیں ان کو ابھرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس لیے کہ غیر کمیونسٹ عناصر بالعموم آئین اور قانون کے قائل ہوتے ہیں۔ کمیونسٹوں کی سرگرمیوں پر تو زیادہ اثر نہ پڑا لیکن دوسری تحریکوں کی سرگرمیوں پر بریک لگ گیا۔ اس دوران میں اگر عرب نیشنلزم اور اخوان کی تحریکوں کو فروغ پانے کا موقع حاصل ہوتا تو آج عراق میں کمیونسٹ اتنے دلیر نہ ہوتے جتنے کہ آج ہیں۔

بہرکیف، انقلاب کے بعد کمیونسٹوں نے بدلی ہوئی صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی پوری پوری کوشش کی انھوں نے حالات پر غور و فکر کرنے کے بعد اپنا ایک واضح مقصد متعین کر لیا اور پھر بڑی دانشمندی اور ہمت و جرأت کے ساتھ کام میں لگ گئے اور کسی قسم کے تذبذب یا ذہنی انتشار میں مبتلا نہیں ہوئے۔ حالات کا جائزہ لینے کے بعد جو اہم ترین فیصلہ کمیونسٹوں نے کیا تھا وہ یہ تھا کہ عراق کو عرب جمہوریہ میں مدغم ہونے سے روکنا ہے۔ یہ فیصلہ اس لحاظ سے بالکل فطری تھا کہ اگر عراق عرب جمہوریہ میں مدغم ہو جاتا تو یہ بات بہت دشوار تھی کہ وہ اس وسیع خطے میں کمیونسٹ انقلاب لا سکیں۔ عراق کے علاحدہ وجود کے قائم رہنے کی صورت میں البتہ اس بات کا امکان موجود تھا کہ انقلاب کے بعد جو افراتفری اور انار کی پھیل گئی تھی اس سے فائدہ اٹھا کر کمیونسٹ پارٹی انقلاب لا سکے۔ پھر روس سے قریب ہونے کی وجہ سے بھی عالمی کمیونزم کو عراق جیسے ترنوالہ کی ضرورت تھی علاوہ ازیں عرب جمہوریہ میں شمولیت کی پالیسی کی مخالفت کرنے کا ضمنی فائدہ یہ بھی تھا کہ عبدالکریم قاسم سے اتحاد اور تعاون کی ایک اساس فراہم ہو گئی اور کمیونسٹ قاسم کے ذریعہ عارف جیسے اسلام پسند آدمی کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔

ان مقاصد کے لیے کمیونسٹوں نے دو طرفہ کام کیا۔ ایک طرف تو قاسم کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ انھوں نے اس کی خوشامد، چاپلوسی بھی کی اور اسے خوش کرنے کے لیے اور بھی ایسے وسائل استعمال

کئے جو اخلاقی نقطۂ نگاہ سے بے حد مذموم ہیں، کچھ حالات کا دباؤ اور عارف کی اتحادِ عرب کے بارے میں بے صبری اور جلد بازی کا اور کچھ کمیونسٹوں کی ہوشیاریاں، ان سب کا حل ملا کر نتیجہ یہ ہوا کہ قاسم کو کمیونسٹ اپنے شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہو گئے، دوسری طرف عراق کی عوامی زندگی کے ان تمام عناصر میں جن میں کسی طرح بھی عرب جمہوریہ میں شمولیت کی مخالفت کا جذبہ پیدا ہو سکتا تھا..... یہ جذبہ پیدا کیا گیا۔ کردوں کے قومی جذبے کو مشتعل کیا گیا، شیعہ فرقے کے افراد...... کے دل میں یہ وسوسہ ڈالا گیا کہ اگر عراق عرب جمہوریہ میں شامل ہو گیا تو شیعوں کی اہمیت وطاقت ختم ہو کر رہ جائے گی۔ متوسط طبقے کے پڑھے لکھے لوگوں کو یہ کہہ کر بھڑکایا گیا کہ اگر عراق جیسا خوش حال ملک مصر جیسے غریب ملک کے ساتھ متحد ہو گیا تو عراق کے لوگوں کی خوش حالی ختم ہو کر رہ جائے گی۔

یہ تھے وہ اسباب جن کی بنا پر عراق میں عرب نیشنلزم اور کمیونزم کے علمبرداروں کے درمیان لڑائی شروع ہوئی اور اس نزاع کا سمبل قاسم اور عارف کی شخصیتیں بن گئیں۔ ایک طرف کمیونسٹ عوام میں عرب جمہوریہ میں شمولیت کے خلاف پروپگنڈے کی مہم چلانے میں لگ گئے اور دوسری طرف قاسم آہستہ آہستہ عارف کو نکالنے کے لیے سازش کرنے لگا، نتیجہ یہ ہوا کہ اکتوبر کے اوائل میں دنیا نے اچانک یہ سنا کہ انقلاب عراق کے ہیرو عبدالسلام عارف کو تمام عہدوں سے برطرف کر دیا گیا ہے۔ عارف کے سقوط نے عرب نیشنلسٹوں کی ہمتیں اور بھی پست کر دیں، ویسے بھی کمیونسٹوں کی طاقت کا مقابلہ کرنے کے لیے حزب البعث العربی الاشتراکی کافی نہ تھی، اخوان کی طاقت بھی گذشتہ دو تین سال کے اندر کمزور ہو گئی تھی، ایک طرف نوری السعید کی سخت گیریوں کی وجہ سے دوسری طرف قاہرہ ریڈیو کے مخالفانہ پروپگنڈے کی وجہ سے۔ پھر مصر میں جمال عبدالناصر اور اخوان میں جو اختلافات ہیں انکی وجہ سے عرب نیشنلسٹوں اور اخوان کے تعلقات کافی متاثر تھے نتیجہ یہ ہوا کہ شدید کمیونزم دشمنی کے باوجود اخوان اور عرب نیشنلسٹ ساتھ ملکر کوئی متحد محاذ نہ بنا سکے اور عارف کے سقوط کے بعد کمیونسٹوں کی قوت میں اضافہ ہوتا رہا۔ حکومت کے کلیدی مناصب پر وہ آہستہ آہستہ اپنے آدمی پہنچاتے رہے۔ ملک میں ایسی فضا پیدا کرتے رہے کہ کمیونزم کی مخالفت نہ کی جا سکے۔ کمیونزم کے مخالفین کو تشدد کے ہتھیاروں سے اس درجہ خوف زدہ کرنے کی کوشش کی جانے لگی کہ کوئی سرخ سامراج کے خلاف آواز نہ بلند کر سکے۔ اسلام کے خلاف بعض اوقات علانیہ مخالفت کا رویہ اختیار کیا گیا۔ بازاروں میں عربی زبان میں کمیونسٹ لٹریچر کا ایک سیلاب امنڈ پڑا۔ یہاں تک کھلم کھلا الحاد و دہریت کی تبلیغ کرنے والی کتابیں مثلاً این اللہ (اللہ

کہاں ہیں) اللہ فی قفص الا مقام (اللہ مجرموں کے کٹہرے میں) بازاروں میں علی الاعلان فروخت کی گئیں۔ کمیونسٹوں کی منظم طاقت ویسے بھی کافی تھی لیکن ایک فوجی حکومت کے خوف نے کمیونزم کے مخالفین کی ہمتیں اور بھی پست کر دیں ــــــ ان حالات میں ایک منظم سازش کے تحت ۴ر اکتوبر کو عبدالسلام عارف کو گرفتار کیا گیا اور کمیونسٹوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب میدان انھیں کے ہاتھ ہے! عارف کی گرفتاری کے بعد سے ابتک حالات اور زیادہ خراب ہوئے ہیں ــــ قاسم نے اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے کمیونسٹوں کو پہلے سے زیادہ سر چڑھا لیا ہے۔ ایسے تمام عناصر کو جو کمیونزم کی مخالفت کر سکتے تھے کمزور اور بے اثر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ فی الجملہ حالات کا ارتقا جس سمت ہو رہا ہے اگر کوئی مؤثر مزاحمت نہ ہوئی تو عراق مستقبل قریب میں سرخ سامراج کی ہوس ملک گیری کا شکار ہو کر رہ جائے گا اور عرب اتحاد کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

عراق کی صورت حال بحیثیت مجموعی اگرچہ حوصلہ شکن ہے لیکن اس میں بعض امید افزا پہلو بھی ہیں۔ اولی تو عراقی فوج کے افسروں کی عظیم اکثریت کمیونزم کی شدت سے مخالف ہے۔ یہ لوگ اس بات سے پوری طرح واقف ہیں کہ حالات کتنے سنگین ہو چکے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ کب کوئی اقدام کریں گے لیکن یہ بات کوئی اچنبھے کی نہ ہوگی اگر عراق میں ایک دوسرا (فوجی) انقلاب رونما ہو اور کمیونزم کا سر کچل کر رکھ دیا جائے۔

دوسرا امید افزا پہلو یہ ہے کہ عراق میں کمیونزم نے وہ تمام حسین نقابیں ایک ایک کر کے نوچ کر پھینک دی ہیں جن کی وجہ سے اب تک اس کا مکروہ چہرہ چھپا ہوا تھا۔ اسی طرح شام کی کمیونسٹ پارٹی نے مصر اور شام کے اتحاد کے خلاف ایک واضح موقف اختیار کر کے اپنی حقیقت سے آگاہ ہونے کا بڑا قیمتی موقع فراہم کر دیا ہے۔ اب یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ اس سے قبل اگر کمیونسٹ عرب نیشنلزم کی جد و جہد میں دوش بدوش ساتھ تھے تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ جد و جہد ایک ایسے سامراج کے خلاف تھی جس کے خلاف بین الاقوامی کمیونزم جنگ آزما ہے مغربی سامراج کے خلاف عربوں کی جد و جہد میں کمیونسٹوں کے ساتھ دینے سے اگر یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ عرب ممالک کے کمیونسٹ بنیادی طور پر عرب مفاد کے وفادار ہیں تو یہ ایک خام خیالی تھی اور اگر کبھی یہ خام خیالی پیدا بھی ہوئی تھی تو اب کمیونسٹوں نے اس کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دی۔ اس سے قبل جنگ فلسطین کے زمانے میں بھی عرب ممالک کے کمیونسٹوں نے عربوں کا ساتھ نہیں دیا تھا درمحض اسلئے کہ بین الاقوامی کمیونزم اسرائیل کے قیام کا حامی تھا۔ (یہاں تک کہ چیکوسلوکیہ کے اسلحہ کی مدد سے یہ ریاست قائم ہوئی) پھر ۱۹۵۶ء میں

کمیونسٹوں نے اپنی کانفرنس میں بھی یہی فیصلہ کیا کہ وہ اسرائیل کے خلاف عربوں کے قومی عزائم کا ساتھ نہیں دے سکتے[۵۱]
ہر کیف اب عربوں نے بہ چشم سر دیکھ لیا ہو کہ یہ عرب مفاد پر سرخ سامراج کے مفاد کو مقدم رکھتے ہیں۔ عربوں میں اس شعور کا
پیدا ہونا بڑا مبارک ہو اسلیے کہ مغربی سامراج مقدس جہاد آزادی کی بنا پر عالم نزع میں گرفتار ہو۔ لیکن یہی وہ زمانہ ہو
جبکہ سرخ سامراج عرب دنیا میں قدم جمانے کے ناپاک منصوبے سوچ سکتا ہو اسکی وجہ یہ ہو کہ ایک سامراج کیخلاف
جدوجہد کرتے ہوئے ایک مظلوم قوم اسکی حریف سامراجی طاقت سے مدد لینے کی طرف مائل ہوتی ہو اور یہ مدد اسے
بہ آسانی حاصل ہو جاتی ہو۔ اس مدد کی بنا پر لوگوں کے دلمیں عام طور پر یہ خیال پیدا ہونے لگتا ہو کہ وہ طاقت مخلص ہو
انسانیت دوست ہو اور یہی فضا اس سامراج کی توسیع کیلیے سازگار ہوتی ہو۔ جب عربوں نے عثمانی اقتدار سے
گلو خلاصی کی ضرورت محسوس کی[۵۲] تو اسوقت انھوں نے انگریزوں کے اشارے پر اور انکی مدد سے بغاوت کردی۔ اس
بغاوت کے ذریعہ انہیں عثمانی خلافت سے تو یقیناً گلو خلاصی ہوگئی لیکن اسکے بعد اس خانہ خالی پر ایک ایسے دیو کا قبضہ
ہوگیا جو ایک ہمارے سینہ پر مونگ دل رہا ہو۔ عربوں کی اسی غلطی کی بنا پر عربی دنیا کی وحدت پارہ پارہ ہوئی اور
متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستیں وجود میں آئیں۔ اسرائیل جیسی لعنت صفحہ ہستی پر وجود میں آئی اور ایک طویل عرصہ کی
غلامی مسلط رہی۔ اب جبکہ مغربی سامراج خود لب گور ہو تو اسوقت روس اور کمیونزم کے بارے میں خوش گمانی کا
باقی رہنا سخت خطرناک ہو۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ عرب ممالک کو روس سے مدد نہ لینی چاہیے دونوں بین الاقوامی
بلاکوں کی کشمکش سے عرب ممالک کو اگر فائدہ پہونچ سکتا ہو تو اسے ضرور حاصل کرنا چاہیے لیکن اگر فائدہ حاصل
کرنے کے دوران میں عرب اس خام خیالی میں بھی مبتلا ہو جائیں کہ روس ان کی مدد بے لوثی اور اخلاص کی بنا پر
کر رہا ہو تو یہ بات سخت خطرناک ہوگی۔ اسلیے کہ اس خوش گمانی کے بعد پھر عرب روس کی ریشہ دوانیوں سے ہوشیار
نہیں رہ سکتے۔

خدا کا شکر ہو کہ اب عربوں میں ایک نئی بیداری پیدا ہو رہی ہو اور حالات ان کو دھکیل دھکیل کے واقعیت
پسند بنائے دے رہے ہیں ہم عربوں کی اس بیداری کو سلام کرتے ہیں...... اسلیے کہ اسکی بنیاد پر یہ امید اور قوی
ہو جاتی ہو کہ انشاءاللہ ہمارے بھائی جنھوں نے گرانقدر قربانیاں دیکر غلامی کی زنجیریں کاٹ پھینکی ہیں اب
اپنی سادہ لوحی کی بنیاد پر ان زنجیروں سے زیادہ کڑی زنجیریں خود پہننے پر آمادہ نہ ہوں گے (چراغ راہ کراچی)

---

[۵۱] ملاحظہ ہو المسلمون دمشق شمارہ ۵ اکتوبر ۱۹۵۶ء۔
[۵۲] یہاں ہم اس بحث سے اجتناب کرتے ہیں کہ یہ طرز فکر فی نفسہٖ صحت مندانہ تھا یا نہیں اور یہ کہ اس طرز پر سوچ کر
وہ مغربی سامراج کے مقاصد کو پورا کر رہے تھے یا خود اپنے قومی مفاد کی خدمت کر رہے تھے۔

تعارف و تبصرہ

فضائل رمضان مرتبہ مولانا عبدالحلیم قاسمی، ناشر: شعبہ اشاعت و تبلیغ مدرسہ جامعہ حنفیہ، ٹمپل روڈ۔ لاہور، صفحات ۴۶۔ کاغذ اور کتابت بہتر، قیمت ۸ آنے

اس میں رمضان کے احکام و فضائل، روزے کے مقاصد اور اس کی تاریخ اور عید الفطر کے مسائل کا بیان ہے، امید ہے کہ عام مسلمان اس تبلیغی کوشش سے فائدہ اٹھائیں گے۔

آئینہ ترتیل مؤلفہ جناب قاری محمد یوسف صاحب، صفحات ۳۲، قیمت ۶ آنے۔
ملنے کا پتہ:۔ مولانا بکسیلر، بندر، منگلور ۱ (جنوبی ہند)

یہ رسالہ تجوید کے مبتدی طلبار کے لیے لکھا گیا ہے، اور آسان انداز میں ترتیل کے ابتدائی اصول و قواعد سمجھائے گئے ہیں۔

تحریک اخوان المسلمین ترجمہ۔ سید رضوان علی صاحب ندوی، ناشر: مکتبہ الحسنات، رامپور۔ کتابت، طباعت معمولی، تاہم صاف، صفحات ۳۲۵ مجلد۔ قیمت تین روپے۔

گذشتہ چند برسوں میں "اخوان المسلمین" کے نام سے ہند و پاکستان کے باشندے اچھی طرح آشنا ہو چکے ہیں۔ مصر کے محمد شوقی زکی صاحب نے زیر نظر کتاب بطور ایک تحقیقی مقالہ کے قاہرہ یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کرنے کے لیے لکھی تھی، جس کو جناب سید رضوان علی صاحب ندوی نے جو ایک سال مصر میں رہ کر اخوان سے اچھی طرح واقف اور مانوس ہو چکے ہیں، اردو کے قالب میں پیش کر دیا ہے۔

جن لوگوں کو اخوان کے حالات اور کام سے دلچسپی ہو ان کے لیے اردو میں اس سے زیادہ معلومات افزا کتاب اس وقت تک نہیں ہے، اخوان کی بنیاد کس طرح پڑی۔ پھر اس تحریک کا ارتقاء

کس طور پر ہوا۔ ان کی دعوت اور فلسفہ کیا ہے؟ جمال عبدالناصر کے ہاتھوں کچلے جانے سے پہلے ان کا تنظیمی نظام کیا تھا؟ کیا کیا خدمات انھوں نے انجام دیں اور ان کے دائرہ کار کی وسعت کیا تھی؟ ان تمام سوالات پر بہت تفصیل کے ساتھ اس کتاب پر روشنی ڈالی گئی ہے، بلکہ اتنی زیادہ تفصیل ہو کہ کم ہی لوگ کو اتنی ساری تفصیلات سے دلچسپی ہو سکے گی، ترجمہ میں اگر کچھ اختصار کر لیا جاتا تو شاید زیادہ اچھا ہوتا — ترجمہ کے بارے میں بھی ہمارا خیال ہے کہ اگر اور زیادہ مفید اور دلچسپ ہو سکتا ہے۔ موجودہ صورت میں ترجمہ خاصا اچھا ہونے کے باوجود بہت سی جگہ ترجمہ پن آگیا ہے، اور کہیں کہیں بات ایسی گنجلک اور غامض ہو گئی ہے کہ عام قارئین کو سمجھنے میں دقت ہو سکتی ہے۔

امام ابوحنیفہ کی تدوین قانون اسلامی

از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب، طبع دوم، صفحات ۵۶، کاغذ دبیز، قیمت ۱۲ / ناشر:۔ دارالاشاعت، مقابل مولوی مسافر خانہ۔ کراچی ۱/

یہ قانونِ اسلامی کی تدوین کے سلسلے میں امام ابوحنیفہ رح کی مساعی و خدمات کا مختصر مگر پر مغز تذکرہ ہے، اس سلسلہ میں اولاً فقہ کی تاریخ، پھر اس کی علمی تاریخ، اور فقہی اعتبار سے وہاں کے سلسلۂ علم کے پایۂ اعتبار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر امام ابوحنیفہ رح کی طالبعلمانہ سرگزشت کی چند جھلکیاں پیش کر کے دکھایا گیا ہے کہ وہ کس طرح فقہ کی طرف مائل ہوئے اور رفتہ رفتہ اہل ذوق و طلب کا مرجع بنے اور اپنے بہترین شاگردوں اور ساتھیوں کی رفاقت میں انھوں نے کن اصولوں پر قانونِ اسلامی کی تدوین کا وہ بلند کارنامہ انجام دیا جس کا فیض آج تک جاری ہے — آخر میں ڈاکٹر صاحب نے اس سوال پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ اسلامی قانون بیرونی قوانین خصوصاً رومانی سے کہاں تک متاثر ہے۔ اس بارے میں ان کی رائے نہایت معتدل ہے۔

فتوح الغیب اُردو

مجموعۂ مقالات سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح، صفحات ۲۲۷۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کتابت، طباعت جلی۔ قیمت ۲/۵۰

ملنے کا پتہ:۔ (۱) مکتبۂ نشاۃ ثانیہ، معظم جاہی مارکیٹ، حیدرآباد دکن۔

(۲) نیشنل بکڈپو، چارکمان، حیدرآباد دکن

فتوح الغیب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح کے مقالات و ارشادات کا مشہور مجموعہ ہے۔ اس کا اردو ترجمہ پہلے بھی شائع ہو چکا ہے۔ اب یہ ترجمہ بقول ناشر شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے فارسی ترجمہ

اور سید سکندر شاہ صاحب کے اردو ترجمہ کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔

مولانا مودودی اور تصوف

از جناب شیخ احمد صاحب، ناشر:- اسلامک بک سینٹر، مسجد چوک حیدرآباد دکن۔ کتابت طباعت جلی اور صاف۔ صفحات ۱۴۲ قیمت:- ۱/۵۰

یہ ایک طویل مقالہ ہے جس میں مقالہ نگار نے بعض لوگوں کے جواب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مولانا مودودی میں وہ تمام اوصاف اعلیٰ درجہ پر پائے جاتے ہیں جو تصوف سے مطلوب ہیں۔ مقالہ نگار نے اس ضمن میں مودودی صاحب کی کچھ تحریریں اور بعض واقعات پیش کیے ہیں۔ ہمیں اس سے واقفیت نہیں کہ حقیقت حال کیا ہے اور نہ اس سے کوئی دلچسپی ہے، لیکن اس شخصی بحث سے قطع نظر ہم اصولی طور پر فاضل تنقید نگار کو اس طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ تحریروں سے باطنی اوصاف کمال ثابت کرنا نہایت سطحی اور غیر صحیح طرز فکر ہے۔ مولانا مودودی کے بارے میں تو چاہے ان کا خیال مبنی بر حقیقت ہو، مگر بڑی مصیبت آجائے گی اگر ہم نے اس پیمانہ کو حکم مان لیا جس پیمانہ کو وہ پیش کر رہے ہیں۔ تحریر آج کل کا بہت بڑا فتنہ ہے، لوگ کچھ ہوتے ہیں اور اپنی تحریروں سے کچھ معلوم ہوتے ہیں اس لیے اگر بلا وجہ کسی سے بدگمانی تو نہیں کرنا چاہیے، مگر صرف تحریروں کی بنا پر خوش اعتقادی کا اصول ہرگز قائم نہ کرنا چاہیے۔ خصوصاً جبکہ ہم کو تو ہدایت یہ ہے کہ (صرف) نماز روزہ دیکھ کر بھی کسی کے معتقد نہ ہو بیٹھو ـــــ ہم امید کرتے ہیں کہ مولانا مودودی کے معتقدین اس گزارش کو کوئی غلط معنیٰ نہ پہنائیں گے۔

مولانا مودودی اور غلطیاں

از جناب شیخ احمد صاحب، ناشر:- محکمۂ تعمیر ملت، چوک بازار ملتان، صفحات ۵۶، کاغذ رف، قیمت مع محصول ڈاک ۲ آنے

اس رسالہ میں اس بات کی کئی مثالیں پیش کی گئی ہیں کہ جب کسی نے مولانا مودودی کی غلطی کو ان پر واضح کر دیا۔ انھوں نے بلا تأمل اس سے رجوع فرمایا۔

مزدور اور اسلام

از جناب پرواز اصلاحی، صفحات ۶۴، قیمت ۸ر آنے۔ پتہ:- اسلامی کتب خانہ ۱۳۶۷، بلیماران دہلی۔

اس رسالہ میں دکھایا گیا ہے کہ اسلام میں مزدوری کے کیا فضائل ہیں، نیز یہ کہ مزدور کے اوصاف کیا ہونے چاہئیں اور اسلام نے اپنی تعلیمات میں مزدوروں کی بہبودی کا کتنا خیال رکھا ہے، اور کس قدر

احسانات اس طبقہ پر کیے ہیں۔

مصنف اگرچہ غیر معروف ہیں مگر ان کی تحریر سے لکھنے کی اچھی صلاحیت کا اظہار ہوتا ہے، کمی صرف یہ ہے کہ وہ موضوع کے حدود کو ملحوظ نہیں رکھ سکے ہیں۔ مزدوری کے فضائل میں حضرت یوسف علیہ السلام کی "ملازمت" کو بھی لے آئے ہیں، مزدور طبقہ پر اسلام کے احسانات میں اسلام کی اُن تعلیمات اور نبی اکرمؐ اور صحابۂ کرامؓ کے اُس طرزِ عمل کا ذکر کرتے چلے گئے ہیں جس کا تعلق غلاموں اور رضاکارانہ طور پر خدمت گزاروں سے ہے۔ اس طرح کی اور بہت سی مثالیں کتاب میں موجود ہیں۔ مآخذ کی فہرست دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اتنی اچھی خاصی کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھنے والے نے اُجرت، ملازمت، مضاربت، رضاکارانہ خدمت اور غلامی کو گڈمڈ کیسے کر دیا۔

قرآن مجید مع ترجمہ و تفسیر ماجدی سورۂ یونس تا سورۂ نحل، شائع کردہ تاج کمپنی لمیٹڈ پاکستان، قیمت درج نہیں، غالباً گیارہ روپے۔ کپڑے کی اعلیٰ جلد، سنہری ڈائی، کاغذ سفید دبیز ۱۸×۲۲/۱×۴

مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی مدیر صدق کی تفسیر کی غالباً یہ تیسری جلد ہے، جو ایک عرصہ ہوا تاج کمپنی کی روایتی کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہو چکی ہے، ہر صفحہ پر بیچ میں سبز زمین پر قرآنی آیات مع ترجمہ۔ اور تین طرف سے گھرے ہوئے ان آیات سے متعلقہ تفسیری حواشی۔ جو قرآن کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے بلاشبہ بڑی افادیت کے حامل ہیں۔ ان حواشی کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ گویا مستند تفاسیر کا نچوڑ ہیں، مفسرین کے اقوال کا اپنی زبان میں خلاصہ دینے کے ساتھ ساتھ بعینہٖ ان کے الفاظ بھی کتب تفسیر کے حوالہ سے نقل کر دیے گئے ہیں۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ کتب سابقہ (توراۃ و انجیل وغیرہ) سے بھی مدد لی گئی ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ قدیم شرک و کفر کے ساتھ جدید شرک و کفر کی بھی تردید ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اور چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ حسب موقع جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں دکھایا گیا ہے کہ سائنس ہی کے نام سے قرآن کی جو تردید اور تغلیط اب تک کی جاتی رہی تھی وہ کس طرح باطل ثابت ہو رہی ہے۔[1]

لغات القرآن جلد پنجم تالیف مولانا سید عبد الدائم الجلالی۔ ناشر: ندوۃ المصنفین دہلی، صفحات ۵۰۰ سائز ۲۰×۲۶/۸ کاغذ اور

[1] واضح رہے کہ ہم نے جستہ جستہ مقامات سے دیکھ کر یہ رائے قائم کی ہے پوری تفسیر کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔

کتابت وطباعت عمدہ ، قیمت ۶/۸

اس کتاب کی پہلی چار جلدیں مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی کے قلم سے نکل چکی ہیں، اب اس پانچویں جلد کی تالیف مولانا سید عبدالدائم صاحب کے حصہ میں آئی ہے، اس جلد میں حرف غ سے م تک کے لغات قرآنی آگئے ہیں۔ امید ہے کہ قرآن فہمی کا شوق رکھنے والے اردو خواں حضرات کے لیے یہ جلد بھی پہلی جلدوں کی طرح مفید ثابت ہوگی۔

سُنن دارمی اردو شائع کردہ۔ محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب، قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی۔ صفحات ۵۰۰ کے قریب، کتابت طباعت اور کاغذ معمولی ، مجلد قیمت -/۸ روپے

سنن دارمی حدیث کی مشہور کتاب ہے جس کے مؤلف کا زمانہ تیسری صدی ہجری کا ہے۔ محمد سعید اینڈ سنز نے بغیر متن حدیث کے اس کا ترجمہ شائع کیا ہے، مترجم کون بزرگ ہیں اس کا پتہ نہیں، مترجم کا نام کتاب پر تو درج ہے ہی نہیں۔ عجیب بات ہے کہ دو دو حضرات نے مقدمے لکھے ہیں مگر ان میں بھی مترجم کے نام سے اغماض کیا گیا ہے ــــــ محمد سعید اینڈ سنز کے یہاں سے دھڑا دھڑ کتب احادیث کے تراجم شائع ہو رہے ہیں۔ ہم اس رجحان کی ہمت افزائی نہیں کرسکتے غالباً حدیث نبوی ہے "کلموا الناس علیٰ قدر عقولہم" (لوگوں سے اُن کی عقل و فہم کا لحاظ رکھ کر بات کرنی چاہیے) اور خود آنحضرت کا اس پر عمل بھی رہا بعض باتیں ہیں جو آپ نے بعض اصحاب سے فرمائیں اور تاکید کردی کہ یہ بات عام کرنے کی نہیں ہے، پس اولاً تو عوام کی سطح کا لحاظ رکھ کر احادیث کا انتخاب کرنا چاہیے۔ دوسرے احادیث کی ضروری تشریح و تفہیم کا بھی التزام ہونا چاہیے ورنہ حدیث کے سابقہ مؤلفات کا من وعن لفظی ترجمہ شائع کردینا جہاں لوگوں کو فائدہ پہونچائے گا وہاں نقصان بھی پہونچا سکتا ہے۔ اور بہت سا حصہ تو لفظی ترجمہ کی وجہ سے بے کار ہی رہ جائے گا، پس جن حضرات کے پیش نظر صرف تجارت نہ ہو لوگوں کے نفع وضرر سے بھی بحث ہو انھیں اس سلسلہ میں مستند اہل علم سے رجوع کرنا چاہیے۔

مسند امام ابو حنیفہؒ مترجم اردو ترجمہ وتشریح مولانا سعد حسن، ناشر: محمد سعید اینڈ سنز، صفحات ۴۴۴، کتابت طباعت

بہتر، کاغذ معمولی، قیمت مجلد -/۸

مسند حدیث کی اُن کتابوں کو کہا جاتا ہے جن میں کسی ایک ہی شخص کی مرویات کو جمع کیا گیا ہو۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے جن احادیث کو روایت کیا ان کے مجموعے بہت سے حضرات نے تیار کیے انھیں میں سے ایک مجموعہ یہ ہے جو ترجمہ و تشریح کے ساتھ پیش نظر ہے۔ اس میں پہلے ایمانیات کے ابواب اور کتاب العلم ہے، ابعدازاں فقہی ابواب کی احادیث ہیں، جن فقہی مسائل میں ائمہ کا اختلاف ہے، مترجم نے وہاں اختلاف کو بیان کر کے مختلف مذاہب کے دلائل بھی بیان کر دیے ہیں۔ ترجمہ کہیں کہیں قابل نظر ثانی معلوم ہوا مثلاً "ثَيِّب" کا ترجمہ ہر جگہ "بیوہ" کیا گیا ہو حالانکہ ثیب کے لیے بیوہ ہونا ضروری نہیں، مطلقہ بھی ہو سکتی ہے۔

احکام سلطانیہ

از علامہ ابوالحسن ماوردی، مترجمہ مفتی انتظام اللہ شہابی۔ صفحات ۳۵۶، کاغذ اخباری، کتابت و طباعت بہتر۔ مجلد قیمت -/۶، ناشر:- محمد سعید اینڈ سنز۔

الاحکام السلطانیہ، علامہ ابوالحسن ماوردیؒ (متوفی ۴۵۰ھ) کی اسلامی نظام حکومت پر مشہور تصنیف ہے۔ جس سے اس موضوع پر لکھنے والے مصنفین برابر استفادہ کرتے رہے ہیں اس میں اسلامی حکومت (خلافت) کے سلسلہ کی تمام ضروریات و مسائل اور احکام کو احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کی گئی ہے، مفتی انتظام اللہ صاحب نے اس کے بعض ابواب و مباحث کو حذف کر کے اور مقدمہ ابن خلدون وغیرہ سے بعض اضافے کر کے اردو کے قالب میں اس کو از سر نو مرتب کیا ہے۔ پوری کتاب کا ترجمہ پہلے حیدرآباد دکن سے بھی شائع ہو چکا ہے۔ یہ ملخص ترجمہ بھی موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مفید ہوگا۔

کتاب الاخلاق

از مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی، ناشر:- محمد سعید اینڈ سنز۔ کتابت طباعت اور کاغذ بہتر صفحات ۲۲۴ مجلد قیمت ۲/۸۔

اسلام نے جن فضائل اخلاق کو اختیار کرنے اور جن رذائل کو ترک کرنے کی تعلیم دی ہے اسلام کی ان اخلاقی تعلیمات کو اس کتاب میں جمع کیا گیا ہے۔ طرز یہ ہے کہ ہر باب کے ماتحت پہلے کچھ آیات قرآنی یا ترجمہ پیش کی جاتی ہیں اور اس کے بعد چند احادیث نبوی کا ترجمہ۔

کتاب اپنے موضوع پر مفید ہے۔

کتاب المعاشرت | از مفتی صاحب موصوف، ناشر:- محمد سعید اینڈ سنز، کتابت طباعت بہتر، کاغذ معمولی، صفحات ۱۷۶۔ مجلد قیمت -/۲ روپے

کھانا پینا، رہن سہن، شادی بیاہ، اور پیدائش وموت وغیرہ کے سلسلہ میں جو احکام و آداب اسلام نے تعلیم کیے ہیں۔ اس کتاب میں ان کو جمع کر دیا گیا ہے، کتاب مفید انداز میں لکھی گئی ہے۔

خیال ہوتا ہے کہ یہی کتاب اسلامی معاشرت کے نام سے برسوں پیشتر دہلی سے شائع ہو چکی ہے اور اس پر الفرقان میں ریویو بھی ہو چکا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو تعجب ہے کہ اس کا ذکر ناشر یا مصنف نے کیوں نہیں کیا۔

نقش آزاد | مرتبہ مولانا غلام رسول مہر، شائع کردہ۔ کتاب منزل لاہور، کتابت، طباعت اور کاغذ متوسط، صفحات ۳۶۰، سائز ۲۲×۱۸/۱۶، مجلد قیمت -/۶ روپے۔

مہر صاحب اُن چند لوگوں میں ہیں جن کے مولانا آزاد مرحوم سے بہت قریبی تعلقات رہے ہیں، مہر صاحب کے تعلقات کی مدت کم و بیش چوالیس سال ہے۔ اس طویل عرصۂ تعلق کی یادگار مہر صاحب کے پاس مولانا مرحوم کے وہ خطوط تھے جو مولانا انھیں لکھتے رہے، مہر صاحب نے اسی یادگار کو نقش آزاد کی شکل میں نذرِ عام کر دیا ہے۔ یہ اکیاسی مکاتیب ہیں جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۵۸ء تک کے ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا کی کچھ اور تحریریں بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں جو مہر صاحب کی کتاب "غالب" پر مولانا کے افادات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی چند تحریریں ہیں جنھیں متفرقات کا عنوان دیا جا سکتا ہے۔

ان جمیع مشمولات کو مہر صاحب نے اسی ترتیب پر تقسیم کر دیا ہے۔ "حصہ اول" میں اپنے نام کے مکاتیب "حصہ دوم" میں "غالب" پر مولانا کے افادات، "حصہ سوم" میں متفرقات، جن میں کچھ دوسرے لوگوں کے نام کے خطوط بھی شامل ہیں ــــ حصہ اول 'مکاتیب' میں علمی، دینی، سیاسی، ذاتی اور کاروباری ہر قسم کے خطوط شامل ہیں۔ کاروباری خطوط سے مراد وہ خطوط ہیں جو ترجمان القرآن جلد اول و دوم کی طباعت و فروخت وغیرہ کے معاملات سے متعلق ہیں۔ ان خطوط میں عام افادیت اور دلچسپی کا اگرچہ کوئی پہلو نہیں ہے، مگر یہ ضرور ہے کہ اس سے مولانا کی زندگی کا وہ گوشہ بھی سامنے آجاتا ہے جس سے معدود

چند اصحاب ہی کو واقفیت رہی ہو گی اور یہ چیز مولانا کی سوانح نگاری کی تکمیل میں مدد دے گی۔

علمی اور دینی خطوط کے سلسلہ میں مولانا کا ایک وہ خط بھی اس مجموعہ میں آگیا ہے جو انھوں نے اپنی تفسیر سورۂ فاتحہ پر کیے جانے والے اعتراضات کے سلسلہ میں لکھا ہے اس کی یہ سطریں دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی جن میں مولانا نے "لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا" کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بڑے صاف الفاظ میں یوں بیان کیا ہے!

"قرآن کی یہ تصریح گذشتہ کی نسبت ہے جس کا اختلاف اہل کتاب بطور حجت کے لاتے تھے نہ کہ آئندہ کی نسبت، آئندہ کے لیے اس کا اعلان معلوم ہے کہ نعمت تمام ہو چکی اور یہ اتمام نہ صرف اصل دین میں ہے بلکہ شرع و منہاج میں بھی۔ اور اتمام کے بعد مزید تبدل ممکن نہیں، اکمال کے بعد مزید تکمیل کی گنجائش نہیں۔

یہ ہمارے دستے ہو کہ ہم ہر طالب حق پر واضح کریں کہ جس طرح اصل دین کی دعوت کامل ہو چکی اور وہ تمام پچھلی دعوتوں کا جامع و مشترک خلاصہ ہے ٹھیک اسی طرح شرع و منہاج کا معاملہ بھی کامل ہو چکا ہے اور وہ تمام پچھلے شرائع کے مقاصد و عناصر پر جامع و حاوی ہے۔" (ص۵۰)

مولانا کی زندگی کے ان مخفی گوشوں میں سے جو صرف اس مجموعہ مکاتیب ہی کے ذریعہ منظر عام پر آئیں گے غالباً ایک یہ بھی ہو گا جو دسمبر ۱۹۳۶ء کے ایک مکتوب کی ان سطروں میں رونما ہوا ہے۔

"خط بروقت مل گیا تھا لیکن رمضان کے آخری دنوں نے مہلت التفات نہ دی۔ اللہ کے افضال خاص میں سے ایک فضل یہ ہے کہ اس ماہ کی خوش وقتیوں سے دل محروم نہیں رہتا، دنیا کے لیے چار موسم ہوا کرتے ہیں میرے لیے صرف دو رہ گئے ہیں۔ گیارہ مہینے خزاں کے ایک بہار کا۔ رمضان میرے لیے "بہار و بادہ" کا پیام ہوتا ہے!۔

ہمہ شب شراب خوردن، ہمہ روز خواب کردن!" (ص۱۱۶)

ان مکاتیب اور جو دوسری تحریریں اس مجموعہ میں شامل ہیں ان پر مہر صاحب کے حواشی بھی کافی تعداد میں ہیں، جن میں اشارات کی تفصیل اور اجمال و ابہام کی توضیح کے ساتھ مہر صاحب مولانا کے تسامحات پر تنبیہ بھی کرتے گئے ہیں، بلکہ بعض مقامات پر تو ان تنبیہات کے ساتھ کچھ اس انداز کے فقرے بھی آگئے ہیں کہ ان میں لطیف طنز اور نیازمندانہ ادب دونوں رخ جمع ہیں۔ بلکہ بعض تنبیہات

تو موقع و محل کے اعتبار سے نیازمندانہ ستم ظریفی کا مصداق بن گئی ہیں ـــــ غالباً مہر صاحب کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا ـــــ اسی طرح بعض اشخاص کی صفائی میں مولانا سے ایک طرح کی نوک جھونک کا سا رنگ آ گیا ہے۔ مثلاً ایک مکتوب ہے جس میں مولانا نے مہر صاحب کی کتاب "غالب" کے سلسلے میں کچھ افادات رقم فرما کر لکھا ہے۔

"افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا۔ غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری ہی کا رونا تھا۔ نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی۔

نا روا بود بہ بازار جہاں جنس وفا
رونقے گشتم و از طالع دکاں رفتم" (ص ۱۵۷)

اس خط کے افادات پر مہر صاحب نے مولانا کو دو جگہ لقمہ دیا ہے۔ اسے موقع و محل کے اعتبار سے ستم ظریفی نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے؟ پھر اس پر مزید پہلے "لقمے" کے بعد کے یہ فقرے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ وہ میری کتاب پر ضروری یادداشت تحریر فرمانے کے لیے زیادہ فرصت نہ نکال سکتے تھے۔ اور یہ خیال بھی تھا کہ مجھے افادات سے محروم نہ فرمائیں۔ جتنا وقت ملتا اور جو کچھ پیش نظر آتا تحریر فرما دیتے۔ نہ زیادہ فرصت تھی اور نہ مراجعت کتب کی مہلت پاتے۔" (ص ۱۵۶)

مہر صاحب نے یہ مولانا کی طرف سے نیازمندانہ معذرت پیش کی ہے۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ اس میں بڑے لطیف طنز کا رُخ بھی پایا جاتا ہے۔

علیٰ ہذا ترجمان القرآن کے تجارتی معاملے میں شیخ مبارک علی صاحب کی صفائی میں مہر صاحب جگہ جگہ ایسے حاشیے لکھ گئے ہیں کہ مولانا سے اچھی خاصی نوک جھونک کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

یہیں یہ بات بھی کہہ دینے کو جی چاہتا ہے کہ مہر صاحب نے شیخ مبارک علی صاحب کی تو پوری پوری صفائی کر دی ہے، مگر بعض دوسرے لوگ جو اس معاملے سے متعلق ہیں اُن کی طرف سے اگر کوئی صفائی مہر صاحب نہیں کر سکتے تھے تو پھر بہتر یہ تھا کہ اس سلسلہ کے بعض خطوط کو کتاب سے خارج کر دیا جاتا، اس سے کوئی خاص کمی کتاب میں نہ رہتی۔ اسی طرح مولانا کے سکریٹری ت۔ جیاں کے خطوط کی اس مجموعہ میں شمولیت کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔

بہرحال مولانا مرحوم کی تحریر کے دلدادوں کے لیے "نقش آزاد" بڑا قیمتی تحفہ ہے جسے مہر صاحب جیسے کہنہ مشق مصنف نے اپنی پوری دلچسپی کے ساتھ مرتب کر کے پیش کیا ہے۔

تذکرہ مجدد الف ثانیؒ

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی

متوسط خوشنما کتابی سائز، ساڑھے تین سو صفحات، مجلد مع ڈسٹ کور، قیمت چار روپے ۴/-

امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کو عام طور سے اس حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے کہ وہ تصوف کے ایک سلسلہ کے امام ہیں، حالانکہ انھوں نے خود تحریر فرمایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے مجھے صرف "تزکیہ و ارشاد" کے اس کام کیلئے نہیں پیدا کیا ہے، ہاں اللہ جسکو توفیق دے وہ یہ فیض بھی اس بندہ سے حاصل کرلے، ورنہ میرے وجود سے اللہ تعالیٰ کا خاص مقصد کچھ اور ہے۔ اور ایک کارِ عظیم مجھ سے وابستہ ہے"۔ اس خاص مقصد اور کارِ عظیم کو ان کے مکتوبات کے دفتروں سے بھی سمجھا جاسکتا تھا اور پوری طرح سمجھا جاسکتا تھا لیکن کچھ خاص وجوہات سے عام طور پر سمجھا نہیں گیا۔ یہاں تک کہ اب سے ۲۱ سال پہلے (محرم ۱۳۵۷ھ مارچ ۱۹۳۸ء میں) جب الفرقان کا مجدد الف ثانی نمبر شائع ہوا، اور اسکے لکھنے والوں نے (خاص کر ہمارے مولانا گیلانی مرحوم نے) اس مسئلہ کو اپنا موضوع بناکر اس پر روشنی ڈالی تو یہ حقیقت کھل کر سب کے سامنے آئی کہ وہ کیا کارِ عظیم ہے جسکو آپ نے اپنے وجود کا مقصد قرار دیا ہے اور آپکا وہ کون سا نمایاں تجدیدی کارنامہ ہے جسکی وجہ سے آپ کو کسی ایک صدی کا نہیں بلکہ "الف ثانی" یعنی پورے دوسرے ہزار کے (از ۱۰۰۱ تا ۲۰۰۰) کا مجدد امت نے مان لیا ہے ــــ الفرقان کے اس نمبر کی اشاعت پر ۲۱ سال گزر چکے ہیں اس عرصہ میں خاصکر اسلامی دنیا کے حالات میں بہت کچھ تبدیلیاں ہوئی ہیں، ان تبدیلیوں کو اور انکے دینی تقاضوں کو دیکھ کر یہ یقین بڑھ جاتا ہے کہ واقعۃً امام ربانی حضرت سرہندی قدس سرہ "الف ثانی" کے مجدد ہیں اور ہمارے اس دور کے لیے بھی حضرت ممدوح کے تجدیدی کام میں پوری رہنمائی موجود ہے۔ خاصکر ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کے سامنے جو اہم دینی سوالات ہیں ان کے تو ایسے جوابات حضرت مجدد قدس سرہ کی تجدیدی و اصلاحی جد و جہد سے مل جاتے ہیں گویا کہ وہ ان ہی سوالات کو حل کر رہے ہیں، اور یہاں کے اہل دین کو انکی مشکلات کا حل بتارہے ہیں۔

الفرقان کے اس نمبر کے مقالات کو اب کتابی شکل میں نئی ترتیب دیکر شائع کیا گیا ہے۔

اعیان الحجاج: ـ (از حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی) حج کی عظمت اور اس کے حقوق کو سمجھنے کیلئے ایک منفرد کتاب ـ جو امت کی سینکڑوں برگزیدہ ہستیوں کے تذکرہ حج پر مشتمل ہے ـ غیر مجلد قیمت ۸/- مجلد قیمت ۱۰/-

ماہنامہ

الفرقان

لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے اور یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے

لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، یہ اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت و بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت و شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی پیغام کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں ہم اس کا عہد کرتے ہیں اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

[illegible] فی الحیاۃ الدنیا وفی الآخرۃ

فاطر السموات والارض [illegible]

توفنی مسلماً والحقنی بالصالحین

ادارۂ الفرقان

مسئول

محمد منظور نعمانی

مرتب

عتیق الرحمن سنبھلی

ماہنامہ

الفرقان لکھنؤ

غیر ممالک سے

سالانہ چندہ اشلنگ

اعزازی خریداروں سے

سالانہ [illegible]

ہندوستان و پاکستان سے

سالانہ چندہ (بجز پاکستان) [illegible]

سالانہ چندہ (بجز ہندوستان) [illegible]

ششماہی .. .. [illegible]

فی کاپی آٹھ آنے

جلد (۲۶) — بابتہ ماہ شعبان ۱۳۷۸ھ مطابق مارچ ۱۹۵۹ء — شمارہ (۸)

اگر اس ○ میں سرخ نشان ہے — تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا رسالہ بصیغہ وی پی ارسال کیا جائے گا۔

چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۱۴ تاریخ تک پہنچ جانی چاہیے۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیج دیں۔

تاریخ اشاعت:۔ رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ کو روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۲۵ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

دفتر الفرقان

کچہری روڈ لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

ہر مؤثر انقلاب کا خاصہ ہے کہ زندگی کے پرانے نقشے ٹوٹتے اور نئے نئے نقشے بنتے ہیں بیاست کے سانچہ میں تبدیلی آتی ہے، اقتصاد و معیشت کا ڈھانچہ بدلتا ہے تعلیمی نظام متغیر ہوتا ہے، اور معاشرت کا دائرہ نئے اطوار سے آشنا ہونے لگتا ہے۔

۱۹۴۷ء کی آزادی ہندوستان کا ایک مؤثر انقلاب تھی، اس گیارہ سال کے عرصہ میں اس انقلاب کے اچھے اور بُرے اثرات کسی نہ کسی پیمانہ پر زندگی کے ہر ہر گوشہ میں رونما ہو چکے ہیں۔ سیاست کا نظام ایک نئے سانچے میں ڈھل رہا ہے۔ اقتصاد و معیشت کا ڈھانچہ تیزی سے بدل رہا ہے، زمینداری کا سسٹم کبھی کا ختم ہو چکا، صنعتی سرمایہ داری موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہے سوشلزم کا قیام ملک کی منزل قرار پا گئی ہے۔ زراعت کے نظام کو کواپریٹو نہج پر لانے کا تہیہ کیا جا چکا ہے۔ اور یہ تجویز ملک کا اہم ترین مسئلہ بن رہی ہے۔ غرض ملک کی قیادت ترقی اور بہبودی کے بارے میں جو نقطۂ نگاہ رکھتی ہے اس کے سارے تقاضے ایک ایک کرکے بروئے کار آرہے ہیں۔

انھیں تقاضوں میں سے ایک تقاضہ عورتوں کو میدانِ کار میں لانے کا بھی ہے۔ اس تقاضے نے ملک کے سب سے بڑے لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو کی زبان، کچھ عرصے سے پردہ کے خلاف کھلوا رکھی ہے۔ اس معاملہ میں ان کا انداز کھلے طور پر جارحانہ اور انتہا پسندانہ ہے۔ وہ جب کسی میٹنگ میں عورتوں کو مروّجہ پردے کے ساتھ دیکھتے ہیں برس پڑتے ہیں اور بقول خود "ان کا خون کھولنے لگتا ہے"۔ اُن کے یہ الفاظ خود بتاتے ہیں کہ اس معاملے میں وہ جارحیت اور انتہا پسندی کی کس چوٹی پر پہونچے ہوئے ہیں۔

بہت سے مسلمان ان الفاظ اور اس حملہ کا رُخ مخصوص طور پر اسلامی پردے کی طرف سمجھ کر غم و غصہ کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ بات تو صحیح نہیں ہے، بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پنڈت جی کے سامنے زیادہ تر ہندوانی پردہ آتا ہے۔ اور واقعاتی اعتبار سے ان کا زیادہ تر رُخ اسی طرف ہوتا ہے، مگر یہ درست ہے کہ موقع و محل سے قطع نظر، اُن کے الفاظ جو شائع ہوتے ہیں وہ عام ہوتے ہیں اور ان کی پوری پوری چوٹ اسلامی پردہ پر بھی پڑتی ہے۔ بلکہ یہ پردہ زیادہ سخت ہونے کی وجہ سے اسی پر زیادہ سخت چوٹ پڑتی ہے اور اسی وجہ سے ہم، غم و غصہ کرنے اور بُرا ماننے والے لوگوں میں سے تو نہیں، البتہ یہ تشویش ضرور رکھتے ہیں کہ یہ آواز مختلف عوامل کے تحت، مسلمان معاشرہ کے رہے سہے پردہ پر بھی ضرور اثر انداز ہوگی۔

مسئلہ اپنی جگہ پر پنڈت جی ہی کی وجہ سے کافی قابلِ فکر تھا، مگر اب فکر و تشویش کا یہ نیا پہلو پیدا ہوا ہے کہ پنڈت جی کی صاحبزادی جو کانگرس کی مسندِ صدارت پر بٹھیا دی گئیں ہیں انھوں نے بھی صدارت کا تاج سر پر رکھتے ہی اپنے والدِ ماجد کے کھیلے ہوئے اس نئے محاذ پر کام شروع کر دیا ہے۔ اور ملکی تعمیر و ترقی کے نام پر اپنی ہم صنفوں سے اپیل کرنے لگی ہیں کہ وہ گھر کے محدود دائرہ سے نکل کر وسیع تر میدانِ کار میں آئیں۔ اور روایتی پردہ کو ختم کر کے قومی تعمیر میں مردوں کا ہاتھ بٹائیں[1] ــــــ جب ترکِ حجاب کی مردانہ آواز میں عورتوں کے لیے یہ اثر ہو کہ "کھلوار (راجستھان) میں دورہ کے موقع پر ۲۲۵ راجستھانی عورتوں نے شری نہرو کو ترکِ حجاب کا یہ عہد نامہ پیش کر دیا کہ وہ آج سے اپنا روایتی و رواجی پردہ ختم کرتی ہیں[2]۔" تو اندازہ کر لینا چاہیے کہ ایک پُرکشش نسوانی آواز کی اپیل کا کیا عالم ہوگا!

ایک عورت اور وہ بھی جو کانگرس کی صدارت جیسے مقام پر پہونچ چکی ہو، عورتوں کے لیے، ان کی خاص نفسیات کے اعتبار سے، ایک بڑا پُرکشش نمونہ اور ایک مؤثر شخصیت بنتی ہے، پھر جب وہ یہ نسبت بھی رکھتی ہو کہ پنڈت نہرو کی چہیتی بیٹی ہے۔ جن کی محبوبیت کا یہ عالم ہے کہ ابھی یکم مارچ کو جب وہ لکھنؤ آئے اور ایک پروگرام کے لیے شہر کے قدیم حصہ میں گئے۔ جہاں مسلمانوں کی

---

[1] قومی آواز ۳ مارچ ۱۹۵۹ء [2] ایضاً ۹ مارچ۔

ابھی آبادی ہے تو ایک مقامی اخباری رپورٹ کے مطابق "برقع پوش" عورتوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ ان کے دیدار کے لیے سڑکوں پر لگے ہوئے تھے اور ان میں سے بعض بوڑھیوں نے ہاتھ پھیلا پھیلا کر اُن کی "بلائیں" لیں، تب تو اس کی شخصیت کی اثر اندازی کا پوچھنا ہی نہیں یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ اگر خواتین کی کسی میٹنگ میں ترکِ حجاب کی اپیل فرمائیں جس میں برقع پوش مسلم خواتین کی بھی کچھ تعداد ہو تو دو چار نقاب ضرور اسی دم اُلٹ جائیں گے۔ اور عہد نامہ پیش ہو جائے گا کہ ہم آج سے اس "نقش" کو خیر باد کہتے ہیں۔

شریمتی اندرا گاندھی اگر اپنے والد پنڈت نہرو کی طرح پردہ کی مخالفت کو ایک مستقل مہم بنا لیتی ہیں تو بات صرف ان کی براہ راست مساعی اور مسلم معاشرہ پر ان مساعی کے بالواسطہ یا بلا واسطہ اثرات ہی تک محدود رہنے والی بھی نہیں ہے بلکہ خود ہمارے معاشرہ میں ایسی خواتین موجود ہیں جو اپنی حد تک اس پردہ کی "لعنت" کو ختم کرنے کے لیے پہلے ہی سے کوشاں ہیں۔ ان سے توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس بہترین موقع کو ہاتھ سے جانے دیں گی۔ اور اندرا گاندھی کی شخصیت کے اثر سے جو فضا بنے گی وہ اس سے فائدہ نہ اٹھائیں گی۔ ہمارے یہ خواتین مسلمان عورتوں کو پردے اور گھر کی چہار دیواری سے لانے کے لیے کتنی بے چین ہیں اور کیسے مؤثر اور نفسیاتی ڈھنگ انھوں نے اس سلسلہ کے غور و فکر میں پا لیے ہیں۔ اس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ کچھ ماہ پیشتر ایک مرتبہ نہرو جی کے لکھنؤ آنے کا پروگرام بنا تو یہ خواتین جو اس زمانہ میں بدھم وغیرہ کے سلسلہ میں مسلم خواتین سے ربط پیدا کیے ہوئے تھیں ان کی جانب سے اخبارات میں باقاعدہ یہ اپیل شائع ہوئی کہ خواتین اپنے محبوب لیڈر کا استقبال کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہوائی اڈہ پر پہونچیں۔ اور اس کے لیے اطلاع دی گئی کہ مخصوص بسوں کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ وہ تو کہیے کہ نہرو جی کی آمد ملتوی ہو گئی۔ ورنہ ہم آپ دیکھتے کہ کتنی برقع پوش خواتین اس "چلتی گاڑی" میں سوار نظر آتیں۔ یہ صرف ایک شہر کی مثال ہے۔ یقیناً دوسرے شہروں میں بھی اس قسم کی خواتین کی کچھ نہ کچھ تعداد ہوگی۔

بہر حال مسئلہ فکر کا طالب ہے، پردہ کہنے کو تو ایک لفظ ہے مگر آج بھی مسلم معاشرہ کے لیے یہ ایک بڑے حصار کا کام دے رہا ہے۔ کتنے ہی مفاسد و منکرات ہیں جو اس کی بدولت مسلم معاشرہ کے ایک بڑے حصہ میں گھسنے سے رُکے ہوئے ہیں۔ مثلاً صاحب ایمان

اور صاحب اہلیت مردوں اور عورتوں سبھی سے توجہ کا طالب ہے۔ مگر خواتین خصوصاً اس سلسلہ میں بڑا کام انجام دے سکتی ہیں۔ اور انھیں اپنے مواقع کی حد تک اس مسئلہ میں پوری علمی دلچسپی لینی چاہیے

شعاعِ امید پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا مگر وہاں کے اربابِ اقتدار اور اہلِ سیاست نے گذشتہ دس سال کے اندر اسلام کی جتنی مٹی پلید کی وہ تاریخ اسلام کا ایک ماتم انگیز باب ہے۔ یہ لوگ اگر چاہتے تو پاکستان کا قیام ایسا زرّیں موقع تھا کہ پاکستانی امت مسلمہ کی صدیوں کی گراوٹیں برسوں میں دور کر سکتے تھے۔ مگر، خدا انھیں معاف کرے انھوں نے اس جذباتی ماحول کے صالح امکانات کو یکسر غارت کر دیا اور اپنی نفس پرستیوں کی بدولت پچھلی گراوٹیں چند برسوں میں کہیں سے کہیں پہونچا دیں۔

برائی کی اس اندوہناک رفتار نے ایک انقلاب کو جنم دیا اور فوجی افسروں نے آگے بڑھ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ انقلاب اسلام کے حق میں کیا ثابت ہوگا اور اب بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر حال ہی میں قائد انقلاب جنرل محمد ایوب خاں کی ایک تقریر آئی ہے اور اس کے بعد پے بہ پے کئی تقریریں ایسی ہی آئی ہیں۔ جن میں امید کی ایک کرن جھلملاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، ہمارے پیش نظر لاہور کے ایک مجمع عام کی جو تقریر ہے اس میں جنرل موصوف نے کہا ہے

"پچھلے دنوں اس ملک کے سیاسی طالع آزماؤں نے قدم قدم پر اسلام کے نام کو اس بری طرح سے غلط طور پر استعمال کیا ہو کہ قوم کے اخلاق کو مجروح کر کے رکھ دیا ہے۔ اقتدار کی رسہ کشی میں اسلام کا نام اس بری طرح استعمال کیا جاتا رہا ہے جیسے" ان بزرگوں "نے یہ لوٹ کھسوٹ اسلام ہی کے جاری کر رکھی ہے۔ ضرورت ہے کہ پاکستان کی روح کو اُجاگر کرنے کے لیے قوم روحانی طور پر اپنی اقدار کو بلند کرے۔ یہ ملک محض اس لیے حاصل کیا گیا تھا تاکہ ہم اسلامی نقطۂ نگاہ کے تحت اپنی زندگیوں کو خالص اسلامی نظام میں ڈھال کر دنیا کے روبرو پیش ہو سکیں۔ ہمیں ان وعدوں کو نبھانا ہے جو قیام پاکستان کے موقعہ پر ہم نے دنیا کے سامنے کیے تھے۔ آؤ اللہ کا نام لے کر ہم اسلام کی صحیح قدروں پر آگے بڑھیں۔"

آپ نے کہا کہ نئی تحریکیں چلانا آسان بات ہے۔ لیکن کسی بگڑی ہوئی تحریک کو واپس لانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آج ہمارے سامنے بہت ہی مشکل صورت حال ہے۔"

صدر ایوب خاں نے صحیح کہا ہے کہ انھیں آج بہت ہی مشکل صورت حال کا سامنا ہو کیونکہ کسی بگڑی ہوئی تحریک کو اس کی اصلی شکل پر واپس لانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ مگر وہ خوش قسمت ہیں کہ وہ پہلے شخص نہیں ہیں جنھیں اس قسم کی صورت حال سے سابقہ پڑا ہو۔ ان کے لیے اسلام کی تاریخ

میں عمر بن عبدالعزیزؒ کا نمونہ موجود ہو۔ جن کے ہاتھ میں تقریباً ایسے ہی حالات میں زمامِ اقتدار آئی تھی۔
عمر بن عبدالعزیزؒ کے نقشِ قدم پر چلنا تو بیشک ذرا مشکل کام ہے۔ کیونکہ اس راستہ کا سب سے پہلا قدم اپنے نفس، اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال کے عیش و آرام پر پڑتا ہے۔ لیکن یہ مرحلۂ عشق اگر کوئی طے کرلے تو پھر آگے کی ہر مشکل آسان ہے۔ یہ وہ کیمیا ہے کہ معاشرہ کی اخلاقی اور روحانی حالت چند مہینوں میں بدل کر رکھ دے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ صدر ایوب کو اس راستہ کی توفیق دے۔

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ملکیت و دیگر تفصیلات کے متعلق بیان

FORM, IV

(SEE RULE 8)

(۱) مقام اشاعت ـــــ لکھنؤ (۲) وقفہ اشاعت ـــــ ماہانہ

(۳) ایڈیٹر پرنٹر پبلشر اور مالک کا نام ـــــ محمد منظور نعمانی (۴) قومیت ـــــ ہندوستانی

(۵) پتہ ـــــ کچہری روڈ لکھنؤ

میں (محمد منظور نعمانی) بذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اعتماد کی حد تک صحیح ہیں۔

دستخط پبلشر ...... (محمد منظور نعمانی)

ـــــ یکم مارچ سنہ ۵۹ء ـــــ

قرآنی دعوت

(مسلسل)

جرأت و شجاعت!

قرآن کریم جس طرح تواضع و خاکساری اور درگزر و بردباری کی تعلیم دیتا ہے اسی طرح وہ اپنے موقع پر بہادری اور جانبازی اور جرأت و اظہار قوت کی بھی تلقین کرتا ہے. مثلاً اگر حق و باطل کا معرکہ ہو تو قرآن مجید اپنے ماننے والوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ فولادی انسانوں کی طرح پوری بہادری اور ثابت قدمی کے ساتھ جنگ کریں ——— ایک موقع پر ارشاد ہے

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا۔ (انفال ع ۶)

اے ایمان والو جب تمہارا مقابلہ (دشمن کی) کسی فوج سے ہو تو تم ثابت قدم رہو۔

ایک دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا گیا۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ٥ (صف ع ۱)

اللہ تعالیٰ اپنے اُن بندوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں صف بستہ ہوکر اور ایسے جم کر جنگ کرتے ہیں کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کرام کی اس ایمانی قوت اور شجاعت کا ذکر خاص پیار اور تحسین کے انداز میں کیا گیا ہے کہ جب ان کو مرعوب اور

دہشت زدہ کرنے کے لیے یہ خبریں پہونچائی گئیں کہ تمھارے دشمنوں نے تمھیں ختم کرنے کے لیے بڑی تیاریاں کی ہیں اور بہت سامان جنگ جمع کیا ہے۔ تو وہ بالکل مرعوب نہیں ہوئے بلکہ اس سے ان کی ایمانی قوت میں اور ترقی ہوئی اور انھوں نے کہا کہ (ہمیں ہمارا اللہ کافی ہے، ہم سب دیکھ لیں گے) ـــــ سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے۔

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ ۝ (آل عمران ع ۱۸)	ہمارے وہ صاحب ایمان بندے جن سے لوگوں نے کہا کہ (تمھارے مٹانے کے لیے) سارے لوگ جمع ہوئے ہیں اور انھوں نے بڑا سامان جمع کیا ہے، تم کو اُن سے اندیشہ کرنا چاہیے! تو اس بات نے اُن کی ایمانی کیفیت میں اور اضافہ کیا اور انھوں نے کہا ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔

اسی طرح غزوۂ احزاب میں دشمنوں کی ٹڈی دل فوجوں کو دیکھنے کے بعد اہل ایمان نے جس ایمانی جرأت وہمت اور شجاعت کا ثبوت دیا تھا اس کا ذکر بھی قرآن پاک میں بڑی تحسین کے انداز میں کیا گیا ہے ـــــ ارشاد ہوا ہے۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا ۝ (احزاب ع ۳)	اور جب دیکھا ایمان والوں نے دشمن کی فوجوں کو، تو ان کی زبان سے نکلا 'یہ تو وہی ہے جس کی ہم کو اللہ و رسول نے پہلے سے خبر دے دی تھی' اور بیشک سچ فرمایا تھا اللہ و رسول نے' اور اس سے ان کے ایمان و یقین میں اور ان کی اطاعت کی صفت میں اور ترقی ہوئی۔

اس سلسلہ میں ایک بات یہ بھی سمجھنے کی ہے کہ موت کا خوف یا کسی تکلیف یا نقصان کا اندیشہ ہی وہ چیز ہے جو جرأت وشجاعت کے راستہ میں رکاوٹ بنتی ہے اور آدمی کو بزدل بنا دیتی

ہے، قرآن مجید نے بزدلی کی اس جڑ ہی کو کاٹ دیا، جابجا فرمایا گیا ہے کہ موت کا وقت مقرر ہو اگر وہ وقت آگیا ہے تو کوئی بچا نہیں سکتا اور اگر وہ وقت ابھی نہیں آیا ہے تو کوئی مار نہیں سکتا ــــــ اسی طرح جابجا فرمایا گیا ہے کہ کسی تکلیف یا نقصان کا پہونچنا نہ پہونچنا اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ پر موقوف ہے جب تک اس کا ارادہ اور حکم نہ ہو ہمیں کوئی گزند اور نقصان کسی طرف سے نہیں پہونچ سکتا اور جب اس کا حکم ہو تو کوئی ہمیں تکلیف اور نقصان سے بچا نہیں سکتا۔ دو تین آیتیں اس سلسلہ میں بھی پڑھ لی جائیں۔ سورۂ آل عمران میں ارشاد ہو۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتَابًا مُّؤَجَّلًا (آل عمران ع ۱۵)	اور کسی کو موت آ نہیں سکتی، بغیر حکم خدا کے، لکھا جا چکا ہے، معین وقت (موت کا)

ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہے۔

اِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ (یونس ع ۵)	جب آوے گا وقت اُن کی موت کا تو نہ ایک گھڑی پیچھے رہ سکیں گے اور نہ آگے جا سکیں گے (ٹھیک مقرر وقت پر اُٹھا لیے جائیں گے۔

اسی طرح فرمایا گیا ہے۔

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (تغابن ع ۱)	کوئی مصیبت نہیں آسکتی بدون حکم خدا کے۔

اور سورۂ توبہ میں ارشاد ہے۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَا اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (توبہ ع ۷)	اے رسول آپ فرما دیجئے کہ ہمیں ہرگز کوئی مصیبت نہیں پہونچ سکتی سوائے اس کے جو اللہ نے ہمارے لیے مقدر کر دیا ہو وہ ہمارا مالک ہے اور ایمان والوں کو سب کام اسی اللہ کے سپرد کر دینے چاہئیں۔

غور کیا جائے، جس دل میں یہ تعلیم اتر جائے پھر اس میں بزدلی کے لیے کہاں گنجائش رہ سکتی ہے اور جرأت و شجاعت کی راہ میں اس کے لیے کیا رکاوٹ ہو سکتی ہے۔

وقار و خودداری :-

جرأت و شجاعت سے قریبی مناسبت رکھنے والی ایک اخلاقی صفت وہ بھی ہے جسے ہم اپنی زبان میں وقار اور خودداری کہتے ہیں، قرآن مجید اپنے ماننے والوں کو اس کی بھی ہدایت کرتا ہے کہ وہ باوقار اور خوددار ہو کر رہیں، ایسا رویہ نہ اختیار کریں کہ لوگوں کی نظروں میں ذلیل و خوار ہوں، حتیٰ کہ اگر کسی وقت ناداری اور حالات کی ناسازگاری سے نوبت فقر و فاقہ کی بھی آجائے تو بھی اپنے اس حال کو جہاں تک ہو سکے دوسروں پر ظاہر نہ ہونے دیں، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں سورۂ بقرہ میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے۔

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ (البقرہ ع ۳۷)	ناواقف آدمی ان کی بے سوالی کی وجہ سے ان کو آسودہ حال سمجھے گا، تم پہچان سکتے ہو ان کو ان کے چہرہ کی خاص کیفیت سے۔

اور سورۂ فرقان میں جہاں اللہ کے خاص مقبول بندوں کے امتیازی اخلاق و اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے وہاں ان کا ایک وصف یہ بھی بیان فرمایا گیا ہے۔

وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝ (فرقان ع ۶)	اور جب ان کا گزر ہوتا ہو لوگوں کی بیہودہ باتوں پر تو وہ باوقار شریفوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔

الغرض اپنے ماننے والوں کو قرآن مجید کی ہدایت ہے کہ ان کا رویہ ایسا ہی خودداری اور وقار کا ہونا چاہیے۔

حیا اور عفت :-

شرم و حیا اور عفت و پاکدامنی بھی ان اخلاق میں سے ہے جن پر قرآن مجید نے خاص

طور سے زور دیا ہے اور اُس کی ضد بے حیائی اور اخلاقی آلودگی سے جس کے لیے جامع لفظ قرآن مجید میں "فاحشۃ" اور "فحشا" کا استعمال کیا گیا ہے) بچنے کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ بلکہ منہیات ومحرمات کے بیان میں کئی جگہ پہلے نمبر پر اسی کا ذکر کیا گیا ہے ــــ مثلاً سورۂ نحل کی اُس آیت میں جو مختصر ہونے کے باوجود قرآن مجید کا ایک جامع ہدایت نامہ ہے (اور اسی وجہ سے جمعہ وغیرہ کے خطبوں کے آخر میں عام طور سے اس کو پڑھا جاتا ہے۔) ارشاد فرمایا گیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو عدل وانصاف اور احسان وغیرہ مکارم اخلاق کا حکم دیتا ہے ــــ اور

وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝ (النحل ع ۱۳)	منع فرماتا ہے بے حیائی سے اور عام برائی سے اور ظلم و زیادتی کرنے سے، اللہ تعالیٰ تم کو یہ نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔

اسی طرح سورۂ اعراف میں جہاں بنیادی محرمات کا ذکر فرمایا گیا وہاں بھی سب سے پہلے نمبر پر "فواحش" ہی کا نام لیا گیا ہے، ارشاد ہے۔

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ (اعراف ع ۴)	اے رسول آپ لوگوں کو فرمایئے کہ میرے رب نے حرام کردیا ہو سب بیحیائی کی باتوں کو جو ان میں سے علانیہ ہوں اور جو چھپی ہوں (یعنی بے حیائی کی یہ باتیں علانیہ کرنا بھی حرام ہیں اور پردہ میں بھی) اور اسی طرح اللہ نے حرام کیا ہے گناہ کو اور ناحق ظلم و زیادتی کو اور اس بات کو کہ

تم شریک کرو اس کے ساتھ کسی بھی ہستی کو جس کی اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری، اور یہ کہ تم اللہ کے متعلق وہ بات کہو جس کا تمھیں (کسی صحیح ذریعہ سے) علم نہیں ہو۔

ان دونوں آیتوں میں اور ان کے علاوہ بھی جن آیتوں میں بے حیائی کی باتوں (فحشاء

یا فاحشہ یا فواحش) کی ممانعت فرمائی گئی ہے تو یہ ممانعت دراصل نہی کی شکل میں حیا اور عفت کا امر و حکم ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید نے ان باتوں سے بھی منع فرمایا ہے جو بذاتِ خود اگرچہ بے حیائی کی باتیں نہیں ہیں، لیکن ان سے بے حیائی اور اخلاقی آلودگی کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر حکم دیا گیا ہے کہ نامحرم مردوں اور عورتوں کا جب سامنا ہو جائے تو دونوں نگاہیں نیچی کر لیا کریں، ایک دوسرے کی طرف نہ دیکھیں ــــ سورۂ نور میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ

(نور۔ ع ۴)

اے رسول آپ ایمان والوں کو حکم دیجئے کہ (جب نامحرم عورتوں کا سامنا ہو تو) وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزگی کی بات ہے، اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اور کریں گے اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے ــــ اور (اسی طرح) ایمان والی ہماری بندیوں کو آپ حکم سنا دیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

خود آیت کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ آنکھوں پر یہ پابندی حیا اور عفت و عصمت کی حفاظت ہی کے لیے لگائی گئی ہے۔ بلکہ پردہ سے متعلق سارے احکام کی اصل نوعیت یہی ہے کہ وہ حیا، اور عفت و عصمت کی حفاظت کے لیے دیے گئے ہیں ــــ سورۂ احزاب میں جہاں یہ حکم دیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گھر والیوں سے جب کوئی چیز مانگنی ہو تو پردہ کی اوٹ سے مانگا کرو (وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ[1]) تو وہیں اس کی حکمت اور وجہ یہ بیان فرمادی گئی ہے۔

---

[1] یہ آیت اگرچہ اپنے سیاق کے لحاظ سے ازواج مطہرات سے متعلق ہے لیکن حکم عام ہے ۱۲۔

ذَالِکُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِکُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ
(احزاب ع ۷)

یہ طرز عمل تمھارے اور ان کے دلوں کو زیادہ پاک رکھنے والا ہے۔

نیز اسی سورۂ احزاب میں جن ایمانی اخلاق و اوصاف رکھنے والے مرد اور عورتوں کو مغفرت اور اجر عظیم کی بشارت سُنائی گئی ہے اُن میں سے ایک وصف یہ پاکدامنی بھی ذکر فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝
(احزاب ع ۵)

اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں، اور اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد اور اسی طرح کثرت سے اس کا ذکر کرنے والی عورتیں! اللہ تعالیٰ نے ان سب کے لیے مغفرت کا فیصلہ فرما رکھا ہے، اور اجر عظیم کا سامان تیار کیا ہے۔

اسی طرح سورۂ مومنون اور سورۂ معارج میں اللہ کی رحمت اور جنت کے مستحق مومنین کے جن امتیازی اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے، اُن میں اُن کی عفت اور پاکدامنی بھی ہے، دونوں جگہ الفاظ بالکل یکساں ہیں، ارشاد ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝
(مومنون ع ۱۔ معارج ع ۱)

اور وہ بندے جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ (یعنی وہ جنت کے وارث ہوں گے اور جنت میں ان کا بڑا اعزاز و اکرام ہوگا)

بہر حال قرآن مجید کی تعلیم کے مطابق حیا و عفت بھی ان خاص ایمانی اوصاف میں سے ہیں جن سے انسانوں کی نجات و فلاح کا مسئلہ وابستہ ہے۔

طہارت و پاکیزگی

اخلاق و آداب ہی کے سلسلہ کی قرآن مجید کی ایک تعلیم یہ بھی ہے کہ ہر قسم کی نجاست اور

گندگی سے اپنے کو پاک صاف رکھا جائے۔ سورۂ مدثر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنا کر ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ (مدثر۔ ع ۱)

اور اپنے کپڑے بھی) پاک صاف رکھو، اور ہر طرح کی گندگی اور میل کچیل سے دور رہو۔

اور سورۂ توبہ میں اصحاب نبیؐ کے ایک خاص طبقہ کی صفائی پسندی اور اس کے خاص اہتمام کا ذکر فرما کر ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (توبہ۔ ع)

اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو خوب پاک صاف رہتے ہیں اور اس کا اہتمام کرتے ہیں۔

اور سورۂ بقرہ میں ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ۔ (بقرہ ع ۲۸)

اللہ تعالےٰ محبت رکھتا ہے توبہ کرنے والے اور پاک صاف رہنے والے بندوں سے۔

گویا طہارت و پاکیزگی ان اوصاف میں سے ہے جن کی وجہ سے بندہ اللہ کی محبوبیت کا مستحق ہو جاتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنَا مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ!

نیا طوفان اور اس کا مقابلہ

دعوت ایمان کی تجدید

(از، مولانا ابو الحسن علی ندوی)

ترجمہ ——— عتیق الرحمن سنبھلی

گذشتہ صحبت میں اس سوال پر روشنی ڈالی گئی تھی کہ عالم اسلامی میں ان ملحدانہ مغربی فلسفوں کا سکہ کیونکر رواں ہوا جو تعلیمات انبیاء اور شرائع سماویہ سے براہ راست متصادم ہیں اور ان کے اثر سے آج دنیائے اسلام کے تعلیم یافتہ طبقہ میں زندقہ والحاد ——— بلکہ صاف الفاظ میں ارتداد کا سیلاب کس طرح اُمنڈ رہا ہے؟ جس میں مشرق و مغرب اور عرب و عجم کی کوئی تفریق نہیں۔

اب تک کی گفتگو زیادہ تر بنیادی عقائد ——— ایمان باللہ، ایمان بالرسل، ایمان بالغیب اور ایمان بالآخرت وغیرہ ——— کے پہلو سے رہی، اور بلاشبہ یہی پہلو سب سے زیادہ اہم ہے اور کفر و ایمان اور زندقہ و اسلام کے درمیان یہی حدِّ فاصل ہے۔ لیکن اسکے علاوہ ان فلسفوں کے اثرات کے کچھ اور بھی پہلو ہیں اور ضرورت ہے کہ وہ بھی سامنے آجائیں۔ تاکہ موجودہ عالم اسلام کی تصویر مکمل ہو سکے۔

ان فلسفوں نے جہاں ایک طرف عقائد اور اخلاقی قدروں کو مجروح کیا ہے وہاں ان جاہلی جذبات و احساسات کی تخم ریزی بھی دنیائے اسلام میں کی ہے جن سے اسلام نے کھل کر جنگ کی تھی اور جن پر پیغمبر اسلام نے پوری قوت سے چوٹ لگائی تھی۔ مثال کے طور پر عصبیتِ جاہلیہ کو لیجئے جو نسل، وطن یا قومیت کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے پھر اسکی اسقدر تقدیس کی جاتی ہے، اس طرح اس پر جان دی جاتی ہے اور انسانی برادری کو اسکی بنیادوں پر تقسیم کرنے میں اتنا غلو پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ (عصبیت) ایک مستقل عقیدہ اور ایک مستقل دین

بن جاتی ہے، دل و دماغ پر اس طرح اس کا قبضہ ہوجاتا ہے کہ ساری زندگی کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ یہ اپنی ہمہ گیری، اپنی طاقت اور اپنے اثرات کی گہرائی اور مضبوطی کے لحاظ سے بلاشبہ دین و مذہب کی حریف ہے۔ اور اسکی گرفت انسان کی پوری زندگی پر ہوتی ہے۔ یہ جب کسی معاشرہ پر چھا جاتی ہے تو انبیاء علیہم السلام کی کوششوں اور کارناموں پر پانی پھر جاتا ہے۔ اور دین، عبادات اور چند رسوم و رواج کے دائرے میں محدود ہوکر رہجاتا ہے جو پوری زندگی پر فرمانروائی کے لیے آیا تھا۔ پھر اسکے نتیجہ میں عالم انسانیت چند متحارب کیمپوں میں تقسیم ہوجاتا ہے اور وہ " اُمت واحدہ " جس کے متعلق پروردگار عالم کا ارشاد ہوا تھا وَإِنَّ هٰذِهٖ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ۔ پارہ پارہ ہوکر بے شمار اُمتوں میں بٹ جاتی ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عصبیتِ جاہلیہ کے خلاف پوری شدّت سے جنگ کی تھی۔ اسکے بارے میں اپنی امت کو صاف الفاظ میں آگاہی دی تھی، اور ہر اُس بنیاد پر تیشہ چلایا تھا جس سے یہ اُبھر سکتی ہے، اور اس باب میں یہ رویہ ضروری بھی تھا۔ اسلئے کہ ان عصبیّتوں کے ساتھ ایک عالمی دین کے قیام کا کوئی امکان نہیں تھا اور امتِ واحدہ کی وحدت چار دن بھی سلامت نہیں رہ سکتی تھی۔ اس عصبیت کی مذمّت اور اسکی تردید شریعتِ اسلامیہ میں ایک مسلّم حقیقت ہے۔ بے شمار نصوص ہیں جو اس بات کو ظاہر کرتے ہیں، بلکہ اسلام کا اس عصبیت سے بُعد ایک بدیہی چیز ہے۔ جو شخص اسلام کے مزاج سے، بلکہ مطلق دینی مزاج ہی سے واقف ہوگا اس پر یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ یہ مزاج ان عصبیتوں کے ساتھ جوڑ نہیں کھاتا، سیاسی رجحانات و خیالات سے خالی الذہن ہوکر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ بین الانسانی تفریق اور عالم انسانیت کی تباہی و تخریب میں جو عوامل کار فرما رہے ہیں اُن میں ان جاہلی عصبیتوں کا درجہ بہت اونچا ہے پس قدرتی بات ہے کہ جو انسان اس لیے آیا ہو کہ پوری دنیا کو ایک اکائی بنائے، جو اس لیے آیا ہو کہ تمام نوعِ انسانی کو ایک جھنڈے کے نیچے اور ایک عقیدے پر جمع کرے، جو اس لیے آیا ہو کہ ایک نیا معاشرہ وجود میں لائے، جو دین اور ایمان برب العالمین کی بنیادوں پر استوار ہو۔

جو اس لیے آیا ہو کہ خارزار عالم میں امن و سلام کے پھولوں کی سیج بچھائے جو اسلیئے آیا ہو کہ انسانیت کے پورے خاندان کو محبت و الفت کی ایک لڑی میں پرودے۔ جو اس لئے آیا ہو کہ انھیں باہم شیر و شکر کر کے اس طرح یک جان بنا دے کہ ایک کو دکھ ہو دوسرا بھی تڑپے ــــ اس مشن کے حامل انسان کے لیے تو بالکل قدرتی اور بالکل عقلی بات ہے کہ ــــ وہ اِن نسلی، قومی اور وطنی عصبیتوں کے خلاف کھلا اعلانِ جنگ کرے اور اس انتہائی حد تک انکے خلاف لڑے کہ یہ قصہ ماضی بن کر رہ جائیں۔

لیکن یورپ کے سیاسی اور ثقافتی غلبہ کے بعد سے دنیائے اسلام، اسی دنیائے اسلام کا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے وجود میں آئی حال یہ ہے کہ وہ انھیں عصبیتوں کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دے رہی ہے۔ اور اس طرح انھیں ماننے لے رہی ہے جیسے کوئی علمی نظریہ اور کوئی حقیقت ثابتہ ہو جس سے مفر نہو۔ آج اس دنیائے اسلام کا حال یہ ہے کہ اس میں بسنے والی تمام قومیں حیرت انگیز حد تک اِن عصبیتوں کو زندہ کرنے اور اُن کے گن گانے کی طرف راغب ہیں جن کو اسلام ہی نے موت کے آغوش میں سُلا یا تھا ــــ حتیٰ کہ ان عصبیتوں کے اُن شعائر کے احیاء کا جذبہ بھی آج موجزن ہے جو کھلی ہوئی بت پرستی کا مظہر ہیں ــــ ان عصبیتوں کے اس عہدِ قبلِ اسلام کو سرمایہ افتخار گردانا جا رہا ہے جسے اسلام "جاہلیت" اور صرف جاہلیت کا نام دیتا ہے ــــ اور یہ وہ لفظ ہے جس سے زیادہ وحشت اور نفرت انگیز کوئی دوسرا لفظ اسلام کی لغت میں موجود نہیں ــــ جس سے نجات پانے کو، قرآن مسلمانوں پر اپنا احسان ٹھیراتا ہے اور تلقین کرتا ہے کہ مسلمان اس نعمت کا شکر ادا کریں۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ	اور یاد کرو، احسان اللہ کا، اپنے اوپر،
اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ	جب کہ تھے تم آپس میں دشمن۔ پس الفت
بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ	ڈالی اس نے تمھارے دلوں میں، سو اب
بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ	ہو گیے تم اس کے فضل سے بھائی بھائی،
عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ	اور تم تھے کنارے پر ایک آگ کے گڑھے
فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔	کے، تو اس سے تم کو نجات دی۔

(آل عمران آیت ۱۰۳)

بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ
هَدٰىكُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ
كُنْتُمْ صَادِقِیْنَ

بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اُس
نے راہ دی تم کو ایمان کی،
اگر سچ کہو۔

(الحجرات آیت ۱۷)

وَهُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی
عَبْدِهٖ آیٰتٍ بَیِّنٰتٍ لِیُخْرِجَكُمْ
مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ
وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ
الرَّحِیْمٌ۔

وہی ہے جو اتارتا ہو اپنے بندے
پر صاف آیتیں کہ نکال لائے تم کو
اندھیروں سے اجالے میں۔ اور
اللہ تم پر نرمی کرنے والا، مہربان
ہے۔

(الحدید ۹)

اس کے بعد تو ایک مومن کا حال یہ ہونا چاہئیے کہ "جاہلیت" کا —— چاہے وہ قریب العہد ہو یا بعید العہد) —— جب بھی ذکر زبان پر آئے حقارت اور نفرت کے ساتھ آئے اور ہر بُن مو سے ناگواری کے جذبات ٹپکنے لگیں۔ آپ نے کسی قیدی کو دیکھا ہے کہ رہائی پانے کے بعد وہ اپنے دورِ قید و محن کو یاد کرے اور اس کا رُواں رُواں ناگواری سے پھکنے نہ لگے؟ کیا کسی مہلک و موذی مرض سے صحت پانے والے کو آپ نے دیکھا ہے کہ اُسے اپنی بیماری کے ایّام و احوال کو یاد آئیں اور اس کا دل افسردہ اور رنگ متغیر نہ ہو؟ اور کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ رات کو ڈراؤنے اور پریشان کن خواب دیکھنے والا صبح کو ان خوابوں کو یاد کرے اور خدا کا شکر نہ ادا کرے کہ یہ محض اوہام و خیالات تھے؟ —— پھر جب قیدی اپنے دورِ قید و محن کو خوشی سے یاد نہیں کرتا، جب صحت یافتہ مریض کے لئے اپنے ایّامِ کرب کی یاد خوشگوار نہیں ہوتی اور جب بُرے خوابوں کو یاد کر کے شکر ہی ادا کرنے کو جی چاہتا ہے کہ یہ خواب بس خواب ہی رہے —— تو جاہلیت تو ان سب سے بدتر شئے ہے۔ جو جہل و ضلالت کے بدترین اقسام پر مشتمل ہو اور دنیا و آخرت کے کتنے ہی نقصانات اور مضرات اس میں پنہاں ہیں۔ اس کی یاد پر تو سزا وار ہے کہ آدمی کو شدید سے شدید تر ناگواری ہو اور بے اختیار شکر ادا کرنے کو جی چاہے کہ اس کے دن بیت گئے

اور خدا نے اس تاریکی سے نجات دی ـــــ اسی لیے تو حدیث صحیح میں آتا ہے۔

ثلث من کنّ فیہ وجد	تین باتیں ہیں، یہ جس میں پائی جائیں گی
حلاوۃ الایمان ان یکون	اسے ایمان کا ذائقہ نصیب ہوگا۔
اللہ ورسولہ احبّ الیہ	ایک یہ کہ اللہ و رسول ہر شئی سے زیادہ
مما سواھما و ان یحبّ المرء	محبوب ہوں۔ دوسرے یہ کہ آدمی اگر
لا یحبّہ الا للہ وان یکرہ	کسی سے محبت کرتا ہو تو صرف اللہ کے
ان یعود الی الکفر کما یکرہ	لیے کرتا ہو۔ تیسرے یہ کہ کفر کی طرف لوٹنا
ان یقذف فی النار	اتنا شاق ہو جیسے کہ آگ میں ڈالدیا
(رواہ البخاری)	جانا۔

اور خداوند قدوس جاہلیت کے شعائر اور جاہلی رجال و اکابر کی مذمت کرتے ہوئے بے لاگ اور بے رو رعایت انداز میں فرماتا ہے۔

وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَدْعُونَ	اور کیا ہم نے اُن کو (اہل دوزخ کا)
إِلَى النَّارِ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ	پیشوا کہ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف۔ نہ
لَا يُنْصَرُونَ ۝ وَأَتْبَعْنَاهُمْ	ملے گی کوئی مدد ان کو قیامت کے دن،
فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً	اور پیچھے رکھ دی ہو ان کے ہم نے اس
وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ هُمْ	دنیا میں لعنت۔ اور قیامت کے
مِنَ الْمَقْبُوحِينَ ۝	دن ہوگی ان پر برائی۔
(قصص آیت ۴۲)	

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَمَا أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ	اور نہیں تھی بات فرعون کی کچھ
يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ	نیک ڈھنگ کی۔ آگے ہوگا اپنی قوم کے
فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ وَبِئْسَ	قیامت کے دن۔ پھر پہنچا دے گا انکو
الْوِرْدُ الْمَوْرُودُ وَأُتْبِعُوا	آگ پر۔ بُرا گھاٹ ہے جس پر پہنچے۔

فی هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ۔ (ہود آیت ۹۹)	پیچھے سے ملتی رہی اس دنیا میں لعنت اور دن قیامت کے بھی بُرا انعام ہے جو ملا۔

لیکن بہت سے اسلامی ملکوں اور مسلمان قوموں کا حال اس وقت یہ ہے کہ وہ صرف مغربی فلسفوں اور اہل مغرب کے طرز فکر سے مرعوبیت کے ماتحت اپنے قبل اسلام کے عہد اور اس عہد کی تہذیب و رسوم کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں۔ ان میں اس عہد سے دلی لگاؤ سا پیدا ہوتا جا رہا ہے، ان میں خواہش پیدا ہو رہی ہے کہ اس عہد کے شعائر کو زندہ کریں اور اس کے ہیروؤں، بادشاہوں اور ناموروں کو تاریخ کی زندۂ جاوید ہستیوں میں جگہ دلا دیں۔ گویا یہ ان کا کوئی زریں دور تھا اور کوئی نعمت تھی جو اسلام نے ان سے چھین لی ـــــ العیاذ باللہ! یہ کیسی کھلی ناشکری اور اسلام اور پیغمبر اسلام کی کیسی ناقدری ہے! ـــــ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کفر و بت پرستی کی شناعت دلوں سے نکل گئی ہے اور جاہلی خرافات سے کوئی نفرت باقی نہیں رہ گئی ـــــ اور یہ وہ باتیں ہیں کہ ایک باشعور مسلمان کے متعلق ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان پر تو اگر ایمان سلب ہو جائے، اسلام کی دولت سے محروم کر دیا جائے اور اللہ کی رحمت کے بجائے اس کا عتاب سامنے آ جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ـــــ قرآن نے آگاہ کیا ہے :-

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ۔	اور مت میلان رکھو ان لوگوں کی طرف جنھوں نے ظلم (شرک) کیا۔ ورنہ کہیں تم کو بھی آگ نہ پکڑ لے۔ اور نہ نکلے اللہ کے علاوہ تمہارا کوئی مددگار۔ پھر نہ ہو سکے تمھاری کوئی مدد۔

ان عصبیتی رجحانات کے علاوہ ایک اور فتنہ بھی ہے جس سے آج کا عالم اسلام دوچار ہے۔ اور وہ ہے اونچے طبقوں میں، آنکھیں بند کر کے مادیات کے پیچھے پڑنے کا رجحان، کہ

ہر عقیدہ اور ہر قدر اس پر قربان۔ دوسرے الفاظ میں دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کا رجحان، زمینی زندگی پر فریفتگی اور نفس پرستی کا رجحان: اور پھر اس کے نتیجہ میں جو کچھ ہوا کرتا ہے، یعنی اخلاقی بے راہ روی، محرمات الٰہیہ کا استخفاف، فسق و شراب کا شیوع و عموم، اور اسلامی فرائض و قیود سے اس طرح کلی آزادی جیسے اس طبقہ کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں، یا اسلامی شریعت منسوخ ہو چکی ہے ——— اور وہ کوئی داستانِ پارینہ اور قصہ و افسانہ ہے۔ دنیائے اسلام کے تمام ملکوں کے اونچے طبقہ کا یہ وہ حال ہے کہ باستثنائے شاذ کہا جا سکتا ہو، جس ملک میں جائیے گا اس طبقہ کو اسی رنگ میں پائیے گا — گویا ایک ہی تصویر ہے جس کی مختلف کاپیاں کر دی گئی ہیں۔

یہ ہے اجمال کے پیرایہ میں آج کے عالم اسلامی کی ذہنی اور اعتقادی تصویر! اس تصویر میں جو کچھ نظر آتا ہے، میرے نزدیک یہ جاہلیت کی ایک موج ہے جو اسلام کا سارا سرمایہ بہائے لیے جا رہی ہے۔ دنیائے اسلام کو اپنی پوری تاریخ میں اس سے زیادہ سرکش موج سے سابقہ نہیں پڑا ہے، نہ اس جیسی طاقتور مخالف موج کا سامنا عالم اسلامی کو کبھی ہوا ہے۔ اور نہ اس جیسی ہمہ گیر موج کا۔ اور پھر اس کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اسکی ہلاکت خیزیوں پر چونکنے والے کم، اور وہ تو کم سے بھی کم تر ہیں جو سب کچھ چھوڑ چھاڑ اور اپنی ساری قوتوں کا سرمایہ لے اسکے مقابلہ پر ڈٹ گئے ہوں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ماضی میں یونانی فلسفہ کے اثر سے جونہی الحاد زندقہ پھیلنا شروع ہوا فوراً ایسی ہستیاں سامنے آکھڑی ہوئیں جنھوں نے اپنے علمی تبحر، عظیم عقلیت، نادرۂ روزگار ذکاوت اور قوی شخصیت کے سارے ہتھیاروں سے اس کے خلاف جنگ کی۔ ایسے ہی باطنیت اور ملاحدہ کی جماعت کا ظہور ہوا تو اس کے مقابلہ میں بھی علم و حکمت اور دلیل و برہان کی تلواریں لے کر اسلام کے سرفروش میدان میں آکودے۔ چنانچہ اسلام ان بر وقت نصرتوں کی بنا پر، علمی اور عقلی اعتبار سے ایسی مضبوط پوزیشن میں رہا کہ مخالفت کی موجیں اٹھتیں اور سر ٹکرا کر واپس چلی جاتیں، سیلاب کے ریلے آتے اور بے اثر ہو کر گزر جاتے۔ آج دنیائے اسلام کا اولین مسئلہ اخلاقی انحطاط کا نہیں ہے۔ اور نہ عبادات و نوافل

میں تساہل، ترک شعائر، اور تقلید اغیار، آج کے بنیادی مسائل ہیں۔ بے شک یہ مسائل نہایت اہم ہیں اور سعی و توجہ کے پورے مستحق ـــــ لیکن عالم اسلامی کا وہ مسئلہ جو طوفان بن کر کھڑا ہوا ہے اور اسلام کی ہستی اس کی زد میں آگئی ہے، کفر و ایمان کا مسئلہ ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اسلامی دنیا اسلام پر قائم رہے گی یا اس کا قلادہ اپنی گردن سے اتار دیگی؟ اسلامی دنیا میں آج ایک معرکہ برپا ہے جس میں ایک طرف مغرب کا فلسفۂ لادینیت ہے، دوسری طرف اسلام ـــــ خدا کا آخری پیغام! ـــــ ایک طرف مادیت ہے اور دوسری طرف آسمانی شریعت! میں سمجھتا ہوں کہ یہ دین اور لادینیت کا آخری معرکہ ہے۔ اور اسکے بعد دنیا دونوں میں سے کسی ایک رخ کو اختیار کرلے گی۔

آج کا جہاد، آج کی خلافت نبوت اور آج کی سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ لادینیت کی اس طوفانی موج کا مقابلہ کیا جائے۔ نہیں! بلکہ آگے بڑھ کر اس کے قلب و مرکز پر حملہ کیا جائے۔ جو عالم اسلام کی جڑیں کھود رہی ہے۔ آج کی خلافت نبوت یہ ہے کہ امت کے نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلام کے اساسات و عقائد، اسکے نظام و حقائق اور رسالت محمدی پر وہ اعتماد واپس لایا جائے جس کا رشتہ اس طبقہ کے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے؛ آج کی سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ اس فکری اضطراب اور ان نفسیاتی الجھنوں کا علاج بہم پہنچایا جائے، جن میں آج کا تعلیم یافتہ نوجوان بری طرح گرفتار ہے، اور اسکی عقلیت اور علمی ذہن کو اسلام پر پوری طرح مطمئن کر دیا جائے۔ آج کا سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ جاہلیت کے وہ بنیادی افکار جو دل و دماغ میں گھر کر گئے ہیں ان سے علم اور عقل کے میدانوں میں نبرد آزمائی کی جائے، یہانتک کے اسلام کے اصول و مبادی پورے ایمانی جذبات کے ساتھ ان کی جگہ لے لیں!

کامل ایک صدی گزرتی ہے کہ یورپ ہمارے نوجوان اور ذہین طبقے پر چھاپے مار رہا ہے۔ شک والحاد، نفاق و ارتیاب کا ایک طوفان ہے جو اس نے ہمارے دل و دماغ میں برپا کر رکھا ہے۔ غیبی اور ایمانی حقائق پر اعتماد متزلزل ہو رہا ہے۔ اور سیاست و اقتصاد کے مادہ پرستانہ نظریات اس جگہ پر قابض ہو رہے ہیں ـــــ کامل ایک صدی سے

یہ اکھیڑ پچھاڑ ہو رہی ہے ــــ لیکن ہمیں اس کے مقابلہ کی کوئی فکر نہیں ہوئی۔ ہم اپنے اسلاف کی علمی میراث پر تکیہ کئے بیٹھے رہے۔ اور اس کی کوئی پروا نہیں کی کہ وقت کے تقاضوں کے مطابق اس ترکہ پر اضافے کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔ ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوئی، کہ یورپ کے اِن فلسفوں کو سمجھیں اور پھر اِن کا علمی محاسبہ بلکہ سرجنوں کی طرح ان کا پوسٹ مارٹم کریں۔ ہمارا سارا وقت سطحی بحثوں کی نذر ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اس صدی کے آخر میں ہمارے سامنے، گویا یکایک، یہ منظر آیا کہ ایمان و عقیدہ کی دنیا متزلزل ہے اور ایک ایسی نسل تیار ہو کر برسر اقتدار آچکی ہے جو نہ اسلام کے عقائد و مبادی پر ایمان رکھتی ہے، نہ اسلامی جذبات اور اسلامی حمیت رکھتی ہے۔ اور نہ اس کا کوئی علاقہ اپنی مومن و مسلم قوم سے اسکے سوا ہے کہ قومیت کے خانہ میں اس کا شمار بھی مسلمانوں میں ہوتا ہے۔ یا اگر کچھ تعلق ہے تو وہ محض سیاسی مصالح کی حد تک! بس اسکے سوا کوئی تعلق نہیں! ــــ اور اب اس سے بھی آگے بڑھ کر صورت حال یہ ہے کہ یہ لادینی مزاج اور لادینی اندازِ فکر ادب و ثقافت اور صحافت و سیاست کے راستہ سے جمہور تک پہنچ چکا ہے۔ اور مسلمان قوموں کے سر پر عمومی پیمانہ کی لادینیت کا خطرہ منڈلا رہا ہے ــــ خاکم بدہن! وقت کی رفتار وہ وقت قریب لا رہی ہے کہ اسلام کو زندگی کے میدان سے قطعاً بے دخل کر کے رکھ دیا جائے۔

میں اپنے گذشتہ صحبت کے یہ الفاظ پھر دہراتا ہوں، کہ "یہ وقت عالم اسلام میں ایک نئی اسلامی دعوت کا متقاضی ہے۔ اس دعوت اور جد و جہد کا نعرہ اور نشانہ ہو" الی الایمان من جدید! ــــ آؤ پھر سے اسلام پر ایمان پیدا کرو! ــــ لیکن تنہا نعرہ کافی نہیں ہے۔ اس میں پہلے وہ نفسیاتی راستہ سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے جس سے عالم اسلام کے موجودہ برسر اقتدار طبقہ کے دل و دماغ تک پہنچا جاسکے اور اُسے اسلام کی طرف لوٹایا جاسکے۔"

میں پھر کہتا ہوں کہ "آج عالم اسلام کو ایسے مردان کار کی ضرورت ہے جو صرف اسی دعوت کے ہو رہیں۔ اپنا علم، اپنی صلاحیتیں اور اپنا مال و متاع اسکے لیے وقف کر دیں، کسی جاہ و منصب یا عہدہ و حکومت کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھیں۔ کسی کے لیے ان کے دل میں کینہ و عداوت نہو۔ فائدہ پہنچائیں، مگر خود فائدہ نہ اٹھائیں۔ دینے والے ہوں، لینے والے نہ ہوں۔ جو طبقہ جس چیز کے لیے

کرتا ہوا اس کو اسی کے لیے چھوڑ دیں حتیٰ کہ ان پر کوئی تہمت نہ لگائی جا سکتی ہو اور شیطان ان کے خلاف کوئی ہتھیار فراہم کر کے نہ دے سکتا ہو۔ اخلاص انکا شعار ہو اور نفس پرستی، خود پسندی، اور ہر قسم کے عصبیت سے بالاتری ان کا امتیاز!

اور اس پر یہ اضافہ کرتا ہوں کہ آج ایسے علمی ادارے اور اکیڈمیاں بھی عالم اسلام کی بڑی اہم ضرورت ہیں، جو ایسا طاقتور نیا اسلامی ادب پیدا کریں جو ہمارے تعلیمیافتہ نوجوانوں کو دوبارہ کھینچ کر اسلام ــ وسیع معنیٰ میں اسلام ــ کی طرف لاسکے۔ جو انھیں مغرب کے ان فلسفوں کی ذہنی غلامی سے نجات دلا سکے، جنھیں اِن میں سے کچھ نے سوچ سمجھ کر اور زیادہ تر نے محض وقت کی ہوا سے متاثر ہو کر حرزجان بنا لیا ہے ــــ وہ ادب ــــ جو ان کے دماغوں میں از سرِ نو اسلام کی بنیادیں اٹھائے اور قلب و روح کی غذا بنے ــــ اس کام کے لیے عالم اسلام کے ہر گوشہ میں آج ایسے ارباب عزیمت درکار ہیں جو معرکہ کے اختتام تک اس علمی محاذ پر جمے رہیں۔

میں اپنے بارے میں صراحت کے ساتھ بتا دینا چاہتا ہوں کہ زندگی کے کسی لمحے اور کسی وقفے میں بھی میں ان لوگوں میں نہیں رہا ہوں جو دین و سیاست کی تفریق کے قائل ہیں۔ نہ میں ان لوگوں میں ہوں جو دین کی ایسی تعبیر کرتے ہیں جس سے وہ زندگی کے ہر نظام اور حالات کے ہر سانچہ میں خواہ وہ اسلام سے کتنا ہی ہٹا ہوا ہو، فٹ ہو جائے، اور ہر رنگ کی سوسائٹی میں جڑ جائے۔ اور نہ میرا تعلق کبھی اس گروہ سے رہا ہے جو سیاست کو قرآن کے شجرۂ ملعونہ ــــــــ "الشجرة الملعونة فی القرآن" ــــــــ کا مصداق سمجھتا ہو۔ میں ان لوگوں کی اگلی صف میں ہوں جو مسلمان قوموں میں صحیح سیاسی شعور کے داعی ہیں اور ہر اسلامی ملک میں صالح قیادت کو بروئے کار دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں ان لوگوں میں ہوں جن کا اعتقاد ہے کہ دینی معاشرہ اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک دین کو اقتدار حاصل نہ ہو اور حکومت کا نظام اسلامی بنیادوں پر استوار نہ ہو۔ میں اس کا داعی ہوں اور زندگی کے آخری سانس تک رہوں گا۔

لیکن بات ترتیب اور تقدیم و تاخیر کی ہے، دینی حکمت اور دینی تفقہ کی ہے۔ اور سوال حالات کے تقاضہ کا ہے، اب تک ہماری کوششیں اور ہماری صلاحیتیں، ہمارے وسائل اور ہمارے اوقات سیاسی اور تنظیمی تحریکات کی نذر ہوتے رہے ہیں۔ اور یہ ساری جہد و حرکت

اس مفروضہ پر رہی کہ قوم میں پورا پورا ایمان ہے۔ اور قوم کی قیادت ــــ جو لامحالہ تعلیم یافتہ طبقہ ہی سے ہوتی ہے ــــ وہ بھی پوری طرح مسلمان ہے، اسلام کے عقائد و مبادی پر اس کا ایمان ہے۔ اسلام کی سربلندی کے لیے اُس کے دل میں جوش و جذبہ ہے اور حدود و احکام کے نفاذ کے لئے بھی وہ تیار ہے۔ حالانکہ بات برعکس ہے۔ قوم کا حال یہ ہے کہ ایمان میں ضعف اور اخلاق میں انحطاط آچکا ہے لیکن اسکا نہیں پتہ ہوا نہ خود قوم کو شعور ہوا۔ تعلیم یافتہ اور اونچے طبقہ کا حال یہ ہے کہ مغربی فلسفوں اور ریاست و اقتدار کے اثر سے، بیشتر افراد میں عقیدہ گویا گھل چکا ہے بلکہ بہتوں کا حال تو یہ ہو چکا ہے کہ اسلامی عقیدہ سے کھلے باغی اور مغربی فلسفوں اور ان فلسفوں کے لائے ہوئے افکار و عقائد پر دل کی گہرائیوں سے ایمان۔ ان کے لئے دنیا سے لڑجانے کا جوش و ولولہ اور ان کی نشر و اشاعت کا جنون۔ یہ فکر کہ زندگی کا نظام ان فلسفوں کی روشنی اور ان کی دی ہوئی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ اور یہ کوشش کہ پوری قوم کو اس لادینیت سے مانوس کیا جائے۔ یہ ہے اس طبقہ کے بہت سے افراد کا ذہنی حال۔ پھر عمل کے میدان میں بعض جلد باز ہیں اور بعض تدریج کے قائل ــــ بعض اس لادینی رجحان کو طاقت کے زور سے قوم پر ٹھونس دینا چاہتے ہیں اور بعض قوم کو اس شیشہ میں خوبصورتی کے ساتھ اتارنے کی راہ پر گامزن ہیں۔ مگر منزل سب کی ایک اور مقصد و ہدف سب کا واحد!

اس طبقے کے بارے میں ہمارا دینی طبقہ ــــ بشرطیکہ یہ تعبیر درست بھی ہو۔ کیونکہ اسلام میں کوئی مخصوص دینی طبقہ اور پاپائیت جیسی کوئی چیز نہیں ہے ــــ اپنے رویہ کے اعتبار سے دو گروہوں میں تقسیم ہے، ایک گروہ ہے جو اس سے شدید جناب رکھتا ہے۔ اسکی تکفیر کرتا ہے اور اسکے سایہ سے بھی دور رہنا پسند کرتا ہے لیکن ان اسباب و علل کی جستجو سے بالکل مستغنی ہے جنہوں نے اس طبقہ میں لادینیت کا رجحان پیدا کیا۔ یہ گروہ اس کا قائل نہیں کہ اس طبقہ سے اختلاط پیدا کیا جائے، دین اور رجالِ دین سے اس کی وحشت دور کی جائے، اگر کوئی ایمان و خیر کا ذرّہ اس میں موجود ہے تو اُسے بڑھا دیا جائے۔ موثر اسلامی لٹریچر کے ذریعہ اس کے اندر دینی افکار اتارے جائیں، اس کے جاہ و مال اور قوت اقتدار سے استغنا، دکھا کر اسلامی کردار کی عظمت کا نقش قائم کیا جائے، مخلصانہ اور حکیمانہ نصیحت کی جائے۔ اور اس طرح اس کے احوال اور

دل و دماغ کو بدلا جائے۔

دوسرا گروہ اس کی بالکل ضد ہے، وہ اس طبقہ سے تعاون کرتا ہے، مال و جاہ میں اس کا شریک بنتا ہے، اس کے ذریعہ اپنی دنیا بناتا ہے، اس کا دین سنوارنے کی فکر نہیں کرتا، پس اس گروہ میں نہ کوئی دعوتی آواز ہے، نہ دینی غیرت کا کوئی مظاہرہ۔ نہ یہاں اس بگڑے ہوئے طبقہ کی اصلاح کی کوئی حرص و فکر پائی جاتی ہے اور نہ اُسے اس قُرب و تعاون میں کوئی پیغام ملتا ہے۔

ایسا کوئی گروہ نہیں جو اس صورت حال پر دردمند ہو۔ جو یہ سمجھے کہ یہ اونچا تعلیم یافتہ طبقہ مریض ہے، مگر علاج کے لائق اور شفایابی کے قابل۔ اور پھر اسکے علاج کی فکر کرے، حکمت اور نرمی کے ساتھ دین کی دعوت لے کر اس میں گھسے اور بے لوث نصیحت کا حق ادا کرے ایسا کوئی تیسرا گروہ نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے اس مغرب زدہ عنصر کو دین اور دینی ماحول سے قریب ہونے کا کوئی موقع نہیں ملتا، اسکی ساری زندگی اس ماحول سے وحشت اور دوری میں کٹتی ہے۔ اور پھر اس بعد و وحشت کو اہل دین کا وہ گروہ اور بڑھا دیتا ہے جو اس کا سیاسی حریف اور فریق بن کر میدان میں اتر آیا ہے۔ ایسے ہی وہ ایک گروہ بھی اس بُعد و وحشت میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ جو دین کے نام پر اس طبقہ سے، جاہ و منصب اور حکومت و سلطنت کے لیے جنگ کرتا ہے۔ یہ دونوں گروہ سوائے اس کے کچھ نہیں کرتے کہ اس طبقہ کو دین سے خائف کریں اور ایک بغض و عناد کی کیفیت پیدا کریں۔ انسان کی فطرت ہے کہ اگر وہ دنیا کا حریص ہے تو اس معاملہ میں اپنے کسی رقیب کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر حکومت و سلطنت ہی اس کا مقصد زندگی ہے تو اس میدان کے حریف کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتا۔ اور اگر بندۂ نفس اور خوگر عیش و عشرت ہے تو یہ بھی ناممکن ہے کہ وہ اس دنیا میں کسی کو سہیم شریک بننے کی اجازت دیدے۔

عالم اسلامی کے درد کی دوا آج وہ گروہ ہے جو خواہشات سے بلند اور داعیانہ بے غرضی کا پیکر ہو۔ ہر اس بات سے دامن بچائے جس سے وہم بھی ہو سکتا ہو کہ اسے دنیا کی طلب ہو یا اس کا مطمح نظر اپنے لئے، اپنی پارٹی کے لیے یا اپنے خاندان کے لیے حکومت و اقتدار کا حصول ہے' وہ گروہ جو اس طبقہ سے میل ملاقات کے ذریعہ، مراسلت اور گفتگوؤں کے ذریعہ، دعوتی اسفار کے

ذریعہ، پُر اثر اسلامی ادب کے ذریعہ، شخصی روابط کے ذریعہ، پاکیزگیٔ کردار اور علوِّ اخلاق کے ذریعہ، زہد واستغنا اور پیغمبرانہ اخلاق کی پُر اثر نمائندگی کے ذریعہ ان نفسیاتی اور عقلی گرہوں کو کھول دے جو مغربی علوم نے پیدا کی ہوں یا دینی طبقہ کی بے تدبیری سے پڑی ہوں یا کم فہمی، کم نظری اور اسلام اور اسکے صحیح ماحول سے بُعد ان کا سبب ہوا ہو۔

یہی وہ گروہ ہے جس سے ہر دور میں اسلام کی خدمت بن آئی ہے۔ اُموی سلطنت کا رُخ پھیر دینے اور تختِ خلافت پر عمر بن عبدالعزیز کو لا بٹھانے کا سہرا اسی گروہ کے سر ہے، اور پھر ہندستان میں مغل سلطنت میں اسی نوعیت کا انقلاب بھی اسی گروہ کا رہینِ منت ہے۔ اکبر جیسے طاقتور بادشاہ نے اسلام سے انحراف کرکے اور کھلی اسلام دشمنی پر کمر باندھ کے گویا یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اس اسلامی برِعظیم کو جو چار صدیاں اسلامی حکومت کے سایہ میں گزار چکا تھا پھر پُرانی جاہلیت کے سانچے میں ڈھالدے۔ لیکن اس حکیمانہ دعوت اور ایک ایسے حکیم اور داعیٔ اسلام کے ظہور میں آنے کے طفیل، جس نے اسلام کے لیے خلوص اور اسکے تفقہ کا حق ادا کیا، اور اسکے جانشینوں کی کوششوں کے طفیل یہ ملک ایک بار اسلام کے ہاتھ سے نکل کر پھر اسکے ہاتھ میں آیا ——— اور پہلے سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ آیا ——— اکبر کے تخت پر پے در پے ایسے بادشاہ آئے جن میں سے ہر ایک اپنے پیشرو سے بہتر تھا، حتیٰ کہ نوبت اورنگ زیب عالمگیر تک پہنچی۔ وہ اورنگ زیب جس کا ذکر تاریخ اسلام اور تاریخ اصلاح کا ایک زرّیں باب ہے ——— اور معلوم ہے کہ تاریخ ہمیشہ، دھرائے جانے اور بار بار دھرائے جانے کے لیے تیار رہی۔ اسے کبھی اس عمل سے انکار نہیں ہوا۔ بس بات صرف اُس قوت کی رہی ہے جو اُس کا رُخ پھیر سکے۔ اور اسلام کے تابندہ ادوار کو دھرا کر لانے والی قوت صرف یہی دعوت اور یہی حکمت واخلاص ہے!

کیا ہم اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

نوٹ:۔ اس مضمون کا پہلا حصہ حال ہی میں "المسلمون" (دمشق) میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ دوسرا حصہ ہم نے براہ راست مسودہ سے لے کر ترجمہ کیا ہے۔ اس کی اشاعت اب تک نہیں ہوئی ہے۔

(الفرقان)

زندگی کا قرینہ

از، استاذ مصطفےٰ السباعی ——— مترجمہ، مولانا عبدالغفار حسن

[یہ دمشق کے استاذ مصطفےٰ السباعی کی ایک ریڈیائی تقریر کا ترجمہ ہے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دمشق میں بیٹھ کر ہندوستان کی ملت اسلامی کو خطاب کیا جارہا ہو! ہم اس کی اشاعت کے لیے معاصر عزیز المنبر لائل پور کے ممنون ہیں] ——— (الفرقان)

انسان کو دیکھئے اس میں متضاد کیفیتیں اور حالات نظر آئیں گے۔ ایک طرف اس کا یہ حال ہے کہ دنیا کی ساری مخلوقات سے قوت وطاقت میں برتر دکھائی دیتا ہے۔ فضا کی بلندیوں اور وسعتوں میں پرواز کرتا نظر آتا ہے۔ سمندر کی گہرائیاں بھی اس کے قدموں کی جولاں گاہ بنی ہوئی ہیں۔ طویل سے طویل مسافتیں کم سے کم مدت میں طے کرجاتا ہے۔ اس انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ توانائی بھی بخشی ہے کہ وہ خشک بے آب وگیاہ صحراؤں کو لہلہاتے کھیتوں اور سرسبز وشاداب باغات میں تبدیل کرلیتا ہو۔ نہروں اور دریاؤں کے رُخ موڑ دیتا ہے اور پہاڑوں کی چٹانوں کو ریزہ ریزہ کرڈالتا ہو۔ خلاصہ یہ کہ زمین وآسمان کے درمیان ساری مخلوق اس کے لئے مسخّر اور تابع نظر آتی ہے۔

لیکن اس عظمت ورفعت کے باوجود ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اسکے عجز وناتوانی کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ایک چھوٹی سی مکھی اسے تکلیف میں مبتلا کرسکتی ہے، ایک حقیر سا کانٹا اسے بے چین کرسکتا ہے اور ہوا کا ایک سرد جھونکا اسے موت کے گھاٹ اتار سکتا ہو۔ بلکہ محض خیالی اندیشے اور وسوسے اسکی ہلاکت کا موجب بن سکتے ہیں۔

انسان کی یہ متضاد حالت اس حقیقت پر روشن دلیل ہے کہ یہ کائنات بغیر کسی خالق وصانع کے محض بخت واتفاق سے وجود میں نہیں آئی ہے۔ اس کارخانۂ حیات کا ایک موجد ہے جس کی حکمت، تدبّر اور رحمت وشفقت کی یہ ساری کرشمہ سازیاں ہیں۔ اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے

ان لفظوں میں واضح کیا ہے:-

وفی الارض آیات للموقنین	زمین میں یقین والوں کے لیے نشانیاں
وفی انفسکم افلا تبصرون.	ہیں اور تم خود اپنے وجود میں غور وفکر
(سورۂ ذاریات ۲۰-۲۱)	کیوں نہیں کرتے۔

عقل مند انسان وہ ہے جو نہ اپنی کمزوری اور ناتوانی کو بھولتا ہے۔ اور نہ خدا کی دی ہوئی قوت وعظمت کی بنا پر فخر وغرور اور فریب نفس میں مبتلا ہوتا ہے۔ اسے یہ بھی زیب نہیں دیتا کہ ظاہری طاقت، ذہانت اور علم وفن کے بل بوتے پر خدا کی کمزور مخلوق پر دست درازیاں شروع کردے۔ اور ناجائز ذرائع کے سہارے بلند سے بلند تر منصب تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ اور یہ بھی درست نہیں ہے کہ وہ احساس کہتری میں اس حد تک مبتلا ہوجائے کہ اسے خود اپنی صلاحیتیں ہیچ نظر آئیں، اور اسکی عملی توانائیاں مضمحل اور معطل ہوکر رہ جائیں۔ انسان خیر وسعادت سے اسی وقت ہمکنار ہوسکتا ہے جبکہ ان دونوں خطرناک امراض سے اسکو نجات حاصل ہو اور اعتدال ومیانہ روی کی راہ اختیار کرے۔

فخر وغرور اور خود پسندی کی صورت میں انسان کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ اپنے سوا کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جو معاملات اسکے دائرۂ عمل سے خارج ہیں۔ ان میں دخل دیتا ہے اور جن چیزوں کا اسے علم نہیں انکے بارے میں اس طرح رائے دیتا ہے گویا اصل ماہر فن یہی ہے۔

اس خود پسندی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ نہ کسی کے مشورے پر کان دھرتا ہے نہ کسی کی مخلصانہ نصیحت کی پرواکرتا ہے، نہ اسکے دل میں کسی بڑے، بزرگ کا احترام ہوتا ہے اور نہ کسی عالم فاضل کی اسکی نگاہ میں قدر ومنزلت رہ جاتی ہے۔

ایسا شخص یہ سمجھتا ہے کہ تمام عالموں سے بڑھ کر عالم وہ ہے۔ کوئی حکیم، کوئی مدبر، کوئی سیاست داں اسکے ہم پلّہ نہیں ہے۔ اس مرض میں وہ کمزور قومیں مبتلا ہوتی ہیں جو طویل عرصہ غفلت اور پستی کی زندگی گزار کر ترقی کے میدان میں قدم رکھتی ہیں یا جو قومیں اپنی بدعملی کی بنا پر عزت ووقار کی بلندیوں سے ذلت ونکبت کی پستیوں میں گرا چاہتی ہیں۔ آج ہماری قوم بھی اسی مرض میں مبتلا ہے۔

آج اسی غرورِ نفس کا نتیجہ ہے کہ ہم لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی مجالس اور عام اجتماعات میں اس طرح شیخیاں بگھارتے ہیں گویا سارے محاسن اور تمام خوبیاں صرف انھی کی ذات والاصفات میں جمع ہوگئی ہیں۔ اور دوسرے تمام افراد خواہ وہ علم وفضل کے بلند مقام پر فائز ہی کیوں ہوں انکی نگاہ میں جہالت و غباوت کے گہرے گڑھوں میں گرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ وہ مرض ہے کہ جب کسی قوم پر وبائے عام کی صورت اختیار کر جاتا ہے تو کوئی بھی مخلصانہ مشورہ یا ہمدردانہ نصیحت کارگر نہیں ہوتی۔ قوم پستی میں گر رہی ہوتی ہے اور یہ خود پسند حضرات سمجھتے ہیں کہ بس ہم ثریا کی بلندیوں کو چھونے والے ہیں۔ چاروں طرف مصائب کا ہجوم ہوتا ہے اور یہ شیخ چلی کے چیلے نعرہ لگاتے ہیں کہ "بس سب اچھا ہے"۔

دوسرا مرض بھی کم خطرناک نہیں ہے۔ احساس کہتری میں مبتلا انسان انتہائی بے چارگی کے عالم میں اپنے آپ کو محسوس کرتا ہے۔ عزم و ارادوں سے محروم اور جوش وولولہ سے یکسر تہی دامن نظر آتا ہے نہ اسے اپنے آپ پر اعتماد ہوتا ہے اور نہ اپنی قوم پر، وہ اپنے وجود کو لاشئ محض تصور کرتا ہے۔

یہ مرض بھی اپنے نتائج کے لحاظ سے ہولناکی میں کچھ کم نہیں ہے۔ اس مرض میں مبتلا قوم کے فکری اور عملی قویٰ شل ہو کر رہ جاتے ہیں، اس کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے، غیرت وحمیت اور عزتِ نفس کا کوئی احساس نہیں رہتا۔ ہر ظالم جبّار اسے اپنا لقمۂ تر سمجھ لیتا ہے اور ہر قوی و توانا کے سامنے سرنگوں ہونے کے لئے وہ تیار رہتی ہے۔

آپ کو کتنے ایسے افراد ملیں گے جنھوں نے اجتماعی معاملات سے الگ تھلگ ہو کر گوشہ نشینی اختیار کرلی ہے۔ تعطل اور جمود نے ان کے اعضاء کو مضمحل کر دیا ہے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ہمت کیجئے۔ قومی معاملات میں دلچسپی لیجئے تو جواب ملتا ہے، بھائی ہم کیا کر سکتے ہیں، ہم کس مرض کی دوا ہیں ہماری حیثیت اور قدر و قیمت ہی کیا ہے۔ جب قوم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ تن آسان لوگ گھروں یا عبادت خانوں میں پناہ لینے کے لیے چپکے سے کھسک جاتے ہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ لوگ غور وفکر سے کام لیں، اور تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں تو ان کو معلوم ہو جائے کہ انھی کی طرح کے گوشت پوست والے انسان ہی تھے جن کے روشن

کارنامے آج بھی دنیا کو پیغام عمل دے رہے ہیں۔ اسی نوع کے کچھ لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو ایک طرف احساس کہتری میں مبتلا ہیں اور دوسری طرف کبر و غرور نے بھی انکا دماغ بدمست کیا ہوا ہو۔ ایسے افراد اپنی قوم کے اندر تو اپنی ذات کو بڑا وزن دیتے ہیں۔ اور کسی بڑے سے بڑے دعوے اور تعلّی سے بھی باز نہیں رہتے۔ لیکن دشمنوں کے سامنے بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی قوم میں ہر قسم کے کیڑے ڈالتے ہیں اور دشمنوں کا ہر عمل انکی نگاہ میں سراپا خیر و برکت ہوتا ہے۔ اگر کبھی دشمن سے سامنا ہو جائے تو یہ لوگ سب سے پہلے بھاگ کھڑے ہوں گے۔ اور دوسروں کو بھی یہی تلقین کریں گے۔ اس قسم کے مواقع پر یہ کہتے ہوئے سنے جائیں گے کہ بھائی! ہم میں کہاں اتنی طاقت کہ دشمن کے مقابلہ میں ٹھہر سکیں۔ اس طرح تو ہم اپنے وجود اور اپنے مستقبل کو خود اپنے ہی ہاتھوں ختم کر دیں گے۔

حاصل یہ ہے کہ یہ دونوں مرض اسلام کی نگاہ میں انتہائی خطرناک ہیں۔ اسلام ان دونوں بیماریوں سے روکتا ہے۔ اس بارے میں اس کی تعلیم انتہائی حکیمانہ اور لطف و شفقت سے بھرپور ہے۔

غرورِ نفس سے روکنے کے لیے انسانوں کے دلوں میں یہ حقیقت ذہن نشین کی گئی ہو کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و عظمت ہر صاحبِ قدرت اور صاحب سطوت سے بالاتر ہے۔ ہمارے پاس مال، جاہ، علم و فن کی صورت میں جو کچھ بھی نعمتیں موجود ہیں ان کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:۔

وما بکم من نعمۃ فمن اللہ	یعنی تمھارے پاس جو بھی نعمت ہو
سورۃ النحل۔ ۵۲	اس کا اصل دینے والا اللہ تعالیٰ ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

ید اللہ فوق ایدیھم	اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں
سورۃ الفتح۔ ۱۰	کے اوپر ہے۔

تیسری جگہ فرمایا:۔

قل رب زدنی علما (طٰہٰ۔ ۱۱۴)	کہیے! کہ اے میرے رب میرا علم زیادہ کر۔

یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ادب سکھایا گیا ہے کہ اہل علم کو کس قسم کی تواضع وانکساری اختیار کرنی چاہیئے۔ علم وفضل کے غرور کو توڑنے کے لیے فرمایا:۔

وفوق کل ذی علم علیم ہر علم والے سے برتر علم والا موجود ہے۔ سورۃ یوسف - ۷۶

وما اوتیتم من العلم الا قلیلا تمھیں علم کے سرمایہ میں سے بہت ہی کم ملا ہے۔ (بنی اسرائیل - ۸۵)

یہ وہ آلٰہی ادب ہے جس کے ذریعے ایک مسلمان غرور نفس اور خود پسندی کی بیماری سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اگر ایک مسلمان صحیح معنی میں اس ادب کو اپنا لے تو کیا وہ کسی صاحب علم وفضل کو حقیر سمجھ سکتا ہے اور کسی نعمت واحسان سے مالا مال انسان کو تحقیر آمیز نگاہوں سے دیکھ سکتا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے۔ قریش مکہ سے بیس سال کی جنگ اور کشمکش کے بعد آپ مکہ مکرمہ میں فاتحانہ داخل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ حال تھا کہ ہر قسم کے فاتحانہ کبر ونخوت اور انتقامی جذبات سے آپ کا دل پاک تھا۔ آپ اللہ تعالیٰ کے انعام اور اس کے فضل واحسان کا شکر واعتراف اس طرح بجا لا رہے تھے کہ اونٹنی پر سوار ہیں اور آپ کا سر اتنا جھکا ہوا ہے کہ قریب ہے کہ سواری کی کاٹھی سے مس کر جائے۔ آپ خانہ کعبہ کے دروازے پر تشریف فرما ہوتے ہیں اور سامنے قریش کے سرداروں کا جمگھٹا ہے تو ایسے وقت میں جب کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے قدرت واقتدار بخشا ہے۔ نہ کسی فریب نفس سے دوچار ہوتے ہیں اور نہ آپ کو یہ نصرت وفتح عُجب وخود پسندی میں مبتلا کرتی ہے بلکہ آپ انتہائی نرمی اور فراخ دلی کے ساتھ ہر ایک سے معاملہ کرتے ہیں۔

اسی موقع پر ایک شخص آپ کے سامنے لرزاں ترساں کھڑا تھا آپ نے اس سے فرمایا:۔

انا ابن امرأۃ من قریش کانت تاکل القدید۔ میں تو بس قریش کی ایک ایسی عورت کا بیٹا ہوں جس کی خوراک کٹا ہوا گوشت تھا۔ یعنی ایک ایسے شخص سے خوف زدہ ہونے کی کیا ضرورت؟

یہ جملہ ادب نبوی کا کتنا بڑا شاہکار ہے۔ آپ نے کتنے دلنشین اور اثر انگیز انداز میں اصل حقیقت کو بے نقاب فرمایا ہے۔ یہ جملہ کسی ایسے انسان نے نہیں کہا ہو جو گمنام ہو، جس نے دشمن سے شکست کھائی ہو یا جو حسب نسب کے لحاظ سے پست ہو، بلکہ یہ اس ہستی کا ارشاد ہے جس کو خدا نے حکمت و نبوت سے نوازا۔ فتح و نصرت کا تاج پہنایا، اور تمام مخلوقات پر عزت و فضیلت عطا فرمائی۔ لیکن اس تمام اعزاز و اکرام کے باوجود آپ کی زبان مبارک سے یہی نکلتا ہے:۔

"انا ابن امرأة من قريش"

کیا اس سیرت نبوی میں ان لوگوں کے لیے کوئی سبق نہیں ہے جو محض بلند بانگ دعووں اور خوشنما خوابوں کی دنیا میں بستے ہیں۔ اور ملت اسلامیہ کو خواہ مخواہ اپنی زباں درازیوں کا نشانہ بناتے ہیں۔

اگر مسلمانوں کے سامنے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع و انکساری کا یہ نقشہ ہو تو وہ کبھی کبھی اپنی اصل حقیقت اور حیثیت کو فراموش نہیں کر سکتے۔

اسی طرح دوسری بیماری (احتقار نفس، احساس کہتری) کے بارے میں بھی قرآن حکیم نے صاف صاف کہا ہے:۔

(۱) كنتم خير امة اخرجت للناس الآية (سورۃ آل عمران ـ ۱۱۰)	تم تمام امتوں سے بہتر امت ہو تمھیں لوگوں کے لیے پیدا کیا گیا ہے کہ ان کو بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔
(۲) وكذالك جعلناكم امة وسطا لتكونوا شهداء على الناس۔ (البقرہ ـ ۱۴۳)	اور اسی طرح ہم نے تم کو امت وسط (عدل و انصاف کی علمبردار) بنایا ہے تاکہ تم (عام) لوگوں پر شاہد و نگراں بن جاؤ۔
(۳) ولا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان كنتم مؤمنين۔ (آل عمران ۱۳۹)	ہمت نہ ہارو، غم نہ کھاؤ، تم ہی بلند ہو اگر تم مومن ہو۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

(۱) لایحقرن احدکم نفسہ (ابن ماجہ) یعنی تم میں سے کوئی اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے۔

(۲) لایکن احدکم امّعۃً یقول ان احسن الناس احسنت وان اساؤا اساتُ (یعنی تم میں سے کوئی امعہ (ذہنی لحاظ سے دوسروں کا غلام اور مرعوب) بن کر نہ رہ جائے کہ وہ اس بات کا قائل ہو اگر لوگ اچھا کام کریں گے تو میں بھی اچھا کروں گا اور اگر انھوں نے غلط راہ اختیار کی تو میں بھی انہی کی راہ پر چلوں گا (بلکہ چاہیئے یہ کہ جب لوگ بھلا کام کریں تو ان کی پیروی کی جائے اور جب وہ برائی کی راہ اختیار کریں تو ان کا ساتھ نہ دیا جائے۔)

یہ ہیں وہ اسلامی تعلیمات جن کی بدولت انسان اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرسکتا ہے اور اپنے آپ کو غرورِ نفس کی ہلاکت خیزیوں سے بچا سکتا ہے۔

یہی وہ خودداری اور عزتِ نفس تھی جس کی بنا پر اسلام کے ابتدائی دور میں ایک عام مسلمان خلیفۂ وقت کو بھی ٹوکنے اور فریضۂ احتساب و تنقید ادا کرنے کی جرأت کرجاتا تھا کہ اے امیر المومنین یہ چادر آپ نے کہاں سے حاصل کی ہے؟

اس دور کے مسلمانوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو حقیر و ذلیل نہ سمجھا، یہی وجہ تھی کہ فوجوں کی قیادت اور ملکوں کو فتح کرتے ہوئے کبھی بھی وہ بے ہمتی اور بے اعتمادی کا شکار نہیں ہوئے۔

اسلامی تاریخ کی وہ عظیم اور نامور ہستیاں جن کے کارناموں سے دوسری قوموں کی تاریخ خالی ہے۔ اپنی ابتدائی زندگی میں کیا تھے، چند غیر معروف نوجوان، کچھ معلوم ہے کہ یہ ابوبکر، عمر بن الخطاب، عمرو بن العاص، خالد بن ولید اور سعد بن وقاص کون لوگ تھے ان میں سے کوئی کپڑوں کا تاجر تھا، کوئی قصاب تھا جس کا کام اونٹوں کو ذبح کرنا تھا کسی کی بہادری کے قصے صرف اسکے قبیلے تک محدود تھے۔ اور ان میں سے کوئی اپنی زندگی لہو و لعب میں گزار رہا تھا لیکن یہی لوگ ہیں۔ جن کے بلند کردار اور روشن کارنامے رہتی دنیا تک لوگوں کے دلوں میں تازہ رہیں گے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نہ کسی مسلمان کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنی حیثیت سے زیادہ سمجھ بیٹھے، اور نہ یہ جائز ہے کہ جو مرتبہ اور جو اعزاز خدا نے بخشا ہے اس سے بھی نیچے اپنے آپ کو گرا دے۔ پہلی صورت میں انسان فریبِ نفس میں مبتلا ہو کر رہ جائے گا اور دوسری شکل میں اس کی زندگی خود اسکی اپنی نگاہ میں انتہائی حقیر اور ذلیل بن کر رہ جائے گی۔ ان دونوں بیماریوں کا علاج یہ ہو کہ انسان کی نگاہ اپنی خوبیوں اور کمزوریوں دونوں پر رہنی چاہئیے۔

اپنی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے انسان کا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیئے کہ (۱) اللہ تعالیٰ کے اس احسان و اکرام پر اسکی حمد بجا لائے۔ اور اس سے مزید انعام کا طلبگار رہو۔ (۲) خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے خدا کی مخلوق کو بھی فائدہ پہنچائے اور ان کے دکھ درد میں کام آئے (۳) اس تعاون اور خدمتِ خلق کا کسی پر احسان نہ دھرے ورنہ یہ سارا کیا کرایا غارت ہو جائے گا۔ اور خدا کے ہاں اس پر ثواب تو کیا ملے گا، شدید عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

کمزوریوں پر نگاہ رکھتے ہوئے انسان کا فرض ہو وہ اپنی اصلاح کی کوشش کرے۔ روحانی علاج اور تربیت و تزکیہ کے ذریعہ اپنے داغ دھبے دھونے میں لگ جائے۔ اور ان عیوب کی بنا پر کسی پست ہمتی میں مبتلا نہ ہو ورنہ مایوسی چھا جائے گی اور خود اپنے ہاتھوں خودکشی کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہوگا۔

ملتِ اسلامی کے فرزندو!

دوسری قوموں کے لحاظ سے تمھاری تعداد ایسی نہیں ہے کہ تم اپنے آپ کو حقیر و ذلیل سمجھنے لگو۔ اگر تم زندگی کی راہ اختیار کرو تو تمھارا شمار زندہ قوموں میں ہوگا۔ اور اگر تم پست ہمتی اور بے اعتمادی کی راہ پر چلے تو تم دنیا میں ذلیل ہو کر رہ جاؤگے۔

سنو! اور کان کھول کر سنو! اس فریبِ نفس اور خوش فہمی سے بچو جس کی بنا پر انسان ہوائی قلعے تعمیر کرتا ہے اور خوابوں کی دنیا ہی میں اس کا بسیرا ہوتا ہو۔ اسی طرح اس احساس کہتری سے بھی بالاتر رہو جس سے انسان کی عملی قوتیں مایوسی اور ناتوانی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ہمیشہ بلند نگاہی کو اپنا شعار بناؤ اور عزم و استقامت کی شاہراہ کو اختیار کرو۔ تمھارے اس طرزِ عمل سے اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ (باقی ملاحظہ ہو صــــ پر)

خطبۂ رمضان

[مدیر الفرقان کی ایک تازہ تقریر]

دوستو اور دینی بھائیو! اللہ کا مبارک مہینہ رمضان قریب آگیا ہے، اب ایک ہفتہ بھی درمیان میں نہیں ہے۔ صرف ظاہر کو دیکھ سکنے والی ہماری نگاہوں میں تو رمضان اور غیر رمضان میں کوئی فرق نہیں ہوتا، جس طرح کے دن اور جس طرح کی راتیں رمضان کے پہلے اور اس کے بعد ہوتی ہیں اسی طرح کے دن رات رمضان کے بھی ہوتے ہیں ــــ لیکن اگر اللہ تعالیٰ کسی کو وہ آنکھ نصیب فرمائے جو آسمان سے نازل ہونے والی رحمتوں اور برکتوں کو اور اسی طرح کی دوسری نورانی اور روحانی حقیقتوں کو دیکھ سکے تو اس کو رمضان اور غیر رمضان میں ایسا کھلا فرق محسوس ہوگا جیسا کہ ہم کو اور آپ کو دن اور رات میں محسوس ہوتا ہے۔

رمضان کے انوار و برکات کو اس دنیا میں سب سے زیادہ محسوس کرنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اس لیے آپ کا حال یہ تھا کہ مہینوں پہلے سے ہمہ تن شوق ہو کر اس کا انتظار فرماتے تھے۔ بعض روایات میں ہے کہ جب دو مہینے پہلے رجب کا چاند دیکھتے تو اللہ تعالیٰ سے دعا فرماتے "اللّٰھم بارك لنا فی رجبنا و شعبان و بلغنا رمضان" (اے اللہ رجب اور شعبان دونوں مہینوں کی برکات ہم کو نصیب فرما۔ اور رمضان تک ہمیں پہونچا!)

پھر رجب کا مہینہ پورا ہونے کے بعد جب شعبان آتا تو آپ مسلسل روزے رکھنا شروع فرماتے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ قریب قریب پورے مہینے شعبان کے آپ روزے رکھتے تھے۔ پھر جب رمضان مبارک آجاتا تو آپ کی طبیعت مبارک کے لیے گویا موسم بہار آجاتا، ــــ آپ خطبات اور مواعظ کے ذریعہ صحابۂ کرام کو بھی اس کی ترغیب دیتے

سمجھے کہ اس مہینہ کی رحمتوں اور برکتوں اور بہاروں سے وہ بھی حصہ لیں اور اس کے دنوں اور راتوں کی پوری قدر کریں۔

اللہ تعالیٰ حضرات محدثین کو جزائے خیر دے ان کے طفیل میں حضورؐ کے اس سلسلہ کے ارشادات اور خطبے بھی حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ میرا معمول ہے کہ جب رمضان مبارک آتا ہے تو میں اجتماعات میں بھی ان کے مضامین کا تذکرہ کیا کرتا ہوں، آج بھی یہی ارادہ ہے، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو عمل کرنے اور نفع اٹھانے کی پوری توفیق دے۔

اس سلسلہ کا حضور کا ایک بہت مختصر خطبہ امام منذری نے "ترغیب و ترہیب" میں طبرانی کے حوالہ سے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے، اس میں ہے کہ ایک دفعہ رمضان مبارک آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے ارشاد فرمایا۔

اتاکم رمضان شهر برکة	اللہ کا محترم مہینہ رمضان تمھارے پاس
یغشاکم الله فیه فینزل	آ گیا۔ یہ بڑی برکت والا مہینہ ہے اللہ تعالےٰ
الرحمة و یحط الخطایا ویستجیب	اس مہینہ میں تمھیں اپنے آغوش رحمت میں
فیه الدعاء ینظر الله تعالیٰ	لے لیتا ہے اور اپنی خاص رحمتیں نازل
الی تنافسکم فیه ویباهی	فرماتا ہے، خطائیں معاف کرتا ہے اور
بکم ملٰئکته فاروا الله من	دعائیں قبول فرماتا ہے اور اس مہینہ میں
انفسکم خیراً فان الشقی	طاعات اور عبادات کی طرف تمھاری
من حرم فیه رحمة الله عزّ	رغبت اور مسابقت کو دیکھتا ہے اور
وجل۔	مسرت و مفاخرت کے ساتھ اپنے

فرشتوں کو بھی دکھاتا ہے ـــ پس اے لوگو! اس مبارک مہینہ میں اللہ کو اپنی طرف سے خیر ہی دکھاؤ۔ وہ شخص بڑا بے نصیب ہے جو رحمتوں کے اس موسم میں بھی اللہ کی رحمت سے محروم رہ جائے

اس خطبہ میں حضورؐ نے رمضان کی پہلی برکت یہ بیان فرمائی ہے کہ "یغشاکم الله فیه" یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے جس قرب اور اس کی جس خاص عنایت و عطوفت کو ظاہر کرتا ہے حق یہ ہے

کہ اس کو الفاظ میں نہیں ادا کیا جاسکتا۔ میں اس کا قریبی ترجمہ یہ کر دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس مہینہ میں تم کو اپنے آغوشِ رحمت میں لے لیتا ہے۔

اس کے بعد آپ نے چار باتیں اور بیان فرمائیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ اس مہینہ میں اپنی خاص رحمتیں نازل فرماتا ہے، اور دوسری یہ کہ خطاکار بندوں کی خطائیں معاف فرماتا ہے۔ اور تیسری یہ کہ دعائیں قبول کرتا ہے، اور چوتھی یہ کہ اس کے جو بندے اس مہینہ کی رحمتیں اور برکتیں حاصل کرنے کے لیے ذوق و شوق کے ساتھ عبادت اور مجاہدے کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی طرف خاص کرم اور بندہ نوازی کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور فخر و مباہات کے ساتھ اپنے فرشتوں کو بھی دکھاتا ہے کہ دیکھو یہ ہیں میرے بندے جنھوں نے نہ مجھے دیکھا ہے نہ میری جنت کو دیکھا ہو نہ دوزخ کو دیکھا ہے، پھر بھی میری رضا اور میری جنت کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ دن بھر کی بھوک پیاس برداشت کر رہے ہیں۔ ان کے پیٹ کمر سے لگ گئے ہیں، زبانیں خشک ہیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی ہیں، اسی حال میں نمازیں پڑھ رہے ہیں تلاوت یا ذکر کر رہے ہیں، دعائیں کر رہے ہیں، پھر دن اس طرح گزار کے رات کو تراویح میں کھڑے رہتے ہیں، پھر تہجد کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

سبحان اللہ! کیسے خوش نصیب ہیں اللہ کے وہ بندے جو رمضان مبارک کے دن اور اس کی راتیں اس طرح گزارتے ہیں کہ اُن کا مالک و مولا نوازش و کرم کی اس خاص نگاہ سے ان کو دیکھتا ہے اور فرشتوں کے سامنے اس طرح ان کا ذکر فرماتا ہے۔ ع

کیا نصیب! اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

پھر آخر میں حضورؐ نے فرمایا "فاروا اللہ من انفسکم خیراً" (پس اے بندگانِ خدا اس مہینہ میں اللہ تعالیٰ کو اپنی طرف سے خیر ہی دکھاؤ) یعنی کوشش کرو کہ اس مہینہ کے تمھارے دن اور راتیں اس طرح گزریں کہ جس وقت بھی مالک الملک کی وہ خاص نگاہ تم پر پڑے تم کو اچھے ہی حال میں دیکھے ——— آخر میں آپ نے فرمایا کہ وہ شخص بڑا بے نصیب ہے جو اس ماہِ رحمت میں بھی اللہ کی رحمت سے محروم رہے اور کوئی حصہ اس میں سے نہ لے سکے۔

اور مشکوٰۃ شریف میں مسند احمد اور نسائی کے حوالہ سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی

روایت سے مروی ہے کہ ایک دفعہ رمضان آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو خطاب فرمایا۔

اتاکم رمضان شهر مبارك	تمھارے پاس رمضان آگیا یہ بڑی برکت
فرض الله عليكم صيامه تفتح	والا مہینہ ہے۔ اللہ نے اس کے روزے
فيه ابواب السّماء وتغلق فيه	تم پر فرض کیے ہیں۔ اس میں (مومنین
ابواب الجحيم وتغل فيه	صالحین کے لیے) آسمان کے (یعنی رحمت
مردة الشياطين لله فيه ليلة	جنت کے) دروازے کھل جاتے ہیں اور
خير من الف شهر من حرم	دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے
خيرها فقد حرم	ہیں۔ اور سرکش شیاطین جکڑ دیے جاتے

ہیں۔ اس میں اللہ کی ایک خاص رات ہے جو اپنی برکات کے لحاظ سے ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے، جو کوئی اس کی خیر سے محروم رہا وہ بڑا محروم ہے۔

رمضان کی آمد پر دوزخ کے دروازے بند کیے جانے اور جنت کے دروازے کھول دیے جانے اور شیطانوں کے جکڑ دیے جانے کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی حدیثوں میں آتا ہے۔ ہمارے استاذ الاساتذہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان تینوں باتوں کے بارہ میں فرمایا ہے کہ ان کا تعلق صرف اُن اہلِ ایمان سے ہے جو رمضان کی آمد کو محسوس کرتے ہیں۔ اور اس کی وجہ سے شیطانی کاموں سے بچنے کی اور دوزخ کے عذاب سے نجات پانے اور جنت حاصل کرنے کی رحمت کے اس مہینہ میں کچھ خاص فکر اور کوشش کرتے ہیں، تو ان کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور جنت حاصل کرنا ان کے لیے بہت آسان کر دیا جاتا ہے، اور جنتی بنانے والے اعمال کی ان کو توفیق عطا فرما کر اُن کے اپنے اپنے احوال و اعمال کے مطابق اُن کے جنتی ہونے کا فیصلہ فرما دیا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ اسی طرح توبہ و استغفار کی اور معصیات سے بچنے کی ان کو توفیق عطا فرما کر اُن کے حق میں دوزخ کے دروازے گویا بند کر دیے جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کی ایسی حفاظت کرتی ہے کہ اس مبارک مہینہ میں شیطانوں کا ان پر قابو نہیں چل سکتا۔ گویا اللہ تعالیٰ اس مبارک مہینہ میں شیطانوں کو اپنی قدرت سے ایسا جکڑ کر دیتا ہے کہ

ان اہل ایمان پر وہ حملہ نہیں کر سکتے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کی آمد پر جنت کے دروازے کھول دیے جانے، اور دوزخ کے دروازے بند کیے جانے اور شیطانوں کے جکڑ دیے جانے کا ذکر فرما کر آخر میں ارشاد فرمایا کہ رمضان مبارک کی ہر رات کو اللہ کا منادی پکارتا ہے" یا باغی الخیر اقبل ویا باغی الشر اقصر" (یعنی اے نیکی اور ثواب کے طالب! قدم بڑھا کے آ، اور اے بدی کے شائق رک اور باز رہ)

میرے بھائیو! اس دنیا میں ہمیں وہ کان نہیں دیے گئے ہیں جو عالم غیب اور ملاء اعلیٰ کی آوازیں سن سکیں لیکن ہمارا ایمان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل حق فرمایا، یقیناً اللہ کا منادی رمضان کی ہر رات میں یہ ندا دیتا ہے۔ اور ہمیں خیر اور نیکی کی طرف بلاتا ہے اور بدی کی جانب جانے سے منع کرتا ہے۔ اس لیے ہمارے دلوں اور ہماری روحوں کو اس مبارک مہینہ کی ہر رات میں محسوس کرنا چاہیے کہ اللہ کا منادی ہمیں بلا رہا ہے اور خیر کی طرف بڑھنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ اور منکرات و معصیات سے بچنے کے لیے ہمیں آگاہی دے رہا ہو اور اس ندا ربانی پر دل و جان سے لبیک کہہ کے نیکی اور سعادت کی راہ پر ہمیں مسلسل تیزی سے بڑھتے رہنا اور ترقی کرتے رہنا چاہیے اور منکرات و معصیات سے توبہ و استغفار کے ساتھ ان سے بچنے کے عزم کی بار بار تجدید کرتے رہنا چاہیے ـــــ اس ندا ربانی کا یہی جواب ہو سکتا ہے۔

رمضان مبارک کی برکت و رحمت کا ایک خاص پہلو اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اس مہینہ میں نیکیوں کے ثواب کا حساب عام حساب سے بہت زیادہ بڑھا دیا جاتا ہے، یعنی ایک نیکی مثلاً دو رکعت نفل یا ایک روپیہ کے صدقہ کا ثواب دوسرے دنوں کے اسی عمل کے لحاظ سے رمضان مبارک میں بیسوں گنا بڑھ جاتا ہے ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رمضان مبارک ہی کے سلسلہ کا ایک خطبہ حدیث کی کتابوں میں حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت کیا گیا ہے۔ یہ اچھا خاصا طویل خطبہ ہے۔ اس کا ایک جز یہ بھی ہے کہ آپ نے فرمایا" من تقرب فیہ بخصلۃ من خصال الخیر کان کمن ادی فریضۃً فیما سواہ ومن ادی فیہ فریضۃ کان کمن ادی سبعین فریضۃ فیما سواہ"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ رمضان مبارک میں جو شخص نفلی قسم کا کوئی نیک کام کرے تو اس کا ثواب غیر رمضان کے فرض کے برابر ہوگا۔ اور رمضان میں جو فرض قسم کی نیکی کی جائے تو اس کا ثواب غیر رمضان کے ستر فرضوں کے برابر ہوگا۔

دوستو! اگر رمضان مبارک میں کوئی بھی فضیلت اس کے سوا نہ ہو، جب بھی ہمیں خالص اپنے نفع اور اپنی کمائی کی خاطر رمضان مبارک کے اپنے اوقات کو زیادہ سے زیادہ طاعات و عبادات میں گزارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اگر کسی تاجر کے لیے کوئی ایسا مہینہ آئے کہ دوسرے دنوں ہی کے برابر محنت کر کے وہ ستر گنا زیادہ نفع کما سکے تو سوچیے کہ وہ اپنے کاروبار پر اس مہینہ میں کس شوق سے جان لگائے گا۔

اصل بات یہ ہے کہ اعمال کی جزا و سزا اور آخرت کے ثواب عذاب کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان اطلاعات پر جیسا یقین ایک صاحب ایمان کو ہونا چاہیے ویسا ہم کو حاصل نہیں ہے، اگر ہم کو وہ یقین حاصل ہوتا تو رمضان مبارک میں ہمارا حال کچھ اور ہی ہو جایا کرتا۔

میں نے اپنے بعض بزرگوں کو دیکھا ہے کہ وہ رمضان مبارک کے ایک لمحہ کو بھی غفلت میں نہیں گزارنا چاہتے۔ رمضان مبارک کے ان کے معمولات کا اگر میں تفصیل سے ذکر کردوں تو آسانی سے ہر ایک کو یقین بھی نہ آسکے۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں وہ بس اتنا ہی آرام کرتے ہیں جتنا کہ زندگی کے لیے بالکل ناگزیر ہے۔ باقی سارا وقت ان کا ذکر و تلاوت اور دعا و عبادت وغیرہ میں مشغول رہتا ہے۔ بلکہ ہمارے ایک بزرگ تو وہ ہیں جن کے گھر کی مستورات کے بارہ میں بھی مجھے معلوم ہے کہ رمضان مبارک میں ان کا حال بھی کچھ ایسا ہی رہتا ہے، گھر کا سارا کام کاج، جھاڑو، برتن اور کھانا پکانا بھی خود ہی کرتی ہیں اور مختلف اوقات کے نوافل و تسبیحات کے علاوہ قریباً پورا قرآن مجید روز پڑھ لیتی ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک کے لیے یہ آسان نہیں ہے۔ میں خود بھی ان باتوں کو آپ کے سامنے صرف نقل کر رہا ہوں ورنہ میں خود اس معاملہ میں بہت مقصر اور محروم رہنے والا میں ہوں، لیکن ہم سب کو اتنا تو فیصلہ کر ہی لینا چاہیے کہ جس قدر ہو سکے گا اس مبارک مہینہ کی رحمتوں اور برکتوں میں حصہ لینے کی کوشش کریں گے۔

جو بھائی اس مہینہ میں اپنے آپ کو دوسرے کاموں سے فارغ کر سکیں اُن کے لیے سب سے بہتر یہ ہوگا کہ وہ یہ پورا مہینہ کسی ایسے ماحول میں گزاریں جو اللہ کے ذکر کا اور آخرت کی فکر کا ماحول ہو اطاعات و عبادات کا ماحول ہو۔ صلاح و تقوے کا ماحول ہو، تربیت و تذکیر کا اور مجاہدہ کا ماحول ہو۔ اور جو بھائی پورے مہینے کے لیے ایسا نہ کر سکیں وہ کم از کم ایک عشرہ کے لیے اور خاص کر آخری عشرہ کے لیے اگر کر سکیں تو ضرور کریں۔ انشاء اللہ اِن کی دینی ترقیات کے لیے بھی یہ چیز بہت مفید ہوگی۔ باقی جن بھائیوں کے حالات میں اس کی بالکل گنجائش نہ ہو وہ بھی کم از کم اس کا فیصلہ تو ضرور کر لیں کہ اس مہینہ میں منکرات و معصیات سے بچنے اور طاعات و عبادات میں زیادہ سے زیادہ مشغول رہنے کا وہ اہتمام کریں گے اور اپنے حالات کے مطابق وہ اس کا پروگرام بھی بنا لیں۔ بعض صاحب اور اک بزرگوں کا ارشاد ہو کہ جس شخص کا رمضان میں جو دینی حال رہتا ہو اسی نسبت سے باقی پورے سال میں اس کا حال رہتا ہے۔

اس مہینہ کی عبادتوں میں سب سے اہم تو پورے مہینہ کے روزے رکھنا ہے، جو رمضان کا ایک رکن ہے اور اس کی اتنی اہمیت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی شرعی عذر کے بغیر رمضان کے ایک دن کا روزہ بھی چھوڑ دے گا تو ساری عمر نفلی روزے رکھ کر بھی اس کی تلافی نہ کر سکے گا — اور اس کے اجر و ثواب کے بارہ میں ایسی ایسی بشارتیں سنائی گئی ہیں کہ اگر وہ بشارتیں ساری عمر روزہ رہنے پر سنائی جاتیں تو یقیناً اہلِ ایمان ان کی طمع میں ساری عمر ہی روزے رکھا کرتے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ حدیث کی تقریباً سب ہی کتابوں میں ایک حدیث مروی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ساری نیکیوں اور عبادتوں کے اجر و ثواب کا ایک کریمانہ قانون مقرر فرما دیا ہے۔ اور ہر شخص کی ہر عبادت اور نیکی کا ثواب اسی قانون کے مطابق بھر پور ملے گا، لیکن روزہ کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ " روزہ میں چونکہ میرا بندہ میری وجہ سے اپنے کھانے پینے کی اور اپنی خواہشِ نفس کی قربانی کرتا ہے اس لیے میں روزہ کی جزاء اس عام قانون سے الگ اپنے بندہ کو خود ہی دوں گا۔ حدیث کے الفاظ ہیں " اِلّا الصوم فانّہ لی وانا اجزی بہ یدع لی شھوتہ وطعامہ

وشرابہ"۔

یہ حدیث قدسی ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات اللہ تعالیٰ سے نقل فرمائی ہے۔

پھر آگے اسی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "وَلَخُلُوفُ فَمِ الصَّائِمِ عِندَ اللهِ اَطْيَبُ مِنْ رِيحِ الْمِسْكِ"۔

یعنی روزہ میں خلو معدہ کی وجہ سے بعض اوقات روزہ دار کے منہ میں جو ایک طرح کی بو پیدا ہو جاتی ہے (حضور فرماتے ہیں کہ) وہ اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بھی بہتر ہے"۔ گویا روزہ دار بندہ روزہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو ایسا محبوب ہو جاتا ہے کہ اس کے منہ کی بدبو بھی اللہ تعالیٰ کو اچھی لگتی ہے، اور مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ اچھی لگتی ہے۔

میرے بھائیو! روزہ کا جو خاص اجر و ثواب اللہ تعالیٰ اپنے دست کرم سے روزہ دار کو خود عطا فرمائیں گے وہ تو خوش نصیب بندوں کو قیامت کے بعد ہی ملے گا، اور وہ جو کچھ ہو گا وہیں جا کے معلوم ہو گا، لیکن میں تو عرض کرتا ہوں کہ یہی کیا کم اجر و ثواب ہے کہ اللہ تعالیٰ روزہ داروں سے ایسی محبت اور ایسے پیار کا اظہار فرمائیں، اُن کے منہ کی بو کے متعلق فرمائیں کہ وہ مشک کی خوشبو سے بھی بہتر ہے، اور صبح سے شام تک کے روزہ کے بارہ میں فرمائیں کہ "میرا بندہ میرے لیے کھانے پینے کو اور شہوت نفس کے تقاضے کو چھوڑتا ہے"۔

ہزار عمر فدائے دمے کہ من از شوق بخاک خوں تپم و گوئی برائے من است

رمضان کے روزوں کی ایک فضیلت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ

من صام رمضان ایماناً وّ احتساباً غفر لہ ما تقدم من ذنبہ۔	جو شخص ایمان اور احتساب کی صفت کے ساتھ رمضان کے روزے رکھے گا اس کے پہلے سب گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

اس حدیث میں رمضان میں روزہ رکھنے والوں کو پچھلے سارے گناہوں کی معافی اور

بخشش کی خوشخبری سنائی گئی ہے اور بلا شبہ ہم جیسے گناہگاروں کے لیے یہ بہت بڑی خوشخبری ہے۔ لیکن اسکے لیے شرط یہ لگائی گئی ہے کہ یہ روزے ایمان اور احتساب کی صفت کے ساتھ رکھے گئے ہوں ــــ ایمان اور احتساب یہ دونوں دین کے خاص اصطلاحی لفظ ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عمل کا اصل محرک اللہ ورسول پر ایمان اور ان کے بتلائے ہوئے ثواب کا یقین اور اس ثواب کی طلب و طمع ہو۔ تو جو نیک عمل اس صفت کے ساتھ کیا جائے وہی ایمان و احتساب والا عمل ہے۔ پس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص رمضان کے روزے اس لیے رکھتا ہے کہ وہ اللہ ورسول پر ایمان لایا ہے اور اُن کی شریعت کو اس نے قبول کیا ہے، اور قرآن و حدیث میں روزوں کا جو اجر و ثواب بتایا گیا ہے اس پر اس کا یقین ہے اور وہ روزے رکھ کے اس اجر و ثواب کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس شخص کے سب پچھلے گناہ ان روزوں کی وجہ سے معاف کر دیے جائیں گے۔

رمضان مبارک کی دوسری خاص عبادت "قیام لیل" ہے (یعنی رات کو نماز کے لیے اللہ کے حضور میں کھڑا ہونا، اس میں تراویح اور تہجد دونوں داخل ہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اس کی فضیلت و برکت بھی بالکل یہی بیان فرمائی ہے، آپ کا جو ارشاد میں نے ابھی سنایا، اس کے بعد متصلاً آپ کا ارشاد ہے۔

ومن قام رمضان ایمانًا	اور جو بندہ رمضان کی راتوں میں اللہ کے
واحتسابًا غفرله ما تقدم	حضور میں کھڑا ہو، ایمان و احتساب کے ساتھ
من ذنبه ۔	اس کے پہلے سب گناہ بخش دیے جائیں گے۔

میرے بھائیو! میرے خیال میں آپ سب حضرات اللہ کے فضل سے روزے رکھنے والے اور تراویح پڑھنے والے ہیں اور آپ میں سے بہت سے بھائی رمضان میں تہجد کے بھی عادی ہوں گے! اب اس حدیث کے سننے کے بعد ہم سب کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ ہمارے روزے اور ہمارے رات کے نوافل اور ہماری ساری عبادتیں ایمان و احتساب کے ساتھ ہوں۔ دراصل ایمان و احتساب ہر عمل اور ہر عبادت کی روح و جان ہیں۔ اور اُن کے پیدا کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ ہر عمل شعور اور نیت کے ساتھ کیا جائے اور اللہ کی رضا اور ثواب کی خاطر کیا جائے اور اس کے کرتے وقت اس یقین کو تازہ کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ حاضر ناظر ہے، وہ میرے عمل کو دیکھنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو توفیق دے کہ ہم اپنے روزے اور تراویح اور ساری عبادتیں اسی یقین اور نیت کے ساتھ اور استحضار کی کیفیت کے ساتھ ادا کریں! اگر یہ نصیب ہو گیا تو سمجھو سب کچھ نصیب ہو گیا۔

رمضان مبارک کی ان دونوں عبادتوں (صیام و قیام) کے متعلق ایک حدیث اور سُن لیجئے۔

مشکوٰۃ شریف میں امام بیہقی کی شعب الایمان کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

الصیام والقرآن یشفعان	دن کے روزے اور رات کو کھڑے ہو کر
للعبد یقول الصیام اے	نوافل میں قرآن پڑھنا یا سننا، یہ دونوں
رب انی منعتہ الطعام و	عبادتیں قیامت کے دن بندہ کے حق
الشہوات بالنہار فشفعنی	میں اللہ سے سفارش کریں گی، روزے
فیہ ویقول القرآن منعتہ	کہیں گے کہ اے پروردگار میری وجہ سے
النوم باللیل فشفعنی فیہ	یہ بندہ کھانے پینے سے اور خواہش نفس پورا
فیشفعان۔	کرنے سے دن میں رکا رہا اس لیے میری

شفاعت اس کے حق میں قبول فرما، اور قرآن کہے گا کہ میں نے اس کو رات میں سونے نہیں دیا اس لیے میری شفاعت اس کے حق میں قبول فرما! اللہ تعالیٰ ان دونوں کی یہ شفاعت اس کے حق میں قبول فرمائے گا

میرے بھائیو اور دوستو، ان روزوں کی اور رمضان کی راتوں میں جاگنے اور قرآن پاک میں مشغول رہنے کی قدر و قیمت اسی وقت معلوم ہوگی جب اللہ کے دربار میں یہ ہمارے سفارشی بن کے کھڑے ہوں گے اور ان کی سفارش پر جب ہمارے لیے گناہوں کی مغفرت کا اور رحمت و جنت کا فیصلہ کیا جائے گا۔

لیکن روزوں کی اور رات کے نوافل (تراویح وغیرہ) کی یہ ساری فضیلتیں اور برکتیں جب ہی ہیں جبکہ یہ عبادتیں اخلاص کے ساتھ اور ایمان و احتساب کی صفت کے ساتھ کی جائیں، اور ان ہدایات کے مطابق کی جائیں جو ان کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہیں، ورنہ خود حضور کا ارشاد ہے۔

کم من صائم لیس لہ من صیامہ الا الظمأ وکم من قائم لیس لہ من قیامہ الا السھر۔	کتنے ہی روزے رکھنے والے ایسے ہیں کہ ان کے روزوں کا حاصل سوائے پیاس (اور بھوک) کے کچھ نہیں، اور کتنے ہی رات کو تراویح پڑھنے والے ایسے ہیں کہ سوائے جاگنے کے اُن کی تراویح کا کچھ حاصل نہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا

من لم یدع قول الزور والعمل بہ فلیس للہ حاجۃ ان یدع طعامہ وشرابہ۔	جو شخص روزے میں جھوٹ اور غلط باتیں اور غلط کام نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کے بھوکے پیاسے رہنے کی کوئی پروا نہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے حضورؐ نے ارشاد فرمایا

الصائم فی صومہ من حین یصبح الی ان یمسی مالم یغتب فاذا اغتاب خرق صومہ۔	روزہ دار صبح کے وقت سے شام آنے تک روزہ کی حالت میں رہتا ہے تاوقتیکہ غیبت نہ کرے پس اگر اس نے کسی کی غیبت کی تو روزہ میں شگاف ہوگیا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی

اذا کان یوم صوم احدکم فلا یرفث ولا یصخب فان سابّہ احد او قاتلہ فلیقل انی صائم۔	جب تم میں سے کسی کے روزے کا دن ہو تو وہ کوئی بیہودہ حرکت اور بیہودہ بات نہ کرے اور تیزی میں زور سے بھی نہ بولے اور اگر کوئی دوسرا اُس سے گالی گلوج کرے اور لڑنا چاہے تو اس سے کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں۔

حضورؐ کے ان ارشادات سے معلوم ہوا کہ جھوٹ، غیبت، گالی بازی اور چیخنے چلانے سے اور ہر بدعملی اور معصیت سے روزہ خراب ہوتا ہے، اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ ہر نیک عمل سے مثلاً قرآن کی تلاوت، ذکراللہ، نفل نماز، صدقہ وخیرات اور تمام طاعات وحسنات سے روزہ کی

نورانیت اور قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔

دراصل رمضان کا پورا مہینہ اس لیے ہے کہ دن کو روزہ ہو، رات کو تراویح ہوں، پھر تہجد ہو، اللہ کا ذکر ہو، قرآن مجید کی تلاوت ہو، دعا ہو، توبہ ہو، استغفار ہو، معصیات سے بلکہ ہر ناپسندیدہ بات سے بھی پرہیز ہو ــــــــ

دوستو! ہمت کر کے ارادہ کرو کہ یہ رمضان انشاء اللہ اسی طرح گزاریں گے معلوم نہیں اس کے بعد ہم میں سے کس کو رمضان آئے اور کس کو نہ آئے! کتنے اللہ کے بندے ہیں جنھوں نے پہلے رمضان میں ہمارے ساتھ روزے رکھے تھے، تراویح پڑھی تھیں، اور سال پورا ہونے سے پہلے ہی وہ اس دنیا سے اٹھا لیے گئے، ہم میں سے کسی کو خبر نہیں کہ اگلا رمضان ہم کو زمین کے اوپر آئے گا یا زمین کے نیچے قبر میں! ــــ

ہاں! ایک بات رہ گئی۔ رمضان کے خاص اعمال میں سے روزہ اور تراویح کے علاوہ ایک اعتکاف بھی ہے، اعتکاف کا مطلب یہ ہے کہ بندہ ہر طرف سے کٹ کے اور سب سے ہٹ کے اللہ ہی کے آستانہ پر جا پڑے، اور گویا اسی کے قدموں میں جا گرے، یعنی اللہ کی کسی مسجد میں اپنے جسم کو مقید کر دے، ناگزیر بشری حاجات و ضروریات کے سوا وہاں سے قدم نہ نکالے، اسی طرح اپنے باطن کو صرف اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دے، اسی کا دھیان ہو، اسی کی یاد ہو، اسی کی عبادت ہو، اسی کی حمد و تسبیح ہو، اسی سے مانگنا اور اس کے حضور میں رونا اور گڑگڑانا ہو، ــــــ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ رمضان مبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے تھے، ایک سال کسی خاص وجہ سے آپ اعتکاف نہ فرما سکے تو اگلے سال بیسؔ دن کا اعتکاف فرمایا، اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سال آپ نے پورے مہینے رمضان کا بھی اعتکاف فرمایا تھا۔ آپ میں سے جن حضرات کے لیے موقع ہو وہ اعتکاف کی سعادت اور برکت بھی حاصل کریں، اور جن کے حالات میں اس کی گنجائش نہ ہو وہ بھی اتنا تو کم از کم ضرور ہی کریں کہ آخری عشرہ میں اپنے دوسرے مشغلوں کو کم سے کم کر دیں، اور دن رات کا زیادہ سے زیادہ حصہ نوافل اور ذکر و تلاوت اور دعا و استغفار اور اسی طرح کے دوسرے اعمال خیر میں گزاریں، اسی آخری عشرہ میں اکثر و بیشتر رحمتوں اور برکتوں والی وہ رات آتی ہے جس کو قرآن مجید میں "لیلۃ القدر"

کہا گیا ہے، اور فرمایا گیا ہے کہ وہ قدر و قیمت اور نزول برکات میں ہزار مہینوں سے بھی بہتر اور بڑھ کر ہے۔ اگر آپ نے پورا رمضان مبارک اور خاص کر اس کا آخری عشرہ میرے عرض کرنے کے مطابق اہتمام سے گزارا تو انشاء اللہ رمضان مبارک کی عمومی اور خصوصی برکتوں سے محرومی نہیں رہے گی ـــــ اللہ تعالیٰ کسی طالب کو محروم نہیں رکھتا، بس سچی طلب اور انابت شرط ہے ایک حدیث قدسی میں اس کا ارشاد تو یہ ہے کہ بندہ میری طرف ایک قدم چلے تو میں دو قدم اس کی طرف بڑھتا ہوں، اور وہ اگر کچھ تیز چل کر آئے تو میں دوڑ کے اس کی طرف آتا ہوں ــــــ بھائیو! اس ارحم الراحمین کی رحمت سے محروم رہنا بڑی ہی بدنصیبی اور بدبختی ہے۔ اللّٰھُمَّ اَسْعِدْنَا وَلَا تُشْقِنَا۔

تعارف و تبصرہ

سیرت سید احمد شہیدؒ مولفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ شائع کردہ خواجہ بکڈپو اردو بازار لاہور، صفحات قریباً ۵۰۰ سائز متوسط، مجلد مع گرد پوش قیمت ۸/۵۰

سید احمد شہیدؒ کی تحریک مسلمانانِ ہند کی تاریخ کا وہ باب ہے کہ بار بار پڑھنے پر بھی اس کی تازگی اور دلکشی میں فرق نہیں آتا۔ اربابِ عزیمت اور مخلصانِ حق، بلکہ دیوانگانِ حق، کے تذکرے ایسی ہی چیز ہیں، اور جب بیان کی زبان بھی بجائے خود دلکش ہو تو نور علی نور۔

سید شہید اور ان کے رفقاء کے بے پایاں اخلاص ہی کی برکت ہے کہ ہمارے اس زمانہ میں ان کی سیرت و سوانح نگاری کے حصہ میں مولانا ابوالحسن علی اور مہر صاحب[1] جیسے معروف اور مقبول اہل قلم آئے ہوئے ہیں، ہمارے اس دور میں پہلے مولانا علی میاں نے (۱۹۳۹ء میں) سیرت سید احمد شہیدؒ مرتب کی جو خوب خوب پڑھی گئی، اُس وقت یہ کتاب مختصر اور ایک ہی جلد میں تھی، پھر مولانا نے کچھ عرصہ بعد اسے از سر نو مرتب کرنا شروع کیا اور ٹھیک دس سال بعد نئی ترتیب کے ساتھ اس کی پہلی جلد لکھنؤ سے شائع ہوئی جو صرف سفر حج تک کے حالات و واقعات پر مشتمل تھی۔ باقی حصہ کی اشاعت میں کچھ موانع رہے، اور قبل اس کے کہ اس کی اشاعت کی نوبت آتی مولانا کی تلاش و جستجو نے اور اتنا نیا مواد و مسالہ فراہم کر لیا کہ اب پوری کتاب از سر نو شائع ہونے کی ضرورت تھی۔ اسی آخری مسودہ کی یہ پہلی جلد ہے جو لاہور سے شائع ہوئی ہے امید ہو کہ دوسری (اور آخری) جلد بھی وہاں سے جلد ہی شائع ہو جائے گی۔

---

[1] مہر صاحب کی کتاب چار جلدوں میں شائع ہوئی ہو پہلی دوسری اور چوتھی جلد خصوصاً دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

پیش نظر جلد میں سید صاحب کی بیعت و امامت کے انعقاد تک کے واقعات آگئے ہیں۔ یہ جلد پچیس ابواب پر مشتمل ہے۔ ان سے پہلے اولاً سید سلیمانؒ کے قلم سے ایک مقدمہ یا کتاب کا تعارف ہے جو سب سے پہلے اڈیشن کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس کے بعد مصنف کے قلم سے کتاب کے مقاصد و مآخذ کا بیان ہے۔ پھر سید صاحب کی سیرت پر ایک اجمالی روشنی ڈالتے ہوئے اس عہد کے حالات خصوصاً ہندوستان کے دینی، علمی، سیاسی اور اخلاقی حالات پر ایک تمہیدی مضمون لکھا گیا ہے۔ جو گویا سید صاحب علیہ الرحمہ کی تحریک کا پس منظر ہے اور جس کے بغیر ان کے کام اور مقام کی عظمت کا کما حقہٗ اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

کتاب کے پہلے چار باب ابتدائی اور انفرادی حالات و سوانح نیز خاندانی تفصیلات سے تعلق رکھتے ہیں، پانچویں باب سے سید صاحب کی تحریک کا دور شروع ہوتا ہے جس کی ابتدا تبلیغی اسفار ہیں، وسط سفر حجاز اور انتہا ہے جہاد! ـــ وذروۃ سنامہ الجہاد! ـــ پانچویں باب سے پندرھویں باب تک تبلیغی اسفار اور سفر حجاز کی روداد، بلکہ ایک طرح کا روزنامچہ ہے جس میں تقریباً ایک ایک دن کے حالات و واقعات کے استقصار کی کوشش کی گئی ہے۔ سولھویں باب میں بڑی خاصی تفصیل کے ساتھ مقاصد و اسباب جہاد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سترھواں باب علاقہ سرحد کے انتخاب کے وجوہ اور پنجاب، افغانستان اور سرحد کے حالات کو روشنی میں لاتا ہے ـــ یہ دونوں باب کتاب کے اہم ابواب شمار کئے جانے کے لائق ہیں ـــ اٹھارھویں باب سے بائیسویں باب تک راہ خدا کے اس پرصعوبت سفر کی داستان ہے جس کا انعام صرف شہادت ہے یا فتح و نصرت ہے۔ اور سید صاحب کے لیے شہادت مقدر تھی۔ ـــ سید صاحب کی امامت کے باقاعدہ انعقاد سے پہلے ایک دو معرکے پیش آگئے تھے تیئسویں اور چوبیسویں باب میں ان کا ذکر ہے۔ پچیسواں باب بیعتِ امامت کا ہے، جہاں سے سید صاحب باقاعدہ امیر المومنین منتخب کیے گئے۔

بعض تصاویر کے علاوہ دو اہم نقشے بھی کتاب کی زینت ہیں اور بلاشبہ یہ نقشے سید صاحب کی سیرت اور ان کی تحریک کے مطالعہ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک نقشہ سفر حجاز کا ہے دوسرا سفر ہجرت کا۔ اور دونوں میں اس عہد کے ہندوستان کی سیاسی صورت حال کو واضح کیا گیا ہے۔

دوسرا نقشہ دیکھ کر گویا سر کی آنکھوں سے یہ دیکھنے کا موقع ملتا ہے کہ سید صاحب اور ان کے رفقاء نے کیسا طویل اور پُرمشقت سفر ہنستے کھیلتے کیا۔ اس روح پرور نظارے کی اس سے بہتر تعبیر شاید ممکن نہ ہو جو مولف نے کی ہے کہ

" ان کے سفرِ ہجرت کے طویل، لیکن نورانی خط نے اس بر عظیم کے تین گوشوں کو اس طرح اپنے دائرے میں لے لیا ہے، جس طرح سمندر کسی جزیرہ نما کے تین حصوں کا احاطہ کر لیتا ہے "

اپنا تأثر یہ ہے کہ صرف اس دوسرے نقشے ہی کے لیے کتاب کو خریدا جا سکتا ہے، اور یوں اپنا اپنا ذوق ہے۔

کتاب کے ابتدائی اوراق میں محترم مؤلف کی ایک وہ تحریر بھی شامل ہے جو شاید کتاب کے پہلے اڈیشن کا مقدمہ یا پیش لفظ رہی ہوگی۔ یہ تحریر ۱۳۶۰ھ کی ہے جبکہ موصوف کی عمر ۲۳-۲۴ سال تھی۔ یہ تحریر جہاں ایک طرف یہ تأثر دیتی ہے کہ مولانا کی فکری اور ادبی صلاحیتیں کتنی تھوڑی ہی سی عمر میں نمایاں ہو گئی تھیں، وہاں یہ عرض کرنے کا موقع بھی دیتی ہے کہ اس کا ایک آدھ مقام نظرِ ثانی کا محتاج ہے ——— اسلام میں اقتدار کی اہمیت مسلّم۔ لیکن حصولِ اقتدار کی جدّوجہد کے لیے یہ استدلال کہ

" حکومت کے بغیر قرآن مجید کا ایک پورا حصہ ناقابلِ عمل رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اسلام کا پورا نظام مالی و دیوانی و فوجداری معطل ہو جاتا ہے "

تقریباً اسی طرح کا استدلال ہے جیسے قرآن میں " ایتاءِ زکوٰۃ " کا حکم دیکھ کر کوئی شخص " صاحبِ نصاب " بننے کی جدوجہد کو بھی ضروری سمجھ لے۔

اسی طرح یہ جملہ کہ " قرآن غلبہ و عزت کے حصول پر زور دیتا ہے " ——— ہمیں کھٹکتا ہے کہ قرآن کے منشاء کی یہ تعبیر کہاں تک صحیح ہے؟

آگے اسی سلسلہ کلام میں " امر بالمعروف اور نہی عن المنکر " کی فرضیت کا ذکر لا کر اور اس باب کی بعض قرآنی آیات نقل فرما کر یہ نکتہ پیش کیا گیا ہے کہ " امر و نہی کے لفظ میں اقتدار اور

تحکم کی شان ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ وہ بھلائی اختیار کرنے کے لیے درخواست دعرض کریں گے"۔
اور پھر استنتاج کے طور پر فرمایا گیا ہے۔

" پس امرونہی کے لیے سیاسی اقتدار اور مادی قوت کی ضرورت ہے"

ہم حیران ہیں کہ اس پر کیا تنقید کریں؟ اس پر تو عجیب عجیب سوالات اٹھتے ہیں۔ اور ہم وہ سوالات پیش کرتے اگر یہ سمجھتے کہ مولانا کا خیال اب بھی اس باب میں یہی ہے۔ مگر ہمارا علم و اندازہ یہ ہے کہ

یہ باتیں ہیں جب کی جب آتش جوان تھا

اس لیے بیکار معلوم ہوتا ہے کہ گفتگو کو طول دیا جائے۔ بس اتنا ہی عرض ہے کہ آئندہ اڈیشن کی اگر نوبت آئے تو اس پر نظر ثانی ہونی چاہیے۔

تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ

مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی — ناشر مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، بادشاہ باغ لکھنؤ، صفحات ۱۵۲۔ سائز $\frac{22\times18}{8\times1}$ مجلد قیمت ۲/۰

حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ اُن اکابر اولیاء اللہ میں ہیں جن کے دامن فیض سے بے شمار عوام و خواص نے فیض پایا۔ آپ کا زمانہ ۱۲۰۸ھ تا ۱۳۱۳ھ ہے۔ بقول تذکرہ نگار "ہماری اس صدی کے آغاز میں اگرچہ انگریزوں کے دم قدم سے مادیت کے قدم اس ملک میں جم گیے تھے اور اہل دل بڑے درد سے کہہ رہے تھے:۔

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دوکان اپنی بڑھا گئے

پھر بھی عشق الٰہی کی کہیں کہیں دوکانیں قائم تھیں۔ جہاں سے جذب و شوق اور درد محبت کا سودا ملتا تھا۔ ان دوکانوں میں دو دوکانیں خاص طور پر مرجع خاص و عام تھیں۔ ایک گنگوہ میں، اور ایک گنج مرادآباد میں" ــــــ یہ گنج مرادآباد کی "دوکانِ عشق" حضرت شاہ فضل رحمٰنؒ کی خانقاہ تھی۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین و معتقدین میں، حضرت حکیم الامت تھانوی۔

حضرت مولانا محمد علی مونگیری، مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی، مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنی مولانا سید تجمل حسین بہاری، صفی الدولہ نواب سید علی حسن خاں اور صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی، جیسے اکابر و مشاہیر ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض حضرات نے مولانا کے ذکر میں مستقل کتابیں اور رسالے لکھے ہیں، بعض نے اپنی حاضری اور تأثرات کے بیان میں مختصر مضامین۔ مولانا سید ابوالحسن علی نے اسی قدیم مواد سے نئے انداز اور عصری مذاق کی رعایت کے ساتھ یہ تذکرہ مرتب فرمایا ہے۔ جو "دوکان عشق" نہیں تو کتابِ عشق ضرور ہو۔

دو قسم کے مواد کے مطابق، کتاب بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک حصہ میں کتابوں اور رسالوں سے منتخب کیا ہوا مواد ہے۔ دوسرے میں مشاہیر کے مضامین ہیں مثلاً مولانا محمد علی مونگیریؒ، مولانا تھانویؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی وغیرہ — دوسرے حصہ کے متعلق تو یہ کہنے کی شاید ضرورت ہی نہ ہو کہ یہ محض نقل ہے۔ پہلا حصہ بھی زیادہ تر نقل و اقتباس ہی پر مشتمل ہے، اس کا ڈھنگ یہ ہے کہ مولانا نے مختلف کتابوں اور رسالوں سے اقتباسات لے کر پہلے انھیں چند ابواب میں تقسیم کر دیا ہے جن کے عنوانات یہ ہیں:-

حالات و معمولات، درد و محبت، اتباعِ سنت و احترامِ شریعت، قرآن و حدیث سے عشق، بذل و عطاء، زہد و توکل، فیض و تأثیر، کمالِ علمی، قرآن و حدیث کے الفاظ کے ہندی ترجمے، علالت و وفات۔

پھر ہر اقتباس پر ایک ذیلی عنوان دیدیا گیا ہے، مولانا کے قلم سے بس ہر باب کے شروع میں چند تمہیدی سطریں ہوتی ہیں۔ دو چار جگہ بیچ میں بھی ایسا ہوا ہو۔ باقی سب اقتباسات — کتاب کا پہلا باب "اجداد و شیوخ" کے عنوان سے ہے وہ اس اقتباسی ڈھنگ کا نہیں ہو۔ اس میں مولانا کی اپنی زبان ہے۔

غائبانہ تعارف بہت ہو چکا، اب ایک جھلک بھی کتاب کی دیکھ لیجئے۔

"باوجود اس سادگی و بے تکلفی کے جو مولانا کی زندگی میں نمایاں تھی، آپ کی صحبت میں اتنی کیفیت، آپ کی نسبتِ باطنی میں قوت اور کلام میں ایسی دلآویزی تھی کہ بجلی کی طرح اثر کرتا تھا، اور حسبِ استعداد مدت تک اس کا

اثر رہتا تھا، یہاں اس فیض و تاثیر کے چند واقعات درج کئے جاتے ہیں:-

گریۂ محبت | مولوی تجمل حسین صاحب لکھتے ہیں، ایک مرتبہ فقیر رخصت ہونے کو حجرہ میں گیا تو میری زبان سے یہ شعر نکل آیا:-

نہ ہو دیدار میسر تو نہ ہو — درِ جاناں کی زیارت ہی سہی

نہ ہو قسمت میں مرے ساغرِ مے — تیرے میخانے کی خدمت ہی سہی

آپ اس وقت اذکار و اشغال میں مشغول تھے۔ آپ نے سر اٹھایا کچھ آیت پڑھ کر سینہ پر دم کر دیا، اور یہ شعر فرمایا:-

دیدۂ سعدی و دل ہمراہِ تست — تا نہ پنداری کہ تنہا می روی

اور فرمایا کہ اب جاؤ، مجھ کو دو کوس تک غلبۂ محبتِ الٰہی میں گریہ تھمتا نہیں تھا۔ اور بیخودی از حد طاری تھی۔"

(بابِ فیض و تاثیر کا پہلا صفحہ)

کتاب کا کاغذ، کتابت، طباعت، ہر ہر چیز اتنی اعلیٰ اور دیدہ زیب ہے، کہ مصنف ناشر اور طابع سب کو مبارکباد دینے کو جی چاہتا ہے، اس معیار پر دینی کتابیں شاذ و نادر ہی چھپتی ہیں۔

چراغ راہ اسلامی قانون نمبر | مرتبہ خورشید احمد ایم، اے۔ پتہ:- دفتر چراغ راہ کراچی ملا پاکستان ——— جلد اوّل (صفحات ۴۵۲) قیمت -/۸/۴ جلد دوم (صفحات ۳۵۰) قیمت -/۸/۳

چراغ راہ، جماعت اسلامی پاکستان کے مکتبِ فکر کا، ایک خاصا پرانا ماہنامہ ہے۔ دو ایک سال پیشتر تک وہ نعیم صدیقی صاحب کی ادارت میں نکلتا رہا۔ پھر ایک اور صاحب کی ادارت میں آیا، اور اب اسے خورشید احمد صاحب نے سنبھالا ہے۔ اور اپنے دور کا افتتاح انھوں نے اسی خاص نمبر سے کیا ہے، جسے ہم بلاشبہ ایک عظیم الشان نمبر کہہ سکتے ہیں ——— نمبر اپنی ضخامت کے اعتبار سے بھی عظیم ہے کہ دو جلدوں میں مکمل ہوا ہے۔ پہلی جلد ۶ حصوں

پر منقسم ہے۔

۱۔ قانون اور اصول قانون۔ ۲۔ اسلام کا تصور قانون۔ ۳۔ اسلامی قانون کا تقابلی مطالعہ۔ ۴۔ ماخذ قانون اسلامی۔ ۵۔ تاریخ قانون اسلامی۔ ۶۔ دستور شعر۔

اور پھر ہر حصہ کئی کئی مقالات پر مشتمل ہے۔ علاوہ حصہ ششم کے کہ یہ حصہ مقالات کا نہیں منظومات کا ہے۔ دوسری جلد کے تین حصے ہیں۔

۷۔ اسلامی قانون کی تشکیل جدید۔ ۸۔ بحث ونظر (اس میں "اسلامی قانون اور تعمیر نو" کے عنوان پر ایک سوالنامہ مرتب کر کے۔ ان سوالوں پر مختلف اہل علم کے جوابات اور خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ یہ گویا ایک سمپوزیم ہے۔) ۹۔ ہمارا قانونی سرمایہ۔

ٹھوس علمی ذوق کے اس انحطاط کے دور میں اس نمبر کی تدوین ادارہ چراغ راہ کا ایک بڑا ہی امید افزا کارنامہ ہے۔ اس میں ایک طرف نئے مضامین بھی لکھے اور لکھوائے گئے ہیں۔ دوسری طرف موضوع سے متعلق اب تک جو کچھ لکھا گیا تھا بڑی دیدہ ریزی سے اسکی جستجو اور پھر اسکا انتخاب کیا گیا ہے ــــ پھر معاملہ صرف اردو ہی کے دائرہ تک محدود نہیں رہا ہے، بلکہ عربی اور انگریزی کے بھی کتنے ہی قابل مطالعہ مضامین و مقالات کے ترجمہ کی کاوش بھی اٹھائی گئی ہے اور اس طرح یہ نمبر حال سے گزر کر ماضی اور ہندوپاک سے گزر کر یورپ اور عربی دنیا کے مشاہیر اہل قلم کے افکار و خیالات کو بھی جامع ہو گیا ہے۔

غالباً کام کی زیادتی کی وجہ سے کتابت کی غلطیاں بہت رہ گئی ہیں۔ یہ ایک علمی اور تحقیقی مجموعہ کا بڑا نقص اور اس پر بڑا ظلم ہے۔

البعث الاسلامی خاص نمبر

مرتبہ سید محمد حسنی۔ صفحات ۱۶۰ــ پتہ:۔ دفتر البعث الاسلامی ۳۷۔ گوئن روڈ، لکھنؤ ــ البعث کا سالانہ چندہ چھ روپے فی پرچہ ۸ر آنے۔ اس نمبر کی قیمت درج نہیں۔

البعث الاسلامی ہندوستان کا غالباً واحد عربی ماہنامہ ہے۔ ہندوستان میں عربی

رسالہ نکالنا جس قدر حوصلہ اور ہمت کا کام ہے وہ صرف اس راہ میں قدم رکھ کر ہی معلوم ہو سکتا ہے، یا کسی راہرو کے حالات جان کر۔ ہم دوسری قسم میں ہیں، اور ہمیں معلوم ہے کہ اس رسالہ کا ابتک جاری رہنا کس قدر حوصلہ و استقامت کا رہین احسان ہے۔ اللہ تعالیٰ اِن حضرات کی ہمتیں قائم رکھے۔ اور ہندوستان کے علما، اہل مدارس اور طلبا کو توفیق دے کہ وہ جدید عربی سے مانوس ہونے کے لئے اس سے فائدہ اٹھائیں۔

البعث الاسلامی نے اپنے تیسرے سال کے اختتام پر یہ خاص نمبر پیش کیا ہے جس کا موضوع ہے "الدعوۃ الاسلامیۃ فی العالم" نمبر اپنے اندر ان لوگوں کی دلچسپی کا وافر سامان رکھتا ہے جنھیں اسلامی دعوت سے دلچسپی ہو اور یہ جاننے کا شوق ہو کہ دُنیا کے مختلف ملکوں میں اسلامی دعوت کی رفتار کیا ہے۔ کہاں کہاں کون کون سی اسلامی جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ کیا اُن کا طریق کار ہے، اور کیا اُن کے حالات ہیں؟

اس نمبر میں جن ملکوں پر مضامین ہیں وہ ہیں لبنان، اردن، عراق، لیبیا، ترکی، ایران انڈونیشیا، نائیجریا، برما، فن لینڈ، مغربی جرمنی، فلپائن۔ لکھنے والے عموماً مقامی حضرات ہیں۔ خود ہندوستان پر رسالہ کے سرپرست اور نگراں مولانا علی میاں مدظلہ کا مقالہ ہے جو غالباً اس نمبر کا طویل ترین مقالہ ہے۔ اور یہ اس سے بہت پہلے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ یعنی "الدعوۃ الاسلامیۃ فی الھند وتطوراتھا"

مضامین عموماً دلچسپی سے پڑھے جانے کے لائق اور معلومات افزا ہیں، مگر یہ بڑی کمی ہے کہ موجودہ ہندوستان و پاکستان میں دعوت اسلامی کی رفتار اور رجال و جماعات کو ظاہر کرنے والا کوئی مضمون نہیں ہے، صرف تبلیغی جماعت کا کچھ ذکر ہے اور وہ بھی نامکمل۔

بدعت کیا ہے | ناشر مکتبۂ تجلی، دیوبند۔ صفحات ۳۰۰ قیمت تین روپے۔

ماہنامہ فاران کراچی نے ایک خاص اشاعت توحید نمبر کے عنوان سے پیش کی تھی، جسے عام طور پر پسند کیا گیا۔ اس کے چار مقالے ہیں جو اس کتاب کی صورت میں یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ پہلا مقالہ ایڈیٹر فاران ماہر القادری صاحب کا ہے۔ دوسرا عطیہ خلیل

عرب صاحب کا "الوسیلہ کا حقیقی مفہوم"۔ تیسرا۔ مولانا شیخ احمد صاحب کا "قبر پرستی" چوتھا۔ ایڈیٹر تجلی عامر عثمانی صاحب کا "بدعت توحید کی ضد ہے"۔

بدعت پرستی نے دین کو اور خود امت کو جس قدر نقصان پہنچایا ہے اُسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا، امت کے اس ناسور کے خلاف جہاد کرنا بڑی سعادت ہے ـــــ پس مبارک ہیں وہ اہل خیر جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت کے مصارف برداشت کیے، جس سے اگر اللہ چاہے تو بہت سوں کی اصلاح ہو سکتی ہے۔

تذکرۂ اولیاء ہند و پاکستان

از، مفتی ولی حسن ٹونکی۔ ناشر محمد سعید اینڈ سنز، مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی ۱۔ کاغذ رف صفحات ۱۹۲ قیمت ۲/-

اس کتاب میں حضرت خواجہ عثمان ہارونی اور خواجہ معین الدین چشتی سے لے کر حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی تک ۱۹ اولیاء کبار کا تذکرہ ہے، جو اپنے اپنے وقت میں سرزمین ہند پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور جن کی روحانیت کا نور آج تک اندھیروں سے لڑ رہا ہے۔

مؤلف نے ان اولیاء کرام کے حالات و سوانح سے آج کے نوجوانوں کی بے اعتنائی اور ناواقفیت کا ماتم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس کتاب کو اس لیے پیش کیا جا رہا ہے کہ ہمارے نوجوان اپنی سیرت کی تربیت اور شخصیت کی تعمیر میں اس سے مدد لے سکیں"۔ (دیباچہ) مگر ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مؤلف جن نوجوانوں کے لیے یہ کتاب پیش کر رہے ہیں ان کے لیے یہ کتاب کچھ بھی مفید نہ ہو سکے گی، بلکہ ہم یہاں تک کہنے پر مجبور ہیں کہ اولیاء کرام کے بارے میں ضعیف الاعتقاد یا "خوش عقیدہ" مسلمانوں میں جو غلط تصورات اور اعتقادات فی زمانہ پھیلے ہوئے ہیں اور توحید کے شجرۂ طیبہ کی جڑوں میں دیمک بن کر لگے ہوئے ہیں، یہ کتاب اُن تصورات اور اعتقادات کو تقویت پہنچائے گی۔

پہلے ہی بزرگ خواجہ عثمان ہارونیؒ کی کرامات میں درج ہے کہ آپ کے ایک مرید کا انتقال ہوا تو خواجہ معین الدین چشتیؒ جو دفن کے بعد قبر پر رہ گئے تھے، انھوں نے دیکھا کہ عذاب کے

فرشتے آئے اسی وقت خواجہ ہارونی بھی پہنچ گئے (یعنی قبر میں) اور فرشتوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اسے عذاب نہ کرو یہ میرا مرید ہے۔ اس پر فرشتوں نے بحکم خداوندی جواب دیا کہ یہ تمہارا سچا مرید نہ تھا، بلکہ تمہارے برخلاف تھا، خواجہ نے فرمایا بے شک برخلاف تھا، مگر یہ ہمیشہ اپنے سلسلہ سے وابستہ جانتا تھا۔ چنانچہ فرشتوں کو حکم ہوا کہ اس سے عذاب اُٹھالو۔

پھر کیا غلط ہے اگر مسلمان عوام اس خیال خام میں مبتلا ہو جائیں کہ پیر ہماری بخشش کا ضامن ہے۔ وہ خدا سے نپٹ لے گا ـــــ سبحانک ھذا بہتان عظیم۔ قرآن کہتا ہے خدا کے آگے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں، وہاں بلا اجازت شفاعت کے لئے لب نہیں ہل سکتا۔ من ذی الذی یشفع عندہٗ الا باذنہ ـــــ حدیث خبر دیتی ہے کہ قیامت کے دن کچھ لوگوں کو حضور دیکھیں گے کہ عذاب کے فرشتے پکڑے لیے جا رہے ہیں۔ آپ پکاریں گے۔ منی و من امتی "! ارے یہ تو میرے اُمتی ہیں۔ بارگاہ الٰہی سے ارشاد ہوگا، لا تدری ما احدثوا بعدک ـــ تمہیں نہیں معلوم انھوں نے تمہارے بعد کیا کیا تھا! اور بس معاملہ ختم ہو جائے گا ـــــ اور یہاں بتایا جاتا ہے کہ سرور انبیاء کی بات پیشِ خدا چلے، یا نہ چلے۔ اولیاء اللہ کی چل کر رہتی ہے۔ استغفر اللہ! کیا غضب ہے!

بوعلی شاہ قلندر پانی پتیؒ کے تذکرہ میں ہے۔

"کئی کئی روز تک پانی میں بحالتِ استغراق کھڑے رہے کہ مچھلیاں تمام گوشت پنڈلی کا کھا گئیں۔ ایک روز عبادت میں مصروف تھے کہ غیب سے آواز آئی .... مانگ کیا مانگتا ہے عرض کیا پروردگار .... سوائے تیری ذاتِ اقدس کے کچھ درکار نہیں۔ اس جگہ کھڑا تیری محبت میں جان دیدوں گا۔ پھر آواز آئی کہ پانی سے نکل تجھ سے بہت کام لینے ہیں۔ عرض کیا دریائے محبت سے خود نہیں نکلوں گا "۔ الخ (ص ۹۴)

عالم جذب وسکر کی یہ باتیں صحیح ہو سکتی ہیں، مگر ان دور از کار باتوں کی روایت سے فائدہ کیا؟ یہ کونسا لائق تقلید اُسوہ ہے جس سے نوجوان اپنے کردار کی تربیت میں مدد لیں؟ اس قسم کی دور از کار باتوں سے کتاب بھری پڑی ہے، بلکہ بعض حضرات کا تذکرہ تو اس سے بھی آگے

بڑھ کر نری شطحیات کا طومار ہے جسے پڑھ کر دم گھٹنے لگتا ہے۔ مثلاً مخدوم صابر کلیری کا تذکرہ۔

یہ مطلب نہیں ہے کہ کتاب میں کچھ بھی کار آمد باتیں نہیں۔ مگر یہ دور از کار قسم کی جذبات اور شطحیات بھی اس قدر ہیں کہ کتاب کی مجموعی حیثیت کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔

مختصر یہ ہے کہ کتاب کا مزاج قریب قریب وہی ہے جس نے اولیاء کے تذکروں کو "خوش اعتقادی" اور دور از کاری کے لیے بدنام کر رکھا ہے۔ ویسے اس میں شبہ نہیں کہ بزرگان دین سے ایک سرسری تعارف اس کتاب کے ذریعہ ضرور ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی بہرحال ایک فائدہ ہے۔

واقعات و حالات کی تاریخی تحقیق کے اعتبار سے کتاب کس درجہ کی ہے؟ اس بارے میں رائے قائم کرنے میں آسانی ہوتی اگر مؤلف نے حوالوں کا اہتمام کیا ہوتا۔ مگر حوالے عموماً ندارد ہیں، جو بتا سکتے کہ کس قسم کے مآخذ پر اعتماد کیا گیا ہے۔ اس لیے پوری کتاب کے بارے میں تو نوری طور پر رائے زنی مشکل ہے، البتہ دو ایک غلطیاں بالکل کھلی ہوئی نظر پڑی تھیں جن میں سے ایک یاد رہ گئی ہے — حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کا سنِ ولادت ۱۲۱۳ھ بتایا گیا ہے۔ حالانکہ مولانا کی پیدائش ۱۲۰۸ھ میں ہے۔ جو خود اسم گرامی "فضل رحمٰن" سے نکلتی ہے۔

خواجہ ہارونی کے تذکرہ میں کئی جگہ ان کے لئے "مجیب الدعوات" کا لفظ آیا ہے — (ص۲۲، ۲۳) یہ معلوم ہوتا ہے "مستجاب الدعوات" کے معنیٰ میں لکھا گیا ہے۔ علیٰ ہذا ص $\frac{۳۴}{۲}$ پر "خود مختاری" کا لفظ آتا ہے حالانکہ یہ محل خود اعتمادی کا تھا نہ کہ "خود مختاری" کا!

حضرت شیخ علی ہجویری کے بارے میں لکھا ہے۔ "آج بھی آپ کے مزار پُر انوار پر ایک میلہ سا لگا رہتا ہے اور جمعرات کو تو اسقدر ہجوم ہوتا ہے۔" ص

بدگمانی معاف۔ یہ انداز تحریر غمازی کرتا ہے کہ مؤلف کا دل اس "میلہ" اور ہجوم کے ذکر سے بڑی خوشی محسوس کر رہا ہے، حالانکہ یہ میلہ جیسا ہوتا ہے اور جو کچھ اس میلہ میں ہوتا ہے وہ خوش ہونے کی نہیں رونے کی بات ہے۔

۱۔ چند دن حجاز میں
۲۔ آپ حج کس طرح کریں

از، جناب حاجی محمد زبیر صاحب لائبریری اسسٹنٹ مسلم یونیورسٹی لائبریری۔

حاجی محمد زبیر صاحب نے بڑی آرزوؤں اور ارمانوں کے بعد حج و زیارت کی سعادت پائی۔ خود لکھا ہے کہ کس طرح وہ کوڑی کوڑی کرکے سفر خرچ جمع کرتے رہے۔ اور شوق و ولولہ کی کتنی پختگی کے بعد ان کی مراد برآئی ——— سفر حج یوں بھی ایک یادگار سفر ہے، پھر اتنے شوق و ارمان کے ساتھ کیا جائے تو اسکی یاد آدمی کو کتنی عزیز ہو گی، اسی یاد کو قائم رکھنے کے لیے حاجی صاحب موصوف نے اپنے حج کا سفرنامہ لکھا، پہلی کتاب میں اس سفرنامہ کا پہلا اور دوسرا حصہ ہے ——— پہلے حصہ میں اپنے سفر کی روداد ہے۔ دوسرے میں حج کے منافع، حج کی تاریخ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر خلفاء عباسیہ تک کے حج اور شغفِ حج کا کچھ مختصر تذکرہ ہے ——— اس کتاب کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ کتابت طباعت معمولی ہے، کاغذ بہتر ہے، ضخامت قریباً ۸۵ صفحات۔

دوسری کتاب اس سفرنامہ کا تیسرا حصہ ہے، اس میں سفر حج و زیارت کے سارے منازل کی اختصار اور خوش اسلوبی کے ساتھ رہنمائی کی گئی ہے۔ امید ہے کہ عازمین حج کو اس چھوٹے سے رسالہ کی معیت سے بڑا فائدہ ہو گا۔ یہ رسالہ دوسری بار ایک صاحب خیر کی طرف سے شائع کیا گیا ہے، اور عازمین حج کے لیے کوئی قیمت نہیں رکھی گئی ہے۔ دونوں کتابیں مصنف سے طلب کی جا سکتی ہیں۔ پتہ ہے، فرحت منزل۔ بدر باغ، علی گڑھ۔

(بقیہ صفحہ ۳۵) ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا ونجعلھم ائمۃ ونجعلھم الوارثین۔
(قصص ۵۔) ہم چاہتے ہیں کہ جو لوگ دنیا میں کمزور سمجھے جاتے ہیں (یعنی اہل ایمان) ان کو اپنے فضل و کرم سے نوازیں اور امامت و رہنمائی کا منصب عطا فرمائیں اور (زمین کا) وارث بنائیں۔

اعلان — آئندہ رسالہ (بابت اپریل) بجائے ۱۵ر کے ۲۰ر اپریل کو شائع ہو سکے گا۔ ناظرین نوٹ فرمائیں ——— "منیجر"

اپریل ۱۹۵۹ء

الفرقان

ماہنامہ — لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

[illegible]

ادارہ الفرقان

مسئول
محمد منظور نعمانی

مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات

کلمۂ طیبہ کی حقیقت

ازافادات مولانا نعمانی

اس میں اسلام کے کلمۂ دعوت

"لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ"

کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ سطر سطر سے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے اور دماغ کے ساتھ دل بھی متاثر ہوتا ہے۔

قیمت ۰/۶/۰

نماز کی حقیقت

ازافادات مولانا نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اس کی روح و حقیقت سے واقف ہونے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں "کلمۂ طیبہ کی حقیقت" کی طرح یہ بھی عقل، جذبات اور دل و دماغ کو یکساں متاثر کرتا ہے۔

قیمت ۰/۱۲/

برکات رمضان

ازافادات مولانا نعمانی

اسلام کے اہم رکن "صوم رمضان" اور ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال و وظائف تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات اور ان کی روحانی تاثرات کا نہایت مؤثر اور شوق انگیز بیان اور حکیم اُمت حضرت شاہ ولی اللہؒ کے طرز پر اس سلسلہ کی احادیث کی ایسی تشریح جس سے دل بھی متاثر ہو اور دماغ بھی مطمئن۔ قیمت ۰/۱۲/۰

اسلام کیا ہے؟

تالیف مولانا نعمانی

اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں

اس کتاب کے دیکھنے والوں کا عام احساس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کوئی خاص مقبولیت و تاثیر عطا فرمائی ہے، پچھلے چند سالوں میں تقریباً تیس ہزار اردو میں اور کئی ہزار گجراتی میں شائع ہو چکی ہے

اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کے لیے ہی نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ اور عمل ان شاء اللہ کافی ہے۔

زبان نہایت آسان ہونے کے ساتھ نہایت شیریں اور پرتاثیر ہے۔ کتابت طباعت اعلیٰ اور معیاری قسم اول کاغذ ۲۰ پونڈ چکنا مجلد ۰/۰/۲ قسم دوم کاغذ ۲۲ پونڈ چکنا غیر مجلد ۰/۱۲/۱

ہندی اڈیشن کاغذ اعلیٰ مجلد۔ قیمت تین روپے ۰/۰/۳

آپ حج کیسے کریں؟

حج و زیارت کے متعلق اردو زبان میں بیشمار چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب (جو مولانا نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی گویا مشترک تالیف ہے) اپنی اس خصوصیت میں اب بھی بے نظیر ہے کہ اس کے مطالعہ سے حج کا صحیح اور مسنون طریقہ بھی تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہے اور دل میں عشق و جذب اور ذوق و شوق کی وہ کیفیات بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو در اصل حج کی روح اور جان ہیں۔

کاغذ عمدہ .... قیمت مجلد ۰/۰/۲

آسان حج یہ آسان زبان میں "حج کیسے کریں" کا خلاصہ ہے۔ ایسے کم تعلیم والے حضرات جو صرف آسان اور معمولی اردو ہی پڑھ سکتے ہیں وہ اس کے مطالعہ سے پورا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

طباعت معیاری .... قیمت .... صرف ۰/۸/۰

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

تالیف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے قابل قدر فاضلانہ اور مبسوط مقدمہ ۰/۸/۲

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی۔ قیمت ۰/۸/۱

امام ولی اللہ دہلویؒ

از مولانا عبید اللہ سندھیؒ ...... قیمت ۰/۰/۱

انیس نسواں

از محترمہ بیگم سید اصغر حسین صاحب

مسلمان خواتین خاص کر تعلیم یافتہ بہنوں میں دین کی طرف سے جو بے فکری اور آخرت کی طرف سے جو غفلت تیزی سے بڑھ رہی ہے اس کے علاج اور انسداد کے لیے ایک محترم بہن نے یہ رسالہ لکھا ہے۔ شروع میں مولانا نعمانی کے قلم سے پیش لفظ ہے۔ ...... قیمت ۰/۱۰/۰

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

قیمت ۰/۶/۰

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین کے الزامات

قیمت ۰/۸/۱

معرکۃ القلم

اکابر دیوبند کی طرف سے مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا آخری تحقیقی جواب .... قیمت ۰/۰/۱

ماہنامہ
الفرقان لکھنؤ

ہندستان و پاکستان سے
سالانہ چندہ (سکۂ پاکستان) ۷ؔ
سالانہ چندہ (سکۂ ہندستان) ۶ؔ
ششماہی ...... ۳ؔ
فی کاپی ...... آٹھ آنے

غیر ممالک سے
سالانہ چندہ ۱۰ شلنگ

اعزازی خریداروں سے
سالانہ ...... ۱۵ؔ

جلد (۲۶) | بابتہ ماہ رمضان المبارک ۱۳۷۸ھ مطابق اپریل ۱۹۵۹ء | شمارہ (۹)

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب یہ ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہو، براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی پی ارسال کیا جائے گا۔

• چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۱۴ تاریخ تک پہونچ جانی چاہیے۔

پاکستان کے خریدار:- اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت:- رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ ر تاریخ کو روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۵ ر تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:- **دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ**

(مولانا) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

کئی سال سے ملک کے فرقہ وارانہ حالات میں ایک گونہ سکون سا چل رہا تھا۔ اور معلوم ہونے لگا تھا کہ اب وہ حالات لوٹ کر آنے والے نہیں ہیں، جنھوں نے مدتوں کے لئے ملک کی رسوائی کا سامان کر دیا تھا۔ لیکن معلوم ہوا کہ اتنا اطمینان صحیح نہیں تھا جتنا کر لیا گیا تھا۔ ابھی ایسی چنگاریاں اس خاکستر میں باقی ہیں جنھیں ہوا دیکر کہیں بھی آتش زار بنایا جا سکتا ہے۔ اور بھوپال و مبارک پور کے سے اندوہناک حالات پیدا کئے جا سکتے ہیں۔

فرقہ واریت کے اس نئے اُبھار کا ایک نہایت تاریک پہلو یہ ہے کہ اس میں پولیس اور شہری امن وامان کے ذمہ دار بُری طرح اور کھلے خزانے ملوّث ہوئے ہیں۔ اس کا سبب کیا ہو؟ اس تفصیل میں اس وقت جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ بہرحال ایک واقعہ ہے جس کو واقعات کی تفصیلات پوری طرح ثابت کر رہی ہیں۔ پولیس اور افسران پولیس کا یہ کردار متعلقہ حکومتوں کی پیشانیوں پر ایک نہایت مکروہ داغ ہے جو ذمہ دارانِ حکومت کی بڑی اخلاقی جرأت اور غایت درجہ کی فرض شناسی ہی سے دُھل سکتا ہو۔ مگر ہمیں نہیں معلوم کہ یوپی اور مدھیہ پردیش کی حکومتیں اس داغ کو داغ سمجھیں گی۔ یا اپنی خدمات کے فرقہ وارانہ فائل میں سند بنا کر رکھیں گی۔ البتہ اب تک اس سلسلہ میں سرد مہری سے دوسری ہی صورت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے، اور اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوگی۔ اس لئے کہ اگر پہلی صورت متوقع ہوتی تو پولیس کو اس کھلے کھیل کی جرأت ہی کب ممکن تھی!۔

فرقہ پرستوں اور پولیس کے اس گٹھ جوڑ نے تقریباً سارے ملک کے مسلمانوں کی توجہ اپنی طرف

کھینچ لی ہے۔ اور جگہ جگہ یہ کیفیت پائی جاتی ہے جیسے نظر کسی بڑے موٹے سوالیہ نشان سے الجھ رہی ہو۔
اس موقع پر گفتگو کے کئی پہلو نکل سکتے ہیں۔ مظلوموں کی مصیبت کا مرثیہ بھی کہا جا سکتا ہے، متعلقہ حکومتوں یا اُن کے عمّال کو ہدفِ ملامت بھی بنایا جا سکتا ہے اور اربابِ حکومت کو خطاب کرکے اُن کی ذمہ داریاں بھی یاد دلائی جا سکتی ہیں، مگر یہ سوال کہ اس سے فائدہ کیا ہوگا؟ — ان پہلوؤں سے طبیعت کو سرد کر دیتا ہے۔ اور پہلو صرف یہ سامنے رہجاتا ہے کہ مسلمان بطورِ خود کیا کریں؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات جو اپنے برادرانِ ملت سے کہنے کو سمجھ میں آتی ہے، یہ ہے کہ وہ ان واقعات سے خوف و ہراس، ذلتِ نفس اور احساس بیچارگی کا شکار نہوں۔ شہری نظم و نسق کے ذمہ داروں اور امن و امان کے محافظوں کی طرف سے نہ صرف اپنی ڈیوٹی سے غفلت بلکہ اپنی ڈیوٹی کے نام پر کھلی جانبدارانہ اور مجرمانہ کارروائیوں کا جو تجربہ ان واقعات میں نہایت عریاں پیمانہ پر ہوا ہے اس کا سب سے زیادہ خطرناک اور مہلک نتیجہ یہی ہو سکتا ہو کہ مسلمان اپنے آپ کو لاچار و بے سہارا سمجھ کر ذہنی مرعوبیت اور احتقارِ نفس کا شکار ہو جائیں اور خود کو تمامتر دوسروں کے رحم و کرم پر سمجھنے لگیں۔

ان واقعات کا یہ اثر اُس وقت ہو سکتا ہو جب مسلمان یہ سمجھ بیٹھے ہوں کہ ان کی عزت و ذلت، ان کی آبادی و بربادی کسی انسان، کسی حکومت اور کسی حکومت کی فوج اور پولیس کے ہاتھ میں ہے۔ حالانکہ اُن کو جو پہلا سبق اسلام دیتا ہے وہ ہے

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ	کہو کہ اے خدائے مالک الملک! تو جس
تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ	کو چاہتا ہے اقتدار دیتا ہو اور جس سے
وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ	چاہتا ہو چھین لیتا ہے، تو جس کو چاہتا ہو
وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ	سربلند کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہو پست کرتا
مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ	ہے، خیر کا سارا خزانہ تیرے ہاتھ ہے،
إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ	بے شبہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ وہ عقیدہ ہے جس کے بغیر کوئی "مسلمان" مسلمان نہیں ہے۔ اور اس عقیدے کے ساتھ اس کا

کوئی امکان نہیں کہ انسان عزت و ذلت اور موت و حیات کا معاملہ غیر اللہ کے ہاتھ میں سمجھے۔ پس اس کے کوئی معنی نہیں کہ ایک مسلمان کسی سے مرعوب ہو کر اسے عزت و ذلت کا مالک سمجھ لے۔ اور اپنے تئیں بے بسی اور بے چارگی کا فیصلہ کر لے۔

رہے یہ مظلومیت کے حالات؟ تو یہ ان انسانوں کو بھی پیش آئے ہیں جن سے زیادہ معزز وجود کا سایہ اس زمین پر نہیں پڑا اور جن سے زیادہ معزز وجود آسمان نے اپنی گردوں گردشوں کے باوجود نہیں دیکھا۔ یہ حالات اس سلسلۂ وجود کے اس خاتم کو بھی مسلسل تیرہ برس درپیش رہے ہیں جس کے غلاموں کی ٹھوکریں قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج تاک پہنچیں۔ اور ان غلاموں نے بھی اپنے آقا کی معیت میں یہ دورِ محن جھیلا مگر کیا انھوں نے ایک لمحہ کیلئے بھی ان حالات سے متأثر ہو کر اپنے آپ کو بے وقعت اور بے بس و مجبور سمجھا۔ اور احتقارِ نفس کا وسوسہ بھی ان کے دلوں پر گزرا؟ خدا گواہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو اُن عزائم اور ان حوصلوں کی بقا کا کوئی امکان نہ تھا جن کے آگے دنیا کی وسعتیں تنگ ہو گئیں ——— اور ان مردانِ خود آگاہ کو ایک سمندر کے کنارے پہنچ کر بڑی حسرت سے کہنا پڑا کہ کاش معلوم ہوتا کہ اس کے آگے بھی ہماری جولانیوں کے لیے کوئی میدان باقی ہے! ——— اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو اسلام کی تاریخ مکہ سے شروع ہو کر مکہ ہی میں ختم ہو گئی ہوتی۔ اس لیے کہ جب دل میں احساسِ ذلت و بے چارگی کا گھر بن جائے وہ حوصلوں کا مسکن نہیں بن سکتا۔ اور جب دل میں حوصلوں کی گرمی نہ ہو اس کا انجام جیتے جی مر جانے کے سوا کچھ نہیں۔

یہ بے پناہ مظلومیت کے ساتھ عزائم و حوصلوں اور خود دارانہ فیصلوں کی توانائی ہی تھی جس نے کاروانِ اسلام کو مدینہ تک پہنچایا اور پھر غلبہ و نصرت کی پوری امید کے ساتھ عالمی تگ و تاز کی راہ پر ڈالا۔ کیسی کیسی ماریں اسلام کے اِن "السابقون الاولون" کو دی گئیں۔ اور روحانی اور جسمانی ایذاء و تذلیل کے کیا کیا تجربات نہ تھے جو ان مٹھی بھر نفوس پر کیے گئے؟ سچ یہ ہے کہ اُن میں سے ہر ایک کہہ سکتا تھا۔ اور بلا مبالغہ کہہ سکتا تھا۔

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبٌ لَوْ اَنَّهَا
صُبَّتْ عَلَى الْاَيَّامِ صِرْنَ لَيَالِيَا

[ایسے ایسے مصائب میری جان پر توڑے گئے ہیں کہ اگر دنوں پر یہ مصیبتیں پڑ جائیں تو دن، دن نہ رہے رات ہو جائے]

مگر اوپر نیچے، آگے پیچھے اور دائیں بائیں کے اس مسلسل ہجوم مصائب کے باوجود اور توہین و تذلیل کی تمام تر ارزانی و فراوانی کے باوجود یہ بات ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں ہوئی کہ وہ خود کو ظالموں کے ہاتھ کا کھلونا اور ان کو اپنی تقدیر کا مالک سمجھ لیتے۔ وقت کی غالب اور جابر طاقتوں نے ان کے ساتھ ضرور حقیر اور بے وقعت مخلوق کا معاملہ کیا اور انھوں نے حالات کی نامساعدت میں اس رویہ کو مدتوں انگیز کیا، مگر ان کے دل کبھی ان احساسات سے آشنا نہوئے جو انھیں اپنی نظر میں بھی۔ ان ظالموں کے سامنے ــــ حقیر و ضعیف بنا دیتے۔ وہ "مستضعفین فی الارض" رہے (کہ دوسرے انھیں کمزور سمجھتے رہے) مگر اُن کے دل نے کبھی اس خیال خام کی تصدیق نہ کی، اور اس کا ثبوت علاوہ اس کے جو ان کے مستقبل نے دیا ایک یہ بھی تھا ــــ اور بڑا کھلا ثبوت تھا ــــ کہ جس کلمہ حق پر وہ ظلم و تشدد کا نشانہ بن رہے تھے، اس سے انحراف پر وہ ایک آن کے لئے تیار نہ کئے جا سکے۔ بلال حبشیؓ پر ترکش ستم کا ایک ایک تیر آزمانے والوں نے آزما لیا۔ مگر اس "کمزور" انسان کی زبان "احد" "احد" سے انحراف نہ کر سکی۔ عمارؓ و یاسرؓ پر ہر روز ایک نیا ستم ایجاد ہوا، مگر خون کا جو قطرہ گرتا تھا اسی نعرۂ حق کو دہراتا ہوا گرتا تھا۔ اُمّ عمارؓ کو اسی کلمۂ حق پر جان بھی ہونا پڑا، مگر ساری صنفی نزاکتوں کے باوجود اس حق سے وفاداری میں کوئی فرق دمِ آخر تک نہ آسکا جسے دل و زبان نے قبول کر لیا تھا ــــ استقامت کے یہ مظاہرے اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ مظلومیت کی انتہا کے باوجود یہ "کمزور" نفوس مرعوبیت کا ننگ کسی دم بھی گوارا نہ کر پائے۔ اور یہ پوزیشن انھوں نے کسی وقت بھی قبول نہ کی کہ لوگ اُن کے قلوب میں ضعف و ہراس اور اُن کی گردن کو اظہارِ تذلّل پر آمادہ پا سکیں۔

مرعوبیت اور احساسِ ضعف و ذلت سے اس بلندی کا راز وہی یقین و اعتقاد تھا جو اسلام کے اولین سبق "قل اللّٰھم مالک الملک الخ" نے ان کمزوروں کے دلوں میں ڈال دیا تھا۔ اور یہی اگر ہمارا بھی اعتقاد ہے تو کوئی معنیٰ نہیں کہ حالات کی کسی ناسازگاری میں ہم اس سبق کو بھول جائیں۔ اور ہراس و مرعوبیت کی وہ روش اختیار کر لیں جو قوموں کی زندگی پر مہر لگا دیتی ہے۔

حالات کا کانٹا بدلتا ہی رہتا ہے۔ "تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ" کا قانون اس عالم کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ اور حالات کی سازگاری و ناسازگاری اسی

قانون کا ظہور ہے۔ جو قومیں حالات کی ناسازگاری میں جی چھوڑ جائیں وہ حالات کی سازگاری کا راستہ اپنے ہاتھوں بند کر دیتی ہیں۔ اس لیے کہ حالات کی سازگاری کہیں اوپر سے نہیں ٹپکتی۔ عزم و ارادہ کی طاقت، جہد و استقامت اور خودداری و عزتِ نفس کے تحفظ سے پیدا ہوتی ہے۔ ناسازگاری کے بعد حالات کی سازگاری، اور عُسر کے بعد یُسر انھیں قوموں کا حصہ ہے جو مشکلات اور تلخی کے ایام کو عزتِ نفس کی پاسبانی اور استقامت وخودداری کے ساتھ بتا دیں ــــ اور مصائب کے سخت سے سخت طوفان بھی اُن کے اس جوہر کو ضائع نہ کر سکیں۔

---

(۲)

یہ بات ہمارے احساسات اور اندرونی رویّہ سے متعلق تھی۔ اس کی بے شک اولین اہمیت ہو۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہمیں کچھ اپنے خارجی اور عملی رویّہ کے متعلق بھی سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

ہندو مسلمانوں کے دلوں میں جو غبار ایک دوسرے کے خلاف انگریزوں کی منافرت انگیز پالیسی کی بدولت بھر گیا تھا وہ تقسیم وطن کے موقع پر اچھی طرح نکل گیا ہے، اور اس حد تک نکل گیا ہے کہ اس نکاسی کی یاد سے دونوں قوموں کی شریف اور امن پسند اکثریت کو آج تک شرم آتی ہے، چنانچہ اب جو فسادات ہوتے ہیں انکا عام طور پر اور حالیہ فسادات کا خاص طور پر اس وسیع پیمانہ کی اور مجنونانہ انداز کی باہمی منافرت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب جو فسادات ہوتے ہیں وہ یا خالص سیاسی مقاصد کے لیے بعض پارٹیوں کی طرف سے بہانے پیدا کر کے کرائے جاتے ہیں۔ یا بعض لوگوں کی مردم آزار اور خواہ مخواہ فتنہ جو طبیعت بے بات کے بتنگڑ بنا کر امن سوز حالات پیدا کر دیتی ہے اور یا تیسری نوعیت یہ بھی ہوتی ہے کہ کچھ لوگ جو ایک خاص تہذیب کو پورے ملک پر مسلط کرنے کے عشق میں از خود رفتہ ہو چکے ہیں۔ وہ مسلم تمدن کے بعض اجزاء اور مسلمانوں کے بعض جمہوری مطالبات کو اس مقصد کے حصول میں حارج پاتے ہیں۔ چنانچہ کبھی کسی مناسب موقع پر وہ بھی لوگوں کو شہ دے جاتے ہیں تاکہ یہ قوم ہراساں ہو کر جان کی خیر منانے میں لگ جائے اور اُن کے راستہ میں حائل ہونے کی کوشش نہ کرے۔

ان تینوں قسموں میں سے تیسری قسم کے فسادات کا مقصد چونکہ محض یہی ہوتا ہو کہ مسلمان

اس ملک میں احساسِ بیچارگی و بےبسی کے ساتھ اور دوسروں کی چشم و ابرو کے اشاروں پر زندگی گزارنے پر آمادہ ہو جائے۔ اس لئے ہم اس کے ذکر کے ساتھ اس بات کو پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ ہمیں دیوانوں کے اس خواب کو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دینا ہے۔

اس کے بعد اصل بات جو ہم اس سلسلہ میں کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہو کہ ان میں سے کسی بھی نوعیت کا فساد ہو اس کی ابتداءً عموماً کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ، شرارت، یا دھاندلی سے ہوتی ہے — بے شک ایسے موقع پر اشتعال انسان کی فطرت ہے۔ مگر عقل کے تقاضہ سے انسان اس اشتعال کو بہت سے مواقع پر روک بھی لیتا ہو اور مصلحت کی خاطر غصہ پی جاتا ہے۔ بس اسی طور پر ہمیں طے کر لینا چاہیئے کہ ہم ان مواقع پر خاموشی سے گزر جانے کا رویہ اختیار کریں گے۔ خاموشی، مرعوبیت اور مجبورانہ ذہنیت کی نہیں بلکہ ضبط و تحمل کی۔ اور اس دور اندیشانہ فیصلہ کی کہ ہمیں (یعنی ہم میں سے جس فرد کو اس ابتدائی صورت حال سے سابقہ پڑے اُسے) تنہا اس وقتی اذیت، کا بوجھ اپنے دل پر لے لینا ہے تاکہ بات بڑھ کر پوری قوم کے لیے نقصان دہ اس کا خطرہ نہ پیدا ہو سکے۔

ہم اگر سختی کے ساتھ اس پالیسی پر کاربند ہو جائیں تو قریب قریب ناممکن ہے کہ کوئی فسادی اسکیم کامیاب ہو سکے۔ افسوس یہ ہو کہ ہم اس طرزِ عمل میں اپنی توہین محسوس کرتے ہیں۔ اور غیرت و حمیت کے وقتی تقاضہ اور عزتِ نفس کے جذبہ سے مغلوب ہو کر ایسے حالات پیدا ہو جانے کا موقع دیدیتے ہیں جن سے ایک بڑی تعداد کے ظاہری نقصانات کے علاوہ پوری قوم کے جذباتی نقصانات کا بھی خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ہم دس بارہ برس سے تجربہ کر رہے ہیں کہ فسادیوں کے خلاف کوئی سخت کارروائی نہیں کی جاتی، بلکہ اِلّا ماشاءاللہ یہاں تک ہوتا ہو جو حالیہ واقعات میں ہوا کہ مجرموں کو ڈھیل دی جاتی ہے اور قیامِ امن کے نام پر پولیس جوابی کارروائی کرنے والوں کو اپنی ساری توجہات اور چابکدستیوں کا نشانہ بنا لیتی ہے، ایسی صورت میں بات کو بڑھنے کا موقع دینا اور غیرت و حمیت کے جذبہ میں بہہ جانا پوری قوم کی عزتِ نفس کو خطرہ میں ڈالنا اور ایسی صورت حال کو دعوت دینا ہے جو قومی پیمانہ پر بےکسی اور بےچارگی کا مہلک احساس پیدا کر جائے۔

ہمیں دونوں باتوں کا موازنہ کرنا چاہیئے کہ آیا یہ بہتر ہے کہ ہم میں سے دو چار پر

ہولی کا رنگ پڑ جائے، مسجد کو رنگ دیا جائے، اور ایک آدھ دن کسی مسجد کے سامنے کسی جلسہ جلوس کا ہنگامہ نا وقت بپا رہے۔ یا یہ بہتر ہے کہ پولیس کے فرقہ پرست عناصر کو ہمارے گھروں میں گھسنے، مجرمانہ زدوکوب کرنے اور دہشت انگیزی کے تمام فن آزمانے کا موقع ہاتھ آئے،

اس موازنہ میں بھی اپنے مطاع و مقتدیٰ حضرت محمد رسول اللہ (ارواحنا فداہ) کا اسوۂ حسنہ پوری پوری روشنی بہم پہونچاتا ہے، ہم میں کون ہے جس کی عزت آپ سے زیادہ ہو؟ اور کون ہے جو آپ سے زیادہ غیرت کا حقدار ہو ـــــ ہماری سب کی غیرتیں اور عزتیں آپ پر قربان ـــــ آپ پر تیرہ برس اس طرح کے بیتے کہ کبھی راہ چلتے وجود گرامی پر کوڑا پھینک دیا گیا، کبھی اونٹ کی اوجھڑی عین حالتِ سجود میں پشت اطہر پر ڈال دی گئی۔ کبھی گردن میں چادر ڈال کر بہانتک بل دیے گئے کہ آنکھیں اُبل آئیں۔ مگر اُس غیرت مجسم اور عزت سراپا نے کبھی کوئی جوابی کارروائی نہ کی۔ اس ضبطِ نفس نے ظالموں کے سارے ہتھیار کند کر دیے اور بالآخر اشقیاء ازلی کے سوا کوئی نہ رہا جو اس روش پر دل سے راضی رہ سکتا۔

اشتعال انگیزی، بدتمیزی اور دھاندھلی پر مشتعل ہو جانا بہت آسان ہے۔ مگر یہ کوئی کمال نہیں۔ کمال یہ ہے کہ انسان غصہ کو پی جائے، اور یہی مفسدانہ کوششوں کا صحیح جواب ہے۔ یہی وہ تلوار ہے جو فتنہ و فساد کے منصوبوں کی کاٹ کر سکتی ہے، اور اس وقت بھی ایسی ہی تلوار کی حاجت ہے۔ یہ تلوار بھی کہیں سے مستعار لینے کی حاجت نہیں۔ اسلام کے اسلحہ خانہ سے جو پہلی تلوار مسلمانوں کو ملی تھی۔ وہ تھی

كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ ہاتھ روکے رہو اور معبود کا حقِ بندگی ادا کرتے رہو۔

آج ہمیں خدا کی دی ہوئی یہی تلوار پھر اٹھا لینی ہے، ایک طرف اپنا ہاتھ جواب سے اٹھا لینا ہے، دوسری طرف مالک الملک سے اپنے تعلق کی درستی کا اہتمام کرنا ہے جس کی اولین شرط نماز کے خراجِ عبدیت کی کما حقہٗ ادائیگی ہے، نماز ــــ جیسی کہ خدا کو مطلوب ہے ــــ وہ نسخہ کیمیا ہے جو شدید سے شدید حالات میں بھی انسان کو ہراس اور احساس

بیچارگی کا شکار نہیں ہونے دیتی ۔ اور وہ قوت قلب بخشتی ہے کہ انسان چاروں طرف حالات کی تہ بہ تہ تاریکیاں دیکھ کر بھی اپنی جگہ قائم رہ سکے ۔ جب حالات اس قسم کی شدت اور نزاکت اختیار کرتے ہیں تو انسان کے دل سے قدرتی طور پر سوال اُٹھتا ہے کہ "چارۂ کار کیا ہے"؟ — یہی فطری سوال تھا جس کا جواب مکہ کے مظلوموں کو دیا گیا (اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوۃِ) نماز اور ضبطِ نفس ہی تمہارے لیے واحد چارۂ کار ہے، ضبطِ نفس ظالموں کے ہاتھ ایک حد سے آگے بڑھنے سے روکے گا ۔ اور نماز اس ہستی کو ہر وقت دل کے سامنے رکھے گی جس کا دھیان دلوں کی طاقت، خوف و ہراس کے خلاف دنیا کی سب سے بڑی ضمانت اور ہر لحظہ پیام امید ہے، کیونکہ اگر اس میں کل یہ قدرت تھی کہ:-

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ	ہم فیصلہ کرتے ہیں کہ ان لوگوں پر کرم
اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَ	فرمائیں جنھیں دنیا میں حقیر اور ذلیل سمجھ
نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ	لیا گیا ہو، اور انھیں امام بنائیں،
الْوٰرِثِيْنَ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ	خلافت ارضی کی وراثت ان کے سپرد کریں
فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ	اور ملک میں انھیں اقتدار بخشیں۔ اور
وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ	فرعون وہامان اور ان کی افواج کو
مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ۔	دکھادیں ان کے ہاتھوں وہ کچھ کہ
(قصص ع ۱)	جس کا وہ خوف کھاتے تھے۔

کی شان دکھا سکے تو آج بھی وہ اس قدرت کا مالک ہے۔

خیر یہ نماز اور تعلق باللہ کی درستی کی بات تو یہاں ضمناً آگئی، ورنہ یہ ایک مستقل موضوع ہے، اور یہاں اس پر گفتگو مقصود نہیں۔ یہاں تو ہمیں صرف ضبط وتحمل کی بات کہنی ہے، ہماری قطعی رائے ہے کہ موجودہ حالات میں ہمارے لئے چارۂ کار یہی ہے۔ بے شک انسان حق بجانب ہے، اگر اس کے ساتھ کوئی بالارادہ بدتمیزی، چھیڑ خانی اور ایذارسانی کی حرکت کی جائے، کہ وہ احتجاج کرے اور اس چیز کو برداشت کرنے سے انکار کر دے،

مگر جب معلوم ہو کہ دلچسپی دراصل اس چھیڑ چھاڑ سے نہیں ہے، بلکہ مقصود بڑے پیمانہ پر فتنہ و فساد کا دروازہ کھولنا ہے، اور اس دروازہ کے کھلنے کی صورت میں امن و امان کی جو محافظ طاقت لابدی طور پر داخل انداز ہوگی وہ، وہ کچھ کرے گی جو بھوپال وغیرہ میں ہوا تو ____ ایسی صورت میں عقل و دانش کا تقاضہ یہی ہے کہ آدمی اپنے اس حق سے دستبردار ہوجائے۔ اور اس طرح فرقہ پرستی کی کمان سے نکلے ہوئے تیر کو اصل نشانہ تک پہنچنے سے روک دے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اب ملک میں فرقہ دارانہ جنون کی کیفیت باقی نہیں ہے، لیکن یہ بات بھی نہیں ہے کہ سرے سے ان جذبات کی جڑ ہی کٹ گئی ہو جو اس جنون تک لوگوں کو پہنچا دیتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جن سنگھ اور مہا سبھا جیسی فرقہ پرست پارٹیوں کے سیاسی کاروبار کا فروغ انھیں جذبات سے وابستہ ہے، یہ مجبور ہیں کہ ان جذبات کو ہوا دینے کا جب کوئی مناسب وقت نظر آئے اس سے فائدہ اٹھانے کی پوری پوری کوشش کریں، ان پارٹیوں کی مفسدانہ سرگرمیوں پر بریک لگانے کا کام تو حکومت کا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کی "جمہوریت" نے حکومتوں کو اس کام سے بالکل چھٹی دے رکھی ہے۔ اور ہمیں کوئی خاص توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ حکومتوں کے اس "جمہوری" مزاج میں کوئی تبدیلی واقع ہوگی۔ ایسی صورت میں اپنے ساتھ بڑی دشمنی ہوگی اگر ہم سنجیدگی کے ساتھ اس بات پر غور نہ کریں اور کوئی پختہ فیصلہ نہ کرلیں کہ ہم ان مساعی کی کامیابی کو کس طرح روک سکتے ہیں، اور کس حد تک ان مفسدانہ سرگرمیوں کے مقابلہ میں بطور خود اپنا تحفظ کرسکتے ہیں۔ واقعات آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ اور ہم اور تو جو کچھ کرتے ہوں مگر اس غور و فکر اور فیصلہ کے معاملہ میں صفر کے صفر رہ جاتے ہیں۔ یہ جینے کے انداز نہیں ہیں مسئلہ مستقل ہے اور اس کے لئے ایک مستقل لائحہ عمل کے بغیر چارہ نہیں۔

فرقہ پرستوں کی مفسدانہ سرگرمیوں کی کامیابی، ہم بتا چکے ہیں کہ ہمارے عدم تحمل پر موقوف ہے۔ ہمیں صرف ایک تحمل اور بھاری پن کا فیصلہ کرلینا چاہیئے۔ اور پے بہ پے تجربات سے فرقہ پرستوں کو اس بارے میں مایوس کردینا چاہیئے کہ ہم ان کی رکیک حرکتوں سے مشتعل ہوسکتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس تجربہ کے بعد فرقہ پرستوں کو اشتعال انگیزی کے سستے محاذ سے ہٹنا پڑے گا۔

ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ پھر وہ فساد انگیزی ہی سے باز آجائیں گے۔ بلکہ ہمارا مطلب صرف

یہ ہے کہ پھر انھیں فساد انگیزی کے ایسے آسان اور سستے ذرائع ہاتھ نہ آئیں گے جن سے مقصد تو پوری طرح حاصل ہو جائے، لیکن کوئی آنچ اور دھبہ اُن پر نہ آسکے۔ پھر اگر انھیں فساد انگیزی کرنا ہی ہوگی، تو کھلے مفسدوں اور مجرموں کی پوزیشن میں سامنے آنا ہوگا۔ اور پھر نہ حکومت ہی کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ کھلی مجرمانہ اور جارحانہ پوزیشن کو نظر انداز کر سکے۔ اور بالفرض کوئی حکومت یہاں تک جانا بھی چاہے تو غیر فرقہ پرست حزب مخالف کی موجودگی اُسے یہاں تک جانے نہیں دے سکتی۔ یہ بات سو فی صدی یقینی ہے اور ہمیں اس معاملہ میں کسی تردد کا شکار نہیں ہونا چاہیئے۔ ہولی کا رنگ، مسجدوں کے سامنے شور وشغب وغیرہ ایسے سستے ذرائع ہیں کہ ان سے مسلمانوں کی ذرا سی برہمی کی آڑ میں سارے منصوبے نہایت آسانی کے ساتھ پورے ہو جاتے ہیں اور معاملہ کی پوزیشن کچھ اس طرح کی رہتی ہے کہ پولیس بھی اگر فرقہ پرستی کے اس کھیل میں شریک ہونا چاہے تو کچھ بہانے تراش لے، اور حکومت بھی اگر انصاف سے کترانا چاہے تو کسی نہ کسی چیز کا سہارا اسے بھی مل سکے۔ لیکن اس قسم کے چھچھورپن کے مقابلہ میں کامل تحمل اور بھاری پن کی قسم کھالی جائے تو ظاہر ہے کہ کوئی شخص کتنا بھی زور لگائے اور اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے الٹا ہی کیوں نہ لٹک جائے ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجا سکتا ـــــ بس مختصر یہ ہے کہ ہمیں فسادات اور ہندو مسلم آویزش کے اس سستے نسخے کو بے اثر کر دینا چاہیئے جو جن سنگھ اور مہا سبھا کے سورماؤں کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ اور انھیں مجبور کر دینا چاہیئے کہ اگر اپنی دوکان چمکانے کے لئے انھیں یہ کھیل کھیلنا ہی ہے تو سامنے آکر کھیلیں۔ مسلمانوں کے اشتعال کی آڑ ڈھونڈنے میں اب اپنا وقت ضائع نہ کریں۔

ہم یہ جو کچھ لکھ رہے ہیں ظاہر ہے کہ براہ راست ہمارے عوام تک نہیں پہنچے گا۔ حالانکہ یہ باتیں دراصل انھیں سے کہنے کی ہیں۔ جو لوگ ان سطروں کو براہ راست پڑھیں گے ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اس افہام وتفہیم کا محتاج ہو، پس دراصل یہ ایک امانت ہے ان لوگوں کے ہاتھ میں جو اس سے متفق ہوں کہ وہ اس کو اپنے اپنے دائرہ امکان میں عوام تک پہنچانے کی کوشش کریں، کیوں کہ اس معاملہ میں ہماری کامیابی کا تمامتر انحصار ہمارے عوام ہی کی تربیت پر ہے، یہ مسئلہ عوامی سطح پر ہی پیدا ہوتا ہے، اور اسی سطح پر ہی اس سے نپٹا جاسکتا ہے۔

(۳)

جگہ جگہ مسلمانوں کے ان تازہ عظیم نقصانات اور ان کے ساتھ کئے گئے بہیمانہ ظلم و تشدد پر سرکاری حلقوں اور حکمراں پارٹی کی سرد مہری دیکھ کر ان سے کچھ کہنے کو جی تو نہیں چاہتا، مگر بات چھڑی ہے تو اتنی بات ان سے بھی کہہ دینی چاہیئے کہ وہ اگر فرض و انصاف کی قدروں کو اکثریت کی خوشنودی کی خاطر قربان کر رہے ہیں، تو وہ ایک غلط امید پر بڑی قیمتی چیز قربان کر رہے ہیں۔ فصل جن سنگھ اور مہاسبھا تیار کریں اور غلہ کانگریس کے گوداموں میں پہنچ جائے۔ یہ ہونے والی بات نہیں ہے۔ معاملہ کی نوعیت اگر صرف یہ ہوتی کہ اکثریت کی تعدی کا کوئی اتفاقی واقعہ ہوا اور آپ نے اقلیت کی داد رسی نہ کی، تو بے شک یہ توقع بجا تھی کہ اکثریت آپ کے ہاتھ میں رہے گی۔ مگر معاملہ کی نوعیت تو یہ ہے کہ جن سنگھ اور مہاسبھا اپنے سیاسی نعروں کو دل آویز بنانے کے لئے ہندو پبلک میں فرقہ وارانہ احساسات ابھارنا چاہتی ہیں اور یہ فسادات محض اسی پلان کے تحت رونما ہو رہے ہیں۔ تو آپ محض اقلیت کی داد رسی نہ کر کے کیونکر اکثریت کے ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ جبکہ آپ الکشن میں وہ نعرے نہیں لگا سکتے جو فرقہ پرست پارٹیوں کے پیدا کردہ احساسات کو اپیل کر سکیں۔ درانحالیکہ اقلیت کی داد رسی نہ کرنے کی جو رشوت آپ اکثریت کو دے سکتے ہیں اس کی ہندو پبلک کو جن سنگھ وغیرہ سے کچھ اور زیادہ ہی توقع ہو سکتی ہے۔

نہیں! اس سے بھی آگے بڑھ کر ہمیں کہنے دیجئے کہ آپ اپنی پالیسی کے نتیجہ میں اکثریت کو فسادات کے لئے ڈھیل دیکر جن سنگھ اور مہاسبھا کو موقع فراہم کر رہے ہیں کہ وہ خوب اچھی طرح فرقہ وارانہ احساسات کی فصل تیار کریں۔ اور جیسا کہ ہم بتا چکے۔ اس فصل کا نفع اٹھانے کے لئے اگر جن سنگھ اور مہاسبھا میدان میں موجود ہوں گی تو سارا نفع بلاشبہ انھیں کے حصہ میں آئے گا۔ اور آنا چاہیئے ـــــ تو کہنا یہ ہے ـــــ اگر آپ نے کان نہیں بند کر لئے ہیں ـــــ کہ آپ اپنے فائدہ کے دھوکہ میں جن سنگھ اور مہاسبھا کے فائدے کا سامان کر رہے ہیں۔

آپ اگر سن رہے ہیں تو سوچیں گے پھر ہم کیا کریں؟ فرقہ پرستانہ نعرے لگانے سے

تو رہے ، اب اگر انصاف کی سختی بھی کریں تو جن سنگھ اور ہندو مہا سبھا کی جیت اگر دس برس میں ہونے والی ہوگی تو دو ہی برس میں ہو لے گی؟ —— اس سوال پر عرض ہے کہ انصاف کی سختی بطور ایک فرض کے، آپ کریں یا نہ کریں، یہ آپ کے سوچنے کی چیز ہے۔ ہم اس کے لئے درخواست نہیں کرتے۔ البتہ فسادات اور اکثریت کے جبر و تعدی کی روک تھام کے لئے سختی آپ کے لیے مضر کم ہوگی اور مفید زیادہ۔ ایک طرف مسلم اقلیت میں آپ پر اعتماد پیدا ہوگا۔ دوسری طرف فسادات کے ذریعہ جو فرقہ وارانہ احساسات ابھرتے ہیں۔ جن کا سارا فائدہ آپ کی بعض مقابل پارٹیوں کے حق میں جاتا ہے۔ وہ وسیع ہونے سے رک جائیں گے۔

لیکن ہم واقعات ہو جانے یا فساد کی صورت رونما ہونے کے بعد صرف سختی کو اس بیماری کا اصل علاج نہیں سمجھتے۔ اس کا اصل علاج عوام میں ایسا ذہن پیدا کرنا ہو کہ وہ فرقہ پرست عناصر کا آلہ کار بننے کو تیار نہ ہوں اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ شریف انسانوں کی طرح زندگی بسر کریں۔ یہ کام باقاعدہ ایک مہم کے طور پر کرنے کا ہے اور کانگریس کو اپنے اصول کے لحاظ سے اسکی اہمیت کو سمجھنا چاہیئے۔ لیکن افسوس ہے کہ کانگریس میں کسی آدمی کو اس کام کے لئے وقف ہو جانے کی فرصت نہیں ہے۔ کانگریس کی پیدل یاترائیں صرف اور کاموں کے لئے رہ گئی ہیں، اور اس اہم ترین کام کا حصہ تقریروں کے بس دو چار رسمی فقرے ہیں۔ جن کی بے اثری سارے ملک پر ظاہر ہے۔

ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ صرف ہندو عوام میں اس کام کی ضرورت ہے مسلمانوں کا ذہن و مزاج بالکل ٹھیک ہے، کانگریس کو بلاتفریق یہ کام کرنا چاہیئے، اور ہم مسلمانوں کی طرف سے کہہ سکتے ہیں کہ اس کام میں اسے بہت سے مسلمان عناصر کی مدد ملے گی۔

یہ مقالہ دفتر الفرقان کی طرف سے پمفلٹ کی صورت میں تیار کرایا جا رہا ہے اور خواہشمند حضرات کو اصل لاگت یعنی نو روپے فی سیکڑہ کے حساب سے فراہم کیا جائے گا۔ فسادزدہ علاقوں کے ارباب خیر اور اصحاب فکر سے خاص طور پر ہماری اپیل ہے کہ اپنے علاقہ کے مسلمانوں میں اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی کوشش فرمائیں۔

(مینیجر)

قرآنی دعوت

(مسلسل)

معاملات میں پاکبازی اور اکل حلال:-

قرآن مجید نے انسانی زندگی کے تزکیہ اور اس کی سیرت کی تعمیر کے سلسلہ میں جو ہدایات اپنے ماننے والوں کو دی ہیں اُن میں سے ایک اہم ہدایت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے لین دین کے معاملات میں پورے پاکباز ہوں اور اپنی روزی صرف جائز اور پاک ذریعوں سے حاصل کریں، کسی ناجائز طریقہ سے ایک پیسہ بھی نہ کمائیں۔

سورۂ بقرہ میں ماہ رمضان کے روزوں کی فرضیت اور اُن کے متعلق چند خاص احکام بیان فرمانے کے بعد متصلاً ارشاد فرمایا گیا ہے

وَلَا تَاكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔ (بقرہ۔ ع ۲۳)

اور تم ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق اور ناروا طریقوں سے نہ کھاؤ (یعنی حرام و ناجائز روزی سے تم ہمیشہ ہی روزہ رکھو)

اور قریب قریب انہی الفاظ میں سورۂ نساء میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ۔

اے ایمان والو تم ایک دوسرے کے مال آپس میں ناجائز طریقوں سے ہضم نہ کرو، ہاں اس میں حرج نہیں کہ باہمی رضامندی سے تمھارے درمیان جائز تجارتی

(النساء - ع ۵) لین دین ہو۔

ان دونوں آیتوں میں ناجائز کمائی کی ممانعت کے لیے ایسا وسیع اور عام عنوان اختیار کیا گیا ہے جس میں کمائی کے سارے ہی ناجائز طریقے آجاتے ہیں۔ اس طرح ان آیتوں سے سود، رشوت، جوا، سٹہ، لاٹری، دھوکہ فریب کی تجارت اور ان کے علاوہ بھی ناجائز کمائی کے سارے طریقے خواہ وہ پرانے ہوں یا نو ایجاد، ان آیتوں کی رو سے ممنوع اور حرام ہو گئے۔

پھر سود اور جوئے وغیرہ کی حرمت قرآن مجید میں جا بجا مستقلاً بھی بیان فرمائی گئی ہے، مثلاً سورہ بقرہ کے اڑتیسویں رکوع میں سود خواروں کی مذمت اور ان کے برے انجام کے ذکر کے ساتھ "حَرَّمَ الرِّبٰو" کے صاف صریح الفاظ میں سود کی حرمت کا اعلان فرمایا گیا، پھر "یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا" کے الفاظ سے سود کی نحوست اور اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اس کی مبغوضیت و ملعونیت کو اور زیادہ واضح کیا گیا ہے۔ پھر جو لوگ یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی سودی کاروبار نہ چھوڑیں اُن کو مخاطب کر کے سنایا گیا "فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ" یعنی تمھیں اب خبردار رہنا چاہیے کہ تم سے اللہ و رسول کی جنگ ہے۔ تم اب اللہ و رسول کے دشمن ہو اور اللہ و رسول تمھارے دشمن ہیں ——— (نعوذ باللہ من غضبہٖ و غضبِ رسولہٖ)

کمائی اور کھانے پینے ہی کے سلسلے میں شراب اور جوا وغیرہ بھی چند ناپاکیاں عربوں کی زندگی کا گویا جزبنی ہوئی تھیں ان کے بارہ میں سورۂ مائدہ میں ارشاد فرمایا گیا

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطَانِ فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝	اے ایمان والو یہ شراب اور جوئے بازی اور یہ تھان (یعنی معبودان باطل کے آستانے اور ان کے چڑھاوے) اور یہ پانسے (یعنی پانسوں کے ذریعہ قرعہ اندازی جو جوئے ہی کی ایک خاص شکل ہے) یہ سب گندے ناپاک شیطانی کام ہیں، ان سے بچو تو تمھاری فلاح کی امید ہو سکتی ہے۔
(مائدہ ع ۱۲)	

ناپ تول میں کمی بیشی جو بہت پرانی اور بہت عام بددیانتی ہے، اس کے بارہ میں قرآن مجید میں

فرمایا گیا:۔

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۝ (بنی اسرائیل ع ۵)

اور جب تمہیں کوئی چیز کسی کو ناپ کر دینی ہو تو پیمانہ پورا بھر کر دو، اور (جب کسی کو تول کر کچھ دینا ہو تو) ٹھیک ترازو سے تولو (باٹ ترازو میں کوئی پھیر اور ریخ نہ ہو)

اور سورۂ رحمٰن میں ارشاد فرمایا:۔

وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ (الرحمٰن ع ۱)

اور حق و انصاف کے مطابق ٹھیک تولو اور وزن میں کمی نہ کرو، (ڈنڈی نہ مارو)

قرآن مجید نے ان واضح اور صریح احکام کے علاوہ ناپ تول میں بد دیانتی کرنے والوں کو قیامت کے عذاب سے ایسے انداز میں ڈرایا ہے کہ جس دل میں خدا کے خوف اور ڈر کی کچھ بھی گنجائش ہو وہ لرز کے رہ جائے اور پھر کبھی بھول کے بھی اُس سے یہ بد دیانتی سرزد نہ ہو ـــــــ ارشاد فرمایا گیا ہے :۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(تطفیف)

بڑی خرابی اور بہت برا انجام ہے ناپ تول میں بد دیانتی کرنے والوں کے لئے (جن کا طرزِ عمل یہ ہو کہ) جب لوگوں سے وہ اپنے لیے ناپ کر لیتے ہیں تو بھرپور لیتے ہیں اور جب دوسروں کے لیے وہ کوئی چیز ناپتے یا تولتے ہیں تو کم دیتے ہیں؛ کیا انھیں اسکا خیال نہیں ہے کہ وہ (مرنے کے بعد حساب اور جزا کے) یوم عظیم کے لئے پھر زندہ کرکے اٹھائے جائیں گے، جس دن کہ سارے انسان جلال و جبروت والے رب العلمین کے حضور میں کھڑے ہوں گے۔

جو شخص سچے دل سے قرآن مجید کو خدا کی کتاب مانے وہ ان آیتوں کے سننے کے بعد ناپ تول میں بددیانتی کس طرح کرسکتا ہو، اگر ایمان کا دعوے کرنے والوں میں بھی ایسے لوگ کہیں نظر آتے ہیں تو سمجھنا چاہیئے کہ اُن کے دل حقیقتِ ایمان سے محروم ہیں۔

حرامخوری کی ایک نہایت ہی لعنتی شکل یہ بھی ہے کہ کوئی شخص مذہبی و روحانی پیشوائی کا لباس پہن کر یعنی عالم دین یا درویش بن کر حیلوں اور ہتھکنڈوں سے خدا کے سادہ دل بندوں سے نذرانے چڑھاوے وصول کرے، ایسے لوگوں کا عام طریقہ یہ ہوتا ہے کہ تحصیل وصول کے اس سلسلہ کو ہمیشہ باقی رکھنے اور اپنی آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کرنے کے لئے وہ اس کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ اُن کے یہ دام افتادہ دین کی صحیح تعلیم سے کبھی آشنا نہ ہونے پائیں اور اللہ کے مخلص بندوں اور دین حق کے سچے خادموں اور داعیوں سے ہمیشہ دور دور اور الگ تھلگ رہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسے لوگ زیادہ تر یہودیوں میں تھے — لیکن ہمارے اس زمانہ میں بدقسمتی سے خود مسلمانوں میں ایسے پیشہ ور مولویوں اور پیرزادوں کا ایک پورا طبقہ موجود ہے جس کا یہی کردار اور یہی کاروبار ہے ——— بہرحال ایسے لوگ خواہ یہودیوں یا عیسائیوں میں ہوں یا مسلمانوں میں قرآن مجید میں اُن کے بارہ میں فرمایا گیا ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا	اے ایمان والو بہت سے "عالم مولوی" اور
إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ	"پیرفقیر" بندگان خدا کا مال ناجائز حیلوں
وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ	اور ترکیبوں سے کھاتے ہیں (اور بجائے اسکے
أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ	کہ اُن بیچاروں کو کوئی دینی فائدہ پہنچاتے
وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ	اور خدا کا راستہ بتاتے، الٹے ان کو) اللہ کے
(توبہ ع ۵)	راستہ سے روکتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہود کے مذہبی پیشواؤں کا ایک طبقہ تھا جو پہلی آسمانی کتابوں (توراۃ وغیرہ) کے ان مضامین سے خوب واقف تھا جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور آپ کے لائے ہوئے دین و شریعت کی تصدیق ہوتی تھی لیکن وہ اپنے عوام کے سامنے اس حقیقت کو ظاہر نہیں کرتا تھا بلکہ تحریف و تاویل کے پردے ڈال کر اس کو چھپانا چاہتا تھا تاکہ

یہ بیچارے عوام اسی طرح اس کے جال میں پھنسے رہیں اور نذرانوں، چڑھاووں کے سلسلہ میں کوئی فرق نہ پڑے، قرآن مجید سورۂ بقرہ میں ان لوگوں کو سخت وعید سنائی گئی ۔۔۔ فرمایا گیا:۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ	اللہ تعالیٰ نے جو کتابیں نازل کیں جو لوگ
اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ	ان کے مضامین کو لوگوں سے چھپاتے ہیں
بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا	اور اس حق پوشی کے ذریعہ تھوڑے سے
يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا	پیسے (نذرانے چڑھاوے) حاصل کرتے
النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ	ہیں وہ اپنے پیٹ صرف آگ سے بھر رہے
الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ	ہیں (وہ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے یہاں
عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝	خدا رسیدہ اور اللہ والے بنے ہوئے ہیں
(البقرہ ع ۲۱)	لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے بہر دو پہلو

سے سخت ناراض اور بیزار ہے) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے بات بھی نہیں کرے گا اور ان کو (بخشکر) گناہوں سے پاک بھی نہیں کرے گا۔ اور وہاں کے لیے وہاں صرف دردناک عذاب ہے۔

قرآن مجید نے ایک طرف تو کمائی کے ناجائز طریقوں اور حرام غذاؤں کو ممنوع قرار دیا اور ان پر سخت وعیدیں سنائیں اور دوسری طرف اسکی بھی ترغیب دی کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں اور جن کمائیوں کو حلال وطیب قرار دیا ہے (جن کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہے) ان کو اللہ کی نعمت سمجھ کر اس کے حکم کے مطابق آزادی سے استعمال کیا جائے، اور اس کا شکر ادا کیا جائے اپنے کو خواہ مخواہ تنگی میں اور مشکل میں نہ ڈالا جائے۔

سورۂ بقرہ میں ارشاد فرمایا گیا:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ	اے ایمان والو ہم نے جو پاک طیب چیزیں
طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا	تمھیں بخشی ہیں ان کو بے تکلف کھاؤ اور
لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ	اللہ کا شکر ادا کرو، اگر تم صرف اسی کی
(بقرہ ع ۲۱)	بندگی کرنے والے ہو (تو تمھارا طرز عمل
	یہی ہونا چاہیئے)

اور سورۂ نحل میں فرمایا گیا:۔

فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَاشْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۝

(نحل ع ۱۵)

اللہ تعالیٰ نے جو حلال و طیب چیزیں تم کو عطا فرمائی ہیں ان کو بے تکلف کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو اگر تم صرف اسی کی عبادت کرتے ہو تو تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیئے۔)

اور سورۂ مائدہ میں ارشاد فرمایا گیا:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝ وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ ۝

(مائدہ ع ۱۲)

اے ایمان والو اللہ تعالیٰ نے جو پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے حلال کی ہیں ان کو اپنے لئے حرام مت کرو اور اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود سے تجاوز نہ کرو ایسا کرنے والے اللہ کو سخت ناپسند ہیں اور اللہ نے جو حلال طیب چیزیں تمہیں عطا فرمائی ہیں ان کو بے تکلف کھاؤ پیو اور جس اللہ پر تمہارا ایمان ہے اس سے ڈرو (اور اس کے حدود و احکام کے پابند رہو۔)

اِنفاقِ فی سبیل اللہ

(مولانا امین احسن اصلاحی)

دُنیا اور احباب دنیا سے محبت کے سبب سے اللہ تعالیٰ سے جو غفلت ہوتی ہے، اس کا سب سے زیادہ موثر اور کارگر علاج انفاقِ فی سبیل اللہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنا۔

یہ بات ملحوظ رہے کہ ہم نے انفاقِ فی سبیل اللہ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ زکوٰۃ کی اصطلاح نہیں استعمال کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تزکیۂ نفس اور احسان کے نقطۂ نظر سے دین میں جس چیز کی اہمیت ہے وہ انفاق کی ہے صرف زکوٰۃ کی نہیں ہے۔ زکوٰۃ تو وہ کم سے کم مطالبہ ہے جو ایک صاحبِ مال سے کیا گیا ہے۔ اسلام کا اصلی مطالبہ تو انفاق کے لئے ہے جو سِرًّا بھی ہو علانیۃً بھی، تنگی میں بھی ہو، فراخی میں بھی۔ دوست اور عزیز کے لئے بھی ہو، مخالف اور دشمن کے لئے بھی۔ زکوٰۃ ادا کرنے سے آدمی کے نفس کو جو تربیت حاصل ہوتی ہے، اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں انفاق کے لئے دلیر ہو جاتا ہے۔ درآں حالیکہ یہ راہ بہت کٹھن ہے۔ یہاں تک کہ قرآن نے اس کو اقتحامِ عقبہ یعنی گھاٹی پار کرنے سے تعبیر فرمایا ہے۔ وہ روشنی جو انسان کو محبتِ دنیا کی تنگنائے سے نکال کر محبتِ الٰہی کی جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے وہ انفاق سے پیدا ہوتی ہے۔ بشرطیکہ آدمی ان شرائط و آداب کو اچھی طرح ملحوظ رکھ سکے جو اسکے لئے ضروری ہیں۔ ہم پہلے مختصراً انفاق کی برکات پر گفتگو کریں گے، اس کے بعد ان آفات کا ذکر کریں گے جو اس کو باطل کر دیتی ہیں اور ساتھ ہی اپنے علم کی حد تک ان آفات کے تدارک کی تدبیریں بھی بتانے کی کوشش کریں گے۔

اِنفاق کی برکات

اللہ تعالیٰ کے ساتھ حقیقی لگاؤ انفاق کی سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ یہ آدمی کے دل کو خدا کے ساتھ اس طرح جوڑ دیتا ہے کہ خدا سے غافل رہنا اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے۔ آدمی کو مال سے جو محبت ہے اس کا فطری تقاضہ یہ ہے کہ وہ جس جگہ اپنا مال رکھتا ہے یا جس کام میں اپنا سرمایہ لگاتا ہے اسی جگہ اسی کام کے ساتھ اس کا دل بھی اٹکا رہتا ہے۔ اگر وہ اپنا مال کسی مخفی جگہ میں دفن کرتا ہے تو اس کا دل ہر وقت اسی گوشہ داراسی خرابہ میں گردش کرتا رہتا ہے۔ اگر وہ کسی بنک میں رکھتا ہے تو اس بنک کے ساتھ اس کا دل بندھ جاتا ہے، وہ اس بنک کی کامیابی کو اپنی کامیابی اور اسکے دیوالیہ ہونے کو اپنا دیوالیہ ہونا خیال کرنے لگتا ہے۔ اگر کسی کاروبار یا کسی کمپنی میں اپنا سرمایہ لگاتا ہے تو رات دن اس کاروبار یا اس کمپنی کی فکریں اسکے سر پر سوار رہتی ہیں۔ الغرض جہاں آدمی اپنا سرمایہ لگاتا ہے تجربہ شہادت دیتا ہے کہ وہیں اس کا دل بھی رہتا ہے۔ اس حقیقت کی روشنی میں دیکھئے تو یہ بات بالکل واضح معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص اپنا مال خدا کے راستے میں خرچ کرے گا اس کا دل بھی خدا کے ساتھ رہے گا۔ کیونکہ اس کا مال خدا ہی کے پاس ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ تُو اپنا مال اپنے خداوند کے پاس رکھ۔ کیونکہ جہاں تیرا مال رہے گا وہیں تیرا دل بھی رہے گا۔

معاشرے کے ساتھ حقیقی ربط اس کی دوسری برکت یہ ہے کہ صاحب انفاق کا اپنے معاشرے کے ساتھ بھی صحیح ربط قائم ہو جاتا ہے، اور یہ چیز بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ فلسفہ شریعت کے اعتبار سے یہ دین کی دو بنیادوں میں سے دوسری ہے۔ ایک بندے کے صحیح بندہ بننے کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ اپنے رب کے ساتھ اس کا تعلق بالکل ٹھیک ٹھیک قائم ہو جائے، دوسری یہ کہ خلق کے ساتھ وہ صحیح طور پر مربوط ہو جائے۔ پہلی چیز آدمی کو نماز سے حاصل ہوتی ہے جس کا ذکر آگے گزر چکا ہے[1]۔ یہ دوسری چیز اس کو انفاق سے حاصل ہوتی ہے، چنانچہ یہی رمز ہے کہ نماز

---

[1] ہمارا یہ مضمون "ترجمان القرآن" ... میں شائع ہو چکا ہے۔

اور زکوٰۃ کا ذکر قرآن میں ساتھ ساتھ ہوا ہے، اور سورہ بقرہ کے شروع ہی میں ویقیمون الصّلوٰۃ کے ساتھ دوسری چیز جس کا ذکر ہوا، وہ انفاق (ومما رزقنٰھم ینفقون) ہے۔

یہ دونوں چیزیں درحقیقت وہ دو بنیادیں ہیں جن پر خلق اور خالق کے ساتھ آدمی کے سارے تعلقات کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ اس وجہ سے یوں سمجھنا چاہیے کہ انہی دو چیزوں پر درحقیقت پورے دین و شریعت کی عمارت قائم ہے۔ پچھلے مذاہب میں بھی تمام نیکیوں کی جڑ انہی دو چیزوں کو قرار دیا گیا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السّلام سے ایک مرتبہ ان کے ایک شاگرد نے پوچھا کہ "اے استاد! تمام نیکیوں کی جڑ کیا ہے؟" انھوں نے فرمایا کہ "تو تمام دل و جان سے اپنے خداوند خدا سے محبت کر اور دوسری چیز یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے محبت کر" پھر فرمایا کہ "انہی دو چیزوں پر تمام دین و شریعت قائم ہیں"

ظاہر ہے کہ پڑوسی سے خشک خشک محبت محض ایک بے معنی چیز ہے۔ اس کی محبت کا اولین تقاضا یہ ہے کہ آدمی اس کے لیے اپنا مال خرچ کرے، اس کے دکھ درد میں اس کا شریک بنے اور اس کی مشکلات میں اس کا ہاتھ بٹائے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا اولین مظہر نماز ہے، اسی طرح اسکی مخلوق کے ساتھ محبت کا اولین مظہر انفاق ہے اور بظاہر میں یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں لیکن ذرا گہری نگاہ سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ثانی الذکر درحقیقت مقدم الذکر کا ثمرہ اور نتیجہ ہے جو آدمی خالق سے محبت کرے گا، وہ اس کی مخلوق سے بھی ضرور محبت کرے گا، اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو اپنی عیال سے تعبیر فرمایا ہے۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ اگر اس کو کسی سے محبت ہو تو اس کے متعلقین سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔ اپنی اسی فطرت کے تقاضے سے جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے وہ اس کی مخلوق سے بھی محبت کرنے لگتا ہے اور اس محبت کا قدرتی ظہور، جیسا کہ ہم نے عرض کیا۔ ان کے لیے انفاق کی شکل میں ہوتا ہے علاوہ ازیں انسان کو اللہ تعالیٰ سے جو محبت ہوتی ہے وہ اس کے جذبۂ شکر گزاری کا نتیجہ ہوتی ہے، وہ جب اپنی ذات اور اپنے گرد و پیش پر حقیقت پسندانہ نظر ڈالتا ہے تو ہر پہلو سے اپنے آپ کو خدا کی نعمتوں سے گھرا ہوا پاتا ہے۔ ان نعمتوں کا احساس اس کو ایک طرف اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ

رب کی ستایش اور بندگی کرے. چنانچہ اسی مقصد سے وہ نماز پڑھتا ہے اور پھر یہی جذبہ دوسری طرف اس کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ جس طرح اسکے رب نے اس کے اوپر احسان فرمایا ہے، اسی طرح وہ اپنی استطاعت کے مطابق اللہ کے دوسرے بندوں پر احسان کرے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ ان میں سے ایک چیز دوسری سے پیدا بھی ہوئی ہے اور پھر انہی دونوں پر تمام دین و شریعت کی بنیاد بھی ہے۔ ایک تمام حقوق اللہ کا سرچشمہ ہے اور دوسری تمام حقوق العباد کی اصل ہے جو آدمی دوسروں کے لئے اپنا مال خرچ کرسکتا ہے وہ ان کے دوسرے حقوق ادا کرنے میں بھی تنگدل نہیں ہوگا۔ انسان کا دل اگر مال کی محبت اور بخالت کی بیماری سے پاک ہوجائے تو اسکے لئے وہ تمام نیکیاں آسان ہوجاتی ہیں جن سے ایک آدمی اپنے معاشرہ کا بہترین فرد بن سکتا ہے اور اگر اس کا دل مال کی محبت میں گرفتار رہے تو اس کے لئے نیکی کا ہر کام دشوار بن جاتا ہے. قرآن مجید نے یہ حقیقت اس طرح سمجھائی ہے:۔

فاما من اعطیٰ و اتقیٰ وصدق بالحسنیٰ فسنیسرہ للیسریٰ واما من بخل و استغنیٰ وکذب بالحسنیٰ فسنیسرہ للعسریٰ،

(پس جس نے دیا اور خدا سے ڈرا اور اچھے انجام کو سچ مانا اس کے لئے ہم راہ کھولیں گے آسانی کی اور جس نے بخیلی کی اور خدا سے بے نیاز ہوا اور اچھے انجام کو جھوٹ جانا تو اس کو ڈالیں گے ہم تنگی کی راہ پر)

انفاق سے حکمت حاصل ہوتی ہے

انفاق کی تیسری برکت یہ ہے کہ یہ دین کے دوسرے تمام عقائد و اعمال کے لئے بمنزلہ غذا اور پانی کے ہے۔ اس سے آدمی کی وہ نیکیاں جڑ پکڑ لیتی ہیں جو کمزور اور ناتواں ہوتی ہیں اور وہ عقائد مستحکم اور پائیدار ہوجاتے ہیں جو ابھی اچھی طرح دل میں راسخ نہیں ہوئے ہوتے ہیں. دین کے عقائد اور اعمال کا یہی رسوخ و استحکام ہے جس کو قرآن مجید میں حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے' اور قرآن کے اشارات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حکمت کے خزانہ کی کلید درحقیقت انفاق ہی ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ کے اخیر میں انفاق کی برکتیں بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:۔

الشیطن یعدکم الفقر ویامرکم بالفحشاء واللہ یعدکم

مغفرۃ منہ وفضلا واللہ واسع علیم یؤتی الحکمۃ من یشاء ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیرا (۲۶۸-۲۶۹ البقرہ)

(شیطان تمھیں فقر سے ڈراتا ہے اور بے حیائی کا مشورہ دیتا ہے اور اللہ اپنی طرف سے تمھارے لئے مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ بڑی سمائی اور بڑا علم رکھنے والا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر ملا)

یہ اس انفاق کی برکت بیان ہوئی ہے جو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے اور اپنے دل کو دین کے احکام پر جمانے کے لئے کیا جائے۔ چنانچہ اس کی تمہید یوں شروع ہوتی ہے:۔

مثل الذین ینفقون اموالھم ابتغاء مرضات اللہ وتثبیتا من انفسھم۔

(ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال خرچ کرتے ہیں اللہ کی رضا جوئی اور اپنے دل کو جمانے کے لئے)

اپنے دل کو جمانے کے لئے ——— یعنی دل کی خواہشات کے علی الرغم وہ اپنے مال اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ ان کے لئے خدا کے احکام کی تعمیل اور اس راہ میں ہر قربانی آسان ہو جائے۔ جو لوگ اس مقصد سے مال خرچ کرتے ہیں ان کا صلہ اللہ تعالےٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ ان کو اپنی مغفرت اور اپنے فضل سے نوازتا ہے اور ساتھ ہی ان کو حکمت کا وہ خزانہ بھی عطا فرماتا ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔

مال میں برکت انفاق کی چوتھی برکت یہ ہے کہ اس سے آدمی کے مال میں برکت ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں اس برکت کی مثال اس طرح بیان ہوئی ہے:۔

مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ واللہ یضعف لمن یشاء واللہ واسع علیم

ان لوگوں کی مثال جو اللہ کے رستے میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں، ایسی ہے جیسے ایک دانہ ہو جو اگائے سات بالیاں جس کی ہر بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہو بڑھاتا ہو

اور اللہ بڑی سمائی رکھنے والا اور علم والا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

یمحق اللہ الربوٰا ویربی الصدقٰت (اللہ سود کو مٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔)

یہ برکت آخرت میں جو ظاہر ہوگی وہ تو ہوگی ہی، اس دنیا میں بھی اس شخص کے مال میں برکت ہوتی ہے جو خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے بے شمار بندے جو اس کے انفاق سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ یہ دعائیں کرنے والے بندے مخلص بھی ہوتے ہیں اور اس بات کے مستحق بھی، کہ اللہ تعالےٰ ان کی دعائیں قبول فرمائے، بلکہ بعض روایات سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایسے شخص کے لئے خدا کے فرشتے بھی برکت کی دعا کرتے ہیں۔ ایک حدیث کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بندوں پر کوئی صبح نہیں آتی ہے، مگر دو فرشتے اترتے ہیں۔ ایک یہ دعا کرتا ہے کہ اے خدا تو اپنی راہ میں مال خرچ کرنے والے کو اس کا بدل عطا فرما اور دوسرا یہ دعا کرتا ہے کہ تو بخیل کو بربادی اور نقصان عطا فرما۔" (متفق علیہ)

لیکن یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ برکت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے کی تجوریاں بھر جاتی ہیں یا اس کے بینک بیلنس میں اضافہ ہوجاتا ہے، یا اس کے املاک وجائداد کی مقدار اور تعداد کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے، بلکہ برکت کا مفہوم یہ ہے کہ مال کا جو حقیقی فائدہ اور نفع ہے وہ جس مقدار میں حاصل کرتا ہے اس کے مقابل میں دوسرے حاصل نہیں کرپاتے۔ خلق خدا کی جو خدمت اس کے مال سے انجام پاتی ہے۔ دوسروں کے مال سے انجام نہیں پاتی۔ معاشرے اور تمدن کی اصلاح وترقی میں جو حصہ اس کے مال کا ہوتا ہے، دوسروں کے مال کا نہیں ہوتا، خدا کی خوشنودی کا جو لازوال خزانہ وہ اپنے مال کے بدلے میں حاصل کرلیتا ہے، دوسرے اس سے محروم ہوتے ہیں۔ خلق خدا کے دلوں میں عزت اور محبت کا جو مقام اسے ملتا ہے روپئے کو گن گن کر رکھنے والے اور کوٹھیوں اور کاروں کے مالک اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے پھر سب سے بڑی بات یہ کہ جو فراغ خاطر، جو سکونِ قلب، جو اعتماد علی اللہ، جو قلبی مسرت اور دل اور روح کی

جو بادشاہی اس کو حاصل ہوتی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کو کبھی خواب میں بھی وہ چیز نظر نہیں آتی۔

اس برکت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انفاق کرنے والے کا مال، چونکہ دوسروں کے دبائے ہوئے حقوق کی فاسد ملاوٹ سے پاک ہوتا ہے، اس وجہ سے صالح بیج کی طرح اس کی قوت نشوونما میں بڑا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی قدر و قیمت کو مضاعف کر دیتا ہے اور ان آفتوں سے وہ محفوظ ہو جاتا ہے جو آفتیں اندر اندر ان مالوں کو چٹ کرتی رہتی ہیں، جن کے اندر دوسروں کے حقوق کی آلائشیں ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ (المنبر، لائلپور)

احوال و تاثرات

عید اور عید کے بعد

(م - ا - م)

عید کا دوگانہ اور زبانوں پر حمد و تکبیر کا ترانہ (اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد) اس بات کی علامت ہے کہ آج پروردگار عالم کی کوئی بڑی نعمت تمام ہوئی ہے جس کا حق ہے کہ انسان سجدۂ شکر ادا کرے اور حمد و ثنا کے نغموں سے زمین و آسمان کی وسعتوں کو بھر دے۔

یقیناً ایک بڑی، اور بہت بڑی نعمت تھی جس کے اتمام کی خوشخبری لے کر عید کا آفتاب طلوع ہوا۔ اور اس کی حق شناسی کا یہی تقاضہ تھا جو ہوا۔ یہ نعمت ماہِ صیام اور اس کے خاص عبادتی نظام کی نعمت تھی جو انسان کو تقویٰ کی راہ پر ڈالنے اور اس راہ کی مشکلات کو آسان بنانے کا خصوصی امتیاز رکھتا ہے ـــ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ	اے ایمان لانے والو! فرض قرار دیے گئے ہیں
عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى	تم پر روزے، جیسے کہ تم سے پہلے اہلِ ایمان پر
الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ	فرض کیے گئے تھے، تاکہ تم صاحبِ تقویٰ
(البقرہ)	بن سکو۔

ـــــ وہ "تقویٰ" جو انسانی سعادت کی معراج، یا کہیے کہ اس کی تمام سعادتوں کا زینہ ہے۔

إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ	اس کی دوستی تو بس اربابِ تقویٰ
( )	ہی کا حصہ ہے۔
اَلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا	جو لوگ ایمان لائے اور اپنے رب سے ڈرتے

يَتَّقُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ ( )

ہے انھیں کے لیے پروانۂ خوشنودی ہے حیاتِ دنیا میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی۔

اس کے آگے کون سی سعادت و سرفرازی ہے جو ایک خداشناس تصور میں بھی لاسکے؟

تو جو "تقویٰ" اس وجود خاکی پر اس منتہائے سعادت کے دروازے کھولتا ہو اور بدیں طور کہیے کہ، خود منتہائے سعادت ہو، وہ جن اوقات اور جس نظام اوقات کی برکت سے ارزانی ہو، کیا شبہ ہے اُن اوقات اور نظام اوقات کے نعمت اور کمالِ نعمت ہونے میں؟ — حق ہے، جتنا بھی شکر اس نعمت کا ادا کیا جائے۔ اور جسقدر بھی اس کے اعتراف میں زبانوں کو گھسا جائے!

مگر یہ عجیب بات ہے کہ انسان جس پہلو سے رمضان اور اس کے خاص عبادتی نظام کو عظیم نعمت سمجھتا اور شکر و اعتراف کے اعلیٰ ترین مظاہر پیش کرتا ہے۔ اس مظاہرۂ شکر و اعتراف کے معًا بعد ہی سے اپنے عمل سے یہ ثابت کرنے لگتا ہے کہ اس نے اس پہلو سے رمضان اور اس کے مخصوص عبادتی نظام سے کوئی فیض نہیں حاصل کیا! — بیشک اللہ کے بندے ہیں جو اس صورت حال سے مستثنیٰ ہیں، مگر ہم جیسے جو اُمت کی اکثریت ہیں، اُن کا تو عام حال بالکل یہی ہے، چھوڑ دیجئے ان کو جو رمضان کے خاص عبادتی نظام میں کوئی حصہ ہی نہیں لیتے۔ کہ ان کا مسئلہ تو بالکل صاف ہو۔ جن کا حال یہ نہیں ہو اُن کا جائزہ لیجئے! جو یوں نماز پڑھنے کے عادی نہیں تھے وہ اگر رمضان میں نماز اور تراویح تک کی پابندی کرنے لگے تو عید کی نماز پڑھتے ہی انھوں نے مسجدوں سے اس طرح رُخ پھیر لیا، جیسے کبھی کوئی آشنائی ہی نہیں تھی جو نمازوں کے عادی تھے مگر فکر و اہتمام سے کام نہ لیتے تھے انھوں نے اگر رمضان میں اس اہتمام کی کسی کی تو رمضان گذرتے ہی اس اہتمام سے بیگانہ ہو گئے۔ جو سال بھر اوامر و نہیات سے لاپرواہی برتتے رہے تھے وہ ایام صیام میں بعض احکام سے اعتناء کرنے کے بعد پھر اسی بے اعتنائی کی طرف لوٹ گئے، جنھوں نے جھوٹ کم کر دیا تھا وہ اپنی کسر پوری کرنے میں لگ گئے۔ جنھوں نے فحش سے بچنے کی کوشش کی تھی وہ اس کوشش کو بھول گئے اور جو شریعت کی حرام کردہ تفریحات (مثلاً سینما بینی) سے اجتناب کیے ہوئے تھے وہ دوگانۂ عید ادا کرتے ہی اس اجتناب کو خیرباد کہنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ آخر کیا قصہ ہے؟ ــــ جس پروگرام میں تقویٰ آفرینی کی ایسی یقینی صلاحیت ہو کہ خدا کی کتاب اس کا اعلان کرے، اسکی بے اثری کا (معاذ اللہ) حال یہ نظر آئے کہ جیسے ادنیٰ صلاحیت، اس میں تقویٰ پیدا کرنے کی نہیں تھی! ــــ سوال سوچنے کا ہے، جن لوگوں کو۔ باوجود کمزوریوں کے ــ خود اپنے لئے اور تمام امت کے لئے تقویٰ کی آرزو ہے، انھیں سوچنے کی ضرورت ہے کہ اگر تقویٰ آفرینی کے لئے خدا کا مقرر کردہ خصوصی نظامِ عمل بھی مفید نہیں ہے تو پھر کہاں سہارا جائے۔ اور کس راہ سے اس سعادت تک رسائی حاصل ہوگی؟

جہاں تک خدا کے دیئے ہوئے اس تربیتی پروگرام کا تعلق ہے، یقیناً ہم نہیں سوچ سکتے کہ اس میں اثر نہیں ہے۔ اس میں اگر اثر نہیں تو دنیا کے کسی اور پروگرام میں تقویٰ آفرینی کا اثر نہیں ہوسکتا۔ لیکن ہمارے حق میں جو یہ بے اثر نظر آرہا ہے اسکی وجہ خود ہمارے اندر اس شرط کا فقدان ہے جو ایسے کسی پروگرام سے فیض پانے کے لیے فطرۃً ضروری ہے۔

اللہ نے ہم پر روزے فرض کرتے ہوئے اس کی غایت بتائی تھی کہ مہینہ بھر کے اس سالانہ پروگرام سے زندگی میں تقوے کی شان پیدا ہونے کی امید ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۝

(تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں تاکہ تم تقویٰ کی شان سے زندگی گزار سکو۔)

ہم نے روزے تو رکھے اور ان کا احترام بھی کرنے کی کوشش کی مگر ان کی فرضیت کے مقصد کی طرف ہمارا ذہن شاید ہی متوجہ ہوا ہو۔ بس یہی اس بے اثری کا راز ہے کہ ہم چار دن بھی اتنے تقویٰ کی شان سے بھی نہ رہ سکے جتنا رمضان کے ایام میں ہم نے اختیار کرلیا تھا۔[۵]

انسان جب کسی مقصد کی خاطر کوئی مشقت جھیلتا ہے تو فطری طور پر تھوڑے بہت دن ضرور اس مقصد کا پاس کرتا ہے۔ ہم اگر یہ سمجھتے کہ خدا نے بھوک اور پیاس کی مشقت دیکر محض اپنی بندگی کا خراج ہم سے وصول نہیں کیا ہے، بلکہ اس مشقت کو اپنی عبادت کا مرتبہ دیکر ہماری زندگی کا ڈھنگ سنوارنے کے لیے اس کو فرض کیا ہے، تو اسکی ادائیگی میں جہاں ہم ادائے فرض کا احساس اپنے اندر پاتے' وہاں یہ جذبہ بھی آپ سے آپ ہمارے اندر اُبھرتا کہ اس مشقت کا وہ نتیجہ بھی ہمیں حاصل ہونا چاہیئے جس کے لیے اسے فرض

[۵] یہ غلط فہمی نہ ہو کہ رمضان کی ساری تاثیر اسی شعورِ مقصد پر موقوف ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس کی پوری تاثیر کے لئے وہ ایمانی کیفیت شرطِ اوّل ہے جو تمام عبادات کی روح ہے۔ البتہ اس درجہ بے اثری کو روکنے کے لیے جس کا ذکر ہو رہا ہے نفسِ ایمان کے ساتھ مقصد کا شعور ہی کافی ہے۔

کیا گیا ہے۔ اس طرح رمضان گزار کر ہمارا حال یہ نہ ہوتا کہ گویا ایک فرض تھا جسے اتار کر چھٹی پالی، بلکہ ذہن اس طرح کام کرتا کہ اس مشقت کا تقاضہ کیا ہے جو ایک دن دو دن نہیں بلکہ پورے تیس دن تقویٰ کی اعلیٰ مشق کرتے ہوئے اٹھائی گئی ہے! اور اس ذہن کے ساتھ یہ حال کسی طرح ممکن نہ تھا کہ اُدھر رمضان نے پشت پھیری) اور اِدھر

جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اُسے صاف دل سے بھلا دیا

خیر یہ سوچ بچار تو آئندہ کا کام دیگا، جو جملہ معترضہ کے طور پر بیچ میں آ گیا —— کیونکہ یہ رمضان تو شعور مقصد اور استحضار مقصد کے بغیر گزر گیا۔ اور اب اس سوچ بچار کا حاصل صرف اتنا ہی ہو کہ آئندہ یہ چوک نہو —— بات عید کی چل رہی تھی کہ ہم نے جو یہ خوشی کا دن منایا، اور اس کے پروگرام میں سب سے نمایاں اور سب سے مقدم چیز دوگانہ شکر اور زمزمۂ حمد و تکبیر رہی۔ یہ خوشی آخر کس چیز کی تھی؟ کیا کوئی موسمی ترنگ تھی جس نے بعض ہمسایہ قوموں کی طرح ہمارے جذبات تحفظ دکیف کو چھیڑ کر موسم کے ایک خاص دن کو یوم عید کی شکل دیدی؟ یا کوئی قومی فتح کا دن تھا جس کی یادگار ہم منا رہے تھے؟ یقیناً ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ نا واقف سے نا واقف مسلمان بھی رمضان کے ساتھ عید کے کھلے تعلق کی وجہ سے کسی نہ کسی درجہ میں اصل بات کو سمجھتا ہے۔ کم از کم یہی سمجھتا ہو کہ یہ رمضان کی خوشی تھی! —— تو رمضان کی خصوصیت شب و روز کی عبادت کے سوا کیا تھی؟ پھر کیا اس سخت عبادت پر خوشی کا نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا کہ ہم سال بھر کی ہلکی عبادتوں سے بھی منہ موڑ لیں؟

یہ رمضان کی خصوصیت سے کم سے کم درجہ میں واقفیت رکھنے والے طبقے کے سوچنے کی بات ہے!

دوسرا ایک طبقہ ہو جو معاملہ کی نوعیت کو ذرا اس سے زیادہ سمجھتا ہو۔ اور وہ عید کی خوشی میں رمضان کی اس خصوصیت کے دخل سے بھی واقف ہو کہ اس ماہ میں قرآن اتارا گیا۔ جو هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ہے۔ تو کیا اس کتاب کے نزول پر خوشی کا نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا کہ خوشی منائے جائیں اور اسکے احکام کو لپیٹ کر رکھتے جائیں۔؟

پھر لوگ بھی ہیں جو معاملہ کی پوری نوعیت سے واقف ہیں اور عید کی خوشی کے اس رمز کو بھی سمجھتے ہیں کہ اس دن اللہ کا دیا ہوا تقویٰ آفرینی کا وہ نصاب تمام ہوتا ہے جسکی تکمیل پر خود پروردگار نے مقام تقویٰ حاصل ہونے کی بشارت دی ہے۔

غرض ان سب باتوں کو ملا لیجئے یا الگ الگ ہی رکھیئے۔ بہر صورت یہ سوال اپنے نفس سے کرنے کا ہے کہ کیا ان تمام پہلوؤں سے یا ان میں سے کسی ایک ہی سے عید منانے کے بعد اور وہ بھی اس طور طریقے سے منانے کے بعد جو ان پہلوؤں سے پوری طرح ہم آہنگ بھی ہے اور ان کا غماز بھی، ہماری اس روش میں کوئی معقولیت ہو جو عید ہی کے دن سے ہم نے کم و بیش کے فرق کے ساتھ اختیار کرلی ہے۔ اور ہر سال اختیار کرتے ہیں؟

كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهُ۔

انتخاب

ہندوستان میں جمہوریت کا مستقبل

(ایچ - وی. کامتھ)

ایسے وقت میں جبکہ ایشیا کے وسیع خطوں میں جمہوری ادارے فنا ہو گئے ہیں یا دم توڑ رہے ہیں، جبکہ ہمارے چاروں طرف نوخیز جمہوریت کی شمع حیات تقریباً بجھادی گئی ہے، ہندوستان کی سیاسی حالت کا جائزہ بیدار مغزی اور دانشمندی کا کام ہوگا۔ تاکہ مخالف میلانات کے انسداد کے لیے پُرخلوص اور سنجیدہ تدابیر عمل میں لائی جاسکیں اور اپنے ملک میں جمہوریت کی بقا و استحکام کے لیے ٹھوس اقدام کیا جاسکے۔ یہ کہنا کہ ہندوستان ایشیا میں جمہوریت کا آخری قلعہ ہے جو آمریت کے ریگستانوں میں ایک نخلستان کے مانند ہے، اب ایک فرسودہ مقولہ ہو گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ آنے والے دس سال ہندوستان میں جمہوریت کی بقا کے لیے فیصلہ کن ہی نہیں، نازک اور معرکے کے سال بھی ہوں گے۔

اگر اس ملک میں جو ایشیا اور دنیا کا دوسرا عظیم ملک ہے، جمہوریت کی عمارت منہدم ہو جاتی ہے تو مجھے کوئی شبہ نہیں ہے کہ صرف ہندوستان ہی میں نہیں، بلکہ اس قدیم براعظم کے وسیع حصوں پر کیمونزم کی حکمرانی ہوگی یا اس سے بھی بدترین حالت ہوگی یعنی فوجی استبداد یا ناکارہ شخصی مطلق العنانی یا بے نظمی و انتشار کا راج ہوگا اور افریقہ میں بھی آزادی کے چراغ گل ہو جائیں گے۔

اپنی گزشتہ تاریخ کو تھوڑا بہت سمجھے بغیر ہندوستان میں جمہوریت کے مستقبل پر گفتگو کرنا مفید نہ ہوگا۔ اگرچہ ہندوستان کے روحانی اتحاد کا ہزاروں سال پہلے ارتقا ہو چکا تھا لیکن وہ اپنی محفوظ تاریخ کے طویل اور گوناگوں دور میں کبھی واحد اور متحد سیاسی وجود نہیں رہا ہے، حتیٰ کہ جب انگریزوں نے ہندوستان کو سیاسی وحدت کے طور پر قائم کیا تو بھی پورے ملک میں یکساں طرز کی گورنمنٹ اور

نظم و نسق نہ تھا، کیونکہ ہندوستانی عوام ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک شخصی حکومت کی ترنگوں کا شکار رہے۔ یہ شخصی حکومت اتفاقیہ طور پر کریم النفس تھی۔ لیکن زیادہ تر بدعنوانیوں سے پُر تھی۔ اور ملک راجاؤں، صوبہ داروں اور سپہ سالاروں کے درمیان تقسیم تھا۔ ریسرچ اسکالر ہمیں بتاتے ہیں کہ زمانۂ قدیم میں ہماری گاؤں پنچائتیں جمہوریت سے ناواقف نہ تھیں، لیکن اس جمہوریت سے موجودہ طرز کی جمہوریت کا موازنہ ایسا ہی ہے جیسے کیچوے سے اژدہے کا۔ کیا یہ قسمت کی حیرت انگیز ستم ظریفی نہیں ہے کہ گیارہ سال پہلے جب ہمیں سیاسی آزادی ملی تو ہندوستان ایک بار پھر "متحدہ قومی ریاست" بننے سے محروم ہو گیا۔ اور نئے ملک پاکستان میں جمہوریت مر کر گل سڑ بھی چکی!۔

قرارداد مقاصد جن جمہوری اداروں کا قلم شاہی اور درباری روایات کی شاخ پر لگانے کی کوشش کی گئی ہو ان کے صحت مند ارتقاء کے لیے نہ زمین راس آ سکتی ہے نہ آب وہوا۔ کتنے لوگ جانتے ہیں کہ جنوری ۱۹۴۷ء میں بھی، جبکہ ہندوستان آزادی کے دروازہ پر تھا، دستور ساز اسمبلی نے ہندوستان کے "خود مختار جمہوری ری پبلک" (SOVEREIGN DEMOCRATIC REPUBLIC) قرار دیے جانے کی تجویز کو مسترد کر دیا تھا۔ اور اس کے بجائے اس بات کو ترجیح دی تھی کہ اسے "آزاد خود مختار ری پبلک" (INDEPENDENT SOVEREIGN REPUBLIC) قرار دیا جائے۔ دستور ساز اسمبلی نے قرارداد مقاصد (OBJECTIVES RESOLUTION) کو ـــــ جس کا نام بعد میں ہندوستان کی آزادی کا چارٹر" رکھا گیا اور جس کے مجوز پنڈت جواہر لال نہرو تھے ـــــ منظور کر لیا اور میری اس تجویز کو کہ "جمہوری" (DEMOCRATIC) کا لفظ "آزاد" (INDEPENDENT) یا "خود مختار" (SOVEREIGN) کے بجائے رکھ دیا جائے، رد کر دیا گیا۔ حالانکہ تین ہی سال گزرنے پائے تھے کہ تھوڑی سی بحث و گفتگو کے بعد اسے منظور کر لیا گیا اور دستور کے ابتدائیہ میں شامل کر دیا گیا۔
۱۳ دسمبر ۱۹۴۶ء کو پنڈت جواہر لال نہرو نے، دستور ساز اسمبلی سے یہ درخواست کرتے ہوئے کہ وہ میری ترمیم کو مسترد کر دے، یہ دلیل دی تھی کہ ہم جو طرز حکومت یہاں قائم کریں وہ ہمارے عوام کے مزاج سے ہم آہنگ اور ان کے لیے قابل قبول ہونا چاہیے۔ ہاؤس دیکھے گا کہ تجویز میں ہم نے لفظ "جمہوری" استعمال نہیں کیا ہے، کیونکہ ہمارے خیال میں یہ بات واضح ہے کہ "ری پبلک" کا لفظ

اس لفظ پر بھی مشتمل ہے! اور ہم نے ایسے الفاظ کا ، جو غیر ضروری اور حشو و زوائد ہوں استعمال کرنا پسند نہیں کیا! .... " مجھے محسوس ہوتا ہے ــــــ خدا کرے میں غلطی پر ہوں ــــــ کہ خود پنڈت جواہر لال نہرو کے اپنے ذہن میں جمہوریت کی اس مخصوص طرز کا نقشہ کبھی بھی واضح نہیں رہا ہے جسے وہ ہندوستان میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔

جمہوریت کا امتیاز بجا طور سے ایک "طرز زندگی" کی حیثیت سے ہے۔ ۲۵ فروری ۱۹۵۶ء کو پارلیمنٹری جمہوریت کے پہلے سیمنار کو ــــــ جو نئی دہلی میں ہوا تھا ــــــ خطاب کرتے ہوئے نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے جمہوریت کے کچھ بنیادی معیارات کو وضاحت و قوت کے ساتھ بیان کیا، انھوں نے کہا: " جمہوریت ایک نئی زندگی کی طرف دعوت ہے ..... جمہوری حکومت کا دار و مدار صاف ستھرے اور اہل نظم و نسق پر ہے۔ (آج) گورنمنٹ پبلک سکٹر کو بتدریج وسیع کرتے ہوئے خود سب سے بڑی آجر بنتی جارہی ہے، (اس لیے) ہمیں عمدہ قسم کا عملہ بھرتی کرنا چاہیے .... انتخاب و تقرر کا انحصار اہلیت پر ہونا چاہیے، اثر و رسوخ پر نہیں ....

جمہوریت کے معنی ہیں اقتدار کی تقسیم اور عدم ارتکاز " آزاد عدلیہ، آڈٹ اور سروس کمیشن حکومت کو من مانی اور مستبدانہ کارروائیوں سے روکتے ہیں .... اقتدار کی افزونی فرشتہ خصلت انسان کو بھی سخت اور پست ہمت بنا دیتی ہے۔ اقتدار کو مرتکز نہیں ہونا چاہیے ....

...... ایک گورنمنٹ صرف اتنی سی بات سے جمہوری نہیں بن جاتی کہ اس نے اکثریت کے ووٹوں سے سیاسی غلبہ حاصل کیا ہے .... جب تک ہم اپنے شہریوں کو افلاس، بھوک، بیماری اور جہالت سے آزاد کرانے کے قابل نہ ہو جائیں ہماری جمہوریت راحت و اطمینان سے خالی ہوگی۔"

اسی سیمنار کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر اعظم نہرو نے کہا " جمہوریت کا تذکرہ خصوصاً ماضی میں سیاسی جمہوریت کی حیثیت سے رہا ہے، جس کی نمائندگی ہر اس شخص سے ہوتی ہو جو ووٹ رکھتا ہو۔ لیکن ایک ووٹ بذات خود ایک ایسے شخص کی نمائندگی نہیں کرتا جو زمانے کا مارا ہوا ہو یا فاقہ کشی میں مبتلا ہو اور بھوکا ہو، سیاسی جمہوریت فی نفسہ کافی نہیں ہے، بجز اس صورت کے کہ اسے معاشی جمہوریت کی بہ تدریج بڑھتی ہوئی مقدار، مساوات اور عوام کے

لیے عمدہ ضروریاتِ زندگی کی فراوانی کے حصول اور عمومی وہمہ گیر ناہمواریوں کے ازالے کے لیے (بطور ذریعہ کے) استعمال کیا جا سکے۔

کیا ہم وزیر اعظم اور نائب صدر جمہوریہ کی بتائی ہوئی سمت میں بڑھ رہے ہیں، کیا اس امر کی سرگرم اور سنجیدہ کوششیں کی جارہی ہیں کہ جمہوری مزاج کے مناسب ضابطۂ معاملات کی تشکیل ہو، صحت مند رسوم وروایات کو جمہوری طرز پر ڈھالا جائے، بنیادی اقدار (اخلاقی اقدار) کی نشو ونما ہو اور پبلک لائف اور نظم ونسق میں اخلاق کے اعلیٰ معیارات کو نافذ کیا جائے؟ کیا اس حقیقت کو واضح کرنے کی سنجیدہ کوششیں عمل میں لائی جارہی ہیں کہ قانون کی حکومت اور ادائیگی فرض کے پرشوق انہماک ــــ جو حقوق کی طلب سے کم پرجوش نہ ہو ــــ کے بغیر آزادی کا، اور روحانی داخلاقی اقدار سے خالی جمہوریت کا روبہ زوال اور فنا ہونا ناگزیر ہے؟

آج ہندوستان کی "خود مختار جمہوری ریپبلک" ۹ سال کی ہو چکی ہے۔ میں نے تقریباً ۲۵ سال تک برٹش راج کا اندرونی نظم ونسق دیکھا، میں نے اپنے ملک کے لیے ایک بہتر نظم پانے کی امید میں جنگ آزادی لڑی، میں نے دستور کے بنانے میں حصہ لیا۔ میں چار پارلیمنٹری انتخابات میں امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہوا، اور میں نے پارلیمنٹ میں حزب مخالف کے ایک رکن کی حیثیت سے کام کیا ہے۔ میں ان گوناگوں تجربات کے لیے جو مجھے حاصل ہوئے، خدا کے فضل وکرم کا ممنون ہوں۔ لیکن میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ۱۹۵۰ء میں مجھے جو توقع ہندوستان میں جمہوریت کے قابلِ عمل ہونے کے بارے میں تھی، وہ اب قابلِ لحاظ حد تک کم ہو گئی ہے۔ میں اپنے پڑھنے والوں کو یقین دلاتا ہوں کہ نہ تو میں قنوطی ہوں، نہ کاہن اور نہ نجومی۔ لیکن مجھے خود اپنے پچھلے بیس سالہ سیاسی وانتظامی زندگی کے تجربات اس یقین کی طرف لے جارہے ہیں کہ ہندوستان میں جمہوریت کا مستقبل تاریک ہے۔

نظم ونسق ایک دبے پاؤں آنے والے فالج کا شکار ہو گیا ہے۔ ساتھ ہی ڈانواڈول شخصیت پرستی، ہر طرح کے اصول ومعیارات سے متنفرانہ بے اعتنائی، پبلک دولت کے معاملہ میں اخلاقی حس کے فقدان اور ذاتی منفعت کے نہ بجھنے والی بھوک نے نظم ونسق کو اور بھی کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ قومی وعوامی مفاد کو اکثر اوقات جماعتی یا ذاتی اغراض ومقاصد پر قربان کر دیا جاتا ہے۔

نظم ونسق کے معیار اور اس کی نوعیت کو ہمیشہ وزرائے حکومت کے طور طریق سے متعین کیا جاتا ہے۔
وزرا اور حکام میں اگرچہ کچھ قابلِ احترام استثنائات بھی ہیں۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ استثنائات
بھی جیسے سخت بدبختی کا شکار ہو گئے ہوں اور اس (اخلاقی) سڑاہند کے روکنے کے معاملہ میں بالکل
لاچار و بے بس ہوں۔ اگر میں برٹش دور کے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۹ء تک کے اعلیٰ نظم و نسق، ڈسپلن،
کارکردگی اور اخلاقِ عامّہ کے قطعی معیارات کی سرپرستی کا ـــــ باوجودیکہ اس سب کے تہہ میں
گھناؤنے سامراجی اغراض و مقاصد تھے ـــــ تذکرہ کروں تو یہ بات کچھ وطن پرستانہ جذبات
سے ہم آہنگ نہ ہوگی۔ لیکن ان میں سے اکثر باتیں اب زیادہ عرصہ تک ناقابلِ فہم نہیں رہ سکتیں۔
یہ ایک حقیقت ہے کہ سیرت و کردار اور اخلاقی رویہ کا بڑھتا ہوا ضعف جمہوری نظام کی قوتِ حیات کو
رفتہ رفتہ بالکل ختم کر دے گا۔

برسرِ اقتدار پارٹی کا 'ریاست' کے ساتھ بڑھتا ہوا اتحاد ہندوستان میں جمہوریت کے لیے
شدید خطرہ ہے، یہاں، ناگپور میں 'جہاں کہ میں یہ سطور لکھ رہا ہوں'، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ
چند سال میں پریس، پارلیمنٹ اور باہر کی تنقیدیں رائیگاں گئی ہیں، کانگرس پارٹی کے اس سالانہ
اجلاس کے موقع پر پبلک فنڈ کے بددیانتی کے ساتھ، بے پایاں ضیاع اور پارٹی کے مقاصد کے
لیے حکومت کی مشینری کے ناروا استعمال کو دیکھ دیکھ کر سخت متلی آتی ہے۔

کانگریس پارٹی ـــــ جس کے بہت سے درخشاں ستارے صبح و شام گاندھی جی کے نام کی دہائی
دیتے ہیں ـــــ غالباً یہ نہیں جانتی کہ پارلیمنٹ میں دستوری ذمہ داریوں سے زیادہ اہم رائے عامہ
اور "نام نہاد" اقلیت کی رایوں کا پاس و لحاظ ہے۔ "نام نہاد" کا لفظ میں نے دانستہ اور عمداً استعمال
کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ میں اکثریت رکھنے والی پارٹی ووٹروں کی اقلیت کے ووٹوں
سے منتخب ہو کر آئی ہے۔ اگر متناسب نمائندگی کا نظام ہوتا تو قانون ساز مجالس میں حزبِ
مخالف کو زیادہ اچھی پوزیشن حاصل ہوتی۔

وہ ایک مہمل اور اوندھی تجویز تھی جسے وزیر داخلہ پنڈت پنت نے اگلے روز پیش کیا کہ پارلیمنٹ
کے فیصلے ـــــ بالفاظِ دیگر ان کی پارٹی کے فیصلے ـــــ مقدس اور واجب التعظیم ہیں اور ان کی
راہ میں عوام یا حزبِ مخالف کو حائل نہ ہونا چاہیے۔ جمہوریت خالی خولی (جمہوریت کی) نقل اور

نزاسخزاین ہوگی، اگر عوام ــــــ جمہور ــــــ کو ان کے بنیادی انسانی حقوق ــــــ غیر متشددانہ عدم تعاون اور غیر منصفانہ وجابرانہ قوانین کی مزاحمت سے محروم کردیا گیا۔ جبکہ ان ظالمانہ قوانین کا کوئی پارلیمنٹری علاج اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک برسر اقتدار پارٹی کی پشت پر ایک بے حس اور گھٹیا درجہ کی اکثریت موجود ہے۔ ان حقوق سے محرومی آمریت کی راہ پر سب سے پہلا قدم ہوگا۔ مہاتما گاندھی نے برسوں پہلے متنبہ کیا تھا۔ "حقیقی سوراج چند افراد کے ہاتھ میں اقتدار آنے سے نہیں بلکہ اس بات سے آئے گا کہ سب لوگوں کو موقع حاصل ہو کہ وہ اقتدار کی راہ میں حائل ہوسکیں، اگر اقتدار کا بیجا استعمال ہو۔"

انتخابات کی مہم

منصوبہ بندی، اقتصادی اور سیاسی، دونوں قسم کی قوتوں کو معدودے چند افراد کے ہاتھوں میں مرتکز کردیتی ہے، سوشلسٹ طرز کا سماج اشتراکیت اور سماجی کنٹرول کے ذریعہ نہیں تعمیر کیا جارہا ہے بلکہ بڑھتی ہوئی سرکاریت (چیزیں حکومت کی ہوجائیں) اور دفتریت و مرکزیت کے ذریعہ جو قومیانے (NATIONALISATION) کی مضحکہ خیز نقل ہے۔ ریاست کی حیثیت فی الحقیقت مطلق کی ہوتی جارہی ہے' یہ بات جمہوریت کی ــ جو ڈاکٹر رادھا کرشنن کے الفاظ میں قوت کے عدم ارتکاز کا نام ہے ــــــ بالکل نقیض ہے۔ مجھے یقین ہے کہ برسر اقتدار پارٹی منصوبہ کے نام پر آئندہ سالوں میں زیادہ سے زیادہ طاقت کو ہڑپ کرنے کی غاصبانہ کوشش کرے گی۔

اور انتخابات ــــــ وہ اصل بنیاد جس پر پارلیمنٹری جمہوریت کا محل تعمیر ہوتا ہے! ــــــ کے بارے میں کیا کہا جائے؟ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے دستور ساز اسمبلی کو الوداعی خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا۔ "تعلیم بالغان کے بغیر بالغوں کا حق رائے دہندگی چھپے ہوئے خطرات سے پُر ہے۔" آلڈوس ہکسلے (ALDOUS HUXLY) نے یہ بہت مناسب رائے ظاہر کی ہے کہ "ایسا قانون ہوسکتا ہے اور میرا خیال ہے کہ ہونا بھی چاہیے، جو سیاسی امیدواروں کو اپنی انتخابی سرگرمیوں میں ایک متعینہ رقم سے زائد رقم صرف کرنے ہی سے نہیں، بلکہ انھیں ایسے نامعقول اور جذباتی پروپیگنڈوں سے بھی باز رکھے جو ساری جمہوری طریق کار کو لغو بنا رکھ دیتے ہیں۔ اگر ایک ممبری پارلیمنٹری حلقۂ انتخاب کے لیے خرچ کی حد ۲۵ ہزار روپیہ رکھ دی جائے ــــــ اُس خرچ کے علاوہ جو اس پارٹی کی طرف ہوتا ہے

جو کسی امیدوار کو کھڑا کرتی ہے ——— تو کیا اس صورت میں الیکشن آزادانہ اور دیانتدارانہ ہو سکتا ہے؟ اگر مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کے انتخابات بالواسطہ ہوں تو یہ طریقہ کم مسرفانہ اور جمہوری ہوگا، لیکن اس صورت میں بھی ووٹوں کو خریدنے کی خراب لت کو کس طرح ختم کیا جائے؟ سرمایہ داروں کے لیے ووٹوں کا خریدنا ——— جبکہ ووٹ بہت کم ہوں ——— بہت آسان ہو سکتا ہے!

بدقسمتی سے پریس بھی آزادی کی جدوجہد کے زمانے کے مقابلے میں کم آزاد اور زیادہ خوف زدہ ہو گیا ہے۔ حزب مخالف اس گھر کی طرح ہے جس نے منقسم ہو کر خود اپنے کو تباہ کر لیا ہو۔ اور یہی وجہ ہو کہ کانگرس جاگیردار بنی ہوئی ہے۔ سب سے زیادہ اندوہناک صورت حال یہ ہے کہ یہ دیکھنے کے باوجود کہ کرپشن نے پڑوسی ملک کو کس نتیجہ تک پہونچا دیا ہے، کرپشن سے جنگ کرنے اور اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا جذبہ حکام میں مفقود ہے۔ حزب مخالف نے بارہا یہ مطالبہ کیا کہ اس مقصد کے لیے ایک آزاد قانونی باڈی بنا دی جائے، مگر یہ مطالبہ رد کر دیا گیا۔ عوام کی اکثریت اس معاملہ میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی اور نہ اسے اس بات پر یقین ہے کہ جمہوریت کی مدافعت کے لیے جنگ کرنی اور جان دینی چاہیے۔

میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں ہم ایک بے اصول، مستبد و سنگ دل نظام حکومت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جو ہو سکتا ہے کہ بھدّے مفہوم میں کچھ زیادہ کارگزار ہو، مگر وہ قطعی طور پر غیر جمہوری ہوگا۔

جمہوریت برقرار رہ سکتی ہے تو صرف اس وقت جبکہ (اخلاقی) اقدار کی قدر و قیمت کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔ صرف اس وقت جبکہ منصوبے سے زیادہ انسان پر توجہ کی جائے اور صرف اس وقت جبکہ ہم صحیح معنی میں اور واقعی طور پر خدا کی طرف پلٹ آئیں۔

(السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا ۲ر جنوری ۱۹۶۳ء سے ترجمہ۔ بشکریہ زندگی رامپور)

معذرت ۔ الفرقان کی اس اشاعت میں رمضان المبارک کی وجہ سے کچھ تاخیر کا تو اندازہ تھا جس کا اظہار گزشتہ اشاعت میں کر دیا گیا تھا، مگر افسوس ہو کہ اس اندازہ سے بہت زیادہ تاخیر ہو گئی اور رسالہ کے صفحات بھی معمول سے کم رہ گئے۔ جون کا پرچہ انشاء اللہ صحیح وقت پر شائع ہوگا اور اس میں صفحات کی کمی بھی پوری کر دی جائے گی۔ ——— ناظم الفرقان

تعارف و تبصرہ

		قیمت	شائع کردہ
(۱)	سکھ مسلم اتحاد کا گلدستہ	نامعلوم	ناظر دعوت و تبلیغ سلسلہ احمدیہ قادیان
(۲)	تبلیغ اسلام زمین کے کناروں تک	"	
(۳)	حقیقی اسلام	"	

یہ تینوں رسالے ہندوستان کی قادیانی جماعت کے شائع کردہ ہیں۔

نمبر۱ ۱۶۸ صفحات پر ہے اس میں سکھوں اور مسلمانوں کی منافرت انگیز تاریخ کی تردید کرتے ہوئے ان واقعات و بیانات کو جمع کیا گیا ہے جن سے سکھوں اور مسلمانوں کے اچھے تعلقات اور ایک دوسرے کے متعلق اچھے خیالات ثابت ہوتے ہیں۔ سکھوں اور مسلمانوں کے تعلقات کی خرابی میں انگریزوں کی تراشیدہ تواریخ کا بڑا دخل ہے اور بڑی ضرورت ہے کہ انگریزی دور کے اس منافرت انگیز پروپگنڈہ کی قلعی کھولی جائے۔

نمبر۲ ۸۰ صفحات پر ہے اور اس میں قادیانی حضرات کی ان تبلیغی کارگزاریوں کا تعارف کرایا گیا ہے جو وہ دنیا بھر میں انجام دے رہے ہیں۔ ہمیں ان کارگزاریوں کے مطالعہ سے بڑی خوشی ہوتی اگر یہ صرف "تبلیغ اسلام" کی راہ میں ہوتیں۔ مگر افسوس کہ یہ کارگزاریاں خالص اسلام کے بجائے "قادیانیت آمیز اسلام" کی راہ میں ہو رہی ہیں اور لوگوں کو ایک گمراہی سے نکال کر دوسری گمراہی میں ڈالا جا رہا ہے۔

لوگ اس کی داد دیتے ہیں کہ یہ فرقہ اپنے بعض عقائد میں غلطی ہی پر سہی مگر غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ کا بیڑا تو تنہا یہی اٹھائے ہوئے ہے لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ اگر اس کو اسلام ہی کا ایسا درد ہے تو خود مسلمانوں میں اس کی دلچسپی اپنے مخصوص عقائد ہی کی تبلیغ تک کیوں محدود ہے؟ جبکہ مسلمانوں میں اصل دین کی تبلیغ و ترغیب کی بھی شدید ضرورت ہے! ہمیں تو یہ سوال یہ

سمجھنے پر مجبور کرتا ہے کہ جس طرح مسلمانوں میں ساری تگ و دو کا مدعا صرف حلقۂ ثانیہ یا بیت کی توسیع اور جمہور امت کے مقابلہ میں فرقہ وارانہ قوت کا اضافہ ہے اسی طرح غیر مسلموں میں بھی تبلیغ اسلام کا مدعا اور کچھ نہیں ہے۔

نمبر ۳ اس ۱۰۴ صفحوں کے رسالہ میں اوّل نو اسلام کے متعلق علیہ عقائد و اعمال بیان کئے گئے ہیں بعدہٗ قادیانی جماعت کے مخصوص عقاید کی شرح کی گئی ہے۔ گویا اسلام "حقیقی اسلام" اسوقت بنا جب اس میں مرزا غلام احمد صاحب کے تعلیم فرمودہ عقائد کی قلم لگ گئی۔ اسلام کے نام پر غیر اسلام کی دوکان چمکانے کی کیسی افسوسناک کوشش ہے! ہمیں حیرت ہے ان لوگوں کی عقلوں پر جو رسالت محمدی کا ذائقہ چکھ کر بھی ایک ایسے شخص پر ایمان لانے کو تیار ہو گئے اور اس کے داعی بنگئے جس کے ارشادات کا نمونہ خود اس کتاب میں یہ ہے۔

"میں اپنے ہزار ہا بیعت کنندوں میں اسقدر تبدیلی دیکھتا ہوں کہ موسیٰ نبی کے پیروؤں سے جو ان کی زندگی میں ان پر ایمان لائے تھے ہزار ہا درجہ ان کو بہتر خیال کرتا ہوں" ص ۹۳

مرزا صاحب نے اپنے دعوئے نبوت کے سلسلہ میں تاویلات کی جو عجیب عجیب قلابازیاں کھائی ہیں ان سب کو ہضم کر لینے والی عقلیت، پتہ نہیں ان حضرات نے کہاں سے پائی ہے! ایک طرف کہا جاتا ہے کہ مرزا صاحب کے "الہامات" میں اگرچہ شروع ہی سے نبی و رسول وغیرہ کے الفاظ آپ کے متعلق آرہے تھے مگر آپ پر یہ بات واضح نہیں ہوئی تھی کہ مجھے بھی یہ رتبہ بلند مل سکتا ہے اس لئے آپ یہ تاویل فرمایا کرتے تھے کہ یہ الفاظ محض جزوی مشابہت رکھتے ہیں۔ اور اس کیلئے مرزا صاحب ہی کی ایک عبارت سے سند لی جاتی ہے۔ دوسری طرف مرزا صاحب کا یہ ارشاد بھی اس کتاب میں اسی صفحہ پر ملتا ہے کہ

"جس جس جگہ میں نے نبوت یا رسالت سے انکار کیا ہے صرف ان معنوں میں کیا ہے کہ میں مستقل طور پر کوئی شریعت لانے والا نہیں ہوں الخ" ص ۴۵

یہ کیا چیستاں ہے؟ ایک طرف تو آپ کو اپنی نبوت کا گمان بھی نہیں تھا۔ دوسری طرف یہ کہ مجھے اپنی نبوت سے مطلقاً انکار بھی نہیں تھا کیا خوب مضحکہ ہے! نبوت کی تاریخ میں کبھی یہ

ہو ابھی کیوں پیش آئے ہوگی؛ یہ تو تثلیث ہی کے لوازم ہیں۔

نزول عیسیٰ علیہ السلام

از حضرت مولانا سید بدر عالم صاحب مؤلف ترجمان السنۃ
ناشر۔ حاجی مولوی غلام محمد نورگت صاحب مالک نور پریس صوفی باغ متصل اسٹیشن سورت (گجرات) قیمت نامعلوم۔

مرزا صاحب قادیانی نے نزول عیسیٰ علیہ السلام ہی کی خبروں پر اپنی نبوت کا تخت بچھایا تھا، یں طور کہ نزول کی جو خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے وہ تو قطعی ہے۔ مگر اس میں عیسیٰ ابن مریم سے مراد مثیل عیسیٰ ہے۔ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول مراد نہیں ہے اس دعویٰ کی قبولیت کے لئے مرزا صاحب کو اور بہت سے جتن کرنے پڑے مثلاً یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے نہیں گئے تھے جیسا کہ سلف سے خلف تک اہل اسلام کا عقیدہ ہے بلکہ انھوں نے اسی زمین پر وفات پائی، اسی سلسلہ میں مرزا صاحب نے ایک داستان اختراع کی کہ حضرت مسیح علیہ السلام اپنے ملک سے ہجرت کر کے کشمیر پہونچے اور وہیں انکی وفات ہوئی اور ان سب مخترعات کی مدد سے نزول عیسیٰ علیہ السلام کا راستہ بند کر کے اپنی نبوت کا راستہ ہموار کر لیا۔

حضرت مولانا بدر عالم صاحب نے ترجمان السنۃ جلد سوم میں ....
... اس مسئلہ پر جمہور امت کے عقائد کے مطابق نہ صرف تشفی بخش بلکہ بے نظیر کلام کیا ہے اور جیسا کہ اس کتاب میں ان کا طریقہ ہے ایک مستقل مقالہ اس بحث پر رقم فرمایا ہے۔ اس مقالہ کو مولوی غلام محمد صاحب (سعادت) نے علیحدہ کتاب کی شکل میں شائع کر دیا ہے جو اسوقت زیر تبصرہ ہے اللہ تعالیٰ مصنف اور ناشر دونوں کو جزائے خیر دے کہ ایک نے اپنے قلم سے قادیانی علم کلام کے ایک بنیادی حصہ کا تار و پود بکھیر دیا ہے اور دوسرے نے اپنے مال سے اس کی وسیع تر اشاعت کا انتظام کر دیا ہم اپنی سعادت سمجھتے ہیں کہ اس مقالہ کی اشاعت میں حصہ دار بنیں اور اس کی آسان تر صورت یہی ہے کہ اس کی کچھ جھلکیاں الفرقان کے صفحات میں پیش کر دیں تاکہ ناظرین کو اس کی قدر و قیمت کا پورا اندازہ ہو سکے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ مقالہ کی افتتاحیہ سطریں ہی پڑھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے مسئلہ اپنی آخری حد تک صاف ہو گیا آپ بھی یہی سطریں سب سے پہلے پڑھیئے اور اندازہ کیجئے کہ چند ہی لفظوں میں مسئلہ کس حد تک پانی ہو گیا ہے۔

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ میں ان کے آسمان پر تشریف لے جانے اور آسمان سے اترنے کی سرگزشت بیشک ایک عجیب و غریب واقعہ ہے لیکن اس پر غور کرنے سے پہلے یہ سوال ضرور سامنے رکھنا چاہیئے کہ یہ مسئلہ کس دور اور کس شخصیت سے متعلق ہے کیونکہ روزمرہ کے معمولی سے معمولی واقعات میں بھی زمانہ اور شخصیتوں کے اختلاف سے ان کی تصدیق و تکذیب کرنے میں بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔"

غور کیجئے! کیا مسئلہ کی ساری الجھن یہی نہیں ہے کہ ہم مسیحؑ کی شخصیت کو ایک عام انسانی شخصیت سمجھ کر اور اس کے نزول کے واقعہ کو اپنی اس دنیا کے ایک عام دور میں رکھ کر سوچنا شروع کرتے ہیں اور پھر اس کو اس دنیا کے ممکنات کے چوکھٹے میں فٹ کرنے سے عاجز آکر انکار یا تاویل یا دامن بچا کر نکل جانے کی راہ پر پڑ جاتے ہیں قلم چوم لیجئے مولانا کا ایک ذرا سا سوالیہ اشارہ دیکر کس طرح مسئلہ کی ساری الجھن دور کر دی مولانا نے پوری تفصیل سے اس اشارہ کی وضاحت کی ہے کہ مسیحؑ کی شخصیت میں عام انسانوں سے اور ان کے زمانۂ نزول میں ہماری اس دنیا کے عام زمانوں سے کیا فرق و اختلاف ہے مگر ہمیں یقین ہے کہ بہت سوں کے لئے صرف یہ اشارہ ہی کافی ہوگا اور جن کے لئے صرف یہ اشارہ کافی نہ ہوگا ان کے لئے تفصیل کے یہ چند ٹکڑے ضرور ایک حد تک کافی ہو جائیں گے

نمبر ۱۔ جب آپ ان دو سوالوں پر محققانہ نظر ڈالیں گے تو پوری وضاحت سے ثابت ہوگا کہ یہ واقعہ (واقعہ نزول مسیحؑ) تخریبِ عالم یعنی قیامت کے واقعات کی ایک کڑی ہے۔ اور تخریبِ عالم کا ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جو عالم کے تعمیری دور (یعنی تخلیق و تخریب کے درمیانی دور ۔ع) کے واقعات سے ملتا جلتا ہو" صلا

نمبر ۲۔ اس کے بعد جب آپ اس پر غور کریں گے کہ یہ پیشگوئی ہے کس شخصیت سے متعلق وہ شخصیت کسی عام بشری سنت کے تحت کوئی بشر ہے یا ان سے کچھ الگ؟ تو آپ کو یہی ثابت ہوگا کہ وہ صرف عام انسانوں ہی سے نہیں بلکہ انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں بھی سب سے ممتاز خلقت کا بشر ہے۔ جتنے انسان ہیں وہ سب مذکر و مونث کی دو صنفوں سے پیدا ہوئے ہیں، مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام" الخ صث

نمبر ۳۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک انسان کا آسمانوں پر زندہ جانا اور زندہ رہنا اور

آخر زمانہ میں پھر اسی جسم عنصری کے ساتھ اتر آنا نہ عام انسانوں کی سنت ہے اور نہ دنیا (ع) کے عام واقعات کے موافق ہے لیکن اگر آپ یہ دو باتیں ملحوظ رکھیں کہ یہ مسئلہ تخریب عالم کا ایک مقدمہ ہے اور یہ بھی اس شخصیت کے متعلق جس کے دیگر حالات زندگی بھی عالم کے عام دستور کے موافق نہیں ہیں تو پھر بنظر انصاف اس میں آپ کو کوئی تردد نہیں ہونا چاہیئے " صلا

اس سلسلہ تفصیل میں ایک مقام کے یہ جملے کیسے آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔

پس چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا مسئلہ بھی عالم کے درمیانی واقعات کا مسئلہ نہیں بلکہ تخریب عالم کے واقعات کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس لئے اپنی جگہ وہ بھی معقول ہے ظاہر ہے کہ جب تمام مردوں کے زندہ ہو ہو کر ایک میدان میں جمع ہونے کا زمانہ قریب آرہا ہو تو اس سے ذرا قبل صرف ایک زندہ انسان کا آسمانوں سے زمین پر آنا کونسی بڑی بات ہے بلکہ اس طویل گمشدگی کے بعد یہ جسمانی نزول مجموعہ عالم انسانی کی جسمانی نشاۃ ثانیہ کے لئے ایک بدیہی اور محکم برہان ہے اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں ارشاد ہوا وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی ایک محکم نشانی ہیں صلا

مرزا صاحب قادیانی نے نزول مسیح سے انکار کرنے کے لئے رفع مسیح سے انکار کیا اور اسکی جگہ آپ کی موت کا دعویٰ کیا اور اس کے لئے وادی کشمیر میں ایک قبر تک گڑھ ڈالی مولانا بلا نام لیئے روئے سخن اس طرف کر کے فرماتے ہیں۔

یہ بات کتنی عجیب ہے کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام خود نبی اولوالعزم ہیں ان کی امت بھی تسلسل کے ساتھ کسی انقطاع کے بغیر اب تک چلی آرہی ہے پھر ان کی موت اور ان کی قبر کا صحیح صحیح حال آج تک ان سب پر کیسے مخفی رہ گیا[۱] .... اس سے زیادہ حیرت اس پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لاکر ان کے حق میں کبھی موت کا ایک حرف نہیں فرمایا درآنحالیکہ یہ مسائل آپ کی آنکھوں کے سامنے چل رہے تھے ....

اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے تردید الوہیت کے موقع پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معمولی سے معمولی حالات کا تذکرہ فرمایا مثلاً ان کا کھانا کھانا۔ کانا

[۱] خصوصاً جبکہ انکی موجودہ امت کے ذوق تجسس نے سفینہ نوح تک کے نشانات پالئے تھے اور فرعون کی لاش تک دستیاب کرلی

یا کلان الطعام مگر ان کی الوہیت کے خلاف جو سب سے بڑا لفظ تو موت تھا یعنی یہ کہ وہ مرچکے ہیں اس کو ایک جگہ بھی عیسائیوں کے مقابلہ میں ذکر نہیں فرمایا" ص ۱۹-۲۰

غرض مسئلہ پر جس جس پہلو سے بحث کیجاتی ہے تقریباً ہر ہی پہلو کے ضمن میں مولانا نے ایسے نکات وسوالات اٹھا کر فکر و نظر کے سامنے کر دیئے ہیں جو کسی غیر حقیقت پسندانہ بات کو دراندازی کا موقع نہیں دیتے گویا مسئلہ کے ہر موڑ پر ایک قندیل روشن ہے جو کسی مغالطے کا چراغ نہیں جلنے دیتی ہاں یہ بات جان لینے کی ہے کہ مسئلہ کے بعض پہلوؤں پر مولانا موصوف کی بحث اجمال اور اختصار پسندی کی وجہ سے ذرا اونچی اور عام اذہان کی گرفت سے باہر ہو گئی ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ کسی کو کسی موقع پر عدم تشفی کا احساس ہو۔

ہم نہیں جانتے کہ ناشر کتاب اس کوچہ میں تو وارد ہیں یا اس کے آداب ورسوم سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں اگر پہلی صورت ہے تب تو شکایت کی بات نہیں ورنہ ہم ان کے جذبۂ دینی کی قدر کے ساتھ اس کوتاہی کو قابل گرفت سمجھتے ہیں کہ کتاب میں مقدمہ و پیش لفظ کے نام سے چار سطریں تک نہیں حتیٰ کہ اتنا سا تعارف بھی نہیں کہ یہ مقالہ فلاں کتاب کا ایک حصہ ہے حالانکہ متعدد جگہ ترجمان السنۃ کے دوسرے مباحث کے حوالوں کی موجودگی میں یہ ایک لازمی چیز تھی ایک ناواقف ناظر پڑھے گا۔ اور پریشان ہو گا کہ (مثلاً) یہ معجزات کی بحث کہاں ہے۔

ایک ایسے وقیع مقالہ کے ساتھ یہ سلوک انتہائی ناروا ہے اور اگر دہلی میں اسکی کتابت و طباعت ندوۃ المصنفین کے زیر اہتمام ہوئی ہے تب تو خصوصیت کے ساتھ یہ فروگزاشت ایک افسوس ناک تساہل کا حکم رکھتی ہے۔

تصحیح کا بھی کوئی خاص اہتمام نہیں کیا گیا معلوم ہوتا ہے جو اغلاط ترجمان السنۃ میں رہ گئی تھیں وہ شاید اس میں بعینہٖ ہیں مثال کے طور پر ملاحظہ ہو صفحہ ۶ س ۱۰ و ۱۱ یہ محولہ جملہ جس طرح ترجمان السنۃ میں مہمل چھپا ہے ٹھیک اسی طرح اس میں موجود ہے۔

آخر میں ہم حضرت مصنف مدظلہ کی خدمت میں گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اس پر نظر ثانی فرما کر عام اذہان کی رعایت سے کچھ تسہیل فرما دیں اور جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں بس ضرورت بعض مقامات پر کچھ تفصیل کی ہے۔ مثلاً بعض مقامات پر مصنف بعض قرآنی آیات وبیانات کی طرف اشارہ

کر جاتے ہیں الفاظ ذکر نہیں کرتے اِس سے بات کی وضاحت میں خلل پڑتا ہے۔

تحریک اسلامی میں کارکنوں کے باہمی تعلقات

از خرم جاہ مراد صاحب۔ ناشر: مکتبہ چراغ راہ۔ کراچی کتابت طباعت اور کاغذ بہتر۔ قیمت ۸۰/ صفحات ۱۳۶

کتاب چھوٹی سی ہے مگر بڑی قیمتی۔ ایسی کہ ہر مسلمان گھرانے میں اسکے پہنچنے کی سفارش کیجائے۔ مسلمانوں کی باہمی زندگی اخوت کی آئینہ دار ہونی چاہیئے۔ "انما المومنون اخوۃ" (قرآن) کا یہی تقاضہ ہے۔ اس عظیم تقاضہ کو مسلمان کیسے پورا کریں؟ اس کے لئے خود قرآن نے بھی بہت سی باتیں بتائی ہیں اور جو زبان رسالت کے لئے چھوڑ دیں وہ رسول پاک نے ایک ایک کر کے اس طرح بتائیں کہ شاید اخوت کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی ادا بھی چھوٹنے نہیں پائی یہانتک کہ آپ مسجد میں ایک مجلس میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک آدمی آیا تو آپ نے اس کے لئے جسم مبارک کو حرکت دی (جیسا کہ شائستہ اور خلیق لوگوں کا آنے والے کے اکرام اور استقبال میں آج بھی دستور ہے) اس پر آنے والے نے عرض کی کہ حضور جگہ کافی ہے ارشاد ہوا۔ ان للمسلم لحقا اذا راٰہ اخوہ ان یتزحزح لہ (بیہقی) مسلمان کا حق ہے کہ جب اس کا بھائی اسے دیکھے تو اپنے جسم کو ذرا اک جنبش دے۔

تو یہ تھیں حضورؐ کی تعلیم اخوت کی وسعتیں مگر آج ان تکمیلی اداؤں کو تو چھوڑ دیجیے حقوق واجبہ تک فراموش ہو چکے ہیں اور حق یہ ہے کہ ہماری زندگی کی الجھنوں اور پریشانیوں میں اس صورت حال کا بڑا بھاری دخل ہے ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب اس صورت حال کی درستی میں بڑی مدد دے سکتی ہے کیونکہ اس میں اسلامی اخوت کی ساری تعلیم بڑے حسن و خوبی کے ساتھ جمع کر دی گئی ہے۔ یہ کتاب کا ایک رُخ ہے۔

دوسرا رُخ یہ ہے کہ اس کے ابتدائی حصہ سے یہ خطرناک ذہن غذا پا سکتا ہے کہ اخوت کے جو حقوق خدا اور رسول نے تعلیم فرمائے ہیں اور جس باہمی اندازِ تعلق کی ہدایت کی گئی ہے اسکو لمحوظ کرنے کی فکر بس کسی اسلامی تحریک سے وابستہ افراد کے حق میں ہونی چاہیئے۔ حالانکہ یہ حقوق وہ ہیں جنکی اہمیت ہر مسلم کے حق میں یکساں ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ایک اسلامی تحریک کے کارکنوں کے باہمی تعلقات ٹھیک اسی اندازہ پر ہونے

چاہئیں جس کی تعلیم خدا اور رسول نے اہل اسلام کو دی ہے مگر اس کی تلقین کے لئے یہ انداز کہ ـــــ

اسلامی تحریک کے کارکنوں کے باہمی تعلقات کو قرآن اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ . . . .

" انما المومنون اخوۃ "

نادانستہ طور پر ہی سہی اسلامی تحریک کے کارکنوں میں ایک نہایت غلط اور تباہ کن ذہنیت کو دعوت دیتا ہے۔ ان کا مطلب انھیں یہ بتاتا ہے کہ "مومنون" کا مطلب ہے "اسلامی تحریک میں کام کرنے والے ساتھی"۔ یا یہ مومنون وہی ہیں جو کسی اسلامی تحریک سے وابستہ ہوں اور انھیں سے ساتھ اخوت کا تعلق برتنے کی ہدایت قرآن نے دی ہے۔

ہم گمان کر سکتے تھے کہ "اسلامی تحریک" سے مراد اسلام ہے کیونکہ مصنف جس حلقہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ اسلام کو "اسلامی تحریک" سے بھی تعبیر کرتا ہے اور اس تاویل کے بعد ہم "کارکنوں" کے لفظ کی بھی کوئی ایسی تاویل کر لیتے جس میں عام مسلمانوں کی شمولیت کی بھی گنجائش نکل آتی مگر اس عبارت کا سیاق اور سباق ان تاویلات سے قطعاً مانع ہے۔

ہم مصنف پر کوئی فرد جرم نہیں عائد کرنا چاہتے ہیں ہمارا مدعا صرف اس امر پر تنبیہ کرنا ہے کہ اسلامی تحریکات کے کارکنوں کو اسلامی اخوت کی تلقین کا یہ انداز نہیں ہونا چاہیئے۔ جو مصنف نے اختیار کیا ہے اس کے لئے صحیح انداز یہ ہے کہ ان کے سامنے یہ حقیقت پیش کرکے کہ اسلام کو مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی کیا نوعیت مطلوب ہے انھیں متوجہ کیا جائے کہ جب ہر مسلمان کے ساتھ تعلق کا یہ انداز اسلام کو مطلوب ہے تو جو لوگ ایک جماعت بنکر اسلام کی خدمت کر رہے ہوں ان کے آپس کے تعلقات تو بدرجۂ اولیٰ اسی انداز پر استوار ہونے چاہئیں۔ ہمارے خیال میں مصنف کا مقصود بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے "اسلام" اور "اسلامی تحریک" کے خلط ملط نے خواہ مخواہ ان کی نہایت قابل قدر کتاب کا ایک رخ خراب کر دیا۔

	صفحات	قیمت	ناشر
۱۔ تاجدار مدینہ	۱۱۲	۱۲/	ادارہ مدرسہ نور محمدیہ قصبہ جھنجھانہ (ضلع مظفرنگر)
۲۔ حضرت عمرؓ	۶۴	۸/	〃
۳۔ سیرت بلالؓ	۱۳۸	۱/۴	〃

تینوں کتابیں جناب نسیم احمد صاحب علوی جھنجھانوی کی تالیف کردہ ہیں خاص طور سے بچوں کیلئے لکھی گئی ہیں جن میں بالترتیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپکے خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ اور محبوب صحابی حضرت بلالؓ کی پاک سیرت بیان کیگئی ہے انداز بیان سادہ اور موثر ہے واقعات اور روایات کے بارے میں اندازہ یہی ہے کہ مستند

ہیں۔ تینوں کتابوں کی کتابت جلی اور طباعت صاف ہے۔ امید ہے کہ بچوں کی دینی تربیت اور مذہبی واقفیت کے لیے علوی صاحب کی ان تالیفات سے فائدہ اٹھایا جائےگا۔

۱۔ تاریخِ قرآن } از، مولانا عبد القیوم صاحب ندوی۔ ۲۷۱ صفحات کاغذ رف مجلد -/۲

۲۔ سومنات } " " " صفحات ۱۴۴، کاغذ رف۔ مجلد ۱/۸

۳۔ امامتِ عظمیٰ } از سید رشید رضا مصری مرحوم " ۲۰۰ " چکنا معمولی " ۲/۱۰

۴۔ رحمتِ دوعالمؐ } از حکیم قاری احمد صاحب پیلی بھیتی " ۱۷۵ " رف " -/۲

۵۔ شہادتِ حسینؓ } از مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی " ۱۳۶ " " " ۱/۸

. . . .

ناشر:۔ محمد سعید اینڈ سنز۔ مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی ۱

۱۔ یہ کتاب جو اپنے نام سے کوئی خاص مناسبت نہیں رکھتی قرآن سے متعلق بہت سے معلومات و مسائل کا ایک کشکول ہے۔ یہ خاص طور سے اسکے پہلے حصہ کی نوعیت ہے۔ دوسرا حصہ اوامر و نواہی سے تعلق رکھنے والی بعض قرآنی آیات کے ترجمہ پر مشتمل ہے۔ کتاب فی الجملہ مفید ضرور ہے۔ مگر اسے پڑھ وہی لوگ سکیں گے جن کے پڑھنے کے لیے کتاب میں ربط و ترتیب شرط نہ ہو۔

۲۔ خواتین اسلام کو مجموعی طور پر کن اوصاف کا حامل ہونا چاہیئے۔ اس کے نمونہ کے طور پر اس کتاب میں ایک طرف حضرت سارہؓ سے لے کر شہزادی گیتی آرا بیگم (آٹھویں صدی ہجری) تک نام بنام بہت سی مثالی خواتینِ اسلام کے حالات زندگی کہیں اختصار اور کہیں تفصیل کے ساتھ درج کردیے گئے ہیں۔ ان خواتین میں اول و آخر کے علاوہ آنحضرت کی ازواج مطہرات، بنات طیبات اور بعض صحابیات وغیرہ شامل ہیں۔ آخر میں مغرب زدہ ترکی کی خواتین کی کچھ جھلک بھی بعض حیثیات سے عبرت اندوز ہونے کے لیے دکھادی گئی ہے۔

۳۔ یہ سید رشید رضا مصری مرحوم کی کتاب "الخلافۃ والامامۃ العظمیٰ" کا اردو ترجمہ ہے۔

مترجم مولانا ابوالفتح عزیزی صاحب ہیں۔ ترجمہ کو زیادہ کامیاب تو نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم قابل استفادہ ہے۔
کتاب کا مقصد اسلامی دنیا کو نظامِ خلافت قائم کرنے کی دعوت دینا ہے۔ شروع کے سو صفحات میں صحیح اسلامی نظامِ خلافت کا تعارف کرایا گیا ہے اس میں خلافت سے متعلقہ تمام ضروری مباحث آ گئے ہیں۔ پھر احیاءِ خلافت کے لیے بعض بنیادی کوششوں کی طرف اشارات کیے گئے ہیں۔ اور اس راہ کے بعض اہم موانع کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مغرب زدہ مسلمانوں کے پھیلائے ہوئے وساوس کی تردید اور اسلامی خلافت سے غیر مسلموں کے خدشات کے ازالہ کی طرف بھی فاضل مصنف نے توجہ کی ہے۔ اسی طرح بعض اور بھی مفید اور ضروری عنوانات ہیں، جن پر فاضل مصنف نے روشنی ڈالی ہے۔
ترجمہ کی خاص کمزوری یہ ہے کہ بہت سی جگہ مضامین و مباحث کا ربط و تسلسل کھو گیا ہے، اور کہیں بات نامکمل سی رہ گئی ہے۔

۴۔ رسول اکرمؐ کا ذکر عبادت، اور انسان کی سعادت ہے وہ جو بھی کچھ حصہ آپ کی سیرت کی اشاعت میں لے سکے، مگر ایک پہلو یہ بھی ہے کہ سیرت کے موضوع پر جب کتابیں گنتی سے باہر ہو چکی ہیں، تو اچھا یہ ہے کہ آدمی کسی خاص ضرورت کو پورا کرنے کے لیے تو اس موضوع پر قلم اٹھائے، ورنہ محض حصولِ سعادت کے لئے اس مقدس موضوع کو ـــــ معاذ اللہ ـــــ "پامال" شمار کیے جانے کا ذریعہ نہ بنے۔ افسوس ہے کہ لوگوں کی نظر میں اس پہلو کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور اسی لیے اس موضوع پر روز ایک نئی کتاب آ جاتی ہے جس میں کوئی محنت نہیں ہوتی۔ زیر تبصرہ کتاب کو بھی ہم اسی قبیل سے پاتے ہیں۔ البتہ اس میں اتنی خصوصیت مؤلف نے ضرور پیدا کر دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی سو مختصر اقوال کو کتاب کا ایک حصہ بنا دیا ہے۔

۵۔ واقعہ کربلا پر بھی کتابوں اور کتابچوں کی شاید کمی نہیں ہے، مگر لکھنے والے کم و بیش ایک ہی لگے بندھے انداز میں لکھتے رہتے ہیں۔ اور پڑھنے والے پڑھتے رہتے ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی لگے بندھے انداز کی ہے۔ جس میں واقعہ شہادت سے اگر کوئی اچھا سبق لوگوں کو ملتا ہے تو ساتھ میں بہت سے فاسد خیالات بھی ان کے دل و دماغ میں جگہ پکڑتے ہیں، بلکہ

اس میں اہل سنت کی عام روش کے برعکس ایک غضب یہ بھی ہے کہ میر انیس وغیرہ کے مرثیے بھی موقع بموقع فٹ کر دیے گئے ہیں۔ مفتی صاحب کی یہ مذاق شناسی عوام قابل داد ہے

انسانوں میں ایک انسان پیغمبر | از ڈاکٹر محمد آصف صاحب قدوائی ایم، اے پی، ایچ ڈی ــــ ناشر:۔ لال باغ سیرت کمیٹی لکھنؤ (بلاقیمت)

لکھنؤ کی "لال باغ سیرت کمیٹی" کئی سال سے اپنے سالانہ جلسۂ سیرت کے موقع پر سیرت پر اردو انگریزی میں ڈاکٹر صاحب موصوف کے مقالات شائع کر رہی ہے۔ پیش نظر پمفلٹ اس سال کے موقع کا ہے ــــ ڈاکٹر صاحب کے مقالات الفرقان میں اکثر شائع ہوتے رہے ہیں، جن میں اکثریت سیرت ہی سے متعلق رہی ہے، اور خدا کے فضل سے عموماً پسند کیے گئے ہیں، امید ہے کہ اس کو بھی لوگ ایک مفید کوشش پائیں گے۔

سیرت کمیٹی لال باغ سے یہ پمفلٹ مفت طلب کیا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید سے متعلق اردو کتب خانہ

تفسیر ابن کثیر (اردو)

حافظ عماد الدین بن کثیرؒ کی تفسیر جو عربی تفسیروں میں بھی بے نظیر اور مستند ترین تفسیر سمجھی جاتی ہے، اور جس میں یہ التزام ہو کہ آیات کی تفسیر پہلے دوسری آیتوں سے کرتے ہیں اسکے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے، پھر صحابۂ کرام اور تابعین اور بعد کے ائمۂ تفسیر کے ارشادات سے، یہ اس کا مکمل اردو ترجمہ ہو۔ پانچ ضخیم جلدیں ہیں۔ قیمت جلد مکمل سیٹ (۵۵ روپئے)

تفسیر بیان القرآن

(از حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ)

مکمل بارہ جلد، طبع ہندوستان - ۔۔ روپیہ

تفسیر ماجدی

مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کی اردو تفسیر قرآن کی چار جلدیں تاج کمپنی لاہور کی طرف سے چھپ چکی ہیں۔

قیمت جلد اول مجلد ۱۳
جلد دوم مجلد ۱۲
جلد سوم مجلد ۱۲
جلد چہارم ۱۲

قصص القرآن

(از مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی)

قرآن پاک میں انبیاء علیہم السلام کے سوانح حیات، ان کی امتوں اور مختلف قوموں اور شخصیتوں کے جو قصص و واقعات مذکور ہیں اس کتاب میں انھیں بڑی تفصیل اور تحقیق کے ساتھ پیش کیا گیا ہو۔

جلد اول۔ حضرت آدمؑ سے حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے حالات تک۔ ..... قیمت ۔۔

جلد دوم :- حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰؑ تک کے واقعات قیمت ۔۔

جلد سوم :- انبیاء علیہم السلام کے علاوہ باقی تمام قصص القرآن کا بیان قیمت ..... ۔۔

جلد چہارم :- حضرت عیسیٰؑ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور متعلقہ واقعات قیمت ۔۔ مکمل سٹ ۲۲

الحیوانات فی القرآن

(از مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی)

قرآن مجید میں جتنے حیوانات کا کہیں ذکر آیا ہے ان کے متعلق لغوی تحقیقات اور تاریخی و تفسیری مباحث کا ایک علمی مرقع قیمت ۔۔

قرآنی جغرافیہ۔ از مولانا موصوف قیمت ۔۔

لغات القرآن مکمل جلد

اُردو زبان میں قرآن شریف کے تمام الفاظ و لغات کی نہایت مفصل اور مبسوط تشریح کی گئی ہو اپنے موضوع میں بے نظیر اور محققانہ کتاب ہو قیمت جلد اول ۔۔ جلد دوم ۔۔ جلد سوم ۔۔ جلد چہارم ۔۔ جلد پنجم ۔۔ ، جلد ششم ۔۔

ترجمۂ قرآن کا مکمل سٹ

(از جناب مولانا محفوظ الرحمٰن نامی)

مفتاح القرآن، حصہ اول ۵
حصہ دوم ۶ سوم ۔۔، چہارم ۔۔
پنجم ۔۔

معلم القرآن ... ... ۔۔

مصباح اللغات

اردو میں عربی زبان کا سب سے زیادہ جامع اور مبسوط لغت۔

مجلد ۱۶

اردو عربی ڈکشنری مجلد ۶

قرآن اور تعمیر سیرت

از ڈاکٹر میر ولی الدین قیمت -/۵
مجلد ۶

قرآن اور تصوف۔ از ڈاکٹر میر ولی الدین قیمت -/۲، مجلد -/۲

اردو میں حدیث نبوی کا کتب خانہ

صحیح بخاری شریف (مکمل اردو)

سات ہزار سے زائد صحیح حدیثوں کا مجموعہ۔ یہ بخاری شریف کا مکمل اردو ترجمہ ہے، جو بہت اہتمام سے چھاپا گیا ہے، تین ضخیم جلدیں ہیں۔

قیمت کامل مجلد .. .. .. ۲۷/- روپیہ

جامع ترمذی شریف (اردو)

ترمذی شریف کو صحاح ستہ میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے، امام ترمذی نے اس کا التزام کیا ہے کہ ہر باب میں حدیثیں درج کرنے کے ساتھ وہ ائمہ امت کا مذہب بھی لکھتے ہیں ——— یہ اس کا مکمل اردو ترجمہ ہے۔ دو ضخیم جلدیں، قیمت مجلد ۱۸/- روپیہ

مشکوٰۃ شریف (اردو)

چھ ہزار سے زائد حدیثوں کا مجموعہ مشکوٰۃ شریف کو بجا طور پر حدیث کے کتب خانہ کا جامع انتخاب کہا جا سکتا ہے۔ اس میں حدیث کی گیارہ کتابوں، بخاری مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی، مؤطا، امام مالک، مسند شافعی، مسند احمد، بیہقی، و دارمی کی بیشتر حدیثیں آگئی ہیں، یہ اس کا مکمل ترجمہ ہے جو پورے اہتمام سے چھاپا گیا ہے، دو ضخیم جلدیں قیمت مجلد ۱۶/-

حصن حصین (مع ترجمہ اردو)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام وہ دعائیں جو حدیث کی کتابوں میں روایت کی گئی ہیں قیمت مجلد ۵/-

ترجمہ کتاب الصلوٰۃ از امام احمد بن حنبلؒ۔ مجلد ۱۲/-

ترجمہ شعب الایمان بیہقی ۸/-

ترجمان السنۃ

(از مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مدینہ طیبہ)

حدیث کی ایک نہایت مبسوط اور جامع کتاب اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ، ہر جلد بجائے خود بھی علوم و معارف کا ایک مستقل خزانہ ہے۔ قیمت جلد اول ۱۲/-، جلد دوم ۱۰/-، جلد سوم ۱۲/-

حدیث کا ایک اہم تاریخی مجموعہ

صحیفۂ ہمام بن منبہ

ہمام بن منبہ، مشہور صحابی حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد ہیں انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے سنی ہوئی حدیثوں کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کر لیا تھا اور یہ اسی سے روایت کیا کرتے تھے۔ حدیث کی کتابوں میں اس کا صرف تذکرہ ملتا تھا، ہمارے زمانہ کے مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے بڑی تلاش اور جستجو سے اس کا نسخہ کسی طرح حاصل کیا اور اپنے فاضلانہ مقدمہ اور ترجمہ و تشریحی نوٹوں کے ساتھ شائع کیا ہے، قدردانوں کیلئے بڑا قابل قدر تحفہ ہے۔ قیمت :- ۱/۸

زاد سفر

امام نوویؒ کی بہترین کتاب ریاض الصالحین کا ترجمہ محترمہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کے قلم سے (دو جلدوں میں۔ شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ قیمت ۲ جلد ۸/-

علم الحدیث۔ اپنے موضوع پر بہترین کتاب، نیز حدیث کے بارے میں پیدا کیے جانے والے شبہات کا جواب قیمت ۳/-

مختلف موضوعات پر منتخب کتابیں

تاریخ و سیرت

رحمت عالم از مولانا سید سلیمان ندویؒ ...... [illegible]

خطبات مدارس .... [illegible]

سلسلۂ تاریخ ملت

(شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی)

کامل سٹ ۱۱ جلد قیمت [illegible]

قرون وسطی کے مسلمانوں کی علمی خدمات

قیمت حصہ اول مجلد [illegible]

حصہ دوم مجلد [illegible]

تاریخ اسلام پر ایک نظر

اسلام کے مختلف دوروں اور خلافت و حکومت کے مختلف سلسلوں کی جامع و مختصر تاریخ [illegible]، مجلد [illegible]

مکتوبات شیخ الاسلامؒ

جلد اول، قیمت [illegible]، جلد دوم [illegible]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات و معاہدات

یعنی شاہان عالم، عرب کے حکمرانوں اور قبائلی سرداروں سے آپ کی سیاسی خط و کتابت اور معاہدات — از سید محبوب حسین صاحب دیوبندی۔ مجلد [illegible]

تاریخ مشائخ چشت (از پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی)۔ سلسلۂ چشتیہ کی نظامی شاخ کی چند اہم شخصیتوں کا مفصل اور محققانہ تذکرہ اور تصوف اور خاص کر چشتی سلسلہ کے متعلق نہایت اہم اصولی بحثیں۔ قیمت [illegible]

تاریخ دعوت و عزیمت

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

جلد اول۔ جس میں ساتویں صدی ہجری تک کے مجددین و مصلحین کا تذکرہ ہے قیمت [illegible]

جلد دوم:۔ جس میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ اور ان کے تلامذہ کا مستقل تذکرہ ہے...... قیمت ...... [illegible]

حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

(از پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی)

قیمت مجلد ...... [illegible]

سوانح قاسمی۔ مولانا گیلانی مرحوم کے قلم سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی مفصل سوانح حیات۔

قیمت جلد اول [illegible]، جلد دوم [illegible]، جلد سوم [illegible]

تاریخ دیوبند مجلد از سید محبوب رضوی [illegible]

اسلام کا نظام حکومت اس میں اسلام کی ریاست عامہ کا مکمل دستور اساسی اور مستند ضابطۂ حکومت پیش کیا گیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کا نظام حکومت دوسرے رائج الوقت نظاموں سے کس قدر بلند ہے۔ قیمت [illegible]، مجلد [illegible]

اسلام کا اقتصادی نظام مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی کی مشہور تالیف ہے۔ [illegible] مجلد [illegible]

اسلام کا [illegible] نظام۔ اپنے موضوع پر جامع اور اپنی نوعیت کی پہلی کتاب۔ قیمت [illegible]، مجلد [illegible]

اسلام کا نظام عصمت و عفت۔ اسلام میں پاکدامنی اور عصمت کی حفاظت کے جو اصول مقرر کیے گئے ہیں ان کی تفصیل اور ان کی حکمت اس کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔ قیمت [illegible]

اسلام کا نظام مساجد اسلام کے نظام میں مسجد کا کیا مقام ہے۔ اور اس سے کتنے اہم مقاصد وابستہ ہیں۔ اور اس کے بارہ میں اسلام کے احکام کیا ہیں۔ قیمت [illegible]

تذکرۂ مجدد الف ثانیؒ

مرتبہ ــــــ مولانا محمد منظور نعمانی

متوسط خوشنما کتابی سائز، ۳۰۰ سو صفحات، مجلد مع ڈسٹ کور، قیمت چار روپے -/۴

امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کو عام طور سے اس حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے کہ وہ تصوف کے ایک سلسلہ کے امام ہیں۔ حالانکہ انھوں نے خود تحریر فرمایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے مجھے صرف "تزکیہ و ارشاد" کے اس کام کیلئے نہیں پیدا کیا ہے، ہاں اللہ جسکو توفیق دے وہ یہ فیض بھی اس بندہ سے حاصل کرلے، ورنہ میرے وجود سے اللہ تعالیٰ کا خاص مقصد کچھ اور ہے۔ اور ایک کار عظیم مجھ سے وابستہ ہے"۔ اس مقصد اور "کار عظیم" کو ان کے مکتوبات کے دفتروں سے بھی سمجھا جاسکتا تھا اور پوری طرح سمجھا جاسکتا تھا لیکن کچھ خاص وجوہات سے عام طور پر سمجھا نہیں گیا، یہانتک کہ اب سے ۲۱ سال پہلے (۱۳۵۷ھ م ۱۹۳۸ء) میں حسب الفرقان کا مجدد الف ثانی نمبر شائع ہوا اور اسکے لکھنے والوں نے (خاص کر ہمارے مولانا گیلانی مرحوم نے) اس مسئلہ کو اپنا موضوع بنا کر اس مسئلہ پر روشنی ڈالی تو یہ حقیقت کھل کر سب کے سامنے آگئی کہ وہ کیا "کار عظیم" ہے جسکو آپ نے اپنے وجود کا مقصد قرار دیا ہے۔ اور آپ کا وہ کون سا امتیازی تجدیدی کارنامہ ہے جسکی وجہ سے آپ کو کسی ایک صدی کا نہیں بلکہ "الف ثانی" یعنی پورے دوسرے ہزارہ (از ۱۰۰۱ھ تا ۲۰۰۰ھ) کا مجدد امت نے مان لیا ہے ــــــ الفرقان کے اس نمبر کی اشاعت پر ۲۱ سال گزر چکے ہیں، اس عرصہ میں خاص کر اسلامی دنیا کے حالات میں بہت کچھ تبدیلیاں ہوئی ہیں، ان تبدیلیوں کو اور ان کے دینی تقاضوں کو دیکھ کر یہ یقین بڑھ جاتا ہے کہ واقعۃً امام ربانی حضرت سرہندی قدس سرہ "الف ثانی" کے مجدد ہیں اور ہمارے اس دور کے لیے بھی حضرت ممدوح کے تجدیدی کام میں پوری رہنمائی موجود ہے، خاص کر ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کے سامنے جو اہم دینی سوالات ہیں ان کے تو ایسے جوابات حضرت مجدد قدس سرہ کی تجدیدی و اصلاحی جدوجہد سے مل جاتے ہیں گویا کہ وہ ان ہی سوالات کو حل کر رہے ہیں اور یہاں کے اہل دین کو انکی مشکلات کا حل بتا رہے ہیں۔

الفرقان کے اس نمبر کے مقالات کو اب کتابی شکل میں نئی ترتیب دے کر شائع کیا گیا ہے۔

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے، اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے

لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، وہ اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اس کا عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السمٰوٰت والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرۃ توفنی مسلما والحقنی بالصالحین

ادارہ الفرقان

مسئول
محمد منظور نعمانی

مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

| جلد ۲۶ | بابت شوال ۷۸ھ مطابق مئی ۱۹۵۹ء | شمارہ ۱۰ |

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

گذشتہ اشاعت میں ہم نے لکھا تھا کہ اشتعال انگیزی اور بدتمیزی کے مقابلہ میں ضبط و تحمل کا مظاہرہ کر کے ہمیں فساد انگیزی کے اس سستے نسخے کو بے اثر کر دینا چاہیے۔ جو فرقہ پرست سورماؤں کے ہاتھ لگ گیا ہے جس سے ان کا مقصد تو پوری طرح حاصل ہو جاتا ہے مگر کوئی آنچ اور دھبّہ ان پر نہیں آنے پاتا۔

نیز ہم نے لکھا تھا کہ

"پھر اگر انھیں فساد انگیزی کرنا ہی ہو گی تو کھلے مفسدوں اور مجرموں کی پوزیشن میں سامنے آنا ہو گا اور پھر نہ حکومت ہی کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ کھلی مجرمانہ اور جارحانہ پوزیشن کو نظر انداز کر سکے۔ اور بالفرض کوئی حکومت یہاں تک جانا بھی چاہے تو غیر فرقہ پرست حزب مخالف کی موجودگی اسے یہاں تک جانے نہیں دے سکتی۔ یہ بات سو فیصدی یقینی ہے۔ اور ہمیں اس معاملے میں کسی تردد کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔"

بلا مبالغہ ان الفاظ کی روشنائی ابھی خشک نہیں ہونے پائی تھی۔ اور کم از کم یہ تو ہے ہی کہ ہمارے یہ الفاظ ابھی اشاعت نہیں پا سکے تھے، کہ واقعات نے ہمارے اس خیال کی پوری پوری تصدیق کر دی۔ الفرقان کا گذشتہ شمارہ ابھی کتابت کی منزل میں تھا کہ بہار کی سرزمین پر سیتا مڑھی کا فساد رونما ہوا جس میں بہار کے فرقہ پرستوں نے فساد اور مسلم کشی کے اس سستے نسخے کو استعمال کرنے کے بجائے کھلی مجرمانہ اور جارحانہ پوزیشن اختیار کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہار کی حکومت یو، پی اور مدھیہ پردیش گورنمنٹ کے نقش قدم پر نہیں چل سکی اور سری کرشن سنہا پر بے اعتنائی

اور پہلوتہی کی وہ راہ نہیں آسان ہو سکی جس پر کانجو اور سمپورنانند کو شروع سے آخر تک کوئی دقت پیش نہ آئی۔ یہاں لوگ چیختے رہے، چلّاتے رہے، انصاف کو آواز دیتے رہے مگر کسی کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ وہاں سری کرشن سنہا (وزیر اعلیٰ بہار) کو خبر پاتے ہی فساد زدہ علاقہ کا رُخ کرنا پڑا۔ اور پھر اسمبلی میں کہنا پڑا کہ

"سیتا مڑھی کا فساد ایک دیوانگی ہے جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔"

اُنھیں کہنا پڑا کہ

"میں فسادات کی روک تھام کے لیے فوج کے استعمال سے بھی گریز نہ کروں گا۔"

انھیں کہنا پڑا کہ

"ہم اس بات کا تہیّہ کیے ہوئے ہیں کہ اس قسم کے واقعات دُہرائے نہ جائیں۔"

اور صرف بہار کی حکومت ہی نہیں، پورے ملک کے ضمیر کو اس برہنہ فساد نے جھنجھوڑ دیا۔ یا کم از کم زبانوں کو تو حرکت دے ہی دی۔ جو مبارک پور اور بھوپال کے فسادوں پر بالکل گنگ رہیں۔

بہار پردیش کانگریس کمیٹی نے متفقہ طور پر قرارداد منظور کی جس میں اس فساد پر اظہار افسوس کیا گیا اور جن لوگوں پر اس فساد کا اثر پڑا ہے اُن سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے حکومت پر زور دیا گیا ہے کہ وہ ان لوگوں کی مدد کرے۔

نہرو جی جو مبارک پور اور بھوپال کے معاملے میں خاموش رہے انھوں نے بھی کہا ہے کہ یہ فرقہ وارانہ فساد جہالت و بربریت کے نمونے ہیں۔

اور مرکزی وزیر دفاع مسٹر کرشنا مینن کو بھی کہنا پڑا کہ بہار کے ان واقعات نے ہندوستان کی پوزیشن کو قدرے کمزور کر دیا ہے۔

پس اب ہم اور زیادہ یقین و اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ فسادات کی مصیبت سے نجات پانے کا واحد طریقہ مسلمانوں کے لیے یہ ہے کہ وہ ضبط و تحمل پر کمر باندھ کر فساد انگیزی کا صرف یہی ایک راستہ فرقہ پرستوں کے لیے باقی رہنے دیں جو انھوں نے سیتا مڑھی میں آزمایا ہو۔ ہمیں یقین ہو کہ اس خطرناک راستہ پر وہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتے۔ اس لیے کہ یہاں

حکومت خاموش تماشائی بن کر نہیں رہ سکتی۔

البتہ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ فسادات کی یہ راہ فرقہ پرستوں کے لیے اسی وقت کٹھن ہو سکتی ہو جبکہ ضبط و تحمل کا دامن ہمارے ہاتھ سے اس مجرمانہ قتل و غارت کے اثر سے بھی نہ چھوٹے!

یہاں "ضبط و تحمل" سے ہماری مراد یہ نہیں ہے، کہ ہم اپنے بچاؤ کی جدوجہد نہ کریں اپنی جان، اپنا مال اور اپنی عزت و آبرو خاموشی کے ساتھ لٹوا دیں؛ ہم ضرور اپنی مدافعت کریں۔ یہ نہ صرف ہمارا حق بلکہ فرض ہے۔ اور اس میں کوتاہی کسی طرح درست نہیں، "ضبط و تحمل" سے ہماری مراد یہاں بھی صرف وہی ہے کہ جس طرح رنگ پاشی وغیرہ اوچھی حرکتوں کے مقابلہ میں ہمیں مشتعل نہیں ہونا چاہیے اسی طرح اس مجرمانہ قتل و غارت کے نتیجہ میں بھی ہم میں اشتعال نہیں آنا چاہیے۔ مدافعت الگ چیز ہے اشتعال الگ چیز ہے۔ مدافعت ہمیں جس قوت سے کرنا چاہیے، اشتعال کو اسی قوت سے دبانا چاہیے۔ ورنہ ہم جیتی ہوئی بازی ہار جائیں گے، اور فرقہ پرستوں کی مشکل کو اپنے ہاتھوں آسان کر دیں گے۔

اشتعال سے ہماری کیا مراد ہے جس سے ہم اجتناب کا مشورہ دے رہے ہیں؟ یہ بات شاید ابھی واضح نہ ہوئی ہو! ——— اشتعال سے یہاں ہماری مراد یہ ہے کہ ہم مدافعت پر قناعت نہ کریں بلکہ انتقام کا جذبہ ہمارے اندر پیدا ہو جائے جس کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم حملہ آوروں سے انتقام لینے کی کوشش کریں۔ اور دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ جس فرقہ سے حملہ آوروں کا تعلق تھا اس کے جن افراد پر ہمارا بس چل جائے انھیں پر غصہ اتار دیں۔ یہ دونوں ہی صورتیں غلط ہیں ——— خصوصاً دوسری تو ہر لحاظ سے غلط ہے ——— اس لیے ہمیں دونوں ہی سے اجتناب کرنا چاہیے۔

ہر چند کہ فی زمانہ مسلمان خود ہی کسی انتقامی کارروائی سے اجتناب کرتے ہیں تاہم مسلمان انسان ہی ہیں، عام انسانی فطرت کی طرح ان میں بھی کسی وقت انتقامی لہر آ سکتی ہو خصوصاً جبکہ زیادتی اس درجہ کی ہو کہ ہندو "وزیر اعلیٰ" کا سر بھی ندامت سے جھک جائے اور ہندو "وزیر اعظم" کی زبان بھی اسے بربریت سے تعبیر کرے۔ اس لیے ضروری ہو کہ یہ بات بھی اُن سے

کھول کر کہہ دی جائے کہ اشتعال جس طرح فرقہ پرستوں کی اوچھی حرکتوں کے مقابلہ میں ان کے لیے مضر اور فرقہ پرستوں کے لیے مفید تھا، اسی طرح فرقہ پرستوں کی بہیمیت کے نتیجہ میں ان کا اشتعال خود ان کے لیے مضر اور فرقہ پرستوں کے لیے مفید ہے۔ کسی انتقامی اقدام سے وہ اپنے نقصانات تو واپس نہیں لا سکتے ہیں، البتہ اپنا مقدمہ کمزور کر سکتے ہیں۔ اور فرقہ پرست حکام اور ذمہ داران امن و امان کو موقع دے سکتے ہیں کہ وہ اصل واقعہ کو پس پشت ڈال دیں اور اپنے "انتظامی فرائض" کی ساری تان جوابی غلطی کرنے والوں پر توڑ دیں ــــــ یہ ہمارے کسی مشتعلانہ اقدام کا نقد نتیجہ ہوگا۔ جو بجائے خود بڑے دور رس نقصانات اپنے اندر رکھتا ہے۔ جن کی تفصیل ہم گذشتہ صحبت میں کر چکے ہیں۔

دوسرا نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو مسلم منافرت کی جو آگ ہندو فرقہ پرست لیڈر اپنے مقاصد کے لیے روشن رکھنا چاہتے ہیں ــــ جس کا نقصان یا ملک کی مجموعی فلاح و بہبود کو ہے، یا خاص کر مسلمانوں کو ــــ اور اسی غرض کے لیے فساد کراتے ہیں، ہمارا اس قسم کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا اقدام بھی اس آگ کو مزید ایندھن فراہم کرنے کا مترادف ہوگا۔ یہ ایسی کھلی ہوئی بات ہے کہ ذرا بھی تفصیل کی حاجت نہیں۔ یہ منافرت ہی منقسمہ ہندوستان میں آج ہماری تمام مشکلات و مسائل کی جڑ بنیاد ہے۔ فسادات اسی کے بل بوتے پر ہوتے ہیں۔ اردو کا مسئلہ حل ہونے میں اسی منافرت نے اڑچن ڈال رکھی ہے۔ دستور کے دیے ہوئے تمام حقوق و مواقع حاصل ہونے میں یہی بنیادی رکاوٹ ہے۔ غرض ہندوستان میں ہماری بہتر زندگی کی راہ مارنے میں سب سے زیادہ ہاتھ اسی کا ہے۔ تو ہم سے زیادہ ناعاقبت اندیش کون ہوگا اگر ہم غصہ میں آ کر اس منافرت کی بحالی کا سامان کرنے لگیں؟

ہمیں تو نہ صرف اپنی بہتر زندگی کے لیے بلکہ اپنے اس ملک میں اسلام کا مستقبل روشن کرنے کے لیے اس منافرت کا بیج مارنے کی جد و جہد کرنا ہے، ہم بحیثیت "مسلمان" "اسلام" کی مقدس امانت اپنے ساتھ لیے ہوئے ہیں جسے آدم کے ایک ایک بیٹے کو ہمیں پہونچانا ہے۔ اور یہ امانت ہم کیونکر ان تیس کروڑ ابنائے آدم کو پہونچا سکتے ہیں جن کے دل منافرت کے باعث ہماری طرف سے بند ہوں؟ امانت ہمیں پہونچانی ہے تو دلوں کے قفل بھی ہمیں کھولنے ہیں۔ اور یہ قفل جبھی کھل

سکتے ہیں جب فضا منافرت سے پاک ہو جائے۔

مسلمان "داعی الی اللہ" بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔ "اُخرِجَت لِلنَّاس" دنیا میں اس اُمت کے منصب کی صحیح تعبیر ہے (یعنی یہ اُمت ابنائے آدم کو اللہ کی طرف بلانے کے لیے پیدا کی گئی ہے) پس اس دعوت کی راہ ہموار کرنا بھی آپ سے آپ اسی کا فریضہ ہے۔ اور ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس دعوت کی راہ ہموار کرنے کی طرف پہلا قدم یہی ہو سکتا ہے کہ اس منافرت کو ختم کیا جائے۔ الغرض ہر حیثیت سے اس منافرت کے خلاف جد و جہد کرنے کی ضرورت ہے۔ پس کسی ایسے طرزِ عمل کا تو سوال ہی کیا جو اس منافرت کو غذا پہنچائے، ہمیں تو ان باتوں کا اہتمام کرنا ہے جو اس منافرت کی زندگی محال کر دیں!

اگر یہ صحیح ہے، اور مسلمانوں کو اس سے انکار نہیں ہے کہ بے شک ان کا دعوتی منصب اور ان کی ملکی پوزیشن اسی کی متقاضی ہے تو پھر انھیں عدم اشتعال اور ضبط و تحمل پر قناعت نہیں کرنی ہے۔ بلکہ ان باتوں کی بھی جستجو کرنی ہے جو اس منافرت کا قصہ ہی تمام کر دیں! ـــــ وہ باتیں کیا ہو سکتی ہیں؟ اور یہ طاقت کس چیز میں ہے کہ مدتوں کی جمی ہوئی نفرتوں اور بدگمانیوں کو کھرچ ڈالے؟ یقین مانئے کہ پوری اسلامی زندگی تو بڑی چیز ہے۔ اسلام کے صرف دو حکموں کی پابندی یہ عظیم کام کر کے دکھا سکتی ہے وہ دو حکم ہیں صدق اور عدل (دل و زبان کی سچائی اور انصاف پسندی) ایسی سچائی اور انصاف پسندی جس میں ہندو مسلمان کی تمیز نہ ہو۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ۔ (قرآن کریم)	دیکھو! تمھیں کسی قوم کی دشمنی جادۂ عدل سے نہ ہٹا دے۔ (ہر حال میں) انصاف کی کہو اور انصاف کرو کہ یہی قرین تقویٰ ہے۔

کیا اندازہ کر سکتے ہیں آپ اس طرزِ عمل کی تسخیری طاقت کا جس کی ہدایت قرآن کریم کر رہا ہے۔ اگر ہم اس حق گوئی اور انصاف پسندی کو اپنی زندگی کا شعار بنا لیں اور ہمارے ہمسایہ ہمارے طرزِ عمل میں برملا اس وصف کا مشاہدہ کریں تو کس فرقہ پرست ہندو لیڈر میں یہ طاقت ہے کہ وہ ہندو اکثریت کو ہم سے نفرت اور بدگمانی پر قائم رکھ سکے؟

قرآن کریم کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى	اگر ہم اس کتاب کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو
جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا	تم دیکھتے کہ وہ خشیت الٰہی سے لرزتا اور
مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۔	ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔

یقین جانئے کہ یہی قرآن جب کسی قوم کی زندگی میں جلوہ گر ہوتا ہے تو نفرت و عداوت کی بڑی بڑی مضبوط دیواریں اس کی تاب نہ لاکر یونہی ڈھیر ہو جاتی ہیں ــــــ ہم تو اس ملک کے رہنے والے ہیں۔ ان عرب مسلمانوں کی تاریخ پڑھیے جو ایک اجنبی کی حیثیت سے ہندوستان کے ساحلوں پر اُترے اور اپنے اسلامی اخلاق کی اسی طاقت سے اُس دور میں اِس ہندو قوم کی آنکھوں کے تارے بن گئے۔ جب یہ غیروں کے میل جول سے آشنا بھی نہیں تھی۔ جنوبی ہند میں موپلے انھیں عربوں کی یادگار ہیں۔ اور سننے میں آیا ہے کہ "موپلے" اسی علاقہ کی مقامی زبان کا لفظ تھا، جس سے مقامی لوگ انھیں پکارنے لگے اور اس لفظ کے معنی تھے "پیارے"۔

سچ یہ ہے کہ ہماری ساری مشکلات کا حل اسی قرآن ہی میں ہے جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے نازل ہوا تھا۔ اور ہم اسے کہیں باہر تلاش کرتے ہیں ــــــ فَيَا حَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْ جَنْبِ الْقُرْاٰنِ ۔

قندِ مکرّر

اَن دیکھی قوّت کا ایک پوشیدہ ذخیرہ

(از مولانا سیّد مناظر احسن گیلانیؒ)

[سنہ ۴۷ء کا خونیں دور سر سے گزر رہا تھا جب مولانا مرحوم نے اس عنوان سے ایک مضمون اپنے خاص رنگ میں الفرقان کے لیے رقم فرمایا تھا، یہ مضمون ذی قعدہ و ذی الحجہ سنہ ۶۶ھ کے مشترک شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ بدقسمتی سے حالات نے پھر سنہ ۴۷ء کی یاد دلادی ہے۔ پتہ نہیں مولانا اس دنیا میں موجود ہوتے تو اُن کے حسّاس دل پر کیا گزرتی، اور وہ کس انداز سے کسی پوشیدہ قوت کا کوئی نیا ذخیرہ مسلمانوں کے دلوں میں اُنڈیلنے کی کوشش کرتے۔ مگر آہ کہ اب وہ کہاں؟ ——— آئیے اب اُن کی اس پرانی تحریر ہی کو حالات کے اعادہ کے ساتھ دُہرا لیں۔

پورا مضمون تو نہیں البتہ اس کا بیشتر حصّہ یہاں درج کیا جا رہا ہے۔ بعض اشاروں کی توضیح سہولتِ فہم کی خاطر اس اشاعت میں اپنی طرف سے کر دی گئی ہے، ——— اُمید ہے کہ مضمون میں ذرا بھی پُرانا پن ناظرین کو محسوس نہ ہوگا۔ بلکہ "قندِ مکرّر" کی بات نظر آئے گی۔]

——— ادارہ

اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ بجائے بوجھنے کے دیکھنے اور صرف دیکھنے پر اگر بھروسہ کیا جائے تو تھوڑی دیر کے لیے عقل اس سطحی فیصلے پر ضرور آمادہ ہو جاتی ہے جس کی عامیانہ تعبیر "بھینس اُس کی لاٹھی" سے لوگ کرتے ہیں۔ "طاقت ہی حق ہے"۔ (یا Might is right) یہ فقرہ شاید اتنا ہی پرانا ہو جتنی پرانی انسانی نسل ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ آدم علیہ السلام کے سعادت مند صاحبزادے

ہابیل کو ان ہی کے کور بخت لڑکے قابیل (یا قائن) نے "لَاَقْتُلَنَّكَ" (میں تجھے مار ڈالوں گا) کی دھمکی دیتے ہوئے جو الفاظ استعمال کیے تھے، وہ کیا تھے، لیکن اس بڑے بول کی تہہ میں یقیناً "جس کی لاٹھی" کا مغالطہ چھپا ہوا تھا، کہ جسے اپنے ہاتھ میں پاکر ہر چلنے والی بھینس کو ہانک کرنے والوں نے اپنی بھینس باور کرلیا ہے —— پیغمبر اور پیغمبر کے ساتھیوں کی بے نوائی اور بے سر و سامانی کو دیکھ دیکھ کر سرمایہ دار جب بڑ بڑا رہے تھے۔ "اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ (آل عمران) "خدا تو فقیر ہے اور ہم تونگر یعنی سرمایہ دار ہیں"۔ تو دوسرے الفاظ میں وہ اسی فیصلے کا اعلان کر رہے تھے کہ بھینس ہماری ہو کر رہے گی۔ کیونکہ لاٹھی ہمارے ہاتھ میں ہے اور ان کے باپ دادوں نے اسی فیصلہ پر بھروسہ کرکے ان حرکات کا ارتکاب کیا تھا جن کا ذکر اسی کے بعد قرآن نے ان لفظوں میں کیا ہے یعنی۔

وَقَتْلَهُمُ الْاَنْبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ پیغمبروں کو بغیر کسی حق کے ان کا قتل کرنا۔

انھوں نے قوت ہی کا نام حق رکھ چھوڑا تھا، سمجھتے تھے کہ اس "حق" سے جو محروم ہو زندگی کے سارے حقوق سے بھی محروم ہو، بلکہ خیال کرتے تھے کہ زور والوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ زندگی کے حقوق سے ان بے زوروں کو محروم کر دیں۔ اسی نشہ کے متوالوں نے بسا اوقات جیسا کہ قرآن ہی نے نقل کیا ہے۔

مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ہم سے زور میں بڑا کون ہے؟

کا چیلنج ان غریبوں کو دیا ہے جو ان کے نزدیک حق کی اس دلیل سے مفلس تھے، خدا ہی جانتا ہے کہ دہرانے والوں نے حق کی اس پرانی دلیل کو قولاً و عملاً کہاں کہاں، کس کس زمانہ میں دہرایا ہے۔ چند ہی سال ہوئے جب یورپ کے بعض علاقوں سے اس کو دہراتے اور انھیں الفاظ کے ساتھ بڑبڑاتے ہوئے اٹھانے والوں نے سر اٹھایا[۵] تاؤ دیتے ہوئے اپنی مونچھوں پر اور خم ٹھونکتے ہوئے تاریخ کے چبوترے پر نمودار ہوئے، مگر فیصلہ کیا ہوا؟ انھیں چند سالوں میں وہ اونچے بھی ہوئے اور نیچے بھی بنے، خدا کی مخلوق دھوکہ میں بھی مبتلا ہوئی، مغالطوں کے لوگ شکار بھی ہوئے، جو کچھ وہ کہتے تھے دوسروں نے بھی وہی رٹنا شروع کیا۔ ان کی واقعیت پر اصرار کیا گیا جس کے وہ مدعی تھے، لیکن

---

[۵] غالباً اشارہ ہے ہٹلر اور اس کی قوم کی طرف۔ (الفرقان)

صدی دو صدی تو بڑی بات ہے، نصف صدی بھی نہیں، ثلث بھی نہیں، ربع بھی نہیں، ایک دہا بھی بارہ مہینوں کے چند مجموعوں کا ختم ہونے نہ پایا کہ پھر کوئی نہ تھا، نہ دعویٰ تھا، نہ دعویٰ کرنے والے تھے، ان کو کچھتانا پڑا جنھوں نے یقین کر لیا تھا کہ بخار کو بڑھانے میں "اس سمرہ" کے استعمال کو دخل ہے جو مریض کے سامنے خربزہ کے چھلکوں کی طرح اتفاقاً پڑا ہوا تھا ـــــ اگرچہ جھوٹ سچ سے پھر بھی جدا نہ ہوا تھا اور جھوٹ کی جب جھوٹ سے ٹکر ہو تو فیصلہ کی صورت ہی کیا تھی، تاہم اتنا تو پھر بھی ماننے والوں کو ماننا ہی پڑا کہ جس جس چیز کا نام قوت رکھا گیا تھا اور جن جن شکلوں میں، قالبوں میں یقین دلایا گیا تھا کہ ان میں طاقت بند کی ہوئی ہے، اترنے والے سب ہی کو لے کر میدان میں اُترے تھے، اپنی پشت پر وہ قوت کے جن ذخیروں کو لادے ہوئے آئے تھے ان میں سائنس کی قوت بھی تھی، کیمیائی بھی، میکانکی آلات کی بھی، اور برقی و بخاری اوزاروں کی بھی، جن قوتوں سے سمندر کی گہرائیوں میں اُترا جاتا ہے اور ہوا کی بلندیوں پر جن کے بل بوتے پر لوگ چڑھتے ہیں، اُڑتے ہیں، لانے والے سب ہی کو لے کر آئے تھے، باہر بھی ان کا بھرا ہوا تھا اور اندر کی تعمیر بھی ان[۴] کی استوار تھی، ضبط بھی تھا، اور نظم بھی، اتفاق بھی تھا اور اتحاد بھی، کیسا اتفاق، کیسا اتحاد سارا ملک ایک شخصی حکمران کے وجود میں گم ہو گیا تھا[۵] جو مقابلہ میں تھے ان کی قوم تو حکمرانوں کی جماعت میں فانی ہو کر بقا کی ضمانت کو حاصل کیے ہوئے تھی لیکن پھر بھی کثرت ہی میں کثرت کا یہ انجذاب تھا۔ مگر انھوں نے تو اپنی قومی کثرت کو شخصی وحدت میں جذب اور محو کر دیا تھا ایک، اور بالکلیہ ایک ہو کر وہ رہے تھے، پھر ثابت ہوا کہ باوجود سب کچھ لانے کے وہ کچھ نہ لائے تھے۔ ایسا ہوا کہ اپنی جانوں کو بھی واپس لے جانے کا موقع ان میں سے اکثر کو نہیں ملا۔ مغرب میں یہی تماشہ دکھایا گیا اور مغرب کی جو نقل مشرق میں اتاری گئی تھی اس کا بھی آخری انجام یہی ہوا

لیکن باوجود سب کچھ دیکھنے کے تماشہ کچھ اس طریقے سے کھیلا گیا کہ "بھینس اور لاٹھی" والے نظریہ کی غلطی پھر بھی جیسا کہ چاہیے واضح نہ ہوئی۔

---

[۴] یعنی ہٹلر کے وجود میں۔ (الفرقان) [۵] یہ غالباً جاپانیوں کی طرف اشارہ ہے جو جرمنوں کے اتحادی بن کر میدان جنگ میں آ گئے تھے۔ (الفرقان)

مگر آج پھر غلطی واضح نہ ہوئی، تو کیا ہوا؛ یہی دنیا تو تھی، یہی آسمان تھا، یہی زمین تھی، بڑی موٹی لاٹھی ان لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی تھی۔ جو روم میں رہتے تھے، رومتہ الکبریٰ کے جس "امپائر" یا شہنشاہیت کبریٰ کے قائم کرنے میں وہ کامیاب ہوئے تھے۔ سمجھا جاتا تھا کہ یہ اُسی لاٹھی کی کرامت ہے۔

لیکن اس رومی حکومت کے وسیع وعریض مقبوضات کے ایک ایشیائی مشرقی گوشہ میں جب یہ دکھایا گیا تھا کہ جو صرف اپنی ماں کا اکلوتا لڑکا تھا، قدرت نے کسی باپ کا بیٹا بنا کر جسے نہیں پیدا کیا تھا[۵]، وہی ننھا گلیلی جھیل کے کنارے مچھلی پھنسانے والوں کو جھیل کے کنارے کھڑا پکار رہا تھا۔

میرے پیچھے چلے آؤ تو میں تمہیں آدمی کا پکڑنے والا بناؤں گا۔

(متی باب ۴ درس ۱۹)

اور سوت سے بنے ہوئے جال کو پھینک کر جب مچھلی پھنسانے والے اس کے پیچھے آدمی کے پکڑنے اور پھنسانے کے فن کو سیکھنے کے لیے روانہ ہوئے اور سیکھ کر انسانوں کے شکار کرنے کی مہم میں وہ مشغول ہوئے تو مشرق ہی نہیں، بلکہ دانایانِ مغرب کی عقل بھی ان کے جال سے بچ نہ سکی، بلاشبہ یہ دیکھا گیا، اس وقت تک دیکھا جا رہا ہے کہ مچھلی پکڑنے والوں کے ساتھ جو وعدہ کیا گیا تھا وہ پورا ہوا، جب وہ مچھلیاں پکڑتے تھے اس وقت تو سوت یا رسّی کے بنے ہوئے چند جال بھی ان کے پاس تھے، لیکن آدمی پھنسانے کی مہم پر جب وہ روانہ ہوئے تو ان کے پاس اس وقت وہ جال بھی نہ تھے۔ سکرس آف گارڈ جو ڈین آف کنٹربری، اور ڈاکٹر فیرر ڈی ڈی کی مشہور کتاب ہے اس میں ان ماہی گیر مردم شکاروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس وقت بُت پرست رومیوں کے پایۂ تخت "رومتہ الکبریٰ" میں پطرس حواری پہونچے تھے تو وطنی اور قومی تعلق کی بنیاد پر رومہ کے اس محلہ میں قیام اختیار کیا جس میں غریب یہودی رہا کرتے تھے۔ لکھا ہے کہ:۔

"شہر کا یہ وہ حصّہ تھا جسے عالم کا "بدرو" کہنا زیادہ موزوں ہو سکتا ہے،

---

۵ یعنی عیسیٰ بن مریم علیہ السلام۔ (الفرقان)

یہودی لوگ اس جگہ پرانے دھرانے کپڑوں کا ریخ کے ٹکڑوں اور دوسری ادنیٰ و نکمّی چیزوں کا بیوپار کیا کرتے تھے، رمل و نجوم یا بھیک مانگ کر بسر اوقات کرتے تھے ان ہی تاریک اور غلیظ کوچوں میں ایک کوچہ تھا، جہاں روم شہر کی ذلیل آبادی کا مسکن تھا، مرقس اور پطرس (حواری)، اسی کوچہ میں رہتے تھے، جب انھوں نے شہر روم کی مختصر و محدود کلیسا کی بنیاد رکھی۔" صنا ۱۵

یہ بھی لکھا ہے کہ سینٹ پال جسے موجودہ زمانے کے عیسائی پولس رسول بھی کہتے ہیں جب رومہ کے اسی شہر میں بایں ہیئت کذائی داخل ہوا تھا کہ :-

"اس کی کمر ٹیڑھی اور بدن نحیف ہو گیا تھا، پیر پر جھرّیاں پڑی ہوئی تھیں وہ پابہ زنجیر تھا اور ایک پہرہ دار ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا۔"

لیکن باہر سے جو اتنا بے زور نظر آرہا تھا، لکھا ہے کہ

"اس کی تلقین اور وعظ کا اثر محلوں اور جھونپڑیوں، شہروں اور دیہاتوں، ہر جگہ پھیلتا چلا گیا، بہت سے لوگوں کو اس کے نمونہ سے بہت بڑی تحریک پہونچی۔"

سکرس آف گاڈ صدا ۱۵۱ (ترجمہ)

کچھ بھی ہو، سننے سے زیادہ دیکھنے سے ان آثار و نتائج کا اندازہ زیادہ آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے، جو آدمی پھنسانے والے غریب، بے نوا ماہی گیروں کی کوشش کی بدولت ظاہر ہوئے، کرۂ زمین کا مغربی حصہ ان ہی پھنسنے والوں سے بھرا ہوا ہے، اور رومہ کے اسی محلہ میں جس میں پطرس اور مرقس کے زمانہ میں بقول ڈین آف کنٹربری :-

"ہر قوم اور ہر ملک اور ہر نسل کے کمینے، سفلے آدمی رہتے تھے۔"

آج دنیا کا سب سے بڑا چرچ کھڑا ہوا ہے لاٹھی والے غائب ہو گئے اس طرح غائب ہو گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اور بھینس پر ان لوگوں کا قبضہ ہو گیا جن کے قبضہ میں تلوار تو تلوار سوت والا جال بھی باقی نہ رہا تھا۔

اور گلیلی جھیل کے ساحل کا یہ قصہ تو بہت پرانا ہے، اس وقت کا ہو جب آسمانی بادشاہت کا زمانہ ابھی آیا نہیں تھا، بلکہ جو "مبشر" بنا کر بھیجا گیا تھا۔ صرف اسی بشارت کی منادی کر رہا تھا۔

"توبہ کرو کیونکہ آسمانی بادشاہت نزدیک آگئی ہے" متی ۴/۱۷

پھر دنیا کی سب سے بڑی دونوں بادشاہتوں (قیصریت و کسرویت) سے ٹکرا کر جب زمین پر بجائے زمین کے آسمان کی بادشاہت قائم کردی گئی اور "الدین للہ" کا پھریرا مشرق و مغرب میں اڑا دیا گیا تو خواہ لوگوں کو معلوم ہو یا نہ ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کے جنوبی حصہ کے ساحلی علاقوں میں اس وقت جس وقت مسلمان اپنی بادشاہت کے ساتھ ان علاقوں میں پہونچے بھی نہ تھے آسمانی بادشاہت کا پیغام پہونچ چکا تھا اس پیغام کے پہونچانے والے جیسا کہ مختلف سیاحوں کا بیان ہے، نہ تلواروں کے ساتھ اُترے تھے اور نہ توپوں اور بندوقوں کے ساتھ، الغرض جو قوتیں دیکھی جاتی ہیں اُن میں سے کسی قسم کی کوئی قوت ان کے ساتھ میں نہ تھی، لیکن سلیمان تاجر کی کتاب پڑھیے اپنی عینی چشم دید شہادت بیان کرتا ہے۔ میں اپنے الفاظ میں اس کا خلاصہ درج کردیتا ہوں، اس کا بیان ہے کہ:-

"اپنی اَن دیکھی قوتوں کے زور کا ان لوگوں نے جو مظاہرہ کیا تھا، اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ انہوں نے ملک کے باشندوں میں برتری حاصل کی اور کیسی برتری کہ اس ملک کا سب سے بلند اور اونچا طبقہ ایک طرف اگر برہمن کے نام سے موسوم تھا تو ان پیغام لانے والوں کے قائد اور زعیم کو (جسے مقامی غیر اسلامی حکومت مقرر کرتی تھی) ہُنرمن (بروزن برہمن) کا خطاب دیا گیا تھا۔"

سلیمان ہی نے لکھا ہے کہ "ان ساحلی شہروں میں سے جس شہر میں بھی پہونچا، یہی دیکھا کہ نو وارد مسلمانوں کو ہنرمن پر جمع کردیا گیا ہے۔ ان کے مقدمات حکومت کی عام عدالتوں میں پیش نہیں ہوتے تھے، بلکہ ہنرمن کے اجلاس پر ان کے مقدمات دائر ہوتے تھے، حکومت ان مسلمانوں کو جو کچھ کہنا چاہتی تھی، یا ان سے سُننا چاہتی تھی، سب میں واسطہ بھی ہنرمن تھا، جہاں کہیں وہ سکونت پذیر تھے ان کی مسجدیں قائم تھیں، جمعہ اور جماعت کا انتظام اسی ہنرمن کے ساتھ متعلق تھا، گویا دیکھی جانے والی قوتوں کے بغیر "حکومت اندر حکومت" ان کی اَن دیکھی طاقت کی بدولت ہر جگہ قائم تھی! اور صرف مسلمانوں ہی پر یہ قائم نہیں تھی۔ بلکہ جن دلوں میں ابھی اسلام نہیں اُترا تھا ان کے اندر بھی یہی مسلمان کچھ اس طرح اتر گئے تھے کہ گواہی کی ضرورت جب کسی کو ہوتی تو عموماً غیر مسلم کے مقابلہ میں مسلمان ہی کو وہ ترجیح دیتا تھا، جو خود مسلمان نہیں ہوتا تھا۔"

قرآنی دعوت

(مسلسل)

حق اور نیکی کو پھیلانے اور عام کرنے کی جدوجہد اور اس راہ میں جانبازی

عقائد اور اعمال، اخلاق اور معاملات وغیرہ زندگی کے مختلف شعبوں میں قرآن مجید نے جو ہدایات دی ہیں ـــــ (جو کسی قدر تفصیل سے اس سلسلہ کی پہلی قسطوں میں ذکر کی جا چکی ہیں) ـــــ کوئی عقل سلیم والا اس میں شک نہیں کر سکتا کہ یہ سب حق اور نیکی کی ہدایات ہیں۔ قرآن مجید ان ہدایات پر عمل کرنے کے مطالبے کے ساتھ اپنے ماننے والوں سے اس کا بھی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس حق اور نیکی کو دوسروں میں پھیلانے اور عام کرنے کی بھی جدوجہد کریں یعنی اس کی پوری کوشش کریں کہ اللہ کے زیادہ سے زیادہ بندے حق اور نیکی کے اس راستہ کو اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا اور رحمت اور آخرت میں جنت کے حقدار بنیں۔

حالات کے مطابق اس کوشش کی شکلیں اور اس کے درجے مختلف ہوتے ہیں۔ دعوت الی الخیر، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، جہاد فی سبیل اللہ ان مختلف شکلوں کے عنوانات ہیں، راقم اس موضوع پر تفصیلی کلام اپنی کتاب "دین و شریعت" میں کر چکا ہے، یہاں چونکہ صرف یہی بتانا مقصود ہے کہ قرآن مجید کا مطالبہ اور اس کی دعوت و ہدایت اس بارہ میں کیا ہے اس لیے یہاں اس سلسلہ کی صرف چند آیات درج کی جاتی ہیں۔

سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (آل عمران ع ۱۱)

اور ضروری ہو کہ تم میں ایک ایسی اُمّت ہو جو لوگوں کو بھلائی کی طرف دعوت دے، نیکی کے لیے لوگوں سے کہے اور بُرائی سے روکے، اور یہ کام کرنے والے ہی فلاح یاب ہونگے۔

اس آیت کے لفظ "مِنْكُمْ" سے لوگوں کو یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ اس کام کا مطالبہ اس آیت میں قرآن کی ماننے والی پوری اُمت سے نہیں کیا گیا ہو، بلکہ یہ اس کے کسی خاص طبقہ کی ذمہ داری ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس آیت ہی کے آخری جملہ "وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○" سے اس غلط فہمی کی تردید ہو جاتی ہو۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاح وسعادت کے حقدار صرف وہی لوگ ہوں گے جو اس کام کو انجام دیں، اور جس عمل پر فلاح وسعادت کا حصول موقوف ہو ظاہر ہے کہ اس کا مطالبہ کسی خاص طبقہ سے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کی دعوت پوری امت کو دی جانی ضروری ہے ــــ علاوہ ازیں اس آیت سے ۴۔ ۵ ہی آیتوں کے بعد قرآن نے اس مطالبہ کو پھر ان الفاظ میں دہرایا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔ (آل عمران ع ۱۲)

اے پیروانِ محمد! تم تمام اُمتوں میں بہترین اُمت ہو جو لوگوں (کی اصلاح وہدایت) کے لیے ظہور میں لائی گئی ہو، تمھارا کام یہ ہے کہ نیکی کا حکم دیتے ہو، بُرائی سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت میں اس اُمّت کے وجود وظہور کی غرض وغایت ہی یہ بتائی گئی ہے کہ اسں کو ایمان باللہ کے ساتھ امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اور لوگوں کی اصلاح وہدایت کی خدمت انجام دینا ہے! الغرض اس آیت سے بھی یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ امت کا کوئی خاص طبقہ اس کام کا ذمہ دار نہیں ہو بلکہ پوری اُمت سے اس کا مطالبہ ہے ــــ ہاں اس کام کی خاص نوعیت ایسی ہو کہ اکثر حالات میں اُمت کے ہر فرد کا اس میں لگنا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ اس کی اہلیت وصلاحیت رکھنے والے افراد اگر بقدر کفایت اس کام میں لگے رہیں اور دوسروں کا تعاون انھیں حاصل رہے تو بھی کام پورا ہوتا رہتا ہے، اور اس عاجز کا خیال ہو کہ غالباً اسی طرف اشارہ کرنے کے لیے پہلی آیت میں لفظ

"منکم" لایا گیا ہے ــــــ واللہ اعلم۔

اور سورۂ حٰم سجدہ میں فرمایا گیا۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ (حٰم سجدہ ع ۵)

اور کون زیادہ اچھا ہو سکتا ہے اس شخص سے بات میں جس نے بلایا اللہ کی طرف اور خود بھی نیک کرداری اختیار کی اور کہا کہ میں اللہ کے فرمانبرداروں میں سے ہوں۔

یعنی سب سے اچھی بات اُس بندہ کی ہے جو ایمان و عمل صالح کا ذاتی سرمایہ رکھنے کے ساتھ اللہ کے دوسرے بندوں کو بھی اس کی طرف بلاتا ہو، اور ان کی اصلاح کی کوشش کرتا اور اس راہ میں جان کھپاتا ہو۔

اور سورۃ العصر میں فرمایا گیا۔

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِىْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

زمانہ کی گردش کی قسم سارے انسان خسارہ میں ہیں۔ خسارہ سے بچنے والے اور فلاح پانے والے صرف وہ بندگانِ خدا ہیں جو ایمان لائیں، نیک اعمال کریں اور راہِ حق پر چلنے کی اور نفس کو بُری خواہشوں سے بچائے رکھنے کی ایک دوسرے کو وصیت و نصیحت بھی کریں۔

اس سورت میں خسارہ سے بچنے اور فلاح پانے کے لیے ایمان اور عملِ صالح کے ساتھ "تواصی بالحق" اور "تواصی بالصبر" کی بھی شرط لگائی گئی ہے، اس تواصی بالحق کا مطلب ظاہر ہے کہ یہی ہو کہ عقائد میں، ایمان میں، اخلاق میں، معاملات میں، (خواہ وہ معاملات انفرادی ہوں یا اجتماعی، شخصی ہوں یا قومی یا بین الاقوامی، اپنوں کے ساتھ ہوں یا غیروں کے ساتھ) غرض زندگی کے ہر معاملہ اور ہر شعبہ میں حق پر چلنے کے لوگوں کو دعوت دی جائے ــــــ اسی طرح تواصی بالصبر کا مطلب یہ ہو کہ غلط راہوں پر چلنے اور غلط کام کرنے کی جو خواہشیں مختلف محرکات کی وجہ سے نفس میں پیدا ہوتی ہیں اُن سے باز رہنے اور نفس کو قابو میں رکھ کر حق و ہدایت کا پابند رکھنے کی بھی دوسروں کو دعوت

دی جائے اور وصیت و نصیحت کی جائے ـــــ بہر حال اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ ایمان اور عمل صالح کی طرح یہ کام بھی ہمارے اُن بنیادی فرائض میں سے ہے جن کو ادا کیے بغیر ہم فلاح و سعادت سے ہمکنار نہیں ہو سکتے۔

اس کام کا ایک جامع اور وسیع تر عنوان جیسا کہ عرض کیا گیا جہاد فی سبیل اللہ بھی ہے جس کا اصل مطلب ہے اللہ کے راستہ میں پوری محنت اور کوشش کرنا یعنی اللہ کے بندوں کو اللہ کے راستہ پر لگانے اور اس کی رضا و رحمت کا مستحق بنانے کے لیے جس وقت جس محنت و کوشش اور جس قربانی کی ضرورت ہو اور جو اپنے امکان میں ہو وہ کر گزرنا ـــــ جہاد کے اصل معنی یہی ہیں۔ ہاں اس کی شکلیں جیسا کہ عرض کیا جا چکا حالات کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہیں، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکۂ معظمہ کے بارہ تیرہ سالوں میں جس طرح یہ کام کرتے رہے وہ جہاد کی ایک شکل تھی، پھر مدینہ طیبہ کے ابتدائی دور میں آپ نے اور آپ کی رہنمائی میں آپ کے اصحاب کرام نے جو دعوتی اور تبلیغی کوششیں فرمائیں اور جو محنتیں اور مشقتیں اس سلسلہ میں اٹھائیں وہ بھی جہاد کی ایک شکل تھی۔ اور اس کے بعد بدر و احد اور دوسرے غزوات میں جنگ و قتال کے جو معرکے ہوئے وہ بھی جہاد ہی کی ایک شکل تھی ـــــ پس قرآن مجید میں جہاں جہاں اہل ایمان سے جہاد فی سبیل اللہ کا مطالبہ کیا گیا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ والا بنانے کے لیے اور شیطان و نفس اور معبودان باطل کی غلامی سے نجات دلا کر ان کو اللہ کی بندگی میں لانے کیلئے اور ان کی زندگی کو پاکیزہ اور نورانی بنا کر ان کو خدا کی رحمت اور جنت کا مستحق بنانے کے لیے جو کوشش اور قربانی تم کر سکتے ہو اس میں دریغ نہ کرو۔ قرآن مجید میں اس کام کو اتنی عظمت دی گئی ہے کہ اس کو خود اللہ کی نصرت اور اس کے کرنے والوں کو انصار اللہ یعنی "اللہ کے مددگار" کہا گیا ہے اور ان کے لیے دنیا اور آخرت کی بڑی سے بڑی سرفرازیوں اور سربلندیوں کے وعدے کیے گئے ہیں ـــــ

سورۂ صف کی یہ چند آیتیں پڑھیے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنّٰتِ عَدْنٍ ط ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْ اِلَى اللّٰهِ ط قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۔ (صف ع ۲)

اے ایمان والو کیا میں تمھیں ایک ایسا کاروبار بتادوں جو دردناک عذاب سے تمھیں نجات دلادے؟ (سنو وہ یہ ہے) ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر (اور اس ایمان کے تقاضوں کو پورا کرکے اپنے حقیقی مومن ہونے کا ثبوت دو) اور اپنے جان و مال سے اللہ کے راستہ میں اور اس کے دین کے لیے جدوجہد کرو اس میں تمھارے لیے سراسر بہتری ہے۔ اگر تم کو حقیقت کا علم ہو، (تم نے اگر ایسا کیا) تو اللہ تمھارے گناہ بخشدے گا اور تم کو بہشت کے اُن باغات میں پہونچادے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ اور سدابہار جنتوں کے نہایت نفیس محلوں میں تمھیں بسائے گا۔ یہی عظیم الشان کامیابی ہے (اور آخرت کی اس جنت اور کامیابی کے علاوہ اور اس سے پہلے) ایک دوسری نعمت بھی تم کو عطا کرے گا جس کی تمھیں چاہت ہو (اور وہ ہو) دشمنوں کے مقابلہ میں اللہ کی مدد اور قریبی فتح اور اے پیغمبر آپ ایمان والے بندوں کو اس کی خوشخبری سنادیجیے! اے ایمان والو ہوجاؤ اللہ کے مددگار، جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کہ کون ہیں میری مدد کرنے والے اللہ کے راستہ میں؟ تو حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں اللہ کے انصار اور اس کے راستہ میں آپکے مددگار۔

اور سورۂ مائدہ میں فرمایا گیا ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (مائدہ ع ۶)

اے ایمان والو خدا سے ڈرو اور اس کے (قرب و رضا) کا راستہ تلاش کرو (یعنی ایسے عمل کرو جن سے اس کی رضا اور قرب حاصل ہو، اور اس سلسلہ کا خاص الخاص

عمل یہ ہو کہ) اس کے دین کی راہ میں (یعنی اس کے بندوں کو اس کی راہ پر لگانے کے لیے) بھرپور کوشش کرو تاکہ تم فلاح پاسکو۔

اور سورۂ حج کے خاتمہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۤءَ عَلَى النَّاسِ (الحج ع ۸)

اور جد و جہد کرو اللہ کی راہ میں (یعنی اس کے بندوں کو اس کے راستہ پر لگانے کے لیے پوری محنت اور کوشش کرو) جیسی محنت اور کوشش کا اس کا حق ہو۔ (اے امت محمد! اب) اللہ نے تم کو اس خدمت کے لیے چنا ہو، طریقہ ہے تمھارے باپ ابراہیم کا (علیہ السلام) اس نے تمھارا (کیا اچھا) نام مسلم رکھا ہے اس (کتاب قرآن مجید) میں اور اس سے پہلے (والی کتابوں میں) تو ایسا ہو کہ رسول تو تمھیں بتانے والا ہو اور تم باقی دنیا کے بتانے والے ہو۔

اور سورۂ حجرات میں اس جہاد فی سبیل اللہ یعنی دین کے لیے محنت و قربانی کو لازمۂ ایمان بتایا گیا ہے اور صاف فرمایا گیا ہے ...... کہ سچے مومن بس وہی ہیں جن کو اللہ و رسول پر اور ان کی باتوں پر یقین ہو، دل میں کسی شک و شبہ کا گزر نہ ہو، اور وہ اللہ کی راہ میں جد و جہد اور قربانی بھی کرتے ہوں۔ ارشاد ہوا ہو۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط اُولٰۤئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○ (حجرات ع ۲)

اصلی مومن تو بس وہی بندے ہیں جو یقین لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر، پھر وہ کسی شک و شبہ میں گرفتار نہیں ہوئے اور انھوں نے خوب کوشش کی اور قربانی دی اپنے جان و مال کی اللہ کے راستہ میں، بس وہی بندے (ایمان کے

دعوے میں) صادق اور سچے ہیں۔

آخر میں سورۂ توبہ کی ایک آیت اور پڑھ لی جائے جس میں بتایا گیا ہو کہ اہل ایمان کی شان یہ ہونی چاہیے کہ انھیں دنیا کی ہر محبوب اور پسندیدہ چیز حتیٰ کہ اپنے ماں باپ اور بیوی بچوں سے بھی زیادہ اللہ اور رسول کی محبت اور اللہ کی راہ میں جدوجہد اور جانبازی محبوب ہو۔ اگر کسی کا حال یہ نہ ہو تو وہ خدا کی رحمت و عنایت کا نہیں بلکہ سزا کا مستحق ہو۔ العیاذ باللہ۔

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝ (توبہ ع ۳)

(اے رسول مسلمانوں سے) کہیے کہ اگر تمھارے ماں باپ اور تمھاری اولاد اور تمھارے بھائی بند اور تمھاری بیویاں اور تمھارا کنبہ قبیلہ اور تمھاری کمائی ہوئی دولت اور تمھاری وہ تجارت جس کے ٹھپ ہو جانے کا تمھیں خطرہ ہو، اور تمھارے رہنے کے مکانات جو تمھیں عزیز ہیں (تو اگر یہ چیزیں) زیادہ پیاری ہیں تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اُس کی راہ میں محنت و جانبازی سے تو منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ کر دے (اور تم کو اس کی سزا مل جائے) اور اللہ تعالیٰ کا دستور یہ ہو کہ وہ نافرمانوں کو ہدایت کی نعمت عطا نہیں فرماتا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مومن کی اصل شان یہ ہو کہ راہِ خدا میں جانبازی اور دین کے لیے جدوجہد اس کو دنیا کی ساری چیزوں سے زیادہ محبوب و مرغوب ہو۔ گویا صرف یہ عمل ہی نہیں بلکہ اس عمل سے عشق ہونا چاہیے اور بیشک عشق ہی کی طاقت سے اس راستہ کی مشکلات کو عبور کیا جا سکتا ہے۔

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بسے
شرطِ اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

دین میں حکمتِ عملی کا مقام

(از مولانا امین احسن صاحب اصلاحی)

"ایسی حکمتِ عملی اور ایسی پریکٹیکل وزڈم پر اللہ کی، اس کے نبیوں اور رسولوں کی، اس کے ملائکہ کی اور تمام اہلِ ایمان کی لعنت ہے جو خدا کی شریعت میں کتر بیونت کو مباح کرتی ہو. آپ کو اپنی حکمتِ عملی استعمال کرنے کا شوق ہے تو اس دائرہ میں استعمال فرمائیے جس دائرہ میں خدا نے اپنے احکام و ہدایات کے ذریعہ سے مصلحت متعین نہیں فرما دی ہے، لیکن جس امر کے بارے میں کوئی چھوٹا یا بڑا حکم آگیا ہے خواہ نہی کی صورت میں یا امر کی شکل میں اس میں وہی مصلحت ہے۔ اگر کوئی شخص اس مصلحت پر اپنی مصلحت قائم کرنا چاہتا ہے تو وہ خدا اور رسول کے حرم میں مداخلت کرنا چاہتا ہے" (مولانا اصلاحی)

جنوری کے الفرقان میں اس بحث کے سلسلہ میں مولانا مودودی کی ایک جوابی تحریر اپنے مختصر تعاقبات کے ساتھ شائع کرکے ہم نے اہلِ علم سے گزارش کی تھی کہ وہ مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر اس موضوع پر قلم اٹھائیں ہمیں خوشی ہے کہ مولانا اصلاحی صاحب نے مسئلہ کی وہ اہمیت محسوس فرمائی جو انکے منقولہ بالا الفاظ سے ظاہر ہے۔ مضمون کی اہمیت کے لیے مولانا اصلاحی کا نام کافی ضمانت ہے۔ اس میں نفس مسئلہ کے علاوہ مودودی صاحب کے "نظریۂ حکمتِ عملی" کے پس منظر کو بھی شرح و بسط کے ساتھ سامنے لایا گیا ہے اور حقیقت

اسلامی کے ماضی وحال پر بھی ایسا سخن گسترانہ تبصرہ اس میں آگیا ہے، جو بے شک مولانا اصلاحی "شاہد من اہلہا" ہی کا حصہ تھا۔

ہمارے ناظرین مضمون کے لب ولہجہ میں کچھ سختی محسوس کریں گے۔ مگر اس کی وجہ سے اصلی افادیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ورنہ جہاں تک لب ولہجہ کا تعلق ہے ہم خود یہی بہتر سمجھتے تھے کہ مولانا اصلاحی صاحب ہمارے بارے میں مولانا مودودی کے لب ولہجہ کو نظر انداز فرما دیتے۔ کیونکہ ہم نے خود اسکو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔

ہم اب اس مضمون پر اس بحث کو ختم کرتے ہیں ——— واللہ یھدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم ——— ادارہ

دسمبر ۵۸ء کے "ترجمان القرآن" میں مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے ایک سائل کے جواب میں " دین میں حکمت عملی کا مقام " کے عنوان سے وہ بحث پھر چھیڑی ہے جو معلوم نہیں دین کے معاملہ میں کتنے فتنوں کے دروازے کھول چکی ہے۔ ہماری دلی خواہش تھی کہ مولانا اب اسلام اور مسلمانوں پر رحم کرتے اور اس فتنہ انگیز بحث کو زیادہ نہ کریدتے۔ باطل کی حمایت میں دلائل فراہم کرنے سے باطل حق نہیں بن جایا کرتا بلکہ ایک باطل سے سینکڑوں باطل پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ ایام میں مولانا مدظلہ کے قلم سے اسلام اور مسلمانوں کی تھوڑی بہت جو خدمت بن آئی تھی وہ اس کا بدلہ اب مع سود کے چکانا چاہتے ہیں اور ہم نیازمندوں کی خواہش اور مشورہ کے علی الرغم وہ تہیہ کر چکے ہیں کہ یہ بدلہ وہ چکا کے رہیں گے۔

مولانا کے مستفسر نے مولانا سے یہ خواہش کی تھی کہ " الفرقان" (لکھنؤ) نے آپ کے دلائل پر جو تنقید کی ہے، وہ بہت جاندار ہے اور آپ کے جوابات تشفی بخش نہیں ہیں اس لیے مناسب ہوگا کہ آپ ایک مفصل مضمون کے ذریعہ سے ان لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کریں جو کسی کے جانبدار نہیں ہیں بلکہ مسئلہ کی حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں۔

مولانا نے مستفسر کی تشفی کے لئے سب سے پہلے تو یہ انکشاف فرمایا کہ " اصل بنائے بحث یہ مسائل نہیں ہیں۔ بلکہ دل کا ایک پرانا بخار ہے جو مدتوں سے موقع کی تلاش میں دبا پڑا تھا اور اب

اس کو نکالنے کے لئے کچھ مسائل بطور حیلہ ڈھونڈ لئے گئے ہیں" پھر فرماتے ہیں کہ اگر وہ بھی چاہیں تو ان معترضین کی طرح "تقویٰ اور خشیت کا لباس نہ پہن کر" ان کے خلاف بہت سی باتیں بنا سکتے ہیں لیکن ان کو چونکہ "خدا کا خوف اور ایک ایک لفظ پر اس کے حضور باز پرس" کا ڈر لاحق ہے اس وجہ سے وہ ایسا نہیں کر رہے ہیں۔ پھر اپنے اعلیٰ مشاغل اور اپنے برتر مقاصد کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ معترض تو اپنے پست محرکات کے تحت اعتراض کرتا ہے "اور اپنے مقصد کی خاطر ہزار دی میں بھٹکتا پھریگا، میں اپنے مقصد کو چھوڑ کر اس کے پیچھے کہاں کہاں بھٹک سکتا ہوں"۔ پھر مولانا ان مکرمات سے اپنی بالاتری کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ "میں نے انھیں چھوڑ دیا کہ جب تک چاہیں اپنا نامۂ اعمال سیاہ کرتے رہیں"۔ پھر مستفسر کو مخاطب کر کے ارشاد ہوتا ہے کہ ناقدین و معترضین "آئے دن آپکے دل میں ایک نیا وسوسہ ڈالیں اور میں اپنے سارے کام چھوڑ چھاڑ کر آپکے وسوسے دور کرنے میں لگا رہوں"؟ آخری ارشاد اس سلسلہ میں یہ ہے کہ یہ معترضین تو "اطفالِ مکتب" ہیں مطلب یہ ہے کہ مولانا علم وفضل کے اس مرتبۂ بلند پر ہوتے ہوئے ان اطفالِ مکتب کو منہ کس طرح لگائیں۔

مولانا اپنے معتقدین میں اپنے ذہنی توازن اور اپنے علم وتحمل کے لیے بڑی شہرت رکھتے ہیں اور اپنے خوف خدا اور لفظ لفظ پر آخرت کی باز پرس کے ڈر کا اشتہار تو انھوں نے اپنے اس مضمون میں بھی دیا ہے لیکن ہم کسی ثالث بالخیر سے پوچھنے کے بجائے خود مولانا ہی سے پوچھتے ہیں کہ خدا اور آخرت کے جس خوف کا حوالہ آپنے دیا ہے کیا ان سطروں کے لکھتے وقت بھی وہ آپ پر طاری رہا ہے؟ کیا فی الواقع آپ اپنے مذکورہ بالا الفاظ اور فقروں کی خدا کے آگے جواب دہی کے لیے تیار ہیں؟

آخر آپنے کس ذریعۂ علم سے دریافت فرمالیا کہ جن لوگوں نے آپ پر تنقید کی ہے انھوں نے آپکے خلاف دل کا ایک پرانا بخار نکالا ہے اور محض شرارت اور بدنیتی سے آپکے مضمون کو بہانہ بنا لیا ہے؟ کیا اس کا امکان نہیں ہے کہ انھوں نے فی الواقع آپکے مضمون کو قابل اعتراض پایا ہو اور محض توضیح حق اور آپ کی اور آپکے دوسرے ہم خیالوں کی اصلاح اور

رہنمائی کے لئے یہ تنقیدیں لکھی ہوں؟ آپنے کیسے جانا کہ یہ لوگ اپنے نامۂ اعمال سیاہ کر رہے ہیں؟ کیا آپ کے کسی مضمون پر تنقید کرنا اپنے نامۂ اعمال کو سیاہ کرنا ہے اور کیا اس کا امکان نہیں ہے کہ آپنے اپنے مضمون کے ذریعہ سے خود اپنے نامۂ اعمال کو داغدار کیا ہو اور ناقدین نیک نیتی سے یہ چاہتے ہوں کہ آپ کے نامۂ اعمال کے یہ داغ دُھل جائیں؟ یہ آپنے کس طرح معلوم کیا کہ انھوں نے تقویٰ اور خشیت کا لباس زرد پہن رکھا ہے، کیا آپنے ان کے باطن میں جھانک کر دیکھا ہے اور ان کے دلوں کے حال سے آگاہ ہیں؟ آپنے کس بنا پر یہ فرمایا کہ یہ ناقدین اطفال مکتب ہیں، درآنحالیکہ ان میں سے بعض عمر اور علم دونوں میں آپکے ہمسر ہیں اور بعض اگر عمر میں آپ سے چھوٹے بھی ہیں تو کیا قرآن وحدیث نے ہمیں یہی سکھایا ہے کہ جو عمر میں ہم سے چھوٹے ہوا کریں، ہم ان کو اطفال مکتب سے خطاب کیا کریں۔

مولانا کے مضمون کا یہ پہلو بھی نہایت افسوس ناک ہے کہ "الفرقان" میں تنقید تو لکھی ہے عتیق الرحمٰن صاحب نے لیکن مولانا مودودی صاحب نے اپنا سارا غیظ وغضب نکالا ہے مولانا محمد منظور نعمانی صاحب پر۔ عدل والنصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ مولانا کم ازکم اپنے زیر بحث مضمون میں اپنا غصہ اسی پر نکالتے جس نے تنقید لکھی اور اپنے نام سے چھاپی ہے۔ لیکن اس مضمون کا ہر مطالعہ کرنے والا آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے "طفل مکتب" کی پھبتی کے سوا اپنے ہر وار کا ہدف مولانا محمد منظور نعمانی صاحب ہی کو بنایا ہے۔ حالانکہ زیر بحث مضمون کی حد تک ان کا قصور اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے کہ وہ تنقید نگار کے والد ماجد ہیں، نفس مضمون کی تحریر وتسوید سے ان کا کوئی دور کا واسطہ بھی نظر نہیں آتا ہے۔ وہ بیچارے صرف بیٹے کے گناہ میں دھر لئے گئے ہیں۔

ابھی کل کی بات ہے جب جماعت اسلامی کے بہت سے ارکان کے استعفے اخبارات میں چھپنے شروع ہوئے تو ان کے سامنے مولانا مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے دوسرے اہل قلم حضرات کیطرف سے انہی مولانا منظور صاحب کو بطور اسوۂ حسنہ پیش کیا جاتا تھا کہ ان کو دیکھو، یہ بیچارے کیسے صالح اور خدا ترس ہیں کہ جب ان کو جماعت اسلامی سے اختلاف ہوا تو اس سے الگ ہوکر اپنے طور پر دین کی خدمت میں لگ گئے کسی کو ان کے اختلافات کی کانوں کان خبر نہیں ہوئی اور اب انہی مولانا منظور صاحب کی تواضع اُن خطابات سے ہو رہی ہے جن کا حوالہ ہم نے اوپر دیا ہے۔ ان کی نسبت مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ تقویٰ اور خشیت کا لباسِ زرد پہن کر وہ ان کے خلاف دل کا بخار نکال رہے ہیں۔

مولانا محمد منظور نعمانی ہماری قوم کی جانی پہچانی ہوئی شخصیت ہیں۔ علم دین کے لحاظ سے وہ مسلمان قوم کے چوٹی کے علماء میں سے ہیں۔ صاحب قلم ہیں، صاحب زبان ہیں، نہایت مقبول، نہایت بلند پایہ اور نہایت موثر کتابوں کے .... مصنف ہیں۔ ان کے رسالہ "الفرقان" کی دینی واصلاحی خدمات سے شاید ہی کوئی شخص انکار کی جرأت کر سکے۔ ان کا قلم اس درجہ محتاط ہے کہ اگر یہ قسم کھائی جائے کہ انھوں نے اس طرح کے الفاظ اپنی پوری تصنیفی زندگی میں کسی مسلمان کے متعلق کبھی کبھی نہ لکھے ہوں گے جس قسم کے الفاظ مولانا مودودی صاحب نے ان کے بارے میں رقم فرمائے ہیں تو انشاء اللہ قسم کھانے والا جھوٹا ثابت نہ ہو گا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ عملی انسان ہیں۔ جس دین کی تعلیم وہ دوسروں کو دیتے ہیں اس کے وہ خود بھی عملی پیکر ہیں۔ ان کی زندگی طالب العلمانہ بلکہ درویشانہ ہے۔ کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ انھوں نے کبھی ..... اپنے علم و تقویٰ کو کسی منفعت دنیوی کے حصول کا ذریعہ بنایا ہو۔ انکی نسبت مولانا مودودی صاحب کا یہ فرمانا کہ وہ خشیت و تقویٰ کا لباس زور پہن کر ان کیخلاف پندرہ سولہ سال سے تہمت تراشیوں میں لگے ہوئے ہیں، ایک ایسی بات ہے جس کے جواز کو مولانا مودودی صاحب کے مخصوص حلقۂ معتقدین کے سوا شاید ہی کوئی تسلیم کر سکے۔ خود مجھے بھی مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی بعض باتوں سے اختلاف رہا ہے اور اب بھی ہے، لیکن میں ان کی نیت کو ہر شبہ سے بالاتر سمجھتا ہوں اور جب میں ان کو دیکھتا ہوں تو ان کی عملی زندگی پر تو مجھے رشک آتا ہے۔

مولانا مودودی صاحب کے غصہ کے دوسرے ہدف حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب ایڈیٹر المنبر (لائل پور) اور مولانا عتیق الرحمٰن صاحب ایڈیٹر الفرقان (لکھنؤ) ہیں۔ غالباً یہی لوگ ہیں جن پر مولانا مودودی صاحب نے اطفالِ مکتب کی پھبتی چست کی ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ علم اور دین کے یہ خادم طفلِ مکتب کیوں قرار دیے گئے ہیں۔ یہ دونوں اصحاب عمر میں مولانا مودودی صاحب مدظلہ سے چھوٹے ضرور ہیں، مولانا کے مقابل میں ان کو اپنے علم اور تجربہ کی کمی کے اعتراف میں بھی کوئی شرمندگی نہیں ہے، انھوں نے اپنی تحریروں میں بار بار اس بات کا اظہار و اعتراف بھی کیا ہے، لیکن اس کے باوجود ان پر اطفالِ مکتب کی پھبتی چست کرنا مولانا کی بڑی زیادتی ہے۔ عمر اور علم میں اپنے سے چھوٹے لوگوں کے لئے اس طرح کے تحقیر آمیز فقرے استعمال کرنا آدمی کی بڑائی کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس سے آدمی کا عجب ٹپکتا ہے اور یہ چیز جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔

میں حکیم صاحب کو نظر انداز کرتا ہوں کہ مولانا کو ان سے بہت سی باتوں کے سبب سے شکایات ہیں اس وجہ سے ان کے بارے میں اگر وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے تو ان کو معذور قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن عتیق صاحب پر مولانا کی اس زیادتی کے لیے کوئی عذر میری سمجھ میں نہ آسکا۔

عتیق صاحب کی جو تحریریں ابتک ہماری نظر سے گذری ہیں ان سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ وہ نہایت ہونہار نوجوان ہیں۔ ان کی طبیعت سلیم، انکا ذہن اخاذ، اور انکا قلم زوردار ہے۔ مولانا مودودی صاحب کے مضمون پر انھوں نے "الفرقان" کے کئی نمبروں میں جو تنقید لکھی ہے وہ میری نظر سے گذری ہے۔ اس میں انکا علم بھی ان کی عمر کے لحاظ سے بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے اور ان کی متانت اور شرافتِ لہجہ تو قابل داد ہی ہے۔ انھوں نے مولانا مودودی صاحب کی ایک ایک دلیل کے بخیے اُدھیڑ کے رکھ دیئے ہیں لیکن ایک لفظ بھی مولانا کی شان میں تحقیر آمیز نہیں لکھا ہے۔ لکھنے والا نوجوان ہو اور اس کے ہاتھ میں قلم بھی منہ زور ہو تو اس طرح کے فقرے ایجاد کر لینے کیا مشکل ہیں۔ جس قسم کے فقرے مولانا نے ایجاد فرما لیے ہیں۔ لیکن تعجب ہوتا ہے کہ مولانا تو سن و سال کی اس پختگی میں بھی زبان قلم کو تعدیوں اور ایذا رسانیوں سے نہیں بچا سکے لیکن جن پر مولانا "اطفالِ مکتب" کی پھبتیاں چست فرماتے ہیں وہ قلم کی حرمت مولانا سے کہیں زیادہ ملحوظ رکھتے ہیں۔

ان تمہیدی گالیوں کے بعد مولانا نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں اسی قسم کی دو دلیلیں بھی پیش فرمائی ہیں جس قسم کی دلیلیں وہ کچھ عرصہ سے ڈھونڈھنے اور پیش کرنے میں مصروف ہیں۔ مولانا کی ان دلیلوں کا بھی مختصر طور پر جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ لیکن اس جائزہ سے پہلے میں مولانا کے ان تمام مضامین کے پس منظر کی طرف بھی سرسری طور پر اشارہ کر دینا مناسب سمجھتا ہوں، جو ادھر کچھ عرصہ سے وہ "دین میں حکمت عملی کا مقام" کی تحقیق سے متعلق لکھ رہے ہیں، اس پس منظر کے سامنے آجانے کے بعد غالباً ناظرین بہتر طریقہ سے سمجھ سکیں گے کہ یہ ذہنی و فکری انحطاط جو ان مضامین میں جھلک رہا ہو کب سے اور کن اسباب سے شروع ہوا ہے۔

مولانا کے مضامین کا پس منظر

اس حقیقت سے غالباً ہمارے دوست دشمن سب ہی واقف ہوں گے کہ مرحوم جماعت اسلامی

جب وجود میں آئی تھی تو دین اور اس کے تقاضوں سے گریز و فرار کے لیے رخصتوں اور مصلحتوں کی تلاش کے لیے نہیں وجود میں آئی تھی بلکہ انبیا علیہم السّلام کے طریقہ پر اللہ کے پورے دین کو زندگی کے تمام شعبوں میں قائم کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی۔ جہاں تک رخصتوں اور مصلحتوں کے کاروبار کا تعلق ہے اس کے جاننے والے اور اس کے چلانے والے ہماری قوم میں تھوڑے نہیں تھے کہ اس کاروبار کو مزید فروغ دینے کے لیے ایک نئی جماعت کی تشکیل کی ضرورت محسوس کی جاتی۔ ہماری قوم کے اہلِ فکر کا ایک بہت بڑا طبقہ، انگریزوں کے تسلط کے بعد سے، زیادہ تر کام ہی یہی کر رہا تھا کہ شریعت کی ذمہ داریوں سے فرار کی راہیں سوچے، فقہ و حدیث کی کتابوں سے ان کے کھوٹے سچے دلائل تلاش کرے اور پھر اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ سے مسلمان قوم کو رام کرے کہ تم خواہ مخواہ اسلام کے نام پر فلاں فلاں پابندیوں میں اپنے آپ کو جکڑے ہوئے ہو، اسلام میں تو یہ ساری باتیں مباح ہیں۔ جو لوگ اس گروہ کے لیڈر تھے یا جنھوں نے اپنی زبان و قلم کی صلاحیتوں سے اس مقصد کو تقویت پہنچائی، میں ان کے نام گنا سکتا ہوں اور اس سلسلے میں ہر ایک کا جو رول رہا ہے وہ بھی بتا سکتا ہوں لیکن طوالت سے بچنا چاہتا ہوں۔

علماء کی ایک جماعت نے اس گروہ کی ان فکری چیرہ دستیوں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اپنے اخلاص کے باوجود یہ جماعت ہوا کا رُخ بدلنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ اس کی وجہ اوّل تو یہ ہے کہ زمانہ کے حالات بالکل ناسازگار ہو چکے تھے۔ اور دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ اس جماعت نے مذہب کی حمایت و مدافعت کا جو طریقہ اختیار کیا اس کا مزاج بالکل منفی نوعیت کا تھا۔ اس کا کوئی پہلو بھی مثبت نہیں تھا، اس وجہ سے اس کی ناکامی گویا خود اس کے وجود کے اندر ہی مضمر تھی۔

اس دوران میں صرف ایک آواز ایسی اٹھی جو مذہب کی حمایت کے حق میں بڑی رعد آسا تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی گھن گرج سے ہماری سوسائٹی کے ہر حلقہ میں ایک ہلچل سی نمایاں ہونے لگی۔ اس کے اثر سے کتاب اور سنت کے الفاظ ان مجلسوں میں بھی بولے جانے لگے جن میں یا تو لوگ ان ناموں سے واقف ہی نہ تھے یا ان کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔ اس کی رَو اتنی تیزی سے بڑھی اور پھیلی کہ معلوم ہوتا تھا کہ صبح و شام میں ہماری قوم میں ایک ایسا فکری انقلاب

پیدا ہو جائے گا جو نصرف قدیم جمود کی جڑیں اکھاڑ کے رکھ دے گا بلکہ ان غلط رجحانات کو بھی ایک قلم جلا وطن کر دیگا۔ جو ہماری قوم کے اندر انگریزوں کے تسلط کے بعد پرورش پائے ہیں۔ لیکن ہماری تاریخ کا یہ ایک بہت بڑا حادثہ ہے کہ یہ آواز ہماری زندگیوں پر کوئی گہرا اثر چھوڑے بغیر ہی دب گئی۔ اور اب اس کی یاد ہمارے حافظہ میں پچپنے کے صرف ایک سہانے خواب کی حیثیت سے محفوظ رہ گئی ہے۔ یہ حادثہ کس طرح پیش آیا۔ کن عوامل نے اسکے اسباب فراہم کیے اور اس حادثہ سے ہماری قوم کو کیا کیا نقصانات پہنچے، ان سوالات پر یہاں بحث کرنے کا موقع نہیں ہے۔ اس وجہ سے میں اسکی طرف ایک سرسری اشارہ کر کے آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔

اس حادثہ کے بعد امیدوں کے بہت سے چراغ بجھ گئے اور بہت سے بجھا چاہتے تھے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے امید کی ایک روشنی دکھائی اور بہت سے اللہ کے مخلص بندے ان کے اردگرد اکٹھے ہوگئے۔ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان لوگوں کے اُن کے اردگرد اکٹھے ہو جانے میں زیادہ دخل مولانا کی قوت جذب کو تھا یا جمع ہو جانے والوں کے شوقِ انجذاب کو۔ یہ سوال یہاں غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال کچھ اہلِ اخلاص جمع ہوگیے اور جماعت اسلامی وجود میں آئی۔

اس جماعت کے متعلق میں یہ بات اوپر عرض کر چکا ہوں کہ یہ اللہ کے دین کو انبیائے کرامؑ کے طریقہ پر قائم کرنے کے دم داعیہ کے ساتھ اٹھی تھی حیلوں، بہانوں، اور لایعنی مصلحتوں کی کوئی نئی کتاب الحیل تدوین کرنے کے ارادہ کے ساتھ نہیں قائم ہوئی تھی۔ اس نے اٹھتے ہی مسلمانوں کی اُس مصلحت پرستانہ اور حیلہ بازانہ ذہنیت پر جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے، اس زور سے حملہ کیا کہ سابق فکر و فلسفہ کے بہت سے حامیوں کے چھکے چھوٹ گیے۔ یہ ہر شعبۂ زندگی میں بے آمیز اور خالص اسلام سے کم کسی چیز کو قبول کرنا تو درکنار اس کا نام بھی سننے کے لئے تیار نہیں تھی۔ جس کو بھی اس نے اس نصب العین کی راہ میں کسی نوعیت سے حارج پایا اس کو رگڑنے کی کوشش کی۔ ملّا، صوفی، رند، زاہد، فقیہہ، محدث، خانقاہ مدرسے، لیڈر، ایڈیٹر سب اس کی زد میں آئے۔ حد یہ ہے کہ اسی زعم میں اس نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے لے کر حضرت شاہ ولی اللہؒ اور سید احمد شہیدؒ تک ہر مصلح و مجدد کے کام پر تنقید کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ زمانہ اور وقت کی مصلحتوں کے لحاظ نے اِن لوگوں کے کاموں میں یہ خرابیاں پیدا

کیں اور یہیں اس قسم کی تمام مصلحت پرستیوں سے بچ کر آگے بڑھنا ہے۔

جہاں کہیں بھی اس نے مصلحت پرستی کا کوئی اڈہ یا کوئی گوشہ دیکھا وہیں سے لوگوں کو کھدیڑ کھدیڑ کر نکالنے کی کوشش کی۔ اس کی دعوت سے کتنوں نے کالجوں اور اسکولوں کی تعلیم کو خیرباد کہا کہ یہ قتل گاہیں ہیں، کتنوں نے ملازمتیں چھوڑیں کہ یہ نظام طاغوت کی چاکری ہے، کتنوں نے اپنے ذوی الارحام سے قطع تعلق کیا کہ ان کی کمائی حرام کی ہے، کتنوں نے اپنے حقوق تلف کرائے کہ وہ غیر اسلامی عدالتوں میں اپنے معاملات لے جا کر تحاکم الی الطاغوت کے مجرم بننے کے لئے تیار نہیں تھے، کتنے گھرانوں میں اختلافات پیدا ہوئے کہ افرادِ خاندان میں فکری اتحاد باقی نہیں رہ گیا تھا۔ یہ سب کچھ ہوا اور جماعت اسلامی کی قیادت میں ہوا۔ لیکن جماعت اسلامی کے یہ خدائی فوجدار کسی قیمت پر بھی کسی مصلحت اور کسی رخصت کا لحاظ کرنے یا کسی سے کوئی سمجھوتہ کرنے کے قائل نہ تھے۔

مولانا مودودی کی شدّت پسندی ظاہر ہے کہ ان رجحانات میں بہت کچھ دخل افراط و تفریط کو بھی تھا بعض باتیں یا تو غلط طور سے سامنے آئیں یا غلط طور پر لوگوں کے سامنے پیش کی گئیں۔ اس وجہ سے جماعت کے مزاج میں بعض پہلوؤں سے انتہا پسندی پیدا ہو گئی۔ کچھ لوگوں نے ان غلط رجحانات کو اپنے امکان کی حد تک راہِ اعتدال پر لانے کی کوشش کی۔ اس طرح کی کوششوں سے جماعت کے اہلِ علم بے خبر نہیں ہیں ——— اس قسم کے رجحانات میں جماعت کے ایک فرقہ کی شکل اختیار کر لینے کے امکانات محسوس ہوتے تھے اس وجہ سے محتاط لوگ چاہتے تھے کہ یہ رجحانات نقطۂ اعتدال پر آئیں۔ لیکن مولانا مودودی صاحب اس وقت تک یہی چاہتے تھے کہ یہ رجحانات شدید سے شدید تر ہوتے جائیں۔ ان کا خیال تھا کہ انبیاء کی دعوت اسی طرح گھر گھر میں لڑائی چھیڑ دیا کرتی ہے۔

حیرت انگیز تبدیلی لیکن پاکستان میں منتقل ہو جانے کے کچھ ہی عرصہ بعد مولانا کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل میں بڑی نمایاں تبدیلی واقع ہو گئی۔ یہ تبدیلی کچھ تو حالات کی تبدیلی کے نتیجہ کے طور پر واقع ہوئی اور اس کا واقع ہونا ضروری تھا۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ وہ حالات کی نسبت سے کہیں زیادہ بدل گئے ہیں۔ یہاں وہ بالکل سیاسی طرز پر سوچنے اور اسی طور پر کام کے نقشے بنانے لگے۔ ان کے اقدار اور پیمانے بھی آہستہ آہستہ

بدلنے لگے۔ یہ پتہ خدائے علام الغیوب ہی کو ہے کہ اس تبدیلی میں اصلی دخل کس چیز کو ہے۔ ممکن ہے پاکستان میں ان کو ایک روشن سیاسی مستقبل کی جھلک دکھائی دی ہو، یہ گمان اس وجہ سے ہوتا ہو کہ وہ اپنے آپ کو قومی اور بین الاقوامی دونوں ہی میدانوں میں ضرورت اور حقیقت سے زیادہ اہمیت دینے لگے تھے۔ ان کے پاس بیٹھنے والوں نے بھی ان کو غلط فہمیوں میں مبتلا کیا اور پامسٹری کے ایک ماہر صاحب نے بھی ان کو سبز باغ دکھائے۔

اس تبدیلی نے ان کو فکری اور عملی دونوں اعتبارات سے اس قدر بدل دیا کہ بالآخر آہستہ آہستہ وہ ہر اس سوراخ میں خود گھسے جس سے دوسروں کو نکالنے کے لئے انھوں نے خدائی فوجدار بن کر قلم کا ڈنڈا چلایا تھا۔ جن چیزوں کو انھوں نے پورے زور اور قوت کے ساتھ حرام کہا تھا ان کو حلال کہا، جن چیزوں کے لیے انھوں نے دوسروں کو مطعون کیا تھا ان کے مرتکب خود ہوئے، جن اصولوں کو مذہب قرار دیا تھا ان کو خود توڑا، جن باتوں کی بناء پر وہ دوسروں پر پھبتیاں چست کرتے تھے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ اب اپنے لیے خود ان باتوں کا بڑی کوشش سے اہتمام کرنے لگے۔

فلسفہ حکمتِ عملی کی ایجاد

ان تبدیلیوں پر جب مولانا نے جماعت کے بہت سے ذی فہم حضرات کو معترض پایا، یہاں تک کہ ان کے سبب سے جماعت کی تاریخ میں بڑے بڑے واقعات پیش آئے اور جماعت کا شیرازہ منتشر ہوتا نظر آیا تو مولانا نے دین میں حکمت عملی کا وہ فلسفہ تصنیف فرمایا جو یہاں زیر بحث ہے۔ اس فلسفۂ جدیدہ کی پہلی اساس تو یہ تھی کہ دین کے رموز کو وہ قائد ہی کچھ سمجھتا ہے جو دین کو بحیثیت ایک تحریک کے دنیا میں برپا کرنے کے لئے لے کر اٹھتا ہے، اس کو دوسرے لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ اس کا دوسرا اصول یہ تھا کہ دین کے کچھ اصول تو ہمیشہ رہنے والے ہیں، مثلاً توحید اور ایمان بالآخرۃ وغیرہ۔ مگر دوسری چیزوں کو حکمت عملی (Practical Wisdom) کے تقاضوں کے تحت قائد تبدیل کر سکتا ہے۔

اس اصول کی دلیل کے طور پر ارشاد ہوا کہ دیکھو، مساوات، اسلام کا ایک بنیادی اصول ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر اس کا وعظ فرماتے رہے۔ لیکن عملی سیاست کا تقاضا چونکہ یہ تھا کہ اپنے بعد خلافت قریش کے سپرد کریں۔ اس لیے اسلام کے اصول مساوات کو توڑ کر

خلافت قریش ہی کے سپرد فرمائی۔

یہ مضمون جب میرے علم میں آیا تو میں یہ بات تو سمجھ گیا کہ اب مولانا میں اور جماعت میں جو تبدیلیاں آگئی ہیں، ان تبدیلیوں کا جواز اس نئے نظریہ کے بغیر ثابت نہیں کیا جا سکتا، اس وجہ سے مولانا اس کے ایجاد کرنے پر مجبور رہیں۔ تاہم میں نے خاص طور پر ملاقات کر کے مولانا کو اس گمراہ کن نظریہ اور اس کے گمراہ کن نتائج کی طرف توجہ دلائی اور عرض کی کہ آپ کے اس نظریہ میں اور ان لوگوں کے نظریہ میں کیا فرق ہے جن سے ہم اب تک برابر لڑتے رہے ہیں۔ مولانا اپنے مشہور تحمّل کے باوجود میری اس مودبانہ گذارش پر برافروختہ ہوگئے۔ اور انھوں نے مجھے چیلنج کیا کہ میں اگر اس نظریہ کو غلط سمجھتا ہوں تو اس کی تردید میں ایک مضمون لکھوں، مولانا از راہِ نوازش اس کو "ترجمان" میں چھاپیں گے اور اس کا جواب دیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ جب بات یہاں تک پہنچ جائے گی کہ میں اور آپ ایک دوسرے کی تردید میں "ترجمان" ہی میں زورِ قلم دکھائیں تو اس سے پہلے میرے لیے جماعت سے الگ ہو جانا مناسب رہے گا۔ میں یہ کہہ کر ان کے پاس سے اُٹھ کر چلا آیا۔

بعد میں جب اس مضمون پر بعض تنقیدیں نکلیں اور ان کے سبب سے جماعتی حلقوں میں کچھ اضطراب نمایاں ہوا تو مولانا نے ایک اور طول طویل مضمون اپنے اس نظریہ کی حمایت میں لکھ مارا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی کہ مسلمان حکمت عملی کے تحت کلمۂ کفر بھی کہہ سکتا ہے، حکمت عملی کے تحت کسی کو قتل بھی کرا دے سکتا ہے، حکمت عملی کے تحت کسی اجنبی عورت کے کپڑے بھی اتار سکتا ہے، حکمت عملی کے تحت جھوٹ بھی بول سکتا ہے، حکمت عملی کے تحت غیبت بھی کر سکتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اور اپنے ان فتوؤں کی تائید میں اپنے زُعم کے مطابق قرآن و حدیث سے دلیلیں پیش کرنے کی کوشش فرمائی۔

ناطقہ سر بگریباں......؟

یہ مضمون جب میرے علم میں آیا تو ان اجتہادات اور ان اجتہادات کے دلائل پر غور و بحث اور ان کی تحقیق و تنقید تو بعد کی چیز تھی، سب سے پہلے یہ سوال ذہن کے سامنے آیا کہ اقامت دین کے جس نصب العین کو مولانا مدظلہٗ لے کر اٹھے تھے اور اس طنطنہ کے ساتھ اُٹھے کہ ناک پر

ملّی بھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے، اس کے پروگرام میں اتنی جلدی آخران چیزوں کی ضرورت کہاں پیش آگئی؟ کیا جماعت اسلامی کا قیام اسی لیے عمل میں آیا تھا کہ مسلمان تقیہ نہیں کر رہے تھے، کسی کو قتل نہیں کرتے تھے، اجنبی عورتوں کے کپڑے نہیں اتارتے تھے، جھوٹ نہیں بولتے تھے، غیبت نہیں کرتے تھے، ان کو بتانا تھا کہ یہ سارے کارنامے .... بغیر کسی خوف لومۃ لائم کے انجام دو، اسلام میں یہ سارے کام مباح ہیں بس شرط یہ ہے کہ حکمت عملی کے ساتھ انجام دو۔

ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ یہ سارے کاروبار ہمارے معاشرے میں ہو رہے ہیں اور دھڑلے سے ہو رہے ہیں۔ پھر آخر اس کی کیا ضرورت پیش آئی کہ مولانا اپنے زبان و قلم کی صلاحیتیں بھی اسی کاروبار کو چمکانے اور فروغ دینے کے لیے مصروف کر دیں؟ اگر مولانا کو یہ خیال ہے کہ ان چیزوں کے حق میں شرعی دلائل موجود نہیں تھے۔ اس وجہ سے لوگ ان کاموں کو ذہن اور ضمیر کی آزادی کے ساتھ نہیں کر رہے تھے، ڈر تھا کہ مبادا آگے چل کر یہ کاروبار مندا پڑ جائے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ کاوش کر کے مولانا ان کے جواز و استحسان کے دلائل فراہم کر دیں۔ تو یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ ہمارے بہت سے پرانے فقیہوں نے بھی یہ خدمت انجام دی ہے اور بہت سے نئے فقیہہ بھی یہی خدمت انجام دے رہے ہیں بلکہ اس اعتبار سے تو ہمارا ملک بڑا خوش قسمت ہے کہ یہاں اس کار خاص کے لئے ادارے قائم ہیں جن کے اعضا و ارکان اس مقصد کے لیے سرکار سے وظائف پاتے رہے ہیں کہ مسلمان جن چیزوں کو منکر یا حرام سمجھ کر ان پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں ان کے حق میں شرعی دلائل فراہم کریں۔ پھر جو کام اس اہتمام کے ساتھ ہو رہا ہے کیا ضروری تھا کہ مولانا بھی اس کو اپنے اقامت دین کے پروگرام میں شامل فرما لیتے۔

میرے ذہن میں یہ سوالات بھی پیدا ہوئے اور مولانا کے دلائل کی نوعیت کو دیکھ کر زمانہ کے اس حیرت انگیز انقلاب پر تعجب بھی ہوا کہ، ابھی کل کی بات ہے جب ہم مولانا مدظلہ کی قیادت میں اپنے پرانے اور نئے فقیہوں کی مرتب کی ہوئی کتاب الحیل کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور اب یہ حال ہے کہ مولانا اسی کتاب الحیل کو صحیفۂ اسلامی کا اصلی گم شدہ ورق سمجھ رہے ہیں جو نہیں معلوم کتنی کاوشوں سے انھیں ہاتھ آیا ہے۔

مولانا کے مذکورہ مضمون پر تنقید کرنا میں اپنا دینی فرض سمجھتا تھا۔ لیکن سفر حج پیش آجانے کے سبب میں یہ خدمت انجام نہ دے سکا۔ اللہ تعالیٰ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے اپنے رسالہ "الفرقان" میں اس مضمون پر تنقید کی اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، نہایت عمدہ تنقید

کی لیکن مولانا مودودی صاحب نے اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس پر اس غیظ وغضب کا اظہار فرمایا ہے جس کے شواہد کا حوالہ میں صدر مضمون میں دے چکا ہوں۔

اس غیظ وغضب کے اظہار کے بعد مولانا نے اپنے موقف کی تائید اور وضاحت میں دو باتیں بطور دلیل کے بیان فرمائی ہیں۔ اب میں مختصر طور پر ان کا بھی جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ لیکن اس جائزے سے پہلے میں اس اصل نزاع اور اختلاف کو سامنے رکھ دینا چاہتا ہوں جو ہمارے اور مولانا مدظلہٗ کے درمیان ہے۔

اصلی نزاع ہمارے اور مولانا کے مابین نزاع یہ نہیں ہے کہ دین وشریعت میں حکمت ومصلحت کا لحاظ ہے یا نہیں ہے۔ ظاہر ہو کہ دین وشریعت کی ہر بات نہایت گہری حکمت ومصلحت پر مبنی ہو۔ خواہ یہ حکمت ومصلحت ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ دین کی ہر چھوٹی بڑی بات کے اندر حکمت ومصلحت کے وجود پر ہمارا ایمان ہے اور ہم اس کی جستجو اور تلاش کو بھی ایک نہایت اعلیٰ کام سمجھتے ہیں۔

اس امر میں بھی اختلاف نہیں ہے کہ دین کے قائم کرنے کی جدوجہد میں ان حکمتوں اور مصلحتوں کو ملحوظ رکھا جائے یا نہیں جو دین کی باتوں میں مضمر ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ حکمتیں اور مصلحتیں جو دین کے اندر مضمر ہیں، دین ہی کا جزو ہیں، ان کا لحاظ واہتمام دین ہی کا اہتمام ہے، اس باب میں اختلاف ہو سکتا ہے تو اس امر میں ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص دین کی کسی بات کی کوئی من مانی حکمت بیان کرے اور اس کی آڑ لے کر دین کے اس حکم میں کتر بیونت شروع کر دے۔ لیکن نفس حکمت کے لحاظ واہتمام پر کس کو اختلاف ہو سکتا ہے۔

ہمارے اور مولانا کے درمیان اصلی نزاع جو ہے وہ یہ ہے کہ دین کو بحیثیت ایک تحریک کے لے کر چلنے والے قائد کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ حکمت عملی یا عملی سیاست کے تقاضوں کے تحت دین کے کسی حکم میں کوئی ردّ و بدل کر سکے؟ کسی جائز کو ناجائز یا کسی ناجائز کو جائز ٹھہرا سکے؟ شریعت کے کسی حکم کو مقدم یا مؤخر کر سکے؟ مولانا فرماتے ہیں یہ اختیار اس کو حاصل ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ شریعت میں اس قسم کے تصرف کا اختیار اللہ اور اس کے رسولؐ کے سوا کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔

مولانا مودودی صاحب کے "ہاں" کہنے کے جو وجوہ اور جو دلائل ہیں وہ مولانا اپنے مضامین میں پیش کر چکے ہیں اور مولانا عتیق الرحمٰن صاحب ان پر "الفرقان" (لکھنؤ) میں مفصل تنقید کر چکے ہیں۔ جو شخص ان دونوں نقطہ ہائے نظر میں موازنہ اور محاکمہ کرنا چاہے وہ ان مضامین کو پڑھ لے۔

ہمارے پاس "نہیں" کہنے کے جو وجوہ ہیں ان کو حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب اور عتیق صاحب اپنے

اپنے مضامین میں اس سے پہلے پیش کرچکے ہیں اور اب مختصر طور پر میں بھی اپنے الفاظ میں ان کو بیان کیے دیتا ہوں۔

میرے نزدیک مولانا کے اس نظریے کا ہر جزو مغالطہ انگیز اور گمراہ کن ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے:-

بہت بڑا مغالطہ اوّل تو اسلام کو نری ایک تحریک سمجھ کر اٹھانا اور لے چلنا ہی ایک بہت بڑا مغالطہ ہے۔ اگر اب تک ہمیں اس کے مغالطہ ہونے میں کچھ تذبذب تھا تو اب تو مولانا نے اچھی طرح ثابت کر دیا کہ فی الواقع یہ بہت بڑا مغالطہ ہے۔

اس حقیقت سے کون شخص انکار کرسکتا ہے کہ تحریکوں میں وقتی مصلحتیں، سیاسی حکمت عملیاں لیڈر یا لیڈروں کی تدبیریں اور چالیں ہی اصلی عوامل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ ان میں اپنی صوابدید اور اپنی ذہانت کی رہنمائی میں موسم اور ہوا کا رخ دیکھ کر ردّ و بدل کرتے رہتے ہیں۔ نہ ان کے لئے معین حدود و قیود کی پابندیاں ہوتی ہیں، نہ ان کے آگے پیروی کے لیے کوئی اسوہ ہوتا ہے۔ وہ خود ہی کوزہ اور خود ہی کوزہ گر ہوتے ہیں۔ اگر عوام کو بھڑکانے کے لیے ضرورت محسوس کریں گے تو اپنی الکشنی سرگرمیوں کو بھی بدر و حنین کے غزوہ سے تعبیر کریں گے اور اس جہاد سے الگ رہنے والوں کو مرتدو مردود ٹھہرائیں گے اور اگر ہوا کا رُخ خلاف دیکھیں گے تو یہ بدر و حنین کے مجاہدین اس طرح بلوں میں جا گھسیں گے جس طرح بلی کو دیکھ کر چوہے بلوں میں جا گھستے ہیں۔ اگر موسم سازگار پائیں گے تو گلے پھاڑ پھاڑ کر اعلان کریں گے کہ "وقت آگیا ہے" کہ کرسیوں والے اپنے اقتدار کی کرسیاں ان کے لئے خالی کر دیں لیکن اگر شومیٔ تقدیر سے اثنائے تقریر ہی میں موسم بدلتا نظر آئے تو زور تقریر کے جھاگ خشک ہونے سے پہلے ہی اپنے مجاہدین کو ہدایات دیں گے کہ اپنی وردیاں پھینک دو، اپنی تلواریں توڑ دو، اپنے بورڈ اتار دو، اپنے اعلانوں کو گھس گھس کے مٹا دو، اپنے نعروں اور ناموں پر سیاہیاں پھیر دو اور اپنے گھروں کے دروازے بند کرلو۔

اس کے برعکس جو لوگ خدا کے دین کی اقامت کے لئے اٹھتے ہیں ان کی رہنمائی کے لئے خود خدا کے مقرر کئے ہوئے حدود و قیود ہوتے ہیں اور اس جد وجہد کے ہر مرحلہ میں پیروی کے لیے ان کے سامنے نبیوں اور رسولوں کا اسوۂ حسنہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ ہمیشہ خدا کی ہدایت کی روشنی میں چلتے ہیں۔ ان کی جد وجہد کو یہ افتاد کبھی نہیں پیش آتی کہ وہ اٹھیں تو آندھی کی طرح اور بیٹھ جائیں بلبلے کی طرح۔ وہ طوفانوں کے زور کے ساتھ بھی چلیں گے تو اس میں بھی نسیم صبح

کی خوش ادائی اور باد بہاری کی عطر بیزی اور مشک افشانی ہوگی۔ تحریکوں والے تنہا اپنے اعتماد پر چلتے اور چلاتے ہیں اس وجہ سے اگرچہ وہ اپنی ذہانت کی دوربین سے دس سال کی مسافت تک مستقبل کے پردوں میں جھانک کر دیکھ لیتے ہوں لیکن خدا کی روشنی سے محروم ہونے کے سبب سے جب وہ ٹھوکر کھاتے ہیں تو بسا اوقات اپنی ناک کے نیچے کے پتھر سے ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ اور جب گرتے ہیں تو ان کو سنبھلنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن اقامت دین کے خادموں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ اگر اپنی کسی لغزش کے سبب سے گرتے بھی ہیں تو اپنے رب کے دروازے ہی پر گرتے ہیں اور ان کا رب ان کو اُٹھاتا اور سنبھالتا ہے۔

لفظ کی تاثیر یہ نہ خیال فرمایئے کہ لفظ میں کچھ نہیں ہوتا۔ لفظ میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ اگر لفظ میں کچھ نہیں ہوتا تو آخر آپ نے اور ہم نے تحریک کے لفظ کو اسلام کے سابقہ یا لاحقہ کی کی حیثیت سے استعمال کرنا کیوں ضروری خیال کیا۔ اس کی وجہ یہی تو ہے کہ آپ جس مدعا کو تعبیر کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے اسلام یا دین کے لفظ کو یا اس کے لیے دعوت یا اقامت کے لفظ کو کافی نہیں سمجھتے۔ اسلئے آپ نے تحریک کا لفظ اختیار فرمایا۔ آپ کہتے ہیں کہ آپ تحریک کے لفظ سے اسلام کے صرف حرکتی پہلو کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں، لیکن تحریک کا لفظ وقت کی ایک نہایت معروف اصطلاح ہے، اس کے لوازم اور مضمرات بہت وسیع ہیں اور اس کی شہرت و عمومیت کے سبب سے اس کے ان لوازم و مضمرات کو ہماری سڑکوں پر چلنے والا ایک راہ گیر بھی سمجھتا ہے۔ کس طرح ممکن ہے کہ ایک ایسی معروف اصطلاح کو آپ اسلام کا سابقہ اور لاحقہ بنا کے رکھ دیں اور لوگ اس کے تمام لواحق و تضمنات کو نظر انداز کر کے اس کے اسی ایک پہلو کو لیں جو آپ کے پیش نظر ہے۔ یہ آپ کے گھر کی اصطلاح تھوڑے ہی ہے کہ جو معنی آپ اس کے قرار دیں وہی دوسرے بھی قبول کر لیں۔

چنانچہ دیکھ لیجئے آپ نے تحریک کا لفظ اسلام کے لیے استعمال کیا اور تحریک کے سارے لوازم خود آپ ہی کے ہاتھوں آموجود ہوئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رسول اللہ سے لیڈر بن گیے، دین کی حکمتوں نے حکمت عملی یا عملی سیاست کی شکل اختیار کر لی اور پھر اس تحریک کے لیڈروں کی حکمت عملی ہی سارے دین پر حکمراں بن گئی اور اس حکمت عملی کی پناہ میں بیٹھ کر آپ نے سارے دین کی اس طرح کتر بیونت شروع کر دی ہے گویا یہ اللہ کا دین نہیں بلکہ پاکستان کے سابق وزیر داخلہ کے

ہاتھ میں ہندوؤں کی کوئی متروکہ جائداد ہے۔

تحریک اسلامی کے قائد کا لفظ بھی نہایت مغالطہ انگیز ہے۔ قائد سے آپ کی کیا مراد ہے۔ اگر اس سے مراد حضور نبی کریمؐ ہیں تو گو میں حضور کے لیے قائد یا لیڈر کے لفظ کے استعمال کو سوء ادب سمجھتا ہوں۔ تاہم اس سے غض بصر کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ حضورؐ تو یہ ردّ و بدل خدا کی ہدایت کے تحت کرتے تھے۔ یہ مقام کسی دوسرے کو کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟ دوسرے قائدوں کو یہ اختیار تو اسی شکل میں حاصل ہو سکتا ہے جب خدا اور رسولؐ نے ان کو یہ اختیار دیا ہو۔ بعض اختیارات ایسے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی استعمال فرمائے اور شرائط و حدود کے تعین کے ساتھ اپنے بعد کے دینی قائدوں کو بھی بخشے مثلاً اجتہاد کا حق حضورؐ کو بھی حاصل تھا اور آپ نے یہ حق دین کے علماء کو بھی دیا۔ لیکن دین میں کسی ترمیم و تغیر اور کسی ردّ و بدل کا حق نہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو بخشا ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

پرویزیت سے ہم آہنگی یہاں اس بات کی طرف اشارہ غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ دین میں ردّ و بدل کا جو اختیار مولانا مودودی صاحب تحریک اسلامی کے قائد کو دیتے ہیں بعینہ اسی اختیار کا مطالبہ غلام احمد پرویز صاحب اپنے مزعومہ مرکز ملت کے لیے کر رہے ہیں اور اس معاملہ میں ان کو مولانا مودودی صاحب پر اسبقیت کا شرف حاصل ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مولانا نے اپنا چراغ انہی کے چراغ سے جلایا ہے۔ میں صرف توارد فکر کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ اس طرز فکر کے بعض دوسرے اصحاب بھی اپنے اپنے لفظوں میں یہی بات کہہ رہے ہیں۔ فرق اگر ہو گا تو طرز تعبیر میں ہو گا حقیقت ایک ہی ہے۔ یہ لوگ یہ بھی آشکارا طور پر کہتے ہیں کہ قائدین کو یہ ردّ و بدل من مانے طور پر نہیں کرنا چاہیئے بلکہ حکمت عملی کے تحت کرنا چاہیئے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ کام دین کے مصالح کے تحت ہونا چاہیئے۔

"حکمت عملی" کا لفظ بھی بڑا گمراہ کن ہے۔ حکمت عملی کا لفظ تو، مولانا معاف کریں۔ سیاسی بازیگری اور چالاکی کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ اگر مولانا نے اس لفظ کو اس سے کسی اونچے معنیٰ میں استعمال فرمایا ہے یعنی اس سے ان کی مراد دین کی مصلحتیں ہیں تو بات اسی اصطلاح میں کرنی تھی۔ ورنہ تحریک اور قائد اور حکمت عملی تینوں اقانیم کے جمع ہو جانے کے بعد تو دین فی الواقع

ایک بازیچۂ سیاست ہی بن کے رہ جاتا ہے۔ لیکن اگر اس سے مراد دینی مصلحتیں ہیں جب بھی میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ ان کے نام پر دین میں کوئی ردوبدل کیا جاسکتا ہو۔ مصلحتیں دین کے لیے ہیں دین مصلحتوں کے لیے نہیں ہے۔

بظاہر یہ بات بہت بے ضرر سی معلوم ہوتی ہے کہ دین ہی کی خاطر مولانا جیسے ارباب بصیرت لوگ دین میں تھوڑا سا تصرف کرلیا کریں تو اس میں کیا قباحت ہے۔ لیکن آخر کچھ بھید تو ہے کہ یہ اصول نہ تو قرآن مجید نے بیان کیا، نہ نبی (صلعم) نے بیان فرمایا اور نہ ہمارے اسلاف ہی میں سے کسی نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں بھید دراصل یہ ہے کہ اگر یہ ڈھیلا ڈھالا اصول لوگوں کے ہاتھوں میں پکڑا دیا جائے کہ تم دین کی مصلحتوں کو سامنے رکھ کر دین کی کسی بات کو اختیار اور کسی بات کو ترک کرسکتے ہو تو پھر دین کے معاملہ میں بالکل امان ہی اُٹھ جاتی ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ اسکے استعمال کا حق آپ افراد کو دیں گے یا اقامت دین کی تحریک کے قائدوں کو۔ جس کے ہاتھ میں بھی یہ حربہ آپ پکڑا دیں گے وہ سارے دین کا تیا پانچہ کرکے رکھدے گا۔

اصولِ حکمتِ عملی کے روح فرسا نتائج

فرض کیجیے آپنے افراد کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ دین کی بڑی مصلحتوں کی خاطر دین کی کسی بات کو ترک اور کسی بات کو اختیار کرسکتے ہیں، تو سوچیے اس کے نتائج کیا کیا نکل سکتے ہیں۔

ایک صاحب نماز باجماعت اور روزہ کی پابندی ترک کردیتے ہیں کہ میں اقامت دین کے لیے کتابیں اور مضامین لکھنے میں مصروف رہتا ہوں، مسجد کی حاضری سے میرے اوقات کا نقصان ہوتا ہے اور روزوں سے میری صلاحیتِ کار متاثر ہوتی ہے۔

ایک صاحب کبھی کبھی سینما تشریف لے جایا کرتے ہیں اور مصلحت دینی ان کے پیش نظر یہ ہے کہ اس دور میں وہ شیطان کی ترقیوں سے آگاہ رہیں اور اللہ کے بندوں کو اس کے نئے نئے ہتھکنڈوں اور حربوں سے آگاہ کرسکیں۔

ایک صاحب شب میں تھوڑی سی پی لیا کرتے ہیں کہ ان کو ہر روز اسلامی انقلاب کے داعی اخبار کے لیے جو مقالات لکھنے پڑتے ہیں اس کے بغیر وہ دین کی یہ خدمت انجام ہی نہیں دے سکتے۔

ایک صاحب اپنی صاحبزادی کا نکاح کسی ملحد و بے دین سے کردیتے ہیں۔ تاکہ صاحبزادی اس کو

اپنے دام محبت میں پھنسا کر دین کی طرف لائیں۔

ایک صاحب اپنی صاحبزادی کو پردہ کی قیود سے آزاد کر دیتے ہیں کہ لڑکی کالج آتے جاتے برقعہ کی پابندیوں کے ساتھ اپنے ناموس کی حفاظت کے لیے پوری طرح آزاد نہیں رہتی۔

ایک صاحب اپنی صاحب زادی کو انہی تعلیم گاہوں میں، جن کو ہم قتل گاہیں کہتے رہے ہیں، بھیج دیتے ہیں کہ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو اعلیٰ سوسائٹی کی خواتین میں تبلیغ دین کے لیے مبلغات کہاں سے ہاتھ آئیں گی۔

ایک صاحب نوخیز متبرجات کے ساتھ بازاروں میں شاپنگ کرتے پھرتے ہیں کہ یہ ان کی عزیز خواتین ہیں جو گو پردہ کی عادی نہیں ہیں لیکن اسلام سے شغف رکھتی ہیں اور توقع ہے کہ اگر ان کے ساتھ محبت کے روابط رکھے جائیں تو یہ ایک دن تحریک اسلامی کے لیے کام کرنے والی خواتین کی صف اول میں آجائیں گی۔

اس طرح کی بے شمار مثالیں فرض کی جا سکتی ہیں۔ آپ دیکھ لیجئے۔ ان میں سے ہر شکل میں ایک بڑے دینی مقصد کی خاطر ایک چھوٹے دینی حکم کو قربان کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کسی خاص مثال کے بارے میں آپ کو اختلاف ہو کہ نہیں۔ اس میں ایک چھوٹی مصلحت کے لیے بڑا حکم قربان کر دیا گیا ہے۔ لیکن یہ ایک اختلاف رائے کی قسم کی چیز ہے۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ میرے نزدیک اس زمانے میں اسلام کے نقطۂ نظر سے فلاں چیز نہیں بلکہ فلاں چیز زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

فرض کیجئے آپ کہتے ہیں کہ ہم مصلحتوں کے اس فارمولے کے تحت معاملات دین میں ترک و اختیار کا یہ حق عام افراد کو نہیں بلکہ صرف تحریک اسلامی کے قائد کو دیں گے۔ لیکن اس سے اس اصول کی فتنہ انگیزی میں کوئی خاص فرق نہیں پیدا ہوگا۔ اگر پیدا ہوگا بھی تو وہ فرق یہ نہیں ہوگا کہ فتنے کم ہو جائیں گے بلکہ یہ ہوگا کہ یہ فتنے شدید تر اور قوی تر ہو جائیں گے۔ اسلام کے نام پر اس اصول کو استعمال کرنے والا قائد بڑی آسانی کے ساتھ چند سالوں کے اندر اندر ایک بالکل نیا دین بنا کر کھڑا کر سکتا ہے اور کوئی مائی کا لال بھی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا ــــــ اب آئیے دیکھئے ایک قائد اگر اس ڈھیلے ڈھالے اصول کو پا جائے تو وہ اس کی رہنمائی میں کیا کچھ کر سکتا ہے۔

فرض کیجئے ایک قائد یہ رائے قائم کر لے کہ اقامت دین کے نصب العین کے لیے اس وقت اصلی کام لٹریچر کو پھیلانا، لوگوں سے ملنا جلنا، دوڑ دھوپ کرنا، دیواروں پر پوسٹر چسپاں کرنا، جلوس نکالنا، اور چندے اکٹھے کرنا ہے تو وہ ان کاموں کی خاطر روزہ نماز، تراویح اور تلاوت کی پابندیوں میں

لوگوں کو ڈھیل دے سکتا ہے۔ کیونکہ اختیار اہون کا اصول اس کا مقتضی ہے۔

اسی طرح اگر وہ اسلام کی سربلندی کی ہی فکر میں اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ جب تک اس کی ذات اس ملک کے لوگوں کے ذہنوں پر پوری طرح مسلط نہیں ہو جائے گی اس وقت تک اس ملک میں اسلام کے لئے راہ نہ کھلے گی۔ اور پھر وہ اس نتیجہ پر بھی پہنچ جائے کہ لوگوں کے ذہنوں پر اس طرح مسلط ہونے کے لئے اس زمانے میں ضروری ہے کہ اخبارات میں اس کے فوٹو چھپیں، اسٹیشنوں اور چوراہوں پر اس کے جلوس نکلیں۔ جلسوں میں اس کو سپاس نامے پیش کیے جائیں، لوگ اس کے نام کے نعرے لگائیں اور اونٹ اور گھوڑے اس کو سلامیاں دیں تو مذکورہ بالا اصول کی روشنی میں اس کے لیے یہ بات بالکل جائز ہوگی کہ وہ اپنے لیے ان ساری چیزوں کا اہتمام خود بھی کرے اور دوسروں سے بھی کرائے۔ یہ باتیں دین کے نقطۂ نظر سے معیوب و مکروہ سہی لیکن ایک اعلیٰ مقصد کے لئے ان مکروہات کو گوارا کرنا پڑے گا۔ ورنہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ اسلام کو پست اور ذلیل دیکھنے پر راضی رہے۔

اسی طرح فرض کیجئے کہ وہ اقامت دین ہی کے عشق اور غم میں اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ اس زمانہ میں خواتین کے طبقہ میں، بالخصوص جدید تعلیم یافتہ خواتین کے طبقہ میں، اگر کچھ کام کر سکتی ہیں تو بے پردہ خواتین ہی کر سکتی ہیں، پردہ دار خواتین کے بس کا یہ روگ نہیں ہے تو اس کے لیے یہ بات بالکل جائز بلکہ مستحسن ہوگی کہ یا تو وہ پردے کے اٹھا دینے کی عام ہدایت جاری کر دے اور اگر وہ فی الوقت اس میں کچھ رکاوٹیں محسوس کرے تو کم از کم یہ کرے کہ خاص کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اندر اقامت دین کے لیے بے پردہ لڑکیوں کی ایک ٹیم مرتب کر لے ــــ بے پردگی اگرچہ اسلام میں ناجائز ہے لیکن اقامت دین کے اعلیٰ مقصد کے لیے اس اہون ناجائز کو نہ گوارا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم چاہتے ہیں کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کا ماحول بالکل تاریک ہی رہ جائے۔

اسی طرح فرض کیجئے کہ وہ اپنے ملک میں ہونے والے انتخابات کے متعلق یہ رائے قائم کر لیتا ہے کہ اس ملک میں اسلامی نظام کا قیام اس امر پر منحصر ہے کہ ہونے والے انتخابات میں اس کو اور اس کی پارٹی کو کامیابی حاصل ہو تو مذکورہ بالا اصول کی روشنی میں اس کے لیے یہ بات بالکل جائز ہو گی کہ جو ووٹ اس کو پیسے دیئے بغیر نہ حاصل ہو سکتے ہوں ان کو بے تکلف پیسے دیکر خریدے اور خرید وائے۔ پیسے دیکر ووٹ خریدنا ناجائز سہی۔ لیکن اسلامی نظام کے اعلیٰ مقصد کے لئے اگر اس گناہ کو نہ گوارا کیا گیا

تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کا معاملہ محض ایک اہون معصیت کے اندیشہ سے خطرہ میں ڈال دیا جائے۔

یہ میں نے اس اصول کے چند بدیہی نتائج بطور مثال پیش کیے ہیں۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہو تو میں اس طرح کی سینکڑوں مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ اس اصول کو اپنا لینے کے بعد قائد کی دستبرد سے دین کی کوئی چیز بھی نہیں بچ سکتی۔ وہ جس چیز کی بساط جب چاہے گا لپیٹ کر رکھ دے گا۔ یہاں تک کہ دین کے بالکل بنیادی عقائد بھی، جن کے تحفظ کا مولانا مودودی اطمینان دلاتے ہیں، اس اصول کی زد سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ مولانا اگر میرے اس دعوے کو غلط سمجھتے ہوں تو میں اس بات کے لیے تیار ہوں کہ مولانا دین کی کسی چیز کا بھی نام لیں، عام اس سے کہ اس کا تعلق عقائد سے ہو یا عبادات سے، یا معاملات سے، یا اخلاق سے، میں انشاء اللہ دکھا دوں گا کہ اس اصول کی بے پناہ قینچی کس طرح اس کو کتر کے رکھ دے سکتی ہے بلکہ اگر مولانا چاہیں تو میں ایسی مثالیں بھی پیش کر سکتا ہوں جو ثابت کر سکتی ہیں کہ ایک قائد اس اصول سے فائدہ اٹھا کر اسلام کے نام پر اس ملک کے امن و امان کو بھی غارت کر دے سکتا ہو لیکن مصالح کے خیال سے میں اس قسم کی مثالیں پیش کرنے سے احتراز کرتا ہوں۔

یہ برہمی کیوں؟ مولانا اپنے زیر بحث مضمون میں اس بات پر بہت برہم ہوئے ہیں کہ حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے ان پر ووٹ خریدنے کے جواز کے فتوے کا ایک بے بنیاد الزام لگایا ہے۔ میں مانے لیتا ہوں کہ آپ نے ووٹ کی خریداری کا فتویٰ نہیں دیا۔ لیکن آخر آپ اس بات پر اس قدر برہم کیوں ہیں اور اس کو اپنے اوپر ایک تہمت کیوں خیال فرماتے ہیں۔ آپ کے قائم کردہ اصولِ فقہ اور اعلان کردہ اصولِ اجتہاد سے صریح طور پر جو بات جائز ٹھہرتی ہے آخر آپ نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا کیوں نہیں؟ ووٹوں کے اتنے ضروری کام اور اہم کاروبار میں اگر آپ نے اپنے اس اصول سے فائدہ نہیں اٹھایا تو یہ محض آپ کا ایک بے جا تکلف ہے، اپنے لگائے ہوئے اس درخت کے پھل کھانے کے سب سے زیادہ حق دار تو آپ ہی تھے۔ اگر اس اصول کو قائم کر لینے کے بعد بھی آپ ووٹوں کی خریداری میں کوئی شرعی قباحت سمجھتے ہیں تو ازراہِ افادہ اس کو بیان فرما دیجئے تاکہ دوسرے بھی اس نکتہ فقہی سے مستفید ہو سکیں۔

مولانا کی ایک غلط فہمی

مولانا مدظلہ کی اصلی غلط فہمیاں تو میں آگے چل کر واضح کروں گا۔ لیکن ان کی ایک غلط فہمی کی طرف اشارہ کر دینے کے لیے میرے اس مضمون میں موزوں مقام آگیا ہے۔ وہ غلط فہمی یہ ہے کہ مولانا اپنے اس اصول کو اور شریعت اسلامی کے اصول، اختیار اہون البلیتین کو بالکل ایک چیز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں میں آسمان وزمین کا فرق ہے۔ بلکہ اگر میں ان دونوں کے فرق کو کفر اور اسلام کے فرق سے تعبیر کروں تب بھی شاید کوئی زیادتی نہیں کروں گا۔

اختیار اہون البلیتین کا جو اصول ہے اس کا مدعا تو یہ ہے کہ جب ایک مسلمان کے سامنے زندگی میں کوئی ایسا موڑ آجائے جہاں دو برائیوں میں سے کسی ایک برائی کو اختیار کیے بغیر کوئی چارہ ہی باقی نہ رہ جائے تو شریعت اس مسلمان کو اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ ان دونوں برائیوں میں سے اس برائی کو اختیار کرے جو اس کی دنیا اور عاقبت کے نقطہ نظر سے کم ضررناک ہو۔ مثلاً ایک مسلمان کے سامنے ایک طرف تلوار رکھ دی جاتی ہو اور دوسری طرف اظہارِ کفر کا مطالبہ اور اس کو یقین ہے کہ اب ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کیے بغیر چارہ نہیں تو اس کو اس بات کی رخصت ہو کہ وہ ظاہری طور پر کفر کا اظہار کر کے اپنی جان بچالے جائے۔ اگرچہ کفر کا محض زبان سے اظہار بھی ایک مسلمان کے لیے نہایت گھناونی چیز ہے۔ لیکن ایک مسلم کا قتل ہو جانا اس سے کہیں شدید تر ہے۔ اس وجہ سے عقل اور فطرت بھی یہ گواہی دیتی ہے کہ اسے قتل کے مقابل میں اظہار کفر کو گوارا کر لینا چاہیئے اور اسی بات کی اجازت اسکو اسلام نے بھی دی ہے۔

برعکس اس کے مولانا کا اصول اگر اسکی بہتر سے بہتر اور پاکیزہ سے پاکیزہ تعبیر بھی کی جائے تو یہ بنتا ہے، کہ تحریک اسلامی کا قائد "حکمت عملی" یا "عملی سیاست" یا "اقامت دین کے مصالح" کے تحت دین کے احکام و قوانین میں سے کسی کو ترک، کسی کو اختیار کر سکتا ہے، کسی ناجائز کو جائز ٹھہرا سکتا ہے، کسی مقدم کو مؤخر، کسی مؤخر کو مقدم کر سکتا ہے۔ مثلاً مولانا فرماتے ہیں کہ غیبت اسلام میں بہت بڑا گناہ ہے۔ لیکن محدثین نے دین کی مصلحت کے تحت راویوں کی غیبت کو کار ثواب سمجھ کر اختیار کیا۔

مولانا ان دونوں اصولوں کو ایک چیز سمجھتے ہیں حالانکہ ان دونوں میں، جیسا کہ میں نے عرض کیا، آسمان وزمین کا فرق ہے۔ میں پہلے ان دونوں کے درمیان جو بنیادی فرق ہے اس کو

واضح کرتا ہوں، اس کے بعد مولانا کی دی ہوئی مثالوں کی تحقیق کروں گا۔

پہلا فرق تو ان دونوں کے درمیان بنیادی یہ ہے کہ اختیار اہون البلیتین کے اصول میں انتخاب دو ناگزیر برائیوں میں سے ایک کا جائز قرار دیا گیا ہے۔ بلیتین کا لفظ خود اس حقیقت پر گواہ ہے۔ یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ اسی طرح کا انتخاب آدمی کو ایک اہم اور ایک اس سے اہم تر حکم کے درمیان بھی کر لینے کی اجازت ہے۔ برعکس اس کے مولانا یہ اصول انتخاب دو ناگزیر بھلائیوں یا بالفاظ دیگر دو واجب الاطاعت احکام شریعت کے درمیان استعمال کر رہے ہیں۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ اہون البلیتین والے اصول میں اصلی چیز جو فیصلہ کن ہے وہ آدمی کا حالت اضطرار میں پھنس جانا ہے۔ یعنی آدمی کی جان یا اس کے ایمان یا اس کے ناموس کے لیے کوئی حقیقی خطرہ پیش آ گیا ہو اور اس کے لیے اس کے سوا کوئی مفر ہی نہ باقی رہ گیا ہو کہ دونوں برائیوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرے۔ یہ بات نہیں ہے کہ روزمرّہ کی چلتی پھرتی زندگی میں بھی جو دو برائیاں اسکے سامنے آتی جائیں ان میں سے ایک کو اختیار کرتا اور دوسری کو چھوڑتا جائے۔ برعکس اسکے مولانا کے اصول میں اصلی فیصلہ کن چیز عملی سیاست یا بہتر سے بہتر الفاظ میں کہیے تو مصلحت اقامت دین ہے۔ اگر قائد کا دل ٹھک جاتا ہے کہ آج فلاں ناجائز کو جائز ہونا چاہیے حکمت عملی یا مصلحتِ دین اس کا تقاضا کر رہی ہے، تو وہ اس حرام کو جائز کر دے سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ حالت اضطرار کی پیش آ گئی ہو۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ اہون البلیتین کا اصول صرف مجبور کن حالات کے لیے رخصت کی ایک راہ کھولتا ہے، وہ کوئی اقامت دین کی تحریک کا فلسفہ نہیں پیش کر رہا ہے۔ برعکس اس کے مولانا اپنے اصول کو تحریک اقامت دین کے ایک بنیادی فلسفہ کی حیثیت سے پیش فرما رہے ہیں۔

اگرچہ یہ تینوں فرق مولانا کے اصول اور اہون البلیتین کے اصول میں بالکل واضح اور بدیہی ہیں لیکن میں دو کو نظر انداز کر کے صرف حالت اضطرار کے فرق کے متعلق سوال کرتا ہوں کہ یہ ایک حقیقت ہے یا نہیں کہ مولانا کے اصول میں حرام کو حلال کرنے والی چیز حکمت عملی اور مصلحت ہے اور اہون البلیتین کے اصول میں اضطرار؟ اگر مولانا اہون البلیتین کے اصول میں اضطرار کو لازمی چیز نہیں مانتے تو پھر وہ اس بات کو تسلیم کریں کہ بغیر کسی اضطرار کے

بھی مسلمان کو یہ اجازت ہے کہ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ہر بڑی برائی کے مقابل میں چھوٹی برائی بے تکلف اختیار کرلیا کرے، مثلاً یہ کہ شراب تو نہ پئے لیکن بھنگ یا چرس یا افیون سے شغل فرمالیا کرے۔ زنا تو نہ کرے لیکن بوس و کنار کی حد تک مضائقہ نہیں، کسی کو قتل تو نہ کرے لیکن دو چار ڈنڈے رسید کردیا کرے۔ اور اگر مولانا اہون البلیتین کے لیے حالت اضطرار کو شرط لازم مانتے ہیں تو یہ تسلیم کریں کہ ان کے اصول میں اور اہون البلیتین کے اصول میں بنیادی فرق ہے اور انھیں اپنے بنائے ہوئے اصول کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اس اصول کا بطور دلیل حوالہ نہیں دینا چاہیئے۔

ممکن ہے مولانا نے عتیق الرحمٰن صاحب کی تنقید کے بعد پوزیشن سنبھالنے کے لیے جس طرح حکمت عملی اور مصلحت وغیرہ کے مجمل الفاظ کی وضاحت اقامت دین کے مصالح سے کردی ہے۔ میری ان معروضات کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر اپنا موقف تبدیل کرنے کی کوشش فرمائیں اور یہ کہیں کہ حکمت عملی اور مصلحت وغیرہ کے الفاظ سے ان کی مراد بھی یہی ہے کہ اگر کوئی حالت اضطرار پیش آجائے تو قائد تحریک اسلامی بھی کسی حرام کو حلال کرسکتا ہے۔ اگر مولانا یہ موقف اختیار فرماتے ہیں تو میری گذارش یہ ہے کہ وہ خواہ مخواہ حکمت عملی اور (Practical Wisdom) اور مصالح اقامت دین وغیرہ کی اصطلاحات بول کر مرعوب کرنے کے بجائے سیدھے سادے طریقہ پر یوں بات کریں کہ جس طرح اہون البلیتین کے اصول کے تحت شریعت نے ہر مسلمان کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ دو برائیوں میں اہون کو اختیار کرلے اسی طرح تحریک اسلامی کے ایک قائد کو بھی یہ رخصت ہے کہ حالت اضطرار ومخمصہ میں کسی ناجائز کو جائز بنالے۔

اگر مولانا مودودی مدظلہ یہ موقف اختیار فرمالیں تو بلاشبہ ان کے اصول میں اور اہون البلیتین والے اصول میں ایک قدر مشترک مل جاتا ہو۔ وہ یہ کہ دونوں اصول حالت اضطرار کے لئے خاص ہوجاتے ہیں اور مولانا کی حکمت عملی اور مصلحت والی بات ختم ہوجاتی ہے۔ لیکن ایک بات پھر بھی باقی رہ جاتی ہے اور وہ بھی خاصی اہم ہے۔ وہ یہ کہ مولانا اپنے اصول کو صرف افراد واشخاص کے لیے رخصت اور جواز کی ایک گوارا کرلی جانے والی شکل کی حیثیت سے نہیں پیش فرمارہے ہیں بلکہ اقامت دین کی ایک ایسی تحریک کے لئے جو انبیاء کے طریقہ پر اٹھائی جانے کی

مدعی ہو ایک رہنما اصول شرعی کی حیثیت سے پیش فرما رہے ہیں۔ یہ چیز مولانا کے اصول کو اہون البلیتین کے اصول سے پھر ٹکرا دیتی ہے اور دونوں کی راہیں پھر الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ اسلئے کہ اہون البلیتین کا اصول افراد کو تو بلا شبہ حالت اضطرار میں کسی ناجائز بات کو گوارا کر لینے کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن انبیاء کے طریقہ پر اقامت دین کرنے والی جماعت کے قائد کو یا امیر کو یہ رخصت نہیں دیتا کہ وہ اپنی حکمت عملی کے تحت اضطرار کا فیصلہ کر کے اپنی پوری جماعت کے لیے شریعت کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال اور اس کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام قرار دے ورنہ شریعت کے معاملہ میں امان اٹھ جائے گی اور اس سے وہ تمام نتائج لازمی طور پر برآمد ہوں گے جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔

لیکن یہ ساری بحث مفید صرف اس شکل میں ہو گی جب مولانا اپنی حکمت عملی اور مصلحت کا مفہوم اضطرار لیں۔ لیکن ان کے الفاظ اور پھر وہ دلائل جو انھوں نے فراہم کیے ہیں اور وہ سارا فلسفہ جو وہ شروع سے بیان فرما رہے ہیں اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ وہ در حقیقت اضطرار کو نہیں بلکہ تحریک اسلامی کے قائد کی حکمت عملی اور مصلحت شناسی کو اصلی فیصلہ کن چیز اس معاملے میں سمجھتے ہیں اور اس کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ تحریک کے مصالح کو پیش نظر رکھ کر پوری جماعت کے لیے تحریم و تحلیل کا خدائی حق استعمال کرے۔

میں یہاں انبیاء کے طریقۂ اقامت دین کی طرف بھی چند لفظوں میں اشارہ کر دینا چاہتا ہوں اور مقصود اس اشارہ سے کسی نئی حقیقت کا انکشاف نہیں ہے بلکہ اسی حقیقت کی یاد دہانی کرنی ہے جس کو مولانا بھی بار بار دہرا چکے ہیں اور ان کے رفقا بھی جس کو برسوں دہراتے رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنے ہی پڑھائے ہوئے سبق کو ایک مرتبہ خود بھی تازہ کر لیں۔

انبیاء کا طریقۂ اقامت دین

انبیاء علیہم السلام دعوت دین یا اقامت دین کے کام میں حکمت عملی یا مصالح وقت یا مصالح تحریک کو بنیادی کار کی حیثیت نہیں دیتے۔ اور نہ رخصتوں اور اضطراروں کے اصول پر اپنے کام کی بنیاد رکھتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ان پر جو احکام و قوانین نازل فرماتا ہے وہ خلق خدا کو ان کی دعوت دیتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جو زمانے ان کے حصے میں آئے ہیں وہ تاریخ انسانی کے تاریک ترین، بدترین، اور راشد ترین زمانے تھے۔ لیکن انھیں خدا کی جو

بات جس طرح ملی ہے۔ انھوں نے وہ بات بے کم وکاست خلق کو اسی طرح پہنچائی ہے۔ اس میں کوئی ترمیم یا تنسیخ نہیں کی ہے۔ جس بات کو اللہ نے حرام کیا اس کو انھوں نے حرام کہا، اور اگر ساری دنیا مخالفت میں الٹی لٹک گئی ہے تب بھی انھوں نے اس کی پروا نہیں کی ہے اور جس چیز کو ان کے رب نے حلال کیا، اس کو انھوں نے حلال کہا۔ اور اگر اس جرم میں خود ان کو لٹکا دیا گیا ہے، تب بھی انھوں نے کوئی پروا نہیں کی ہے۔ وہ اگر زمانہ کی مصلحتوں، اور جس چیز کو آپ لوگ تحریک اقامت دین کہتے ہیں، اس کی حکمت عملیوں کو دیکھ کر اپنے منصوبے بناتے تو ان باتوں میں سے ایک بات بھی اپنی زبانوں سے نہ نکالتے جن کی انھوں نے اپنی قوم کے ایک ایک فرد کے سامنے منادی کی۔ اور اگر وہ رخصتوں پر نگاہ رکھتے تو ان کاموں میں سے کسی ایک کام کے لیے بھی گھروں سے نکلنے کی جرأت نہ کرتے جن کے لیے انھوں نے اپنی قوم کے ایک ایک دروازے پر دستک دی۔

وہ خود صاحب عزیمت تھے اور جو لوگ ان کا ساتھ دینے کا ارادہ کرتے تھے ان کو یہ آگاہی پہلے ہی دیدی جاتی تھی کہ "جس کو ہمارے ساتھ آنا ہے وہ اپنی صلیب خود اپنے کندھوں پر اٹھائے اور ہمارے ساتھ آئے"۔ وہ جو بات بھی لائے اور انھوں نے جس بات کا بھی حکم دیا وہ بجائے خود حکمتوں اور مصلحتوں سے بھری ہوئی تھی لیکن اس کے کہنے اور پہنچانے میں انھوں نے اس بات کا کبھی لحاظ نہیں کیا کہ زمانہ اور وقت کے فریم میں بھی وہ فٹ منطبق ہے یا نہیں۔ انھوں نے جو عقائد پیش کئے وہ زمانہ کے عقائد کے خلاف، جس اخلاق کی تعلیم دی وہ زمانہ کے معروف ومنکر کے برعکس، جس نظام زندگی کی دعوت دی وہ وقت کے نظام زندگی کے لیے ایک کھلا ہوا چیلنج۔ لیکن خدا نے ان پر جو چیز جس ترتیب وتدریج کے ساتھ اتاری، اسی ترتیب وتدریج کے ساتھ انھوں نے وہ دنیا کے سامنے پیش کردی، ان میں سے نہ تو انھوں نے کسی چیز کو بدلا، نہ کسی چیز کو ملتوی کیا، نہ کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہٹایا۔ انھوں نے خدا کے کسی حکم پر، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ اپنی مصلحت نہیں چلائی بلکہ بعینہٖ اس کے حکم کے اجرا اور نفاذ ہی کو عین مصلحت سمجھا۔ انھوں نے مصلحت کا لحاظ اگر کیا تو ان امور میں کیا جن امور میں خدا نے ان کو بجائے خود کوئی معین حکم دینے کے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو آزاد چھوڑا تھا کہ تم مصلحتوں کے لحاظ سے جو قدم ان امور میں مصالح دین کے مطابق سمجھنا وہ اٹھانا، مگر ہرگز ہرگز وہ قدم میرے کسی چھوٹے بڑے حکم کے خلاف نہ ہو۔

اس میں شبہ نہیں کہ انبیاء کے لائے ہوئے دین میں دین اور ملت کی مصلحت بجائے خود ایک ماخذ اجتہاد ہے۔ لیکن اس کا تعلق ہماری زندگی کے اس دائرے سے ہے جس کے بارے میں خدا یا اسکے رسولؐ نے نہ تو بطور نص کے کوئی حکم دیا ہے اور نہ نصوص کے اندر چھپے ہوئے اشارات ہی میں ان کے لیے کوئی رہنمائی مل رہی ہے۔ اس دائرہ میں دین اور اہل دین کی مصلحت ہی ہمارے لیے رہنما اصول ہے۔ لیکن جس دائرے میں خدا یا اسکے رسول نے کوئی بات فرمادی ہے اس میں مصلحت خود خدا اور اس کے رسولؐ نے معین فرمادی۔ اب اگر کوئی قائد صاحب یا کوئی امیر جماعت صاحب اس دائرے میں مداخلت فرماتے ہیں جس دائرے میں خدا اور رسولؐ نے مصلحت معین فرمادی ہو اور اپنی مصلحت بینی کے زعم میں خدا اور اسکے رسولؐ کے احکام میں کوئی تبدیلی فرماتے ہیں تو اسکے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خدا سے بھی زیادہ مصلحت شناس سمجھتے ہیں اس وجہ سے انھوں نے خدا اور رسولؐ کے نسخہ میں تبدیلی فرمادی ہے۔

انبیاء کے طریق کار سے متعلق یہ بات بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ نہ تو انھوں نے خود کسی معاملہ میں اہون کو اختیار کیا اور نہ اختیار اہون کے اصول پر اپنی جماعتیں بنائیں۔ وہ بھی اگر اہون کو اختیار کرنے پر قانع ہو جاتے تو خدا کا دین قائم کن کے ہاتھوں ہوتا۔ پھر تو دنیا میں اہون ہی اہون رہتا اور دین کے تمام اعلیٰ اقدار سرے سے وقوع پذیر ہی نہ ہو سکتے۔ یہ انہی کا اور ان کا ساتھ دینے والوں کی قربانیوں ہی کا فیض تو ہے کہ شیطان اور اسکی فوجوں کے علی الرغم دنیا میں نظام حق بار بار قائم ہوا اور اس کا پیغام ہم تک پہنچا۔ ان کے ہاں اختیار اہون کے نام سے اگر کوئی چیز ملتی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انھوں نے اپنے اقامت دین کے جہاد میں اس چیز کو بطور ایک رہنما اصول کے پیش نظر رکھا تھا، بلکہ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ اگر ان کے ساتھ کچھ ایسے لوگ بھی شامل ہو جائیں جو اس جہاد میں کسی وقت عزیمت کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکیں اور وہ مخلص بھی ہوں تو ان کے لیے جماعت کے ساتھ وابستہ رہنے کی ایک شکل باقی رہے۔ یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ اس چیز کو پوری جماعت لیڈر سمیت اپنے لئے بطور اصول اور نصب العین کے اپنا لے۔

انبیاء کرام کے طریقہ کار کی ایک اور نہایت ہی اہم چیز جس کی طرف یہاں توجہ دلانا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ دین کے پیش کرنے میں ان کے ہاں ایک خاص تدریج اور ایک خاص ترتیب ہوتی ہو یہ تدریج و ترتیب نہایت گہری حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہوتی ہے اور وہی تدریج و ترتیب ہے جو فی الواقع

ان کی کوششوں کو نتیجہ خیز اور مثمر بناتی ہے۔ وہ تمام ترغیبات اور تمام فتنوں سے بچ کر پورے صبر کے ساتھ اپنے کام کو جاری رکھتے ہیں۔ نہ مایوس ہوتے، نہ گھبراتے اور نہ جلد بازی کرتے، بلکہ ایک ایک قدم اسی ترتیب کے ساتھ اٹھاتے ہیں جو ترتیب ان کے لیے دین میں قائم کر دی گئی ہے۔ وہ اپنی قوم کے تمام افراد کو عام اس سے کہ وہ غریب ہیں یا امیر، عالم ہیں یا جاہل، حاکم ہیں یا محکوم، غرباء اور متوسطین کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے ہیں یا امراء و اغنیاء کے طبقہ سے، یکساں ہمدردی و دل سوزی کے ساتھ اللہ کی بندگی اور اس کی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو آخرت کی بازپرس...... اور اس کے نتائج سے ڈراتے ہیں۔ وہ نہ تو کبھی فخر کرتے، نہ کبھی ڈون کی لیتے، نہ آخرت کے سوا لوگوں کو کسی اور چیز کی دھمکی دیتے اور نہ اقتدار اور سلطنت کے طالب بن کر اٹھتے۔ جو اللہ کے بندے ان کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ وہ ان کی تربیت اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں اور جو ان سے بیگانہ رہتے ہیں انکی تلاش میں وہ اس گڈریے کی طرح جو اپنی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں ہو، انکے پیچھے پیچھے پھرتے رہتے ہیں۔ وہ ان کی گالیوں کے جواب میں انکو دعائیں دیتے ہیں، ان کے پتھروں کے جواب میں ان کے لیے خدا سے ہدایت مانگتے ہیں اور ان کے غرور و تکبر کے جواب میں ان کو خدا سے ڈرتے رہنے اور خشیت و تواضع کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کے عمل، ان کے قول کے گواہ ہوتے ہیں۔ انکی راتیں، انکے دن کی باتوں کی شہادت دیتی ہیں۔ انکی خلوت انکی جلوت سے زیادہ پاکیزہ اور ان کے اشارے ان کی تصریحات سے زیادہ بامعنیٰ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ان سارے کاموں میں اتنے بے لچک اور اپنے تمام اقوال و افعال میں اتنے ہم آہنگ اور ہم رنگ ہوتے ہیں کہ انکے کٹر سے کٹر دشمن بھی ان کو بناہوا آدمی کہنے کی جرأت نہیں کرتے، اگر کہتے بھی ہیں تو دیوانہ کہتے ہیں۔ پورے صبر کے ساتھ ایک معینہ تدریج و ترتیب کے ساتھ کام کرتے کرتے وہ اپنے معاشرہ کو اس طرح بدل دیتے ہیں کہ اس معاشرے کے اندر ان نظریات و عقائد کے سوا جن کو وہ لائے ہیں کسی اور نظریہ اور عقیدہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی اور اس نظامِ زندگی کے سوا جس نظامِ زندگی کو وہ پیش کرتے ہیں کسی اور نظامِ زندگی کے فروغ پانے کا کوئی امکان ہی نہیں رہ جاتا۔ اس طرح وہ بالتدریج روحانی اور مادی دونوں اعتبارات سے اس چٹان کے مانند بن جاتے ہیں جس کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ جو اس سے ٹکراتا ہے وہ خود پاش پاش ہو کے رہ جاتا ہے اور جس پر وہ گرتی ہے۔ اس کو چکنا چور کر کے رکھ دیتی ہے۔

جو جماعت طریق انبیاء کی مدعی ہو

یہ میں نے حضرت انبیائے کرام علیہم السلام کے طریقۂ اقامت دین سے متعلق چند اشارات کیے ہیں۔ اب اگر کوئی جماعت مدعی ہو کہ وہ اسی طریقہ پر اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے اٹھی ہے تو کم از کم حضرات انبیاء کے نام کی لاج رکھنے ہی کی حد تک اس کے طریقہ کار میں چند باتوں کا نمایاں ہونا لازمی ہے۔

پہلی چیز یہ ہے کہ وہ اللہ کے دین کو اسی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرے جس شکل میں وہ اترا ہو۔ نہ اپنی طرف سے کسی چیز کو حرام کرے، نہ حلال، نہ کم کرے نہ بیش، نہ نرم کرے نہ سخت اور نہ آگے کرے نہ پیچھے۔ اگر زمانہ ناسازگار ہے اور وہ اللہ کے دین کو اس کی اصلی شکل میں پیش کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پا رہی ہے تو بہتر ہے کہ وہ اپنے گھر میں آرام کرے۔ نہ اللہ اس کا محتاج ہے اور نہ اللہ کا دین۔ لیکن یہ حق اس کو ہرگز حاصل نہیں ہے کہ وہ اللہ کے دین پر اپنی مصلحت تراشیوں کی مقراض چلائے اور اسکے ناجائز کو جائز اور اسکے حلال کو حرام بنائے اور رکھے یہ حکمت عملی کا تقاضا اور یہ (Practical Wisdom) کا مطالبہ ہے۔ ایسی حکمت عملی اور ایسی پریکٹیکل وزڈم پر اللہ کی، اسکے نبیوں اور رسولوں کی، اسکے ملائکہ کی اور تمام اہل ایمان کی لعنت ہے جو خدا کی شریعت میں کتر بیونت کو مباح کرتی ہو۔ آپ کو اپنی حکمت عملی استعمال کرنے کا شوق ہے تو اس دائرہ میں استعمال فرمائیے جس دائرے میں خدا نے اپنے احکام و ہدایات کے ذریعہ سے مصلحت متعین نہیں فرما دی ہے۔ لیکن جس امر کے بارے میں کوئی چھوٹا یا بڑا حکم آگیا ہے، خواہ نہی کی صورت میں یا امر کی شکل میں، اس میں وہی مصلحت ہے۔ اگر کوئی شخص اس مصلحت پر اپنی مصلحت کو قائم کرنا چاہتا ہے تو وہ خدا اور رسول کے حرم میں مداخلت کرنا چاہتا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اس جماعت کی اصل روح تمام معاملات دینی میں عزیمت کی ہونی چاہیئے۔ عقائد میں، عبادات میں، معاملات میں، حتیٰ کہ اخلاق و آداب میں بھی اسلام جس اعلیٰ معیار کو پیش کرتا ہو۔ جماعت اور اس کے قائد من حیث الجماعت اس اعلیٰ معیار کو اپنانے اور اس کے قائم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے کے عزم کے ساتھ اٹھیں۔ اس عزم کے ساتھ جب وہ اٹھیں گے تب ہی ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبدیل شدہ عقائد کی تصحیح، منہدم شدہ عبادات کے احیاء، متغیر شدہ اخلاق و آداب کی اصلاح اور مردہ سنتوں کی تجدید کی سعادت حاصل ہوگی اور اقامت دین

علیٰ طریقۃ الانبیاء کے اگر کوئی معنیٰ ہیں تو یہی ہیں۔ لیکن اگر یہ جماعت خود ہی کتاب الحیل کھولکر بیٹھ گئی اور اختیار اہون البلیتین کے پردے میں شریعت سے گریز و فرار کی راہیں ڈھونڈنے لگ گئی تو آخر وہ کونسا دین ہے جس کو قائم کرنے کے لیے وہ اٹھی ہے۔ اگر اس جماعت کو یہ خیال ہے کہ جاہلیت کی تاریکی، اور نظام باطل کے تسلط کے اندر عزیمت کے تقاضوں کو پورا کرنا ممکن نہیں ہے تو براہ کرم یہ ارشاد ہو کہ کیا انبیاء علیہم السّلام جاہلیت کے نہیں بلکہ اسلام کے دَور میں آئے ہیں اور خدا کی شریعت نظام باطل کے اندر نہیں بلکہ نظام حق کے ظہور اور غلبہ کے زمانہ میں نازل ہوئی ہے؟

کیا آپ دُنیائے اسلام کے پہلے قائد ہیں؟

آپ اپنے زمانہ کی مشکلات کا رونا روتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں کہ جس قائد کو جنیں اور جہاں حالات کے اندر صرف وعظ ہی کرنا نہیں، بلکہ دین کو قائم کرنا بھی ہے وہی جانتا ہے کہ کیا چیز لینے کی ہے اور کیا چیز چھوڑنے کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، آپ دنیا میں پہلے قائد ہیں جو اقامت دین کے لیے اٹھے ہیں اور یہ مشکلات و مصائب کی پہلی صبح ہے جو صرف آپ کے لئے طلوع ہوئی ہے۔ آخر اس سے پہلے بھی لوگوں نے کام کئے ہیں اور اتنے سخت حالات کے اندر کئے ہیں کہ ہم اور آپ ان کی سختی کا صحیح صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ احمد بن حنبل، ابن تیمیہ، مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ اور اسمٰعیل شہید نے جس طرح کے حالات کے اندر کام کیا ہے وہ ہمارے حالات کی نسبت سے کہیں زیادہ بُرے تھے۔ بہرحال آپ کا زمانہ سخت ہے یا ان کے زمانے سخت تھے۔ میں اس بحث میں نہیں پڑتا۔ میں جو بات عرض کرنی چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جو جماعتیں انبیاء کے طریقہ پر اقامت دین کے لیے اٹھتی ہیں وہ اہون البلیتین کے اصول پر اپنے پروگرام نہیں بناتیں بلکہ عزیمت کے نصب العین پر بناتی ہیں۔ ان کے لیڈر اور ان کے اعیان اسی نصب العین کو سامنے رکھتے ہیں اور ان جماعتوں کا مجموعی مزاج بھی یہی ہوتا ہے۔ البتہ اگر ان کے اندر کچھ ضعفاء ہوتے ہیں جو عزیمت کے تمام تقاضوں کا تحمل نہیں کر سکتے تو وہ رخصتوں سے بھی فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔

تیسری چیز یہ ہے کہ اس جماعت کے سارے کام میں وہ تدریج و ترتیب ملحوظ ہو جس کا اہتمام انبیاء علیہم السلام نے فرمایا۔ یہ ترتیب و تدریج ہی درحقیقت وہ چیز ہے جس کے اندر اس طریقۂ کار کی تمام خوبیاں اور تمام برکتیں مضمر ہیں۔ آپ چاہیں تو اس چیز کو حکمت عملی اور مصلحت سے بھی تعبیر

کرسکتے ہیں لیکن اس سے مراد وہ تدریج و ترتیب ہی ہوگی جو دین کی اقامت کے لیے خود دین کے بھیجنے والے نے پسند فرمائی ہے۔ انبیائے کرام اللہ کا دین پہلے لوگوں کے دلوں پر قائم کرتے ہیں، جب بہت سے ایسے دل جمع ہو جاتے ہیں جن پر اللہ کا دین قائم ہوچکتا ہے۔ تب وہ معاشرہ بننا شروع ہوجاتا ہے جو اللہ کا دین اپنے اوپر قائم کرتا ہے اور جب ایک معاشرہ اللہ کا دین اپنے اوپر قائم کرلیتا ہے تو جو زمین اس معاشرہ کے پاؤں کے نیچے ہوتی ہے اس کے اوپر اللہ کے دین کے سوا دوسرا کوئی دین یا نظامِ زندگی قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ اگر کوئی اور دین یا نظامِ زندگی پہلے سے قائم ہوگا تو اس کو اکھڑنا پڑے گا، خواہ وہ طوعاً اکھڑے یا کرھاً۔

وما یلقّٰها الا الذین صبروا
وما یلقّٰها الا ذو حظ عظیم

لیکن اس تدریج و ترتیب کا التزام و اہتمام بڑا صبر آزما کام ہے۔ اسکے تقاضے وہی لوگ پورے کرسکتے ہیں جن کو انبیاء کی حکمت اور ان کے صبر میں سے حصہ ملا ہو۔ بے صبرے، جلدباز، طالع آزما اور صدارت و وزارت کے حریص لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ یہ پاپڑ بیل سکیں۔ وہ تو سیدھا طریقہ یہی اختیار کریں گے کہ لاؤ صدارت اور وزارت کی کرسیاں ہمارے حوالے کردو۔ ہم صبح و شام میں اسلامی نظام قائم کیے دیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کو یہ بات کچھ اوپری اور انوکھی سی معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی زندگی اسلامی معاشرہ اور اسلامی نظام کا آغاز ذکر و فکر کی خلوتوں، تنہائی کی دعاؤں اور مناجاتوں، مسجدوں کے منبروں اور محرابوں اور بندگانِ الٰہی کے دلوں اور ان کی روحوں کو بیدار کرنے سے ہوتا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ہر چیز تو کراچی کے قصرِ وزارت و صدارت سے چلتی ہے تو آخر اسلام اور اسلامی نظام ہی کی یہ خصوصیت کیوں ہوگی کہ وہ اپنے سفر کا آغاز مسجد سے کرے گا۔ اس وجہ سے وہ ان بہت سی چیزوں کا مذاق اڑاتے ہیں جن کی دین میں بڑی اہمیت ہے اور ان چیزوں کی دعوت دینے والوں کو راہب، ملا اور احمق قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ لوگ اسلام کی راہ مارنا چاہتے ہیں۔ چھوڑو ان احمقوں اور ملاؤں کو آگے بڑھ کر قبضہ کرلو پارلیمنٹ اور اسمبلیوں پر، اس وقت اسلام کے لیے یہی بدر و حنین کا غزوہ ہے اور اس جنگ کے جیتنے کے لیے توڑ دو ان حدود و قیود کو جو اس مقصد کی راہ میں حائل ہوتے ہیں اسلیئے کہ حکمت عملی اور اختیار اھون البلیتین کے اصول کا تقاضا یہی ہے۔

میں اپنے ان دوستوں کے اس طرز فکر پر ان کو ملامت کرنا بے سود سمجھتا ہوں اس لئے کہ سوچنے کا ایک انداز یہ بھی ہے۔ ممکن ہے اسلام کی خیر خواہی کے جذبہ ہی کے تحت انھوں نے یہ راہ اختیار کی ہو۔ البتہ میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ کام نہ تو اقامت دین کا کام ہے اور نہ اس کو انبیاء علیہم السّلام کے طریقہ اقامت دین سے کوئی نسبت ہے۔ یہ عام سیاسی کھلاڑیوں کے کھیلوں کی طرح کا ایک کھیل ہے جس میں اسلام کے نام کو یا تو محض عوام فریبی کے لیے استعمال کیا گیا ہے یا محض نادانی کے سبب سے اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دوں گا کہ جس سبب سے بھی اسلام کے نام کو استعمال کیا گیا ہے یہ اسلام کے اوپر ایک بہت بڑا ظلم کیا گیا ہے۔

مولانا مودودی صاحب کے دلائل کا جائزہ[1]

یہاں تک تو میں نے مسئلہ پر ایک عام اصولی بحث کی ہے۔ اب میں مختصر طور پر مولانا کی ان دو دلیلوں کا بھی جائزہ لینا چاہتا ہوں جو انھوں نے زیر بحث مضمون میں اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں پیش کی ہیں۔

مولانا کے نقطۂ نظر کو ایک مرتبہ پھر سمجھ لیجئے۔ مولانا یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اقامت دین کی تحریک چلانے والے قائد کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اگر محسوس کرے کہ فلاں چیز جو شریعت میں حرام ہے اگر اس کو گوارا نہ کیا گیا تو اس سے دین کی کوئی بڑی مصلحت فوت ہو جائے گی تو وہ اس حرام کو جائز قرار دے سکتا ہے۔

مولانا کی پہلی دلیل
غیبت اور راویان حدیث کی جرح و تعدیل

اس کے ثبوت میں مولانا فرماتے ہیں کہ دیکھئے مثلاً غیبت شریعت میں کتنا بڑا گناہ کا کام ہے۔ لیکن

---

[1] الفرقان: مضمون کی طوالت کم کرنے کے لیے ہم نے خیال کیا تھا کہ یہ دلائل کی گفتگو حذف کر دیں۔ کیونکہ یہ گفتگو الفرقان میں ہو چکی ہے اور وہ کافی ہے۔ مگر پھر یہ دیکھ کر کہ مولانا اصلاحی نے غیبت والی دلیل پر ایک نئے انداز سے گفتگو کی ہے۔ اور اس سے بات بہت زیادہ صاف ہو جاتی ہے، ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ اس حصہ کو بھی رہنے دیا جائے۔ اور حجت اپنی انتہائی حد تک تمام ہو جائے۔

اس امت کے اگلے پچھلے تمام فقہا و محدثین نے اس گناہ کے کام کو کارِ ثواب سمجھ کر بالاتفاق کیا اور تمام امت نے اس کو کارِ ثواب مانا۔ اس لیے کہ اگر وہ اس برائی کا ارتکاب نہ کرتے تو اس سے بہت زیادہ بڑی برائی یہ لازم آتی کہ دین میں بہت سی وہ باتیں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے داخل ہوجاتیں جو حضورؐ نے نہیں فرمائیں اور اس طرح دین کا حلیہ بگڑ کے رہ جاتا۔

اس میں شبہ نہیں کہ مولانا کی یہ دلیل بڑی وزنی ہے۔ بشرطیکہ دو باتیں ثابت ہوجائیں۔ ایک تو یہ کہ راویانِ حدیث پر جرح کرنا غیبت ہے اور دوسری یہ کہ محدثین نے اسی دلیل کی بنا پر اس حرام کام کو کارِ ثواب ٹھیرایا ہے کہ اگر وہ اس حرام کا دروازہ نہ کھولتے تو دین میں اس سے زیادہ بڑے بڑے حرام داخل ہوجاتے۔

اب آئیے پہلے اس سوال کو لیجیے کیا فی الواقع حضرات محدثین اور فقہا نے راویوں پر جو جرحیں کی ہیں وہ اسی دلیل کی بنا پر کی ہیں جو مولانا نے ان کی طرف سے پیش فرمائی ہے؟ یعنی ہے تو یہ چیز وہی غیبت جس کو قرآن نے مردہ بھائی کے گوشت کھانے سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن محدثین کرام اور ہمارے فقہائے عظام نے اپنے بھائیوں کا یہ گوشت کھانا اس لیے گوارا کیا کہ اگر وہ مولانا کے بقول یہ گھناونا کام نہ کرتے تو دین کا حلیہ ہی بگڑ کے رہ جاتا۔

میرے نزدیک ہمارے محدثین اور فقہا پر اور ساتھ ہی اسلام پر یہ ایک بہت ہی گھناؤنی تہمت ہے جو مولانا نے لگائی ہے۔ آخر کوئی فکر سلیم رکھنے والا شخص یہ تصور بھی کیسے کرسکتا ہے کہ ایک ایسے اہم معاملہ میں، جس کے اوپر خود مولانا ہی کے بقول، دین کے حلیہ کے بننے اور بگڑنے کا انحصار ہو، اسلام جیسا دینِ کامل، منفی یا مثبت طور پر، تصریح کے ساتھ کوئی حکم نہ دے اور فقہا اور محدثین کو اس بات پر مجبور ہونا پڑے کہ وہ دین کو ایک بہت بڑے خطرہ سے بچانے کے لیے اختیار اہون البلیتین کی آڑ لیں اور غیبت جیسی غلیظ برائی کو "کارِ ثواب" سمجھ کر اختیار کریں۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اللہ میاں نے پورے دین کو ایک شدید خطرے میں ڈال دیا تھا۔ لیکن وہ تو خیر ہوئی کہ فقہا اور محدثین کو وقت پر سوجھ گئی اور انھوں نے دین کو دین ہی کی قربانی دے کر بچالیا ورنہ غیبت کی یہ تحریم تو سارے دین ہی کو لے ڈوبی تھی۔

معلوم نہیں مولانا کی اس تحقیق کی بنیاد کیا ہے کہ محدثین نے جرح و تعدیل کا یہ عظیم

کام جو کیا ہے اختیار اہون البلیتین کے اصول کی روشنی میں غیبت کو جائز کرکے کیا ہو۔ محدثین خود تو یہ بات نہیں کہتے۔ وہ تو اپنے اس کام کو ایک فریضۂ دینی و شرعی بتاتے ہیں اور اسکی بنیاد قرآن و حدیث کے متعدد قطعی اور واضح نصوص پر رکھتے ہیں۔ انھوں نے تو یہ کہیں بھی نہیں کہا ہو کہ غیبت کے حرام ہونے کی وجہ سے ہم دین کے تحفظ کی طرف سے سخت مخمصہ میں پڑ گئے تھے۔ بالآخر ایک بڑی مصلحت کے پیش نظر اختیار اہون البلیتین کی کنجی سے ہم نے غیبت کے مقفل دروازے کو کھول لیا۔

جن نصوص پر حضرات محدثین اپنے اس کار عظیم کو مبنی بتاتے ہیں وہ ایک سے زیادہ ہیں۔ ان سب کا حوالہ دینے میں طوالت ہوگی۔ البتہ ایک نص قرآنی کا حوالہ میں محض اس خیال سے دیتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے قرآن مجید کی اسی سورہ میں ہے جس میں غیبت کی حرمت بیان ہوئی ہے۔ ارشاد ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْا۔	اے ایمان والو! اگر تمھارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی اچھی طرح تحقیق کر لو۔
(۶ حجرات)	

اس نص قرآنی میں نہایت واضح الفاظ میں پوری امت کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ خبر اور روایت کے قبول کرنے میں مسلمانوں کو بے احتیاط نہیں ہونا چاہیئے۔ خبر اور روایت صرف وہی قابل قبول ہے جس کے پہنچانے والوں کی دیانت، احتیاط، ثقاہت، معاملہ فہمی، راست بازی مشہور و معروف ہے۔ اگر ذرا بھی شبہ ہے کہ راوی غیر محتاط اور غیر ثقہ ہے اور خبر اہمیت رکھنے والی ہے تو راوی اور روایت دونوں کی ہر پہلو سے تحقیق کر لو۔

اب غور کیجئے کہ اگر یہ حکم قرآنی موجود ہے اور کوئی روایت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا فعل یا تقریر سے متعلق (جن کی ہر چیز پوری امت کے لیے قانون اور ہدایت کی اہمیت رکھتی ہے) کسی محدث یا فقیہہ کے سامنے آتی ہے تو وہ کیا کرے گا؟ یہی تو کرے گا کہ اگر راوی اپنی ثقاہت وعدالت کے لیے مشہور ہے تو اس کو قبول کرلے گا اور اگر راوی مجہول ہے، یا مبتدع ہے یا فاسق ہے یا کسی اور پہلو سے اس کی ثقاہت وعدالت مشتبہ ہے تو اسکی بھی اور اسکی روایت کی بھی تحقیق کرے گا۔ اگر

تحقیق کی کسوٹی پر جانچنے کے بعد اس کو قابل قبول پائے گا تو قبول کرے گا ورنہ اس کو رد کر دے گا۔

یہ نص قرآنی ہے جس کے تحت محدثین اور فقہا نے ہر غیر مشہور راوی کو جانچا اور پرکھا اور اسکے ہر عیب و ہنر کو واضح اور بے نقاب کیا ہے۔ اس آیت میں روایت قبول کرنے والوں کے لیے بھی رہنمائی ہے اور روایت کی ذمہ داری اٹھانے والوں کے لیے بھی تنبیہ ہے۔ کہ جو شخص کسی اہم معاملہ میں کوئی روایت کرنے کے لیے اٹھے وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ کے اٹھے کہ وہ پوری امت کے دین و ایمان کے معاملہ میں دخیل بن رہا ہے اس وجہ سے اس کو یونہی نہیں گذر جانے دیا جائے گا، بلکہ پوری امت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہر پہلو سے اس کی صداقت و دیانت اور اسکے علم و حافظہ کو جانچے اور پرکھے۔

قرآن و حدیث میں اسکے ہم معنیٰ اور بھی نصوص ہیں اور محدثین صاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ ہم انہی نصوص کی تعمیل میں راویوں کی جرح و تعدیل کی ذمہ داری لیتے ہیں۔ لیکن مولانا فرماتے ہیں کہ محدثین نے دین کے تحفظ کے پیش نظر غیبت جیسی حرام چیز کو حلال کیا۔ دیکھئے کہ اپنی بات کی پچ آدمی کو کہاں سے کہاں لے جاکے پھینکتی ہے اور جب وہ خود کوئی غلطی کر گزرتا ہے تو اپنے ساتھ کیسے کیسے لوگوں کو اس غلطی میں شریک اور حصہ دار ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مولانا کی یہ عادت ہے کہ جب وہ اپنی کسی غلطی کی تصویب پر کمر باندھ لیتے ہیں تو اس وقت تک کمر نہیں کھولتے جب تک اس کو مکھی سے بھینس بنا کے نہ رکھ دیں۔ اس وجہ سے مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ یہ نہ فرما دیں کہ جب اللہ میاں نے سورہ حجرات ہی میں غیبت کی حرمت بیان کی اور اسی میں راویوں پر جرح کرنے کا حکم بیان کر دیا تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ (العیاذ باللہ) اللہ میاں کو عملی سیاست کے تحت خود بھی اضطراراً اہون البلیتین کے اصول سے کام لینا پڑا۔ چنانچہ جس غیبت کو ایک آیت میں حرام ٹھیرایا اسی غیبت کو اس دوسری آیت میں جائز کر دیا۔ اگرچہ اللہ تعالےٰ کے حق تحریم و تحلیل پر تو کسی کو مجال اعتراض نہیں مجھے اگر اعتراض ہے تو مولانا کے حق تحریم و تحلیل پر ہے۔ تاہم مولانا کی تفہیم کے لیے میں چاہتا ہوں کہ اس تبیّن میں، جس پر راویوں کے جرح و تعدیل کی اساس ہے، اور غیبت میں جو قرآن میں حرام قرار دی گئی ہے، جو بنیادی اور اصولی فرق ہے وہ واضح ہو جائے۔

قرآن مجید اور احادیث میں جن چیزوں کو غیبت قرار دیا گیا ہے ان سب کو سامنے رکھ کر اگر

غیبت کی تعریف کی جائے، تو اس کی تعریف یہ ہو گی کہ "آدمی کسی کے پیٹھ پیچھے اس کی کسی واقعی برائی کا، اسکی تحقیر و تذلیل کی نیت سے، چرچا کرے اور ساتھ ہی اس بات کا خواہش مند ہو کہ جس کی وہ برائی بیان کر رہا ہے اس کو اسکے اس فعل کی خبر نہ ہو"

اب مختصر طور پر اس تعریف کے تمام اجزا کی وضاحت بھی سن لیجئے تاکہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔

"پیٹھ پیچھے" کی قید اس میں اس لیے لگی ہوئی ہے کہ آدمی کے منہ پر اگر ان کی کسی برائی کو بیان کرنا بھی غیبت بن جائے، تو آپ کا کسی کو اس کی برائی پر نصیحت کرنا بھی غیبت میں شامل ہو جائے گا۔ حالانکہ یہ چیز بالاتفاق نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ ایک مسلمان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے دوسرے بھائی کو اس کی غلطیوں اور کمزوریوں پر ٹوکتا اور نصیحت کرتا رہے۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے بمنزلہ آئینہ کے ہے۔

"واقعی برائی" کی قید کا یہ مطلب ہے کہ اگر وہ برائی فی الواقع اس کے اندر نہ ہو بلکہ محض جھوٹ موٹ اس کی طرف منسوب کی جا رہی ہو تو یہ چیز، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے، غیبت سے گزر کر بہتان کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

"تحقیر و تذلیل کی نیت" کی قید کا فائدہ یہ ہے کہ اگر یہ قید اڑا دی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر آدمی کو کسی ضرورت سے کسی کا حلیہ بیان کرنا پڑ جائے کہ اس کا رنگ سانولا ہے، اس کی ناک چپٹی ہے، اسکی ایک آنکھ زخمی ہے تو یہ چیز بھی غیبت میں شامل ہو جائے گی۔ حالاں کہ یہ چیز غیبت نہیں ہے، بلکہ یہ چیز (پہچنوانے کے مفہوم میں) اس کی تعریف ہے۔

اس میں اخفاء کی شرط کا فائدہ یہ ہے کہ اگر یہ شرط نہ ہو تو پھر آپ کسی شخص کے ظلم کے بارے میں پولیس میں رپٹ درج کرائیں تو یہ بھی غیبت ہو جائے گی، اگر اسلامی حکومت کے محتسب کو یہ اطلاع دیں کہ فلاں شخص آپ کے پڑوس میں فلاں منکر کا ارتکاب کرتا ہے، اس منکر کی اصلاح کے کام میں مدد کیجیے، تو یہ بھی غیبت بن جائے گی۔ حضورؐ کا ایک شخص کے بارے میں یہ فرمانا کہ "آنے دو، اگرچہ ہے تو وہ برا آدمی" العیاذ باللہ۔ یہ بھی غیبت ہو جائے گا، انصار کی آنکھوں سے متعلق حضورؐ نے جو بات فرمائی، خدانخواستہ وہ بھی غیبت میں شامل ہو جائے گی۔ حالانکہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان باتوں میں سے نہ تو

کوئی چیز غیبت ہو اور نہ ان چیزوں کو غیبت ہونا چاہیئے۔ ان تمام صورتوں میں کسی کی برائی تو ضرور زیر بحث آتی ہے لیکن نہ تو مقصد تحقیر و تذلیل ہوتا ہے اور نہ برائی کو زیر بحث لانے والا کچھ بہت زیادہ اس بات کا خواہشمند ہوتا ہے کہ اس کی ذات سامنے نہ آئے۔

غیبت کی مذکورہ بالا حقیقت سے اگر آپ کو اتفاق ہو تو اب آئیے غور کیجئے کہ محدثین نے راویوں پر جو جرحیں کی ہیں کیا وہ غیبت کی تعریف میں آتی ہیں۔

سب سے پہلے تو اس سوال پر غور کیجئے کہ ایک محدث یا فقیہہ کو کسی راوی سے کس نوعیت سے دلچسپی ہوتی ہو۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہو کہ اگر قرآن میں یہ حکم نہ دیا گیا ہوتا کہ جب تمہارے سامنے کوئی روایت آئے تو اچھی طرح تحقیق کیے بغیر تم اس کو قبول نہ کرنا تو کسی محدث یا فقیہہ کو کسی راوی کے عیب و ہنر سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ محدث یا فقیہہ کو راوی سے کوئی ذاتی عناد نہیں ہوتا کہ جوں ہی یہ کسی شخص کو روایت کرتے سنیں اس کی بوٹیاں نوچنے لگ جائیں۔ وہ تو راوی سے اگر بحث کرتے ہیں تو محض خدا کے حکم (تبیّن) کی تعمیل میں اور خود راوی کو بھی اس چیز پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ایک بات کی روایت کی ذمہ داری لے رہا ہو۔ دونوں فریق مشترک طور پر ایک مقدس مقصد کے اللہ تعالیٰ کے ایک واضح حکم کی تعمیل میں حصہ لیتے ہیں۔ ایک اپنی کسوٹی اٹھاتا ہو تاکہ جانچے اور دوسرا اپنے آپ کو پیش کرتا ہو کہ اس کو جانچ لیا جائے۔ محدث یا فقیہہ کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ راوی لازماً مجروح ہی ثابت ہو جائے اور شہر میں اسکی کوئی آبرو ہی باقی نہ رہ جائے۔ بلکہ یہ اسکی دلی خوشی کی بات ہوگی اگر راوی اس ذمہ داری کا اہل ثابت ہو جائے جو اس نے اٹھائی ہے۔

معاملہ کی اس واضح نوعیت کے باوجود سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا اس تبیّن اور اس تحقیق کو اس غیبت سے کس طرح ملا دیتے ہیں جس میں غیبت کرنے والے شخص کو اس شخص کے گوشت سے ذاتی دلچسپی ہوتی ہو جس کی وہ غیبت کرتا ہو اور اسکے اس فعل کا محرک اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا کہ جس شخص کی یہ غیبت کر رہا ہے وہ ذلیل اور بے وقعت ہو کے رہ جائے۔

محدث اور راوی کے معاملہ ہی سے ملتا جلتا معاملہ قاضی اور شاہد کا ہو۔ قاضی خدا کے دین کی ایک عظیم ذمہ داری ادا کرنے کے لیے مسند قضا پر بیٹھتا ہے اور شاہد امت کے فریضۂ منصبی شہادت علی الناس کے تقاضے کے تحت ایک معاملہ میں قاضی کے سامنے شہادت کے لیے آتا ہے۔ شاہد کا فرض

ہو کہ وہ سچی شہادت دے اگرچہ اس کی شہادت سے کسی کی برائی بے نقاب ہو رہی ہو اور قاضی کا فرض ہو کہ وہ شاہد کے ان پہلوؤں کی تحقیق کر لے جو اس کی ثقاہت و عدالت سے متعلق ہیں۔ شاہد اگر شہادت دینے سے اس خیال سے جی چرائے کہ اس طرح وہ غیبت کرنے کا مجرم بن جائے گا تو وہ اس فرض اجتماعی کے ادا کرنے میں کوتاہی کرے گا جو امت مسلمہ کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتا ہو اور اگر قاضی شاہد کے عیوب سے غض بصر کرے کہ اس کے عیوب کو زیر بحث لانا غیبت ہو تو وہ اپنے فریضۂ قضا کے ادا کرنے میں کوتاہی کرے گا جو اللہ اور رسول نے اس پر عائد کیا ہو۔ چنانچہ ہر شخص قاضی کے اس حق کو تسلیم کرتا ہو کہ اگر وہ شاہد کے اندر کوئی خرابی پائے تو اس کی شہادت کو رد کر دے، یہاں تک کہ بعض حالات میں وہ اس کو مستقلاً ساقط الشہادت بھی قرار دے سکتا ہو جس کے بعد وہ کسی عدالت میں بحیثیت ایک گواہ کے پیش ہونے کے قابل ہی نہیں رہ جاتا۔ اسلام کی پوری تاریخ میں ہر قاضی نے اس حق کو استعمال کیا لیکن کسی نے اس کو غیبت نہیں کہا۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہی کام جب ایک فقیہ یا محدث راوی کے معاملہ میں کرتے ہیں تو مولانا مودودی صاحب اس کو غیبت کیوں قرار دیتے ہیں۔

اوپر غیبت کی تحقیق کے سلسلہ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ غیبت کرنے والے کی یہ خواہش بھی ہوتی ہو کہ وہ جس شخص کی غیبت کر رہا ہو اس کو اس کے اس فعل کی خبر نہ ہو، لیکن کسی محدث یا فقیہ کے متعلق یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ وہ کسی راوی پر جرح کرتے ہوئے یہ خواہش بھی رکھتا ہو کہ جس پر وہ جرح کر رہا ہو اس کو اس کے فعل کی خبر نہ ہو۔ فقہاء اور محدثین نے یہ کام ہرگز کسی سے چھپا کر نہیں کیا ہے۔ بلکہ ڈنکے کی چوٹ پر کیا ہے۔ انھوں نے اپنی جرحیں ان پر بھی آشکارا کی ہیں جن پر جرحیں کی ہیں اور اپنی ان تمام جرحوں سے اپنے بعد آنے والی نسلوں کو آگاہ کرنے کا بھی سامان کیا ہے۔ ان کے اس سلسلہ کے تمام کارناموں کے دفاتر موجود ہیں۔ یہ کام غیبت کی طرح کانا پھوسی کی تنہائیوں اور سرگوشی کی مجلسوں میں نہیں ہوا ہی، بلکہ منبروں پر، مجلسوں میں حلقہائے درس کے اندر اور عظیم الشان کتابوں کے صفحات میں ہوا ہی، بلکہ اگر میں یہ کہوں تو شاید غلط نہ ہوگا کہ بالکل اسی طرح ہوا ہو جس طرح مولانا اپنے معاصر اور غیر معاصر لیڈروں پر تنقیدیں فرماتے رہے ہیں۔

بس اگر فرق ہو تو یہ فرق ہو کہ اہل سیاست کے منہ میں صرف زبان ہوتی ہو کوئی لگام نہیں ہوتی، لیکن ہمارے فقہاء اور محدثین کے منہوں میں صرف زبانیں ہی نہیں تھیں بلکہ انصاف اور سچائی کی لگامیں بھی تھیں۔

ممکن ہو کسی کو خیال ہو کہ فقہاء اور محدثین صرف زندہ راویوں ہی کو تو زیر بحث نہیں لائے ہیں بلکہ ایسے

لوگوں پر بھی انھوں نے جرحیں کی ہیں جو ان کے زمانوں سے پہلے گذر چکے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسا بھی ہوا ہے۔ لیکن اس طرح کی جرحیں یا تو ثقہ اور عادل لوگوں کے بیانات پر مبنی ہیں یا ان دلائل پر مبنی ہیں جو ان لوگوں کی اپنی ہی کتابوں اور تصنیفوں سے ماخوذ ہیں جن پر جرحیں کی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نوعیت کی جرح بھی کسی پہلو سے غیبت کی تعریف میں نہیں آتی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا نے محدثین کے اس عظیم کام کو غیبت میں کیوں شامل کر دیا۔

بہر حال نہ تو غیبت اور جرح میں کوئی قدر مشترک موجود ہے اور نہ محدثین نے جرح کا کام غیبت سمجھتے ہوئے محض کسی مصلحت کے تحت انجام دیا ہے۔ انھوں نے یہ کام، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، قرآن و حدیث کے صریح نصوص کی تعمیل میں انجام دیا ہے اور جس طرح خدا اور رسول کا ہر حکم کسی عظیم حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتا ہے اسی طرح اس حکم میں بھی بہت سی ظاہر اور مخفی حکمتیں ہیں۔ ان میں سے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اس کی وجہ سے کمزور یا جھوٹے راویوں کی دراندازیوں سے اللہ کا دین محفوظ رہا۔ لیکن یہ حکمت اور مصلحت سب سے پہلے اللہ اور اس کے رسول ہی کو سوجھی تھی۔ یہ ہرگز نہیں ہوا تھا کہ اللہ اور رسول تو اس حکمت و مصلحت سے بے خبر رہے لیکن محدثین کو یہ سوجھ گئی، اور انھوں نے حکمت عملی سے کام لے کر غیبت کے بند دروازے کو توڑ کر اللہ کے دین کو ایک عظیم خطرے سے بچا لیا۔

ممکن ہے یہاں کسی کو شبہ ہو کہ غیبت اور جرح و تعدیل میں تو فی الواقع کوئی قدر مشترک نہیں ہے تو پھر بعض علماء نے یہ کیوں لکھ دیا ہے کہ راوی کے عیب کو بیان کرنا ان غیبتوں میں سے ہے جو جائز ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ بعض علماء نے یہ بات لکھی ضرور ہے لیکن اس کی وجہ ہرگز یہ نہیں ہے کہ جرح و تعدیل کا کام ان کے نزدیک غیبت میں شامل ہے جس کو کسی حکمت عملی یا مصلحت کے تحت مباح کر لیا گیا ہے، بلکہ انھوں نے یہ بات حدیث کی ایک علمی مشکل حل کرنے کے لیے لکھی ہے۔ وہ مشکل یہ ہے کہ حدیث میں حضورؐ سے غیبت کی جو تعریف منقول ہے اس میں غایت درجہ ایجاز ہے جس کے سبب سے ایک عام آدمی کو غیبت کے حدود معین کرنے میں غلط فہمیاں پیش آسکتی ہیں۔ حضورؐ سے کسی شخص نے پوچھا کہ یا رسول اللہ غیبت کیا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ غیبت یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کا برائی سے ذکر کرو۔ ظاہر ہے کہ یہ غیبت کی کوئی فنی تعریف نہیں ہے بلکہ صرف اس کے ایک واضح پہلو کی طرف حضورؐ نے اشارہ فرما دیا ہے۔ حضورؐ نے تو یہ بات مخاطب کے لحاظ سے فرمائی ہوگی اور ایک مخاطب کلام کے مختلف پہلوؤں اور اس کے سیاق و سباق کی روشنی میں پوری

بات اخذ کر لے سکتا ہو لیکن اگر کوئی شخص حضورؐ کے اس ارشاد کو غیبت کی جامع و مانع منطقی تعریف سمجھ کر یہ رائے قائم کر بیٹھے کہ ہر وہ بات جس میں اپنے کسی بھائی کی برائی کا ذکر آجائے غیبت ہو تو اس کا یہ سمجھنا بالکل غلط ہے۔ کیونکہ اس تعریف کی رو سے بہت سے وہ کام بھی غیبت میں شامل ہو جائیں گے جن کا قرآن اور حدیث میں حکم دیا گیا ہے۔ جو نہایت اہم انفرادی و اجتماعی فرائض میں داخل ہیں۔ اس غلط فہمی سے لوگوں کو بچانے کے لیے بعض شارحین حدیث کو یہ لکھنا پڑا ہو کہ فلاں فلاں کام فلاں فلاں باتیں بظاہر غیبت معلوم ہوتی ہیں اس لیے کہ ان میں کسی کی برائی کا حوالہ آتا ہے۔ لیکن یہ باتیں جائز ہیں۔ یہ چیز انھوں نے محض عام لوگوں کے شبہ کے ازالہ کے لیے لکھی ہے۔ غالباً یہی چیز ہے جس کو مولانا نے یہ رنگ دے دیا ہو کہ جرح وتعدیل کا کام ہے تو غیبت اور غیبت کو اللہ اور رسولؐ نے حرام ٹھہرایا ہے۔ لیکن چونکہ حکمت عملی مقتضی ہوئی کہ اس حرام کو مباح کیا جائے اس لیے حضرات محدثین نے اس حرام کام کو "کارِ ثواب" سمجھ کر کیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ مولانا نے اپنی ذہانت سے اپنی محبوب حکمت عملی کے جواز و استحسان کے لیے یہ بہت اچھوتی دلیل نکال لی لیکن میری ناچیز رائے یہ ہو کہ انھوں نے اگر یہ کام پرویز صاحب کے لیے چھوڑ دیا ہوتا تو اچھا تھا۔

مولانا کی دوسری دلیل الائمۃ من قریش

مولانا کی دوسری دلیل جس کو انھوں نے بڑی اہمیت دی ہے اور جس کی دسمبر کے ترجمان میں مزید وضاحت فرمائی ہے، یہ ہو کہ اگرچہ مساوات، اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بھر اس کا وعظ فرمایا لیکن چونکہ "عملی سیاست" کا تقاضا یہ ہوا کہ خلافت قریش ہی کو سونپی جائے اس وجہ سے آخر وقت میں مساوات کے اس اصول کے خلاف حضورؐ نے حکم دیا کہ الائمۃ من قریش یعنی خلفاء قریش ہی میں سے ہوں گے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اگر حضورؐ نے یہ حکم نہ دیا ہوتا اور مسلمان اسلام کے اصول مساوات کو آزمانے کے شوق میں کسی غیر قریشی کو خلیفہ بنا بیٹھتے تو سخت تباہی میں پڑ جاتے۔

مولانا کی اس دلیل سے متعلق پہلے ہی مرحلہ میں یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (بالفرض) عملی سیاست کے تقاضوں کے تحت ہی اسلام کے کسی اصول کو توڑ دیا تھا تو اس سے یہ بات کس طرح ثابت ہو گئی کہ شریعت کے کسی اصول کو توڑنے کا یہی اختیار، مولانا مودودی صاحب کو بھی حاصل

ا؎ یہ مولانا کا خود اپنا اختیار کردہ لفظ ہی کسی کو یہ گمان نہ ہونا چاہیے کہ میں نے ان کی طرف منسوب کر دیا ہو۔ (ا۔ن)

ہوگیا۔ آخر مولانا امیر جماعت ہیں کوئی نبی تو نہیں ہیں، کیا مولانا کا کسی عملی سیاست کے تحت دین کے کسی حکم کو بدل دینا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی مصلحت کے تحت کسی حکم کو بدلنا دونوں برابر ہیں لیکن میں اس سوال کو یہاں نہیں اٹھاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا نے جو دلیل قائم فرمائی ہے، سرے سے اس کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔ مجھے یہ کہنے کے لیے معاف فرمایا جائے کہ نہ انھوں نے اس مساوات کی حقیقت سمجھی ہے جس کا اسلام نے حکم دیا ہے اور نہ انھوں نے الائمۃ من قریش کی حکمت ہی سمجھی ہے۔

اسلام نے مساوات کی تعلیم ضرور دی ہے لیکن اس مساوات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کے بعد وہ تمام امتیازات بھی یک قلم ختم ہوگئے جو رشتۂ رحم و قرابت یا قابلیت و صلاحیت یا اختلاف جنس یا اوصاف پر مبنی ہیں۔ اسلام میں مساوات بھی ہے اور ساتھ ہی اختلاف جنس کی بنا پر عورتوں اور مردوں میں جو فرق ہونا چاہیئے اس نے اس کو بھی ملحوظ رکھنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (اور مردوں کو عورتوں پر ایک درجۂ ترجیح حاصل ہے) اسلام میں مساوات بھی ہے اور ساتھ ہی رحم اور قرابت کی بنا پر حقوق میں جو ترجیح و تقدیم ہونی چاہیئے، اسلام نے اس کا بھی حکم دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ ۵، انفال (اور جو لوگ آپس میں رشتۂ رحم سے وابستہ ہیں وہ اوروں کے مقابل میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں) اسی طرح اسلام میں مساوات بھی ہے لیکن اسلام نے ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا ہے کہ ذمہ داریاں صرف انہی لوگوں کو سونپی جائیں جو اپنی صفات اور قابلیتوں کے اعتبار سے ان ذمہ داریوں کے اہل ہوں۔ چنانچہ فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا ۵ نساء (اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم ذمہ داریاں ان کے سپرد کرو جو ان کے حق دار ہیں۔)

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان احکام میں سے کوئی حکم بھی اسلام کے قانون مساوات سے متصادم نہیں ہے۔ ورنہ نعوذ باللہ ماننا پڑے گا کہ خود اللہ میاں نے بھی اپنے قائم کردہ اصول مساوات کے بالکل خلاف بہت سے احکام محض عملی سیاست کے دباؤ کے تحت دے ڈالے۔ اگر مولانا اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو پھر انھیں یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ اسلام میں وہ اندھی بہری مساوات نہیں ہے جو ان امتیازات کو بھی کالعدم کر دیتی ہو جو بالکل عقل و فطرت پر مبنی ہیں۔

اسلام نے مساوات کا حکم ضرور دیا ہے لیکن ساتھ ہی قاضی کے لیے، مفتی کے لیے، امام کے لیے،

مسجد کے متولی کے لیے اور سب سے بڑھ کر اسلامی ریاست کے کارکنوں اور عہدہ داروں کے لیے حدیث اور فقہ کی کتابوں میں بہت سے اوصاف اور شرائط بھی بیان ہوئے ہیں کیا ان سب کے متعلق مولانا کا یہی خیال ہے کہ یہ ہیں تو اسلام کے اصول مساوات کے خلاف۔ لیکن یہ بعد میں مساوات کے اصول کو توڑ کر محض اس لیے بڑھائے گئے ہیں کہ حکمت عملی ان کی مقتضی تھی۔ اگر یہ نہ بڑھائے گئے ہوتے اور کہیں اسلامی مساوات کا تجربہ کرنے بیٹھ گئے ہوتے تو تباہ ہی ہو کے رہ جاتے۔

مولانا اگر اسلامی مساوات کا یہ مطلب سمجھے ہیں تو میں نہایت ادب سے یہ عرض کروں گا۔ کہ یہ مطلب ان کے اپنے ذہن کا ایجاد کردہ ہے اس کو اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اسلام نے جہاں مساوات کی ہدایت دی ہے وہیں یہ ہدایت بھی، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، دی ہے کہ ذمہ داریاں انہی کے حوالہ کرو جو اس کے اہل ہیں۔ اسلام کے ان دونوں اصولوں میں سر مو تضاد و اختلاف نہیں ہے کہ مولانا کی حکمت عملی سے استمداد کی ضرورت پیش آئے، بلکہ ان میں سے ایک اصول دوسرے اصول کی توضیح و تشریح کر رہا ہے۔ اس توضیح سے یہ بات صاف ہو گئی کہ اسلام میں جو مساوات کی ہدایت ہے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اب اسلام میں کسی کام کے لیے کسی وصف و قابلیت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی اور ہر شخص یہ مجاز ہو گا کہ وہ چلا آئے کہ مجھے قاضی یا مفتی یا امام یا گورنر یا خلیفہ بنا دو اس لیے کہ اسلام میں مساوات ہے۔

یہ تفصیل میں نے یہ حقیقت واضح کرنے کے لیے پیش کی ہے کہ جس طرح غیبت کے حرام ہونے کی وجہ سے محدثین کے لیے جرح و تعدیل کی راہ بند نہیں ہو گئی تھی کہ انھیں حکمت عملی کے تحت غیبت کے دروازے کو کھولنا پڑے، اسی طرح مساوات کا اصول قائم ہو جانے کی وجہ سے اہلیت اور استحقاق کا اصول باطل نہیں ہو گیا تھا کہ حضورؐ کو عملی سیاست کے تحت مساوات کے اصول کو توڑنا پڑے، بلکہ حضورؐ پر یہ دونوں حقیقتیں خود قرآن ہی کے نصوص سے واضح تھیں کہ اسلام میں مساوات بھی ہے اور اہلیت و استحقاق کا لحاظ اور اہتمام بھی اور ان دونوں چیزوں میں کوئی تضاد اور تناقض نہیں ہے۔ بلکہ دونوں میں پوری پوری مطابقت ہے۔ چنانچہ حضورؐ بھی اپنی زندگی میں برابر ان دونوں اصولوں کے مطابق مختلف معاملات کے فیصلے فرماتے رہے اور عام مسلمان بھی ان دونوں حقیقتوں سے پوری طرح باخبر تھے۔ ایک مرتبہ ایک صحابی نے حضورؐ سے کسی منصب پر مقرر کیے جانے کی درخواست کی تو آپ نے ان کی درخواست یہ کہہ کر رد فرما دی کہ تم اس منصب

کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے کمزور آدمی ہو۔ وہ حضور کے اس جواب کے بعد خاموش ہو گئے — نہ انھوں نے یہ کہا کہ اسلام کے اصول مساوات کا تقاضا تو یہ ہے کہ مجھے منصب ضرور ملے اور نہ حضورؐ کو یہ کہنا پڑا کہ میں نے حکمت عملی کے تحت اس اصول مساوات کو توڑ دیا ہے۔

اسی اصول کی روشنی میں حضور نے قریش کی امارت و خلافت کا فیصلہ فرمایا۔ میرے نزدیک حضورؐ کا ارشاد الائمۃ من قریش (خلفاء قریش میں سے ہوں) نہ تو امر ہے نہ خبر، نہ وصیت بلکہ یہ ایک قضیہ اور ایک نزاع کا فیصلہ ہے — یہ قضیہ اگرچہ ایک قضیہ کی شکل میں حضور کے سامنے پیش نہیں ہوا تھا لیکن یہ ذہنوں میں موجود تھا، اور اس کے اثرات وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے رہتے تھے — حضورؐ کے لیے یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہ تھا کہ آپ کی وفات کے بعد یہ قضیہ ایک نزاع کی شکل اختیار کر سکتا ہے، اور اس سے امت میں انتشار پیدا ہو سکتا ہے، اس وجہ سے آپ نے اپنی زندگی ہی میں فیصلہ فرما دیا کہ آپ کے بعد خلافت کے حقدار قریش ہیں۔

اس نزاع میں ایک طرف قریش تھے دوسری طرف انصار — حضور کے زمانہ میں یہی دو گروہ سیاسی زور و اثر کے لحاظ سے نمایاں تھے، اور آپ کے بعد خلافت کا مطالبہ لیکر اٹھ سکتے تھے، اسلام نے انکو جاہلی تعصبات سے پاک کر دیا تھا، لیکن قبائلی حمیت کے فطری اور جائز رجحانات دونوں کے اندر زندہ تھے حضورؐ کی حیات مبارک میں تو اس امر کا کوئی اندیشہ نہ تھا، کہ بات اپنے حدود سے آگے بڑھ کر کسی بگاڑ کی صورت اختیار کرلے گی، لیکن حضور کے بعد اس قسم کا اندیشہ بے محل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ان میں حصولِ اقتدار کی کشمکش کا اندیشہ کچھ ایسا زیادہ نہیں تھا، جتنا اندیشہ اس بات کا تھا، کہ خدمت دین میں مقابلہ کا جذبہ جو ان دونوں کے اندر موجود ہے مبادا وہی انکو کسی کشمکش میں مبتلا کر دے۔ اس وجہ سے حضور نے مناسب خیال فرمایا کہ اپنی زندگی ہی میں اس نزاع کا فیصلہ فرما دیں۔

یہ نزاع کیونکہ امامت عامہ یعنی خلافت کے لیے تھی، صرف کسی مسجد کی امامت کے لیے نہ تھی، اسوجہ سے اس معاملہ میں ان دونوں گروہوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دو ہی چیزوں کی بنا پر حاصل ہو سکتی تھی — ایک دین اور اسکی خدمات، دوسری سیاسی زور و اثر — جہاں تک دین اور دینی خدمات کا تعلق ہے یہ دونوں گروہ کچھ برابر برابر سے تھے، کچھ پہلو اگر قریش (بالفاظ دیگر مہاجرین) کے نمایاں تھے تو چند پہلو انصار کے بھی بہت روشن تھے، چنانچہ قرآن نے ان دونوں کی دینی خدمات کا جہاں جہاں ذکر کیا ہو، کچھ اس طرح کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں کہ دونوں مساوی الوزن معلوم ہوتے ہیں — اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مختلف مواقع پر دونوں کی دینی خدمات کا ذکر اس طرح فرمایا ہو کہ کسی کا پلڑا جھکتا ہوا نظر نہیں آتا۔ اسوجہ اس پہلو سے تو ان میں کسی ایک کو بھی دوسرے پر ترجیح دینے کیلئے کوئی وجہ مرجح موجود نہیں تھی۔

لیکن دوسرے پہلو یعنی سیاسی زور و اثر کے لحاظ سے قریش کو انصار پر نمایاں فوقیت حاصل تھی۔ سیاسی زور و اثر بجائے خود اسلام میں کوئی وقعت رکھنے والی چیز نہیں ہے لیکن دین کے ساتھ مل کر یہ چیز ایک وجہ ترجیح بن جاتی ہے۔ امامت عامہ یعنی خلافت و امامت جس طرح دین کو مقتضی ہے اسی طرح سیاسی زور و اثر کو بھی یہ چاہتی ہے۔ قریش کو چونکہ جاہلیت میں بھی دینی پیشوائی اور سیاسی قیادت کا منصب حاصل رہا تھا اس وجہ سے اسلام لانے کے بعد اسلام میں بھی ان کو یہ چیز حاصل ہو گئی۔ اہل عرب کے لیے ان کی اطاعت کوئی اوپری اور انوکھی چیز نہیں تھی، بلکہ ایک جانی پہچانی ہوئی چیز تھی۔ وہ جن کی اطاعت جاہلیت میں کرتے رہے تھے بڑی آسانی کے ساتھ بغیر کسی کراہت کے ان کی اطاعت اسلام میں بھی کر سکتے تھے بشرطیکہ دین مانع نہ ہو، سو الحمد للہ اس قسم کا کوئی مانع باقی نہیں رہا تھا بلکہ قریش نے اسلام کی خدمت میں بھی ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ اس وجہ سے وہ دونوں چیزیں ان کے اندر جمع ہو گئی تھیں جو اسلام میں منصب امارت و خلافت کے لیے استحقاق پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ حضورؐ نے الائمة من قریش فرما کر قریش کے حق میں فیصلہ فرما دیا اور اس فیصلہ نے اس نزاع کو ختم کرنے میں بڑا کام دیا جو حضورؐ کی وفات کے معاً بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار اور مہاجرین کے درمیان اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اگر کسی کو یہ گمان ہو کہ قریش کے حق میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ محض ان کی قرشیت کی بنا پر دیا تو یہ گمان غلط ہے۔ اگر اس وقت انصار اور قریش کے سوا کوئی اور تیسرا گروہ بھی موجود ہوتا جو اپنی سیاسی جمعیت و قوت اور اپنی مذہبی و دینی خدمات کے لحاظ سے ان دونوں پر فوقیت رکھنے والا ہوتا تو یہی فیصلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسکے بارے میں بھی دے سکتے تھے۔

جو شخص بھی اپنی بات کی پچ کی بیماری سے پاک ہو کر میری ان توضیحات کی روشنی میں ان حدیثوں کو جو اس باب میں وارد ہیں اور ان تقریروں کو جو سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار اور مہاجرین کے اکابر نے کی ہیں پڑھے گا وہ بڑی آسانی کے ساتھ اس حقیقت کی طرف پہونچ جائے گا جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ پھر اس واضح اور معقول توجیہ کے ہوتے ہوئے اگر مولانا نے یہ نکتہ پیدا کر ڈالا کہ حضورؐ نے الائمة من قریش فرما کر محض حکمت عملی کے پیش نظر اسلام کے ایک بنیادی اصول کو توڑ ڈالا تو اس بارے میں میں اسکے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ مولانا کو متکلم اسلام سمجھتے رہے ہیں مولانا نے اپنے اس نتیجۂ فکر سے ان کو بڑا صدمہ پہونچایا ہے۔ میرے نزدیک تو حضورؐ نے مساوات کے اصول کو توڑا نہیں بلکہ اس کو اس کی اصل بنیاد پر قائم فرمایا۔

مولانا نے اس سلسلہ میں جو بات بھی لکھی ہے وہ ان کے موجودہ الجھے ہوئے فکر کا مظہر ہے۔ لیکن میں ان کی

ہر چیز کی تردید پر اپنا اور قارئین کا وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔ میں نے صحیح بات پیش کر دی ہے۔ اگر مولانا نے اسکو سمجھنے کی کوشش کی تو اس مسئلہ کے سارے الجھاؤ آپ سے آپ دور ہو جائیں گے۔

میرے خیال میں مولانا چونکہ اس فرق کو واضح طور پر نہیں سمجھ سکے ہیں کہ حضورؐ کے اس ارشاد کو امر کی حیثیت دینے اور خبر کی حیثیت دینے میں کیا فرق واقع ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ اسکے متعلقات کی توجیہ میں کہیں اس کو امر کی حیثیت دے دیتے ہیں اور کہیں خبر کی اور جب سوال بات بنانے کا آجائے تو آدمی کا دماغ کسی بحث کے نازک پہلوؤں کو سمجھ سکتا بھی نہیں۔ تاہم مجھے امید ہے کہ اب جو واضح چیز میں نے پیش کی ہے مولانا اس پر غور کرنے کے لیے کچھ وقت نکالیں گے۔

حضورؐ نے الائمۃ من قریش کے ساتھ جو یہ فرمایا کہ ما اقاموا الدین، جب تک وہ دین کو قائم کریں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قریش کا سیاسی زور و اثر ان کے استحقاق خلافت کی دلیل اسی وقت تک بن سکتا ہے جب تک وہ دین پر قائم رہیں اور دین کو قائم رکھیں، اگر وہ اقامت دین کے نصب العین سے ہٹ جائیں تو پھر امامت عامہ کی پہلی شرط چونکہ ختم ہو جائے گی اس وجہ سے محض عصبیت جاہلیت کے زور پر نہ انھیں مسلمانوں پر لدے رہنا چاہیے اور نہ مسلمانوں کو محض ان کی قرشیت کی بنا پر انھیں اپنے سروں پر لادے رکھنا چاہیے۔

مولانا ممکن ہے، میرے اس مضمون کو پڑھنے کے بعد فرمائیں کہ میں نے اپنے دل کا ایک پرانا بخار نکالنے کے لیے ان کے مضمون کو بہانہ بنالیا ہے۔ اسکے جواب میں پیشگی گزارش ہے کہ میں نے دل کا بخار تو ضرور نکالا ہے لیکن یہ بخار زیادہ پرانا نہیں ہے بلکہ مولانا خوب واقف ہیں کہ میرے دل میں یہ بخار مولانا کے اس مضمون ہی سے پیدا ہوا تھا اور مولانا نے اسکو نکالنے کی دعوت بھی دی تھی لیکن میں نے اسکو نکالنا پسند نہیں کیا تھا میرا گمان یہ تھا کہ اگر مولانا خود اپنی غلطی پر متنبہ نہیں ہوئے ہیں تو دوسروں کی تنبیہ سے متنبہ ہو جائیں گے اور اس غلطی کی اصلاح کر لیں گے۔ لیکن میرے گمان کے برعکس انھوں نے اپنی ضد سے اسلام کے خلاف ایک بہت بڑا فتنہ اٹھا دیا ہے۔ اس وجہ سے مجھے مجبوراً یہ سطریں لکھنی پڑی ہیں۔ اگر میں یہ نہ لکھتا تو قیامت کے دن شیطان اخرس بن کر اٹھتا اور کتمان حق کے جرم میں میرے منھ میں آگ کی لگام لگائی جاتی۔ میں اس چیز سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اور اپنا دینی فرض سمجھتا ہوں کہ اس سلسلہ میں مولانا نے جو کچھ لکھا ہے سب کا جائزہ لوں۔ میرے سفر کے دوران میں مولانا نے جو کچھ اس مسئلہ سے متعلق لکھا ہے میں اس کو بھی پڑھ رہا ہوں۔ اور عنقریب اس کے متعلق بھی اپنے ناچیز خیالات پیش کروں گا اور مقصود میرا اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مسلمانوں کو اس فتنہ کے اثرات سے بچاؤں جو بدقسمتی سے اٹھا دیا گیا ہے۔ (بشکریہ رسالت)

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے

لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ و معاہدہ

اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اسی کی بھیجی ہوئی

اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت و شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی مسلک پر جئیں گے اور مریں گے۔

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی

زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اسی کا

عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السموات والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرۃ

توفنی مسلما والحقنی بالصالحین

ادارہ الفرقان

مسئول
محمد منظور نعمانی

مرتب
عتیق الرحمن سنبھلی

کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات

کلمۂ طیبہ کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

اس میں اسلام کے کلمۂ دعوت "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ پڑھنے سے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے اور دماغ کے ساتھ دل بھی متاثر ہوتا ہے۔

قیمت ۔۔ ۔/۶/۰

نماز کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اس کی روح و حقیقت سے واقف ہونے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں "کلمۂ طیبہ کی حقیقت" کی طرح یہ بھی عقل و جذبات اور دل و دماغ کو یکساں متاثر کرتا ہے

قیمت........ ۔/۱۲/۰

برکات رمضان

از افادات مولانا نعمانی

اسلام کے اہم رکن "صوم رمضان" اور ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال و وظائف۔ تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات اور ان کی روحانی تاثرات کا نہایت مؤثر اور شوق انگیز بیان اور حکیم اُمت حضرت شاہ ولی اللہؒ کے طرز پر اس سلسلہ کی احادیث کی ایسی تشریح جس سے دل بھی متاثر ہو اور دماغ بھی مطمئن۔ قیمت ۔/۱۲/۰

اسلام کیا ہے؟

تالیف مولانا نعمانی

اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں

اس کتاب کے دیکھنے والوں کا عام احساس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کوئی خاص مقبولیت و تاثیر عطا فرمائی ہے، پچھلے چند سالوں میں تقریباً تیس ہزار اردو میں اور کئی ہزار گجراتی میں شائع ہو چکی ہے

اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کے لیے ہی نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ اور عمل انشاء اللہ کافی ہے۔

زبان نہایت آسان ہونے کے ساتھ نہایت شیریں اور پُرتاثیر ہے۔ کتابت طباعت عمدہ اور معیاری قسم اول کاغذ ۲۰ پونڈ چکنا مجلد ۔/۸/۱ قسم دوم کاغذ ۲۲ پونڈ چکنا غیر مجلد ۔/۱۲/۱

ہندی اڈیشن کاغذ اعلیٰ مجلد۔ قیمت تین روپے ۔/۰/۳

آپ حج کیسے کریں؟

حج و زیارت کے متعلق اردو زبان میں بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب (جو مولانا نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی گویا مشترک تالیف ہے) اپنی اس خصوصیت میں اب بھی بے نظیر ہے کہ اس کے مطالعہ سے حج کا صحیح اور مسنون طریقہ بھی تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہے اور دل میں عشق و جذب اور ذوق و شوق کی وہ کیفیات بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو دراصل حج کی روح اور جان ہیں۔

کاغذ عمدہ........ قیمت مجلد........ ۔/۰/۲

آسان حج

یہ آسان زبان میں "حج کیسے کریں" کا خلاصہ ہے۔ ایسے کم تعلیم والے حضرات جو صرف آسان اور معمولی اردو ہی پڑھ سکتے ہیں وہ اس کے مطالعہ سے پورا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

طباعت معیاری........ قیمت........ صرف ۔/۸/۰

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

تالیف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے قابل قدر فاضلانہ اور مبسوط مقدمہ........ ۔/۸/۲

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

مرتبہ: مولانا محمد منظور نعمانی۔ قیمت ۔/۸/۱

امام ولی اللہ دہلویؒ

از مولانا عبید اللہ سندھیؒ....... قیمت ۔/۰/۱

انیس نسواں

از محترمہ بیگم سید اصغر حسین صاحب

مسلمان خواتین خاص کر تعلیم یافتہ بہنوں میں دین کی طرف سے جو بے فکری اور آخرت کی طرف سے جو غفلت تیزی سے بڑھ رہی ہے اس کے علاج اور انسداد کے لیے ایک محترم بہن نے یہ رسالہ لکھا ہے۔ شروع میں مولانا نعمانی کے قلم سے پیش لفظ ہے۔...... قیمت ۔/۱۰/۰

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

قیمت ۔/۶/۰

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین کے الزامات

قیمت ۔/۸/۱

معرکۃ القلم

اکابر دیوبند کی طرف سے مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا آخری تحقیقی جواب........ قیمت ۔/۰/۱

ہندوستان و پاکستان سے
سالانہ چندہ (بسکہ پاکستان) ۶ر
سالانہ چندہ (بسکہ ہندوستان) ۵ر
ششماہی ۳ر

فی کاپی آٹھ آنے

غیر ممالک سے
سالانہ چندہ ۱۰ شلنگ
اعزازی خریداروں سے
سالانہ ۱۰ر

جلد ۲۶ | بابتہ ماہ ذیقعدہ ۱۳۷۸ھ مطابق جون ۱۹۵۹ء | شمارہ ۱۱

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب یہ ہو کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو گئی ہو، براہ کرم آیندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا رسالہ بصیغہ وی، پی ارسال کیا جائے گا۔

چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۱۰ تاریخ تک پہونچ جانی چاہیئے۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت:۔ رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ کو روانہ کر دیا جاتا ہو اگر ۲۵ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔

خط وکتابت و ترسیل زر کا پتہ

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

آج سے ایک ماہ قبل کانگرس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ نے حالیہ فسادات پر ایک رزولیوشن پاس کیا تھا جس میں اظہار افسوس وغیرہ کے علاوہ ریاستی حکومتوں سے کہا گیا تھا کہ

اُن کو اپنا یہ فرض اولین تصور کرنا چاہیئے کہ وہ فرقہ وارانہ اتحاد اور یگانگت کو فروغ دیں اور اپنی پالیسی سے یہ بات پوری طرح واضح کر دیں کہ وہ غیر جانب دار انصاف کی حامی ہیں۔ اور جو لوگ فرقہ وارانہ منافرت پھیلاتے یا تشدد آمیز سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں انھیں برداشت نہ کیا جائے گا۔

یہ ہدایت ہی نہیں بلکہ دبے لفظوں میں اس بات کا اعتراف بھی تھا کہ ابتک ریاستی حکومتوں کا رویہ عموماً غیر اطمینان بخش رہا ہے۔ مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس ہدایت میں چھپے ہوئے اعتراف پر نہ ریاستی حکومتوں کو کوئی ندامت ہے، اور نہ وہ اس ہدایت کو عمل میں لانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔

اسکی ایک بالکل تازہ مثال خود لکھنؤ جیسے مرکزی ریاستی مقام کی ہے۔ جس میں ایک بالکل بے بنیاد بات پر فرقہ پرست عناصر مسلمانوں کے خلاف مہینوں سے تحریر و تقریر کی پوری آزادی کے ساتھ اشتعال انگیزی میں مصروف ہیں۔ مگر یہاں کی ریاستی حکومت محض تماشائی ہے۔ بے بنیاد بات بھی کیسی کہ فلاں مسلم تعلیمی ادارہ (جو ہندو آبادی کے بیچ میں واقع ہے) اپنے احاطہ میں جامع مسجد اور اپنے طلباء کے لئے ہوسٹل تعمیر کر رہا ہے۔ بات اگر صحیح بھی ہوتی جب بھی ہندوستان کے دستور کی رو سے کسی کو اسکے خلاف لب کشائی کی مجال نہیں تھی۔ اور حکومت کا فرض تھا کہ وہ اسکے خلاف پروپگنڈے کو جرم تصوّر کرتی۔ مگر یہاں تو اتفاق سے بات میں ایک رتّی بھی سچ نہیں ہے، مگر پھر بھی حکومت اِن ساری اشتعال انگیزیوں کا اس حد تک تماشہ دیکھ رہی ہے کہ ۱۴ مئی کو فرقہ پرستوں کی طرف سے اس بے بنیاد بات

کے خلاف ہڑتال کرائی گئی اور تقریری بے لگامی اور اشتعال انگیزی کی انتہا کر دی گئی ــــ وہ تو کہیے کہ اللہ کے فضل اور ذمہ داران ادارہ کے حلم و تدبر نے حالات کو بگڑنے نہیں دیا۔

اور یہ سب کچھ جب ہو جبکہ کانگرس ورکنگ کمیٹی کا رزولیوشن ہی دبے لفظوں میں عام ریاستی حکومتوں کی کوتاہی اور جانبداری کا اعتراف نہیں کر چکا ہے۔ بلکہ انہی دنوں میں اور ئی (یو، پی) کے ہولناک فساد (۵۶ء) کے مقدمہ کا فیصلہ دیتے ہوئے یو، پی ہائی کورٹ ریاست کے محکمہ پولیس کو کھلے لفظوں میں مجرم ٹھہرا چکا ہے۔

کانگرس بحیثیت جماعت، کو بھی مذکورہ بالا رزولیوشن میں اسی قسم کی ہدایات دی گئی تھیں، مگر کانگرس کا بھی اور اس کے ساتھ دوسری تمام غیر فرقہ پرست کہلانے والی پارٹیوں کا بھی جو عملی حال اسی لکھنؤ کے واقعہ کے آئینہ میں نظر آیا، وہ اتنا افسوسناک ہو کہ خود ایک کانگرسی اخبار نے لکھا کہ

> "مقامی کیونسٹ پارٹی نے بڑی بہادری دکھلائی کہ اس نے اخباروں میں ایک بیان دیکر اور پھر لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کر کے سب کو بتلایا کہ جس بات کا پروپگنڈہ ہو رہا ہو وہ بالکل غلط ہو ...... لیکن اسکے علاوہ اور کسی سیاسی پارٹی نے اس بات کی ہمت نہیں کی۔ انھوں نے بات کو ٹال دینا مناسب سمجھا۔ اس معاملہ میں کانگرس، پرجا سوشلسٹ اور سوشلسٹ تینوں کا ایک ہی درجہ رہا۔ کتنی افسوس کی بات ہو کہ شہر میں ایک بے بنیاد بات پر آگ لگ رہی ہو اور یہ جماعتیں جو ہر بات کو سلجھانے کا دعویٰ کرتی ہوں بے خبر بیٹھی رہیں۔"

یہی اخبار مزید لکھتا ہے:۔

> "سیاسی پارٹیوں کا ایسے موقع پر خاموش رہنا بھی ایک طرح کا اعلان سمجھا جاتا ہے وہ اعلان یہ کہ ان میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ فرقہ واریت کا سامنا کر سکیں۔ اسلئے فرقہ پرستوں کے لیے ہر طرح کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔"

اس سب طویل حکایت کا مدعا یہ ہے کہ اگر فرقہ پرست طاقتوں کی یلغار کو روکنا ہے تو کسی کا آسرا نہ دیکھئے، جو کچھ سوچنا ہے خود سوچئے۔ اور جو کچھ کرنا ہے خود کریئے۔ ہاں مگر یہ یاد رکھیئے کہ جو کچھ ہو وہ غصہ اور جذبات سے الگ ہو کر ہو۔ ورنہ ماحول ایسا ہے کہ ایک طرف فرقہ پرستوں کی زیادتیاں اشتعال دلاتی ہیں۔ اور دوسری طرف ارباب حکومت کی چشم پوشیاں چڑچڑاہٹ پیدا کرتی ہیں۔ اس ماحول میں

اگر ہم نے عقل و ہوش کو بیدار نہیں رکھا تو ہر قدم پر پاؤں پھسل جانے کا ڈر ہے ــــــ ہمیں ایک مستقل اور وسیع الذیل لائحہ عمل بھی طے کرنا چاہیئے جس میں اِن شر انگیزیوں کی پوری کاٹ ہو۔ اور دوسری طرف وقتی تحفظ کے اس رویّہ کو بھی مضبوطی سے پکڑے رہنا چاہیئے جس پر ہم اپریل کے شمارہ میں تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں۔[1] لکھنؤ کے جس قصہ کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اُس سلسلہ میں فساد کا نہ ہونا بظاہر ارباب متعلقہ لوگوں کے اسی رویہ پر کاربند ہونے کا نتیجہ ہے۔ اور مہینوں کی کوشش اور پوری آزادی کے باوجود فرقہ پرستوں کی یہ ناکامی ان کے سستے حربوں کی وہ ناکامی ہے جس کا پورا احساس کچھ وہ ہی کر سکتے ہیں!

الفرقان کے ہمدردوں اور ہوا خواہوں کو یہ بات پہنچا دینا ضروری ہے کہ بہت عرصہ سے الفرقان کی توسیع اشاعت کی کوئی خاص کوشش نہ ہونے کی وجہ سے، الفرقان خسارہ کے چکر میں آ گیا ہو جس سے بحمد اللہ وہ کئی سال سے باہر تھا۔ اب سے کئی سال پیشتر جب ایسی صورت حال پیدا ہوئی تھی تو بظاہر اسباب صرف دو بندگان خدا کی ہمت نے اسے اس چکر سے نکال دیا تھا۔ جنھوں نے اپنی ذاتی محنت اور اثر و رسوخ سے کام لے کر تقریباً دو سو صد جدید خریدار مہیا کر دیئے تھے۔ اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے یہ توقع بیجا نہیں ہے کہ الفرقان کے محبّین و مخلصین آج پھر اس مثال کا اعادہ کر سکتے ہیں۔ اور ادارۂ الفرقان کو موجودہ پریشانی سے نجات مل سکتی ہے۔

اس ذیل میں یہ تو بہت ہی ضروری ہو کہ جن حضرات کی طرف الفرقان کا چندہ بقایا چل رہا ہو وہ اگلے مہینے کے شروع تک چندہ ضرور ادا کر دیں ورنہ اب ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ انھیں رسالہ جاری رکھ سکیں۔

پیش نظر شمارہ، قربانی سے متعلق مضمون کی بنا پر مقررہ تاریخ اشاعت سے چند دن پیشتر شائع کیا جا رہا ہے تاکہ خریداروں کو بر وقت مل سکے۔ تاہم اندیشہ ہے کہ دیہی علاقوں کے بعض خریداروں کو بعد از وقت ملے۔ ہم اُن سے معذرت خواہ ہیں کہ اور جلدی نہ کر سکے۔

---

[1] اپریل کے الفرقان کا یہ اداریہ الگ پمفلٹ کی صورت میں شائع ہو چکا ہو اور علاوہ ڈاک خرچ نو روپیے فی سیکڑہ (قیمت لاگت) کے حساب سے اب بھی دفتر الفرقان سے مل سکتا ہو۔

قربانی

حقیقت اسلام کا ایک رمز

(از عتیق الرحمٰن سنبھلی)

عن زید بن ارقم قال قال اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا رسول اللہ ما ھٰذہ الاضاحی. قال سنۃ ابیکم ابراھیم علیہ السلام ۔ (الحدیث) رواہ احمد وابن ماجہ (مشکوٰۃ باب فی الاضحیۃ)

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ (صحابی) سے روایت ہو کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؐ سے عرض کی کہ "یا رسول اللہ یہ (عید کی) قربانی کیا ہے؟" ارشاد ہوا کہ تمھارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہو۔"

اللہ کے لیے قربانی ملتِ ابراہیمیؑ کی روح ہو۔ یہ قربانی ـــــ زندگی کے ہر ہر موڑ اور ہر ہر گوشہ میں قربانی ـــــ ہی وہ طرّہ امتیاز ہے جس نے ابراہیمؑ کو "خلیل اللہ" بنایا (علیہ وعلی نبینا الصلوٰۃ والسلام) سب سے پہلے محبت پدری کی قربانی دی۔ اور باپ کی زبان سے اللہ کے لیے

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَہِ لَاَرْجُمَنَّکَ وَ اھْجُرْنِیْ مَلِیًّا۔ (مریم ۔ ع ۳)	اگر تو (اس دعوتِ توحید سے) باز نہ آیا تو میں تیرا سر پھوڑ دوں گا، چل میرے پاس سے دفعان ہو جا!

جیسے الفاظ سنے ۔ اور پھر

سَلَامٌ عَلَیْکَ سَاَسْتَغْفِرُ لَکَ رَبِّیْ اِنَّہٗ کَانَ بِیْ حَفِیًّا وَاَعْتَزِلُکُمْ	تم سلامت رہو، میں تمھارے لیے اپنے رب سے معافی چاہوں گا۔ کہ وہ مجھ پر بڑا مہربان ہو۔

وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ اور تمہیں اور تمہارے معبودوں کو چھوڑ کر الگ

(ایضاً) ہو جاؤں گا۔

کہتے ہوئے، جیتے جی باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔

باپ کے ساتھ ساتھ سارے اہلِ وطن دشمنِ جان ہو گئے تو اپنے وجود ہی کی قربانی کا سوال سامنے آ گیا اور ساری خدائی نے دیکھا کہ

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

یہ مرحلۂ عشق طے ہوا تو اب وطن کو خیرباد کہنے کی باری تھی، قربانی کا ابراہیمی جذبہ اس گھاٹی کو بھی ہنستے کھیلتے پار کر گیا، اور اب بابل کے بجائے ارضِ کنعان اس دولتِ عشق کی وارث ہوئی۔ یہاں بڑھاپے کی عمر میں پہونچ کر پہلی اولاد عطا ہوئی تو عہدِ شیرخوارگی ہی میں حکم ملا کہ اس کو اور اس کی ماں کو (مکہ کی) وادیٔ غیر ذی زرع میں چھوڑ آؤ ــــ عشق کا یہ مرحلہ بھی بلا حیل و حجت طے ہوا، یہ قربانی ہی کیا کم تھی؟ مگر اللہ کی "دوستی" اس سے بھی زیادہ مہنگی تھی۔ اور "نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز" کی صدا ابھی تھمنے کا وقت نہیں آیا تھا۔

چند سال بیتے۔ اور اس وادیٔ غیر ذی زرع میں پلنے والے اکلوتے فرزند کی عمر اتنی ہو گئی کہ

بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ (صٰفّٰت) بوڑھے باپ کا کچھ ہاتھ بٹانے کے قابل ہو گئے۔

تو قربانی کے اس مرحلے کا سامان بھی ابراہیم کے لیے ہو گیا جس کے بعد اس بارگہ والا سے بھی "ارزانی ہنوز" کی نہیں

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ بے شک یہ بڑی کھلی ہوئی

(ایضاً) جانچ تھی۔

کی صدائے اعتراف اٹھی۔ ابراہیم علیہ السلام نے ایک خواب سے سمجھا کہ بیٹے کی قربانی کا حکم دیا جا رہا ہے۔ شرحِ صدر ہو گیا تو نہ باپ جھجکا نہ بیٹا کسمسایا۔ اور ساری خدائی نے دم بخود ہو کر یہ ماجرا دیکھا کہ بیٹا منہ کے بل زمین پر ہے اور باپ کی چھری بیٹے کی گردن پر، لیکن خدا کو اسمٰعیل کی قربانی مطلوب نہیں تھی، ابراہیم کا دل دکھنا یا کھینچے کہ محبت کا آخری مرحلہ طے کرانا مقصود تھا، وہ طے کرا دیا گیا اور ابراہیم کے جذبۂ عبدیت و فدائیت کی صداقت کو آزما لیا گیا، تو قبل اس کے کہ چھری اپنا کام کرے، پکار آئی۔

يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا (ایضاً) — اے ابراہیم (بس! بس!!) تو نے خواب سچا کر دکھایا۔

اب تیرا بیٹا تجھے مبارک ہو۔

إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ۔ — ہم صادقین و محسنین کو اسی انداز سے جزا دیتے ہیں۔

پے در پے آزمائشوں کے سلسلہ کی یہ وہ آخری آزمائش تھی جس میں پورا اُترنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نوعِ انسانی کی امامت کا مژدہ سنایا گیا۔ قرآن کا بیان ہے

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا (بقرہ ع ۱۵) — اور جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے متعدد باتوں میں، اور وہ ان میں پورا اُترا، فرمایا میں بناؤں گا تجھے بنی آدم کا امام۔

یہی امامت تھی جس کا کامل ظہور اس طرح ہوا کہ آپ کی نسل میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام نوعِ انسانی کا رسول بنا کر مبعوث کیا گیا اور اس کے لیے وہی طریقہ اور وہی دین پسند کیا گیا جو ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ اور اُن کا اُسوہ تھا۔ چنانچہ قرآن میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا گیا۔

قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا۔ (الانعام ع ۲۰) — (آپ کہہ دیجیے کہ) مجھے سجھائی ہے میرے رب نے سیدھی راہ۔ یعنی دینِ قیم۔ جو طریقہ ہے ابراہیم حنیف کا۔

اور اس طرح ابراہیمی کیش و ملت کو تمام نوعِ انسانی کے لیے اُسوہ ٹھہرا دیا گیا ـــــ اُمتِ محمدیؐ کے اوّلین طبقہ کو (جو نزولِ قرآن کے وقت داخلِ اسلام ہو چکا تھا) خطاب کر کے فرمایا گیا۔

هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ (الحج) — اس (اللہ) نے تم کو منتخب کیا ہے۔ اور نہیں کی ہے دین میں تمہارے اوپر کوئی تنگی ـــــ تمہارے باپ ابراہیم ہی کی تو ملت ہے۔ اسی نے نام رکھا ہے تمہارا مسلمان۔

پس وہ ابراہیمی کیش و ملت جس کی روح ہی "قربانی" ہے۔ اور جس کو "اسلام" کا نام ہی اس عظیم آخری قربانی کے سلسلہ میں دیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ صفّت میں اسی موقع پر ہے۔

فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ الخ[۵] پس جب ان دونوں باپ بیٹوں نے کمال اطاعت (اسلام) کا مظاہرہ کر دیا۔ اور ابراہیم نے اسمٰعیل کو پیشانی کے بل ڈال دیا۔ الخ

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اس کیش و ملت میں کوئی مستقل نشان اس عظیم قربانی کا نہ ہوتا اور جس بنیاد پر اسے اسلام کا نام دیا گیا تھا۔ مابعد میں اس بنیاد کا کوئی اثر اس اسلام نامی ملت میں نظر نہ آتا؟ پس حق اور قطعاً حق تھا کہ "اسلام" کے اس حقیقی مظاہرہ کی کوئی نہ کوئی یادگار اس ملت کے خاکہ میں مستقل جگہ پاتی۔ اور قربانی پیش کرنے کی کوئی نہ کوئی شکل اسلام کا دائمی شعار قرار دی جاتی۔ ....

.... چنانچہ خداوند قدوس نے اس موقع پر خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ سے قربانی کی شکل متعین کرائی۔ کہ اسمٰعیل کی قربان گاہ پر اُسی چھری سے ایک مینڈھا ذبح کرایا۔ اور ہر سال اسی دن اس عمل کے نہایت عظیم اور عالمگیر پیمانہ پر اعادہ کو ملتِ ابراہیمی کا جزو بنا دیا[۶] ——— اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پیغمبر آخر الزماں نے جو دینِ حنیفی اور ملتِ ابراہیمی کا پیامبر تھا، بقرعید کی قربانی کے سلسلہ میں اپنے اصحاب کرام کو بتایا کہ یہ تمھارے باپ ابراہیم کی سنت ہے۔ اور تلقین کی کہ ان میں کا ہر ذی استطاعت اس سنت کی پیروی

---

[۵] اس آیت کے سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن عباس کا ارشاد گرامی ہے "والذی نفس ابن عباس بیدہ لقد کان اول الاسلام" (قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں ابن عباس کی جان ہے یہ اسلام کا سب سے پہلا کامل ظہور تھا۔) (تفسیر ابن کثیر ج ۴)

[۶] امام ابن جریر طبری نے حضرت حسن بصری سے نقل کیا ہے۔

اَنَّهُ كَانَ يَقُولُ مَا يَقُولُ اللهُ وَفَدَيْنَاهُ	کہ وہ فرمایا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد
بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ لِذَبِيْحَتِهِ الَّتِي ذَبَحَ	فدیناہ بذبح عظیم صرف اس خاص بچہ سے متعلق
فَقَطْ وَلٰكِنَّهُ الذَّبْحُ	نہیں ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا بلکہ اس ذبح عظیم
عَلٰى دِيْنِهِ فَتِلْكَ السُّنَّةُ اِلٰى	سے مراد وہ عظیم رسم قربانی ہے جو اس ابراہیمی طریق پر ادا
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔ (تفسیر طبری ج ۲۳)	کیجاتی رہے گی پس معلوم ہوا کہ یہ قیامت تک کیلئے سنت جاری کر دی گئی ہے۔

میں ذوق و شوق سے حصہ لے۔

اب سمجھ میں آتا ہو قربانی کے بارے میں اس قسم کی احادیث کا مطلب (یا زیادہ صحیح الفاظ میں ان کا راز) کہ

(عن عائشۃ قالت قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، مَا عَمِلَ ابنُ اٰدمَ من عملٍ یومَ النحر احبَّ الی اللّٰہ مِنْ اھراقِ الدّمِ وَانَّہٗ لَیاتی یوم القیٰمۃ بقرونِہا واشعارِھا واظلافِہا وانَّ الدَّمَ لیقعُ مِنَ اللّٰہ بمکانٍ قَبْلَ اَنْ یَقَعَ بِالْاَرضِ فَطِیْبُوْا بِھا نفسا۔ رواہ الترمذی و ابن ماجہ۔ (مشکوٰۃ)

(حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) قربانی کے دن ابن آدم کا کوئی عمل اللہ کو اتنا محبوب نہیں جتنا خون بہانے کا عمل تمہارے یہ قربانی کے جانور قیامت کے دن لے کر آئیں گے اپنے سینگ، اپنے بال اور اپنے کھر۔ (یعنی اس کا ایک ایک بال تک تمہاری میزان عمل میں نیکی بنا کر رکھا جائے گا) اور (کیا پوچھتے ہو) یہ خون جو تم بہاتے ہو قبل اس کے کہ زمین پر گرے، اللہ کے حضور میں گرتا ہو (یعنی مرتبہ قبول پاتا ہو) پس خوب اچھے دل سے قربانی کیا کرو۔

جس قربانی کی یہ تاریخ ہو کہ اس کی طرح خود خداوند قدوس نے اپنے خلیل کے ہاتھوں ڈالوائی ہو۔ اور وہ اس عظیم عمل کی یادگار اور رمزدار ہو، جس کی عظمت کا اعتراف "قد صدّقت الرؤیا" کہہ کر" اس دربار عالی سے برملا کیا گیا ہو، جس کی عظمت و کبریائی کے آگے ابن آدم کی بڑی سے بڑی پیشکش ہیچ و حقیر ہے۔ جس کو کمال اطاعت و اسلام (اَسْلَمَا) سے تعبیر کر کے اس کا درجۂ قبولیت بھی اس عظیم ہستی ہی کی طرف سے دنیا پر عیاں کر دیا گیا ہو، جس کی شان بے نیازی کو جاننے والا انسان، عمر بھر کی اطاعت گزاری پر بھی اطمینان نہیں کر پاتا کہ کوئی درجۂ قبولیت اس سب کو اس بارگہ عالی میں مل پائے گا! ـــــ سچ کہیے کہ اگر اس تاریخی قربانی والے دن میں اللہ کو ابن آدم کا کوئی عمل اس درجہ پسند نہیں جتنا یہ قربانی اور اہراقِ دم والا عمل پسند ہو، تو اس میں اچنبھے کی کون سی بات ہو؟ ـــ حق یہ ہو کہ اس عمل کی یہی شان ہونی چاہیے اور ابراہیمی خلوص

خوشدلی کی ادنیٰ جھلک بھی اگر کسی کے اس عمل میں پائی جائے تو اس کو بھی درجۂ محبوبیت و قبولیت ملنا چاہیے جو حدیث بتا رہی ہو۔ ہاں! ہاں!! خون کے اُن قطروں کو جو ایمانی ذوق و شوق کے ساتھ کسی عبدِ مسلم کے ہاتھ سے بہیں یہی رفعت عطا ہونی چاہیے کہ زمین پر گرنے سے پہلے وہ مکین عرش کے دامنِ قبول میں جگہ پالیں اور اس سنتِ ابراہیمی کی پیروی کا یہی صلہ قدرشناسِ جذبۂ ابراہیمی سے ملنا چاہیے کہ قربانی کا ایک بال بھی رائگاں نہ جائے۔ سچ کہا اور یقیناً خدا کی طرف سے کہا "دُعائے خلیل" کے ظہورِ مجسم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہ

بِكُلِّ شَعْرَةٍ حَسَنَةٌ (قالوا	ہر بال کے حساب میں ایک نیکی! (صحابہ نے
فالصوفُ یا رسولَ اللہ؟) قال	عرض کیا کہ حضور اور جو جانور اون والے
بِكُلِّ شَعْرَةٍ مِنَ الصوفِ حسنة!	ہیں؟) فرمایا اون میں سے بھی ہر بال
رواہ احمد وابن ماجہ (مشکوٰۃ)	کے حساب میں ایک نیکی۔

بعض لوگ جو روایاتِ حدیث کے استناد میں شک رکھتے ہیں اور بنا بریں دین میں کوئی بات محض حدیث کی بنیاد پر ماننے کو تیار نہیں ہوتے، بلکہ قرآن سے سند اور حجت چاہتے ہیں، آپ اُن کو کہتا ہوا سُنیں گے، بلکہ بارہا سُن چکے ہوں گے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس سنت (قربانی) کا تعلق تو صرف مناسکِ حج سے تھا اور قرآن نے بھی اُمتِ مسلمہ کے لیے صرف اسی ذیل میں اس سنت کا اجرا کیا ہو۔ حج اور حجاج کے دائرہ سے باہر اس سنت کے اجرا کی ہدایت قرآن میں کہیں نہیں ملتی۔

یہ بات ٹھیک ہو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی بیشک اسی موقع کی ہو، اور اس قربانی کو جاری کرنے کا حکم قرآن نے حج ہی کے سلسلہ میں دیا ہے، لیکن اگر حدیث کی بنیاد پر دین میں کوئی چیز ماننے سے ان لوگوں کو صرف یہی خیال مانع ہو کہ حدیث کی روایات مستند نہیں ہیں، نہ یہ کہ قرآن کے سوا دین میں کوئی شے حجت اور ماخذِ دین ہی نہیں، اور وہ مانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا عمل کی کوئی روایت اگر قابلِ اطمینان ثابت ہو جائے تو وہ دین میں حجت ہوگی۔ اور اس سے ثابت شدہ امر دین ہی کا حکم سمجھا جائے گا؟ تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قربانی کی روایت اُن روایات میں سے نہیں ہو جن کی صحت یا صحیح یا غلط طور پر کوئی بھی شک کیا جا سکے۔ یہ روایت صرف قول کی نہیں ہو کہ کہہ دیا جائے کہ پتہ نہیں کس نے گڑھ لی ہو۔ بلکہ ایسے مسلسل، متواتر اور علانیہ عمل کی روایت بھی اس سلسلہ میں موجود ہو جس میں جھوٹ چار قدم بھی نہیں چل سکتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ راوی ہیں، اور ان کی یہ روایت جامع ترمذی میں موجود ہے کہ

اقام رسول الله صلى الله عليه وسلم بالمدينة عشر سنين يضحي (مشکوٰۃ۔ باب فی الاضحیہ)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کی پوری دس سالہ اقامت میں برابر قربانی کرتے رہے۔

دوسری طرف انھیں عبداللہ بن عمر کی یہ بھی روایت ہو کہ

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يذبح وينحر بالمصلّٰى۔ (رواہ البخاری)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ عیدگاہ ہی پر قربانی (بھی) کیا کرتے تھے۔

کیا کوئی معقولیت پسند آدمی سوچ سکتا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اتنا بڑا جھوٹ بھی اُمت میں قبول پا سکے کہ ایک کام آپ نے سرے سے کیا ہی نہ ہو اور کہنے والا کہے کہ آپ دس سال تک متواتر عیدگاہ کے ایسے بھرے مجمع میں یہ کام کرتے رہے ہیں؟ کس قدر بدعقلی کی بات ہو کہ ایسی روایات کو بھی یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے کہ پتہ نہیں سچ ہے یا جھوٹ! ــــ حدیث کے مجموعے ہزار دیر سے مرتب ہوئے ہوں۔ مگر ان میں اس قسم کی باتیں بھی اگر "عجمی سازش" کے ماتحت جھوٹ موٹ گھڑ کے بھر دی گئی ہوں تو ایک طرف تو ان عجمیوں کی سازشی "عقل" کی داد دیجئے کہ جھوٹ کی وہ صنف اختیار کی کہ منھ سے نکلتے ہی پکڑ لیا جائے اور دوسری طرف حیرت میں ڈوب جائیے کہ کوئی ایک عرب نہ نکلا جو ان عجمیوں کا گریبان پکڑتا کہ ہماری پشتیں گزر گئیں، ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مسلسل اور مجمع عام کے عمل کی خبر تک نہ ہوئی۔ آج تم ترمذ و بخارا سے اُٹھ کر ہمیں یہ خبر دینے آئے ہو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس سال تک متواتر اور علی الاعلان ایک عمل کرتے رہے اور ہمارے آباؤ اجداد جو آپ کے

ایک ایک قدم سے قدم ملا کر چلتے تھے، اس سے کوئی اعتنا رہی نہ کیا؟ ـــــ اور پھر یہ بھی نہیں، تم یہ بھی خبر دیتے ہو کہ آپ نے یوں یوں اس قربانی کے فضائل اپنے اصحاب سے بیان کیے اور ترغیب کے ساتھ ساتھ یہ زبردست تہدید بھی کی کہ

من کان لہٗ یسارٌ فلم یُضحِّ	جس کسی نے وسعت ہوتے ہوئے قربانی
فلا یقربنّ مُصلّانا۔	نہیں کی وہ ہماری عیدگاہ کے قریب بھی نہ آئے۔

مگر اس کے باوجود ہمارا پورا معاشرہ اور ہمارے اسلاف کی زندگی ہو کہ عید کی اس قربانی سے ناآشنائے محض! گویا رسول خدا کی ترغیب و تہدید سے بھی ان کے کانوں پر جوں نہ رینگی؟ جبھی تو ہمیں ان کے کسی ایسے عمل کی ہوا تک نہ لگی! ـــــ قربان ہو جائیے اس عرب معاشرہ کی سادہ لوحی پر کہ اس نئی دریافت" پر ایک عام ہیجان تو درکنار کسی ایک فرد کے ذہن میں بھی یہ بدیہی سوال پیدا نہ ہوا بلکہ لگے سب کے سب آمنّا و صدّقنا کہتے ہوئے قربانی کرنے۔ کیا یہ عقل میں آنے والی بات ہے اور کوئی عقل والا ایسی صورت حال فرض بھی کر سکتا ہے؟

پھر اس سے کیا ثابت ہوا؟ اس سے بالکل دو اور دو چار کی طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قربانی کے عمل ہی کی نہیں، قربانی کے حکم کی بھی روایات ہر کذب و خطا سے پاک ہیں۔ اور اُمت کے عمومی توارث عمل نے ان کی پوری پوری تصدیق کی ہے ـــــ یعنی یہ روایتیں اگرچہ دیر سے بھی مدوّن ہو کر منظرِ عام پر آئی ہوں مگر ان پر کوئی انکار اور استعجاب و احتجاج نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ قربانی کا عمل پورے عموم کے ساتھ نسلاً بعد نسلٍ اُمت میں منتقل ہوتا چلا آرہا تھا ـــــ اور یہ عمومی توارث کی شہادت کسی دعوے کا وہ ثبوت ہے جس کی قوت اور قطعیت سے وہی شخص انکار کر سکتا ہے جو موجودہ قرآن کے اصلی قرآن ہونے میں شک کرنے کو تیار ہو، کیونکہ اس کے لیے بھی ہمارے پاس آج سب سے بڑا ثبوت یہ توارث ہی ہے۔

بہر حال لاریب یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی حج کے مخصوص دن (۱۰ ذی الحجہ۔ یوم النحر) والی قربانی' عید کی قربانی کے عنوان سے حج کے باہر بھی پابندی

کے ساتھ کی ہے اور اس کا اسی طرح حکم بھی دیا ہے ـــــ پس اب کیا تأمل ہو سکتا ہے کہ یہ قربانی رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین ہے، نہ کہ بعد میں کسی کی ایجاد و اختراع!

یہ تو تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قربانی کے قولی و عملی ثبوت کی بحث اور یہ ایک مومن کے لیے سمعنا واطعنا کہنے کو بالکل کافی ہے، لیکن اس موضوع پر گفتگو صرف ایک خشک ثبوت اور ضابطہ کی کارروائی پر ختم نہیں ہو جاتی ہے بلکہ اسلام میں قربانی کے اجراء کا جو پس منظر صدر میں بیان کیا گیا ہے اسے اگر نگاہ میں رکھئے تو یہ بات بڑی صحیح اور وجدان و فطرت کا عین تقاضا نظر آتی ہے کہ قربانی کا یہ حکم حجاج کی تعداد ہی تک محدود نہیں ہونا چاہیے تھا، بلکہ پوری امتِ مسلمہ جس کی اکثریت حج کی استطاعت نہیں پا سکتی، اس سبھی کو اسلام کامل کا رمز رکھنے والے اس عمل سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملنا چاہیے تھا۔ بالفاظ دگر اگر ابراہیمی انداز کی قربانی ہی وہ عمل ہے جس سے "اسلام" کی اصل کیفیت ظاہر ہوتی ہے اور اسی عمل کو اپنے کرنے کی حد تک کر گزرنے پر ابراہیمی کیش و ملت کو "اسلام" کا نام ملا۔ تو اس کیش و ملت کے پیروؤں میں اس کی حقیقی روح سدا برقرار رکھنے کے لیے اگر یہ مناسب اور تقاضائے عقل و فطرت تھا کہ اس جذبۂ ابراہیمی کا کوئی رمز ملتِ ابراہیمی میں مستقل طور سے ودیعت کر دیا جائے، اور کوئی ایسا عمل جو اس جذبے اور شیوۂ تسلیم و رضا کا غماز ہو مشروع کر کے مستقل جزوِ ملت بنا دیا جائے، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اس تشریع کو حجاج ہی تک محدود رکھا جاتا جن کی تعداد "امتِ مسلمہ" کے پھیلاؤ کو دیکھتے ہوئے بڑی تھوڑی تھی۔ دل کہتا ہے کہ بالکل یہی ہونا چاہیے تھا کہ اگر حجاج کو ان باتوں سے اپنے امام و پیشوا (ابراہیمؑ) کے جذبۂ فدائیت کے اظہار کی سعادت ملے ـــــ وہ لبیک لبیک کہتے ہوئے معبود کے در اقدس پر پہنچیں۔ اس کے گھر کا طواف پر طواف کر کے اپنا پورا وجود نثار کر دینے کا اشارہ کریں، حجرِ اسود کو چوم کر اور آنکھوں سے لگا لگا کر چشمِ تصور میں خود اس کی دست بوسی کریں اور اشک ہائے عبدیت کی نذر اُتار کر تسلیم و وفا کا بھرپور اظہار کریں۔ کبھی ملتزم سے چمٹ کر روئیں اور گڑگڑائیں اور کبھی صفا و مروہ کے درمیان دوڑیں کہ اے ربِّ ابراہیمؑ تو کہاں ہے؟ کہ اب یہ سر وبالِ دوش اور دم تیرے قدموں پر نکلنے کے لیے بے تاب ہے۔

کبھی عرفات کے میدان میں حسرتیں نکالنے کی کوشش کریں، اور پھر بھی تسکین تمنا نہ ہو تو منی جا پہونچیں اور اپنے امام و پیشوا کی اقتدا میں کسی دوسری ہی جان کا نذرانہ پیش کر کے ایک گونہ تسکین کا سامان مہیا کرلیں۔ بیشک یہ اتنا بہت تو حجاج ہی کا حصہ ہے۔ ہم نہیں پہونچ سکے تو لبیک لبیک کیا کہیں؟ خانۂ کعبہ ایک ہی ہو تو اس سے دور رہ کر طواف کاہے کا کریں؟ ملتزم ہمیں نصیب نہیں، حجر اسود سے ہم دور کہ دست بوسی کا رمز پیدا کرسکیں، صفا و مروہ کے دامن تک ہمیں رسائی نہیں کہ جوشِ جنوں دکھا سکیں۔ لیکن دل کہتا ہے کہ اگر حجاج کو یہ دس باتیں نصیب ہیں تو دو ہم بے نصیبوں کے حصہ میں بھی آجانی چاہئیں۔ ہم ہزار کوتاہ دست و شکستہ پا سہی کہ اپنے امام و پیشوا کی اذانِ حج پر لبیک نہ کہہ سکے مگر اُمتِ مسلمہ میں تو ہم بھی ہیں۔ ہمارے اندر بھی اسلام کی حقیقی روح برقرار رکھنے کا کچھ نہ کچھ سامان ضروری ہے —— دل کی یہی آواز اور اُمتِ مسلمہ کی فطرت کی یہی خاموش پکار تھی جس کے جواب میں خدا نے اپنے رسول کے ذریعہ اعمالِ حج کا ایک حصہ اور حجاج سے ایک گونہ تشبہ کا سامان پوری اُمت کو بقدرِ استطاعت نصیب فرما دیا ——

حج والی قربانی کو حج سے باہر بھی جاری کرانے کا یہی فلسفہ ہو جسے عقل بھی تسلیم کرتی ہو اور فطرت بھی اس کی معقولیت پر شہادت دیتی ہے۔ ہم میں سے اربابِ استطاعت کو موقع دیا گیا (فقہ کی اصطلاح میں وجوب کہیے یا سنت) کہ وہ اپنے گھروں ہی پر رہتے ہوئے ابراہیم خلیل اللہ کی سنتِ قربانی کو ہر سال تازہ کر کے اُس مرموز جذبۂ ابراہیمی کی زندگی اور تازگی کا سامان کریں جو اسلام کی اصل اور اس کی روح و جان ہو۔ باقی کو بھی محروم نہیں رکھا گیا کہ عرفات کا والہانہ اجتماع نمازِ عید کی متبادل شکل میں عطا کر دیا گیا، اور ایسا نہ ہو کہ جو نہ قربانی کرسکے اور نہ عید کی نماز میں پہونچ سکے وہ ملتِ اسلامی کی تاسیس کے ان تاریخی ایام میں، جو روحِ اسلام کی بالیدگی کے لیے قدرتی طور پر نہایت سازگار ہیں، اس روح کی آبیاری کے کسی سامان سے بالکل ہی محروم رہ جائے اس لیے تیسری آسان ترین چیز یہ عطا کی گئی کہ ۹ رذی الحجہ سے ۱۳ رذی الحجہ تک ہر فرض نماز کے بعد اللہ کی تکبیر و تحمید کا غلغلہ بلند کرو۔ اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر لا اِلٰہ اِلا اللّٰہ واللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر و للّٰہ الحمد۔

پس اللہ کی رحمت اور سلام اس نبی پر جس کے صدقہ میں پوری اُمتِ مسلمہ کو اپنے امام و پیشوا

کی سنت نصیب ہوئی۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

بعض لوگ آپ کو اور ملیں گے، یورپ کی پھیلائی ہوئی افادیت پرستی جن کے روحانی حاسّہ کو کھا گئی ہے اُنھیں آپ کہتا ہوا پائیں گے کہ آخر یہ قربانی سے کیا فائدہ ہے؟ ثواب ہی مطلوب ہے تو اتنا روپیہ انفرادی طور پر خیرات کر دیجئے یا کسی اجتماعی نظم کے تحت غریبوں کی فلاح وبہبود پر خرچ کیجئے۔ اس سے تو سوائے اس کے کہ دو چار وقت آپ خود اور غربا، اناپ شناپ گوشت خوری کریں اور ایک خواہ مخواہ کی بہیمیت کا مظاہرہ ہو جائے اور کچھ نہیں! بھلا اللہ کو اس خونریزی سے کیا لینا ہے کہ یہ اس کی رضامندی کا ذریعہ بنے؟ اس کے نام پر کسی کو سلیقہ سے فائدہ پہونچائیے تو ثواب کی بات بھی ہے!

یہ مسلمان کہلانے والے سب وہ لوگ ہوں گے جو گوشت خوری میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں، مگر انھیں اپنی گوشت خوری اور اس کے لیے جانوروں کے ذبیحہ پر بہیمیت کا خیال کبھی نہیں آتا۔ ان کی ساری رحمدلی اور لطیف الحسی سال بھر میں صرف اسی ایک دن پھڑکتی ہے جب جانوروں کا ذبیحہ خود ان کے خالق کے نام پر کیا جاتا ہے۔

بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا؟

دوسری بات یہ کہتے ہیں کہ اس خونریزی میں ثواب کا کیا کام۔ اس سے اللہ کو کیا لینا؟ تو انھیں معلوم نہیں کہ یہ کوئی خاص عقلی انکشاف نہیں فرما رہے ہیں کہ اس سے قربانی کو عبادت سمجھنے والے مبہوت ہو کر رہ جائیں۔ یہ بات جو وہ آج بڑے عقلی طنطنے کے ساتھ کہتے ہیں خدا نے اسی دن صاف صاف بتا دی تھی جس دن قربانی کا حکم دیا تھا۔ سورۂ حج ہے جس میں قربانی کا بڑے شد و مد کے ساتھ مطالبہ ہے۔ اسی میں اللہ کی طرف سے اس حقیقت کا اظہار بھی ہے کہ

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا	خدا کو ہرگز ہرگز نہ تمھاری ان قربانیوں کا
وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ	گوشت پہونچتا ہے اور نہ ان کا خون! اس کے
يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ	حضور صرف تمھارے دل کا جذبۂ اطاعت

نیازمندی پہونچتا ہے۔[۱] (ع ۵)

تو یہ کوئی ایسا انکشاف نہیں فرما رہے ہیں کہ قربانی کرنے والے سوچنے لگیں کہ ہم کیا بیکار کام کر رہے ہیں؟ اور (خاکم بدہن) خدا کو نظر ثانی کرنی پڑے کہ اس نے کیا بے فائدہ کام کا حکم دے دیا۔

قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ — آپ کہیے کہ کیا تم کوئی ایسی خبر اللہ کو دے رہے ہو جس کا پتہ اُسے نہیں تھا؟ (یونس ع ۲)

اس حقیقت کا اسے اس وقت علم تھا، جب ہمارے اور ان اہلِ خرد کے ابو الآباء بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّيْن تھے۔ مگر پھر بھی اس نے قربانی کا حکم دیا جس کی حکمت کی طرف سورۂ حج کی اسی آیت کے آخری الفاظ (وَلٰكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوىٰ مِنْكُمْ) میں اشارہ بھی کر دیا گیا ہے — جس کو یہ اہلِ خرد از خود نہیں سمجھ سکتے تھے ــــــ اس حکمت کی تشریح ہم آگے کریں گے۔

تیسری بات اسی دوسری بات پر بنیاد رکھ کر یہ لوگ صدقہ و خیرات کی کہتے ہیں۔ مگر یہاں بھی سارے عقلی ادّعا کے باوجود یہ لوگ عقل سے اتنا بھی کام نہیں لیتے کہ قرآن کا خدا کیا صدقہ و خیرات سے ناآشنا تھا کہ اس نے صدقہ و خیرات جیسی "معقول" نیکی کے بجائے قربانی جیسی (معاذ اللہ) "نامعقول" نیکی کا حکم دے مارا، کیا ان مسکینوں کو اتنی بھی خبر نہیں کہ قرآن میں صدقہ و خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ کی تعلیم کا کیا مقام ہے اور کس قدر کثرت کے ساتھ اس تعلیم کا اعادہ کیا گیا ہے۔

---

[۱] یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس کی ایک ہی آیت کسی زمانہ میں ایک سمت کی گمراہی کا استیصال کرتی ہے تو دوسرے زمانہ میں اس کی بالکل مقابل سمت کی گمراہی کا توڑ بھی اسی طرح کرتی ہے کہ معلوم ہو صرف اسی گمراہی کے سدّباب کے لیے نازل ہوئی ہے۔ اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ مشرکین عرب قربانیوں کا گوشت اور خون خانۂ کعبہ کی دیواروں پر لگاتے تھے اور چپٹاتے تھے اور اس طرح گویا اللہ کو پہونچاتے تھے، بعض مومنین کو بھی یہی خیال پیدا ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ آج بات الٹ گئی ہے کہ لوگ لَنْ يَنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا کہہ کر مسلمانوں کو قربانی سے برگشتہ کرنا چاہتے ہیں تو یہی آیت انھیں جواب دے رہی ہے کہ تم یہ کون سی نئی بات بتا رہے ہو۔ یہ تو اللہ نے خود بتادی تھی اور اس کے باوجود قربانی کا حکم دیا تھا۔

پھر جبکہ یہ معلوم ہو کہ جس خدا نے قربانی کا حکم دیا ہو وہ نہ صرف صدقہ و خیرات سے بھی آشنا ہو، بلکہ اس کی نظر میں اس کا ایک عظیم مقام ہو۔ اور یہ حقیقت بھی نہ صرف اس پر کھلی ہوئی ہو بلکہ اس نے دوسروں پر بھی کھول دی ہے کہ قربانی کے گوشت پوست سے اللہ کو کچھ نہیں لینا۔ تو کم از کم کسی صاحب عقل کو یہ مشورہ دینے میں جلدی تو نہیں کرنی چاہیے کہ۔

قربانی کے بجائے صدقہ و خیرات کا حکم ہونا چاہیے تھا۔ قربانی میں تو بجز اضاعت مال کے اور کچھ نہیں۔

جہاں تک "بہیمیت" یا اس سے ملتے جلتے الفاظ سے قربانی کی رسم کو تعبیر کرکے اعتراض پیدا کرنے کا تعلق ہو، ہم نے اوپر اس کے جواب میں جو چند جملے کہے ہیں ان کی نوعیت اگرچہ الزامی ہو مگر انہی میں اصل جواب بھی پوشیدہ ہو، اور وہ یہ ہے کہ حلال چوپایوں کا، جب انسان اپنے ذائقہ اور اپنی ضرورت کے لیے خون بہاتا ہی ہے۔ اور اللہ نے ان چوپایوں میں دوسرے منافع کے ساتھ ساتھ ایک منفعت یہ بھی رکھی ہو۔ تو پھر یہ بڑی ناانصافی اور محسن فراموشی کی بات ہو کہ جس نے ان چوپایوں کو وجود بخشا۔ اس کے نام پر ان کو ذبح کرتے ہوئے آپ کو بہیمیت اور وحشت و بربریت کا تصور آنے لگے۔ حالانکہ اس صورت میں بھی وہ آپ کے اور آپ کے دوسرے بھائیوں کے کھانے ہی کے کام آتے ہیں۔ کوئی بیکار نہیں جاتے۔ ان کی کھالیں اور ان کا اُون الگ کتنے ہی دوسرے منافع کا باعث بنتا ہے۔ اور یہ سب خدا ہی کے اذن و حکم سے ہوتا ہے۔ اُسے خود یہ پسند نہیں ہو کہ اس کے نام پر ذبح کی ہوئی چیز بیکار جائے۔ چنانچہ یہ آیت (لن ینال اللہ لحومھا ولا دماءھا) مشرکین جاہلیت کے اسی غلط اعتقاد اور غلط طرز عمل کی تردید میں نازل ہوئی تھی کہ وہ اللہ کے نام پر ذبح کی ہوئی چیز کا گوشت پوست بھی اللہ ہی کے لیے چھوڑ کر بیکار کرتے تھے۔ اللہ نے اس کو جہالت کی بات ٹھہرایا اور اجازت دی کہ گوشت کھایا جائے، غریبوں کو کھلایا جائے اور پوست امور خیر میں صرف کیا جائے —— اس کے بعد تو قربانی کو بہیمیت اور وحشیانہ فعل کا نام دینا اور بھی غلط ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اب اس ذبیحہ میں اور ہمارے روز مرہ کے ذبیحوں میں اگر کوئی فرق ہو تو صرف ایک اعلیٰ نیت اور مصارف خیر کے حصہ کا!

اسی جواب سے "اضاعتِ مال" والے اعتراض کی بے بنیادی بھی پوری طرح آشکارا ہو جاتی ہے اب صرف یہ اعتراض کسی سطح بیں اور ظاہر پرست کے ذہن میں رہ سکتا ہے کہ جتنا روپیہ مجموعی اعتبار سے قربانی پر صرف ہوتا ہے اگر یہ روپیہ انفرادی صدقات و خیرات یا کسی اجتماعی نظم کے تحت ناداروں اور مستحق اداروں کی فلاح و بہبود میں خرچ کیا جائے تو اس سے قربانی کی نسبت بہت عظیم اور دور رس فوائد پیدا ہو سکتے ہیں ——— مگر جیسا کہ عرض کیا گیا یہ اعتراض یورپ کی پھیلائی ہوئی اسی افادیت پرستی کا نتیجہ ہے جس کے مسلط ہو جانے کے بعد آدمی کی نظر میں انسانی اعمال کی قدر و قیمت کا واحد پیمانہ مادی اور ظاہری افادیت بن جاتی ہے۔ اور وہ روحانی حاسۂ انسانی کھو بیٹھتا ہے جس سے دینی اعمال کی بنیادی قدر و قیمت محسوس کی جاتی ہے اور اعمالِ دینیہ کے اسرار کھلتے ہیں۔

افادیت پرستی کے مارے ہوئے یہ لوگ نقد صدقات و خیرات کو اس لیے معقول نیکی سمجھتے ہیں کہ اس سے بڑے پیمانہ کی اور پائیدار مادی فلاح و بہبود پیدا ہوتی ہے، یا ہو سکتی ہے۔ اور قربانی کی نیکی اس لیے ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ اس سے کسی بڑے اور دور رس مادی فائدے کا ظہور نہیں ہوتا۔ حالانکہ غربا، کو مادی افادیت کی ایک دینی قدر و قیمت کے ساتھ ساتھ صدقہ و خیرات کے نیکی ہونے اور اس میں دینی قدر و قیمت پیدا ہونے کی اصل بنیاد بالکل یہ نہیں ہے کہ اس سے کوئی چھوٹے یا بڑے مادی فوائد غربا، و مستحقین کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ صدقہ و خیرات کی کسی شکل میں دینی قیمت پیدا کرنے والی اور اس کو ایک دینی نیکی بنانے والی چیز صرف رضائے الٰہی کی نیت اور دینے والے کا جذبہ و احساس ہے کہ یہ "میرے مال" کے مالکِ حقیقی کا حق تھا جو میں ادا کر رہا ہوں۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب اصل بات کو سمجھئے کہ نقد صدقہ و خیرات کی بیشک ایک دینی قیمت ہے اور بہت بڑی ہے۔ مگر

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

قربانی کی جو خاص بات ہے وہ اس میں نہیں ہے۔ اس سے مال (سیم و زر) کا حق خداوندی ادا ہوتا ہے۔ اس حقیقت کی یاد دہانی ہوتی ہے کہ یہ اسی کی عطا و عنایت ہے۔ اس سے جذبۂ شکر ابھرتا ہے اور اس طرح رشتۂ عبدیت و معبودیت مضبوط ہوتا ہے ———

______ مگر اللہ کی عطا، صرف سیم و زر ہی تک تو محدود نہیں ہے۔ اس نے کتنے ہی انواع کے چوپایوں کی صورت میں بھی تو منافع کا ایک خزانہ دے رکھا ہے جس سے انسان دن رات متمتع ہوتا ہے، دودھ پیتا ہے، گوشت کھاتا ہے، کھیتی باڑی کا کام لیتا ہے۔ وغیر ذالک، کیا اس جاندار عطا و عنایت میں خدا کا کوئی حق نہیں ہے؟ اس پر اس میں جذبۂ شکر نہیں ابھرنا چاہیے۔ اور اس حقیقت کو یکسر فراموش کیے رہنا چاہیے کہ چوپایوں کی یہ منافع بھری دُنیا کس کا فیضِ کرم ہے؟ اور اس عظیم کرم کو رشتۂ عبدیت کی مضبوطی میں سرے سے کام ہی نہ آنا چاہیے؟ ______ حالانکہ عبدیت و معبودیت کا تمام تر رشتہ انہی کرم ہائے گوناگوں پر استوار ہے ______ قربانی یہی کام انجام دیتی ہے[1]۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا	اور ہر اُمّت میں ہم نے قربانی کا طریقہ
لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا	رکھا ہے تاکہ لوگوں کو اللہ کی اس عنایت
رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْاَنْعَامِ	پر اس کا نام لینے کی توفیق ملے جو اس نے
(الحج)	مویشیوں کی صورت میں فرما رکھی ہے۔

ان سب اموال سے بڑھ کر انسان پر اللہ کی سب سے بڑی عنایت خود اس کی جان ہے۔ مگر یہ اُس کا کرم ہے کہ اُس نے اس جان کا ... نذرانہ ان دوسرے جانداروں کی جان کی طرح طلب نہیں کیا۔ لیکن اسلام میں قربانی کی بات جہاں سے چلی ہے، یعنی سیّدنا ابراہیم و اسمٰعیل (علیہما السلام) کا واقعہ، وہ سوچنے والوں کو اس بات کا کھلا اشارہ دیتا ہے کہ قربانی کے حکم میں جہاں یہ حکمت تھی کہ مویشیوں کی صورت میں اللہ کی زبردست عطا کا شکرانہ ادا ہو وہاں ان جانداروں کی قربانی میں یہ رمز بھی رکھ دیا گیا ہے کہ قربانی کرنے والا خود اپنی جان بھی اسی طرح جان آفریں پر نذر کرنے کو تیار ہے[2]۔ مگر چونکہ اجازت نہیں اس لیے اس کے بدلے میں ایک دوسری جان نذر

[1] قربانی کی یہی وہ حکمت ہے جس کی طرف کہا گیا تھا "ولکن ینالہ التقوی منکم" میں بھی اشارہ موجود ہے۔

[2] راقم کا خیال ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سے امت مسلمہ کے لیے قربانی کی سنت کا اجرا جو اس طرح کرایا گیا کہ پہلے اسمٰعیل علیہ السلام کو چھری کے نیچے تک پہونچا دیا گیا (حالانکہ اہلِ تحقیق کے نزدیک ابراہیم علیہ السلام کے خواب کا اصل اشارہ یہ نہیں تھا۔ یا تھا بھی تو کم از کم اسمٰعیل علیہ السلام کو قربان کرا دینا تو منظور نہیں تھا) تو اس میں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ اصل قربانی کو یہ رمز دیا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کرتا ہوا وہ اپنے حقیقی جذبۂ فدائیت کو شکل مجاز پیش کرتا ہے۔ ـــــ اس طرح اس قربانی میں ایک عظیم عطا کا شکرانہ بھی ہوا اور خود اپنی جان کا نذرانہ بھی۔ اور یہ بات نقد صدقہ وخیرات سے کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتی۔ جبکہ اللہ سے رشتۂ عبدیت کی درستی اور مضبوطی کے لیے اس خانہ کا بھرنا صدقہ وخیرات والے خانہ کے بھرنے سے کسی طرح کم ضروری نہیں۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی ضروری نظر آتا ہے۔

ایک ضروری درخواست

استاذ الاساتذہ محدث عصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری علیہ الرحمۃ کے درس حدیث کی دو تقریریں "فیض الباری" اور "العرف الشذی" کے نام سے چھپ چکی ہیں۔ پہلی تقریر بخاری شریف کی ہے اور دوسری جامع ترمذی کی، العرف الشذی متعدد وجوہ سے نامکمل تھی، مگر بہرحال ان کتابوں میں حضرت مرحوم کی درسی تقریروں کا کافی ذخیرہ آگیا ہے مگر جتنا یہ ذخیرہ ہے اس سے بہت زائد ان کے تلامذہ کے پاس مخطوطات و مکتوبات کی شکل میں محفوظ ہے۔ وہ چاہے درس حدیث سے متعلق ہو یا عام مواعظ و ملفوظات سے۔ اب حضرت مرحوم کے تلامذہ کو اس ذخیرہ کو اُمت کا عام حق سمجھ کر اشاعت کے لیے دے دینا چاہیے۔ بجا طور پر یہ خطرہ ہے کہ یہ سب چیزیں محفوظ نہ کر لی گئیں تو آئندہ چند سالوں میں خدانخواستہ ضائع ہو جائیں گی اور علوم و معارف کی ایک بہت بڑی دولت سے اہل علم محروم رہ جائیں گے۔

واضح ہو کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کی اشاعت کا کام مجلس علمی ڈابھیل نے شروع کیا تھا یہ ادارہ اب کراچی میں کام کر رہا ہے۔ اس سلسلہ کا آئندہ سارا کام بھی اسی ادارہ سے ہوگا۔

لہذا جن حضرات کے پاس حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی جو علمی امانت ہو (جو ابھی شائع نہ ہوئی ہو) وہ "دفتر مجلس علمی، نیپیر روڈ کراچی" کے پتہ پر روانہ فرمادیں۔ ان سب چیزوں کی ترتیب اشاعت کیلئے ایک خاص منصوبہ مجلس علمی نے تیار کر لیا ہے۔

سید محمد ازہر شاہ قیصر
شاہ منزل۔ دیوبند

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مرحوم

کا

سفر نامۂ حجاز

(از، مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اُردو، فارسی کے ایک باکمال ادیب و شاعر اور نقاد کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔ ان کا کلیات، رقعات فارسی اور تذکرۂ گلشن بیخار ان کے ادیبانہ کمالات کے شاہد ہیں، لیکن انکی یہ حیثیت بہت کم مشہور ہو کہ وہ دین کے ایک اچھے عالم، وادی سلوک کے رہرو اور زائر حرمین شریفین بھی تھے ـــــ انھوں نے بڑے عاشقانہ انداز میں انتہائی مشقتوں کو جھیل کر سفرِ حجاز طے کیا ـــــ اور ایک پُر از معلومات سفرنامہ فارسی زبان میں ترغیب السالک الی احسن المسالک کے نام سے لکھا جس کا دوسرا نام رہِ آورد ہے ـــــ یہ روداد سفرِ حج مطبع مصطفائی دہلی میں ۱۲۸۳ھ میں شائع ہوئی تھی اور اب کمیاب ہے۔

نواب صاحب مرحوم، ار ذی الحجہ ۱۲۵۴ھ کو برائے سفرِ حج دہلی سے چلے اور دو سال چھ دن کے بعد، ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۵۶ھ کو حج و زیارت کی سعادت عظمیٰ حاصل کر کے دہلی واپس ہوئے۔ انکی نوابانہ زندگی میں فقر و تقویٰ کی جلوہ گری غالباً خاندان ولی اللہی کے فیض صحبت کی رہین منت ہے۔ سفرنامہ سے پتہ چلتا ہے کہ دہلی سے روانگی کے وقت وہ سب سے پہلے حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ کی خدمت میں دعاؤں کے لئے حاضر ہوئے اور جب وہ واپس ہوئے ہیں تو سب سے پہلے اُن ہی کے دیدار فیض آثار سے اپنی آنکھوں کو منور کیا۔

یہ سفر نامہ تین "گفتار" پر مشتمل ہے۔

پہلی گفتار —— دہلی سے بمبئی تک کے سفری واقعات ہیں۔

دوسری گفتار —— "سخنہائے متعددہ" میں جو بمبئی سے مکہ معظمہ و مدینہ منورہ تک اور وہاں سے واپسی میں بمبئی تک کے سفر سے تعلق رکھتے ہیں۔

تیسری گفتار —— میں بمبئی سے دہلی تک کے سفری حالات ہیں۔

دوسری گفتار میں سخنہائے متعددہ کے تحت سخن چہارم میں مناسکِ حج مفصل و مشرح طور پر بیان کئے گئے ہیں یہ حصہ ایک مستقل رسالہ کی حیثیت رکھتا ہے اور بہت جامع ہے۔ میں مناسکِ حج کے علاوہ بقیہ سفرنامے کا خلاصہ اُردو میں پیش کر رہا ہوں۔

نواب شیفتہ کے مختصر سوانح آپ نواب مرتضیٰ خاں مظفر جنگ بنگش رئیس جہانگیر آباد (ضلع میرٹھ) کے صاحبزادے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور وہاں کے باکمال اساتذہ سے علوم عربیہ اور فنون فارسیہ کی تکمیل کی۔ فن حدیث اور فن تجوید کی بھی تحصیل کی —— سفرنامے سے معلوم ہوا کہ انھوں نے مکہ معظمہ کے مشہور محدث شیخ عبداللہ سراج حنفیؒ کو اوائل صحاح سُنا کر شرف تلمذ حاصل کیا۔ اور مدینہ منورہ میں شیخ محمد عابد سندھیؒ کی خدمت میں اکثر کتبِ حدیث کے اطراف پڑھ کر اجازتِ روایت حاصل کی۔

اولاً شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ سے اور اُن کے بعد حضرت شاہ عبدالغنی محدث مجددیؒ سے سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت ہوئے۔ ۶۳ سال کی عمر پا کر ۱۲۸۶ھ میں انتقال فرمایا اور بستی حضرت نظام الدین اولیاءؒ میں اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔

دہلی سے روانگی ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۵۴ھ کو دوشنبہ کے دن شام کے وقت دہلی سے روانگی ہوئی سب سے پہلے عالم ربانی، قدوۃ الاتقیاء، زبدۃ المتورعین، شیخ الفقہاء، سیدالمحدثین مولانا محمد اسحاقؒ سے ملاقات کی اور دعا کے طالب ہوئے —— بعدہٗ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ میں پہونچے اور اپنے والد بزرگوار کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ اسکے بعد حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی قدس سرہٗ کے آستانے پر حاضر ہوئے اور وہاں قیام کیا۔

۱۸ر ذی الحجہ ــــــــ قطب صاحبؒ میں بسر کی

۱۹ر 〃 ــــــــ گڑگانواں

۲۰ر 〃 ــــــــ پاٹودی

۲۱ر 〃 ــــــــ ریواڑی

۲۲ر 〃 ــــــــ شاہجہاںپور

۲۳ر 〃 ــــــــ بڑوڈ ــــــــ بڑوڈ کے متعلق لکھا ہے کہ یہ الور کے متعلقات سے ہے۔ اس جگہ ایک صاحبدل کی تربت ہے وہاں پہونچ کر دلِ غمزدہ کو کشائش اور جانِ بیتاب کو آسائش حاصل ہوتی ہے۔

۲۴ر ذی الحجہ ــــ کوٹ پتلی ــــ یہ مضافات کھیتری سے ہے عاشقین و سالکین کی ایک جماعت یہاں آسودۂ خواب عدم ہے ــ کلّن شاہ مجذوب جو "بیخبرانِ آگاہ" اور "سرمستانِ ہشیار" میں سے ہیں ــ یہی مقام ان کی بیقراری کی قرارگاہ ہے۔

۲۵ر ذی الحجہ ــــ بہابرہ ــــ یہ موضع اپنی خرابی میں "رشک وادی مجنوں" ہے اور ریاست جے پور کی سرحد یہیں سے شروع ہوجاتی ہے۔

۲۶ر ذی الحجہ ــــــــ منوہرپور

۲۷ر 〃 ــــــــ اچرول

۲۸ر 〃 ــــــــ سواد جے پور ــــ جے پور کے متعلق لکھا ہے کہ یہ شہر وسیع ہے، یہاں کے بازار کشادہ ہیں، اسکی اکثر عمارتیں پتھر کی ہیں، آبادی دلخواہ اور گل و سبزہ کثرت سے ہے۔ بیر بھی یہاں اچھے ہوتے ہیں، مگر آم یہاں کم پیدا ہوتا ہے۔ یہاں مولانا ضیاء الدین چشتی نظامیؒ جے پوری (خلیفہ حضرت مولانا فخر الدین چشتی دہلویؒ) کے سجادہ نشین سید رحمت علی سے ملاقات ہوئی، یہ متین اور دنیا سے بے تعلق بزرگ معلوم ہوئے ــ چار روز جے پور میں قیام رہا۔

۳ر محرم الحرام ۱۲۵۵ھ ــــ جے پور سے چل کر بگرو قیام کیا۔

۵ر 〃 〃 ــــ ڈوڈو ــــ اس جگہ علاقہ جے پور ختم ہوجاتا ہے۔

ان دونوں منزلوں کے متعلق لکھا ہے کہ یہاں قزاقوں کا بڑا چرچا ہے اور سرائے بھی نہیں۔

۶ محرم ۱۲۵۵ھ ـــــ کشن گڈھ ـــــ یہاں پر فیض اللہ خاں بنگش کی بنوائی ہوئی ایک سرائے ہے جو مسافروں کے لئے آرام دہ ہے۔

۷ محرم ۱۲۵۵ھ ـــــ دار الخیر اجمیر ـــــ یہاں سب سے پہلے خواجہ معین چشتی قدس سرہٗ کے مزار پُر انوار کی زیارت کی ـــــ لکھا ہے کہ میں درگاہ کی دلربائی اور اُس مسجد کی خوبصورتی کا کیا حال بیان کروں جو متصل روضہ واقع ہے اور شاہجہاں بادشاہ کی بنوائی ہوئی ہے۔ اجمیر کی عمارتوں کا طرز جے پور کی عمارتوں کا سا ہے۔ حاکمانِ عصر اس شہر کی آبادی میں کوشاں ہیں اور جدید عمارتیں بنا رہے ہیں جس سے عجیب رونق ہے۔

اجمیر میں سید تفضل حسین خاں سے ملاقات ہوئی۔ یہ خیر آباد کے ایک بزرگ زادے ہیں ان کو دیکھتے ہی محبت کی ایک لہر دل میں دوڑ گئی، بہت ہی خلیق اور ہمدرد ثابت ہوئے۔ میں ان کے نام و نسب اور وطن سے بعد کو واقف ہوا تعریف کرنے والوں نے مجھے اس شخصیت کا پہلے ہی گرویدہ کر دیا تھا۔ جیسا سُنا تھا ویسا ہی پایا۔

چار دن اجمیر میں اقامت کے بعد ـــــ ۱۲ محرم کو نصیر آباد چھاؤنی پہونچے اسکے متعلق لکھا ہے "فرا ہمگاہ قشون انگریزی است۔"

۱۳ محرم ۱۲۵۵ھ ـــــ بھناہ ـــــ اس مقام پر انگریزوں کا علاقہ جو اجمیر سے شروع ہوا تھا ختم ہو گیا۔

۱۴ محرم ۱۲۵۵ھ ـــــ انگوچھہ ـــــ یہاں بھی کوئی سرائے نہیں۔ لکھا ہے کہ یہاں سے بڑودے تک بھی "دادِ بے مروتی" دی گئی ہے ـــــ یہ علاقہ میواڑ کا ہے۔ اور ریاست اودے پور کا علاقہ یہاں سے آگے کو شروع ہوتا ہے۔

۱۵ محرم ۱۲۵۵ھ ـــــ بھنیبرہ

۱۶ " " ـــــ بھیل واڑہ

۱۷ " " ـــــ سونڈانالی ـــــ ہمیر گڈھ میں قیام کرنا تھا، لیکن ہمیر گڈھ بھیلواڑہ سے پانچ کوس ہے اس مختصر فاصلے کی وجہ سے آئندہ

منزلیں دراز ہوجاتیں اس بنا پر ڈیڑھ کوس زیادہ چل کر سونوانان میں ٹھہرے۔

۱۸؍محرم ۱۳۵۵ھ ـــــ ریاست چتوڑ ـــ یہاں ایک قلعہ ہے جو پہاڑی کے اوپر واقع ہے۔ اس قلعے جیسی لمبائی، چوڑائی، مضبوطی اور بلندی دوسرے قلعوں میں کم پائی جاتی ہے ـــــ الغرض یہ ہندوستان کا مشہور قلعہ ہے۔ یہاں کا خربوزہ گفتار محبوب سے زیادہ شیریں ہوتا ہے ـــــ اودے پور کی عملداری یہاں ختم ہوجاتی ہے۔ نصیرآباد سے چتوڑ تک اگرچہ "کا جائے انگریزی"[1] مسافروں کے لئے بنے ہوئے ہیں، مگر واہ رے منتظمین اس بات کا لحاظ ہی نہیں رکھا کہ وہ آبادی سے قریب ہوں علاوہ ازیں اُن مسافر خانوں کے آس پاس درختانِ سایہ دار بھی نہیں کہ مسافر آرام کرسکیں اور سب سے بڑا ستم یہ کہ "چشمہ و چاہ" بھی ان عمارتوں سے دور ہیں، اسی وجہ سے یہاں ٹھہرنے سے انسانوں اور جانوروں کو بیحد تکلیف ہوتی ہے۔ خصوصاً موسم گرما میں۔

۱۹؍محرم ۱۳۵۵ھ ـــــ نیم ہیڑہ ـــ یہ قصبہ متعلقاتِ ٹونک سے ہے اور نواب محمد وزیر خاں خلف الرشید نواب محمد امیر خاں مرحوم کے تحتِ حکومت ہے۔

۲۰؍محرم ۱۳۵۵ھ ـــــ نمچ (نیمچ) ـــ یہ جگہ اگرچہ مضافات گوالیار سے ہے، لیکن عساکرِ انگریزی یہاں قیام پذیر ہیں ـــ نیمچ میواڑ اور مالوہ کے درمیان ایک برزخی جگہ ہے۔ یہاں پر چھ روز قیام رہا۔

۲۷؍محرم ۱۳۵۵ھ ـــــ ملہار گڈھ

۲۸؍ " " ـــــ مندسور ـــ یہ شہر متعلقات گوالیار سے ہے۔

۲۹؍ " " ـــــ کچنارہ ـــ

۳۰؍ " " ـــــ جاورہ ـــ اس شہر کا انتظام نواب غوث محمد خاں سے متعلق ہے۔ نواب صاحب موصوف میری ملاقات کے لئے آئے اور دلجوئی و مہمانداری کے انتہائی مراسم انجام دئیے ـــ مجھے دو روز تک اپنے یہاں روکے رکھا، یہ نواب نوعمر ہیں لیکن بہت عقلمند ہیں ـــ "نسخۂ جامعۂ ادب و حیات و منتخبِ مجموعۂ مہر و وفا"

---

[1] ڈاک بنگلے۔

۳؍صفر المظفر ـــــ رتلام ـــــ یہ مقام اتنا طول وعرض رکھتا ہے کہ شہر کے حکم میں داخل کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی عمارتیں لکڑی کی ہیں۔ اس لئے اس کا بازار رونق سے گرا ہوا ہے سرزمین مالوہ کی مٹی کم پائدار ہے اسی بنا پر لکڑی کی عمارتیں بنائی جاتی ہیں اور لکڑی اس قدر مضبوط ہوتی ہے جس کا ٹھکانہ نہیں ـــــ اور یہ حکیم علی الاطلاق جل شانہ کی حکمتوں میں سے ایک حکمت ہے۔

پانی کی کمیابی پر ایک علمی لطیفہ

واضح ہو کہ آبِ طاہر، شروطِ حنفیہ پر ان منزلوں میں قطعاً دستیاب نہ تھا۔ مجبوراً بحکم اضطرار امام مالک علیہ الرحمہ کے فتوے پر عمل کرنا پڑا۔ اس لئے کہ بعض مقام ایسے آئے جہاں پانی کے معاملے میں مسلک امام شافعیؒ پر عمل کرنا بھی دشوار ہو گیا تھا ـــــ اب آگے اس سے بھی زیادہ پانی کی نایابی سننے میں آرہی ہے دیکھا چاہیئے آئندہ کس مشرب پر عمل کرنا پڑے۔

رتلام سے بڑودہ تک تین راستے جاتے ہیں اور تینوں راستے مخدوش ہیں۔ تفحصِ حال کی غرض سے ایک دن رتلام میں ٹھہرنا پڑا ـــــ ۵؍صفر کو ہی میں قیام ہوا ـــــ اس جگہ آبادی نہیں ہے۔ پھر آٹا کہاں اور گھی کجا ـــــ یہاں سے راجہ جہابوہ کی فرمانروائی شروع ہوتی ہے۔

۶؍صفر ـــــ کرراوو ـــــ محلِ ورود ہوا ـــ اگرچہ قرارگاہِ مسافراں ایک دوسرا مقام پٹلاوہ ہے لیکن وہاں سایۂ اشجار کم ہے اور پانی بھی ٹھیک نہیں ہے ـــــ ناچار کرراوو میں قیام کیا کہ یہاں فی الجملہ درختوں کا سایہ ہے اور پانی بھی برا نہیں ہے۔

۷؍صفر ـــــ بھگوڑ ـــــ اس مقام کو اس سے پہلے والی منزل سے سات کوس بتایا گیا تھا مگر ہمارے اطراف کے سولہ کوس کے برابر مسافت نکلی اور راستے بھر پانی نہیں ملا حتیٰ کہ بھگوڑ میں بھی ـــــ یہاں ایک نہر ضرور ہے سو وہ بھی موسم گرما کے باعث خشک ہے۔ راستے میں کوئی جگہ ایسی نہ آئی جہاں ایک دو نہریں نہ ملی ہوں مگر پانی کسی کا بھی تابستان کے باعث رواں نہیں ـــــ الا ماشاء اللہ ـــــ اس وادی میں شیر بہت ہیں ہماری اقامت گاہ ان درندوں کی گذرگاہ ہے ـــ بعد کو معلوم ہوا کہ اس منزل کو اختیار کرنے میں خطا ہوئی۔ شیو گڈھ میں اترنا چاہیئے تھا ـــ خیر رات یہیں بسر کر دی۔

۸؍صفر ـــــ ایک غیر آباد مقام پر قیام کیا۔

۹ر صفر ـــــ دوحد ـــ یہ جگہ مضافات گوالیار سے ہے۔ بیرون قصبہ ایک چشمے کے کنارے قیام ہوا۔ اس مقام کو دوحد اس لئے کہتے ہیں کہ یہ مالوہ اور گجرات کے درمیان حد فاصل ہے۔ عالمگیر بادشاہ اسی جگہ پیدا ہوئے تھے شاہجہاں نے اس شہر کو آباد کیا ہے۔

۱۰ر صفر ـــــ جے کوٹ ـــــ یہ بھی غیر آباد مقام ہے لیکن دور تک پانی نہ ملنے کے اندیشے سے مجبوراً یہیں قیام کیا گیا۔

۱۱ر صفر ـــــ "زبونی فرودگاہ" کے باعث ہتھی درہ میں قیام نہیں کیا اسکے آگے پانیا میں اترے ـــ یہاں بھی پانی ضرورت سے کم ہے اور اشیائے خوردنی نایاب ہیں۔

۱۲ر صفر ـــــ اڈواڑہ ـــــ یہاں ایک چشمے کے کنارے خیمہ زن ہوئے ـــ یہاں بھی سامانِ خورش حاصل نہیں ہوتا البتہ ایک دوسری جگہ ایک دیہاتی کی دوکان سے کھانے کی چیزیں لی جاسکتی ہیں۔

۱۳ر صفر ـــــ گودرہ ـــــ یہ اچھا قصبہ ہے گوالیار کی عملداری میں ہے۔

خارستان واضح ہو کہ زتلام سے گودرہ تک ایک ایسا خارستان مسلسل چلا جارہا ہے کہ ہوا بھی وہاں سے دامن کشاں گزرتی ہے۔ اس خارستان کے خوف کے باعث ہی پانی بھی اس وادی سے گریزاں ہے ـــ

۱۵ر صفر ـــــ موضع کلول ـــ مہبط نزول ہوا ـــــ گودرہ سے کلول تک صحرا کی جو تروتازگی دیکھی وہ بیان نہیں ہوسکتی۔ اشجار گوناگوں کی کثرت، گلہائے رنگ رنگ کی فراوانی ـــ طیور رنگین ادا کی جلوہ گری اور مرغان خوش الحان کی زمزمہ سنجی کی وجہ سے یہ قطعہ بہت عمدہ تفریح گاہ ہے ـــــ یہاں ابھی آم کچا ہے لیکن اس قدر بڑا ہے کہ دوسرے علاقوں کے پکے آم بھی اسکے ہموزن نہیں ہوسکتے۔

۱۶ر صفر ـــــ جرود ـــــ یہ موضع راجہ بڑودہ کے علاقے میں ہے۔

۱۷ر " ـــــ بڑودہ ـــــ یہاں پر نواب حسام الدین حسین خاں فرزند نواب کمال الدین حسین خاں جو کہ راجہ بڑودہ کی ریاست کے بڑے امراء میں سے ہیں۔ باوجود عدم تعارف و شناسائی میرے استقبال کے لیے بیرون شہر آئے اور اپنے کاشانے میں آتارا۔

حد درجہ مہماں نوازی کی۔ اُن کی صفات حمیدہ کی شرح نہیں کی جا سکتی ـــــ اُن کے چچا نواب جمال الدین حسین خاں نے بھی مجتہائے فراواں کی پیش کش کی ـــــ یہ بھی فضل و کمال والے ہیں اور مراتب تقویٰ میں بے نظیر ـــــ فقہ اور اصول میں مہارت تام رکھتے ہیں۔ سلسلہ چشتیہ میں جناب مولوی غلام قطب الدین خلف الصدق مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہما سے بیعت ہیں۔ بڑے مخلص آدمی ہیں، ان کو شعر و شاعری سے بھی شوق ہے۔ قطبی تخلص ہے ـــ اُردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں فکرِ سخن کرتے ہیں۔ اپنے کچھ اشعار اپنے قلم سے لکھ کر مجھے عنایت فرمائے اور مجھ سے بھی یہ خواہش ظاہر فرمائی کہ میں بھی اپنا کلام ان کو دوں ـــــ اُن کے بعض اشعار بنظر ارمغانی اور بہ نیت تبرک یہاں بھی پیش کرتا ہوں ـــ ایک قطعہ میں جو عربی زبان میں ہے۔ بڑھاپے سے پہلے اپنے دانتوں کے ٹوٹ جانے کا نکتہ بیان کیا ہے۔

کم نکبۃٍ للہِ فیہا رحمۃٌ ولربَّ ضرٍّ مسّنا لمنافعٖ

کذہابِ اسنانی قبل مشیبتی کے لا اعضّ علی الشباب صابعی

یعنی بہت سی مصیبتیں ایسی ہوتی ہیں ہیں جن میں اللہ کی طرف سے رحمت پوشیدہ ہوتی ہے اور بہت سے ضرر ایسے ہوتے ہیں جن میں منافع مضمر ہوتے ہیں ـــ جیسا کہ میرے دانتوں کا بڑھاپے سے پہلے پہلے ٹوٹ جانا اس میں یہ مصلحت معلوم ہوتی ہے کہ میں شباب کے چلے جانے پر افسوس کرتے ہوئے دانتوں سے اپنی انگلیاں نہ کاٹ لوں۔

اُن کی فارسی کی دو اخلاقی رباعیاں یہ ہیں:۔

(۱) جز شیوۂ صمت ار نہ جوئی اولیٰ در راہِ فضول ار نہ پوئی اولیٰ

چیزیکہ نہ پرسند نہ گوئی اولیٰ چیزیکہ نگویند نپرسی بہتر

یعنی بہتر یہ ہے کہ تو شیوۂ خاموشی اختیار کرے اور راہِ فضول میں گامزن نہ ہو ـــ جس بات کو کوئی بیان نہ کرنا چاہیئے اس کا معلوم نہ کرنا اور جس بات کو دریافت نہ کریں اس کا بیان نہ کرنا ہی اچھا ہے۔

(۲) دستت چو فراخ نیست دل تنگ مکن | جز تن برضا سپردن آہنگ مکن
ایں اہل و عیال و نفس اعدائے تو اند | با دوست برائے دشمناں جنگ مکن

یعنی اگر تجھے فراخ دستی حاصل نہیں ہے تو اپنے دل کو رنجیدہ نہ کر۔ بس راضی برضا رہ (دلے غافل) تیرے اہل و عیال اور تیرا نفس تیرے دشمن ہیں، دشمنوں کی خاطر، محبوب حقیقی سے مت بگاڑ لینا۔

اسی شہر بڑودہ میں ملا مہدی صفاہانی سے بھی تعارف ہوا۔ بقول خود ایک مثنوی بطرز مثنوی معنوی اسی بحر میں انھوں نے لکھی ہے ــــ حافظ غلام حسین بھی اس شہر کے معزز رؤسا میں سے ہیں ان سے بھی سلسلہ محبت قائم ہو گیا۔ جو اعلیٰ صفات میں نے اس شخص میں پائے اگر ان کو بیان کردوں تو "گرفتاران رسم و عادت" باور نہیں کریں گے۔ اس لیے میں انکا بیان چھوڑتا ہوں۔

بڑودہ ایک آباد شہر ہے۔ لیکن ــــ خنزیروں کی کثرت کے باعث جو ہر کوچے میں آوارہ پھرتے نظر آتے ہیں، سیر و تفریح کے لائق نہیں ــــ میوہ جات کثرت سے ہیں خصوصاً آم ــــ یہ موسم اگرچہ گرمی کا موسم ہے لیکن یہاں نہ خورشید کی شعلہ فشانی ہے نہ سموم و صرصر کا نام و نشان۔ آندھی اس علاقے میں کم چلتی ہے ــــ نواب حسام الدین خاں نے مجھ سے اصرار کیا کہ موسم برسات یہاں گزاردوں لیکن دل چونکہ دوسری جگہ (حجاز) کا مشتاق ہے اس لئے کہیں نہیں لگتا۔

۲۶ر صفر ــــ انیٹھو

۲۷ر " ــــ ٹنکاریہ

۲۸ر " ــــ بڑوچ ــــ مشہور شہر ہے۔ یہاں انگریزوں کی حکومت ہے۔ یہ سرزمین اکثر "غنودگان بیداردل" کی خواب گاہ ہے ــــ میں نے ان میں سے دو بزرگوں کے مزارات کی زیارت کی ہے۔

(۱) سید اسمٰعیل زمزمی ــــ اِن کو پیر چھپر بھی کہتے ہیں۔ کرامت سید تاحال موجود

مشہور ہے کہ گرداگردِ مزار انور پانی جاری ہے ایک ہاتھ گہرائی میں اور ایک بالشت چوڑائی میں ——— ہزاروں آدمی اس پانی سے سیراب ہو جائیں پانی بحالہ رہے گا۔

(۲) سید احمد بن شیخ عیدروسیؒ[1] ——— اس علاقے میں سلسلۂ عیدروسیہ کے مشائخ زندہ و گزشتہ کثرت سے ملیں گے۔

بڑودچ دریائے نربدا کے کنارے واقع ہے۔ اس مقام تک سمندر کا جزر و مد اثر انداز ہوتا ہے، اس موسم میں کہ سمندر کی بدمستی کا زمانہ ہے آب نربدا کھاری ہو رہا ہے۔ برسات اور سردیوں میں اس کا پانی میٹھا رہتا ہے۔

۲۹ صفر ——— دریائے نربدا کو عبور کر کے انکلیسر میں قیام کیا۔

یکم ربیع الاول ——— چوکی میں اقامت ہوئی ——— بڑودے سے سورت تک ہر منزل میں پارسیوں نے مسافر خانے بنائے ہیں ——— نیز انگریزی کوٹھیاں بھی ہر قوم کے معززین کے واسطے بنی ہوئی ہیں۔

۲ ربیع الاول کو بندرگاہ سورت پہونچے ——— سورت ایک بڑا اور آباد شہر ہے مگر اسکی گلیاں تنگ و تاریک ہیں ——— اسکی ہوا بارد و مرطوب ہے جو گرم مزاجوں کے واسطے مناسب ہے۔ شہر کی آبادی دریائے تپتی (تاپتی؟) کے کنارے ہے۔ یہ دریا بھی نربدا کی طرح جزر و مد رکھتا ہے۔ امراء میں سے اس شہر میں دو بڑے آدمی ہیں۔

(۱) نواب قمر الدولہ افضل الدین خاں بہادر حشمت جنگ (۲) نواب معین الدین خاں کہ اُن کو بخشی بھی کہتے ہیں۔ نواب معین الدین خاں کو راقم کے ساتھ رابطۂ اتحاد ہو گیا وہ بہت اچھے آدمی ہیں ——— قیام پہلے تو ظفریاب خاں کے مسافر خانے میں رہا پھر نواب صاحب مذکور کی کششِ محبت نے اُن کے پڑوس میں لاکر ٹھہرا دیا ——— سورت میں اکابر و مشائخ کثرت سے ہیں لیکن جن سے راقم کو شرف ملاقات حاصل ہوا۔ اُن کا ذکر کرتا ہوں۔

(۱) اس جگہ کے سرخیلِ مشائخ سید محمد عیدروسی ہیں ان کی عمر اسّی سے متجاوز ہے۔

---

[1] اس مقام پر سفرنگار نے عیدروس کی وجہ تسمیہ بھی لکھی ہے۔

باوجود پیرانہ سالی کے ـ خندہ رو، فرخندہ خو، شگفتہ مزاج اور کشادہ دل ہیں۔ محبت سے پیش آئے ان کی صحبت عجب تاثیر رکھتی ہے۔ سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود کے آئینہ دار ہیں۔

(۲) عقلائے شیوخ میں سے ایک شیخ پیر ہیں۔ دلجوئی اور دلنوازی، شگفتگی اور محبت ان میں کامل طریقے پر موجود ہے ـ حضرت مولانا محمد کرم اللہؒ کا مزار منور، شیخ پیر کی خانقاہ میں اندرونِ احاطۂ حافظ بہادرؒ ہے ـ حافظ بہادر زمرۂ اولیاء میں سے ہوئے ہیں ـ مولانا محمد کرم اللہؒ کی تربت پُر نور کی زیارت سے سعادت اندوز ہوا ـ مولانائے مرحوم فقیر کے اساتذہ میں سے تھے ـ وہ شفقت کہ جس سے بالاتر متصور نہیں وہ میرے اوپر کرتے تھے۔ اُن کا وطنِ شریف "حضرتِ دہلی" ہے۔ ایک بار حج کر کے دہلی واپس ہو گئے تھے دوبارہ سفرِ حج کا ارادہ کیا تو سورت پہونچ کر مرضِ سرطان میں وفات پائی ـ ماہ شعبان ۱۲۵۷ھ میں ـ ان کے فضائل کیا بیان کروں، دفتروں میں نہیں سما سکتے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضرتِ والا جامع علوم ظاہر و باطن تھے۔ فنِ حدیث میں ان کو جو مہارت حاصل تھی وہ کسی میں کم ہوتی ہے۔ حقائق و معارف کے لحاظ سے ان کا جو مرتبہ تھا وہ کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ان کی مشغولیٔ باطن، بطریقہ نقشبندیہ مجددیہ تھی ـ فنِ قرأت و تجوید میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے ـ

(۳) اکابر میں سے ایک بزرگ، شیخ خوب میاں ہیں۔ بڑے صاحب مروت اور باوقار بزرگ ہیں ـ ان بزرگوں کے علاوہ دیگر معززین شہر سے بھی ملاقات ہوئی اگر ان سب کا ذکر کیا جائے تو سخن دراز ہو جائے ـ لیکن حکیم کمال الدین کے ذکر سے خاموش نہیں رہا جا سکتا یہ بھی بہت سی خوبیوں سے متصف ہیں ـ سورت سے سات کوس پر اُن کی قیام گاہ ہے اس مقام کا نام ڈومس ہے۔ اس مقام کی ہوا معتدل ہے۔ ایک روز وہاں گیا اور ایک رات بسر کی۔

جس زمانے میں سورت آنا ہوا۔ سفرِ دریا کا زمانہ گذر چکا تھا۔ براہِ دریا سورت سے بمبئی جانا مشکل تھا، لا محالہ خشکی سے سفر کرنا تھا۔ لیکن جب بارش کا آغاز ہوا تو راہِ خشکی

بھی مسدود ہوگئی اس طرف کی مٹی نم آلود ہو کر دلدل بن جاتی ہے۔ ابھی ہمارے دیار کے حساب سے موسم برسات
کے شروع ہونے میں ایک ماہ باقی ہے لیکن یہاں بارش خوب ہو رہی ہے، بادل ہجوم کر رہے ہیں،
برقِ خاطف شعلہ زن ہے، بادل کڑک رہا ہے ـــــ پھر بھی

ع قدم عشق پیشتر بہتر

کچھ دنوں بعد ہنگامہ ابر و باد فرو ہوگیا اور کچھ کچھ راستہ کھلا ہے۔ شہریوں نے ابھی چلنے کو منع کیا۔ ہمراہیوں
نے ابھی کچھ اور ٹھہرنے کے لئے حیلہ جوئی کی لیکن جوش جنون عشق، گریباں گیر تھا۔ کسی کی نہ سنی اور ۲؍ ربیع الثانی
کو پابرکاب ہوگیا ـــــ سب ساتھی خوف زدہ تھے کہ اگر راستے میں بارش ہوگئی تو چلنا مشکل ہوجائے گا۔
لیکن مجھے کریم کارساز پر پورا بھروسہ تھا اور اپنے ساتھیوں سے کہدیا تھا کہ اگر راہ میں کسی جگہ وہ بات پیش
آجائے جس کا تمھیں اندیشہ ہے تو وہیں ٹھہر جائیں گے۔ جب وطن سے نکل کھڑے ہوئے تو آباد شہر اور غیر آباد
دیہات سب برابر ہیں ـــــ القصہ لاچ پور میں جو سورت سے سات کوس پر ہے۔ منزل کی ـــــ
مبارز الدولہ سیدی ابراہیم یاقوت علی خاں معروف بہ نواب بالوجہ اس جگہ کے بااقتدار رئیس ہیں انھوں
نے ایک باغیچے میں جو ایک دریا کے کنارے ہے ـــ ہمیں ٹھہرایا ـــ یہ بھی بڑے مبارک آدمی ہیں ـــ
بہت خلیق ہیں اس دیار کا ہر چھوٹا بڑا انکی تعریف کرتا ہے ـــ ان کو شعر کا بھی شوق ہے ـــ مثنوی
میر حسن فارسی میں نظم کی ہے اس کا کچھ حصہ بھی سنایا۔

۳؍ ربیع الثانی ـــــ نوساری پہونچے ـــ نوساری بڑا قصبہ ہے تمام چیزیں وہاں
مہیا ہیں وہاں بھی اولیاء اللہ محو خواب ہیں ـــ اُن میں مشہور ترین سید نور الدین علیہ الرحمہ ہیں جن کو
نبیرۂ حضرت جعفر صادقؒ بتاتے ہیں۔

پارسی اگرچہ گجرات و دکن کے اکثر شہروں میں پائے جاتے ہیں خاصکر سورت و بمبئی میں لیکن
انکی اصل نوساری ہے۔

۴؍ ربیع الثانی ـــــ ایک دریا کے کنارے کہ قصبہ بلساڑ اس کی دوسری طرف واقع
ہے رات بسر کی ـــ جب ہم ساحلِ دریا پر پہونچے تو وہ وقت دریا کے جوش و مد کا تھا بغیر کشتی
کے گذرنا محال تھا ـ بلساڑ، نوساری سے سترہ کوس پر ہے دریا کے اس طرف پہونچتے پہونچتے
شام ہوگئی۔ تھکاوٹ اور علالت مزاج کی وجہ سے عبورِ دریا سے قاصر رہے۔

۵ ربیع الثانی کو بلساڑ پہونچنا ہوا ــــ یہ ایک بڑا قصبہ ہے، کافی رونق دار ہے ــ بلساڑ سے پانچ کوس پر ایک قریہ ہے پاڑی نام، رات وہاں بسر کی۔

۶ ربیع الثانی کو دمن اترے دمن دو ہیں ایک خرد، ایک کلاں اور دونوں ساحل بحرِ محیط پر بجانب شرق واقع ہیں ــــ ہم دمن خرد میں ٹھہرے تھے دن کے آخری حصے میں چند آدمیوں کے ساتھ بطور تفریح شعبۂ دریا کو عبور کر کے دمن کلاں گئے۔ ان دونوں جگہوں کی حکومت شاہِ پرتگال سے تعلق رکھتی ہے۔

۷ ربیع الثانی کو کشتی کے ذریعے شعبۂ دریا سے گزر کر عمر گاؤں میں آرام کیا۔

سورت سے بمبئی تک خرابی راہ کا ذکر ہو چکا ہے اسی بنا پر ایام برسات میں دمن سے پرانا راستہ چھوڑ کر دریائے شور کے کنارے کنارے چلے ــ کیونکہ وہاں دلدل کا وجود نہیں ہے۔

کرم کردگار دیکھو کہ احاطۂ ابرِ غلیظ اور لمعہ فروشیِ برق اور صور نوازیِ رعد کے باوجود جس کو دیکھ کر اور سن کر مسافروں کے پتے پانی ہو رہے تھے ایک قطرہ راستے میں نہیں برسا اور یہ سخت راستہ آسانی سے قطع ہو گیا۔ ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہٗ

۸ ربیع الثانی ــــــ ڈہنو

۹ " ــــــ دریائے شور پار کر کے مرمہ پہونچے جو ایک اجڑا ہوا گاؤں ہے۔

۱۰ " ــــــ دنتورا پہونچے جہاں راقم کو آزار شکم لاحق ہو گیا۔

۱۱ " ــــــ لمبتی اترے۔ لمبتی اچھا قصبہ ہے۔ چونکہ بیماری بڑھ گئی تھی مجبوراً ایک روز زیادہ یہاں ٹھہرنا پڑا۔

۱۳ ربیع الثانی کو گھوڑ بندر قیام کیا اور ۱۴ ربیع الثانی کو دوپہر کے وقت مہائم پہونچے۔ بمبئی ــ مہائم سے تین کوس ہے ــ مہائم کو باب بمبئی کہتے ہیں ــــ نقیہ علی مصنف تفسیر رحمانی کا مزار یہاں پر ہے۔ یہ بزرگ مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کے ہمعصر تھے۔

میں تمام سامان مہائم میں چھوڑ کر بمبئی چلا گیا اور ایک دن ایک رات کے بعد ۱۵ ربیع الثانی کو شام کے وقت واپس آیا چونکہ قلعہ و شہر کے مکانات کا صحن عنقا ہے اور میں وسعت صحن کا خوگر ہوں اسلئے کہیت باڑی میں جو کہ بیرون شہر ہے اور متصل شہر بھی ــ ایک دلکشا باغ اور مصفا و منقش

مکان منتخب کرلیا گیا ـــــــ تین روز ترتیب مکان کے انتظار میں حمائم میں ٹھہرنا ہوا۔
حمائم سے بمبئی تک اگرچہ دوکان و بازار، فروشندہ وخریدار نہیں، لیکن محلات دلپذیر اور باغات خوش انداز وخوشنما جلوہ گر ہیں۔

شہر بمبئی کے کیا کہنے ہیں۔ اسکے بازار کشادہ ہیں ـــ ہر جنس کی فراوانی ہے۔ ہمہ اقسام کی اشیاء بکثرت دستیاب ہیں، اگر بمبئی کی تمام خصوصیات کا ذکر مفصل ہو تو کہنے والا بدحواس ہوجائے اور سننے والا تھک جائے ـــــــ بہتر یہ ہے کہ اس کا جامع و مانع وصف بیان کیا جائے اور وہ یہ ہے کہ سوائے اسکے کہ یہاں کی آب وہوا اچھی نہیں، باقی ہر خوبی موجود ہے۔

شعر
جز ایں قدر نتواں گفت در جمالِ تو عیب
کہ خالِ مہر و وفا نیست روئے زیبا را

ہند، سندھ، شام و روم، غرض ہر ملک کے آدمی، ہر مذہب کے خواہ مسلمان ہوں یا ہنود، پارسی ہوں یا یہود، سب اس شہر میں اکٹھے ہیں۔ کوئی تجارت کے لئے آیا ہے، کوئی سیاحت کیلئے۔ ایک شخص دستکاری کے سلسلے میں مقیم ہے تو دوسرا شوقِ حرم میں ٹھہرا ہوا ہے ـــــــ اس شہر کے اصلی باشندے کوکنی اور پارسی ہیں ـــ کوکنی شافعی مذہب کے عامل ہیں۔

شہر بمبئی میں راقم کو سب سے پہلے معلّم ابراہیم سے جو کہ خطیب جامع مسجد بمبئی ہیں ـــــ ملاقات ہوئی ـــ اُن سے غائبانہ تعارف سالہا سال سے تھا اور وہ اس طرح کہ وہ حضرت مولانا محمد کرم اللہ کے احباب میں سے ہیں اور قرأت انھیں سے سیکھی ہے ـــ جناب معلّم کا خاندان حضرموت سے تعلق رکھتا ہے اور اُن کا مولد و منشا سورت ہے۔ پانچ سال سے بمبئی میں رہتے ہیں ـــ فقہ شافعی میں بہترین استعداد رکھتے ہیں۔ حدیث میں بھی اچھی مہارت ہے ـــ جس طرح تقویٰ شعاری میں بلند پایہ ہیں اسی طرح شرائط مہر و وفا کی بجاآوری اور لوازم صدق وصفا کی ادائیگی میں بھی اونچا مقام حاصل ہے۔

ان کے علاوہ مولانا محمد صالح بخاری سے بھی راہ ورسم محبت ہوگئی ـــــــ مجھے ان سے عقیدت بڑھ گئی ہے اور وہ میری جانب التفات بسیار کر رہے ہیں ـــ اس "ویرانہ آباد نما" (بمبئی)، میں فقیر کی تسلّی کا سبب مولانا موصوف کی صحبت ہی ہے اور اُن کو بھی اس تیرہ روزگار

میں کوئی مخاطب صحیح میسر نہ آنے کے باعث مجھ جیسے ناشناس سے گفتگو کرنا باعث عار نہیں بلکہ غنیمت کبریٰ ہے۔ مولانا کے مناقب احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتے ان کا بالکل ذکر نہ کرنا بھی اچھا نہیں ــــ لامحالہ بین الاجمال والتفصیل اُن کا تعارف کیا جاتا ہے۔

آپ جامع منقول و معقول اور حاوی فروع و اصول ہیں۔ حقائق و معارف میں بھی اَوجِ آگہی پر گامزن ہیں، ہر فن میں استحضار ہے ــــ ہر مسئلے کا جواب بے تامل دیتے ہیں ــــ شعر کی طرف بھی رغبت ہے۔ اُن کا وطن اصلی سمرقند ہے ــــ اکتساب فلسفہ وتحصیل اصول فقہ کے بعد ملک عرب آئے اور فن حدیث، شیخ عمر رحمۃ اللہ علیہ سے بالاستیعاب حاصل کیا ــــ اسکے بعد ہندوستان آئے اور مدراس وحیدرآباد میں مقیم رہے بعدہٗ اُن کی اقامت گاہ اورنگ آباد دکن ہوئی۔ ڈیڑھ سال سے بمبئی میں جلوہ افروز ہیں۔

محمد روگھی، جو زمرۂ کوکنیاں میں سے ہیں اور بڑے سوداگر ہیں ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ طائفۂ اہل اسلام میں وہ بڑے معزز ہیں ــــ بیشک بمبئی کو اُن کے دم سے رونق حاصل ہے۔ محمد حسین بن محمد سعید روگھی سے بھی جو کہ شہر بمبئی کے اعیان میں سے ہیں واقفیت، اور شناسائی حاصل ہوئی جو دوستانے تک منتہی ہوگئی ــــ یہ بہت ہی خلیق اور بردبار شخص ہیں ــــ ان کے علاوہ دیگر اکابر شہر سے بھی ملاقات ہوئی جن کے حالات کی تفصیل سے طول تحریر کا خوف ہے۔

بمبئی کے مکانات

یہاں کے مکانات کی بنا لکڑی پر ہے اس لئے کہ ایسے ہنگامہ ہائے ابر وباد کو جو یہاں پیش آتے رہتے ہیں لکڑی کے علاوہ کوئی دوسری چیز برداشت نہیں کرسکتی۔ رتلام سے لے کر بمبئی تک چاہے چھوٹا قصبہ ہو یا بڑا شہر ہو اس کی عمارت چوبی ہے۔

آثار و اطوار کا اختلاف

شاہجہاں آباد (دہلی) سے جس دن سے ہم چلے ہیں اختلاف آثار اور تفاوت اطوار ہر ہر شہر و دیار میں مشاہدہ کیا ــــ ان میں سے ایک یہ ہے کہ دہلی سے یہاں تک ہر منزل و مقام پر مِس وسیم کے سکہ ہائے گوناگوں رواج پذیر ہیں اور کیل وگز بھی مختلف ہیں۔ ایک جگہ کا سکہ دوسری جگہ نہیں چلتا ایسے ہی ایک جگہ کا پیمانہ دوسری جگہ کے برابر نہیں ہے۔

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

وقت کا ایک اہم تقاضا

(از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی)

ایک عرصہ سے عالم اسلام میں ایسے اسلامی لٹریچر کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے جو اسلام کی مؤثر و طاقتور نمائندگی و ترجمانی کرے، ایمان و یقین کی بنیادیں ذہن و دماغ میں از سر نو استوار کرے، اس ذہنی بے چینی و انتشار کو رفع کرے جو مغرب کی مادہ پرست اور شک آفریں تہذیب و ادب نے عالمگیر پیمانے پر پیدا کر دیا ہے۔ اور اس نئے ارتداد کا مقابلہ کرے جو ایک طوفان و سیلاب کی طرح تمام عالم میں پھیل گیا ہے اور اسلام ایک معین و زندہ مذہب ہونے کی وجہ سے خاص طور پر اس کی زد میں ہے۔[1]

نیز دنیا کے دوسرے تعلیم یافتہ اور ذہین طبقوں میں اسلام کے صحیح اور دقیع تعارف کا ذریعہ بنے اور ان میں حقیقت کی جستجو، خدا طلبی کا ذوق، مادیت سے بیزاری، موجودہ صورت حال سے بے اطمینانی پیدا کرے، اور ان کو اس "اسلام" سے مانوس و قریب کرے جس سے اس کے پیروؤں کی غلط و کمزور نمائندگی یا سیاسی کشمکش نے دور کر دیا ہے۔

ایسے مؤثر و صالح اسلامی لٹریچر (جس میں نسل جدید کے دماغوں کی تسکین، یا عصر حاضر کے تقاضوں کی تکمیل کی صلاحیت ہو) کے فقدان یا کمی یا عدم تنظیم کی وجہ سے ایک طرف مسلمانوں کا تعلیم یافتہ و ذہین طبقہ (جو ہر ملک میں قدرتی طور پر زندگی پر حاوی اور رہنمائی اور قیادت کے منصب پر فائز ہے) ذہنی اور اندرونی طور پر اسلام کی طرف سے غیر مطمئن، متشکک اور مذبذب ہے۔ اور کہیں کہیں کھلے طور پر اس سے باغی ہے، اگرچہ اس کی سیاسی مصلحتیں اور ملکی حالات اس بغاوت و انحراف کے اعلان کی اجازت نہیں دیتے سیاست، قانون سازی، تعلیم، ادب و صحافت سب اسی طبقہ کے ہاتھ میں ہے، اور وہی زندگی و معاشرت میں قوم کے لیے نمونہ ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ یہی بے اطمینانی شک و نفاق اور تذبذب و اضطراب سوسائٹی کے ہر طبقہ میں پھیلتا جا رہا ہے اور اندیشہ ہے کہ پورے ملک کا رخ الحاد و ارتداد کی طرف نہ ہو جائے۔[2]

اس تعلیم یافتہ مسلمان طبقہ میں بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی بھی ہے جو اسلام کے صحیح مطالعہ کا

---

[1] مضمون "نیا طوفان اور اس کا مقابلہ" میں اس صورت حال کی مکمل تصویر پیش کی گئی ہے۔
[2] عراق کے تازہ حالات اس اندیشہ کو حق بجانب ثابت کرتے ہیں۔

ذوق رکھتے ہیں، لیکن ان کو اپنی ذہنی پیاس بجھانے اور قلب و دماغ کو مطمئن کرنے کے لیے ایسا دل آویز و دلنشین لٹریچر نہیں ملتا جو اپنے محکم استدلال، جدید اسلوب تحریر، بے لوث و مخلصانہ تبلیغ اور مطالعہ معلومات کی وسعت، نیز حسن طباعت کے لحاظ سے "جدید مطبوعات" کا مقابلہ کر سکے، اس کا نتیجہ ہے کہ وہ اس اسلام کی طرف سے جو ان کو عزیز بھی ہے مایوسی و احساس کمتری کا شکار ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسلام اپنا دور ختم کر چکا ہے اور وہ عصر جدید کے لیے کوئی پیغام اور رہنمائی نہیں رکھتا۔

دوسری طرف غیر مسلم تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کی طرف سے بالکل اندھیرے میں ہے، وہ ایک ملک میں ساتھ اور دوش بدوش رہنے کے باوجود اسلام سے اتنا ناواقف اور ناآشنا ہے جتنا کہ کسی ایسے ملک کے باشندے ہو سکتے ہیں جہاں اسلام کے قدم آج تک نہیں پہونچے، ان میں سے بہت سے طالب حق اور سلیم الطبع افراد ہیں، جن کو اسلام سے ناواقفیت ہے، عناد نہیں، اس طبقہ کو دینے کے لیے ہمارے پاس انگریزی کی مشکل سے دو چار کتابیں ہیں (جو بدقسمتی سے سہل الحصول نہیں) اور ہندی کی شاید اتنی بھی نہیں، اردو کی بھی وہ کتابیں بہت کم ہیں جو اطمینان و اعتماد کے ساتھ ان کے ہاتھوں میں دی جا سکیں، اور ان کی ضروریات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہوں۔

ان حقائق کے احساس اور ان خطرات کے اندازہ نے جو اس خلا کی وجہ سے عالم اسلام کو بالعموم اور ہمارے برعظیم کو بالخصوص درپیش ہے، بعض سوچنے والوں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ ایک ایسی تصنیفی و اشاعتی مجلس (اکاڈمی) کی تشکیل کریں جو ہر قسم کی جماعتی و سیاسی اغراض سے بالاتر ہو کر اسلام و انسانیت کی یہ خدمت انجام دے، اور اپنے وسائل و مواقع کے بقدر اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کرے جو جدید انقلاب کے بعد بڑی شدت سے محسوس ہونے لگا ہے۔

ملک میں ایسے دردمند، صاحب فہم، و مخلص حضرات کی کمی نہیں، جو بجائے خود عرصہ سے اس خلا کو محسوس کرتے ہیں اور وہ اس گزارش میں اپنے دل کی ترجمانی پائیں گے۔ ایسے سب حضرات سے ہم کو تعاون کی اُمید ہے۔

اس مجلس کے متعلق سردست چند گزارشات ہیں۔

(۱) اس مجلس کا نام "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" ہوگا۔

(۲) فی الحال یہ مجلس ندوۃ العلماء کے ایک شعبہ کی حیثیت سے کام کرے گی جو ایک منظم و قابل اعتماد

ادارہ ہے، اسکی وجہ سے اسے وہ سہولتیں حاصل ہوں گی جن کی ایک مجلس کو ابتدائے قیام میں ضرورت ہوتی ہے اور چونکہ اس تعلیم یافتہ طبقہ کی دینی رہنمائی و تسکین ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے اسلئے درحقیقت یہ اس کے ایک ایسے ارادہ کی تکمیل ہے جو شروع سے اسکے بانیوں کے پیش نظر تھا۔

(۳) یہ مجلس فی الحال چار زبانوں میں تصنیف و اشاعت کا کام کریگی۔ ۱۔ اردو ۲۔ ہندی ۳۔ انگریزی ۴۔ عربی۔ ان چاروں زبانوں میں مجلس کے پاس اشاعت کے لیے کچھ نہ کچھ چیزیں موجود ہیں۔ ان زبانوں کے علاوہ مجلس کوشش کرے گی کہ ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں بھی اسکے لٹریچر کا ترجمہ و اشاعت ہو، اور اس کے لیے وہ مختلف صوبوں کے اداروں اور اہلِ قلم اور اہلِ وسائل کو آمادہ کرے گی۔

(۴) مجلس کی اعانت کے حسب ذیل ذرائع ہو سکتے ہیں۔

۱۔ سب سے بڑی اعانت و رفاقت مجلس کی مطبوعات و لٹریچر کو صحیح جگہوں پر پہونچانا اور ان کی تبلیغ و اشاعت ہے۔ جن لوگوں کو کتابیں پہونچائی جائیں ان سے مستقل رابطہ پیدا کرنا اور ان کے تاثرات کی پرورش و ترقی کی فکر کرنا ہے، مجلس کو ایسے رفقا کی سخت ضرورت ہے جو ملک کے حصوں اور آبادی کے مختلف تعلیمیافتہ طبقوں میں اس مجلس کی "سفارت" اور اس کے لٹریچر کی اشاعت کی خدمت حسبۃً للہ انجام دیں، اور مجلس کو اپنی سرگرمیوں اور اپنی کوششوں کے نتائج اور اپنی ضرورتوں اور مشوروں سے مطلع کریں، مجلس کا سب سے بڑا سرمایہ یہی مخلص و سرگرم رفقا ہیں۔

۲۔ مجلس کے کاموں کے لیے مستقل و غیر مستقل عطیے، لائف ممبری کی فیس جو پانچسو روپیہ ہوگی لائف ممبر کو تمام مطبوعات ہمیشہ (بلا قیمت) فراہم کی جائیں گی۔[۱]

ہمیں امید ہے کہ آپ اپنے تاثرات سے مطلع فرمائیں گے اور جواباً تحریر فرمائیں گے کہ آپ اس مجلس سے کس قسم کا تعاون اور اس کی کیا امداد فرما سکتے ہیں۔

پتہ :۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام
دارالعلوم ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ

---

[۱] ہم کو خوشی ہے کہ سکندرآباد (حیدرآباد) کے مشہور مسلمان تاجر ایچ، ایم حسین صاحب نے آپنے ایک ہزار کے عطیے سے اس سلسلہ کی ابتدا کردی ہے۔

تعارف وتبصرہ

۱۔ حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق
از، بشیر احمد ڈار۔ صفحات ۴۹۵۔ سائز متوسط مجلد۔ قیمت درج نہیں ہے۔

۲۔ سکھ مسلم تاریخ
از، ابوالامان امرتسری۔ صفحات ۲۴۲۔ سائز متوسط۔ مجلد قیمت ۳/

ناشر۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ پاکستان۔ ۲ کلب روڈ۔ لاہور

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور کے بعض تجدد پسندانہ دینی رجحانات اور اُن کے مضرات کو اگر نظر انداز کر دیا جائے، تو علمی نقطۂ نظر سے رفقائے ادارہ کی متعدد تصنیفی کاوشیں بہت اعتراف وتحسین کی مستحق ہیں۔ "حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق" بھی اسی زمرہ کی کتاب ہے ـــــ یہ دس مضامین کا مجموعہ ہے۔ جن میں حکیم کون فیوشش اور چینی فلسفۂ اخلاق۔ گوتم بدھ کا فلسفۂ اخلاق، بھگوت گیتا کا فلسفۂ اخلاق، زرتشت کا فلسفۂ اخلاق، مانی کا فلسفۂ اخلاق، سقراط کا فلسفۂ اخلاق، افلاطون کا فلسفۂ اخلاق، ارسطو کا فلسفۂ اخلاق۔ رواقی فلسفۂ اخلاق اور مصری فلسفۂ اخلاق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ان فلسفہائے اخلاق کا نرا بیان ہی نہیں، بلکہ ایک مبصرانہ جائزہ ہے۔ جس میں مصنف نے بڑی عالمانہ نظر، ناقدانہ ذوق اور فن سے گہری مناسبت کا ثبوت دیا ہو۔

مانی کے فلسفۂ اخلاق کو چھوڑ کر، ارسطو کے فلسفۂ اخلاق تک ہم نے کتاب لفظ بلفظ پڑھنے کی کوشش کی۔ اس مطالعہ کے نتیجہ میں تین باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۔ حکیم کون فیوشش سے لے کر ـــــ باستثناء بودھ ـــــ سقراط تک، سب کے سب حکماء مصنف کے بیان و استنباط کے مطابق، صاحبِ وحی و الہام نظر آتے ہیں۔ (۲)، لیکن مصنف نے اس نتیجہ کے لیے بظاہر کسی کھینچ تان کی کوشش نہیں کی ہے۔ ۳۔ مصنف کے نزدیک صحیح ترین فلسفۂ اخلاق اور صحیح اخلاقی

نصب العین وہی ہے جو اسلامی تعلیمات میں ملتا ہے، چنانچہ اِن مختلف فلسفہائے اخلاق پر مصنف کا تبصرہ اسلامی نقطۂ نظر کا حامل ہے۔

"صاحبِ وحی" ہونے کا مطلب تو یقیناً نبی ہونا ہے"۔ اگر یہ صحیح ہے تو کم از کم حکیم کون فیوشش کے بارے میں سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس طرح صاحبِ وحی ہو سکتا تھا۔ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں تو قرآن ہمیں جو کچھ اطلاع دیتا ہے اس میں سب سے نمایاں اور اوّل چیز مابعد الطبیعاتی مسائل و عقائد ہیں۔ یعنی خدا کی ہستی، اس کی وحدانیت اور حیات بعد الممات، اور حکیم کو فیوشش کے بارے میں مصنف کی اطلاع یہ ہے کہ اُسے

"اِن مابعد الطبیعاتی مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی"۔ (صـ۷)

حتیٰ کہ توحید آخرت اور ملائکہ کے بارے میں قدیم چین کے صحیح تصورات جو مرورِ زمانہ سے مسخ ہو گئے تھے، مصنف کے خیال کے مطابق

"کون فیوشش کی تعلیمات کا محور و مرکز .... اِن مسخ شدہ تصورات کی اصلاح (بھی) نہیں معلوم ہوتا"۔ (ایضاً)

اور اس سے بھی آگے بڑھ کر

"وہ خدا کے وجود سے منکر نہیں لیکن اس کا صحیح تصور اُس کے کلام میں کہیں نہیں ملتا"۔ صـ۸۱

تو پھر وہ کیسا نبی اور کیسا صاحب وحی و الہام تھا؟ جس کی نظیر ہمیں کم از کم قرآن کے ذکر کردہ انبیاء میں کہیں نہیں ملتی ____ یہ ایک قابل لحاظ پہلو تھا جس کی طرف فاضل مصنف نے توجہ نہیں کی، اور اس کی بنا پر اُن کے اس مطالعہ میں کئی جگہ جھول نظر آتا ہے۔ خصوصاً یہی پیرا جو صـ۸۱ سے شروع ہو کر صـ۹۱ پر ختم ہوتا ہے، انتہائی پراگندگیٔ فکر کا شکار ہے۔

کتاب میں "توجیہہ" کا املا "توجیح" اتنی کثرت سے ملا کہ اس کی کوئی توجیہہ سمجھ میں نہیں آتی، دو ایک جگہ عبارت کے ایسے جھول بھی سامنے آئے کہ زمانۂ جدید کے ایک اُردو مصنف کی کتاب میں

انھیں گوارا کیا جانا مشکل ہے۔

صفحہ ۲ پر

"حکیم کون فیوشش کی تعلیمات کا محور و مرکز جہاں تک ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ ان مسخ شدہ تصورات کی اصلاح معلوم نہیں ہوتا"

صفحہ ۲۳ پر

"چینی مفسرین کی روسے اشیاء کی ماہیت سے مراد یہ ہے"

کسی "کتاب کی روسے"، "دلیل کی روسے"، "کسی کے قول و بیان کی روسے" یہ تو ٹھیک ہے، مگر "کسی شخص کی روسے"، "فلاں اشخاص کی روسے" یہ تو غالباً نہیں بولا جاتا۔

دوسری کتاب (سکھ مسلم تاریخ حقیقت کے آئینہ میں) بھی ادارہ کی مفید کتاب ہے۔ اس میں سکھ تاریخ کے اُن تین اہم الزامات کا واقعاتی جائزہ لیا گیا ہے جو ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں پر سکھ گروؤں اور اُن کے بعض بچوں کے "ظالمانہ اور سفاکانہ قتل" کے سلسلہ میں لگائے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک گورو ارجن کے قتل کا الزام ہے۔ دوسرا گورو تیغ بہادر کے قتل کا اور تیسرا گورو گوبند سنگھ جی کے شیر خوار بچوں کے دیوار میں زندہ چنوانے کا الزام ہے۔

مصنف جناب ابوالامان امرتسری نے بہت دیدہ ریزی سے بعض سکھوں اور ہندوؤں کے بیانات پیش کر کے اور الزامی داستانوں کا داخلی تضاد ظاہر کر کے دکھایا ہے کہ ان الزامات کی اصل حقیقت کیا ہے۔ اتفاق سے اس وقت حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا ہے کہ خود سکھوں کی اکثریت کے نمائندہ حلقے اس حقیقت کو تسلیم کر رہے ہیں، اور بعض سکھ اخبارات بھی کچھ لکھ رہے ہیں جو ابوالامان صاحب نے لکھا ہے۔

مذہب و تمدن | از، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ناشر۔ ادارہ نشریات اسلام، رحیم یار خان (مغربی پاکستان) صفحات ۱۲۰۔ قیمت ۱/۸

یہ ایک مقالہ ہے جو ۱۹۴۲ء میں مولانا موصوف نے جامعہ اسلامیہ (دہلی) کی فرمائش پر جامعہ

کی ایک علمی مجلس میں پڑھا تھا۔ پہلے بھی چھپ چکا ہے اور اب ایک مدت کے بعد ادارۂ نشریات اسلام نے دوبارہ شائع کیا ہے۔ اس میں مذہب، تمدن اور فلسفہ کے چند مشہور مشترک سوالات اور ان کے جواب پر بحث کی گئی ہے۔ جس پر کسی مذہب، فلسفہ اور نظامِ زندگی (تمدن) کی تعمیر ہوتی ہے۔ مقالہ نگار نے دکھایا ہے کہ ان سوالات کے جوابات کبھی حواس سے لینے کی کوشش کی گئی، کبھی عقل سے اور کبھی اشراق وروحانی کشف سے۔ مگر یہ تینوں طریقے اور تینوں انسانی قوتیں درحقیقت ان حقائق تک کے ادراک سے قاصر اور ان سوالات کے صحیح اور کامل جوابات سے عاجز ہیں۔ ان سوالات کا صحیح اور مکمل جواب رسالت کے راستہ سے ملتا ہے۔ اس لئے (صحیح معنیٰ میں) مذہب ہی وہ چیز ہے جس پر ایک بہترین تمدن اور نظامِ حیات استوار ہو سکتا ہے ——— بحث بڑی جچی تُلی اور شگفتہ ہے، امید ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔

کتابت کی تصحیح پورے طور پر نہیں ہو سکی ہے۔ آئندہ اڈیشن میں بہت اہتمام سے تصحیح کرنے کی ضرورت ہے۔ بلکہ اس اڈیشن میں ایک آدھ صفحے کا غلط نامہ لگا دیا جائے تو بہتر ہے۔

رحمتِ کائنات | از، مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی، شائع کردہ، دارالاشاعت والتبلیغ شمس آباد ضلع اٹک۔ مغربی پاکستان۔ قیمت پاکستان میں عہ، ہندوستان سے ۱۲ کے ٹکٹ۔ ۱۶۸ صفحات، کاغذ گلیز۔ کتابت طباعت صاف۔

امت کی بدقسمتی سے پاکستان میں حیات النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مسئلہ ایک فتنہ بن کر اُٹھا ہوا ہے۔ اہل حق ہی کے دو گروہ ہیں جو اس معاملہ میں برسرپیکار ہیں۔ مسئلہ اپنی حقیقت کی تنقیح کے اعتبار سے اتنا دقیق اور نازک ہے کہ مختلف مسالک کے درمیان ما بہ الفرق نکالنا بھی دشوار ہے، مگر اسے عوامی سطح پر لاکر رکھدیا گیا ہے۔ اور تقریر و تحریر کے ذریعہ سے اس کو عوامی میدان میں حل کرنے پر اصرار کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالےٰ پاکستان کے مسلمانوں کو اس فتنہ سے نجات دے۔

یہ کتاب جو تبصرہ کے لیے سامنے ہے ایک فریق کے دلائل وافکار کی نمائندگی کرتی ہے۔ جو اپنے فریق مخالف کو حیات النبی کا منکر ٹھیراتا ہے، اور بدیں طور اُس کا اپنا موقف گویا حیات النبی کے اثبات کا ہے، ہم نہیں سمجھتے کہ اہل حق کا کوئی گروہ حیات النبی کا علی الاطلاق منکر بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہمارا خیال یہ ہے کہ اختلاف اصطلاحی ہے، کہ ایک جس معنیٰ میں

حیات النبی کا مُقِر ہے' دوسرا اس معنی میں حیات سے منکر ہے، باقی نفسِ عقیدۂ حیات میں دونوں متفق ہیں ——— ہمیں اس کتاب میں بڑی بنیادی خامی یہ نظر آتی ہے کہ اس میں مسئلہ ما بہ النزاع کو منقح کرنے کی مطلق کوشش نہیں کی گئی۔ حتیٰ کہ اپنے مسلک اور عقیدہ کو بھی خود اپنے الفاظ میں منضبط طور سے نہیں پیش کیا گیا۔ بغیر یہ بتائے ہوئے کہ 'یہ عقیدہ' ہے کیا؟ کتاب ان الفاظ سے شروع ہو جاتی ہے۔

"یہ عقیدہ اس حد تک بنیادی اور ضروری ہے کہ" الخ

البتہ اسی سلسلۂ کلام میں چند سطروں کے بعد "اس عقیدہ" کی اجماعیت ثابت کرنے کے لیے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی ایک عبارت پیش کی گئی ہے جس سے ضمناً یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ "یہ عقیدہ" ہے۔

"حیات جسمانی دنیاوی، نہ حیات معنوی روحانی"

جہاں تک اس عقیدے کا سوال ہے اس کی تصویب یا تردید سے تو ہمیں اس وقت کوئی بحث نہیں۔ البتہ محترم مصنف نے اس کے ثبوت میں جو بحث کی ہے اس کے متعلق ہماری رائے یہ ہے کہ وہ ایک غیر جانبدار کے لئے ناکافی اور غیر تشفی بخش ہے۔ بلکہ ہم نے تو اسکے اکثر اجزاء کو غیر متعلق پایا۔ خصوصاً صفحہ ۱۰۱ سے صفحہ ۱۲۰ تک "واقعات اور تجربات" کے عنوان سے اس عقیدے کے اثبات میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے، اُسکی تو کوئی تُک ہی ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔

جناب مصنف نے بعض بزرگوں کی تحسین و تقریظ اور "بشارت عظمیٰ" جیسی چیزیں اس کتاب میں درج کرکے (صفحہ ۲) تبصرہ نگار کو بڑی مشکل میں ڈالدیا ہے، مگر ہماری آزادانہ رائے یہی ہے جو ہم نے پیش کی۔

(۱) نصرۃ الباری	از، مولانا عبدالرؤف صاحب رحمانی۔ صفحات ۲۴۰۔ کتابت طباعت بہتر قیمت ۲/۸
(۲) العلم و العلماء	از، مولانا عبدالرؤف صاحب رحمانی۔ صفحات ۹۶۔ کتابت طباعت بہتر قیمت -/۱

ملنے کا پتہ :- مولانا عبدالرؤف صاحب رحمانی۔ معرفت قاضی تبارک اللہ صاحب۔ بڑھنی بازار، رام گنج، ضلع بستی۔

۱۔ اس کتاب کا پورا نام "نصرۃ الباری فی بیان صحۃ البخاری" ہے۔ اسکی تسوید کا خصوصی محرک مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی ایک تقریر کو بتایا گیا ہے۔ جس کا چند سال پیشتر پاکستان کے بعض اہلحدیث اخبارات میں کافی چرچا رہ چکا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس تقریر کی حقیقت کیا ہے۔ تاہم مولانا مودودی ہوں یا اور کوئی، اگر کسی کو بخاری کی صحت میں شک ہے تو مولانا عبدالرؤف صاحب نے ایک خاص انداز سے اس شک و تردد کے ازالہ کا کافی سامان اپنے اس رسالہ میں کر دیا ہے۔

اس رسالہ کی زبان درسی اور مباحث فنّی ہیں۔ اس لئے ان لوگوں کے حق میں تو یہ مفید ہو سکتا ہے جو اسی زبان اور اسی نہج پر صحت بخاری میں گفتگو کرتے ہیں، مگر وہ لوگ جو ان مباحث سے سروکار نہیں رکھتے، صرف نام نہاد عقلی بنیادوں پر احادیث کو رد کرتے ہیں، خواہ وہ بخاری کی ہوں یا کسی اور کی، اُن کی وسوسہ پردازیوں کا اثر باطل کرنے کے لئے یہ فنّی کاوشیں اور درسی بحثیں ذرا بھی مفید نہیں معلوم ہوتیں۔

بہرحال یہ ایک اضافی نقطۂ نظر ہے، ورنہ کتاب فی نفسہٖ مفید اور معلومات افزا ہے۔ مصنف نے اسکی ترتیب و تسوید میں کافی تلاش و جستجو سے کام لیا ہے۔ پہلے علم حدیث میں اسناد اور جرح و تعدیل کی اہمیت کو ظاہر کیا ہے کہ ان امور کا التزام روایات پر کتنا اعتماد بہم پہنچاتا ہے۔ پھر اس باب میں امام بخاری کا اہتمام اور معرفتِ رُواۃ اور قوتِ حفظ میں ان کا مقام واضح کیا گیا ہے، نیز آپ کی کاوش و احتیاط، اور آپ کی کتاب کی صحت پر ائمہ و ناقدین فن کا اجماع اور امت کی تلقی بالقبول، پھر اُن فنّی اعتراضات اور تنقیدات کا جائزہ لیا گیا ہے جو بخاری کی بعض روایات پر کی گئی ہیں۔ یہ حصّہ کافی طویل الذیل ہے۔ بعض ازاں مولانا مودودی صاحب کی مبینہ تقریر پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ بحث بھی ایک حد تک فنّی اور نقول ہی پر مشتمل ہے ——— فنّی مباحث اور اصطلاحی زبان کی وجہ سے یہ کتاب صرف طلبۂ حدیث اور اُن لوگوں کے کام کی ہے جو مبادیات و مصطلحات فن سے آشنا ہوں۔ عام لوگ اس سے بہت کم استفادہ کر سکتے ہیں۔

۲۔ اس رسالہ میں تحصیل علم کے سلسلہ میں علمائے سلف کی جد و جہد اور مشقت انگیزیوں

اور ان کی علمی مشغولیتوں کا تذکرہ ہے۔ جو یقیناً عہد حاضر کے طلباء کے لئے باعث عبرت ہو۔

قادیانی قول وفعل (حصہ دوم) از پروفیسر محمد الیاس برنی مرحوم۔ صفحات ۱۹۲۔ صرف ۲۰ پیسے کے ٹکٹ بھیج کر، بشرط موجودگی، حسب ذیل پتہ سے مل سکتی ہے۔

بیت السلام، سیف آباد، حیدرآباد دکن

پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی مرحوم نے قادیانیت کی قلعی کھولنے میں جو خدمت اپنے قلم سے انجام دی ہے، وہ اسلامی دنیا کے لئے ناقابل فراموش ہے، جن لوگوں نے موصوف کی معرکۃ الآراء کتاب "قادیانی مذہب" پڑھی ہے۔ وہ ان کے انداز تالیف سے واقف ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب کا انداز بھی وہی ہے، کہ پوری کتاب قادیانی لٹریچر کے اقتباسات پر مشتمل ہے اور اسی آئینہ میں قادیانیت کی اصل صورت نظر آجاتی ہے۔ یہ اقتباسات مختلف عنوانات کے ساتھ پانچ حصّوں میں منقسم ہیں۔

۱۔ قادیانی کہانی ۲۔ قادیانی چالبازی ۳۔ قادیانی چکر ۴۔ قادیانی صحیح نشانی، ۵۔ قادیانی غلط بیانی۔

ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"ہندوستان سے باہر ہر ایک ملک میں ہم اپنے واعظ بھیجیں گے، مگر میں اس بات کے کہنے سے نہیں ڈرتا کہ اس تبلیغ سے ہماری غرض سلسلۂ احمدیہ کی صورت میں اسلام کی تبلیغ ہو، اور حضرت مسیح کے پاس زندہ رہ کر اندر باہر ان سے بھی یہی سنا کہ آپ فرماتے تھے کہ اسلام کی تبلیغ میری تبلیغ ہے، پس اس اسلام کی تبلیغ کرو جو مسیح موعود لایا۔" (یعنی اسلام کے نام سے قادیانیت کی تبلیغ کی جائے۔ البرنی)

(منصب خلافت، تقریر میاں محمود احمد صاحب خلیفۂ قادیان صفحہ)

اربعین نووی مع ترجمہ، و حل لغات و تلخیص و تشریح۔ از حافظ نذر احمد صاحب لکچرار اسلامیہ کالج لاہور، و مولانا عزیز زبیدی۔ صفحات ۷۲۔ کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ۔ قیمت ۱۲ آنے۔ ناشر:۔ نور سنز ناشران و تاجران کتب۔ قصہ خوانی۔ پشاور۔

امام نوویؒ کی مرتب کی ہوئی چہل حدیث، مشہور و مقبول ہے۔ جسے ترجمہ و تلخیص اور تشریح کے

ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ضروری حلِ لغات کا بھی اہتمام کیا گیا ہے، یہ غالباً طلبہ کی رعایت سے کیا گیا ہے، کیونکہ یہ کتاب پشاور یونیورسٹی میں داخلِ نصاب ہے۔

ایک نمونہ

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَجُلاً قَالَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَغْضَبْ فَرَدَّدَ مِرَاراً قَالَ لَا تَغْضَبْ۔ (البخاری)

الفاظ:۔ رَدَّدَ۔ دُہرایا، مِرَاراً۔ کئی بار۔

ترجمہ:۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ "مجھے وصیت کیجئے" آپ نے فرمایا "غصہ نہ کیا کرو" اس نے کئی مرتبہ یہی سوال دُہرایا، اور آپ نے یہی فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو۔"

(بخاری)

تلخیص:۔ سائل نے تین بار درخواست کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی نصیحت فرمائی کہ "غصہ نہ کیا کرو"۔ اور حق بھی یہی ہے اس لئے کہ انسان غصہ میں توازن کھو بیٹھتا ہے، اور ایسے حال میں اس کا کسی نتیجہ پر پہنچنا محال ہے۔"

یہ نمونہ ہم نے محض اختصار کے پیش نظر، یونہی ورق گردانی میں منتخب کر لیا تھا۔ غور سے دیکھا نہیں تھا۔ اب جو نقل کرنا شروع کیا تو اتفاق سے پہلی بات تو یہ نکل آئی کہ متنِ حدیث میں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک لفظ چھوٹا ہوا ہے، جو غالباً "اَوْصِنِیْ" ہے۔ ترجمہ میں اس لفظ کا ترجمہ موجود ہے۔ دوسری بات، "تلخیص" کے زیرِ عنوان عبارت پڑھ کر یہ محسوس ہوئی کہ تلخیص کا عنوان ناکافی ہے۔ جیسا کہ سرورق پر دیا گیا ہے، یہاں عنوان "تلخیص وتشریح" ہونا چاہیئے۔ اسلئے کہ اس عبارت کا ایک جزو تلخیص کہا جا سکتا ہے، مگر دوسرا جزو ("اور حق بھی یہی ہے" الخ) تلخیص نہیں تشریح ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ تشریح کچھ یونہی سی ہو جیسے شارح کا ذہن کچھ چلا نہ ہو، یہاں تشریح یوں ہونی چاہیئے تھی کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے سائل کے مزاج میں غصہ بہت تھا اس لیے حضور نے صرف اسی ایک بات پر زور دیا۔"

تلخیص میں بھی "تین بار" کے بجائے "بار بار" کا لفظ مناسب تھا اس لئے کہ حدیث میں "ثلث مرات" نہیں "مرارا" کا لفظ ہے۔

اسلام اور عصر حاضر | مرتبہ جناب ابو احمد دستگیر "مبلغ اسلام"۔ صفحات ۱۴۴۔ کاغذ اور کتابت وطباعت معمولی۔ قیمت ۲/-

ملنے کا پتہ :۔ دفتر جمعیت خلافت مبشرہ (دیندار انجمن) پنجابی سکشن۔ لالوکھیت، کراچی۔

بین الاقوامی مجلس اسلامی مذاکرہ لاہور (دسمبر ۱۹۵۷ء جنوری ۱۹۵۸ء) میں جو موضوعات زیر بحث آئے تھے، کتاب کے شروع میں کہا گیا ہو کہ اس کتاب میں انہی تمام موضوعات پر قرآن کریم سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ ہم کتاب بالکل نہ پڑھ پائے، اس لئے کہ "مجذوب" کی روایتی "بڑ" میں اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ناشرین نے کتاب کے دو دو نسخے بھیجکر اپنا بھی نقصان کیا اور ہمارا بھی تھوڑا سا وقت ضائع کیا۔ خدا معلوم دستگیر صاحب کیا کہنا چاہتے ہیں۔

صحیح بخاری شریف
مترجم اردو، جلد اوّل | شائع کردہ محمد سعید اینڈ سنز، قرآن محل، مقابل مولوی مسافرخانہ کراچی، کتابت طباعت اور کاغذ بہتر۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۸ صفحات ۹۴۴۔ مجلد، ہدیہ ۱۵/-

قرآن کریم کے بعد جو کتاب مسلمانوں میں سب سے زیادہ جانی پہچانی ہے، وہ احادیث رسول کا وہ مجموعہ ہے جسے امام بخاریؒ نے مرتب فرمایا، اور جو عرف عام میں "بخاری شریف" ہی کے نام سے موسوم ہے۔ اس مقدس مجموعہ احادیث کے پہلے دس پاروں کا یہ ترجمہ ہے جو محمد سعید اینڈ سنز کے تقریباً مستقل لکھنے والے چار حضرات۔ مولوی ابو الفتح صاحب، مولوی امجد اصلی صاحب، مولوی سبحان محمود صاحب اور قاری احمد صاحب کی مشترک محنت کا نتیجہ ہے۔

مترجمین نے بخاری شریف کا مقام ملحوظ رکھتے ہوئے یقیناً بڑی محنت کی ہوگی، اور ناشر کو بھی خوشی ہوگی کہ اس نے ایسی اہم دینی کتاب کا اردو ترجمہ شائع کرنے کی سعادت حاصل کی۔ مگر ترجمہ کے ایک سرسری جائزہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترجمہ بہت ہی ناقابل اعتماد، اور بڑی ناقابل اغماض اغلاط سے پُر ہے۔ اور بہت افسوس کی بات یہ ہے کہ پہلے ہی صفحہ سے غلطیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ پہلے ہی صفحہ پر "باب کیف کان بدء الوحی" کے ذیل میں پہلی ہی حدیث

میں یہ الفاظ آتے ہیں:۔

وھو اشدّہٗ علیَّ فیفصم عنی وقد وعیت عنہ ما قال

ان میں سے خط کشیدہ الفاظ کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

"اور جب میں اُسے یاد کرلیتا ہوں جو اُس نے کہا تو وہ حالت مجھ سے دور ہوجاتی ہے"

اسی حدیث کے آخر میں حدیث کی راویہ حضرت عائشہؓ کے یہ الفاظ ہیں:۔

فیفصم عنہ وانّ جبینہٗ لیتفصّد عرقاً

اس کا ترجمہ کیا گیا ہے:۔

"پھر جب وحی موقوف ہوجاتی تو آپ کی پیشانی سے پسینہ بہنے لگتا"

دوسرے صفحہ پر آیئے۔ باب کی تیسری حدیث ہے، اس میں چند جملوں کے بعد ہے:۔

وکان یخلو بغار حراء فیتحنّث فیہ، وھو التعبد، اللیالی ذوات العدد قبل ان ینزعَ الی اھلہٖ ویتزوّد لذالک ثم یرجع الی خدیجۃ فیتزوّد لمثلھا۔ حتی جاءہٗ الحق وھو فی غار حراء فجاءہٗ الملک۔

ترجمہ کیا گیا ہے:۔

"اور (آپ) غار حراء میں تنہا رہنے لگے۔ اور قبل اسکے کہ گھر والوں کے پاس آنے کا شوق ہو، وہاں تحنّث کیا کرتے (اور تحنّث سے مراد ہے کئی راتیں عبادت کرنی) اور (اس) کے لئے توشہ لیتے۔ پھر حضرت خدیجہ کے پاس واپس آتے اور اسی طرح توشہ لیتے۔ یہانتک کہ جب وہ غار حراء میں تھے۔ حق آیا۔ چنانچہ ان کے پاس فرشتہ آیا"

اس کے بعد روایت میں اُس معاملہ کا بیان ہے۔ جو فرشتہ کی آمد کے بعد گزرا جس کا آخر یہ ہے۔ فغطّنی الثالثۃ فقال اقرا باسم ربّک الّذی خلق الخ اس کے بعد یہ الفاظ آتے ہیں۔

فرجع بھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرجف فؤادہ
فدخل علیٰ خدیجۃ بنت خُوَیلد۔

اس عبارت کا ترجمہ کیا گیا ہے:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو (یعنی آیت اقرا باسم ربک الخ کو) دہرایا۔
اس حال میں کہ آپ کا دل کانپ رہا تھا۔ چنانچہ آپ حضرت خدیجہ بنت خویلد کے
پاس آئے۔

یہاں پہنچ کر روایت میں حضرت خدیجۃ بنت خویلد کے چند فقرے آتے ہیں جن میں آپ حضور کو تسلی
دیتی ہیں، اُن میں سے آخری فقرہ یہ ہے۔

وتُعینُ علیٰ نوائب الحق

اس کے ترجمہ میں ہے:۔

"اور (آپ) حق کی راہ میں مصیبتیں اٹھاتے ہیں"۔

یہ صرف سب سے پہلے دو صفحہ کا جائزہ ہے۔ جو پورے ترجمہ سے بدگمان کر دینے کے لئے
کافی ہے۔ اس لئے کہ چاروں مترجمین کا یہ اظہار کتاب کے شروع ہیں موجود ہے کہ انھوں نے
"باہمی مشورہ سے" اس بات کی "بے انتہا کوشش" کی ہے کہ "ترجمہ میں یکسانیت قائم رہے"۔
ہم نے جن مقامات کی نشاندہی یہاں کی ہے، ان میں صرف پہلے کے بارے میں تو شاید کہا جا سکے
کہ ترجمہ نحوی اعتبار سے غلط سہی۔ مگر مآل کے اعتبار سے اس میں اور صحیح ترجمہ میں کوئی خاص
فرق نہیں ہے۔ مگر باقی تمام مقامات پر مطلب کچھ کا کچھ ہو گیا ہے۔ ان میں بعض مقامات تو ایسے
ہیں جہاں غلطی کا سمجھنا عربی زبان کے قواعد اسالیب بیان اور لغوی حقائق کے جاننے پر موقوف
ہے۔ لیکن بعض ایسے بھی ہیں جہاں صرف عام سمجھ اور ذوقِ سلیم کی مدد ہی سے غلطی واضح ہو سکتی
ہے۔ ہم پہلے دوسری قسم کی غلطیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

مثلاً تیسرے اقتباس میں دیکھئے۔

"اور قبل اسکے کہ گھر والوں کے پاس آنے کا شوق ہو وہاں تحنث کیا کرتے"۔

بغیر یہ معلوم کئے ہوئے کہ "قبل ان ینزع الیٰ اھلہ" کا ترجمہ لغت اور زبان کے استعمالات

کی رُو سے کیا ہونا چاہیئے، آدمی محض کامن سینس اور ذوقِ سلیم کی مدد سے۔ یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ قبل ان ینزع الی اھلہٖ کا ترجمہ "قبل اس کے کہ گھر والوں کے پاس آنے کا شوق ہو" نہیں ہو سکتا۔ اسلئے کہ اس سے ترجمہ سے جملہ بالکل مہمل ہو جاتا ہے:" قبل اسکے کہ گھر والوں کے پاس آنے کا شوق ہو وہاں تحنث (بقول مترجم کئی راتیں عبادت) کیا کرتے" بالکل مہمل سی بات ہے۔

اسی طرح اسی اقتباس میں آخری فقروں کو دیکھئے۔

"یہاں تک کہ جب وہ غارِ حراء میں تھے۔ حق آیا، چنانچہ اُن کے پاس فرشتہ آیا"

یہ "حق آیا۔ چنانچہ اُن کے پاس فرشتہ آیا" کیا بات ہوئی؟ کچھ بھی نہیں! بالکل بے معنیٰ سی بات ہے۔ اور عقلِ سلیم اسکی شہادت دینے کے لئے کافی ہے۔

اب آئیے پہلی قسم کی غلطیوں کی طرف۔

۱۔ "فیفصم عنہ وان جبینہ لیتفصّد عرقًا" ـــــــ یہ جملہ حالیہ ہے۔ جس کا مطلب ہوتا ہے کہ

جب وحی کا سلسلہ موقوف ہوتا تو آپ کی پیشانی پسینہ سے تر ہوتی (یعنی وحی کی حالت آپ پر اتنی شدید ہوتی تھی کہ وحی ختم ہوتے ہوتے آپ پسینہ سے تر بتر ہو جاتے)

مگر مترجم کے ترجمہ نے مطلب یہ کر دیا کہ جب وحی موقوف ہو چکتی تب آپ کی پیشانی سے پسینہ بہنا شروع ہوتا ـــــــ جملہ کی نحوی ترکیب سے قطع نظر بھی غور کیا جائے تو یہ مطلب از خود بھی غلط نظر آتا ہے، اس لئے کہ جو چیز حدیث سے پسینہ لانے کا موجب معلوم ہوتی ہے، یہاں اسی کا ازالہ پسینہ نکلنے کی شرط قرار پا رہا ہے۔ کس قدر بے تُک اور بعید از عقل بات ہے!

۲۔ وکان یخلو بغار حراءٍ ـــــــ عربی کے صحیح ذوق کی رو سے اس کا مطلب یہ ہے اور یہی آگے کے عبارت سے بھی ظاہر بلکہ مصرح ہے، کہ آنحضرت کچھ وقت (یا زیادہ تر وقت) غارِ حراء کی تنہائیوں میں گزارنے لگے، مگر مترجم نے "غارِ حراء میں تنہا رہنے لگے"، ترجمہ کرکے مطلب یوں کر دیا کہ گویا آپ نے غارِ حراء میں مستقل بسیرا کر لیا ـــــــ حالانکہ آگے آ رہا ہے کہ آپ کچھ وقت گزار کر گھر واپس تشریف لے آتے تھے۔

۳۔ فیتحنّث فیہ، وھو التعبد، اللیالی ذوات العدد ـــــ لغت دیکھ لیجئے تحنّث میں "کئی راتوں" کا مفہوم کہیں نہیں ملے گا، بلکہ تحنّث اس سے آزاد ہے کہ ایک رات ہو یا کئی راتیں، یا ایک دن یا کئی دن۔ علاوہ ازیں خود اس عبارت میں نحوی ضابطہ اس سے مانع ہے کہ "اللیالی ذواتِ العدد" کا تعلق "التعبد" سے ہو، بلکہ اس کا تعلق "یتحنث" سے ہے، یعنی "وھو التعبد" جملہ معترضہ ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ "آپ غار حراء میں کئی کئی شب تحنث فرماتے" "تحنث کیا ہے؟ (راوی بیچ ہی میں اس کی شرح کرتے ہیں)" وھو التعبد "(یعنی) تحنث سے مراد ہے۔ عبادت گزاری، مگر مترجم نے اللیالی ذوات العدد کو التعبد سے جوڑ کر ترجمہ یوں کر دیا کہ "تحنث سے مراد ہے کئی راتیں عبادت کرنی"۔

۴۔ ثم یرجع الیٰ خدیجۃ فیتزوّد لمثلھا ـــــ اس میں فیتزوّد لمثلھا" کا ترجمہ ہے اور (پھر) اتنی ہی مدت کے لئے توشہ لے جاتے، مگر مترجم نے ترجمہ کر دیا ہے کہ" اور اسی طرح توشہ لیتے" حالانکہ یہ ترجمہ "لمثلھا" کے "ل" کی موجودگی میں کسی طرح نہیں ہو سکتا، بلکہ "ھا" ضمیر مؤنث بھی اس ترجمہ کی صورت میں محل نظر ہے۔

۵۔ فَرَجَعَ بھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ...... فدخل علیٰ خدیجۃ ـــــ اس کا بہت صاف ترجمہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس اولین درسِ حق (اقرأ باسم ربك الذی خلق) کو لے کر ...... غار حراء سے واپس ہوئے اور حضرت خدیجہ کے پاس پہنچے۔ مگر مترجم نے نہ معلوم کہاں سے" رجع بھا" کا ترجمہ" دوہرانا" کر دیا ہے، حالانکہ آگے "فدخل ....." خود، رَجَعَ بمعنی" واپس ہوئے" کو مانگتا ہے، کما لایخفیٰ علیٰ من لہٗ ادنیٰ تأمّلٍ۔

۶۔ وَتُعِینُ علیٰ نوائب الحق ـــــ اَعان یُعین اعانۃ مشہور لغت ہے، جس کے معنیٰ مدد کرنے کے ہیں، اردو میں بھی اعانت اور مُعین اسی معنی میں مستعمل ہے، جس کی رو سے اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ" آپ حق تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی مصیبتوں میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں"۔ مگر مترجم نے بات کچھ سے کچھ کر دی کہ" آپ حق کی راہ میں مصیبتیں اٹھاتے ہیں"۔

حالانکہ نہ "تُعین" کے معنی مصیبتیں اٹھانے کے ہوتے ہیں اور نہ "علی نوائب الحق" کا مطلب "حق کی راہ میں" ہو سکتا ہے، اس ترجمہ کے لئے تو عربی کے الفاظ کچھ یوں ہونے چاہیئے تھے

"تُعانی النوائب فی سبیل الحق"

"عانی یُعانی معاناۃ" کے معنی آتے ہیں، مشقت برداشت کرنا، یا تکلیف جھیلنا، جس کا مادّہ أعان یُعین اعانۃ کے مادّہ (عون) سے بالکل مختلف، "عنی" ہے۔ پھر عانی یُعانی کے لئے "علیٰ" کا صلہ بھی نہیں آتا۔ یہ موصول بلا صلہ ہے۔

یہ بات بڑی حیرت کی ہے کہ چار چار حضرات کی مشاورتی کوششوں کے باوجود کتاب کی بسم اللہ ہی میں اتنی ناقابل اغماض فروگزاشتیں ہیں۔ اسکے بعد غالباً بیجا نہیں ہے، اگر ہم پورے ترجمہ کے بارے میں بے اعتمادی کا اظہار کریں، اور بھی متفرق مقامات سے ترجمہ کو ہم نے دیکھا تو یہ تو ضرور نکلا کہ ترجمہ کے سب صفحات ایسے نہیں ہیں، مگر اس سے ہماری ابتدائی رائے میں کوئی فرق نہیں آیا، اس لئے کہ آگے بھی اس قسم کی حیرتناک فروگزاشتیں موجود ہیں کہ

"...... محمود بن ربیع سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا کہ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ڈول سے منہ میں پانی لے کر میرے منہ میں کلی کی تھی۔" (صفحہ ۱۲۱)

یہ "میرے منہ میں کلی کی تھی" ترجمہ ہے "مَجَّ فی وجھی" کا۔ حالانکہ اولاً تو یہاں "مَجَّ" کے ترجمہ میں غور و فکر سے کام لینے کی ضرورت تھی، صرف لغت میں مَجَّ بمعنی "کلی کرنا" دیکھ کر یہی ترجمہ لکھدینا کم از کم بخاری کے مترجم کی شان ذمہ داری کے خلاف تھا۔ یہاں لغوی تفقہ سے کام لینا چاہیئے تھا اور مَجَّ کے معنی کی کوئی مستحسن تعبیر کرنی چاہیئے تھی، جس کی مَجَّ کی اصل حقیقت میں پوری پوری گنجائش موجود ہے۔ پھر غضب بالائے غضب یہ ہے کہ "فی وجھی" کا ترجمہ "منہ میں" کر دیا گیا ہے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ "منہ میں کلی کرنے" کا مطلب اردو میں کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ "چہرے پر کلی کی گئی"۔ حالانکہ روایت میں "وجہ" کا لفظ ہے جس کے معنی "چہرہ" اور "رخ" کے ہیں، نہ کہ "فم" جس کے معنی منہ کے ہوتے ہیں۔

یہاں ترجمہ "منہ پر" کرنا چاہیئے تھا۔ فرق تو صرف "بھ" اور "پر" کا ہے۔ یعنی بظاہر بہت خفیف لفظی فروگزاشت ہے، مگر یہ فروگزاشت کیا غضب ڈھا رہی ہے، اسکے بیان کی حاجت نہیں۔

مقامات اور بھی ہیں، مگر اب سب کے ذکر سے کہاں تک تبصرہ کو طوالت دی جائے۔ صرف ایک کی طرف اور اشارہ کیا جاتا ہے۔ صفحہ پر کتاب البیع کے شروع میں ایک روایت ہے جس میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے دیگر صحابہ کے مقابلہ میں اپنی کثرت روایت کی وجہ منقول ہوئی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

اور لوگوں کے تو معاشی مشاغل بھی تھے جن کی بنا پر وہ حضور کی صحبت سے غیر حاضر ہوجاتے تھے۔" وکنت الزم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ملء بطنی" الخ

ان (عربی) الفاظ کا ترجمہ کیا گیا ہے

"اور میرا جب پیٹ بھرا رہتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہتا"

"علی ملء بطنی" کے مفہوم کی بحث کو چھوڑیئے، خود سیاق کلام اس ترجمہ کی نفی کر رہا ہے، پھر کجا ابوہریرہؓ اور کجا شکم سیری؟ ایک ہی سطر بعد اسی روایت میں آرہا ہے کہ "کنت امرأ مسکینا من مساکین الصفة" (میں صفہ کے فقراء میں سے ایک فقیر مسکین تھا) لہٰذا اگر حضرت ابوہریرہ کا ارشاد یہی تھا کہ میرا جب پیٹ بھرا رہتا تو حاضر صحبت رہتا۔ تو اس سے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ کی حاضری کا اوسط سب سے کم ہو۔ درانحالیکہ وہ بتانا یہ چاہتے ہیں کہ میری حاضری کا اوسط سب سے زیادہ تھا۔ اسی بنا پر میری روایتیں سب سے زیادہ ہیں۔

یہ ترجمہ کی اغلاط کی بات تھی۔ ہم سرے سے بخاری شریف کے ترجمہ ہی کو درست نہیں سمجھتے۔ خواہ کتنا ہی صحیح ترجمہ ہو، اس لئے کہ یہ کتاب اہل علم کے استفادہ کی ہے۔ عوام کے ہاتھ میں تھما دینے کی نہیں۔ عربی جاننے والے طلبا اساتذہ کی مدد سے اسکو سمجھنے میں پریشان ہوجاتے ہیں۔ عوام بیچارے محض اردو ترجمہ کی مدد سے کیا خاک سمجھیں گے؟ وہ کونسے عوام ہیں جو بخاری کے تراجم ابواب کی معنویت کو سمجھ لیں۔ اور باب کے عنوان سے ماتحت روایتوں کی لطیف مناسبتوں کا ادراک کرسکیں؟

مثال کے طور پر صفحہ ۱۲ پر باب ہے، "متی یصح سماع الصغیر" (بچے کا کس عمر میں سننا صحیح ہے) اس کے ذیل میں دو روایتیں ہیں۔ (ایک وہی کلی کرنے والی روایت ہے جو ابھی گزری) کوئی نہیں

بتائیے کہ عوام اردو خواں اِن روایات پر اس عنوان سے امام بخاری کا مدعا کیا سمجھ پائیں گے۔ ایسے ہی یہ حضرت ابو ہریرہ والی روایت جو کتاب البیع میں آئی ہے، عوام سوچتے ہی رہ جائیں گے کہ اس سے اور کتاب البیع سے کیا تعلق؟ اور اس سے بیع کے بارے میں کیا ثابت ہوا؟ —— کتاب کے سرورق پر ترجمہ کے ساتھ "فوائد اور ضروری تشریحات" بھی کتاب میں بتائی گئی ہیں مگر نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہمیں اس سے یہی شبہ ہوتا ہے کہ مترجمین اس عظیم کام کو نبھا نہیں سکے! اور یہ کچھ بعید اور تعجب کی بات بھی نہیں ہے، اس لئے کہ بخاری کا سمجھنا بڑا مشکل کام ہے۔

اُردو ترجمہ کے بارے میں یہ رائے ہماری صرف بخاری شریف سے متعلق ہی نہیں ہے، بلکہ اس نوعیت کی جتنی بھی کتب حدیث ہیں۔ اُن میں سے کسی کا بھی من وعن ترجمہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے کہ بعض روایات ایسی بھی آجاتی ہیں۔ جن کا تحمل بہت سے ذہن نہیں کر سکتے۔ خصوصاً انکار حدیث کی موجودہ فضا میں تو اس پہلو کا لحاظ بہت ہی ضروری ہے۔ فروری ۵۹ء کے الفرقان میں ہم محمد سعید اینڈ سنز ہی کے ایک ترجمہ کے سلسلہ میں اس بات کو قدرے وضاحت سے لکھ چکے ہیں۔

ہم نے اس ترجمہ کے بارے میں جو کچھ اندازہ کیا ہے، اور جو رائے تبصرہ میں ظاہر کی ہے۔ اسکے مطابق ناشر سے ہماری مخلصانہ گزارش یہ ہے کہ انھیں اس ترجمہ کی اشاعت بند کر دینی چاہیئے، بلکہ جو نسخے نکل چکے ہوں انھیں بھی واپس منگا لینا چاہیئے۔ اور اگر اس سے ہونے والا خسارہ اُن کے لئے ناقابل برداشت ہو تو کم سے کم کسی مستند ماہر فن سے اسکی تصحیح کرانے کے بعد اسکو مارکیٹ میں لانا چاہیئے۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری جیسے اساتذۂ فن کراچی میں موجود ہیں، ناشر کو ایسے امور میں اُن کا مشورہ حاصل کرنا چاہیئے۔

ہماری شہنشاہی از جناب محمد عطاء اللہ خاں عطاء، صفحات ۲۲۴، کاغذ اور کتابت طباعت متوسط، مجلد قیمت ۲/۱۰

یہ کتاب بھی محمد سعید اینڈ سنز کی شائع کردہ ہے، اس میں ابتدائے اسلام سے لے کر قیام پاکستان تک۔ نہیں بلکہ، اکتوبر ۵۸ء تک کے فوجی انقلاب تک —— اسلامی خلافت

وسلطنت کے سلسلہ کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے۔ ابتداء کے تقریباً ۸۰ صفحے مختلف ممالک کے قبل اسلام کے حکمراں خاندانوں کے تذکرہ پر مشتمل ہیں جو مؤلف کو ایک قدیم قلمی مسودہ کی شکل میں دستیاب ہو گیا تھا۔ کتاب میں اختصار اسقدر ہے کہ اسے تاریخ سے زیادہ گوشوارہ کہنا موزوں ہے ایک ایک صفحہ میں دو دو تین تین شاہان وخلفاء کی "تاریخ" آگئی ہے۔ تاہم اتنا فائدہ تو ہے ہی کہ اس کتاب کے ذریعہ یہ پورا سلسلہ ایک نظر میں سامنے آجاتا ہے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تذکرہ میں ایک جملہ ہے:۔

"حضرت امیر معاویہ خلافت راشدہ کا طریقہ ختم کرکے بادشاہت قائم کرنا چاہتے تھے" (ص ۹۶)

مؤلف نے جس سادگی کے ساتھ ــــ حقیقتاً سادگی کے ساتھ بلا کسی مذمت اور ہجو کے پیرایہ کے ــــ یہ الفاظ لکھے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے محسوس ہی نہ کیا ہوگا کہ وہ کیا کہہ گئے اور حضرت معاویہ کو کہاں پہنچا گئے۔ اس سادگی کے اثرات کتاب میں اور بھی نمایاں ہے۔

(صفحہ ۳۵ کا بقیہ) بمبئی میں ایک عجیب جانور دیار عرب سے لایا گیا ہے جس کی گردن اونٹ جیسی ہے

زرافہ اور سینگ اور پاؤں گائے جیسے ہیں اور رنگ و داغ چیتے کے سے ۔ عرب اس کو زرافہ کہتے ہیں اور عجم والے "اُشتر گاؤ پلنگ" کہتے ہیں جیسا کہ قاموس میں ہے ۔ یہ جانور عجائب صنائع آفریدگار میں سے ہے۔

سمندری سفر کا آغاز قریب چار ماہ سمندر کی طغیانی اور ہوا کے طوفان فرو ہونے کے انتظار میں بمبئی رہنا ہوا ۔ بالآخر آہ سحرگاہی کے اثر سے بادمراد چلی ــــ اب وقت ہے کہ ہم بے خوف و خطر بحری سفر کریں ــــ

بسم اللہ مجریھا و مرسٰھا ان ربی لغفور رحیم۔

(باقی)

جولائی 1969ء

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے
لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، اور اصل یہ
اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی
اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔
جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی
زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم اس کا
عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السمٰوٰت والارض انت ولیّ فی الدنیا والاٰخرۃ
توفنی مسلماً والحقنی بالصّٰلحین

"ادارہ الفرقان"

مسئول
محمد منظور نعمانی

مرتب
عتیق الرحمن سنبھلی

کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات

آپ حج کیسے کریں؟

حج وزیارت کے متعلق اردو زبان میں بےشمار چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب (جو مولانا نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی گویا مشترک تالیف ہو) اپنی اس خصوصیت میں اب بھی بےنظیر ہو کہ اس کے مطالعہ سے حج کا صحیح اور مسنون طریقہ بھی تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہو اور دل میں عشق وجذب اور ذوق وشوق کی وہ کیفیات بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو دراصل حج کی روح اور جان ہیں۔

کاغذ عمدہ .... قیمت مجلد ۲/۰/۰

آسان حج

یہ آسان زبان میں "حج کیسے کریں" کا خلاصہ ہے۔ ایسے کم تعلیم والے حضرات جو صرف آسان اور معمولی اردو ہی پڑھ سکتے ہیں وہ اس کے مطالعہ سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

طباعت معیاری .... قیمت .... صرف ۰/۸/۰

اسلام کیا ہے؟

تالیف مولانا نعمانی

اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں

اس کتاب کے دیکھنے والوں کا عام احساس یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کوئی خاص مقبولیت وتاثیر عطا فرمائی ہو پچھلے چند سالوں میں تقریباً تیس ہزار اردو میں اور کئی ہزار گجراتی میں شائع ہو چکی ہے

اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کے لیے ہی نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ اور عمل ان شاء اللہ کافی ہے۔

زبان نہایت آسان ہونے کے ساتھ نہایت شیریں اور پر تاثیر ہو۔ کتابت طباعت اعلیٰ اور معیاری قسم اول کاغذ ۲۰ پونڈ چکنا مجلد ۲/۸/۰ قسم دوم کاغذ ۲۲ پونڈ چکنا غیر مجلد ۱/۱۲/۰

ہندی اڈیشن کاغذ اعلیٰ مجلد۔ قیمت تین روپے ۳/۰/۰

کلمۂ طیبہ کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

اس میں اسلام کے کلمۂ دعوت "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ سطر سطر سے ایمان ویقین میں اضافہ ہوتا ہے اور دماغ کے ساتھ دل بھی متاثر ہوتا ہے۔

قیمت ... ۰/۶/۰

نماز کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہو کہ نماز کے مقام اور اس کی روح وحقیقت سے واقف ہونے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں "کلمۂ طیبہ کی حقیقت" کی طرح یہ بھی عقل وجذبات اور دل ودماغ کو یکساں متاثر کرتا ہو۔

قیمت ۰/۱۲/۰

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

قیمت ۰/۶/۰

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین کے الزامات

قیمت ۱/۸/۰

معرکۃ القلم

اکابر دیوبند کی طرف سے مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا آخری تحقیقی جواب .... قیمت ۱/۰/۰

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

تالیف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے قابل قدر فاضلانہ اور مبسوط مقدمہ ۲/۸/۰

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی۔ قیمت ۱/۸/۰

امام ولی اللہ دہلویؒ

از مولانا عبید اللہ سندھیؒ .... قیمت ۱/۰/۰

انیس نسواں

از محترمہ بیگم سید اصغر حسین صاحب

مسلمان خواتین خاص کر تعلیم یافتہ بہنوں میں دین کی طرف سے جو بےفکری اور آخرت کی طرف سے جو غفلت تیزی سے بڑھ رہی ہو اس کے علاج اور انسداد کے لیے ایک محترم بہن نے یہ رسالہ لکھا ہے۔ شروع میں مولانا نعمانی کے قلم سے پیش لفظ ہے .... قیمت ۰/۱۰/۰

برکات رمضان

از افادات مولانا نعمانی

اسلام کے اہم رکن "صوم رمضان" اور ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال ووظائف تراویح واعتکاف وغیرہ کے فضائل وبرکات اور ان کی روحانی تاثرات کا نہایت مؤثر اور شوق انگیز بیان اور حکیم امت حضرت شاہ ولی اللہؒ کے طرز پر اس سلسلہ کی احادیث کی ایسی تشریح جس سے دل بھی متاثر ہو اور دماغ بھی مطمئن۔ قیمت ۰/۱۲/۰

ہندوستان و پاکستان سے
سالانہ چندہ (بسکۂ پاکستان) ۶ روپے
" " (بسکۂ ہندوستان) ۵ روپے
ششماہی ۳ روپے

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

(فی کاپی آٹھ آنے)

غیر ممالک سے
سالانہ ۱۰ شلنگ
اعزازی خریداروں سے
سالانہ ۱۵ روپے

جلد (۲۶) | بابت ماہ ذی الحجہ ۱۳۷۸ھ مطابق جولائی ۱۹۵۹ء | شمارہ (۱۲)

نہایت اہم

آئندہ سے الفرقان ہر انگریزی مہینے کی یکم کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے، لہٰذا محرم (اگست) کا پرچہ انشاء اللہ یکم اگست ۱۹۵۹ء کو شائع ہوگا، اور اسکے بعد بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا ـــــــ

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس رسالہ پر آپکی مدتِ خریداری ختم ہو گئی ہے، براہِ کرم آئندہ کیلئے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، ورنہ اگلا رسالہ بصیغہ وی، پی ارسال کیا جائیگا (جسمیں آپکے ۹ آنے زائد خرچ ہونگے اور رسالہ دیر سے بھی پہنچے گا) ـــــــ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۸ اگست تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیئے۔

پاکستان کے خریدار: ـ اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً ہوائی ڈاک سے بھیجدیں ـــــــ جو حضرات پہلے سے خریدار نہیں ہیں اُن کیلئے بھی یہی طریقہ ہے۔

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ
دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا۔

نگاہِ اوّلیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الفرقان کا چھبیسواں[26] سال ختم ہو رہا ہے، ہمیں اپنے ناظرین سے شرمندگی ہے کہ ایک خاص نمبر کا جو وعدہ ہم نے اِس سال کے اندر کیا تھا، اس کے ایفا کی صورت نہ بن سکی، اس میں زیادہ دخل اِس بات کا رہا کہ نمبر کا جو خاکہ ذہن میں تھا اُس میں کافی کام الفرقان کے مرتّب کو خود کرنا تھا، اور اس پورے سال میں صورتِ حال کچھ ایسی رہی کہ باہر سے قلمی تعاون کی کمی کی بناء پر سال کے بیشتر شمارے راقم مرتّب کو قریب قریب خود ہی تیار کرنے پڑے، اِس مشغولیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتنا وقت اور ایسی یکسوئی کسی طرح میسر نہ آسکی، جو اس کام کے لئے ضروری تھی، نمبر کا تقاضہ خود ہمارے اپنے دل کا تھا کہیں باہر کا نہیں تھا، اِسلئے جی چاہتا ہے کہ جس صورت میں وہ تقاضہ اُبھرا تھا، ٹھیک اُسی صورت میں اُس کو پورا کیا جائے، ورنہ چلتا ہوا کام تو ہر حال میں کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال ہم اس معذرت کے بعد یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ نمبر کا مسئلہ ابھی ہمارے ذہن سے نکلا نہیں ہے ہماری دلی خواہش ہے کہ یہ کام حسبِ تخیّل ہو جائے لیکن اَب ہم کسی خاص وقت کی تعیین نہیں کرنا چاہتے، البتہ کوشش رہے گی کہ یہ کام جلد سے جلد ہو جائے۔ والاتمام من اللہ۔

بعض حضرات نے صرف اس نمبر کی توقع پر الفرقان کی خریداری قبول کی تھی، ان میں سے کسی صاحب کیلئے اگر ہماری یہ معذرت قابلِ قبول نہ ہو، اور الفرقان کے عام شماروں کو وہ اپنے چندہ کا بدل بھی نہ سمجھتے ہوں تو ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ ان کا کُل یا جزو چندہ جس قدر وہ مطالبہ کریں واپس کر دیں۔

یہ نیک کام! مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کا جو مضمون شوال کے الفرقان میں شائع ہوا تھا، اس کا ردِ عمل پورے زور شور سے شروع ہو گیا ہے، ہمیں اس ردِ عمل کا کوئی نوٹس نہیں لینا ہے ـــــــ
مولانا اصلاحی صاحب اگر ضرورت سمجھیں گے تو خود کچھ لکھیں گے ـــــــ لیکن "دیدۂ عبرت نگاہ" کو اگر کچھ باتیں اس میں عبرت کی نظر آئیں تو اعراض بھی نہیں کرنا چاہئیے۔

اس مضمون پر ایک مضمون تازہ فاران میں، خود ایڈیٹر فاران کا شائع ہوا ہے، اس مضمون کی سرخی کیساتھ لکھا گیا ہے ـــــــ "کاش! اس کی نوبت نہ آتی" ـــــــ ہماری زبان پر آرہا ہے کہ "کاش! یہ نہ لکھا گیا ہوتا" ـــــــ سر مضمون لکھا گیا ہے:- ع

"قلم کانپا زباں تھرا گئی اظہار سے پہلے"

ہمارا اسے پڑھ کر دل کانپ اٹھا ہے، اور بے اختیار جناب باری میں عرض پرداز ہے کہ:- بارِ الٰہا! اپنے مخلصین اور درد مندانِ دین کی حفاظت فرما ـــــــ اسلئے کہ ہم مدیر فاران کو مخلص سمجھتے ہیں اور انکے دل میں دین کا گہرا درد محسوس کرتے ہیں۔

یہ مضمون، جیسے ہم کہتے ہیں کہ "کاش! نہ لکھا گیا ہوتا"، یوں کہنے کو تو مولانا اصلاحی کے مضمون کا ایک الزامی جواب ہے، مگر در اصل یہ کچھ اور ہے، یہ افسادِ ذات البین کا ایک عبرت انگیز مرقع ہے ـــــــ
وہ "افسادِ ذات البین" جس کے بارے میں زبانِ رسالت سے صاف صاف وارد ہوا ہے:-

هِیَ الْحَالِقَةُ ـــــــ یہ اُسترا ہے ـ بالوں کو مونڈنے والا نہیں، بلکہ (آدمی کے) دین کا صفایا کر دینے والا!۔
(ترمذی و ابی داؤد)

مولانا اصلاحی صاحب نے اپنے مضمون میں مولانا نعمانی کے متعلق چند تعریفی کلمات لکھ دیئے تھے، بس پورے مضمون میں سے صرف اسی کو لیکر ایڈیٹر فاران نے پوری کتاب کھول دی ہے کہ جب تم جماعت اسلامی میں تھے تو مولانا نعمانی کے متعلق تم نے اس کے برعکس کیا کیا لکھا تھا! وہ کتاب جسے یہ دونوں دوست آج نہیں انھیں دنوں لپیٹ کر رکھ چکے تھے جب یہ وجود میں آئی تھی، الفرقان کے صفحات اس پر گواہ ہیں[1]! مگر ایڈیٹر فاران نے

---

[1] جی چاہے تو دیکھئے الفرقان ربیع الثانی ۷۱ھ۔ مکاتبت مولانا اصلاحی و مولانا نعمانی۔ مولانا اصلاحی مولانا نعمانی کو لکھتے ہیں:" بہرحال اب میں ــ ــ ... اس بات کو کسی طرح جائز نہیں سمجھتا کہ آپ سے بدگمان رہوں، (بقیہ ص۔ پر)

داستان کے اس خاتمہ کو بھلا کر بھرپور کوشش کی ہے کہ جو کام اس داستان سے اس وقت نہ ہو سکا تھا، جب یہ داستان نہیں، ایک تازہ واقعہ تھی، وہ آج ہو جائے، جبکہ یہ برسوں کی مسافت پر دفن ہو چکی ہے ــــــ کس قدر نیک کام ہے جو ایڈیٹر فاران نے پوری دلسوزی کے ساتھ اور اظہارِ حق کے جذبہ سے سرشار ہو کر انجام دیا ہے!۔

اس نیک کام میں فاران کے نیک دل ایڈیٹر نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے، پرانی داستانوں کے اوراق ہی انھوں نے نہیں چھانے ہیں، بلکہ قوتِ فکر سے ایک نئی چیز بھی پیدا کر کے...... ہدیۂ ناظرین کی ہے، اور وہ یہ ہے، کہ:۔

"اس مقالہ[1] کے آغاز میں "ادارہ[2]" کی طرف سے جو نوٹ دیا گیا ہے، اس کا اختتام قرآن کریم کی اس آیت پر ہوتا ہے:۔

وَاللّٰهُ يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ

مجلہ "الفرقان"، کے مدیر مسئول اور مرتب اللہ کے فضل سے دونوں صاحب تقوی بھی ہیں اور اہل علم بھی ہیں، لہذا قرآن کی آیت اس طرح استعمال کرنے کی جرأت یہی حضرات کر سکتے ہیں ہم گنہگاروں اور بے علموں کی تو یہ مجال نہیں ہو سکتی، ان کی نگاہ میں مولانا اصلاحی کو اللہ تعالیٰ نے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت اب کی ہے، جبکہ وہ (سابق) جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہو چکے ہیں، اور مولانا مودودی کی عربی دانی، علم و فضل اور فکر و عمل، ان سب کو مجروح فرما چکے ہیں، مگر ہمیں مولانا اصلاحی کے ہدایت یاب ہونے میں کبھی شک نہیں رہا"۔ ...الخ

(فاران، جولائی، ص ۱۸، ۱۷)

(ص۳ کا بقیہ حاشیہ) اس لئے میں آپ پر یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اب میرا دل آپ سے بحمد اللہ صاف ہے، اور میں آپ سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ آپ بھی میرے تمام الفاظ کی تلخیوں کو فراموش اور مجھے معاف کر کے مجھ سے اپنے دل کو صاف کر لیں"۔ اس کے جواب میں مولانا نعمانی نے جو خط لکھا تھا اس کا ایک فقرہ یہ تھا ــــــ "دل میں آپ کی ... ... بالکل وہی جگہ ہے جو کبھی پہلے تھی، آپ کے مضمون کے بعد بھی اس میں کوئی فرق نہیں آسکا ہے"۔

[1] مولانا امین احسن صاحب کا مذکورہ مقالہ۔

[2] ادارۂ الفرقان (ع)۔

یہ ادارتی نوٹ راقم سطور (مرتب) کے قلم سے تھا، اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتا تھا کہ کوئی صاحب یہ معنی بھی اس آیت کو پہنا سکتے ہیں، مگر جب آدمی کسی بات پر کمر باندھ کے بیٹھ جاتا ہے تو پھر دیکھئے وہ کیسی کیسی دُور کی کوڑی لاتا ہے!۔

یہ آیت کس سیاق میں آئی ہے، اس کا اندازہ اس پورے پیرے سے ہو سکتا ہے جس کا جزو یہ آیت ہے وہ پیرا صرف اتنا ہی سا ہے :-

"ہم اب اس مضمون پر اس بحث کو ختم کرتے ہیں ——— وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ"

مدیر فاران جیسے سخن شناس ناقد سے یہ کہنے کی تو جرأت ہمیں نہیں، کہ :- ع

سخن شناس نئی دلبر خطا اینجاست

پس اس کے سوا کیا کہا جائے کہ سخن فہمی کا ایک نیا انداز انھوں نے ہم پر کھولا ہے، جس کے لئے مرتب الفرقان اُن کا ممنون ہے، ورنہ وہ اگر کسی اور کے قلم سے بھی یہ عبارت دیکھتا تو اس کا مطلب صرف یہی سمجھتا کہ بحث اور اظہار حق کی سعی جس حد تک کی جا سکتی تھی کر دی گئی، اب یہ آگے اللہ کے اختیار ہے کہ وہ کس کو قبول حق کی توفیق دیتا ہے کس کو نہیں ۔

مدیر فاران نے اس دوسرے تیر کا نشانہ تو مولانا امین احسن صاحب کے دل پر باندھا تھا، ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ تیر نشانے پر بیٹھا یا نہیں! اس کو خود مولانا ہی بہتر بتا سکیں گے، البتہ جو ناوکِ فساد انھوں نے مدیر الفرقان کے قلب و جذبات کا نشانہ باندھ کر چلایا ہے، اس کے متعلق ان کی خدمت میں عرض ہے :-

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

کسی کی خاطر!!

اس مضمون میں عبرت کا ایک اور بھی پہلو ہے، اس کی تمہید میں مضمون نگار نے "حکمتِ عملی" کی بحث کو بھی چھیڑا ہے، اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا لہجہ، بین السطور، اور بعض بعض فقرے تک بول رہے ہیں، کہ اس بحث میں مضمون نگار کا دل مولانا مودودی کے موقف اور اُن کی

روش پر مطمئن نہیں ہے، مگر دین کیلئے گہرے درد و سوز اور تمام تر اخلاص کے باوجود اس کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ مودودی صاحب کی غلطی کو کسی طرح نبھا لیا جائے ــــــ مسئلہ میں جو حق ہے وہ ضرور اپنی جگہ پر رہے مگر مودودی صاحب کے وقار پر بھی آنچ نہ آنے پائے، خواہ اسکی قیمت پر حق میں التباس ہی کیوں نہ پیدا ہو جائے۔

"حکمتِ عملی" جس سے بحث ہے، کس چیز کا نام ہے؟ اور مولانا مودودی صاحب کا "نظریہ حکمتِ عملی" ہے کیا؟ خود مولانا ہی سے پہلے اس کو سُن لیجئے! ــــــ اپنے اس نظریہ کو سب سے پہلی بار پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :ــ

"اس معاملہ میں (کسی نصب العین کیلئے عملی جدوجہد کرنے کے معاملہ میں۔ ع) صرف نظریت کام نہیں دیتی، بلکہ اس کے ساتھ عملی حکمت ناگزیر ہے، اس حکمت کو نظرانداز کر دینے والا نظری آدمی طرح طرح کی باتیں کر سکتا ہے، کیونکہ وہ یا تو قافلہ میں شامل نہیں ہوتا، یا پھر قافلہ کو لیکر چلنے کی ذمہ داری اس پر نہیں ہوتی، مگر جسے چلنا ہی نہ ہو، بلکہ چلانا بھی ہو، وہ ہر بات کو محض اُس کے خیالی حُسن کی بنیاد پر قبول نہیں کر سکتا، اُسے تو عملی نقطۂ نظر سے تول کر دیکھنا ہوتا ہے، کہ جن حالات میں وہ کام کر رہا ہے، جو قوت اس وقت اس کے پاس موجود ہے، یا فراہم ہونی ممکن ہے اور جو جو مزاحمتیں راستہ میں موجود ہیں، ان سب کو دیکھتے ہوئے کون سی بات قابلِ قبول ہے اور کون سی نہیں!"

اس سے زیرِ بحث "حکمتِ عملی" کا مطلب سمجھ لیجئے!۔

ــــــ آگے بڑھئے :ــ

"(اقامتِ دین کیلئے جدوجہد کرنے والا) جو شخص یہ چاہے کہ پہلا قدم آخری منزل ہی پر رکھوں گا، اور پھر دورانِ سعی میں کسی مصلحت و ضرورت کی خاطر اپنے اصولوں میں کسی استثناء اور کسی لچک کی گنجائش بھی نہ رکھوں گا، وہ عملاً اس مقصد کیلئے کوئی کام نہیں کر سکتا، یہاں آئیڈیلزم کے ساتھ برابر کے تناسب سے حکمتِ عملی کا ملنا ضروری ہے۔ وہی یہ طے کرتی ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے راستہ کی کن کن چیزوں کو آگے کی پیش قدمی کا ذریعہ بنانا چاہئے کن کن مواقع سے فائدہ اُٹھانا چاہئے، کن کن موانع کے ہٹانے کو مقصدی اہمیت دینی چاہئے اور اپنے اصولوں میں سے کن میں بے لچک ہونا اور کن میں اہم تر مصالح کی خاطر حسب ضرورت

لچک کی گنجائش نکالنی چاہیئے۔"

(اس کے بعد حضور نبی کریم کے اسوۂ حسنہ سے "اس لچک کی ایک عملی مثال" آتی ہے، اور اس کی روشنی میں توضیح کی جاتی ہے) :-

"مگر یہ معاملہ دین کے سارے اصولوں کے بارے میں یکساں نہیں ہے جن اصولوں پر دین کی اساس قائم ہے، مثلاً توحید و رسالت وغیرہ، ان میں عملی مصالح کے لحاظ سے لچک پیدا کرنے کی کوئی مثال حضورؐ کی سیرت میں نہیں ملتی، نہ اس کا تصوّر ہی کیا جا سکتا ہے۔"

یہ مولانا کا نظریہ "حکمتِ عملی" ہوا!! ——— اس پر اتنا اضافہ اور کر لیجئے، کہ "لچک" سے مراد قربانی ہے، اس نظریہ پر اعتراضات کے بعد مولانا نے اپنے مدعا کی توضیح کرتے ہوئے یہی ظاہر کیا ہے (ملاحظہ ہو ترجمان القرآن مئی ۱۹۵۸ء) ——— نیز یہ کہ خود مولانا کے بیان کے مطابق اس نظریہ کا پس منظر یہ ہے کہ الیکشن میں اُمیدواری سسٹم (جس کو مولانا اور پوری جماعتِ اسلامی قطعاً ناجائز سمجھتی تھی) کو انگیز کرنے کا مسئلہ تھا جس پر مولانا نے یہ نظریہ پیش کیا، اور اس کے ماتحت یہ فیصلہ ہوا کہ اُمیدواری، اسلام میں اگرچہ ناجائز ہے، اور اسکی بنا پر نہ ہمیں خود اُمیدوار بننا چاہیئے اور نہ کسی اُمیدوار کو ووٹ دینا یا اس کی کامیابی کیلئے کوئی تعاون کرنا چاہیئے، مگر ہم چونکہ ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ہر جگہ اپنے معیارِ مطلوب کے مطابق آدمی کھڑے کر سکیں، اِس لئے اگر ہمیں اقامتِ دین کے لئے عملاً کوئی کام کرنا ہے تو کم از کم اتنا ناگزیر ہے کہ خود اُمیدوار بن کر کھڑے ہونیوالے جو لوگ ہمارے مقصد کیلئے مفید ہو سکتے ہوں ان کو ہم خود بھی ووٹ دیں اور دلوائیں بھی ورنہ ہم اپنے مقصدِ اصلی کو نقصان پہنچانے کے مرتکب ہونگے ——— (حوالہ۔ ایضاً)۔

اب آپ جناب فاران کی سُنئے! ——— فرماتے ہیں :-

"جہانتک اصل موضوع و مبحث (حکمتِ عملی کا دین میں مقام) کا تعلق ہے، اس پر جتنے مضامین موافق و مخالف ابتک آئے ہیں، یا پچھلے علماء اور اہلِ فکر نے جو کچھ لکھا ہے[1]، اُسے پڑھ کر

---

[1] "پچھلے علماء اور اہلِ فکر" کی کوئی چیز تو اس عنوان سے ابتک سامنے لائی نہیں گئی ہے، ہاں حافظ ابن قیمؒ کی ایک فقہی بحث کا ترجمہ حال ہی میں ترجمان القرآن میں شائع ہوا ہے، یہ غالباً اسی کی طرف اشارہ ہے، اس کو شائع کرتے ہوئے اگرچہ یہ ظاہر نہیں کیا گیا ہے کہ اس کا تعلق حکمت عملی کی بحث سے ہے، مگر سمجھا ہم نے بھی یہی تھا، کہ (بقیہ حاشیہ)

ایک صاحبِ لرائے شخص موازنہ اور محاکمہ کرسکتا ہے کہ کس کا موقف درست ہے، اور کس نے اپنی بات کی پچ میں کتنی دھاندلی کی ہے، جہاں تک دین کے اصل احکام کا تعلق ہے اس میں بیشک اللہ اور رسول کے علاوہ اور کسی کو رد و بدل کا حق حاصل نہیں ہے "حکمتِ عملی" دین کے احکام کا حالات و مواقع کے لحاظ سے ان کے صحیح استعمال کا نام ہے، دینی احکام کے رد و بدل کو "حکمتِ عملی" نہیں کہتے!"

یہ خط کشیدہ جملے حق کی شہادت ہیں —— کہ حکمتِ عملی، بہ معنی حالات و مواقع کے لحاظ سے احکامِ دینیہ کا صحیح استعمال تو درست ہے، لیکن یہ کہ عملی نقطۂ نظر سے تول کر کسی حکم کے ترک و اختیار کا فیصلہ کیا جائے، اس معنی میں حکمتِ عملی کی دین میں کوئی گنجائش نہیں —— مگر اس سیاق و سباق اور اس محتاط انداز میں کہ جھنڈا مودودی صاحب ہی کا اونچا رہے! —— یا کم از کم کوئی آنچ تو ان پر نہ آنے پائے!!۔

اور سنئے!:-

"جو چیزیں نص کے ذریعہ حلال و حرام ہیں، ان کی برابری کسی حیثیت سے بھی وہ اجتہادی مسائل نہیں کرسکتے، جن کے جواز و عدم جواز کا فقہا حکم لگاتے ہیں .... اگر حالات کی تبدیلی کے ساتھ قیاسی و اجتہادی مسائل میں تبدیلی ہوسکتی ہے، اور اس تبدیلی کی جسے دوسرے لوگ "تضادِ قول و عمل" سمجھتے ہوں، وہ عالمِ دین (جس نے تبدیلی کا ارتکاب کیا ہو۔ ع) "حکمتِ عملی" سے توجیہ کردے تو اس پر یہ پھبتی چست کرنی ایک طرح کی زیادتی ہے کہ اُس نے شریعت کو اپنے اہواء کے تابع کرلیا ہے!۔

(ص۷ کا بقیہ حاشیہ) یہ ابن قیمؒ کی بحث کا اپنے مقصد کیلئے ایک گونہ حکمتِ عملی کے ساتھ استعمال ہے، اور ہم نے اس پر کچھ لکھ بھی لیا تھا، لیکن اس خیال سے کہ جب ہم اس بحث کو بند کرچکے ہیں، تو جب تک شدید ضرورت ہی داعی نہ ہو اس کا دروازہ پھر سے نہیں کھولنا چاہئے، ہم نے اس کی اشاعت کا فیصلہ نہیں کیا، ورنہ جو خود نہیں سمجھ سکتے ہیں انھیں بھی معلوم ہوجاتا کہ یہ اپنی بات کی پچ میں ایک جلیل القدر پچھلے عالم و امام کا کتنا غلط استعمال ہے، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اگرچہ اس بحث کا تعلق ہمارے یہاں کے موضوع و مبحث سے بالکل نہیں ہے، مگر اللہ کے فضل سے اسکی کانٹ چھانٹ کے باوجود اس میں ایک ایسی چیز موجود ہے جو زیر بحث نظریۂ حکمتِ عملی سے امام ابن قیمؒ کی کامل براءت ظاہر کررہی ہے ؎

؎ یہ شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے ایک مقبول بندے کی حفاظت کا غیبی انتظام ہے۔

مولانا مودودی ہوں یا دوسرے علماء دین اور مفتیانِ شریعت ہوں، ان میں سے وحی تو کسی پر بھی نہیں آتی، یہ بھی نہیں ہے کہ انکی زبان و قلم سے جو حرف بھی نکل جائے اُسے لازماً حق ہی ہونا چاہیئے، یہ بھی ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے کہ نیک نیتی کے ساتھ حالات کے لحاظ سے شرعی اجتہاد کیا جاتا ہے، مگر وہ درست نہیں ہوتا، آگے چل کر حالات ہی کے اعتبار سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ پہلی بات درست نہ تھی، اس فیصلہ میں صورت حال اور مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو سامنے نہیں رکھا گیا تھا، تجربہ کے بعد اس غلطی کا پتہ چل جانے پر "حکمتِ عملی" کی توجیہہ کے بجائے اسکو غلطی اور فروگذاشت سے تعبیر کیا جائے، تو غلطی کا یہ اعتراف بہت سے دلوں کے خلجان کو دور کردے گا، اور بحث و نزاع کیلئے کم سے کم گنجائش نکل سکے گی، مگر نتیجہ کے اعتبار سے ان دونوں موقفوں میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔"

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس حصۂ مضمون میں کہاں کہاں پانی مر رہا ہے؟ اور "اگر" اور "مگر" کا یہ مضطربانہ استعمال کیا کچھ کہہ رہا ہے؟ ——— اور اس اضطراب نے یہ کیا ذہنی کیفیت پیدا کردی ہو کہ غلطی کا اعتراف اور "حکمتِ عملی کی توجیہہ" کا فرق ہی درمیان سے اُٹھ گیا ہے؟؟ ——— اس کے ساتھ اس پر بھی غور کیجئے کہ کس خوبصورتی کے ساتھ مودودی صاحب کو مخمصے سے نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے! ان کا نظریہ اپنی مکمل شکل میں، خود انہی کے الفاظ میں آپکے سامنے ہے، "شرعی اجتہاد" کا لفظ آج تک کی تمام تاویل و توجیہہ میں بھی ایک بار ان کی زبان پر نہیں آیا ہے ——— حالانکہ وہ بھی اس لفظ سے واقف ہیں ——— نہ انھوں نے منصوص اور غیر منصوص احکام کی کوئی تفریق ہی کی، بلکہ صاف بتایا ہے، کہ توحید و رسالت جیسے اساسی اصولوں کو چھوڑ کر دین کا ہر اصول اور ہر حکم اُن کی "حکمتِ عملی" کی زد میں آتا ہے، اور اس چھوٹے سے دائرہ کے سوا، دین کا کوئی حصہ نہیں بچ سکتا جس میں عملی مصالح کے لحاظ سے ترک و اختیار کے بارے میں تحریک اسلامی کے قائد کا فیصلہ نافذ اور ناطق نہ ہو۔ انھوں نے اپنے بیان کے مطابق، سب سے پہلے اس نظریہ کا استعمال "امیدواری" کے مسئلہ میں کیا، جس کا شرعی حکم اُن کے نزدیک منصوص تھا ——— پھر انھوں نے مثالیں دے دے کر بتایا، کہ حکمتِ عملی کے تحت جھوٹ بھی بولا جاسکتا ہے، غیبت بھی کی جاسکتی ہے، نامحرم عورتوں کے کپڑے بھی اُتارے جاسکتے ہیں۔۔۔ ۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ حدود بھی ساقط کئے جاسکتے ہیں! ان میں سے غالباً ایک مسئلہ بھی قیاسی نہیں ہے۔ سب کے سب منصوص الاحکام ہی ہیں؟۔

مگر کس بلا کی معصومیت کے ساتھ کہا جا رہا ہے ——— کہ :۔

"اگر حالات کی تبدیلی کیساتھ قیاسی و اجتہادی احکام میں تبدیلی ہو سکتی ہے، اور اس تبدیلی کی ..

(کوئی) عالمِ دین حکمتِ عملی سے توجیہہ کرتے، تو .. .. .. (اس میں کیا گناہ ہے؟)" ———

اور کس خوبصورتی کیساتھ سمجھایا جا رہا ہے کہ مولانا مودودی نے اگر کسی دینی حکم کو چھوڑ کر اس سے مختلف رُویّہ اب تک اختیار کیا ہے، یا کسی ایسے رُویّہ کے نظری طور پر وہ قائل ہیں، تو اس (مختلف رُویّہ) کی حیثیت ہے تو ایک "شرعی اجتہاد" کی ہے، اور یہ "حکمتِ عملی" کی بات تو محض ایک توجیہہ ہے اس بدلے ہوئے "اجتہادی مُوقف" کی !! ——— جیسے یہ خبر ہی نہ ہو کہ مودودی صاحب دین کے منصوص احکام و اصول میں بھی حکمتِ عملی کے تحت تبدیلِ موقف کے قائل ہیں[لہ]، جو شرعی دائرۂ اجتہاد سے یکسر خارج ہے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ "حکم کی تبدیلی" کی بات نہیں کرتے، کہ مسئلہ میں ہماری رائے بدل گئی ہے، اسلئے ہم عملی موقف بدل رہے ہیں، بلکہ اُن کا انداز یہ ہے کہ مسئلہ کا حکم اپنی جگہ پر وہی ہے، مگر تقاضائے مصلحت یہ ہے کہ اپنے عمل میں ذرا لچک پیدا کی جائے، اور فلاں وقت تک کیلئے اِس حکم سے صرفِ نظر کر لیا جائے ——— علاوہ انکی نظریاتی تصریحات کے "امیر گزاری" کے مسئلہ میں انکی تقریر (جس کا خلاصہ دیا جا چکا ہے) ہمارے اس بیان کی صریح تصدیق ہے! ——— اور ملاحظہ ہو! :۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ دین میں "حکمتِ عملی" کا ایک مقام ہے، اس کے لئے "غیبت و کذب" کی مثالیں لانے کی کوئی ضرورت نہیں، کہ اس سے طبیعت کو وحشت ہوتی ہے! "حکمتِ عملی" کی سب سے واضح مثال تو حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یہ رَوِش ہے کہ فاروق اعظمؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں صوبوں کے تمام گورنروں اور حاکموں کی معاشرت، رہن سہن اور حالاتِ زندگی پر جس سختی کیساتھ احتساب فرمایا، اس طرح کا احتساب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر نہیں کیا!" (فاران)

جزاک اللہ! مودودی صاحب کے نیاز مندوں میں سے کسی کو تو "غیبت و کذب" کی مثالوں سے وحشت ہوئی، اور کسی نے تو دین میں حکمتِ عملی کا صحیح مقام مولانا کو سمجھانے کی کوشش کی، خواہ رُوئے سخن کسی طرف بھی رہا ——— مگر وائے رے شخصیت پرستی! کہ اگلے ہی قدم پر اس "صحیح" میں "غلط" کو بھی جگہ دلانے کی کوشش ہونے لگی، یا "صحیح" میں پہنچا ہوا قدم بے تکلف "غلط" میں جانے لگا!! ——— چنانچہ ارشاد ہوا :۔

"حکمتِ عملی" کی بالکل سامنے کی مثال یہ ہے کہ اب سے تقریباً چالیس سال قبل ہندوستان کے علماء کی غالب اکثریت نے

لہ اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ قیاسی و اجتہادی مسائل حکمتِ عملی کے تحت بدلے جا سکتے ہیں، ہم یہاں علیٰ سبیل التنزل گفتگو کر رہے ہیں، اور نہ اس مسئلہ کی پوری تفصیل آگے آئے گی، کہ ہمارے نزدیک کس قسم کے اجتہادی مواقف میں حکمتِ عملی کے ماتحت تغیر کیا جا سکتا ہے۔

انگریزی حکومت سے موالات کو ناجائز قرار دیا، مگر پندرہ سولہ سال بعد یہ موالاۃ جائز سمجھا گیا، اور کانگریس اور مسلم لیگ نے برطانوی سیادت کے زیر سایہ صوبوں میں زمام حکومت سنبھال لی"

کون بتائے کہ یہ "موالات اور عدم موالات" ان چیزوں میں سے نہیں ہے جن میں حکمت عملی کے ماتحت فیصلے ہوں، وہ تو صرف "مباحات" ہی کا دائرہ ہے جس میں "حکمت عملی" کے ماتحت ترک و اختیار کے فیصلے کئے جا سکتے ہیں، رہی یہ مثال کہ :-

"علماء نے ترک موالات کے فیصلہ کے بعد ایک وقت میں انگریزوں سے موالات کو جائز سمجھ لیا، اور برطانوی سیادت کے زیر سایہ حکومتوں کی تشکیل سے متفق ہو گئے" تو یہ ——— "موالات کو جائز سمجھ لینا" ...... محض آپکا اختراع ہے حقیقت سے کوئی واسطہ اس کو نہیں! نہ ترک موالات کے فتوے کے مقابلہ میں ان علماء کا کوئی فتوی دکھایا جاسکتا ہے کہ "اب موالات جائز ہے، اسلئے انڈیا ایکٹ ۳۵ء کے تحت وزارتیں بنالی جائیں" نہ کوئی شخص بسلامتی ہوش و حواس ان علماء کے مجموعی رویہ کو دیکھتے ہوئے، ان پر یہ تہمت دھر سکتا ہے کہ انڈیا ایکٹ ۳۵ء کو ان کا قبول کر لینا انگریزوں سے موالات کو جائز سمجھ لینے کی بناء پر تھا ——— خدا کے بندو! مودودی صاحب کی بات کو نبھانے کیلئے ان بیچارے دوسرے علماء کو تو کانٹوں میں نہ گھسیٹو! اور وہ تہمت تو ان پر نہ دھرو جسکے بارے میں انھیں پورے اطمینان کا حق ہے، کہ دنیا کی جو بھی تہمت ہم پہ دھر لی جائے، یہ تہمت نہیں دھری جا سکتی[1]

خیر یہ واقعہ کی بحث تو الگ رہی، نفس مسئلہ کی بات یہ ہے کہ جہانتک موالات و عدم موالات کے اصل احکام کا تعلق ہے جو کتاب و سنت میں منصوص ہیں، اُنکے متعلق تو فاران کے فاضل مدیر کا بھی خیال ہے کہ انہیں کوئی شخص سر مو تغیر کرنے کا مجاز نہیں ہے ——— لیکن ان احکام کے (اور اسی طرح تمام مسائل کے اصل احکام کے) کسی خاص محل میں استعمال کا معاملہ بھی یہ ہے، کہ اولاً تو جس جگہ بھی ان کو استعمال کیا جائے گا اس بنیاد پر استعمال کیا جائے گا کہ اس جگہ یہ احکام منطبق ہو رہے ہیں، علیٰ ہذا جب ان احکام کا استعمال ترک کیا جائے گا، اور عملی رویہ بدلا جائے گا، تو اسی بنیاد بھی صرف یہی ہوگی کہ اب یہ محل، ان احکام کا محل استعمال نہیں رہا اور یہ احکام اب اس جگہ پر منطبق نہیں ہو رہے، نہ یہ کہ عملی نقطۂ نظر سے، ہمارے آپکے نزدیک اب ان احکام کا استعمال مناسب نہیں ہے ——— بس موالات و عدم موالات کے احکام ہوں، یا دوسرے احکام اصلیہ، کوئی عالم اگر مذکورۂ بالا صحیح اصول پر انکے استعمال و ترک استعمال کی بات کرتا ہے تو انکے انطباق و عدم انطباق کے مسئلہ میں تو اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، مگر اصولی طور پر اسکی روش کو صحیح مانا جائے گا! لیکن ایک نہیں، امت کی بدقسمتی سے ایک ہزار عالم بھی جمع ہو کر اگر انطباق و عدم انطباق کے نقطۂ نظر کو چھوڑ کر محض

[1] اس واقعاتی بحث پر تفصیل کی ہم ضرورت اسلئے نہیں سمجھتے کہ اس "واقعہ" سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود ہیں، وہ خود اپنی صفائی پیش کر سکتے ہیں۔

عملی نقطۂ نظر سے کسی دینی حکم کے استعمال و ترکِ استعمال کا فیصلہ کرنے لگیں، تو چاہے وہ سب کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں اُن کا یہ طرزِ عمل اصولی حیثیت سے گمراہی ہی کہلائے گا ——— یہی حال قیاسی احکام کا بھی ہے کہ اگر "قیاس صحیح" سے جو مجتہدینِ امت کے نزدیک معتبر اور ایک دلیلِ شرعی ہے، کوئی حکم ثابت ہو جائے تو پھر محض عملی نقطۂ نظر سے کام لے کر، جسکی یہاں بحث ہے، اس کو بھی ترک نہیں کیا جا سکتا!۔

اسکے برعکس جو امور مباحات کے دائرہ کے ہیں، اور اُن میں کسی دینی حکم کی بحث ہی نہیں پیدا ہوتی، انکے بارہ میں ہر شخص آزاد ہے کہ جو چاہے رویہ اختیار کرے، وہ اگر کسی اسلامی تحریک کا قائد ہے تو اسکو اختیار ہی نہیں، عند اللہ اسکی ذمہ داری ہے کہ جو رویہ اسلامی تحریک کے مفاد میں سمجھے اسکو عمل میں لائے، تجربہ سے مضر ثابت ہو تو اسمیں تبدیلی کر دے، یا ایک وقت میں مفید ثابت ہو تو اُسے اختیار کئے رہے، دوسرے وقت میں مضر ہونے لگے تو اسکو ترک کر دے، اسی طرح وہ اگر مسلمانوں کے "اولوالامر" میں ہے تو اپنے یا حکام کے یا عوام کے جس رویہ میں مسلمانوں کی مجموعی مصلحت دیکھے اسکو خود اختیار کرے، حکام کو اسکی ہدایت کرے، اور عوام کو اسکے مطابق چلائے، دو جگہ دو مختلف رویے اختیار کرنا ہی قرینِ مصلحت ہو تو ایسا کرے ——— غرض مباحات کے دائرے میں، حدِ اباحت کے اندر ہر رویہ کی آزادی ہے، اسی لئے پوری گنجائش ہے کہ "حکمتِ عملی" سے کام لیا جائے، عملی نقطۂ نظر سے فیصلے کئے جائیں حضرت عمرؓ کے "متضاد" رویہ کی جو مثال سامنے لائی گئی ہے، بادنیٰ تامل واضح ہو سکتا ہے کہ اس مثال کا تعلق اسی قبیل کے امور سے ہے، اسی لئے انھیں حق تھا اور آج دوسروں کو بھی حق ہے کہ اس دائرہ میں جو چاہیں پالیسی بنائیں، جب چاہیں اُسے ترک کر دیں، اور دس جگہ دس رویے اختیار کرنے کی ضرورت سمجھیں تو کریں، کوئی ان سے یہ تو کہہ سکتا ہے کہ مصلحت کے خلاف کر رہے ہو، یہ کوئی نہیں کہے گا کہ دین کے خلاف کر رہے ہو!۔

افسوس! کہ یا تو حق سے آگاہی کے باوجود، مودودی صاحب کی روش نے، صاحبِ فاران پر حق ملتبس کر دیا کہ وہ معاشرتی معیار اور "موالات و عدم موالات" جیسے امور کو یکساں سمجھ بیٹھے، یا انھوں نے جانتے بوجھتے، مودودی صاحب کے بچاؤ کی خاطر کہ یہ بھی انکی نظر میں ایک نیک کام ہے، یہ جرأت کر ڈالی، کہ "انڈیا ایکٹ" کے قبول کر لینے کو "موالات" کا رنگ دیدیا —— بہرحال شخصیت پرستی کے یہ دونوں ہی اثر قابلِ افسوس اور قابلِ عبرت ہیں!۔

* "الشیخ حبیبٌ الینا والحق احبُّ الینا منہ" کا جو مقولہ جماعت اسلامی کے حلقوں میں بڑی اونچی صداؤں سے ہر گلے اور پچھلے "شیخ" کے رخ پر بلند ہوتا رہا، یہ مقامِ عبرت نہیں تو کیا ہے؟ کہ آج وہ پست سے پست آواز میں بھی نہیں سنائی دے رہا!۔

کئی باتیں اور قابلِ ذکر تھیں، مگر اب صفحات کی گنجائش جواب دے رہی ہے، ورنہ شاید ان کا تذکرہ کئی حیثیتوں سے م

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مرحوم

کا

سفرنامۂ حجاز

تلخیص و ترجمہ ——— از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی ——— قسط دوم

یہ مضمون دراصل تین قسطوں کا تھا، اور مولانا نسیم احمد صاحب کا ارادہ بھی یہی تھا۔ مگر اس صورت میں آخری قسط اگلے سال کے فائل میں چلی جاتی اور یہ کچھ مناسب نہ ہوتا۔ اس لیے ہم کچھ زیادہ صفحات اس مضمون کو دے کر اسی قسط میں پورا مضمون ختم کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین کرام بھی اس فیصلہ کو مناسب قرار دیں گے ——— (مُرتّب)

بمبئی سے حدیدہ

۱۵ ارشعبان ۱۲۵۵ھ کو جہاز کا لنگر اٹھا۔ ۵ ررمضان کو جہاز عدن کی بندرگاہ پر پہونچا۔ اسی تاریخ کو شہر عدن میں جانا ہوا۔ عدن ایک مشہور شہر ہے۔ مگر آج کل (اپنی موجودہ حیثیت کے لحاظ سے) ایک گاؤں سے زیادہ نہیں ہے۔ یہاں کے باشندوں کے اکثر مکانات خسپوش ہیں اور "آرائش سقف و جدار" بوریے سے ہوتی ہے۔ چند مکانات پختہ بھی ہیں ——— یہاں سے قبلہ بسمت شمال ہے ——— سید ابوبکر عیدی روسی کا مزار اسی جگہ ہے۔ سید زین (جو کہ اس بستی کے اکابر و مشائخ میں سے ہیں) کے مکان پر راقم کا قیام ہوا۔ سید ابوبکر عید روسی ان کے رشتہ داروں میں سے تھے ——— ان کے فرط اخلاق کا کیا ذکر کروں۔ کوئی تعارف نہ ہونے کے باوجود ایک مسافر کے ساتھ ایسی مہربانی سے پیش آئے جو انجناب سید کے ساتھ مخصوص ہوا کرتی ہے۔ ان کے تین صاحبزادے ہیں۔ سب سے بڑے سید علوی آج روز رہا اس لیے

سے مل کر راقم کی محبت ازلی تازہ ہو گئی۔ عمدہ آدمی اور مبارک انسان ہیں۔ "تقوی دثار" اور "ورع شعار" ہیں۔

عدن آج کل انگریزوں کے قبضہ میں ہے، سات ماہ گزرے کہ حاکم سابق سے انھوں نے صلح کر لے لیا ــــ اللّٰھم مالک الملک توتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء ــــ اور اس قبضے کا سبب یہ سننے میں آیا کہ ارباب حکومت انگلشیہ کو اپنے دخانی جہازوں کے لیے جو سویس (سوئز) سے لندن آمد و شد رکھتے ہیں۔ ایک ایسی قرارگاہ مطلوب تھی جہاں یہ سامان آب و آتش" بہ آسانی مہیا ہو سکے۔ چنانچہ انھوں نے حاکم عدن سے کہا کہ عدن کی آمدنی سے زیادہ ہم سے لو اور یہاں کی حکومت سے دست بردار ہو جاؤ۔

امیر عدن۔ سیدھا سادہ ناتجربہ کار شخص تھا۔ اس نے دایاں بایاں نہ دیکھا اور ترنج اور پانچ پر نظر کی جھٹ ایک معاہدہ لکھ دیا۔ جب انگریزوں نے وفائے معاہدہ کا مطالبہ کیا تب امیر کی آنکھیں کھلیں اور جان سے ہاتھ دھو لیے۔ عدن کو چھوڑنا نہ چاہا۔ پھر تو انگریزوں نے اس سے جنگ کی اور عدن کو زبردستی اس کے قبضے سے نکالا ــــ جس عطیے کا وعدہ کیا تھا وہ بھی نہ ملا ــــ اس زمانے میں کہ میں یہاں آیا ہوا ہوں، اعراب، انگریزوں سے لڑنے کے لیے فراہم ہوئے ہیں، بلکہ میرے آنے سے ایک روز پیشتر مقاتلہ بھی ہو چکا ہے۔

عدن ساحل سمندر سے تین کوس ہے۔ یہ دوری اُن مسافروں کے لیے جو شہر میں جانا چاہتے ہیں "مایۂ آزار خاطر" ہے۔ کیونکہ آنے جانے کا پورا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ دو رات عدن میں قیام کر کے، ۸ رمضان کو واپس ہوئے ــــ ۹ رمضان کو بادبان کھولے گئے۔ ۹ کو چاشت کے وقت باب المندب سے جو ایک خطرناک موقع ہے سلامتی کے ساتھ گزرے ــــ آدھا دن باقی تھا کہ بندرگاہ مخا پر جہاز ٹھہرا ــــ ۱۰ کو مخا گئے۔

یہ شہر کوچہ ہائے تنگ رکھتا ہے، اس کی عمارتیں پختہ اور سفید ہیں۔ سبزیاں یہاں بہت ہیں جتنی کہ موسم گرما کے میوے ــــ اس زمانے میں کہ آغاز تابستان ہے ــــ بکثرت ہیں۔

۲ دو دن قیام رہا اس لیے یہاں کے اہل علم کو نہ دیکھ سکا اور نہ ان کے حالات

لیکن ایک عالم سے جو زبید کے رہنے والے ہیں اور محمد جابی نام ہے ــــ ملاقات

ہوئی۔ یہ مخا کی جامع مسجد میں بخاری شریف کا درس دیتے ہیں، محقق، فقیہ اور صلاح و تقویٰ میں بلند مرتبہ ہیں ــــ اور کیوں نہ ہوں قضا و قدر نے اہل یمن کی قامت زیبا کو جامۂ تقویٰ اور لباس علم سے آراستہ کیا ہے ــــ صنعاء جو کہ اشرف بلاد یمن اور تخت گاہ امیر ہے "محدث خیز" سرزمین ہے۔ آج کل علم حدیث تنہا اس جگہ ہے۔ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ اس فراوانی اور وسعت کے ساتھ کسی دوسری جگہ ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب ــــ وفوق کل ذی علم علیم ــــ قاضی شوکانیؒ جو صنعاء کے قاضی القضاۃ تھے تباؤ کہ بعد از ساعت، فن حدیث میں دور احاطہ و اطلاع کے لحاظ سے آج ان جیسا کون ہے؟ قاضی صاحب فروع میں تقلید ائمہ نہیں کرتے تھے اپنے اجتہاد پر عمل تھا اور یہ بات ان کے ساتھ خاص نہیں ہے اس جگہ کے تمام اہل حدیث اسی روش پر چلتے ہیں۔

ارض یمن اگر اتنے ارباب خیر و صلاح کا مسکن اور اصحاب نجات و فلاح کا مجمع ہے تو تعجب کی کونسی بات ہے؟ خواجۂ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی یمن کے بارے میں فرمایا ہے۔ الایمان یمانٍ والحکمۃ یمانیۃٌ ــــ

۱۱ رمضان کو مخا سے واپسی ہوئی ــــ ۱۳ کو بوقت شام قریب حدیدہ جہاز لنگر انداز ہوا۔ رات کے وقت نزدیک ساحل نہ جا سکے۔ ۱۴ کو بندرگاہ حدیدہ میں جہاز ٹھہرا ــــ ۱۵ رمضان۔ حدیدہ میں جانا ہوا۔ ایک مکان کرایہ پر لیا۔ یہ مکان جامع مسجد کے قریب تھا ــــ حدیدہ کی آبادی کا طرز مخا جیسا ہے۔ لیکن مخا اس سے زیادہ بڑا ہے۔ آجکل مخا، حدیدہ اور ارض یمن کا کچھ اور حصہ محمد علی پادشاہ مصر کے زیر تصرف ہے ــــ محمد علی پادشاہ نے یہاں کی گورنری ابراہیم پادشاہ کے سپرد کر دی ہے ــــ اس جگہ کے مشاہیر فقہا میں شیخ عمر سندھی حنفی اور حسن خطیب شافعی ہیں۔ حسن خطیب سے ملاقات نہ ہو سکی، فقیہ عمر سے مکرر ملاقات کا موقع ملا ــــ یہ روشن روان، نیک روح اور پاکیزہ نفس شخص ہیں۔ ان کا مولد و منشاء دیار سندھ ہے، کسب علم اس علاقہ میں کیا ہے۔ ان کے پاس بڑی تعداد میں "کتب فقیہ" موجود ہیں ــــ

حدیدہ سے دس کوس کے فاصلے پر ایک قریہ ہے مراوہ نام ــــ وہ جناب سید محمد عبدالباری کی رہائش گاہ ہے۔ چونکہ ان کے فضائل کا شہرہ متواتر سامعہ افروز رہا اس لیے

طبیعت آرزو مند ملاقات ہوئی ۔۔۔ ۱۹ رمضان کی شب کو مرادہ کے لیے چل کھڑا ہوا ۔۔۔ صبح کے وقت منزلِ مقصود پر دم لیا۔ سید صاحب موصوف جس اخلاق سے پیش آئے اس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اکرام ضیف ان سے سیکھنا چاہیے ۔۔۔ کہتے ہیں کہ وہ مراتب ولایت میں اہلِ تمکین میں سے ہیں۔ ان کی عمر تخمیناً پینتیس سال ہوگی ۔۔۔ مخلوق کی حاجت برآری کی طرف ان کی بڑی توجہ ہے۔ ان کی مساعی مشکور ہیں، ان کی سفارش مؤثر ہے ان کا رقعہ فرمان سلطان سے زیادہ اثر رکھتا ہے ۔۔۔ سید صاحب کے پانچ بھائی اور ہیں وہ سب کے سب بھی منتخب روزگار ہیں۔ ان حضرات کی فراوانیٔ خُلق کی نظیر ان کے خاندان کے علاوہ اور کہیں نہ ملے گی۔

ع

این خانہ تمام آفتاب است ۔۔۔ این سلسلہ از طلائے ناب است

سید صاحب مذکور اپنی اس مہمان نوازی کی بنا پر جو اہل عرب کا شیوہ ہے نہیں چاہتے تھے کہ میں دو تین دن قیام کیے بغیر چلا جاؤں ۔۔۔ لیکن میں ایک دن رات سے زیادہ مجبوراً نہ ٹھہر سکا ۔۔۔ ۲۰ رمضان کی رات کو بزرگان مرادہ سے رخصت ہو کر صبح کے وقت حدیدہ واپس آیا ۔۔۔ دیارِ یمن گرم علاقہ ہے ۔۔ اس زمانے میں آفتاب برج قوس میں ہے اور ابھی گرمی دور نہیں ہوئی ۔۔۔ بلادِ یمن کے باشندے اکثر و بیشتر شوافع ہیں اور ان کی قرأت ابن کثیر والی قرأت ہے ۔۔۔

اس سرزمین کے مشہور اولیاء میں سے سید احمد مقبولی دریمی ہیں۔ مراتب کشف و شہود میں ان کی شان عظیم ہے۔ اگرچہ ان کے فضائل بمبئی میں سن چکا تھا اور دل ان سے ملاقات کا مشتاق تھا لیکن سید محمد عبد الباری کی بزم کا شوق اتنا غالب آیا کہ محفل سید احمد میں (دریم) نہ پہونچ سکا۔ عرفت ربی بفسخ العزائم ۔۔۔

حدیدہ سے روانگی اور جہاز کا ٹوٹنا

۲۷ رمضان کو جہاز حدیدہ سے چلا ۔۔۔ تین دن کے بعد تیسویں کی شب میں ایک گھڑی رات گزری ہو گی کہ جہاز ناگاہ ایک چٹان سے جو سمندر میں چھپی ہوئی تھی ۔۔۔ ٹکرا گیا ۔۔۔

ٹکر کا لگنا تھا اور جہاز کا ٹوٹنا۔ جہاز کیا ٹوٹا، دل ٹوٹ گئے۔ موت بار بار اپنے رخ سے گوشۂ نقاب الٹ رہی تھی اور زندگی دمبدم اپنے چہرہ پر پردہ ڈال رہی تھی۔ ایک طرف

موجوں کی طغیانی جہاز کو پہاڑی سے ٹکرا رہی تھی، دوسری طرف پانی جہاز کے اندرونی حصے میں رہا تھا اور جگر خون ہو رہا تھا۔ رات، دلِ دشمن کی طرح سیاہ تھی۔ کسی کو خبر نہیں کہ یہ کون سا مقام ہے، اور کیا جگہ ہو۔ سب اس امید میں صبح کے سخت منتظر تھے کہ اکثر پہاڑیاں قریب ساحل ہوا کرتی ہیں اگر ایسا ہوا اور صبح تک جہاز ریزہ ریزہ نہ ہوا، تو ممکن ہے کہ جانیں سلامت رہ جائیں، ورنہ (اس جہاز کے تختوں میں سے کوئی تختہ ہی اگر ساحل پر پہونچے گا تو ہمارا قصہ عزیزانِ وطن سے بیان کرے گا) ؎

قصۂ ما بعزیزانِ وطن خواہد گفت ہر کرا تختہ ازیں ورطہ بساحل برود

میں اس بھیانک رات کی سیاہی اور درازی کا کیا حال بیان کروں ؎

شبِ تاریک و بیم موج و گردابے چنیں ہائل کجا دانند حالِ ما سبک ساران ساحلہا

اسی امید و بیم کی کشمکش میں رات گزری اور روئے سحر نمودار ہوا۔ لوگوں نے دائیں بائیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر ساحل نظر نہ آیا۔ آنکھیں خیرہ ہو گئیں تو یہ بات کھلی کہ ساحل کا نام و نشان نہیں ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ــــ جب سورج چمکا تو اتنا ہوا کہ ایک چھوٹا سا جزیرہ دکھائی دیا۔ ٹوٹے ہوئے دلوں کو کچھ ڈھارس ہوئی۔ فوراً چھوٹی کشتی جہاز میں سے لے کر سمندر میں ڈال دی اور اس پر بیٹھ گئے۔ (ٹوٹے ہوئے جہاز کو وہیں چھوڑا) مگر موجوں کے تھپیڑوں سے کشتی اخروٹ کی طرح غلطاں تھی اور یہ حال تھا کہ جیسے ایک پتا آندھی میں اڑا اڑا پھرے۔ کبھی کشتی بر روئے آب چلتی تھی اور کبھی پانی بر روئے کشتی ــــ تمام کشتی نشیں سر سے پاؤں تک اور آستین سے دامن تک پانی سے بھیگ گئے۔ لیکن اس حال سے کیا خوف ہوتا۔ ع

انا الغریق فما خوفی من البلل (میں تو ڈوب رہا ہوں مجھے تری کا کیا خوف)

بہزار دقت کسی نہ کسی طرح اس جزیرہ تک پہونچنا ہوا ــــ وہ جزیرہ ایسا تھا کہ "چشمِ حاسد" اس سے کہیں زیادہ فراخ تر ہوتی ہے۔ اور "دلِ لئیم" اس سے زیادہ کشادہ ہوتا ہو۔ باوجود اس کے کہ وہاں نہ کوئی درخت ایسا موجود کہ اس کے سائے میں بیٹھ سکیں اور اس کا پھل کھالیں، اور نہ وہاں پانی کا وجود نہ دانے کا، نہ کوئی راستہ کہ وہاں سے گزر جائیں، نہ کوئی ساحل کہ وہاں تک پہونچ جائیں

—— جزیرہ کا یہ حال اور کشتی کا وہ حال جو بیان کیا گیا، اب کیا کیا جائے؟ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ جزیرے میں اُتر جائیں اور "اجلِ مقدر" تک یہیں بسر کریں ۔

شکستہ جہاز سے اُترتے وقت جو سامان پانی سے محفوظ اور اوپر تھا اس کو سمندر میں ڈال دیا گیا تھا۔ کیونکہ اس کے لے جانے کی بظاہر یہی ایک تدبیر تھی، جو سامان ہمارے پاس باقی رہنا مقدر تھا وہ بحکم خالقِ بحر و بر، ہم کو مل گیا اور جو جانا تھا وہ چلا گیا۔ خدا کا شکر ہو کہ بہت سا سامان ہاتھ لگا اور کم ضائع ہوا۔ مگر اُس وقت نہ مال جانے کا غم تھا اور نہ مل جانے کی خوشی تھی ۔ آبِ شیریں کے بڑے بڑے ڈرام بھی سمندر میں ڈال دیے گئے تھے ۔ ان ڈراموں میں جن کو جانا تھا چلے گئے اور جن کو رہنا تھا رہ گئے، اسی طرح اجناس خوردنی میں جتنا حصہ نکالا جا سکا نکال لیا۔ ان اجناس میں اکثر چاول اور باجرہ تھا جس کو اہلِ جہاز نے تجارت کے لیے لاد رکھا تھا۔ طوفان کے فرو ہو جانے کے بعد (جزیرے میں) مشورہ ہوا کہ کیا کرنا چاہیے۔ جو گفتگو درمیان میں آئی یہ تھی کہ آب و دانہ یہاں موجود نہیں، آٹھ ڈرام پانی کے ہیں اور آدمی دو سَو سے زائد ہیں۔ ظاہر ہو کہ اتنا قلیل پانی چند روزہ کا سرمایہ ہے، جب تک کسی دوسرے مقام کا پتہ نہ چلے کشتی کا چلنا معلوم —— راہ خیر مسدود ہے، پھر کیا کرنا چاہیے؟ سب نے بیک زبان کہا کہ کام ہاتھ سے نکل چکا ہے اور پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے سوائے اس کے کوئی تدبیر نہیں کہ اس چھوٹی کشتی میں ہم میں سے چند آدمی جان پر کھیل کر بیٹھ جائیں پھر دیکھیں پردۂ غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے۔ اگرچہ خیال نہیں ہے کہ ایسی معمولی کشتی ایسے سمندر سے سلامت گزر جائے گی، مگر مجبوری ہے —— اگر سمندر میں پانی کا خوف ہے تو جزیرے میں آتش تشنگی کا ڈر ہے۔ بالآخر بحکم الغریق یتشبث بکل حشیش (ڈوبتے کو تنکے کا سہارا) اس معمولی کشتی میں کہ تنکے سے زیادہ نہ تھی، نَو دس آدمی جن کے امیر مولانا فضل علی تھے چند کشتی بانوں کی ہمراہی میں روانہ ہوئے۔ ان نَو اشخاص میں ایک مولوی برہان الدین صاحب بھی تھے۔ مولوی برہان الدین سے یمن میں ملاقات ہو گئی تھی ۔ پنجابی ہیں ۔ فطرتِ سلیم اور فکرِ مستقیم رکھتے ہیں ۔ دو حج اس سے پہلے کر چکے ہیں ۔ اس سال اشرف البلاد میں سکونت کے ارادے سے ہجرت کر کے جا رہے ہیں۔
الغرض اس مصیبت عظمیٰ کے چار دن بعد ان لوگوں کو ۱۳ شوال کو توکلاً علی اللہ اس کشتی میں بٹھا دیا اور بقیہ افراد رحمتِ الٰہی کے منتظر ہو کر وہیں بیٹھے رہے —— ہر صبح کو جب بیدار

ہوتے سمندر کی طرف نگاہ کرتے تھے اور ہر رات کو جب سوتے سفینے کا تذکرہ کر کے سوتے تھے ــــ

دو کشتیوں کا آنا اس کشتی کی روانگی کو بارہ دن اور جہاز کے ٹوٹنے کو سولہ دن گزر گئے تھے کہ شام کے وقت دو چھوٹی کشتیاں نمودار ہوئیں۔ گویا شبِ سیاہ کی سحر ظاہر ہوئی ــــ سمندر میں کشتی، فلک پر ہلالِ عید کی طرح دل آویز معلوم ہوتی تھی ــــ ہم نے سمجھا کہ جانے والے ساحل کا پتہ معلوم کر کے واپس آ گئے لیکن جب ملاح اترے تو ہم نے دیکھا کہ ہمارے جانے والے آدمیوں میں سے ایک بھی نہیں ہو بڑا تعجب ہوا۔ پوچھ گچھ کرنے پر ان لوگوں نے یہ داستان سنائی کہ تمھارے فرستادہ آدمی سات دن کے بعد قنفذہ (جو ساحل سمندر پر ایک چھوٹی سی بستی ہے) پہونچ گئے تھے اور وہاں کے حاکم سے اپنا ماجرا بیان کر دیا تھا۔ اس حاکم کے حکم سے سات چھوٹی کشتیاں تمھاری طرف کو رہ پیما ہوئیں۔ چند شبانہ روز سمندر کے اندر وہ اس جزیرہ کی تلاش میں رہیں۔ جب کوئی سراغ نہ ملا تو پانچ کشتیوں کو ملاحوں نے بسمت قنفذہ واپس پلٹا دیا۔ مولانا فضل علی اور دیگر ساتھیوں نے ان کو ہر چند واپس ہونے سے منع کیا۔ لیکن ان پر کچھ اثر نہ ہوا ــــ ہم دو کشتیوں کو لے کر ہمت کر کے بحر عجم کی طرف سرگرم تلاش ہوئے ــــ اللہ کا شکر ہے کہ ہماری سعی، مشکور ہوئی اور گوہر مراد حاصل ہوا ــــ

اب دو چھوٹی کشتیوں میں جمِ غفیر کا بیٹھنا دشوار تھا۔ مجبوراً ایک کشتی کو تین روز بعد اور دوسری کو چھ روز بعد جس قدر آدمی بھٹائے جا سکے بٹھا کر روانہ کر دیا۔ اور خود اللہ پر بھروسہ کر کے اس شورش کدے میں ہی ٹھہرا رہا ــــ لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا۔

دو اور کشتیوں کا آنا چونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اپنے بندوں پر زائد از وصف ہے۔ بنا بریں جہاز ٹوٹنے کے پچیس دن بعد دو اور کشتیاں آتی دکھائی دیں جب کنارے پر پہونچیں تو پھر "نوا ہائے نا آشنا" اور "شمائلہائے بیگانہ" سے سابقہ پڑا۔ (اپنا کوئی آدمی نہ تھا) جب ان سے تحقیقات کی گئی تو انھوں نے بتایا کہ وہ پانچ کشتیاں جو بھٹک گئی تھیں اور جنھوں نے راہِ قنفذہ اختیار کر لی تھی جب وہ قنفذہ پہونچیں تو ان کو پھر واپس ہونا پڑا۔ کیونکہ امیر قنفذہ ان کے واپس آنے سے سخت برہم ہوا اور اس کا غصہ اس وقت تک ٹھنڈا نہ ہوا جب تک وہ کشتیاں وہاں سے چل نہ دیں، اس امیر نے ایک کشتی کا اور اضافہ کیا۔ چند دن تو سب کشتیاں ساتھ ساتھ چلیں پھر

تلاطم امواج اور جوشش باد سے ہم جدا ہو گئے۔ اب ہم تو اتفاق سے ساحل مقصود (وطن تک) پہونچ گئے۔

۵ آوارہ گیست رہبر، در وادیٔ محبت طوفاں بود معلم، دریائے بیکراں را

دوسری کشتیوں کے معاملے سے ہم لوگ بے خبر ہیں کہ ابھی ٹاپک ٹوئیاں مار رہی ہیں یا اپنے وطن کی طرف پھر لوٹ گئیں۔

ان دو کشتیوں کے آنے پر ہم نے عزم بالجزم کر لیا کہ اس دفعہ بہر طور جملہ بقیہ افراد کو سوار کر ہی لیں گے زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ سامان و اسباب میں سے جو نہ لادا جا سکے گا اس کو چھوڑ دیں گے۔ یہ خیال مصمم ہو کر عزم روانگی ہو گیا۔ ساتھ ہی ساتھ طوفان باد، جوش باراں اور اضطراب امواج کا پھر ظہور ہوا۔ چھوٹی کشتیوں کی کیا مجال کہ اس طوفانی کیفیت میں اپنی حد سے آگے قدم رکھ سکیں۔ اسی وجہ سے دس روز اور توقف کیا جب ابر و باد کا ہنگامہ موقوف ہوا تو ۵ ر ذی قعدہ کو بوقت عصر اس خرابے (جزیرے) کو خیر باد کہہ کر کشتی میں سوار ہو گئے۔ اور لیث کی جانب رُخ کیا۔ اس ویران جزیرے میں ایک ماہ پانچ روز اقامت ہوئی تھی۔ چونکہ بحر عجم اندازے سے زیادہ امواج رکھتا ہے۔ اس لیے ہلاکت کا خوف غالب تھا، لیکن جب حفاظت ایزدی شامل حال ہوتی ہے تو آب و آتش گزند نہیں پہونچا سکتے۔ ۸ ر ذی قعدہ کو نصف النہار کے وقت ساحل لیث پر پہونچ گئے۔ الحمد للہ علیٰ ذٰلک حمداً کثیراً۔

قدرت الٰہی اس سے پہلے کہ آگے کوئی اور بات بیان کروں پینے کے پانی کا حال بیان کرتا ہوں کہ اس تنگی کے باوجود اتنے زمانۂ دراز تک اتنے آدمیوں کے لیے کیونکر کافی ہوا۔ اس کو سُن کر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا منظر آئے گی۔ سُنو۔ ایک پیالہ صبح کو اور ایک شام کو ساغر مہر و ماہ کی طرح ہر شخص کو ملتا تھا۔ اس کفایت شعاری اور احتیاط کے باوجود یہ امید قطعی نہ تھی کہ پندرہ بیس روز تک بھی پانی موجود رہ سکے گا۔ ہجوم تشنگان صاحب تقسیم کے گرداگرد اس طرح جمع رہتا جیسا کہ "انبوہ بادہ خواران" ساقی کے اردگرد ہوتا ہے۔ ان دو پیالوں سے جو روزانہ ملتے تھے پیاس کیا بجھتی اور روٹی پکانے کے لیے کیا تدبیر ہوتی؟ لاچار آب شور سے "پخت طعام" کا کام نکالا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت دیکھو کہ ایک بادل آیا۔ بارش ہوئی ہم نے جزیرے میں گڑھے کھود لیے اور برتن رکھ دیے تھے اس طرح تھوڑا سا پانی فراہم ہوا اور

دو تین دن سامانِ خورد و نوش حسبِ دلخواہ ہو گیا۔ اس کے بعد احقر کے دل میں گزرا کہ اگر آب سمندر کو کشید کر لیا جائے تو ممکن ہے پینے کے قابل ہو جائے، چنانچہ ایسا کیا گیا تو واقعی کھاری پانی بہت لذیذ ہو گیا۔

افضالِ الٰہی طولِ سخن کوتاہ ——— اس زمانے میں جبکہ بظاہر سختی کی صورت تھی مگر پنہاں کتنے کچھ عطیہ ہائے گرانمایہ تھے جو عنایت فرمائے گئے، اگر ان سب عطیات کو بیان کروں تو ریا و سمعہ کی تہمت سے ڈرتا ہوں اور سب کو چھوڑ دوں تو کفرانِ نعمت کی سزا سے ہراساں ہوں میں نے اپنے خداوند کی نعمتیں دیکھی ہیں۔ میں آیۂ واما بنعمۃ ربک فحدث ـــ کو سن کر خاموش کیسے رہ سکتا ہوں۔ لامحالہ بیان کروں گا۔ آئینِ صحابہ کی موافقت میرا شیوہ ہے ـــ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی اقتدا میں (تحدیثِ نعمت کے سلسلے میں) زمزمہ سنجی کرتا ہوں ـــ اللہ تعالیٰ مجھے آفتِ ریا سے محفوظ رکھے ——— اللہ تعالیٰ کا سب سے پہلا انعام یہ تھا کہ دل، صابر، زبان سپاس گزار اور لب سرگرم ثنا عطا فرمائے، اول سے آخر تک بے صبری "سراپردۂ ضمیر" کے گرد نہیں بھٹکی۔ بیقراری کو جیسے گمنامی میں رہی۔ یہ درحقیقت اُس لطیف جل شانہ کا لطف ہی تھا۔ جب اس کا لطف کارفرما ہوتا ہے تو ذرہ "خورشیدی" اور قطرہ "دریائی" کرتا ہے۔ دوسرا انعام یہ ہے کہ اس وادیٔ بے آب و دانہ (جزیرے) میں حیرت انگیز طریقے پر آب و دانہ عنایت فرمایا، پھر اس مہلک جگہ سے آسان طریقے پر نکال بھی دیا ——— تیسرا انعام یہ ہے کہ کسی ایک کو بھی کوئی گزند نہیں پہونچا ——— جس کسی کو اس قسم کے مصائب سے واسطہ پڑا ہو وہ جانتا ہے کہ ایسے حالات میں یہ بات بہت ہی نادر ہے ——— اسباب میں سے بھی بہت ہی تھوڑا اور تو میں سے ایک گیا (باقی بچ گیا) اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار کرنا طاقتِ انسانی سے بالاتر ہے ———

۹ ذی قعدہ ——— لیث میں داخل ہوئے، یہ ایک چھوٹا سا قریہ ہے ——— شب چہاردہم ذی قعدہ ——— لیث سے براہِ صحرا مکہ معظمہ زادہا اللہ شرفاً و تعظیماً ـــ کا عزم کیا۔ رات کو سوار ہوئے اور صبح کو حضرات میں اُترے۔ حضرات میں ایک کنواں ہے، اس کا پانی عمدہ ہے ـــ دیارِ عرب میں بعد و قربِ مراحل کا اعتبار، وقت سے ہوتا ہے نہ کہ میل و فرسخ سے۔ اور سیر و سفر رات کے وقت ہوتا ہے ———

۱۴ ذی قعدہ ــــ قبل از غروب چلے اور کوہ پیش از ستارۂ سحری، سعدیہ پہونچے ــــ اور شرائط احرام ادا کرنے کے بعد نماز مغرب سے پیشتر گرم رفتار ہو گئے۔

۱۷ ذی قعدہ ــــ وادیٔ مقدس بطحیٰ میں نزول ہوا ــــ الحمد للہ ثم الحمد للہ ــــ جمال کعبہ نے تمام غموں کو دل سے دور کر دیا ــــ ہونٹ، تقبیل حجر اسود کے باعث فخر مند ہوئے۔ ہاتھ استلام رکن کے سبب منور ہوئے، پیشانی عتبۂ عالیہ پر گھسنے کی وجہ سے نورانی ہوئی، چادر دوش ملتزم کے التزام سے غالیہ فشاں ہو گئی۔ شرب زمزم، بشارت شراب طہور لایا، طواف بیت العتیق نے مژدۂ عتق من النار سنایا ــــ پردہ ہائے کعبہ کو ہاتھوں سے تھام کر گویا دامن امید کو تھام لیا ــــ پاؤں سعی بین الصفا والمروہ کی برکت سے "کوہ آتش" سے اتر نے چڑھنے سے محفوظ ہو گئے ــــ

چونکہ میں نے احرام تمتع باندھا تھا اس لیے پہلے دن احرام سے نکل آیا ــــ

اس خیر البلاد (مکۂ معظمہ) میں مجھ مسافر کا قیام مدرسہ شریف محمد میں جو کہ حرم محترم سے ملحق اور باب العمرہ کی جانب ہے ــــ ہوا، شریف محمد اس بلد امین کے اعیان واکابر میں سے ہیں۔

بچھڑے ہوئے ساتھی بھی مل گئے

دعا گو کے مکۂ معظمہ آنے سے چھ دن بعد مولانا فضل علی ان لوگوں کے ساتھ جو جزیرے سے پہلی کشتی میں بیٹھ کر ہم لوگوں سے جدا ہوئے تھے۔ مکۂ معظمہ پہونچے، ان کے سلامتی کے ساتھ آجانے سے ہنگامۂ مسرت تازہ ہو گیا، چہرہ نشاط سے جگمگا گیا اور شکر باری تعالیٰ کا ایک اور بڑا موقع از سرِ نو حاصل ہوا ــــ

ان حضرات کی سرگذشت

اب ان لوگوں کی بقیہ سرگزشت جو ان سے سنی ہے، بیان کی جاتی ہے ــــ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، اوائل شوال میں پہلی کشتی جزیرے سے روانہ ہوئی تھی آب وطعام جو بقدر سہ روز ان لوگوں کے حوالے کر دیا گیا تھا وہ تین ہی دن میں ختم ہو گیا ــــ بعدہٗ طاقتیں طاق ہوں اور ناتوانیاں غالب ہو گئیں، ضعف وخستگی نے غلبہ پا لیا ــــ ناگاہ چھٹے دن ایک بڑی کشتی جس کو تغلہ کہتے ہیں ان کے پاس سے ہو کر گزری ــــ اصحاب تغلہ کو ایک چھوٹی سی کشتی پہلی مرتبہ اس محیط بے ساحل میں دیکھ کر حیرت ہوئی اور کشتی نشینوں کی شوریدہ حالی، ان کے تعجب کا سبب بنی۔ اصحاب تغلہ نے معلوم کیا کہ آپ لوگوں کا یہاں کیسے آنا ہوا؟

جب دیکھا کہ ان بیچاروں میں جواب کی بھی طاقت نہیں ہو تو ان کی بے طاقتی پر رحم کھا کر اپنی کشتی پر بٹھا لیا اور چھوٹی کشتی کو اس بڑی کشتی کے پیچھے باندھ کر روانہ ہوئے۔ جو نان و نمک ان بڑی کشتی والوں کے پاس تھا وہ پیش کر دیا، شانِ رزاقی دیکھو کہ کہاں اور کس طرح "دم آب" اور "لب نان" عنایت فرمایا گیا ــــــ جو ذات کیڑے کو پتھر کے اندر برگ سبز دیتی ہو اور "مگس پراں" کو "عنکبوتِ بے بال و پر" کے لیے روزی بناتی ہے، اس کی نیرنگیٔ قدرت سے یہ کیا بعید اور محل تعجب ہو۔

القصہ ــــــ ایک دن کے بعد بخیلہ ساحلِ قنفذہ پر پہونچا اور ٹھہر گیا ــــــ اس گے آگے ان لوگوں کا پیشِ امیر جانا۔ اور اُس کی مدد سے کشتیوں کے ساتھ لوٹنا، جزیرے کا سراغ نہ پانا، دو کشتیوں کا جدا ہونا اور باقی کا قنفذہ واپس جانا، امیر کا ملاحوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر پھر لوٹا دینا اور ایک سفینے کا بڑھا دینا اور دو کشتیوں کا جدا ہونا اور جزیرے میں پہونچنا، ان باتوں کا بیان تفصیل سے کیا جا چکا ہے ــــــ اب رودادِ نا شنودہ کو سنو ــــــ

وہ کشتیاں جو قنفذہ سے دوبارہ چل کر بھٹک گئی تھیں ان میں سے دو کشتیوں کو ایک جہاز دور سے آتا دکھائی دیا۔ اس کے نزدیک پہونچ کر اپنا حال بیان کیا۔ ناخدا اس "دردآلود" افسانے کو سن کر مہربان ہو گیا اور چند آدمیوں کو اپنے جہاز میں بٹھا کر تین روز ان کی نشاندہی کے مطابق جستجوئے جزیرہ میں چپ و راست دوڑ دھوپ کی۔ آخر کار مایوس ہو کر اہلِ جہاز نے ان کشتی نشینوں سے معذرت کی اور اپنا راستہ لیا۔ اس پریشان حالی میں اس جماعت کے دماغ میں یہ بات آئی کہ جزائر بحرِ عرب میں سے چھوٹا بڑا کوئی جزیرہ ایسا نہیں جہاں ہم نہ پہونچے ہوں۔ بہت ممکن ہو کہ جزیرۂ مطلوبہ بحرِ عجم میں واقع ہو۔ اس تمام بیجا خرامی اور بے راہ روی کے بعد یہ ایک خیالِ درست ان کے دل میں جاگزیں ہو گیا۔

؎ تمامی عمر ضائع کرد فرہاد ہمیں یک تیشۂ آخر بجا زد

اس کے بعد "قرار دادِ مصلحت" یہ ہوئی کہ سب سے پہلے بخطِ مستقیم ساحلِ بحرِ عجم پر چلیں اور وہاں سے تجربہ کار ملاحوں کو جو بحرِ عجم سے واقفیت رکھتے ہوں ــــ اپنے ساتھ لے لیں، پھر جستجو کریں، چنانچہ بندرگاہِ سواکن (ملکِ حبشہ) کے ساحل پر لنگر انداز ہوئے اور وہاں کے حاکم سے تمام قصہ بیان کیا۔ نوعیتِ واقعہ نے حاکم کو متاثر کیا۔ اس نے بہت کچھ دلچسپی کی، آئینِ میزبانی بجا لایا، اور

ایک بڑی کشتی کو واقف کار "ملاح" کی سرکردگی میں ان کے ہمراہ روانہ کر دیا۔ ملاح اپنے صحیح اندازے سے ایک دن کے بعد اس جزیرے پر پہونچ گیا، جب اس جزیرے کو ہم لوگوں نے خالی پایا (کیونکہ ہم اس جزیرے سے روانہ ہو چکے تھے) تو اگرچہ وہم نے چند خیال تراشے بھی لیکن ظن غالب یہی ہوا کہ ایزد جہاں آفریں نے کسی طریقے سے واماندگان کو اس ہلکہ سے نجات دے دی ہو چنانچہ انھوں نے حزم لیث کیا۔ لیث پہونچ کر ہم سب لوگوں کے سلامتی کے ساتھ آنے کی بشارت سنی۔ حمد خدا کرتے ہوئے وہ بھی مکہ معظمہ پہونچ گئے۔ (اور ہم سے ملاقات کی)

ذکر اُم القریٰ مکہ معظمہ بڑا شہر ہے۔ رونق شایاں اور آبادی فراواں رکھتا ہے۔ یہاں سب سے اچھا اور سب سے وسیع بازار صفاد مروہ کا بازار ہے۔ ہر شہر و دیار کا کپڑا اور سامان یہاں پایا جاتا ہے۔ سبحان اللہ باوجودیکہ کوئی چیز یہاں پیدا نہیں ہوتی مگر کوئی چیز ایسی نہیں کہ یہاں ناپید ہو۔ اور یہ بات دعائے سیدنا ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا نتیجہ ہے۔ قرآن میں دعائے ابراہیمی کے یہ الفاظ ہیں۔ وارزُق اَھلَہٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ ـــــ ہند و سندھ، عجم، بخارا، کابل، کشمیر، روم وحبش، غرض ہر ملک کے باشندے یہاں موجود ہیں۔ خصوصاً اہل جاوہ اور ترک بہت ہیں۔ ارباب بصر بھی کثرت سے ہیں۔ یہ تو ان لوگوں کا ذکر ہے جو علی السبیل الدوام یہاں سکونت رکھتے ہیں ــــ لیکن موسم حج میں جمع ہونے والوں کی کثرت کا احاطہ سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں کر سکتا اور اُن کے اصناف و اقسام بھی شمار میں نہیں آسکتیں، ہر ایک کی رسم جدا، طرز جدا، لباس جدا، زبان جدا ــــ

مسالک اس اشرف البلاد (مکہ) کے ساکنین زیادہ تر احناف ہیں۔ پھر شوافع، پھر مالکیہ، اور حنبلیوں کی تعداد کلھم تین ہے ــــ

ائمہ و خطبائے مسجد الحرام اُن خطباء اور ائمہ کی تعداد جو مسجد الحرام میں مقرر ہیں ــــ پچاس سے متجاوز ہے ــــ تیس حنفیہ میں سے، ایک حنابلہ میں سے اور باقی شافعیہ و مالکیہ میں سے ــــ قرأت و تجوید ائمہ بڑی خوبی و لطافت والی ہے، فجر کی نماز کے علاوہ باقی تمام اوقات میں، حنفی امام سب سے پہلے جماعت پڑھاتا ہے۔ اس کے بعد شافعی امام، اس کے بعد مالکی ــــ حنبلی امام، صبح کی نماز کے علاوہ کوئی نماز جداگانہ نہیں پڑھاتا ــــ صبح کے وقت اول شافعی امام نماز پڑھاتا ہے۔

اس لیے کہ شافعیہ کے نزدیک غلس (اندھیرے) میں نماز ادا کرنا مستحب ہے۔ اس کے بعد مالکی، اُس کے بعد حنبلی، اور سب سے آخر میں حنفی ــــ اس لیے کہ حنفیہ کے یہاں اسفار (روشنی) میں استحباب ہے ــــ

رواجِ علوم

تفسیر حدیث اور فقہ کا جتنا علم ضروری ہے۔ یہاں رائج ہے۔ فلسفہ و ریاضی کا رواج نہیں ہے ــــ ولا حاجۃ الیہ ــــ فن ادب کی طرف باوجودیکہ التفاتِ طبائع کمتر ہے، لیکن ایسے ایسے ادیب یہاں کے ایوانِ فضل و کمال میں جلوہ گر ہیں جو حریری پر اعتراض اور جریر پر نکتہ چینی کر سکیں ــــ

شیخ عبداللہ سراج

تمام علماء مکہ میں اشہر، اعلم، اسبق اور اقدم شیخ عبداللہ سراج ہیں ــــ بلا تکلف ان کو "سراج انجمن علم و دانش" کہا جا سکتا ہے ــــ فنونِ نقلیہ میں اتنا "سرمایۂ آگہی" رکھتے ہیں کہ آج ان کی ٹکر کا کوئی نہیں ــــ فنونِ دانشمندی میں بھی ان کی بڑی اچھی استعداد ہے ــــ ان کی جودت اور ذکاوت مسلّم ہے۔ ان کی صحبت مؤثر اور ان کی تقریر دلکشا ہے ــــ ان فضائل کے ساتھ ساتھ دلکش اخلاق بھی ان کو منجانب اللہ عطا فرمائے گئے ہیں ــــ اُن کی طبیعت میں شگفتگی ہے ــــ مخلوق کے کار برآری" کی کشائش بھی اُن کا نصب العین ہے ــــ حکام میں ان کی بڑی عزت ہے اور یہ بات بھی آسائش مردم کا سبب بن گئی ہے۔ ان کا طریقہ حنفی ہے۔ تعطیلات کے علاوہ صبح و شام درس دیتے ہیں۔ صبح کو دارالندوہ کے پیچھے کہ آج کل مصلائے حنفی اس کا نام ہے۔ درس حدیث دیتے ہیں، اور شام کو مصلائے حنبلی کے پہلو میں بیت الحرام کے بالمقابل، بین الرکن والمقام، درس تفسیر دیتے ہیں۔ احقر کو اُن سے ملاقات کا بہت موقع ملا ــــ بزمِ درس میں بھی اور اس کے علاوہ بھی ــــ کبھی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، کبھی وہ میری قیام گاہ پر تکلیف فرماتے تھے، مختصر یہ کہ جب تک میں مکہ معظمہ میں رہا فیوضِ فراوان ان سے حاصل کیے ــــ تیمّناً اوائل صحاح بھی ان کو سنائے ــــ

ایک واقعہ ایک دن شیخ موصوف دیگر بزرگوں کے ساتھ فقیر کی قیام گاہ پر رونق افروز محفل تھے، بڑی اچھی مجلس تھی، ہر باب میں گفتگو ہو رہی تھی کہ درمیان میں ایک ہندوستانی نے یہ سوال کر لیا کہ کوئی شخص نذر کرے اور ثوابِ نذر کسی بزرگ کی روح کو بخشے اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ پہلی مرتبہ تو شیخ نے فرمایا "ما ادری" (میں نہیں جانتا) پھر فرمایا ـــــ هذا تلبیسٌ والتلبیس من ابلیس ـــــ (نذر اس طرح کرنا تلبیس ہے، اور تلبیس ابلیس کا کام ہے) ـــــ سبحان اللہ باوجود کمالِ علم سوال کے جواب میں پہلے "ما ادری" فرمایا ـــــ ہم اور تم تھوڑا سا علم رکھتے ہیں اور پھر بھی ما ادری کہنے کی جرأت نہیں کرتے ـــــ "پاکیزہ گوہرانِ عرب" تصنع اور تکلف سے کس قدر دور اور جام وما انا من المتکلفین سے کتنے سیراب ہیں۔ ایک مرتبہ بزرگوں کی ارواح سے استمداد و استعانت کے بارے میں کسی نے سوال کیا تو یہ مختصر جواب دیا ـــــ ما ورد فی السنۃ (سنت سے ثابت نہیں) ـــــ

دیگر علماءِ مکہ شافعیہ میں شیخ عثمان دمیاطی امام فن ہیں، لیکن اس زمانے میں ان کا درس موقوف ہے ـــــ

شیخ احمد بھی فضلائے نامدار میں ہیں، ان کا اصلی وطن دمیاط ہے جو توابع مصر میں سے ہے ـــــ شیخ احمد اب مجاور بلد الحرام ہیں۔ صبح و شام درس دیتے ہیں۔ صبح کو فقہ شافعی پڑھاتے ہیں اور مغرب و عشار کے درمیان تفسیر جلالین کا درس دیتے ہیں۔ صرف و نحو میں شانِ بلند اور تفسیر و فقہ میں دستگاہِ کامل رکھتے ہیں۔ جس قدر فنون ان کے پاس ہیں نہایت سرگرمی سے ان کو دوسروں تک پہونچاتے ہیں۔

فضلائے مالکیہ میں سب سے افضل، شیخ محمد المرزوقی ہیں۔ یہ نابینا ہیں۔ ان کے بھائی شیخ احمد مفتی مذہب مالکی ہیں اور فقہ کے بڑے ماہر ہیں ـــــ دونوں بھائی درسِ حدیث و فقہ صبح و شام دیتے ہیں۔

مفتی حنفیہ، سید عبداللہ میر غنی اہلِ ورع و تقویٰ میں سے ہیں، اُن کو جزئیات

نفقہ خوب مستحضر ہیں۔ ان کے بھائی سید عثمان اُن سے زیادہ متقی ہیں، وہ ایک مرد باصفا ہیں، تصوف سے بہرہ مند ہیں، راقم نے ان دونوں بزرگوں سے بھی فیض حاصل کیا۔

مفتیٔ شوافع، شیخ محمد عمر الرئیس ہیں، ان سے ملاقات نہ ہو سکی ـــــ حنابلہ میں ایک ہی فقیہ و امام ہیں جن کا نام شیخ محمد ہے ـــــ معمر بزرگ ہیں ـــــ اس اشرف البلاد میں کثرت سے اہلِ علم و دانش ہیں ـــ بہت سوں سے ہیں. واقف نہ ہو سکا، اور کچھ سے واقف ہوا ـــــ اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان میں سے بھی اکثر کا ذکر نہیں کیا ہے، صرف ان حضرات کے نام لیے ہیں جو مشہور و معروف ہیں ـــــ

صوفیا طائفۂ صوفیا میں سب سے بڑے سید محمد سنوسی مالکی ہیں، انھوں نے خرقۂ خلافت سید احمد بن ادریس سے حاصل کیا ہے، یہ سالک گرم رو اور عارف بلند سیر ہیں ـــــ مقاماتِ جلیلہ اور حالاتِ سنیہ رکھتے ہیں۔ ان کی صحبت مؤثر ہے۔ اس سال قافلۂ شام کے ساتھ بسوئے قدس گئے ہیں ـــــ ان کے علاوہ شیخ محمد جان ہیں جو قطبِ وقت شاہ غلام علی قدس سرہٗ کے خلفاء میں سے ہیں، بڑے مشغول اور صاحبِ صدق و صفا بزرگ ہیں۔ انھوں نے جو مہربانیاں اس حقیر پر فرمائیں کوئی کسی پر کم کرتا ہے ـــ ایک بزرگ سید محمد ہیں جو اہلِ بخارا میں سے ہیں، ان کا طریقہ نقشبندیہ ہے۔ نعیم دنیا سے روگرداں ہیں۔ ایک پارۂ نان پر قناعت کر کے "معتکفِ حریم حُرمت" ہیں ان بزرگ نے بھی احقر پر وہ کرم فرمایا کہ میں اُن کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا ـــ گرمیٔ التفات دیکھو کہ اگر میں اُن کی خدمت میں نہ جاؤں تو وہ خود تشریف لے آتے تھے ؎

جذبۂ عشق بحدیست میان من و یار
کہ اگر من نروم او بطلب می آید

جناب عبداللہ آفندی، خلیفۂ مولانا خالد کردیؒ (جو خلفائے حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ میں سے تھے) بھی مبارک بزرگ ہیں۔

حکومت امورِ حجاز کا نظم و نسق آج کل احمد پاشا کے ہاتھ میں ہے، یہ محمد علی شاہِ مصر کے بھانجے ہیں ـــــ اس سال فرمانروائے روم سلطان محمود خاں کا انتقال ہو گیا، اُن کے صاحبزادے سلطان عبد المجید خاں تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہو گئے ہیں۔

مکہ میں شاہوں کی حاضری علی شاہ فرزند فتح علی شاہ، بادشاہِ ایران نے چند ماہ ایران کی مسندِ شاہی پر بیٹھ کر حکومت کی، بعدہٗ اس کا بھتیجا محمد شاہ ابنِ عباس مرزا ابن فتح علی شاہ (جو آج کل سلطانِ ایران ہے) اپنے چچا سے نبرد آزما ہوا، بالآخر بھتیجا اورنگِ سلطنت پر قابض ہو گیا علی شاہ شکست کھا کر قسطنطنیہ چلا گیا، اور "حلقۂ درِ سلطان" کو محکم پکڑا ـــــ اس سال سلطانِ روم سے اجازت لیکر وہ حج کے لئے آیا ہے، نیز بادشاہِ تکروری[1] (حبشہ کی ایک قوم ہے) بھی موسمِ حج میں آکر "بہرہ اندوزِ سعادتِ دو جہانی" ہوا۔

دیگر کوائف حسبِ عادتِ قدیم، شامی، مصری اور مغربی قافلے یہاں پہنچے، سب سے بڑا قافلہ قافلۂ شام ہے کہ دس ہزار اونٹوں اور تین ہزار گھوڑوں اور خچروں پر مشتمل ہے۔

یہاں کنیزوں کی بیع و شری بکثرت ہوتی ہے ـــــ چیزوں کا نیلام یہاں ہر روز ہوتا ہے ـــــ یہاں سردی کم ہوتی ہے، زماناً بھی اور کیفاً بھی ـــــ لیکن وفورِ ہنگامۂ گرما جیسا سُنا تھا ویسا نہ تھا، (بظاہر) گرمیِ حجاز، ہندوستان کی گرمی سے زیادہ نہیں ہے، لیکن گرمی کی مدت زیادہ ہوتی ہے۔

احرامِ حج ۸ ذی الحجہ کو بروز ترویہ، احرامِ حج باندھا، اور منا میں گیا، اور وہاں رات گذاری ـــــ سنت یہ ہے کہ پانچ نمازیں جن میں سے پہلی ظہر یوم ترویہ ہو اور آخری فجر یوم عرفہ ہو منا میں پڑھی جائیں، اور سورج نکلنے پر عزمِ عرفات کریں، لیکن اس زمانے میں یہ سنّت، مہجور ہو گئی ہے ـــــ آٹھویں تاریخ منا میں نہ گذاکر براہِ راست عرفات چلے جاتے ہیں ـــــ عذر ہائے بسیار اس بارے میں کئے جاتے ہیں اور سب نا مسموع ہیں ـــــ خدا کا شکر ہے کہ احقر نے رات منا میں گذاری، اور ۹ ذی الحجہ کو بعد انتشارِ شعاع، عرفات کا قصد کیا ـــــ ہر چند یوم الترویہ میں مجھے نمازِ ظہر منا میں میسر نہیں آئی لیکن بحکم ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ جو کچھ میسر ہوا غنیمت ہے ـــــ بالجملہ متصل مسجد نمرہ اُترے ـــــ بعد جمع بین الصلوٰتین ایک گھڑی دن باقی رہا تھا کہ وقوفِ عرفات کیا ـــــ اس مبارک منزل پر جوشِ سحابِ کرم، دیدنی ہے شنیدنی نہیں ـــــ جو یہاں آکر ٹھہرا وہی اس رحمت کو

[1] غالباً "تکرونی"!۔

جانتا ہے ـــــ اے اللہ! میں دوسری مرتبہ بھی اس نعمت کا آرزومند ہوں ـــــ جب سورج غروب ہوا، عرفات سے مزدلفہ کی طرف متوجہ ہوئے اور وہاں رات گذاری، پھر صبح کے وقت مشعر الحرام سے روانگی ہوئی، منا پہنچے ـــــ رمی جمرۃ العقبی، ذبح اور حلق کے بعد مکہ معظمہ گئے، طواف الزیارۃ کیا، اسی دن منا میں لوٹ آئے ـــــ ۱۱ ذی الحجہ کو وہاں رہ کر، ۱۲ کو بعد رمی جمرۃ الدنیا نماز عصر، وادی محصّب میں ادا کر کے مکۂ مشرّفہ میں شرف اندوز سعادت ہوئے۔ الحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات وصلی اللہ علی محمد النبی الامی وعلی آلہ وصحبہ افضل الصلوٰت۔

مخفی نہ رہے کہ اگرچہ بمقتضائے نصِ قرآنی فمن تعجل فی یومین الآیہ ـــــ جو شخص ۱۲ ذی الحجہ کو منا سے چلا آئے وہ گنہگار نہ ہوگا، اور کوئی جنایت بھی اس پر نہیں، اور آج کل سب کی عادت بھی یہی ہو گئی ہے ـــــ لیکن ـــــ سنّتِ سیّد الانام علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی اتباع میں احسن واجمل یہ ہے کہ ۱۳ ذی الحجہ کو منا سے نکلے ـــــ چنانچہ ایک گروہ کو اس روش پر عامل بھی پایا ـــــ البتہ راقم کو یہ مجبوری پیش آگئی کہ والدہ ماجدہ ـــــ اللہ ان کو بخشے ـــــ اندازے سے زیادہ خستہ وضعیف ہو گئیں ـــــ مرحومہ نے اور دیگر ضعفاء نے طواف الافاضہ (طواف الزیارۃ) ابھی نہیں کیا تھا، اس بناء پر ۱۲ کو مکہ معظمہ پہنچنا ضروری ہوا، کیونکہ آئینِ حنفی میں اگر ۱۲ گذر جائے، درآنحالیکہ طواف الزیارۃ نہ کیا ہو، تو گنہگار ہوتا ہے۔

وادی محصّب میں، سنّت یہ ہے کہ چار نمازیں، ظہر سے عشاء تک ادا کی جائیں ـــــ مگر جس مجبوری کا ابھی ابھی ذکر ہوا، اس کی بناء پر نماز مغرب سے پہلے مکہ معظمہ پہنچنا ضروری تھا ـــــ اس وجہ سے اس سنت کی ادائیگی پورے طریقے پر نہ ہو سکی، البتہ نماز عصر جیسا کہ مذکور ہوا اس وادی میں میسر آگئی، امید کہ اس کی رحمت کا کمال ہمارے عمل کے نقصان کو دور کر دے گا ـــــ اور محض اپنے لطف و کرم سے وہ ہمارے اعمال کو قبول فرمائے گا۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

اسی بلدۂ طیبہ میں میری والدہ اور میری نانی چار دن کے فاصلے سے انتقال کر گئیں، اور جنت المعلیٰ میں دفن ہوئیں ـــــ اللھم اغفر لھما وبرّد مضجعھما ـــــ میری والدہ کی خوش نصیبی دیکھو کہ ان کو مزارِ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے پہلو میں جگہ ملی ـــــ واللہ

یختص برحمتہ من یشاء۔

مدینۂ منوّرہ کو روانگی اور وہاں کا قیام

مدینۂ منورہ کا راستہ پانچ سال سے، اہلِ بادیہ کی رہزنی کے باعث بے امن تھا، قافلے نہیں چلتے تھے، اور چلتے تھے تو سلامت کم رہتے تھے ــــــ گذشتہ سال ان بدوؤں کے ہاتھوں اہلِ جادہ پر جو گذری سب کو معلوم ہے ــــــ اسی بنا پر حاجیوں کا دل غمگین تھا، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ خواجۂ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار کی حاضری نہ ہو سکے۔ ناگاہ قدرتِ کاملہ کا ظہور اس انداز سے ہوا کہ یا تو کارواں کے ساتھ نہیں جا سکتے تھے، یا اب بے کارواں جا سکتے ہیں ــــــ اس کی شرح یہ ہے کہ شریف محمد بن عون کو بادشاہِ مصر نے تہدیداً چند سال مصر میں نظر بند رکھا، اب اس شرط پر انتظامِ مدینہ اُن کے سپرد کیا ہے کہ راستے کا انتظام اس طرح کریں کہ ایک بڑھیا بھی رہزن سے خائف نہ ہو ــــــ چنانچہ وہ ان مبارک ایام میں مصر سے آکر منازلِ طریق مدینہ میں آئے، اعراب کو جمع کر کے اُن سے معاہدہ کیا، اور اُن کو قتل و غارت سے باز رکھا۔

۲۲ محرم الحرام ۱۲۵۶ھ کی شام کو مکہ میں دو ماہ پانچ روز قیام کرنے کے بعد مدینۃ الرسولؐ کی زیارت کے لئے چل پڑے ــــــ طلوعِ سحر سے پہلے وادیٔ فاطمہ میں اُترے ــــــ مکہ اور وادیٔ فاطمہ کے درمیان مقام سَرِف میں اُمّ المؤمنین حضرت میمونہؓ کی تربت ہے۔ نگارندگانِ سیرتِ محمدیؐ نے لکھا ہے کہ نکاح و زفاف و وفاتِ اُمّ المؤمنین میمونہؓ کا سرف میں اتفاق ہوا ہے ــــــ وادیٔ فاطمہ میں کھجور کے باغات ہیں اور آب نہر بھی ــــــ ۲۳ محرم کو قُبیل عصر یہاں سے چلے، اور اگلے دن نمازِ صبح سے پہلے ایک منزل میں جس کا نام یاد نہیں، اُترنا ہوا۔

۲۴ محرم کو قبل العصر وہاں سے چلے اور صبح کو خلیص میں سکونت ہوئی ــــــ یہاں بدوؤں کے گھر ہیں ــــــ نہر و باغات بھی ہیں ــــــ ایک مسجد مآثرِ سیّد الانام صلی اللہ علیہ وسلم میں سے یہاں پر ہے، جو اب منہدم ہو گئی ہے لیکن اُس کے آثار باقی ہیں۔

۲۵ محرم کو خلیص سے چل کر دوسرے دن صبح صادق کے وقت بیر قضیمہ پر خیمہ زن ہوئے۔

۲۶ محرم کو بعد زوال چلے، اور چاشت کے وقت رابغ میں اُترے ــــــ رابغ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، اس جگہ کے رہنے والے سارق ہیں ــــــ اس جگہ ایسی بادِ سموم چلی کہ بعض ساتھیوں کا "نخلِ حیات" جلا دیا ــــــ اسی بنا پر ۲۷ محرم کو گور و کفن کا انتظام کرنے کے لئے ٹھہرنا لازم ہوا

یہ حالت تھی کہ ایک کی نمازِ جنازہ پڑھ رہے ہیں، ایک کا کفن سی رہے ہیں، ایک کو غسل دے رہے ہیں، ایک عالمِ نزع میں ہے، اور ایک پر تاثیرِ بادِ سموم کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں ـــــ مُردوں کو آغوشِ گور میں سُلا کر، اور بیماروں کو اُٹھا کر ۲۸ محرم کو ـــــ دن کا کافی حصّہ باقی تھا ـــــ کہ کوچ کیا ـــــ اور صُبح کی نماز کے وقت بیر مستورہ میں اُترے ـــــ سیّد محمّد بخاریؒ نے ـــــ جن کا ذکر عرفاتِ مکّہ میں گذر چکا ہے ـــــ ازراہِ شفقت میرے ساتھ مدینۂ منورہ کا قصد کیا تھا ـــــ جس وقت رابغ سے ہم روانہ ہوئے، بادِ سموم نے اُن پر بھی اثر کیا، اور بیر مستورہ تک آتے آتے اُن کی پاک روح، فردوسِ بریں میں چلی گئی، اور بھی چند ساتھی جنّت کو سدھار گئے ـــــ انا للہ وانا الیہ راجعون ـــــ

چاہ مستورہ کا پانی تلخ ہے، لیکن دو تین کوس کے فاصلے پر پانی میٹھا ہے، اونٹ بان وہاں سے لے آتے ہیں۔

۲۹ محرم کو عصر سے پہلے روانہ ہوئے، بیر شیخ پر اُترنا تھا، لیکن چونکہ وہاں پانی نایاب ہے، اِس لئے وہاں سے تجاوز کر کے ایک کنوئیں کے قریب جو راستے سے ایک طرف کو واقع ہے ـــــ سکونت کی ـــــ یہاں بھی ایک دو آدمی، جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔

غرّہ صفر المظفر کو ـــــ تھوڑا سا دن باقی تھا ـــــ کہ سوار ہوئے، اور بعد شروق شمس "وادیٔ صفرا میں وارد ہوئے ـــــ یہ ایک بڑا قصبہ ہے ـــــ چشمۂ جاری اور باغات رکھتا ہے یہ تمام منازل سے زیادہ شاداب و بارونق ہے۔

۲ صفر ـــــ بعد "اصفرار شمس" سوار ہوئے ـــــ خیف سے گذر کر اشراق کے وقت حدیدہ میں ٹھہرے، یہاں دامن کوہ سے پانی لاتے ہیں۔

۳ صفر ـــــ بین الظہر والعصر ـــــ کوچ کیا، منزل وادیٔ مجنوں میں کرنی تھی، لیکن یہاں پانی نہیں، بنا بریں اونٹ بانوں نے یہاں سے دو تین کوس پر ٹھہرنے کا مشورہ دیا، جہاں پانی دستیاب ہوا۔

۴ صفر ـــــ عصر سے پہلے چلے، اور بعد اشراق ذو الحلیفہ میں ـــــ کہ اب بیر علی کہلاتا ہے ـــــ گزر ہوا ـــــ یہاں سے مدینہ منورہ تین کوس کا فاصلہ رکھتا ہے، یہ وہ مبارک مقام ہے، جہاں حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام حج باندھا ہے ـــــ جب ذو الحلیفہ سے قافلہ گذرا ـــــ میں نے دیکھا کہ ایک عاشق شوریدہ سر رقصاں جا رہا ہے، اور یہ شعر پڑھ رہا ہے:-

شکر للہ کہ نمردیم و رسیدیم بدوست :: آفریں باد بریں ہمتِ مردانۂ ما

اُس نے یہ شعر کتنے صحیح موقع پر پڑھا، اس کے بیان کرنے کی چنداں حاجت نہیں ہے ـــــ دن کا چھٹا حصّہ گذر گیا تھا کہ مدینۂ طیبہ میں بہرہ اندوز سعادت کونین ہوئے ـــــ آداب ضروریہ بجالانے، اور سلطانِ ہر دو سرا کے دربار سے مشرف ہونے کے بعد ہم نے جو کچھ کیا وہ کیا۔

شہیدی مرحوم منشی کرامت علی شہیدی جو مشہور شاعر ہیں اور جن کا ذکر میں نے گلشنِ بنجار میں بھی کیا ہے راستے میں "وبازدہ" ہو گئے تھے ـــــ مدینے میں وفات پائی، اور بقیع پاک میں مدفون ہوئے۔ ؎

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت
مرگے کہ زندگاں بدعا آرزو کنند

ذکر مدینۂ طیبہ وہ تجلیات جو اس نور کدے میں پرتوفگن ہیں، اُن کا ادراک اہلِ معنیٰ کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ اہلِ ظاہر بھی اس فیضِ عام کو محسوس کرتے ہیں ـــــ انوار، بارانِ بہار کی طرح اس ارضِ مقدس پر ہر لحظہ برستے ہیں ـــــ جب نظر، خواجۂ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبۂ منورہ پر پڑتی ہے، تو کیا بتاؤں کہ آنکھ کس قدر کیف یاب ہوتی ہے، اور دل کتنا نشاط حاصل کرتا ہے۔ ؎

جانم فدائے دیدہ کہ روئے تو دیدہ است
قربانِ پاشوم کہ بکویت رسیدہ است

جو کیفیات اس قدسی حریم میں ظاہر ہوتی ہیں، وہ گفتار و تحریر میں نہیں آسکتیں ـــــ اس نعیم گاہ میں جب تک نہ پہونچ گے اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ ع

ذوق ایں مے نشناسی بخدا تا نہ چشی

جو اس بقعۂ مبارکہ میں آگیا، واللہ کہ موت سے پہلے جنّت میں اُس کا گذر ہو گیا ـــــ شاید کوئی ناشناس اس موقع پر مجھ سے اُلجھے اور کہے کہ عبارت کو محلِ اغراق و مبالغہ میں، مؤکد بقسم کیوں کیا جا رہا ہے، اور

لہ شہیدی مرحوم نے اپنے ایک مشہور نعتیہ شعر میں کہا تھا:۔ ؎

تمنا ہے درختوں پر ترے روضہ کی جا بیٹھے　　قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا

بالآخر یہ تمنا پوری ہوئی۔

اپنے آپ کو خواہ مخواہ حانث کیوں بنایا جارہا ہے، میں اس سے کہوں گا وائے برتو اے بے خبر حدیث و فقہ ——
یہ اغراق و مبالغہ نہیں ہے، سچی بات ہے —— تھوڑی سی تکلیف برداشت کرکے اہلِ علم سے مابین قبری و منبری روضۃٌ من ریاض الجنۃ —— کے معنیٰ معلوم کرا اور وہ روایتِ فقہی بھی سُن جس میں ایسی قسم کھانے پر حانث ہونے نہ ہونے کی بحث ہے۔

انعامِ خداوندی اس بندۂ کمینہ پر اتنا ہے کہ عمرِ نوح عطا کریں اور ہر سرِ مو کو طاقتِ گفتار بخشیں پھر تمام عمر سپاسِ نعمت میں بسر ہوجائے تب بھی شاید ہی الطافِ خفیہ میں سے ایک لطفِ خفی کا شکریہ بمشکل ادا ہوسکے —— اور یہ نعمت جو اب عنایت فرمائی گئی (حاضری مدینہ) یہ تمام انعامات کا راس المال اور سردفتر ہے —— الحمد للہ ثم الحمد للہ۔

اخلاقِ اہلِ مدینہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلقِ عمیم کی تاثیر سے اس خیر البلاد (مدینۂ منورہ) کے اکابر و اصاغر، تواضع، اور "اکرامِ ضیف" کی صفات سے متصف ہیں۔

علمائے مدینہ اس بلدہ طیبہ کے "سرخیلِ اہلِ علم" شیخ محمد عابد سندھیؒ ہیں، ان کا مولد سندھ ہے اور پرورش یمن میں پائی ہے —— چند سال سے حرمِ مدینہ کے مجاور ہو گئے ہیں، ان کی عمر سترؔ اور اسّی کے درمیان ہے، یہ پاک دین، مبارک نفس، دلجو، برگزیدہ خو، سنجیدہ گو بزرگ ہیں۔ ان کے وجود کو "مہر و وفا" کے "آب و گل" سے تخمیر کیا گیا ہے۔

مسجدِ نبوی میں درس دیتے ہیں —— عصر و مغرب کے درمیان تشریحِ مطالبِ دُرِ مختار میں دُر فشانی فرماتے ہیں، اور مغرب و عشاء کے درمیان تفسیرِ بیضاوی کے معانی بیان کرتے ہیں، اعلیٰ درجہ کے محدّث ہیں، "وسعتِ روایت" کے لحاظ سے بھی، اور "جرح و تعدیلِ رواۃ" کی حیثیت سے بھی۔

ان کے پاس جو جو کتبِ نفیسہ ہیں، آنکھ نے کم دیکھی ہوں گی اور کان نے کم سُنی ہوں گی ——
ان کی بہت سی مفید تصنیفات ہیں —— دُرِ مختار پر حاشیہ لکھا ہے جو نو دس بڑی جلدوں میں ہے ——
شوقِ تصنیف و مطالعہ نے ان کے دل کا احاطہ کرلیا ہے —— ہر وقت تصنیف و مطالعہ میں مشغول رہتے ہیں —— بخلاف شیخ عبداللہ سراج کے، کہ ان کو تصنیف کا شوق نہیں ہے (بس درس دیتے ہیں)۔

شیخ عبداللہ سراجؒ کا ایک قول

شیخ عبداللہ سراجؒ فرماتے تھے کہ بزرگوں نے ہم کو تکلیف تصنیف سے بے نیاز کر دیا ہے عمر کا تدریس میں گزرنا، تصنیف و تالیف میں بسر ہونے سے بہتر ہے۔ اس لیے کہ اس زمانے میں تدریس کا نفع غالب تر ہے ـــــ ہزاروں کتب موجود ہیں، لیکن "درست خواں" کم ہیں لہٰذا درست خواں طیار کرنے کی کوشش، تصنیف جدید سے بہتر ہے۔

مصرع ـــــ راہیں جدا جدا ہیں طریقے جدا جدا

شیخ محمد عابد سندھیؒ احقر کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آئے اور اندازے سے زیادہ التفات فرمایا۔ مراتب مہمان نوازی کو "ذروۂ اعلیٰ" پر پہونچا دیا ـــــ تبرکاً" اطرافِ اکثر کتب حدیث" اُن کو سنا کر اجازت روایت حاصل کی۔

ایک مصری نابینا عالم ہیں جن کو اکثر علوم خوب مستحضر ہیں ان سے ملاقات کا موقع نہ مل سکا، نہ ان کی مجلس کا رنگ دیکھا ـــــ ایک اور عالم ہیں جو غالباً مصر کے ہیں وہ عصر و مغرب کے درمیان محفلِ تدریس گرم رکھتے ہیں۔ خوبان روزگار میں سے ایک سید گل محمد رامپوری ہیں اُن جیسے دنیا سے کنارہ کش لوگ کم ہیں فقیر ان سے نہ مل سکا۔ ایک بزرگ مولوی عبداللہ ہیں، جو ہندوستانی ہیں اور امیرزادوں میں سے ہیں۔ ترکِ جاہ کر کے درِ رسولؐ کو محکم پکڑ لیا ہے۔ فطوبیٰ لہم طوبیٰ لہ۔ لوگوں کے بہت سے کار ہائے بستہ اُن کے ذریعے جاری ہوتے ہیں، تمام مکارم کے ساتھ ساتھ ان کی نغز گوئی اور شیریں سخنی بھی قابلِ ذکر ہے جتنا ان سے ملو گے سیر نہ ہو گے بلکہ اور زیادہ مشتاق ہو جاؤ گے۔ فقیر کے ساتھ ان کی وہ وہ مہربانیاں ہوئیں، کہ حدِ بیان سے باہر ہیں ـــــ

ایک بزرگ شیخ عبداللہ بن عمر ہیں جو سادات حضرموت سے ہیں، میں نے بمبئی میں ان کا ذکرِ خیر سنا تھا اور ملاقات کا اشتیاق تھا۔ مدینہ منورہ آکر ان کا خیال نہ رہا، ایک دفعہ ان کو دیکھا بھی لیکن اُن کا نام نہ معلوم کر سکا۔ مدینہ منورہ سے روانگی کے وقت ان سے سرسری تعارف ہوا۔ میں نے اُن جیسا پابند اوقات کم دیکھا ہے۔

مسجد نبوی کے خطباء و ائمہ

مسجد نبوی میں جماعت حنبلی و مالکی منعقد نہیں ہوتی ہے۔ بس دو جماعتیں ہوتی ہیں۔ حنفی مسلک والے سوائے نماز صبح کے باقی سب نمازوں میں سبقت کرتے ہیں۔ یہاں کے خطباء و ائمہ کا شمار اسی تک پہونچتا ہے ـــــ میں نے خطبائے مدینہ جیسی حسن خطابت کہیں اور نہیں دیکھی۔ اکثر ائمہ زمرۂ حنفیہ میں سے ہیں، چند زمرۂ شافعیہ میں سے اور دو تین طائفہ مالکیہ میں سے ہیں گروہ حنابلہ میں سے معلوم نہیں کہ کوئی ہے بھی یا نہیں ـــــ

مدینے میں ترک بڑی تعداد میں سکونت پذیر ہیں "آئین استنبول" اور "قانون قسطنطنیہ" مکہ سے زیادہ یہاں رائج ہے۔

مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ | ابھی جگہ گرم نہ ہوئی تھی کہ برخاستگی کا زمانہ آگیا، ایک ماہ نو دن کے بعد بادِ فراق چل پڑی۔ بزم جمعیت دل پریشان ہو گئی۔ آنکھوں کو آنکھوں سے اور آنکھوں کو آستین سے تعلق پیدا ہوا۔ فرمانِ قضا و قدر ٹلتا نہیں ہے۔ مجبوراً اپنے پیکرِ خاکی کو منتقل کر لیا اور دل اسی جگہ چھوڑ دیا۔ ۱۴؍ ربیع الاول کو مکہ معظمہ کی طرف چلے ؎

> زہے سعادتِ آں بندہ کہ کرد نزول
> گہے بہ بیتِ خدا و گہے بہ بیتِ رسول

مدینہ منورہ سے دو منزلیں طے کر کے زیارتِ شہداء کی غرض سے بدر کا قصد کیا، اس امید میں کہ شایدان "سعداء" کی برکت سے مژدۂ "قد غفرت لکم" سے کچھ حصہ مل جائے اور یہ کچھ بعید بھی نہیں، آمرزش کے لیے تھوڑا سا بہانہ بہت ہے۔ بدر میں رات کے آخری لمحات میں آئے۔ صبح کو خاکِ شہیداں پر پہنچے "دل خونیں" اور "جگر سوزاں" کو "بطورِ شمع و گل" پیش کیا ؎

> شمعہا بردہ ام از صدق بخاکِ شہداء
> تا دل و دیدۂ خوں نابہ فشانم دادند

یہاں سے دو منزلیں طے کر کے رابغ آئے اور احرام عمرہ باندھا۔ بعدہٗ منزل بمنزل چل کر ۲۶؍ ربیع الاول کی آدھی رات نہ گزری تھی کہ مکہ معظمہ پہونچ گئے۔ رات ہی میں طواف و سعی کو انجام دیا۔

مکہ سے طائف | اہلِ مکہ، شباب گرما کے زمانے میں بسوئے طائف روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ گرمی کا زمانہ ہے قافلے جا رہے ہیں راقم کو بھی "گلگشتِ بساطینِ طائفی" کا اشتیاق ہوا۔ معلوم ہوا کہ طائف کے دو راستے ہیں ایک جبل کرہ سے اس راستے میں ایک دن لگتا ہے۔ لیکن پہاڑ کی چڑھائی اور اس سے اترنا بہت تکلیف دہ ہے اسلئے دوسرے راستے سے سفر کیا جاتا ہے۔ البتہ اس راستے میں دو دن لگتے ہیں۔ اس دوسرے راستے کے بھی تین شعبے ہیں۔ (۱) براہِ زیمہ۔ اس راستہ میں سایہ دار اشجار نہیں ہیں۔ (۲) براہ سیلہ۔ یہ سرسبزی و شادابی کے لحاظ سے بہترین راستہ ہے۔ (۳) بطریق جعرانہ۔ یہ اگرچہ اور راستوں سے دراز تر ہے۔ لیکن صراطِ مستقیم یہی ہے اسلیے کہ خواجۂ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی جگہ سے اعتمار فرمایا ہے۔ اسی بنا پر جی چاہتا تھا کہ واپسی میں جعرانہ سے مکہ آؤں۔ لیکن بتقاضائے فرمان قضا و قدر اس خجستہ راہ سے گزر نہ ہو سکا ——

مدینہ منورہ سے آ کر پانچ روز حرم محترم میں بسر کر کے سہلہ پہنچے۔ بعدہٗ سیل میں اترے۔ یہاں نہ نہر ہے نہ کنواں البتہ ایک دو بالشت زمین کھود کر صاف پانی نکالا جا سکتا ہے —— ۲؍ ربیع الثانی کو طائف آئے

طائف بڑی اچھی ہوا رکھتا ہے۔ اس زمانے میں جبکہ گرمی کی "گرم بازاری" ہے۔ یہاں (سردی کے باعث) زیر آسمان نہیں سو سکتے۔ میوہ ہائے گوناگوں یہاں پائے جاتے ہیں۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند آثار یہاں مشہور ہیں۔ حبر الامۃ ترجمان القرآن سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے مزار یہیں ہیں، حضرت عکرمہ مولیٰ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مرقد نواح طائف میں ہے۔ سوائے قبر عکرمہ رضی اللہ عنہ کے کہ فاصلہ پر تھی باقی مزارات مقدسہ کی زیارت کی ـــ

طائف کی اپنی ذاتی آبادی کچھ ایسی نہیں ہے لیکن اہل مکہ کے جمع ہو جانے سے اس میں رونق ہو جاتی ہے۔ یہاں کی عمارتیں خام ہیں۔ مثنیٰ ایک موضع، طائف سے ایک کوس پر ہے۔ یہ مقام بھی باغات کا مرکز ہے۔ آٹھ دن اس سرزمین میں گذرے تھے کہ کہنے والے نے کہا کہ "موسم سفر دریا گذرا جاتا ہے، تمام سفینے چلے گئے صرف دو کشتیاں ساحل پر ہیں اور وہ بھی عنقریب روانہ ہونیوالی ہیں"۔ اس خیال سے تو دل غمگین تھا کہ دیار عرب کو جلد خیر باد کہنا پڑے گا لیکن "اقامت سالِ دگر" کا بھی وجوہ موقع نہ تھا۔ لہٰذا فوراً طائف سے آہنگ حرم کیا اور اسی روز ہی نے سمت جعرانہ سے واپسی نہ ہونے دی ـــ ۱۲ ربیع الاول کو مکہ پہونچے۔ بین العشائین طواف وسعی کی۔

وداع مکہ | پندرہ روز مکہ میں قیام کرکے بادلِ پرغم اور باچشم گریاں طواف الوداع بہ نیت واپسی کیا۔ ۲۷ کو حدیبیہ میں نزول ہوا یہاں سے دو کوس کے فاصلے پر بیت الرضوان ہے۔ اب وہاں ایک مسجد بنی ہوئی ہے صبح کی نماز اس مسجد میں پڑھی والحمدللہ ـــ ۲۸ کو جدہ آئے۔ یہ آباد شہر ہے لیکن "مصر کلاں" نہیں ہے۔ سوداگروں کے اجتماع کی وجہ سے یہاں رونق ہے۔ یہاں مکھیوں اور مچھروں کی زیادتی اور پانی کی کمی تکلیف دہ ہے۔ حضرت حوا رضی اللہ عنہا کا مزار بیرون شہر واقع ہے ـــ نو روز جدہ میں ٹھہرے۔ شب ہفتم ماہ جمادی الاولیٰ میں کشتی پر بیٹھے لیکن چار دن تک باد موافق نہ چلی کشتی اپنی جگہ رہی بالآخر ۱۱ جمادی الاولیٰ کو نسیم صبح گاہی کے ہمراہ کشتی روانہ ہوئی ـــ ۱۷ کو بندرگاہ حدیدہ پہونچے۔ اسی دن یہاں اتر کر جامع مسجد میں نماز شام پڑھی اور اسی مکان میں اترے جس میں جاتے وقت اترے تھے ـــ یہاں اس وقت طرح طرح کا میوہ پایا جاتا ہے۔ ان میں سب سے لطیف ولذیذ رطب ہے پھر عنب ـــ انبہ بھی اس جگہ مل جاتا ہے۔

اس دفعہ نقیہ عمر سے حسب دلخواہ ملاقات رہی، شیخ مذکور کے مناقب اندازۂ بیان سے بالاتر ہیں۔ ان کا ظاہر معمور اور باطن آباد ہے۔ ہر چند کہ ان کے کچھ فضائل پہلے گذر چکے ہیں لیکن بمقتضائے

أَعِدْ ذِكْرَ نُعْمَانٍ لَنَا إِنَّ ذِكْرَهُ ‏ ‏ ‏ ‏ هُوَ الْمِسْكُ مَا كَرَّرْتَهُ يَتَضَوَّعُ

(نعمان کا ذکر بار بار کر کیونکہ اس کا ذکر مشک کی طرح ہے۔ بار بار خوشبو دیتا ہے)

قلم نے تکرار فضائل میں تامل نہیں کیا۔ شیخ نے رسالۂ امام ابوالقاسم قشیریؒ فقیر کو عنایت فرماکر ارشاد فرمایا۔ اُوصیکَ بکثرۃِ النظرِ فی ھذہِ النسخۃِ المبارکۃ۔ یعنی میں اس کتاب کے بار بار مطالعہ کرنے کی تم کو وصیت کرتا ہوں ـــ شیخ باوجود حنفی ہونے کے قرأتِ فاتحہ خلف امام کے بارے میں "اِصرارِ فراواں" رکھتے ہیں ـــ

میں حضرت سید احمد مقبولی دُرہیمی کے دیدار کا آرزو مند تھا۔ ۲۲ جمادی الاولیٰ کو رات کے وقت قصد دُرہیم کیا دن نکلتے نکلتے وہاں پہونچ گیا۔ حضرت سید سے "دولت مصافحہ" نصیب ہوئی، نوازش ولطف کا معاملہ کیا۔ فرمانے لگے۔

بشارتیں دیں۔ ان کا دل سبے "رمیدہ" اور محبوب حقیقی سے "آرمیدہ" ہے۔ ان کی عمر ایکسو ساٹھ سال ہے۔ کچھ عرصہ ہوا ان کے ایک لڑکا تولد ہوا ہے۔ یہ امر ان کی کرامات وخوارق عادات میں سے ہے۔ ثقہ لوگوں نے ان کے خوارق کثرت سے بیان کیے۔ اگر ان سب کو لکھا جائے دفتر طولانی ہوجائے۔ ۲۳ر جمادی الاولیٰ کو حُدیدہ واپس ہوئے۔

یمن | یمن پاکیزہ علاقہ ہے۔ یہاں جس کو سنو "قدسی نفس" جسکو دیکھو "پاک روح"۔ میں نے نادیدہ حضرات کا ذکر نہیں کیا ورنہ اس سرزمین میں اتنے اولیاء ہیں کہ ان کے تذکرے سے مستقل ایک "تذکرۃ الاولیاء" مرتب ہوسکتا ہے۔ میں نے اس مبارک سرزمین میں دیکھا کہ یہاں ہنوز "بہارستان ولایت" شاداب ہے۔ اور "چمن زار کرامت" کے پھول تازگی کے ساتھ موجود ہیں۔

ہنوز آں ابرِ رحمت دُرفشان است — مے و میخانہ با مہر و نشان است

ایک خاص واقعہ ملک یمن کا اقتدار ترک سے نکلنا اور امام صنعاء کے حیطۂ اختیار میں آنا ہے۔ امام صنعاء کوہستان میں بسر کرتا تھا، ناگاہ اس کی قسمت جاگ اُٹھی اور "عروس مملکت" اُس کے سرہانے آکر کھڑی ہوگئی۔ سبحان اللہ! ہمارے جاتے وقت یہ مملکت ترکوں کے پاس تھی اور آتے وقت امام، صاحب تاج ونگیں ہے۔ عشرت گیتی کو ثبات اور دولتِ دنیا کو بقا نہیں۔

۲۷ر جمادی الاولیٰ کو حدیدہ سے چل کر مُخا پہنچے اور وہاں سے ۲ر جمادی الثانیہ کو روانگی ہوئی۔ رات کے وقت باب المندب سے بے زحمت نکل گئے۔ تین دن ہوا موافق چلی۔ چوتھے دن امواج سمندر نے کشتی کو بحر عجم میں ڈال دیا اور ایک ایسے پہاڑ کے پاس پہنچا دیا جو ساحل پر واقع ہے۔ اس جگہ پانی کس بلا کا زور اور کشش رکھتا تھا (مت پوچھو) کوسوں سے کشتی کو کھینچتا تھا۔ چھ دن تک اس ورطہ سے نکلنا نہ ہوا۔ جب ہوا تیز چلتی تھی کشتی جنبش میں آجاتی تھی اور پہاڑ سے دور ہوجاتی تھی اور جب ہوا کم ہوجاتی تھی پانی زور کرتا تھا اور کشتی کو پھر بسمت کوہ کھینچ لاتا تھا۔ ہر شام کو خوش ہوتے تھے کہ آج پہاڑ سے دور چلے گئے اور صبح کو دیکھتے تھے کہ پہلے سے بھی زیادہ پہاڑ سے نزدیک ہیں۔ بارے دعائے سحری کارگر ہوئی، ہوائے موافق مسلسل چلی اور دو دن میں "جذب آب" کی حد سے نکل آئے۔ ۲۰ر جمادی الثانیہ کو بمبئی پہنچے۔ ۱۹ دن میں مخا سے بمبئی پہنچنا ہوا۔

بمبئی سے دہلی | ہجوم ابر و باراں اور خرابی راہ کے باعث ایک ماہ پانچ روز بمبئی میں قیام رہا۔ راہ ناسک اس لیے اختیار نہیں کی گئی کہ "یاران سورت اور بڑودہ" سے ملاقات نہ کرنا مروت سے دور تھا وہ حضرات ہماری ملاقات کے منتظر ہیں۔

نامۂ آزردہ | بمبئی ہی میں مولانا محمد صدرالدین خاں صدر الصدور شاہجہاں آباد (دہلی) کا مکتوب آیا ہے۔ مولانا دعاگو کے احباب میں سے ہیں بڑی عنایت فرماتے ہیں۔ مراتب دانشمندی میں اُن کے ہمپایہ کم نظر آئیں گے۔ منقول ومعقول دونوں میں کامل استعداد ہیں۔ اُن کی محفل افادہ گرم ہے۔ تینوں زبانوں میں فکر سخن کرتے ہیں۔ آزردہ تخلص ہے۔ اُن کے مکارم اتنے

فراواں ہے کہ نگارندہ کا قلم لکھتے لکھتے فرسودہ ہو جائے پھر بھی تھوڑے سے نہیں لکھے جاسکیں گے مشتاقان تفصیل کو تذکرہ "گلشن بیجار" دیکھنے کا مشورہ دیتا ہوں میں نے اس میں مولانا کا ذکر وضاحت سے کیا ہے۔

بمبئی سے ۱۹ ر شعبان کو رخصت ہو کر منزل بمنزل چل کر ۲۷ ر شعبان کو سورت پہنچے۔ وہاں ہمارے پہنچنے سے دو روز پیشتر سید محمد عبدروسیؒ کا انتقال ہو چکا تھا اور سید میاںؒ چند ماہ مشتر عالم بالا کو سدھار چکے تھے۔ آج سورت میں ان دونوں بزرگوں کی جگہ خالی پڑی ہے نہ کوئی فقیہ سید میاں جیسا بزم علم و دانش میں نمودار ہے اور نہ کوئی مرشد سید محمد جیسا مسند ارشاد پر فائز ہے۔ سورت چھ روز ٹھہر کر بریاؤ۔ ہرسورن۔ بڑوچ۔ ایکڑ۔ انیٹولہ ٹھہرتے ہوئے ۹ ر رمضان کو بڑودہ پہنچے۔

قابل یادداشت نصیحت | بڑودہ اور گودرہ کے درمیان ایک جگہ ایک کہن سال بزرگ عبدالعزیز نام سے ملاقات ہوئی انھوں نے ایک نصیحت فرمائی دل چاہتا ہے کہ اس کو بھی لکھ دوں۔ فرمایا "کہ اسباب حجاب میں یہ دو سبب بڑے ہیں (۱) نگاہ بر اسباب ظاہر (۲) وہم انانیت ـــــ کوتاہ بیں لوگ کتنی ہی بلند پروازی کریں پردہ اسباب سے نہیں گزر سکتے، اور ساغر انا کو توڑنا بھی مشکل ہے اس مادۂ فاسد کا قلع قمع کرنے کے لیے سفر دریا بہترین علاج ہے خصوصاً جب کہ موج من فوقہ موج من فوقہ سحاب' کا منظر سامنے ہو۔ اس وقت جبکہ ہاتھ تمام تدبیروں سے کوتاہ ہو جاتا ہے اور تمام اسباب پوشیدہ ہو جاتے ہیں، غلبۂ قہر کثرت نہاں ہو کر سلطان وحدت کا ظہور ہوتا ہے تو طلسم ما و تو درہم برہم ہو کر لمن الملک الیوم للّٰہ الواحد القہار' کا مفہوم ظاہر ہو جاتا ہے اور پردہ اٹھ جاتا ہے۔ پھر فرمایا تم نے (اے شیفتہ) یہ ذوق (سفر دریا کی صعوبتیں جھیل کر) حاصل کر لیا ہے۔ گاہے گاہے اس واقعہ کو دہراتے رہنا اور اپنی بیچارگی ہی نہیں بلکہ نابودگی کو نظر میں رکھنا، تم کوئی چیز ہوتے تو تم سے (ان مصائب کے وقت) کچھ ظاہر ہوتا، شاید کہ کثرت تعلق باللہ سے تکلف بے تکلفی سے بدل جائے اور ہستی موہوم سے قطع نظر کرنا زندگی جاوید کا سبب بن جائے۔ فنا چاہو گے تو بقا ملے گی"۔ سبحان اللہ! اس قوم (صوفیاء) کی نگاہ بھی کتنی بلند اور عقل کتنی ارجمند ہوتی ہے۔ مگر فقط باتوں سے کام نہیں چلتا عمل کی توفیق ہو جائے تو بات ہے۔

۱۰ ر شوال کو بڑودہ سے چلے اس دفعہ یہ ارادہ ہوا کہ آنے والے راستے کو بدل دیا جائے تغیر راہ کا بڑا سبب مشاہدہ احمد آباد کا خیال تھا لہٰذا احمد آباد کا رخ کیا، ساتولی میں جو بڑودہ سے بارہ کوس ہے اور نواب حسام الدین کی جاگیر ہے نواب صاحب کے ساتھ وارد ہوئے۔ ۱۱ ر کو نواب صاحب نے جانے نہ دیا۔ ۱۲ ر کو بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ دوستوں کو رخصت کیا ع کز سنگ نالہ خیزد وقت وداع یاراں"۔

وہاں سے چل کر تیسری منزل پر ۱۵ ر شوال کو بٹوہ پہنچے، یہ مقام حضرت سید برہان الدین عبداللہ مشہور بہ قطب العالم کی آرامگاہ ہے یہ مشاہیر اولیائے گجرات سے ہوئے ہیں، ان کا طریقہ سہروردی تھا۔ انھوں نے مخدوم جہانیاںؒ سے استفادہ کیا ہے۔ ۱۶ ر شوال

کو احمد آباد آئے۔ اثنائے راہ میں حضرت شاہ عالم کی تربت پُرنور کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ یہ بزرگ حضرت شاہ قطب عالم قدس کے صاحبزادے ہیں۔ احمد آباد میں بہت سے اولیا آسودہ ہیں، اگرچونکہ اکثر بزرگوں کے مزارات شہر سے فاصلے پر واقع ہیں اس لیے اُن کی زیارت نہ ہوسکی، ہاں شیخ احمد کی تربت پر سرخیز ہیں کہ آج کل سرکھیج مشہور ہے، جانا ہوا۔ کہتے ہیں کہ سلطان احمد گجراتی نے احمد آباد گجرات کو "کلمۂ خیر" اس کی سال بنا کی خبر دیتا ہے، شیخ احمد کی رائے سے آباد کیا۔ ان کے روضے کے قریب علی شیر چشتیؒ کا مزار واقع ہے، دیگر بزرگوں کے مزارات پر بھی جو شہر میں واقع ہیں جانا ہوا لیکن چونکہ ان کا حال تفصیل سے معلوم نہ ہوسکا اور اجمالی حالات بھی یاد نہ رہے لہٰذا ان کا ذکر نہیں کیا گیا۔ علاوہ ازیں اولیائے گجرات کے ذکر میں مستقل تواریخ موجود ہیں اس وجہ سے بھی ان سب کے تذکرے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

آج کل شہر احمد آباد ویران سا ہے جس طرح بڑا شہر ہونے میں احمد آباد کی نظیر کمتر پائی جاتی ہے ویرانی میں بھی اسی طرح بے نظیر ہے، سوائے مساجد کے کہ خدا اُن کو آباد رکھے، کوئی چیز کم دیکھی جاتی ہے اور مساجد بھی ضائع ہو رہی ہیں یہاں کی ایک قابل دید چیز "افزونی گرد و ریگ" ہے عالمگیرؒ بادشاہ بطور لطیفہ فرمایا کرتے تھے:

"ہیچ شہر بگرد احمد آباد نرسد (کوئی شہر احمد آباد کی گرد کو نہیں پہنچتا)"۔

البتہ احمد آباد کے کپڑے وفور شہرت کے باعث ذکر سے مستغنی ہیں۔ مشائخ میں اس جگہ خوب میاں چشتیؒ "خوبانِ روزگار" سے ہیں شکستہ طبع، نرم دل، خوش خو اور پسندیدہ گفتار ہیں، اوقات عزیز کو عبادت سے معمور رکھتے ہیں۔ انھوں نے راقم پر بہت مہربانیاں فرمائیں۔ معززین میں سے قاضی محمد صالح کبیر الس بزرگ ہیں۔ احمد آباد سے ۲۵ر شوال کو منزل بمنزل چل کر ۲۵ر ذی قعدہ کو اجمیر شریف آئے۔ اجمیر سے دہلی تک روزنامۂ سفر لکھا نہ جاسکا۔ مختصر یہ ہے کہ پانچ چھ روز اجمیر میں قیام کر کے وہاں سے روانگی ہوئی۔ ایک ہفتہ جے پور میں گزار کر وہاں سے روانہ ہوئے۔ کچھ حضرات دہلی سے ریواڑی تک "برسم استقبال" پہنچے اور بعض گوڑگاؤں آئے۔ جب کاد حضرت خواجہ قطب الاقطاب قدس اللہ سرہ میں پہنچے تو تمام اعزا اکابر اور احباب واصحاب آکر ملے۔ دل خوش ہوا۔ ۲۳ر ذی الحجہ ۱۲۵۶ھ کو بعد زیارت حضرت سلطان المشائخؒ و والد مغفور چاشت کے وقت شاہجہاں آباد (دہلی) میں وارد ہوئے۔ والحمد للہ تعالیٰ علی المعاودۃ مع العافیۃ والسلامۃ۔

یہاں سب سے پہلے مرجع آفاق مولانا محمد اسحاقؒ کی ملاقات سے بہرہ اندوز ہوئے، اس کے بعد گھر پہنچنا ہوا۔

تمام مدت سفر حج دو سال اور چھ روز ہے۔

غیر اسلامی حکومت کی شرکت اور ملازمت

ایک سوال اور اس کا جواب

(از محمد منظور نعمانی)

سوال :- آپ نے اپنی کتاب "دین و شریعت" میں سیاست و حکومت کے باب میں غیر اسلامی (غیر شرعی) حکومت کے تحت رہنے والے مسلمانوں کے لیے جو اصولی راہِ عمل تحریر فرمائی ہو جس کے ماتحت وہ حکومت کے بہت سے شعبوں میں ملازمتیں بھی جائز طور پر کر سکتے ہیں اور ملت کی دینی و دنیاوی مصالح کا تقاضا ہو تو حکومت اور قانون ساز اداروں میں شرکت بھی کر سکتے ہیں۔ اس کو میرے دل و دماغ نے پوری طرح قبول کیا ہے۔ بات بالکل دل لگتی اور شرعی نقطۂ نظر سے حق نظر آتی ہے۔ اور آپ نے جو استدلالی بحث اس سلسلہ میں کی ہو اگرچہ وہ بہت مختصر ہے مگر میرے نزدیک کافی حد تک اطمینان بخش ہو۔ لیکن ایک خلش یہ باقی رہ گئی کہ آپ نے ان دلائل اور اس نقطۂ نظر سے بالکل تعرض نہیں فرمایا جس کی بنیاد پر ہند و پاک کا ایک مشہور و معروف دینی مکتبِ فکر کسی غیر اسلامی حکومت یا اس کے قانون ساز اداروں میں شرکت کو ہر حال میں ایک طاغوتی عمل اور ایسی حکومتوں کی ملازمت کو مطلقاً تعاون علی الاثم والعدوان اور طاغوت کی چاکری قرار دیتا ہے۔

ان حضرات کی مشہور دلیل سورۂ توبہ کی آیۃ اتخذوا احبارھم ورھبانھم الخ اور اس کی شرح کرنے والی حدیث بروایت عدی بن حاتم ہے۔ اس کی تفصیل یقیناً آپ کے علم میں ہوگی۔ اچھا ہو کہ آپ اس پر بھی روشنی ڈال کر مجھ جیسے لوگوں کی یہ خلش دور فرما دیں۔

جواب

"دین و شریعت" کی جس بحث کا آپ نے اپنے سوال میں حوالہ دیا ہو، واقعہ یہ ہو کہ جب میں نے ابتداءً اس کو لکھا تھا تو اپنے مدعا اور مسلک کی وضاحت سے فارغ ہونے کے بعد اس مخالفانہ نقطۂ نظر اور اسکے اُن مشہور دلائل سے بھی تعرض کیا تھا جن کا آپ نے تذکرہ کیا ہو۔ لیکن بعد میں مجھے یہ خیال ہوا کہ پوری کتاب میں میرا یہ رویہ رہا ہے کہ دین کے جس باب میں جو میرے نزدیک حق تھا بس اسی کو میں نے وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہو اور ناظرین کے اطمینان قلب اور تاثر کے لیے جہاں جتنی استدلالی بحث ضروری سمجھی بس اسی قدر بحث کر دی ہو۔ مخالفانہ دلائل سے کہیں بھی تعرض نہیں کیا ہو، اس لیے مجھے یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس بحث میں بھی اسی طریقہ کی پابندی کی جائے۔ چنانچہ وہ لکھا لکھایا حصہ میں نے کتاب سے نکال لیا —— لیکن نکالا ہوا وہ حصہ اصل مسودہ میں محفوظ تھا اس لیے الفاظ کے معمولی تصرف کے ساتھ میں اسی کو نقل کیے دیتا ہوں —— پہلے میں نے چند سطروں میں اس مخالفانہ نقطۂ نظر کا تذکرہ کیا تھا جس کا آپ نے حوالہ دیا ہو، اس کے بعد میں نے لکھا تھا کہ "کتاب و سنت" اور امت کے مسلسل تعامل سے اس بارہ میں جو کچھ ہم نے سمجھا ہو وہ یہ ہو کہ ہر مسلمان کے لیے یہ تو ضروری اور گویا شرطِ ایمان ہو کہ وہ اسلام، اسلامی تعلیم یعنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے ضابطۂ حیات اور نظام زندگی کو حق و ہدایت سمجھے اور اُس کے خلاف جو کچھ ہو اس کو غلط باطل یقین کرے اور اس لیے اس کی دلی آرزو اور چاہت یہی ہو کہ تمام انسان اللہ و رسول پر ایمان لے آئیں اور ان کے مقدس دین اسلام کو اپنا لیں۔ اور ساری دنیا اس کی حلقہ بگوش اور اسی کے زیر اقتدار ہو جائے۔ (وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ) نیز اُمّتِ مسلمہ کا یہ بھی فرض ہو کہ اس مقصد کے لیے جس وقت براہ راست یا بالواسطہ جو سعی و تدبیر مناسب ہو اس سے دریغ نہ کیا جائے —— (یہ بات "دین و شریعت" میں "دین کی خدمت و نصرت" کے زیر عنوان تفصیل سے لکھی بھی جا چکی ہے) —— لیکن ان حضرات کا یہ کہنا کہ کسی ملک کی غیر اسلامی حکومت کے ساتھ کسی معاملہ میں تعاون اور اس کی کوئی ملازمت مطلقاً بھی کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں، اور اس کو مستقل شرعی فتوے کی حیثیت دینا ہمارے نزدیک ایسی بات ہو جس کی شریعت میں کوئی دلیل و بنیاد نہیں ہو۔ علاوہ ازیں بعض حالات میں

اس غالیانہ "فتوے" سے مسلمانوں کے دینی مقاصد و مصالح کو بھی سخت ضرر پہونچ سکتا ہے۔

ہمارے نزدیک عام شرعی مسئلہ اس باب میں یہ ہے کہ ایک مسلمان جس طرح کسی غیر صالح یا غیر مسلم فرد کے ان معاملات کی انجام دہی کے لیے اس کی ملازمت اور اس کے ساتھ تعاون و اشتراک کر سکتا ہے جو اثم و عدوان نہ ہوں، اسی طرح غیر اسلامی حکومتوں اور اس طرح کے دوسرے اجتماعی اداروں کے بھی ان کاموں میں ہم تعاون کر سکتے... اور عملی حصہ لے سکتے ہیں جو خلاف شریعت اور از قبیل اثم و عدوان نہ ہوں اور جن میں اسلام اور مسلمانوں کا کوئی ضرر نہ ہو۔ مثلاً حکومتوں کا محکمۂ صفائی، محکمۂ غذا، محکمۂ صحت، مواصلات، زراعت، صنعت، انسداد جرائم اور قیام امن، اور ان کے علاوہ اور بھی متعدد شعبے حکومتوں کے ایسے ہیں جو اثم و عدوان نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض میں تو خدمت خلق اور رفاہ عام کا پہلو بھی غالب ہے۔ پس ایسے کاموں میں تعاون اور ان صیغوں میں ملازمت کے شرعی عدم جواز کی کوئی بھی وجہ نہیں ہو سکتی۔

یہاں ایک بڑا اصولی مغالطہ جس پر عدم جواز کے اس فتوے کی بنیاد رکھی جاتی ہے یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ ہر غیر اسلامی حکومت اللہ کے مقدس دین کے مقابلے میں ایک متوازی دین اور اللہ کے نازل کیے ہوئے نظام حق کے مقابلہ میں ایک باغیانہ نظام ہے اس لیے اس کے کسی بھی کام میں تعاون و اشتراک اور کسی بھی شعبہ میں اس کی ملازمت و خدمت دین حق کے مقابلہ میں ایک دین باطل کی خدمت اور مقدس الٰہی نظام کے مقابلہ میں ایک باغیانہ طاغوتی نظام کے ساتھ تعاون اور اسکی خدمت ہے۔

لیکن اگر اللہ نے دین کا کچھ بھی علم و فہم دیا ہے تو تھوڑا سا غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ بات شرعی دلیل سے زیادہ خطابت اور شاعری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس قسم کی دنیوی حکومتوں کے بارے میں یہاں گفتگو ہے (ان کے حدود اختیار اور حدودِ کار کی موجودہ وسعت کے باوجود) ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے کہ وہ ملکی نظم و نسق کو چلانے والے ایسے ادارے ہیں جن کے افراد بھی بدلتے رہتے ہیں، پارٹیاں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ اصول اور دستور تک میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، ان سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں، ان غلطیوں پر نکتہ چینی بھی کی جاتی ہے، خاصکر جمہوری حکومتوں

والے ملکوں میں یہ نکتہ چینیاں بعض اوقات نہایت سخت اور عدد رجہ رسوا کرنے والی ہوتی ہیں، پھر ان حکومتوں کے بڑے بڑے ذمہ داروں پر بھی بعض اوقات مقدمے چلتے ہیں اور ان کو سزائیں بھی دی جاتی ہیں، پھر عوام کے لیے ان حکومتوں کے بدلنے کا حق بھی تسلیم کیا جاتا ہو، اور اسی بنیاد پر ملکوں میں یہ حکومتیں آئے دن بدلتی بھی رہتی ہیں۔ ـــــ اور اسی بنا پر کہ ان حکومتوں کی اصل حیثیت بس یہی ہو کہ یہ ملکی نظم و نسق کے چلانے کے ادارے ہیں ان میں بسا اوقات مختلف عقائد و خیالات رکھنے والے اور مختلف ادیان و مذاہب کے ماننے والے، اور کبھی کبھی تو مختلف سیاسی نظریات رکھنے والے بھی شریک ہو جاتے ہیں جن کے درمیان صرف حکومت کے اصولی پروگرام پر اتفاق ہوتا ہے ـــــ بس جن حکومتوں کی واقعی حیثیت اور پوزیشن یہ ہو ان کے غیر اسلامی اور غیر شرعی ہونے کی وجہ سے شریعت کی زبان میں ان کو ناحق اور غیر صحیح حکومتیں، تو بیشک کہا جا سکتا ہو لیکن یہ کہنا کہ ایسی ہر حکومت خدا کے مقدس دین کے مقابلہ میں ایک متوازی دین ہے اور ان کے چلانے والے خدا کے مقابلہ میں خدائی کے دعویدار ہیں جب ہی صحیح ہو سکتا ہے جبکہ خدا اور اسکے مقدس دین کو بہت نیچے اتار لیا جائے۔ یعنی خدا کو دنیوی حکمرانوں اور فرمانرواؤں کی قسم کا بس ایک حاکم و فرمانروا اور اس کے دین کو بس ایک "اسٹیٹ" اور "نظام حکومت" سمجھ لیا جائے۔ تعالی اللہ عن ذالك علواً کبیراً ۝

اسی طرح کا ایک دوسرا مغالطہ اس سلسلہ میں یہ بھی ہو کہ ان حکومتوں کی صرف دنیوی قانون سازی کو اللہ تعالیٰ کی دینی تشریع کے مقابل قرار دے کر "شرک" بلکہ اس سے بھی بڑھ کر "خدائی کا دعویٰ" کہا جاتا ہو اور اسی بنا پر ان حکومتوں کی مجالس قانون سازی کی شرکت کو 'دعوئے خدائی کو متضمن اور قطعی حرام قرار دیا جاتا ہو، حالانکہ جس تشریع کا حق غیر اللہ کے لیے ماننا واقعۃً شرک ہو وہ دینی تشریع ہو، یعنی یہ کہ کسی مخلوق (فرد یا طبقہ یا ادارہ) کو مقدس مطاع اور منزہ عن الخطا مانتے ہوئے اس کو تحریم و تحلیل اور امر و نہی کا مقتدر مانا جائے اور اس کے احکام کی تعمیل کو بِرّ و سعادت اور اس کی نافرمانی کو گناہ و شقاوت سمجھا جائے ـــــ قرآن مجید میں نصاریٰ کے جس گروہ کے بارہ میں فرمایا گیا ہے ـــــ کہ

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے مذہبی عالموں

اَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔ (توبہ ع ۴) اور درویشوں کو اپنا خدا بنا لیا۔

ان کی گمراہی یہی تھی اور اپنے اَحْبَارُ وَرُھْبَان کو انھوں نے تقدس و تشریع کا یہی مقام دے رکھا تھا۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت عدی بن حاتم سے جو حدیث مروی ہو خود اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے[۵]۔ اور مسیحیت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ چیز اور زیادہ وضاحت و تفصیل سے معلوم ہو جاتی ہو۔

اور بالکل ظاہر ہو کہ عہد حاضر کی جن غیر اسلامی حکومتوں کے بارہ میں یہ گفتگو ہو رہی ہو، ان کی اور ان کے قانون کی حیثیت کسی کے نزدیک بھی یہ نہیں ہو، اس لیے ان کی قانون سازی کو وہ تشریع قرار دینا جو درحقیقت صرف اللہ کا حق ہو اور اس بنا پر اس کو خدائی کا دعویٰ یا شرک یا حرام کہنا، سراسر شاعرانہ غلو ہو اور پھر اس کے ثبوت میں سورۂ توبہ کی مندرجۂ بالا آیت پیش کرنا اور بھی بے جا جسارت ہے۔

امید ہو کہ اس مسئلہ سے متعلق یہی سطریں آپ کی اور آپ جیسے دیگر حضرات کی "خلش" دور کرنے کے لیے کافی ہوں گی۔

اصل بات یہ ہو کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے صحیح اور جائز حکومتیں تو صرف وہی ہو سکتی ہیں جو حکومت و سیاست کے اسلامی ضابطہ کی بنیاد پر قائم ہوں اور جن کے دستور و قانون کی اساس کتاب و سنت اور اسلامی شریعت کو قرار دیا گیا ہو۔ لیکن جو حکومتیں ایسی نہیں ہیں (خواہ ان کے چلانے والے غیر مسلم ہوں یا مسلمان یا مخلوط) ان کے غیر صحیح اور ناجائز ہونے کے باوجود اسلام ان کے وجود کو

---

[۵] جامع ترمذی وغیرہ میں حضرت عدی بن حاتم سے روایت ہو کہ عدی بن حاتم جو عیسائی تھے انھوں نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سورۂ توبہ کی یہ آیت سنی تو عرض کیا کہ عیسائیوں نے اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا تو نہیں بنایا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا ایسا نہیں ہے کہ اُن کے یہ عالم اور درویش جس چیز کو حرام یا حلال قرار دے دیتے ہیں عیسائی ان کی تحریم و تحلیل کو مان کر ان کا اتباع کرتے ہیں ——— یہی ان کو خدا بنانا ہے۔ ظاہر ہو کہ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہی تحریم و تحلیل ہے۔ اور مسیحیت کی تاریخ کے مطالعہ سے اس کی پوری تفصیل بھی معلوم ہو جاتی ہے۔

اسی طرح تسلیم کرتا ہو جس طرح وہ غیر صالح اور غیر مسلم افراد کے وجود کو تسلیم کرتا ہو۔ پھر ان کے حالات کے اختلاف کے لحاظ سے وہ ان کو مختلف قسموں میں تقسیم کرتا ہو اور ان کے بارہ میں الگ الگ احکام دیتا ہو ——— پھر جس طرح وہ عام حالات میں غیر صالح اور غیر مسلم افراد کے ساتھ ایسے امور میں تعاون و اشتراک سے منع نہیں کرتا جو اثم و عدوان نہیں ہیں اسی طرح وہ ایسے امور میں غیر اسلامی حکومتوں کے ساتھ اشتراک و تعاون سے بھی منع نہیں کرتا، بلکہ اگر غیر مسلم افراد اور اسی طرح غیر اسلامی حکومتیں کوئی کام ایسا کریں جس میں اللہ کی مخلوق کی بھلائی ہو تو اسلام اس میں تعاون کی اپنے پیروؤں کو ترغیب دیتا ہے ——— نیکی اور بھلائی کے کاموں میں تعاون و تناصر کا حکم صرف مسلمانوں ہی سے مخصوص نہیں ہو۔ بلکہ اسکے عموم میں غیر مسلم بھی شامل ہیں[۵]

علاوہ ازیں کسی غیر اسلامی حکومت کے مسلمان شہریوں کے لیے ایسے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ (بلکہ اکثر و بیشتر ایسا ہوگا) کہ حکومت کے کاروبار اور اسکی مجالس قانون ساز میں شرکت خود مسلمانوں کو دینی و دنیوی نقصانات سے بچانے کے لیے اور اُن کے دوسرے اہم ملی مصالح کے لیے ضروری سمجھی جائے پس ایسے حالات اور ایسی صورت میں تو ان مخلص مسلمانوں کا جو اس کے لیے اہل اور موزوں ہوں، حکومت کے کاروبار میں شریک ہونا ضروری ہوگا ——— اور بالکل اسی طرح ان ملکوں کے مسلمانوں کے لیے ایسے حالات بھی آسکتے ہیں کہ حکومت کے کاروبار سے بالکل بے تعلقی اور عدم تعاون مسلمانوں کے دینی و ملی مصالح کا تقاضہ ہو اور ان کے اہل علم اور ارباب بصیرت اسی پالیسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کریں، اس وقت ان ملکوں کے مسلمانوں کو اسی کے مطابق چلنا اور اسی پالیسی پر عمل پیرا ہونا ضروری ہوگا۔ لیکن اُس وقت بھی اس فیصلہ کی بنیاد یہ نہ ہوگی کہ "غیر اسلامی حکومت سے اشتراک و تعاون ایمان باللہ اور کفر بالطاغوت کے بنیادی حکم کے منافی ہو اور اس لیے قطعاً حرام ہو"

——— بلکہ وہ اس وقت کے خاص حالات کا تقاضا اور مخصوص صورت حال کا حکم ہوگا۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

---

[۵] جس مکتبِ فکر کے نقطۂ نظر پر یہ بحث کی گئی ہو اُس کے فکری راہنما مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے سورۂ مائدہ کی آیت "تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" کے ذیل میں تفہیم القرآن میں جو کچھ لکھا ہو اُن کے معتقدین اس موقع پر اس کو ضرور دیکھ لیں!!

ایک عبرت انگیز خط

[ذیل میں ایک نجی خط درج کیا جا رہا ہے جو سراپا عبرت و موعظت ہے۔ خط میں کچھ اور بھی تھا جو اشاعت کے مقصد سے تعلق نہیں رکھتا تھا وہ حصہ حذف کر دیا گیا ہے، جواب بھی نجی طور پر دیا جا چکا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ بہت سے بندگانِ خدا کی ہدایت اور اُن میں دینی استقامت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔] (ادارہ)

جناب مولانا صاحب قبلہ! السلام علیکم۔ مزاج شریف۔ بعد آداب کے گزارش ہے کہ چند باتیں جناب سے دریافت کرنی ہیں اگر موقع ملے تو جواب دے کر اس ناچیز پر احسان کیجیے۔ . . . . میں یہاں میونسپل بورڈ میں عرصہ چار سال سے ملازم ہوں، اور میرے ذمہ سلاٹر ہاؤس کا کام، روشنی کی چیکنگ اور اس کا کل کام، اور بازار میں جو جانور بکنے آتے ہیں اُن کی رجسٹری کرنا ہیں۔ آج سے قریب دو سال قبل میں دو مہینے تک رجسٹری کرنے میں فی رسید چار آنے رشوت لے لیا کرتا تھا۔ بازار میں چار آنے فی رسید ناجائز طور سے ہم سے پہلے بھی لوگ لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ سلاٹر ہاؤس کی محرری کا کام ہونے کی وجہ سے گوشت بھی سستا مل جایا کرتا تھا، اور کبھی کبھی مفت بھی لے لیا کرتا تھا۔ جناب قبلہ . . . . صاحب کے . . .[1] آنے کے بعد اُن کے ذریعہ آپ کی کتاب "اسلام کیا ہے؟" پڑھی جس سے کہ مجھے رشوت سے گھن اور نفرت پیدا ہوئی۔ مگر کبھی کبھی ناجائز رقم لے بھی لیا کرتا تھا۔ اس کے بعد . . . . صاحب نے داڑھی رکھنے کے لیے زور دیا! چنانچہ میں نے اپنے نفس کو بہت دبا کر داڑھی رکھ لی۔ ۲۲ سال کی عمر میں داڑھی رکھ لینا میرے لیے اسلام کا سب سے مشکل کام تھا۔ جب میں نے یہ کام کر لیا تو ایک ایک گناہ سے توبہ کی، اور اب شریعت کا کوئی بھی کام میرے لیے مشکل نہیں رہا۔ چنانچہ میں نے

[1] مقام کا نام۔ (الفرقان)

رشوت سے بالکل توبہ کی۔ ...... صاحب سے یہ معلوم کیا کہ یہ جو رعایت سے گوشت ہمیں ملتا ہے اور قصاب ان کہتے ہیں کہ میں خوشی سے دے رہا ہوں، کیا یہ بھی رشوت ہے؟ جواب ...... صاحب قبلہ دام برکاتہم نے میرے اوپر بڑا احسان کیا (اللہ پاک اُنھیں دین و دنیا میں خوش رکھے) صاف صاف بتلادیا کہ ہاں یہ بالکل رشوت ہے۔ چنانچہ اس سے بھی توبہ کی اور اب اللہ کا فضل ہے کہ ایک چھیچھڑا میں زیادہ نہیں لیتا ہوں اور بازار کے پورے دام دے کر لیتا ہوں۔ اس کے بعد ...... صاحب سے میں نے پوچھا کہ پچھلی ناجائز رقم جو میں لے چکا ہوں اُس کے بارے میں کیا ہو؟ تو اُنھوں نے گوشت کے بارے میں تو یہ بتلایا کہ قصاب ان سے معاف کرانا تو ٹھیک نہیں ہے کیوں کہ وہ محض تمھارے دباؤ کی وجہ سے کہہ دیں گے کہ ہم نے معاف کردیا۔ لہٰذا اپنے اندازے سے کچھ رقم ان لوگوں کو دے دو اور یہ کہہ دینا کہ "ہمارے اندازے میں اتنے رقم کا گوشت میں نے تم سے رشوت کے طور پر لیا تھا، اب میں توبہ کرتا ہوں پچھلے دام یہ لے لو اور اگر کچھ بڑھے ہوں تو معاف کردو"۔

چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ بازار کے بارے میں اُنھوں نے یہ بتلایا کہ "جن جن سے پیسے لیے ہوں یاد کرکے دھیرے دھیرے ادا کردو"۔ چنانچہ میں نے اس کی بہت کوشش کی مگر افسوس یہ ہے کہ ناکام رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں پر بھینسوں اور گائیوں کی بازار لگتی ہے اور بڑی دور دور سے مثلاً ضلع کانپور۔ جھانسی۔ جالون۔ ہمیرپور وغیرہ سے لوگ بھینس خریدنے آتے ہیں اور میں فی کس دو آنے پیسے لیا کرتا تھا یعنی ۲ر خریدار اور ۲ر بیچنے والا، اور صرف دو ۲½ مہینے تک یہ ذلیل کام کیا ہوگا، اور ۲۰ - ۲۵ کے درمیان ناجائز روپیہ کمایا ہوگا، لہٰذا اتنی دُور دُور کے رہنے والوں کو اُن کے پیسے واپس کرنا غیر ممکن تھا۔ اس کے بعد یہ سوچا کہ منی آرڈر کے ذریعہ بھیج دوں، حالانکہ جتنے پیسے ہوں گے اتنا ہی منی آرڈر فیس بھی ہوگی۔ خریدار اور بیچنے والے کا پتہ رجسٹر میں لکھا رہتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے رجسٹر بھی Record روم میں داخل کرچکا تھا۔ چنانچہ میں نے کوشش کی کہ ریکرڈ روم سے نکلوا کر دیکھ لیا جائے۔ اور ریکرڈ کیپر سے آپسی طور سے کہا اور اس کے اصرار پر صلیت بھی اس کو بتلادی مگر اس نے بغیر آفیسر کی اجازت کے رکارڈ سے رجسٹر نکالنے سے انکار کردیا۔ ایسی حالت میں میں مجبور ہوگیا، اور ...... صاحب سے کہا۔ اُنھوں نے کہا "یہ تو حق العباد ہے جس کا حق ہے اسی کو دینا چاہیے

اتنا روپیہ کسی غریب محتاج کو دینے سے حق ادا تھوڑے ہی ہو جائے گا"۔ ہاں اگر بالکل ہی غیر ممکن ہو تو اتنا روپیہ کسی محتاج کو دے دو"۔ تب سے میں اب تک پس وپیش میں پڑا ہوں کہ کیا کرنا چاہیئے۔ اب لِلّٰہ آپ بتلائیے کیا کیا کروں۔ کوئی صورت نجات کی ہو تو تحریر فرمائیے۔ بہت زیادہ احسان مانوں گا۔ اگر ۲۵ روپیہ غریبوں اور محتاجوں کو اس نیت سے بانٹ دوں کہ اس کا ثواب ان لوگوں کو ملے جن سے میں نے ناجائز رقم لی تھی، یا کوئی اور صورت بتلائیے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ اس سے نجات کی کوئی صورت ہی نہ ہو۔ اور ان لوگوں کو واپس کرنا تو بالکل غیر ممکن کام ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی صورت ہو تو بتلائیے۔ اور اگر نہیں ہے تو مجبوری ہے۔ ہم نے جب کام ہی ایسا ذلیل کیا ہے تو سزا ملے گی۔ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں ۲/۲۵ روپیہ تو بڑی چیز ہے ایک آدمی کے ۲/ ادا کرنے میں کہیں اللہ میاں ساری زندگی کا نماز روزہ نہ لے لیں۔ ایک تو کیا ہی کیا ہے سوائے گناہوں کے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ والسّلام

تعارف و تبصرہ

۱۔ لغات القرآن جلد ششم — از مولانا عبد الدائم الجلالی —— صفحات ۳۲۴
مجلد قیمت ۸/۵

۲۔ تاریخ گجرات — از مولانا پروفیسر سید ابو ظفر ندوی مرحوم صفحات ۲۴۸

قیمت مجلد -/۸　　ناشر :- ندوۃ المصنفین ۔ دہلی ۔

۱۔ ندوۃ المصنفین ہمارے ملک کا مشہور علمی و دینی ادارہ ہے ۔ جو بڑی حوصلہ مندی کے ساتھ اپنے دینی معیاری علمی اور دینی کتابیں سامنے لا رہا ہے ۔ لغات قرآن کے موضوع پر جس شاندار کتاب کی تکمیل کا بیڑا اس ادارہ نے اٹھا رکھا تھا ، زیر تبصرہ جلد اس کی آخری جلد ہے جس میں حرف ن سے حرف یا تک کے لغات آ گئے ہیں ۔

جیسا کہ پہلی بعض جلدوں پر تبصرہ سے ظاہر ہو چکا ہے ، اس کتاب میں قرآنی الفاظ کے اردو معنیٰ بتائے گئے ہیں ۔ الفاظ کا صرف ترجمہ نہیں ، بلکہ ان سے متعلق ضروری تشریحات و مباحث کا بھی التزام ہے ۔ غرض شرح لغات کے ذریعہ قرآن فہمی جس حد تک ممکن ہو وہ اس کتاب سے پوری طرح حاصل ہو سکتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ کتاب کے مرتبین اور ناشر کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے قرآن سے متعلق ایک بڑی خدمت اس کتاب کے ذریعہ اردو زبان میں انجام دی ہے ۔ کتابت و طباعت بھی ہر لحاظ سے بہتر ہے ، کاغذ سفید اور دبیز ہے ۔ تقطیع متوسط (الفرقان سائز) ہے ۔

دو ایک تسامحات کتاب پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے سامنے آئے ۔ آئندہ اڈیشن میں تصحیح کے لیے ان کی نشاندہی کی جاتی ہے ۔

صفحہ ۳۱۴ پر

"یُوْذِیْ۔ واحد مذکر غائب مضارع مجہول منفی..... ایذا دیتا ہو۔ ۲۲ "

یہاں مجہول منفی کے بجائے معروف مثبت ہونا چاہیے۔

صفحہ ۳۱۶ پر

"یُوْفِضُوْنَ ...... اِفَاضَۃ مصدر (افعال) وہ دوڑتے ہیں۔ دوڑیں گے۔ ۲۹ دیکھو اَفَاضَ"

یُوْفِضُوْنَ کا مصدر اِفَاضَۃ نہیں اِیْفَاض ہو۔ اس بنا پر اَفَاضَ کا حوالہ بھی شاید بے محل ہوگا۔

۲۔ (تاریخ گجرات)۔ پروفیسر مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی مرحوم تاریخ کا بڑا گہرا ذوق اور وسیع مطالعہ رکھنے والے بزرگوں میں تھے، اللہ عزوجل رحمت کرے۔ ابھی سال گزشتہ ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ ایک مدت سے گجرات (احمد آباد) میں قیام تھا۔ تاریخ گجرات اب ان کے اسی قیام گجرات کی یادگار بن گئی ہے ——— دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کا ارادہ اس کتاب کو تین جلدوں میں مکمل کرنے کا تھا۔ پہلی جلد سری کرشن مہاراج کے عہد سے محمود تغلق شاہ (سنہ ۱۴۱۲ء) کے عہد کے سیاسی حالات تک، دوسری شاہانِ گجرات کے عہد میں اور تیسری مغلوں مرہٹوں اور ان کے بعد برطانوی دورِ حکومت کے حالات میں۔ یہ پہلی جلد ہو جو اس وقت ہمارے سامنے ہو۔ دوسری بھی وہ تیار کر چکے تھے، تیسری کے متعلق پتہ نہیں کہ کس مرحلہ میں رہی ——— یہ سب مصنف کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہو۔ ناشر نے کچھ نہیں بتایا کہ ان کے پاس آگے کی کوئی جلد ہو یا نہیں۔ اغلباً نہیں ہو ورنہ وہ اسے جلد اول ہی کی حیثیت سے شائع کرتے اور بقیہ جلدوں کے بارے میں کچھ ذکر کرتے۔ افسوس کہ یہ پہلی جلد بھی جس کی اشاعت، دیباچہ کی تحریر کے مطابق سنہ ۱۹۳۱ء میں ہو جانی چاہتی تھی اور یہ تصور مصنف کو مسرور کر رہا تھا، سنہ ۱۹۵۸ء میں اس وقت شائع ہوئی جبکہ مصنف اس دنیا سے گزر چکے تھے۔ خدا معلوم اس طویل مدت کی داستان کیا ہے؟

بہر حال یہ کتاب جو اس وقت سامنے ہو۔ سری کرشن مہاراج کے خاندان (جادو بنسی) کے عہد سے شروع ہو کر محمود تغلق شاہ اور ظفر خاں (آخری ناظم گجرات) کے دور تک کے سیاسی حالات کی تفصیل اپنے اندر لیے ہوئے ہو ——— شروع میں ایک ۵، صفحے کا مقدمہ ہو جس میں

گجرات کے جغرافی حالات، وہاں کی آبادی اور مختلف اقوام کی تفصیلات درج ہیں، نیز گجراتی زبان کے ارتقاء اور اس کے ادبی سرمایہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، مقدمہ کے بعد کتاب چار ابواب میں منقسم ہے۔

باب اول۔ ہندوؤں کا راج ـــ باب دوم۔ عرب و ہند کا قدیم تعلق اور ہند میں مسلمانوں کی آمد ـــ باب سوم۔ اسلامی حملے۔ باب چہارم۔ گجرات دہلی کے ماتحت۔

ہندو اقتدار پر مصنف کا بیان مختصر ہے تاہم سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اسلامی حملوں میں سلطان محمود غزنوی کی لشکر کشی، اس کے محرکات، معرکوں کی تفصیلات اور سومنات کے واقعہ کو بہت تفصیل سے قلمبند کیا گیا ہے، باب چہارم میں گجرات کے ان دنوں کی سیاسی سرگزشت ہے، جن میں وہ دہلی کے خلجی اور تغلق بادشاہوں کے زیر نگیں رہا (۱۲۹۷ء تا ۱۴۱۲ء)

کتاب تاریخ کا ذوق رکھنے والوں کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ ہے جو پروفیسر سید ابو ظفر صاحب ندوی مرحوم نے اردو میں گجرات کی مکمل تاریخ کا خلاء پر کرنے کے لیے لکھی ہے۔ کم از کم دوسری جلد بھی اگر شائع ہو جاتی تو یہ خلا ایک حد تک ضرور پر ہو جاتا۔

کتابت طباعت متوسط درجہ کی ہے۔ کاغذ عمدہ

جدید بین اقوامی سیاسی معلومات

از جناب اسرار احمد آزاد، صفحات ۷۰۴، کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ، مجلد قیمت ۵/۸

ناشر مکتبۂ برہان، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔

موضوع کے اعتبار سے اردو زبان میں اسرار احمد صاحب آزاد کی اچھوتی کتاب کی دوسری جلد کا یہ دوسرا حصہ ہے جس پر کتاب تکمیل کو پہونچ گئی ہے۔

بین الاقوامی سطح پر تجاویز اور منصوبوں، تحریکات اور نظریوں، مسائل و تنازعات، معاہدات و ادارات، اجتماعات و محاربات اور دیگر نوع کے واقعات کی عرصہ سے جو ریل پیل ہے، وہ اس دنیا میں رہنے والے ایک پڑھے لکھے آدمی کے لیے باقاعدہ ایک ایسی ڈکشنری کی متقاضی ہو گئی ہے جو ان سب امور کی جامع اور ان کی شارح ہو، اردو خوانوں کی اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آزاد صاحب نے یہ ضخیم کتاب مرتب کی ہے جو بین الاقوامی مسائل و حالات

سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے بین الاقوامی امور میں خاصی بصیرت حاصل کیجا سکتی ہو۔ بشرطیکہ قاری اس بات کو بھی پیش نظر رکھے کہ مصنف بہت گہرے روس دوست ہیں ـــــ کتابت طباعت بہتر اور کاغذ عمدہ ہے۔

متاع کلیم | از کلیم احمد آبادی صفحات ۱۷۶ مجلد قیمت ۴/۰
ناشر:۔ کلیم بکڈپو، خاص بازار، احمد آباد، (گجرات)

یہ گجرات کے اسّی سالہ بزرگ شاعر جناب کلیم احمد آبادی کے آخری دور کا مجموعۂ کلام ہے جو خوش قسمتی سے ان کی زندگی ہی میں شائع ہوا ہو۔ شروع میں جناب حبیب الرحمٰن غزنوی، پروفیسر جناب نجیب اشرف صاحب ندوی اور "شاعر" بمبئی کے ایڈیٹر جناب اعجاز صدیقی کا پیش لفظ، تقریب اور دیباچہ ہو جس سے کلیم صاحب کی زندگی اور ان کی شاعرانہ سرگزشت اور ان کے ادبی مقام پر روشنی پڑتی ہے، ان کی شاعری کے مرتبہ کے بارے میں تقریباً ان تینوں حضرات کی متفقہ رائے ہو کہ "آج گجرات میں وہ اگر سب سے بڑے اردو شاعر نہیں تو کسی سے کم بھی نہیں ہیں۔"

یہ مجموعہ تمامتر غزلیات پر مشتمل ہو۔ کلام کا رنگ یہ ہے۔

گلوں کی شعلہ فشانی کو اور کیا کہیئے — چمن میں آگ لگی ہو چمن دہکتا ہے
عجیب منزلِ سوز و گداز ہے راہی — ذرا سکون ملا ہے تو دل دھڑکتا ہے

سکھا دیے ہیں کچھ آداب جذبِ الفت نے — میں رو رہا ہوں مگر آنکھ تر نہیں رکھتا

وہ آئے ہیں غم دل انھیں بھی جا دینا — نہ پوچھ اور تو فرش نظر بچھا دینا
ہمارا کام یہی ہے کہ برق کی زد پر — نہ ہو جہاں وہیں اک آشیاں بنا دینا

کھلا ہو بابِ اجابت بڑھی ہو موجِ کرم — روا ہو ایسے میں دستِ دعا اٹھا دینا

لالہ و گل تو حسیں سے بھی حسیں تر ہیں مگر — دیکھنا یہ ہو کوئی خار حسیں ہو کہ نہیں

تقدیرِ الٰہی ہے در اصل جنوں میرا — گھٹ جائے تو درویشی بڑھ جائے تو شاہی ہو

کہیں گری تو ہو کہ بجلی ذرا نظر کیجئے — کسی غریب کی لیٹی ہوئی دعا تو نہیں

آسمان و زمین کو دیکھ لیا — ہم تو قائل ہیں دل کی وسعت کے

گل و بہار راس نہ آئی کبھی کلیم — کھلنا ہی تھا چمن میں کہ دست ہوس چلے

کتنی عجیب ہیں یہ دل کی راہیں — آسانیاں کم مشکل زیادہ
منزل سے آگے ہے ذوقِ منزل — اُڑنے لگے ہیں اربابِ جادہ

شفق کی شوخیاں ہوں یا گلوں کی شعلہ کاری ہو — ترے دیوانے ان کو اپنے ہی دل کا لہو سمجھے

آج کعبہ کی طرف رُخ ہو صنم خانے کا — ہو نہ ہو ہے یہ تصرف ترے دیوانے کا

ہو کہیں موجِ تبسم تو کہیں موجِ بہار — ایک قطرہ مرے چھلکے ہوئے پیمانے کا

یہ رنگِ تغزل اربابِ ذوق کو دعوتِ التفات دینے کے لیے بجائے خود کافی ہے اور ضرورت نہیں کہ کلیم صاحب کسی کی سفارش کے رہینِ منت ہوں۔ گجرات کے اربابِ ذوق و ادب نے کلیم صاحب کا جشن جوبلی منا کر اپنی اردو نوازی کا ثبوت دیا ہے۔ اس مجموعہ کی اشاعت کے بعد امید ہے کہ کلیم صاحب بیرونِ گجرات سے بھی خراجِ تحسین پائیں گے۔

کتاب گٹ اپ کے اعتبار سے بھی بہت خوب ہے۔ کتابت طباعت دیدہ زیب اور سائز نہایت موزوں۔ بس اگر کچھ ناموزونیت ہے تو شاعر کی تصویر کے ساتھ گرد پوش کے ڈیزائن میں، یا یہ تصویر نہ ہوتی یا وہ ڈیزائن نہ ہوتا۔

ہفت روزہ "المنبر" لائلپور - زیر ادارت مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف۔ سالانہ چندہ نو روپیہ۔ پتہ: ماڈل ٹاؤن، لائلپور۔ پاکستان۔

الفرقان کا حلقۂ ناظرین جناب حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب سے ناواقف نہیں ہے۔ المنبر سے پہلے کئی سال تک وہ المنیر نکالتے رہے۔ اور یہ اُن کی خصوصیت ہے کہ وہ صحافت کے میدان میں یکایک آئے۔ اور آتے ہی کچھ دیر نہ لگی کہ ایک مقام کے مالک ہو گئے۔ "المنبر" المنیر کا نقش ثانی ہے۔ غالباً سات آٹھ مہینے کا عرصہ اس کو نکلتے ہوئے ہو گیا ہے۔ اس عرصے میں جتنے نمبر بھی اس کے آئے سب قابل مطالعہ اور لائق استفادہ نظر آئے۔ بین الاسلامی اتحاد اس کا خاص نصب العین ہے۔ جس کا راستہ مدیر المنبر کے نزدیک یہ ہے کہ عالم اسلامی میں پھیلے ہوئے احیاءِ اسلام کی جدوجہد کرنے والے کارکن ایک دوسرے سے اور ایک دوسرے کے کاموں سے تعارف حاصل کریں اور ممکن حد تک اپنے مشترک مقصد میں تعاون کی راہیں نکالیں۔ المنبر کے بیشتر شمارے اس راہ کو ہموار کرنے کی کوشش لیے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس ذیل میں ایک مستقل چیز مولانا عبدالرحیم اشرف صاحب کے وہ انٹرویو ہیں جو انھوں نے سال گزشتہ اپنے سفر حجاز میں عالم اسلامی کی پچاسوں شخصیتوں سے لیے۔ یہ انٹرویو المنبر میں برابر شایع ہو رہے ہیں۔ عربی سے بامقصد اور مفید مضامین کے تراجم کا بھی المنبر نے التزام سا کر رکھا ہے۔ مولانا امین حسن صاحب اصلاحی کا سفر نامۂ حج بھی اب تک المنبر کا ایک مستقل عنوان سا رہا ہے۔ اس کے علاوہ حالات حاضرہ پر دینی نقطۂ نظر سے تبصرے اور دوسرے مفید علمی و دینی مضامین۔

اس وقت ہمارے سامنے المنبر کا خصوصی شمارہ "عیدالاضحےٰ نمبر" ہے۔ جو حج اور قربانی پر بڑے بیش بہا اور متنوع مضامین اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ ترتیبِ مضامین کی سیٹنگ اور گٹ اَپ کے اعتبار سے بھی اس کا درجہ معیاری ہے۔ اور اس خصوصیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ پورا نمبر اپنے تمام تنوعات کے ساتھ حج اور قربانی کی حقیقی روح میں ڈوبا ہوا ہے۔ ہم اس نمبر پر ادارۂ المنبر کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ مسجد نبوی اور خانۂ کعبہ کے مختلف فوٹوؤں سے اس نمبر کی تزئین کا اہتمام کر کے ادارہ المنبر نے بڑا جرأتمندانہ اقدام کیا ہے۔ خدا کرے بامقصد دینی جرائد کی کساد بازاری کے اس دَور میں المنبر ترقی کی اس روش پر گامزن رہ سکے۔

ماہنامہ راہنمائے صحت | زیرادارت حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب و ڈاکٹر عبدالحمید خاں صاحب

صفحات ۴۸۔ سائز $\frac{20 \times 30}{8 \times 1}$ ۔ سالانہ چندہ ۲/۱۲ ۔ پتہ: ۱۷۴ جناح کالونی، لائلپور

خدا معلوم کہ اُس نے حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کو کتنی مختلف صلاحیتیں اور کتنی قوّتِ عمل دے رکھی ہے۔ ایک طرف مطب بھی کرتے ہیں، نہایت اعلیٰ پیمانے پر ایک دواخانہ بھی چلاتے ہیں جو (یونانی، ایلوپیتھک اور ہومیوپیتھک) تین تین شعبوں پر مشتمل ہے۔ پھر المنبر جیسا معیاری ہفت روزہ بھی نکالتے ہیں اور اس ماہنامہ کی ادارت اُس پر مستزاد ہے۔ یہ ماہنامہ بھی ہماری نظر میں طبّی ماہناموں میں ایک منفرد اور معیاری حیثیت رکھتا ہے اور یہ سب نتیجہ ہے حکیم صاحب اور اُنکے رفقاء کے انہماک اور سلیقہ مندی کا۔

راہنمائے صحت کی تیسری جلد کا دوسرا شمارہ ہے، جو اس وقت ہمارے سامنے ہے نہایت مفید مضامین پر مشتمل ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اطبا اور غیر اطبا سب ہی ان مضامین کو دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے، اور اپنے اپنے مذاق اور ضرورت کے مطابق فائدہ اُٹھا سکیں گے۔ طبّیات سے نکل کر عام سائنسی معلومات کے دائرے کی بھی بعض چیزیں اس شمارہ میں ملتی ہیں۔

پرچہ کی ضخامت اور افادیت کو دیکھتے ہوئے قیمت بہت کم ہے اور یہ چیز اس کی مقبولیت کی ضامن ہے۔

اگر
آپ کو
ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ
پسند ہے
اور اسکی اشاعت کو آپ ایک دینی ضرورت سمجھتے ہیں؟
تو
اسکی اشاعت بڑھانے کی جدوجہد آپ کا فرض ہے
ہم آپ سے
اس فرض کی ادائیگی کی توقع رکھتے ہیں!
ادارۂ الفرقان لکھنؤ

ALFURQAN (RegdNo. A-353) LUCKNOW.